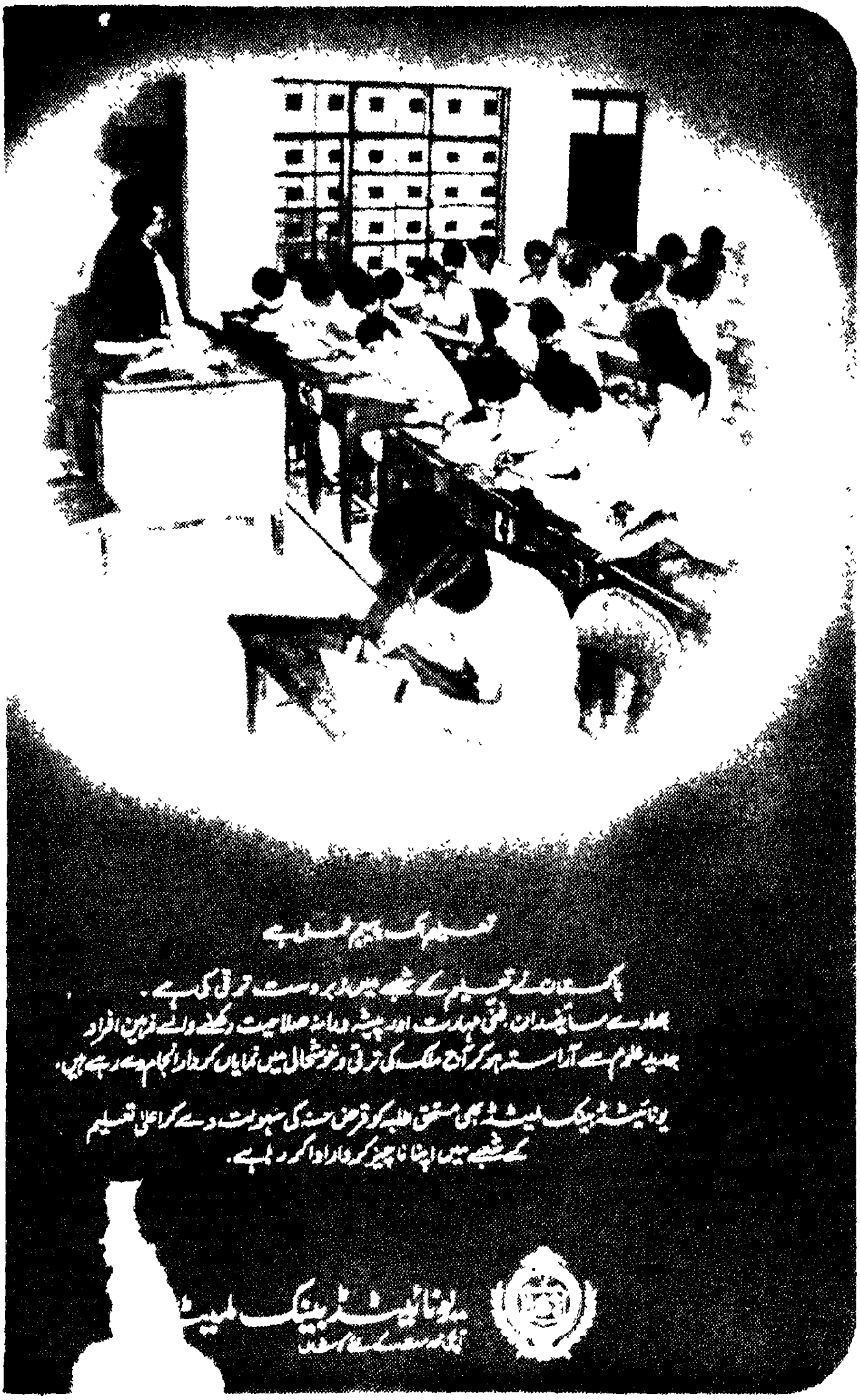
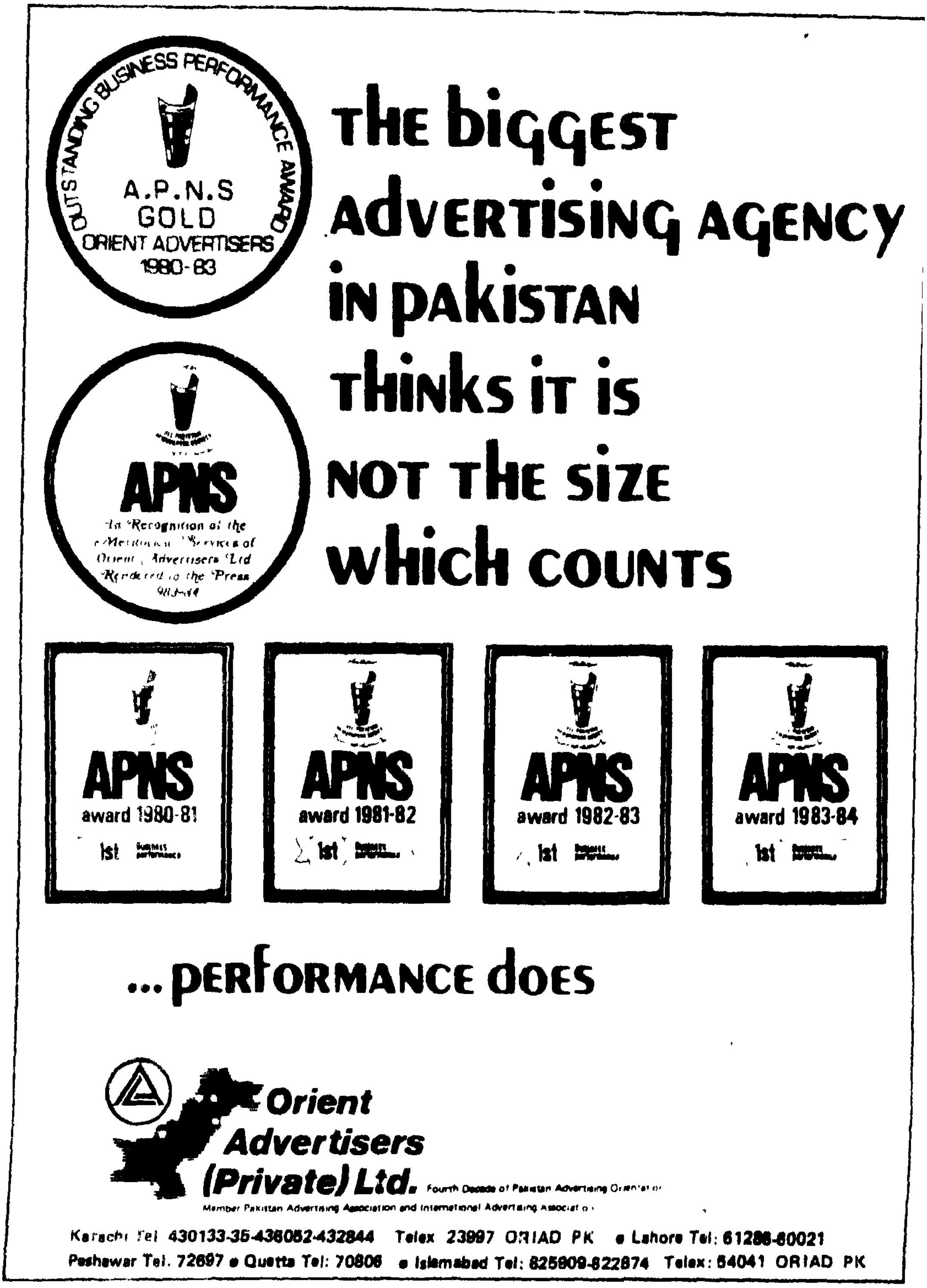




پاکستان نے تعلیم کے شعبے میں زبردست ترقی کی ہے۔
ہمارے سائنسدان، فنی مہارت اور پیشہ ورانہ صلاحیت رکھنے والے ذہین افراد
جدید علوم سے آراستہ ہو کر آج ملک کی ترقی و خوشحالی میں نمایاں کردار انجام دے رہے ہیں۔
یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ بھی مستحق طلبہ کو قرض حسنہ کی سہولت دے کر اعلیٰ تعلیم
کے شعبے میں اپنا ناچیز کردار ادا کر رہا ہے۔
یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ



سپریم
اپنے باغات کی تازہ چائے
بروک بانڈ کی سپریم ان لوگوں میں اپنے آپ کو پہلے ہی منوا چکی ہے جو
کم کوئی چیز قبول نہیں کرتے
ہمیشہ بروک بانڈ کے اپنے باغات کی تازہ سپریم، نمبر 1 کوالٹی چا طلب کریں
بروک بانڈ
سپریم
نمبر 1 کوالٹی چائے


OUTSTANDING BUSINESS PERFORMANCE AWARD
A.P.N.S
GOLD
ORIENT ADVERTISERS
1980-83
APNS
the biggest
advertising agency
in pakistan
thinks it is
not the size
which counts
APNS
award 1980-81
1st
APNS
award 1981-82
1st
APNS
award 1982-83
1st
APNS
award 1983-84
1st
...performance does
Orient
Advertisers
(Private) Ltd.
Member Pakistan Advertising Association and International Advertising Association
Karachi Tel 430133-35-436052-432844 Telex 23997 ORIAD PK • Lahore Tel: 61286-60021
Peshawar Tel. 72697 • Quetta Tel: 70806 • Islamabad Tel: 825909-822874 Telex: 54041 ORIAD PK

جاری شدہ ——— ۱۹۴۵ء
ٹیلیفون نمبر ——— ۲۱۴۰۷۹

نذر اختر حسین رائے پوری

افکار

— مدیر —

صہبا لکھنوی

— نمائندہ اعزازی —

راشد نور

قیمت

~~پینتالیس روپے~~ ۴۵

سعودی عرب اور
خلیجی ملکوں سے
۷۵ روپے

امریکہ، کنیڈا سے
۵ ڈالر
یورپین ملکوں سے
۴ پونڈ

مکتبہ افکار

اَلحَمدُلِلّٰہ
حبیب بینک
کیلئے ایک اور شرفِ اولیّت

ورلڈ بینک فارن کرنسی کریڈٹ لائن کے لئے پاکستان کے پہلے کمرشل بینک کی حیثیت سے منتخب کئے جانے کے بعد اب

حبیب بینک لمیٹڈ

ہی ملک کا وہ واحد کمرشل بینک ہے جسے

ایشین ڈویلپمنٹ بینک

نے نجی شعبہ میں درمیانے اور بڑے صنعتی اداروں کو ان کے پروجیکٹس کے لئے زرمبادلہ کے قرضہ جات دینے کے لئے منتخب کیا ہے۔

حبیب بینک ورلڈ بینک اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک کی کریڈٹ لائینز کے تحت اپنی اندرون اور بیرون ملک تمام برانچوں اور دفاتر کے ذریعے ایک ہی کاؤنٹر پر قرضہ جات کی مندرجہ ذیل سہولیتیں فراہم کررہا ہے:-

(۱) قرضہ جات زرمبادلہ (۱۱) قرضہ جات پاکستانی روپیہ (۱۱۱) لیٹرز آف کریڈٹ۔ ملکی و غیر ملکی (۱۷) کنسورشیم قرضہ جات (۷) برج فائنینسنگ (۷۱) گارنٹیز۔ ملکی و غیر ملکی۔ (۷۱۱) سپلائرز کریڈٹ۔

ان مراعات کی بدولت آپ

نئی صنعتوں کا قیام، قائم شدہ صنعتی اداروں کا بی ایم اینڈ آر اور مزید پھیلاؤ جن میں زرعی اجناس پر مبنی صنعتیں بھی شامل ہیں، توانائی، کان کنی اور معدنیات، انجینئرنگ، کیمیکلز، برآمدات اور متبادل درآمدات صنعتوں کا قیام عمل میں لاسکتے ہیں۔

ایشین ڈویلپمنٹ بینک کے ساتھ وابستگی ہمارے لئے باعث افتخار ہے۔

آیئے آپ ہمارے اشتراک و تعاون سے اپنے پروجیکٹس کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔

تفصیلات کے لئے ہمارے کسی بھی سرکل آفس یا سپروائزری ہیڈکوارٹر، سنڈیکیٹڈ لونز ڈویژن، حبیب بینک لمیٹڈ، ۱۶ حبیب بینک پلازہ، ہیڈ آفس، کراچی سے رجوع کریں۔

حبیب بینک لمیٹڈ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

(اقبالؒ)

ترتیب

سرِ ورق { پیرِ تحریر : عزیز دار آرٹسٹ
خطاطی : آذر [illegible] }

تبصرے۔ تذکرے

بازگشت

آئینہ خانے میں

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

بعض ادیب اپنی ادبی تحریروں کے ذریعے ہی شہرت کی وہ بلندیاں پا لیتے ہیں جو بہت سوں کو تمام زندگی میں پوری زندگی گزار کر بھی نہیں مل پاتیں۔ شاید یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ ان ادیبوں کی ... عصرِ حاضر کی دانش، حساس سمت آتا ہے اور کچھ اس طرح کہ یہ ادیب اپنے کارناموں کے باب میں شعوری بھی ... شعوری بات تک ... رہتے ہیں جو شعور کی ... رہتے ہیں ... نقطۂ نظر کی صداقت مسلم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بلاشبہ ایک ایسی نکتہ رس اور کارآمد شخصیت ہیں جو نہ صرف اپنے عہد کی عہد فکر ... سے ہم رشتہ رہنے کی فکری ... عہد میں مصروف رہے ہیں اور بعد عجب نہیں کہ ان کی فکری جہتوں نے اپنے وقت کے تقاضوں کا بھرپور ساتھ دے کر پوری نسل کی کم گوئی کا ... کر دیا۔

ڈاکٹر رائے پوری کے مضمون "ادب اور زندگی" سے ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز کے سرمائے کا کردار ادا کیا ہے۔ یہ مضمون ترقی پسند تحریک کے پس منظر کے مطالعے میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اپنے سالِ اشاعت سے لے کر اب تک ... چند نکات پر اختلافِ رائے کے باوجود کچھ اس طرح حاوی ہے کہ ۱۹۷۶ء میں بھی اس مضمون کی بنیادی باتوں سے انکار ممکن نہیں ہے۔ "ادب اور زندگی" جولائی ۱۹۳۵ء کے رسالہ ... میں شائع ہوا تھا۔ "ادب اور انقلاب" کے نام سے ڈاکٹر صاحب کا تعارف کراتے ہوئے ... کیا تھا۔

یہ مبالغہ نہیں کہ ... ترقی پسند شاعری کے لیے کسی تحریر نے ... تنقید کو اس حد تک متاثر نہیں کیا ... اختر حسین رائے پوری نے اس مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ترقی پسند تحریک کے فروغ کے سبب ... ذکر ... آخر عمر میں پریم چند کے آرٹ کا اعلا اقبال کی جلالت" ادب اور زندگی کی اشاعت، ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا قیام، قاضی نذر الاسلام کی نظموں کے تراجم، یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ملک کی روز افزوں اشتراکی تحریک سے ... بہت متاثر ہوئی۔"

اردو ادب کے جدید رجحانات "ادب اور انقلاب" ص ۷۵، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے اس مضمون میں لینن، گورکی، ٹالسٹائی اور رومین رولاں وغیرہ کی تحریروں کے حوالے جا بجا ملتے ہیں اور اس مضمون کا سب سے پُرمغز حصہ وہ ہے جس میں مصنف نے ... ادبِ ہند کا معاشی تجزیہ کیا ہے۔ سنسکرت، ہندی، بنگالی، گجراتی اور متعدد زبانوں کے ادب کے مطالعے کا جوہر اس سے بیشتر اردو تنقید کے کسی مضمون میں نظر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے کہ اختر حسین رائے پوری نے اپنی پہلی گراں قدر تحریر میں اردو کو دیگر ہندوستانی زبانوں کے ادب اور عالمی ادب سے کچھ اس طرح ہم رشتہ کیا ہے کہ ان کے زاویۂ نگاہ پر عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کے نزدیک ہندوستانی زبانوں میں صرف نذر الاسلام کی شاعری کا رنگ و آہنگ عہدِ حاضر کی جذباتی کشمکش کی ترجمانی کرتا ہے۔ اردو میں جدید انگریزی، فرانسیسی، روسی اور چینی، امریکی، اطالوی زبان کے افسانوی ادب کے ترجمے کی داغ بیل خواجہ منظور حسین، سید مطلبی فرید آبادی، محمود جالندھری، احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری،



مشتاق نجفی، ظ۔ انصاری، بلال احمد، ابن انشا، شمس راج رہبر، محمد احمد سبزواری، جلیل قدوائی، منصور احمد، منٹو اور شاہد احمد دہلوی وغیرہ نے ڈالی اور ان افسانوں کے تراجم نے ہمارے یہاں حقیقت نگاری کے رجحان کو فروغ دیا۔ اختر حسین رائے پوری اس قافلے کے شہسواروں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے حقیقت پسندانہ ادب کی ترویج کے لیے بہت بنیادی کردار انجام دیا ہے۔ ــــ ہم ابھی تک اردو ادب کے ذخیرے میں ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۵ء تک شائع ہونے والے تراجم پر پوری طرح توجہ نہیں کر سکے ہیں۔ ترقی پسند ادبا کی بھی معتدبہ اکثریت اپنی سہل انگاری کے باعث ترقی پسند ادب کی ابتدا "انگارے" کی سالِ اشاعت سے کرتی ہے۔ "انگارے" کے مصنفین اپنی کاوش کے بارے میں خاصے شعوری تھے، لیکن بنگالی ادب کے اردو زبان میں ترجمہ ہونے والے ان ورجنوں تراجم کے بارے میں کب تک خاموشی اختیار کی جائے گی۔ مثلاً سرت چندر بوس کی تصانیف کے تراجم ــــ بعض تراجم میں ہندوستانی سماج کے ایک حصے کے اندر آہستہ آہستہ در آنے والی تبدیلیوں کی اس انداز سے مرقع نگاری کی گئی تھی کہ "انگارے" کے مصنفین بھی اس رد سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ "انگارے" کے مصنفین نے جس اہم کام کو قدرے اکھڑے پن کے ساتھ انجام دیا تھا اس کام کو بنگالی زبان سے ترجموں نے اسی قدر زیادہ بہتر طور پر انجام دیا تھا اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم "انگارے" سے بہت پہلے پریم چند کی تخلیقات سے کیوں کر پہلو تہی کر سکتے ہیں۔ "انگارے" کی تاریخ ساز اہمیت اس مجموعے کی اپنی جگہ مسلم ہے لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ محلِ نظر ہے کہ "انگارے" کے مصنفین کا فلسفۂ حیات ان کی ایک ایک سطر سے عیاں ہے۔ اگر "انگارے" کے مصنفین کا ایک حد درجہ ریاکار معاشرے سے سابقہ نہ پڑتا اور وہ بلا جواز غیر متناسب ردّعمل کا شکار نہ ہوئے ہوتے تو "انگارے" جیسی کتاب بہت زیادہ وقیع نہ ٹھہرتی۔

بعض تصانیف کی قبولیت یا عدم مقبولیت مصنفین کی خوبیوں اور خامیوں سے زیادہ قارئینِ ادب کی فکری سطح اور سماجی مسائل سے آگہی اور ان کے بارے میں کمٹ منٹ کی سطح سے متعین ہوتی ہے۔ "انگارے" کے ساتھ ہی ساتھ اختر حسین رائے پوری بھی ترقی پسند افکار سے متاثر نظر آتے ہیں

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور اردو ادب گزشتہ نصف صدی سے ایک دوسرے کے ساتھ اس درجہ اور ہمہ وقت ہم رشتہ رہے ہیں کہ ان کی ذات میں "بنگال" اور "ہندوستان" جدا جدا بھی نظر آتے ہیں اور ایک ساتھ بھی اپنی سوانح عمری "گرد راہ" میں وہ بنگال کے فیضان کا بھرپور اعتراف کرتے ہیں اور یہ بات کچھ کم اہم نہیں ہے کہ وہ ایک طرف گورکی کے مترجم بھی ہیں اور دوسری طرف قاضی نذر الاسلام کی انقلابی شاعری کے بھی۔

قاضی نذر الاسلام کی شاعری کے اردو ترجمے ہی نے جوش پر یہ حقیقت روشن کی کہ انقلابی فکر اور جاگیردارانہ مزاج ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ الغرض تخلیق کی بازی ہو یا تحقیق کا سودا، اختر حسین رائے پوری ہمیں ایک منزل کے بعد دوسری منزل کچھ اس سرخوشی کے ساتھ طے کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ معاً یہ خیال گزرتا ہے کہ کیا اختر حسین رائے پوری کی نسل کے ادیبوں میں کوئی ان سے زیادہ ہمہ جہت شخصیت موجود تھی یا ہے۔ جواب ملتا ہے کہ شاید ایسا نہیں ہے۔

اختر حسین رائے پوری کی شخصیت کے بارے میں غور کرتے ہوئے معاً یہ خیال گزرتا ہے کہ ترقی پسند تحریک

کی گولڈن جوبلی منعقدہ کراچی میں اختر حسین رائے پوری کے بارے میں تحریک کے حوالے سے جملہ اختلافات کیوں بالائے طاق رکھ دیے گئے تھے۔ جب یہ روشن ضمیر اور روشن ذہن شخص گولڈن جوبلی تقریب کے افتتاحی اجلاس کے پریسیڈیم میں شمولیت کے لیے ایک ہاتھ میں عصا تھامے اور دوسرا ہاتھ اپنے ایک پرانے رفیق سید انور کے ہاتھ میں دیے آگے بڑھ رہا تھا تو جدید اردو ادب کے پچاس سال کی تاریخ تھوڑی دیر کے لیے ساکت سی ہوگئی تھی۔ وہ کون سے انقلابات تھے جو اس نابینائی میں پوری طرح روشن نہ تھے۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوا کہ جو وصف اس شخص کو دوسرے معاصرین سے ممیز کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اختر حسین رائے پوری کی فکر مسلسل مائل بہ ارتقا ہے "گردِ راہ" میں انھوں نے ترقی پسند تحریک سے اپنے رشتۂ موالست اور انحراف کا سچا اور سیدھا گراف از خود پیش کر دیا ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے علامہ اقبال کی فکر سے اپنے اختلافی محاکے پر بعد کے مطالعے کی روشنی میں جس طرح نظرِ ثانی کی ہے وہ شاید ابھی تک بعض شارحینِ اقبال پر روشن نہیں ہے جس سے ان شارحین کی کم نظری کے سوا اور کیا ثابت ہوتا ہے۔ اگر یہ شارحین بعض ہم عصر ادیبوں کی علامہ اقبال کے بارے میں اسی نوع کے رویے کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں اور اختر حسین رائے پوری کو بطورِ خاص نشانۂ ہدف بنانا چاہتے ہیں تو اسے ان کی مجبوری یا اختیار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نوع کی متعصبانہ روش پورے ادب و سیاست میں روبہ عمل آتی ہی رہتی ہے لیکن علم و ادب کے میدان میں اس نوع کے مناظر سوہانِ روح سے کم نہیں۔

اختر حسین رائے پوری کے نصف صدی پر محیط ادبی کارنامے برصغیر میں روشن خیالی کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے گزشتہ چند برسوں میں غیر جمہوری اندازِ نظر کی یورش سے جس فکری پختگی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے اور جس طرح تجزیاتی بصیرت کو غیر تجزیاتی بصارت کا نعم البدل بنایا ہے وہ اپنی جگہ ایک کارنامہ ہے۔ "گردِ راہ" محض ان معنوں میں اردو کے سوانحی ادب میں اضافہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی مدد سے ایک اہم ادیب کی سوانح سے وہ دبیز پردے ہٹا دیے گئے ہیں جن کے ہوتے ہوئے اختر حسین رائے پوری تک رسائی ناممکن تھی۔ کروچے نے اپنی مشہورِ زمانہ سوانح کے بارے میں لکھا تھا:

"میں اپنی سوانح تحریر نہیں کروں گا کہ سوانح تو کسی شخص کی زندگی کا مرقع ہوتی ہے جن کے ساتھ اس نے کام کیا اور وقت گزارا ہو۔ لوگ ان روئیدادوں کو اس لیے قلم بند کرتے ہیں کہ آئندہ نسلوں کے لیے کچھ اہم حقائق محفوظ کر دیے جائیں۔ ورنہ کہیں وقت کی دست درازی انھیں محو نہ کر دے۔ لیکن میری زندگی کی روداد میں جو چیز محفوظ ہونے کے لائق ہے وہ صرف میری تحریروں کی توقیط اور کتابیات ہے۔ میں نے کسی اور میدان میں کوئی اور کام نہیں کیا ہے اس لیے مجھے افراد اور اشیا کے بارے میں بہت کم کہنا ہے یا پھر کچھ نہیں کہنا۔ بہرحال میری کوشش ہوگی کہ میں سادہ اور صاف انداز میں اپنے اوپر تنقید کروں یا خود نوشت لکھوں۔ ایک ایسی خود نوشت جس کا جواز یہ ہو کہ وہ علم کے سرمائے میں میری طرف سے کسی اضافے کا باعث ہو سکے۔"

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی یادداشتیں خود تنقیدی کے ذیل میں بھی آتی ہیں اور علم کے مشترک سرمائے میں اضافے کے سبب بھی بنتی ہیں۔ اختر حسین رائے پوری نے بھی کروچے کی طرح اس خیال کے پیچھے پناہ لی ہے کہ ہر آدمی علم کے مشترک سرمائے میں اضافہ کرتا ہے۔ انھوں نے حال کی روشنی میں ماضی کو نشانۂ تنقید بنایا ہے، لیکن اپنے حال کی روشنی میں مستقبل پر حکم لگانے سے عمداً پرہیز کیا ہے۔ یہی وہ عالمانہ شان ہے جس کی بدولت اب یہ خاصا مشکل ہو چکا ہے کہ اختر حسین رائے پوری سے اقبال کے بارے میں ان کی جرأتِ اظہار کا جواب طلب کیا جائے یا ان کے یہاں

ترقی پسند تحریک کے بارے میں اتار چڑھاؤ پر بحث کی جائے وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ زندگی اور اس کے ارتقائی عمل پر یقین رکھتے ہیں وہ ان کٹر صف [illegible] ادیبوں کی صف میں نہیں ہیں جنہیں ترقی پسندوں پر حملہ کرتے وقت اپنے اردگرد [illegible] [illegible] عقیدت میں تو گزرنا بھی تنگ [illegible] کا احساس ہوتا ہے [illegible] حب الوطنی اور حد [illegible] وہ فرقہ وارانہ [illegible] کے جابرانہ نظام کا صرف اس لیے حامی نہیں [illegible] اس نظام کے [illegible] مذہب اور ملک سے جھوٹی [illegible] "محبت" کے نام پر جبر و استبداد کے بیج [illegible] کی خواہاں ہے۔ مقام مسرت ہے کہ [illegible] کے لیے کوئی مجبوری نہیں رہی ہے۔ آج کل ہماری صفوں میں [illegible] ہیں جو بنیادی طور پر فاشی غیر جمہوری [illegible] عناصر کے حامل ہیں یہ لوگ خود کو [illegible] جمہوریت اور انصاف پسند طاقتوں کا ساتھ [illegible] ہیں اور اس حقیقت [illegible] وہ جس نوع کی حب الوطنی کا دفاع کرتے ہیں اس کے [illegible] ہر دور میں عوام [illegible] جمہوری حقوق پامال [illegible] رہے ہیں بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کام اب اس قدر آسان نہیں [illegible]

[illegible] دیکھ سکنے کی [illegible] غیظ و غضب سے [illegible] ہے کہ [illegible] غاصب طاقتوں کے دلیل اور ان طاقتوں [illegible] ڈاکٹر احمد حسین [illegible] کے باوجود انسان دشمن نا دہلیوں کی باج گزاری کے مصدقہ [illegible] جس واضح بیزاری کا ثبوت دیا ہے وہ بعض نکات پر ان سے اختلافات کے باوجود لائق احترام ہے اُن کی ذات مصلحت کوشی کے بجائے [illegible] کام [illegible] وہ [illegible] مقام [illegible] جہاں [illegible] رہتی ہے۔ اور جس کا لمحہ آئندہ بہر صورت موجود [illegible] یہ کھلی بات ہے کہ [illegible] آمدہ سحر میں ماضی اور حال کی صداقتیں بھی شامل ہوتی ہیں اور ڈاکٹر [illegible] حسین [illegible] نے ساری عمر اس زندگی اور انقلاب کی حسن کاری کے نغمے گائے ہیں۔ آیئے آج ایک نغمہ احمد حسین [illegible] کے لیے بھی۔ ہم سب کی طرف سے۔ افکار کی جانب سے یہ خصوصی شمارہ [illegible] نذر [illegible] حسین رائے پوری [illegible] اردو کے اس جید ادیب و دانشور کے حضور اسی نغمے کا وہ ارتعاش ہے جس کی اہمیت آج سے زیادہ آنے والے کل میں محسوس کی جائے گی۔

— محمد علی صدیقی

(مہمان مدیر)

صہبا لکھنوی

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

(زندگی، شخصیت اور فن کا مستند جائزہ)

ملیے اُس شخص سے جو آدم ہووے ناز اُس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرمِ سخن تو گرد آوے یک خلق خاموش رہے تو ایک عالم ہووے (میر تقی میر)

تاریخ پیدائش :	۱۲ر جون ۱۹۱۲ء
بمقام :	رائے پور (سی۔ پی)
آبائی وطن :	عظیم آباد (پٹنہ)
خاندانی نام :	سید اختر حسین
معروف ادبی نام :	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

اب و جد

والد ــــ سید اکبر حسین
دادا ــــ سید شجاعت حسین
پردادا ــــ میر وارث علی

وراثتِ شعر و ادب

بڑے بھائی سید مظفر حسین شمیم ادیب و شاعر تھے۔

ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم

۱۹۱۷ء ــ میونسپل پرائمری اسکول۔ رائے پور
۱۹۲۸ء ــ میٹرک۔ گورنمنٹ ہائی اسکول۔ رائے پور
۱۹۳۱ء ــ انٹر۔ ودیا ساگر کالج ــ کلکتہ
۱۹۳۳ء ــ بی۔ اے۔ مسلم یونیورسٹی ــ علی گڑھ
۱۹۳۴ء ــ سنسکرت میں ساہتیہ النکار کی سند بنارس سے حاصل کی
۱۹۳۵ء ــ ایم۔ اے (تاریخ) مسلم یونیورسٹی ــ علی گڑھ
۱۹۳۷ء ــ پیرس یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے داخلہ لیا
۱۹۴۰ء ــ "ہند قدیم کی سماجی تاریخ" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

عملی زندگی

۱۹۳۵-۳۶ء انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد میں مولوی عبدالحق کے ادبی معاون رہے۔
۱۹۴۰-۴۲ء ـ پیرس سے واپسی کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے نیوز ڈیپارٹمنٹ کی غیر ملکی نشریات کے نگران اور ہندستانی لغت کمیٹی کے صدر رہے۔
۱۹۴۲-۴۵ء ـ ایم۔ اے۔ او۔ کالج۔ امرتسر میں وائس پرنسپل اور تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔
۱۹۴۵ء ـ میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن حکومت ہند نے برطانوی مشیر تعلیم سرجان سارجنٹ کے معاون کی حیثیت سے آپ کا تقرر کیا۔
۱۹۴۷-۵۵ء ـ قیام پاکستان کے بعد حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم سے منسلک ہوئے اور نائب مشیر تعلیم، ڈپٹی سکریٹری اور صدر ثانوی تعلیمی بورڈ کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔
۱۹۵۶-۶۴ء ـ میں اقوام متحدہ کے ادارے یونسکو سے وابستہ ہوئے۔ ابتداً پیرس میں شعبۂ ترقی ثقافت کے ناظم بعد ازاں علاقائی دفتر امور ثقافت برائے ایشیا کے دفتر واقع کراچی کے سربراہ رہے۔
۱۹۶۵-۶۶ء ـ میں یونسکو کے نمائندے کی حیثیت سے صومالیہ میں تعینات رہے۔
۱۹۶۷-۷۰ء ـ میں یونسکو کے نمائندے کی حیثیت سے ایران میں خدمات انجام دیں۔
۱۹۷۱-۷۲ء ـ میں یونسکو کے شعبۂ تعلیم میں افسر بکار خاص کی حیثیت سے پیرس میں تعینات رہے۔
۱۹۷۲ء ـ کے آخر میں ریٹائر ہوئے۔ یونسکو کا ایک ڈیولپمنٹ پروگرام جسے اب عالمی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی داغ بیل کا سہرا آپ کے سر ہے۔
۱۹۷۶-۷۹ء کے دوران جامعہ کراچی میں شعبۂ تاریخ کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔

شادی

۲۲ دسمبر ۱۹۳۵ء کو حمیدہ بیگم بنت ظفر عمر (مشہور مصنف ـ نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری وغیرہ) سے ہوئی۔

بچے

کامران حسین ــــ (ذاتی بزنس)
سلمان حسین ــــ (اے۔ پی۔ پی)
عرفان حسین ــــ (اکاؤنٹنٹ جنرل سندھ)
نوید حسین ــــ (آرکیٹکٹ)
شاہد حسین ــــ (امریکہ کی ایک تجارتی فرم سے منسلک ہیں)

علم و مطالعہ ـ اکتساب فیض

(یورپین مصنفین) شیکسپیر، چارلس ڈکنس، ٹامس ہارڈی ـ برنارڈ شا ـ برٹرینڈ رسل۔ گبن ـ کارل مارکس ـ ٹالسٹائی ـ دستووسکی۔ چیخوف میکسیم گورکی ـ ٹامس مان ـ بالزاک سارتر ـ پروست ـ ڈی ایچ لارنس ـ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ـ الڈس ہکسلے ـ خالدہ ادیب خانم (فارسی)
حافظ شیرازی ـ رومی ـ بیدل ـ صائب ـ (اردو) میر ـ نظیر ـ غالب ـ اقبال ـ مولوی عبدالحق ـ سر عبدالقادر ـ سروجنی نائیڈو ـ ڈاکٹر ذاکر حسین ـ
ابو الکلام آزاد ـ پنڈت سندر لال ـ پریم چند ـ (بنگالی) ٹیگور ـ قاضی نذر الاسلام ـ (سنسکرت ـ ہندی) کالی داس ـ بہاری ـ کبیر داس ـ (گجراتی) اردشیر خبردار۔

پہلا تاریخی مضمون

ادبی سفر کا آغاز ہندی زبان سے کیا۔ پہلا مضمون "تیموریہ گھرانے کی آخری جھلک" ۱۹۳۱ء میں کلکتے کے مشہور ماہنامہ "وشال بھارت" میں شائع ہوا۔ اسی سال اس کا اردو ترجمہ "ریاست" دہلی میں چھپا اور شہرت کا آغاز ہوا۔

ادارت

۱۹۲۸-۳۰ء ـ ہندی روزنامہ "وشوامتر" کلکتے کے سب ایڈیٹر رہے۔

۱۹۴۲-۴۳ء۔ پنڈت سندر لال کی اسیری کے دوران اُن کی خواہش پر ماہنامہ "وشوانی" الہ آباد کے اعزازی مدیر کے فرائض انجام دیے۔

۱۹۵۹-۶۲ء۔ یونسکو کے سہ ماہی بلیٹن۔ یونسکو نیوز بلیٹن کے مدیر رہے۔

فلمی دنیا سے تعلق

۱۹۴۰ء۔ میں دیویکا رانی نے بمبئی اسٹوڈیوز میں چیف سینریو رائٹر کی پیش کش کی جسے بوجوہ قبول نہیں کر سکے۔

۱۹۴۴ء۔ میں پنچولی اسٹوڈیوز کی فلم "دکیسے کہوں" کے مکالمے تحریر کیے۔

سفر و سیاحت

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی زندگی کا بڑا حصہ سفر اور سیاحت میں بسر ہوا۔ برصغیر پاک و ہند کے تقریباً تمام شہروں کے علاوہ آپ نے جن ممالک کا سفر کیا اُن میں انگلستان، فرانس، بلجیم، ہالینڈ، اسپین، اطالیہ، سوئٹزرلینڈ، مالٹا، ہنگری، آسٹریا، یونان، ترکی، لبنان، جنوبی یمن، بحرین، مصر، صومالیہ، تنزانیہ، کینیا، یوگنڈا، ایران، افغانستان، نیپال، سری لنکا، بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) برما، تھائی لینڈ، ملیشیا، سنگاپور، انڈونیشیا، ہانگ کانگ، جاپان، امریکہ اور کیوبا شامل ہیں۔

ہشت زبان

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو قدرت نے نئی زبانیں سیکھنے اور اُن پر عبور حاصل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ودیعت کی ہے چنانچہ جن زبانوں کو آپ نے ذوق و شوق سے سیکھا اور اُن پر عبور حاصل کیا اُن میں اُردو۔ فارسی۔ انگریزی۔ فرانسیسی۔ ہندی۔ سنسکرت۔ بنگالی اور گجراتی قابلِ ذکر ہیں۔

پہلا افسانہ

زبانِ بے زبانی۔ ۱۹۳۴ء میں ماہنامہ نگار۔ لکھنؤ میں شائع ہوا۔

بین الاقوامی حیثیت

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی کئی تحریریں بالخصوص افسانوں کے تراجم یورپ اور ایشیا کی کئی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے وابستگی

۱۹۳۵ء۔ میں سید سبط حسن اور مخدوم محی الدین کے تعاون سے نوجوان ادیبوں کی انجمن حیدر آباد دکن میں قائم کی۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد نوجوانوں کی انجمن کے نام کو انجمن ترقی پسند مصنفین میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے پہلے جلسے کی صدارت مسز سروجنی نائیڈو نے کی تھی۔

پہلا ترجمہ

قاضی نذر الاسلام کی نظم "بدروہی" کا ترجمہ بعنوان "باغی" ۱۹۳۱ء میں ہفت روزہ "پیام" کلکتے میں شائع ہوا اس اخبار کے مدیر عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔

پہلا تنقیدی مضمون

"ادب اور زندگی" جولائی ۱۹۳۵ء میں رسالہ اردو۔ اورنگ آباد میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔

صبا لکھنوی

۱۹۴۳-۴۵ء — انجمن ترقی پسند مصنفین - امرتسر کے صدر رہے۔

۱۹۴۶-۴۷ء — میں انجمن ترقی پسند مصنفین - دہلی کے صدر رہے۔

۱۹۸۶ء — ۲ر مارچ کو ترقی پسند ادبی رگولڈن جوبلی) کانفرنس کے افتتاحی اجلاس منعقدہ کراچی کے پریسیڈیم میں شامل ہوئے - اس کانفرنس کا افتتاح پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے فرمایا۔

آگ اور آنسو

طبع زاد ہندی افسانوں کا مجموعہ جو پہلی بار ۱۹۴۳ء میں دہلی سے شائع ہوا اور جس کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اختر حسین رائے پوری

مطبوعہ تصانیف

تنقید:
- ادب اور انقلاب - ۱۹۴۳ء
- روشن مینار - ۱۹۵۲ء

افسانے:
- محبت اور نفرت - ۱۹۳۸ء
- زندگی کا میلہ - ۱۹۵۷ء

پہلا نثری مجموعہ

محبت اور نفرت - ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔

تراجم:
- شکنتلا ——— ۱۹۳۹ء
- پیام شباب ——— ۱۹۴۰ء
- گورکی کی آپ بیتی — (تین جلدیں)
  - الف - میرا بچپن ——— ۱۹۴۱ء
  - ب - روٹی کی تلاش - ۱۹۴۲ء
  - ج - جوانی کے دن - ۱۹۴۵ء
- پیاری زمین / گڈ ارتھ - پرل بک } ۱۹۴۱ء

ترتیب و تالیف:
- حبش و اطالیہ ۱۹۳۵ء
- مقالات گارساں دتاسی (ربہ تعاون عزیز احمد) ——— ۱۹۴۳ء

"گرد راہ" کی مقبولیت

بصارت سے محرومی کے باوجود آپ نے اپنی خود نوشت "گرد راہ" کو سات سال میں مکمل کیا۔ اس کی ابتدائی چند قسطیں افکار میں چھپی تھیں۔ مکتبۂ افکار نے "گرد راہ" کو حسن و اہتمام سے شائع کیا۔ پہلا اڈیشن صرف تین ماہ میں ختم ہو گیا اور مانگ جاری رہی چنانچہ دوسرا اڈیشن شائع کیا گیا۔

"گرد راہ" پر — فیض کا آخری اظہارِ خیال

"ادیب، ناقد، عالم، معلم ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں میں قریب قریب نصف صدی سے آشنا اور معتبر ہے۔ آپ نے ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دنوں میں اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا اور اس تحریک کے ابتدائی دنوں میں اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا اور اس تحریک کے سربرآوردہ اراکین میں شامل ہے مشرق و مغرب کے مختلف علوم و السنہ میں استعداد پیدا کی۔ کچھ عرصہ بعض اداروں میں تعلیم و تدریس سے منسلک رہے بعد ازاں بین الاقوامی علمی اور ثقافتی تنظیم یونسکو کے عہدے دار کی حیثیت سے مختلف ممالک میں مصروف کار رہے اور دلیس پردیس کے ادبی مشاہیر سے دوستانہ کیا۔ غرض گزشتہ نصف صدی کی علمی، ادبی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کے مختلف شعبوں کا مختلف مقامات پر غائر نظر سے مشاہدہ کیا۔ اب کشاکش روزگار سے فراغت کے بعد آپ نے اس بھرپور زندگی کے تجربات اور مشاہدات کی یادداشتیں رقم کی ہیں۔ "گرد راہ" کے صفحات میں ہمارے عصری دور کا یہ منظر نامہ پڑھنے والوں کے لیے یقیناً دلکش اور بصیرت افروز ثابت ہوگا۔"

مستقل پتہ: - ۱۵۳/ ابل بلاک نمبر ۲ پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی نمبر ۲۹

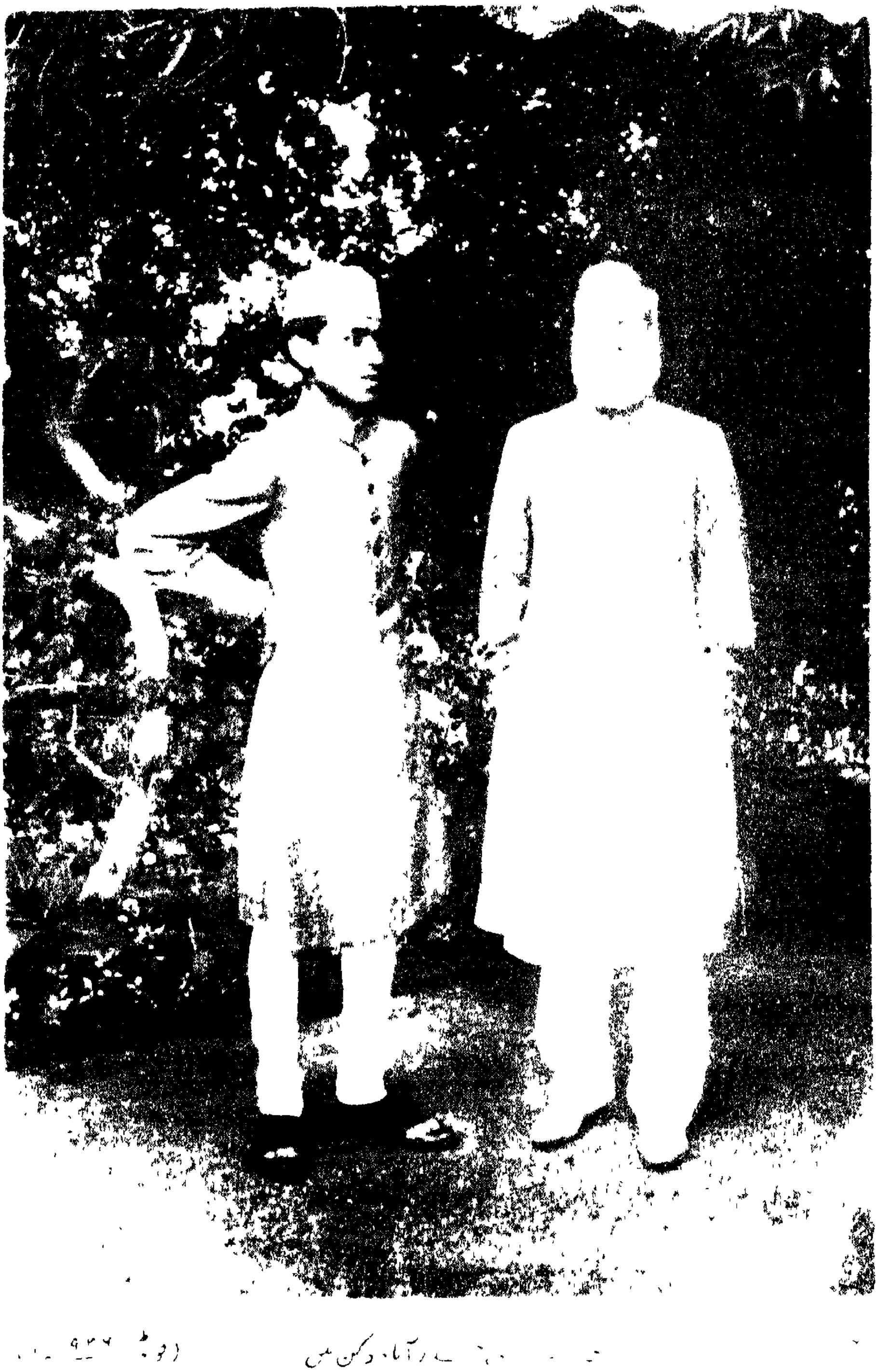


دوران طالب علمی پٹنے میں (فوٹو ۱۹۳۰ء)



ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری (فوٹو ۱۹۶۲ء)





رآباد دکن میں ... (جو ۹۲۷

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ... کے ساتھ



(دائیں سے) ممتاز حسین، انصار ناصری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ... احمد دہلوی ... ۱۹۳۶ء



اختر حسین رائے پوری اور بیگم حمیدہ [illegible] (۲ر فروری ۱۹۳۶ء)



شادی کے فوراً بعد ... ملتے ... لی تھی۔
اختر حسین ... المطلب ... مولوی لشیا الدین ... اشرف
سید سجاد ... اور ... (فوٹو ... دسمبر ۱۹۳۵ء)



... (فوٹو ۱۹۳۶ء)



ڈاکٹر اختر حسین اپنی اہلیہ حمیدہ بیگم اور فرزندوں کے ساتھ کراچی میں (فوٹو: ۱۹۵۵ء)



ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ۔ بحیثیت صدر اسٹوڈنٹس یونین ایم اے او کالج امرتسر میں اراکین کے ساتھ (فوٹو: ۱۹۳۲ء)

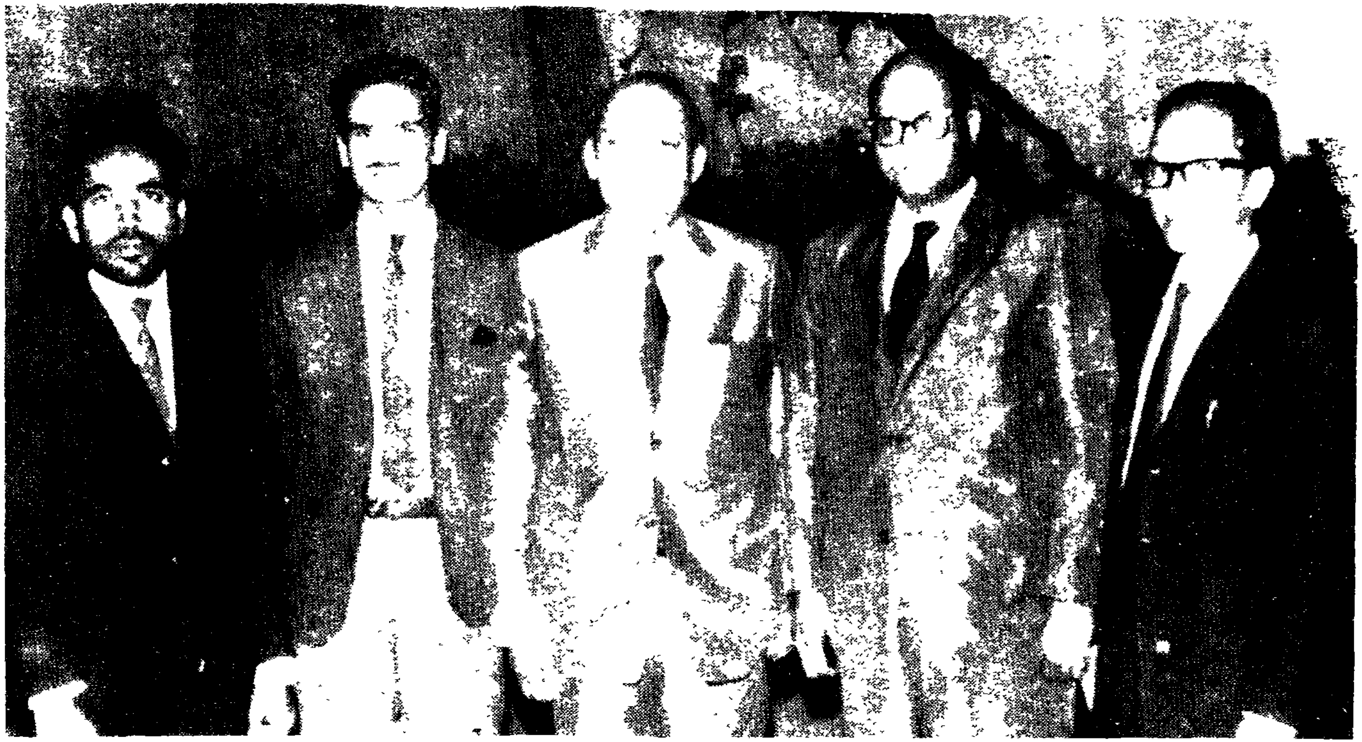





chner Hofbräuhaus







[illegible]

[illegible]

[illegible]



[illegible]

[illegible]



[illegible]

...ی کے مختلف ادوار میں





ی ... ال ...
... ز سا
... سا کا
...



... کشمیر میں کو ...
... ہوئے
... ۱۹۴۲



... حسین ...
... بمبئی ...
... کاں کے ساتھ
... ۱۹۴۲ ...





سیّد سبطِ حسن

الطاف فاطمہ

سیّد انور

ڈاکٹر اسلم فرخی

ڈاکٹر کلیم سہسرامی

قمر ہاشمی

محمد عصام عظیم آبادی

شخصیت کی چند جھلکیاں

نذر اختر حسین رائے پوری ایسی تاریخ ساز پیش کش پر

دلی مبارکباد

منجانب

میسرز سارڈینیہ لمیٹڈ

(درآمد کنندگان اور مینوفیکچررز کے نمائندگان)

نجمی بلڈنگ ۔ فریئر روڈ۔ کراچی

سید سبط حسن

میرے دوست اختر حسین رائے پوری

دوستی کسی قانون یا منصوبے کی پابند نہیں ہوتی بلکہ محبت کی طرح لبس ہوجاتی ہے۔ پھر طالب علمی کے زمانے کی دوستیاں، وہ تو
راسر اتفاقی ہوتی ہیں۔ مثلاً اختر حسین رائے پوری اور ہم اگر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دو سال تک ایک ہی بورڈنگ میں نہ رہے ہوتے تو عین
ممکن ہے کہ اُن سے صاحب سلامت کی بھی نوبت نہ آتی۔ البتہ ہم ایک دوسرے سے کب ملے، کیسے ملے اور کیوں ملے؟ مجھ کو یاد نہیں شاید
سی دن ڈائننگ ہال میں پاس پاس بیٹھ گئے ہوں، شاید کسی مشترک دوست نے ملوا دیا ہو، یا شاید کسی سے یہ سُن کر کہ اختر کا مضمون شائع ہوا
ہے اور وہ ہندی میں کہانیاں لکھتے ہیں ایک عجوبہ شخص سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا ہو۔ غرض کہ دوستی کی ابتدا کا سبب کچھ بھی رہا ہو
مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوستی میں استحکام کا باعث خیالات کی ہم آہنگی تھی۔

بعض لوگوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ ہفتوں سے پانی کے قریب نہ گئے ہوں۔ اس کے برعکس بعض چہروں پر ہر وقت ایک
تازگی، ایک پاکیزگی نظر آتی ہے جیسے ابھی ابھی غسل خانے سے نہا کر نکلے ہوں۔ اختر کا چہرہ آج بھی ویسا ہی صاف ستھرا دُھلا دھلایا ہے جیسا
چالیس سال پہلے تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، بھرے بھرے گال، چوڑی پیشانی، کھلتا ہوا گندمی رنگ، لہجے میں خود اعتمادی اور چال
ڈھال میں پھُرتی۔ یہ تھا اختر کا حُلیہ جوانی میں اور صحت کی خرابی کے باوجود وہ آج بھی ذہنی اور جسمانی طور پر اُتنے ہی مستعد ہیں جتنے پہلے
تھے۔ ملا سیت سے ان کو پہلے بھی چڑھ تھی آج بھی ہے۔ کٹر پنتھیوں کو خواہ وہ دائیں بازو کے ہوں یا بائیں بازو کے انھوں نے کبھی پسند
نہیں کیا۔ کم آمیز وہ پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ لیکن آدم بیزار وہ کبھی نہ تھے۔ زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونا اُن کو خوب آتا ہے،
لیکن انھوں نے ان مسرتوں کو زندگی کا مقصد کبھی نہیں بنایا۔ وہ خوش خوراک بھی ہیں اور خوش پوشاک بھی۔ نفاست پسندی اُن کی
فطرت میں داخل ہے۔ نودولتیوں اور گھمنڈیوں سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ رسمی محفلوں سے جن میں مصنوعی مسکراہٹوں سے سابقہ پڑے
وہ گھبراتے ہیں، البتہ بے تکلف احباب کی صحبت میں اُن کے مزاج کی شگفتگی کھِل اٹھتی ہے۔ نام و نمود کی ہوس نے اُن کو کبھی نہیں ستایا،
نہ انھوں نے کبھی تعلقات عامہ کی دکان سجائی۔ جو شہرت ملی وہ کسی کی ستائش یا سفارش سے نہیں ملی بلکہ ان کے فن کی نمود واقعی
اُن کے خونِ جگر کا کرشمہ ہے۔

اختر حسین رائے پوری کلکتے کی ہنگامہ خیز فضا سے نکل کر علی گڑھ آئے تھے۔ اُس کلکتے سے جو مدت سے انقلابی تحریکوں کا
مرکز تھا، جہاں وہ زندگی کے بے شمار تلخ و شیریں تجربوں سے گزرے تھے اور جہاں اُن کا ادبی اور سیاسی شعور جوان ہوا تھا۔ اُن کا شمار

اُس وقت بھی ہندی کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ لیکن انھوں نے ہم لوگوں پر اپنی لیاقت کا رعب کبھی نہیں ڈالا اور نہ اپنی کلکتے کی زندگی کے قصے کبھی سنائے۔ البتہ وہ قاضی نذرالاسلام کا ذکر بڑے پیارے کرتے۔ اس آتش نوا شاعر کا ذکر کرتے کرتے اُن پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا اور وہ کہتے "تم لوگ جو ٹیگور کا دم بھرتے ہو نذرل کی نظمیں سنو گے تو ٹیگور، اقبال سب کو بھول جاؤ گے۔ اور تب وہ نذرل کی نظمیں لہک لہک کر سناتے۔ پھر ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ اردو میں بھی افسانے لکھنے لگے جو نگار اور ساقی میں چھپتے تھے۔ یہ امتیاز وہاں کسی اور طالب علم کو حاصل نہ تھا۔

سنتا ہوں کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں اِن دنوں ملّائیت کا بڑا زور ہے اور طلبہ جہاد کے جوش میں ہندو مسلم بلووں میں بڑھ کر شریک ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے زمانے میں علی گڑھ کی فضا خاصی لبرل تھی۔ وہاں عقل و خرد ہی کا سکہ چلتا تھا۔ اساتذہ بھی عموماً روشن خیال اور فراخ دل تھے پروفیسر حبیب، خواجہ منظور حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر محمد شریف، پروفیسر حیدر خاں، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ہادی حسن کسی کو بھی مذہبی جنون نہیں ستاتا تھا۔ اور طلبہ بھی وہی مقبول تھے جو ملک کے سیاسی اور سماجی مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتے تھے۔ چنانچہ اسٹوڈنٹس یونین کے الکشنوں میں ہر سال اُنھیں کی جیت ہوتی تھی اور یونین کے ہفت روزہ مباحثوں میں جو موضوع چُنے جاتے تھے اُن کا معیار بھی بہت اونچا ہوتا تھا۔ یونیورسٹی کی فضا کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک بار جب ہم لوگوں نے پروفیسر محمد حبیب کے کہنے پر پنڈت جواہرلال نہرو کو یونیورسٹی میں تقریر کی دعوت دی تو سر راس مسعود، وائس چانسلر ریلوے اسٹیشن پر اُن کا استقبال کرنے آئے، اُن کو اپنی کوٹھی میں ٹھہرایا اور جلسے کی صدارت بھی کی (میں نے اختر کی آپ بیتی نہیں پڑھی ہے لیکن علی سردار جعفری کی زبانی معلوم ہوا کہ اس تاریخی جلسے کا ذکر اختر نے آپ بیتی میں کیا ہے)

اُن دنوں علی گڑھ میں کیا پورے ملک میں سوشلزم کا بڑا چرچا تھا۔ یونیورسٹی کے کئی پروفیسر جن میں سب سے لائق اور محترم ہمارے ہوسٹل کے پرووسٹ حبیب صاحب تھے سوشلزم کے حق میں باتیں کرتے تھے۔ اختر نے سوشلسٹ لٹریچر کا مطالعہ غالباً کلکتے میں کیا۔ عین ممکن ہے کہ ان کے ملنے جلنے والوں میں بعض سوشلسٹ کمیونسٹ بھی رہے ہوں۔ بہرحال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ علی گڑھ آنے سے قبل سوشلسٹ نظریات سے واقف ہو چکے تھے۔ اور انھوں نے علی گڑھ میں بھی اپنے خیالات کبھی نہیں چھپائے۔ رفتہ رفتہ دوسرے نوجوانوں میں بھی سوشلزم کا شوق پیدا ہوا۔ اُنھیں دنوں مشہور کمیونسٹ رہنما ڈاکٹر محمد اشرف مرحوم لندن سے علی گڑھ میں وارد ہوئے۔ وہ یونین کے نائب صدر رہ چکے تھے (صدر وائس چانسلر ہوتا تھا) اور بلا کے مقرر تھے۔ لندن یونیورسٹی سے اُن کو سلاطین دہلی کے دور کے تہذیبی اور سماجی حالات پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی تھی، لیکن یونیورسٹی میں ترکی کی تاریخ پڑھاتے تھے۔ یونیورسٹی کے لائبریرین بشیرالدین احمد صاحب اُن کے دوست تھے۔ وہ خود بھی سوشلزم کو پسند کرتے تھے چنانچہ ڈاکٹر اشرف کی تحریک پر سوشلزم سے دلچسپی رکھنے والوں کی بیٹھک ہر ہفتے بشیر صاحب کے بنگلے پر ہونے لگی۔ اس اسٹڈی سرکل میں اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، جسٹس نیر وزنا (مرحوم)، اسرار الحق مجاز، جاں نثار اختر، التفات احمد خاں (جوش ملیح آبادی کے داماد)، علی اطہر ایڈوکیٹ، اشرف اطہر علی اور دوسرے تقریباً دو درجن سینیئر طالب علم بڑی باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ کبھی کبھار ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر کول (اقتصادیات کے پروفیسر) ڈاکٹر علیم اور کئی اور اساتذہ بھی آجاتے تھے۔ مجھ کو اپنے ہوسٹل آفتاب محلس کا ایک مباحثہ کبھی نہیں بھولے گا۔ مباحثے کا موضوع تھا "ہندوستان کے مسائل کا واحد حل کمیونزم ہے" تحریک کے حق میں پہلی تقریر اختر حسین نے کی۔ مخالفت میں محمد امین کھوسو مرحوم بولے۔ وہ شکارپور سندھ کے رئیس زادے تھے اور سوشلزم سے سخت نفرت کرتے تھے، البتہ بعد میں سوشلسٹ ہو گئے تھے۔ اُن کے بعد میری باری آئی۔ میں نے اختر کی تائید کی۔ اور جب

موضوع کی حمایت اور مخالفت میں کئی تقریریں ہو چکیں تو پروفیسر خواجہ غلام السیدین کو جب یہ محسوس ہوا کہ کمیونزم کے حامیوں کا پلّہ بھاری ہے اور حاضرین بھی ان کا ساتھ دے رہے ہیں، تو وہ کھڑے ہو گئے اور انھوں نے کمیونزم کے خلاف اتنی پُرجوش تقریر کی کہ ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔ مگر لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر اشرف وہاں موجود تھے۔ انھوں نے اتنی فصیح و بلیغ اور اتنی عالمانہ تقریر کی کہ ہال میں ہر طرف سے کمیونزم زندہ باد کے نعرے لگے۔ کمیونزم زندہ باد کے نعرے لگانے والے وہ نوجوان نہ جانے اب کہاں ہیں۔؟

امین کھوسو مرحوم بڑے مجلسی آدمی تھے۔ وہ شام کے وقت ہوسٹل کے صحن میں مجمع لگا کر بیٹھتے، چائے کا دور چلتا اور خوب گپیں لگتیں۔ کبھی کبھار ہم لوگ بھی وہاں جا بیٹھتے اور تب سوشلزم، کمیونزم پر بحث شروع ہو جاتی۔ اختر کو فقرے چست کرنا خوب آتا ہے چنانچہ بحث کے دوران وہ بعض اوقات کوئی ایسا فقرہ بول دیتے کہ کھوسو تلملا اٹھتے۔ ایک دن جب بحث میں بہت گرمی آگئی تو کھوسو لاجواب ہو کر چیخنے لگے کہ "تم لوگ میرے جذبات مجروح نہیں کر سکتے"۔ وہ غصے میں ٹہلتے جاتے اور بار بار یہی کہتے جاتے تھے کہ تم لوگ میرے جذبات مجروح نہیں کر سکتے، تم لوگ میرے جذبات مجروح نہیں کر سکتے۔ آخر اختر سے نہ رہا گیا۔ وہ اٹھ کر کھوسو کے پاس گئے اور جیسے کوئی راز کی بات کہہ رہے ہوں۔ بڑی سنجیدگی سے بولے:

"یار کھوسو تم میری بات مانو تو اپنے جذبات کا بیمہ کروالو"

"کیوں بیمہ کیوں کراؤں؟" کھوسو تڑپ کر بولے۔

"اس لیے کہ بیمے میں مالی فائدے بہت ہیں۔ جونہی تمھارے جذبات مجروح ہوں تم فوراً بیمہ کمپنی کو خبر کر دو وہ تم کو اس حادثے کے عوض معقول رقم ادا کر دے گی" سب لوگ ہنسنے لگے اور کھوسو بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ برسوں بعد ایک بار اُن سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی۔ اس وقت تک اُن کے خیالات بدل چکے تھے۔ میں نے اس واقعے کا ذکر کیا تو خوب ہنسے۔

اختر کی ملاقات مولوی عبدالحق صاحب سے پہلی بار علی گڑھ میں ہی ہوئی۔ وہ مشہور جاسوسی ناول "نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" کے مصنف جناب ظفر عمر کی کوٹھی میں جس کا نام بھی "نیلی چھتری" تھا، مقیم تھے۔ ظفر عمر صاحب کے گھر والوں سے ڈاکٹر اشرف مرحوم کے بھی گہرے مراسم تھے۔ ظفر عمر صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے، مگر ان کی اولاد بڑی ترقی پسند تھی۔ اُن کے بڑے بیٹے شوکت عمر اشرف صاحب کے دوست تھے اور خود بھی کمیونسٹ تھے۔ مولوی صاحب نے اختر کی تحریریں پڑھی تھیں اور جب وہ اختر سے ملے تو اختر نے اُن کا دل موہ لیا۔ سجاد ظہیر کی مرتب کی ہوئی کہانیوں کا مجموعہ "انگارے" انھیں دنوں شائع ہوا تھا اور ملّاؤں نے اس کے خلاف باقاعدہ مہم شروع کر رکھی تھی۔ مگر مولوی عبدالحق صاحب ملّاؤں سے کب ڈرنے والے تھے۔ انھوں نے اختر سے کہا کہ تم رسالہ "اردو" کے لیے "انگارے" پر تبصرہ لکھ دو۔ یہ تبصرہ "ناخدا" کے نام سے اُردو میں شائع ہوا۔

ان سب شخصیتوں نے اختر کی شادی میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اختر ظفر عمر صاحب کی بیٹی حمیدہ سے شادی کرنا چاہتے تھے جو گرلز کالج میں پڑھتی تھیں۔ انھیں صاحبوں کے کہنے سننے سے ظفر عمر صاحب اس شادی پر راضی ہو گئے ورنہ قاعدے سے تو حمیدہ کی شادی ایک بی۔ اے پاس ادیب کے بجائے کسی آئی۔ سی۔ ایس، پی۔ سی۔ ایس یا کم از کم ڈی۔ ایس۔ پی سے ہونی چاہیے تھی۔

علی گڑھ کے بعد اختر کا ہمارا ساتھ دکن میں ہوا۔ وہ انجمن ترقی اُردو سے وابستہ ہو کر اورنگ آباد چلے گئے اور مولوی صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ مولوی صاحب اُن کو بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ وہیں سے اختر نے مجھ کو تار دے کر لکھنؤ سے بلوایا۔ وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ انھوں نے اخبار پیام کے لیے (جس کے ایڈیٹر مولوی صاحب کے دوست قاضی عبدالغفار، مصنف لیلیٰ کے خطوط) مولوی صاحب سے میری سفارش کی تھی اور مولوی صاحب راضی ہو گئے تھے۔ میں ایک ہفتہ اورنگ آباد میں رہ کر حیدرآباد چلا گیا اور مہینہ دو مہینے کے بعد جب انجمن کا صدر دفتر حیدرآباد منتقل ہوا تو اختر بھی حیدرآباد آ گئے۔ وہیں انھوں نے اپنا مشہور مضمون "ادب اور زندگی" لکھا جو

پہلی بار رسالہ اردو میں شائع ہوا۔ "پیام شباب"، "شکنتلا" اور "گورکی کی آپ بیتی" بھی اختر کی اسی زمانے کی تخلیقات ہیں۔
وہیں ہم لوگوں نے مل کر "جنگ حبشہ اور اطالیہ" لکھی جس کو انجمن نے شائع کیا۔ وہیں ہم لوگوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کی اور وہیں سے ہم لوگ حمیدہ بی بی کو بیاہنے کالپی گئے جہاں ظفر عمر صاحب تعینات تھے۔ دولھا کی طرف سے مولوی عبدالحق، ڈاکٹر اشرف، ذکاءاللہ خاں انجینیر، شرف اطہر علی اور میں شادی میں شریک ہوئے۔ یہ شادی بڑی سادگی سے ہوئی حالاں کہ ظفر عمر صاحب پولیس افسر تھے۔ وہ چاہتے تو شادی بڑی دھوم سے ہوتی اور بیٹی زیور اور جہیز سے لد جاتی مگر ان کا ایک دھیلا خرچ نہ ہوتا، لیکن ظفر عمر صاحب اس قماش کے آدمی نہ تھے۔ اور اختر کو بھی پرانے زمانے کی بیہودہ رسمیں پسند نہ تھیں لہٰذا شادی بڑی خاموشی سے ہوئی۔ حمیدہ اب خیر سے چار بیٹیوں کی ماں اور پوتے پوتیوں والی ہیں۔ ان کو چاہیے کہ اپنی شادی کی گولڈن جوبلی اس سال منا ڈالیں اور کراچی میں نودولتیوں نے جو اُدھم مچا رکھا ہے اس کی فکر نہ کریں۔

اختر حمیدہ کو بیاہ کر حیدرآباد لائے، مگر کچھ دن بعد ہی میاں بیوی اعلیٰ تعلیم کے لیے پیرس چلے گئے۔ وہاں جا کر اختر نئی زندگی میں کچھ ایسے مصروف ہوئے کہ کبھی ایک کارڈ بھی نہ بھیجا۔ مجھ کو اس کا ملال آج تک ہے۔ وہ پیرس سے کب واپس لوٹے مجھ کو نہیں معلوم۔ کبھی سُنا کہ وہ ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں پروفیسر ہو گئے ہیں اور کبھی سُنا کہ وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو کر دہلی چلے گئے ہیں، لیکن اُن سے ملاقات کی یا خط و کتابت کی نوبت کبھی نہیں آئی۔

بارہ سال بعد اُن سے پہلی ملاقات یہیں کراچی میں ہوئی۔ وہ اُن دنوں وزارت تعلیمات میں مشیر تھے۔ بڑی گرم جوشی سے ملے اور تمام گلے شکوے دور ہو گئے۔

باتوں باتوں میں کہنے لگے جانتے ہو ان دنوں وزارت تعلیمات کے سامنے سب سے اہم مسئلہ کیا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ بولے ہم کو یہ طے کرنا ہے کہ پاکستان کی تاریخ کا نصاب کہاں سے شروع ہو۔ موہن جوڈارو، ہڑپہ سے، محمد بن قاسم کے حملے سے یا ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء سے۔ پھر بولے یار عجب بالشیتوں میں گھر گیا ہوں۔ مجھ کو اتنے تنگ نظر، متعصب اور جاہل مگر برخود غلط لوگوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ وہ تو خیر گذری کہ اختر کو یونسکو والوں نے بلا لیا ورنہ یہاں کے بزرجمہروں سے اُن کی ہرگز نہ نبھتی۔

وہ ریٹائر ہو کر کراچی واپس آئے تو اُن کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع بہت کم ملا۔ اس شہر میں فاصلے دلوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیتے ہیں۔ میں گوشہ نشین، اختر ڈاکٹروں کی مجرمانہ غفلت کے باعث آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا۔ لیکن وہ جب ملے اُسی پُرانی محبت کے ساتھ۔ اب وہ آنکھوں کے علاج کے لیے لندن جا رہے ہیں۔ خدا کرے وہ روشن آنکھیں لے کر لوٹیں تو افکار کے اس خاص نمبر کا جشن سب لوگ ساتھ مل کر منائیں اور ان کی شادی کی گولڈن جوبلی بھی۔ ●●

الطاف فاطمہ

اختر بھائی

صہبا صاحب کا خط ملا جس میں انھوں نے اختر بھائی کے متعلق کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی تو میں نے سمجھا تھا کہ یہ تو معمولی سی بات ہے ایک دن بیٹھ جاؤں گی اور کچھ نہیں دو تین صفحے تو ضرور ہی کالے کر دوں گی مگر اب جب یہ فرض ادا کرنے بیٹھی ہوں تو سوچتی ہوں کہ یہ کام اتنا آسان اور سہل نہ تھا۔ اختر بھائی کا اور میرا معاملہ تو پہاڑ اور گلہری کا سا ہے۔ ان کا علم اور مطالعہ۔ ان کی زباں دانی۔ ان کے منصبی درجات اور ان کے تجربات، سیر و سیاحت کے علاوہ گھاٹ گھاٹ اور نگر نگر کے لوگوں کے مسائل اور معاملات کو سمجھنا، نظر ڈالنا بڑی بڑی دیو قامت اقوام اور ایشیا کی ترقی پذیر بگی سائز اقوام کے درمیان سمجھوتوں اور مفاہمت کی تدبیریں سوچنا اور تجویز کرنا۔ اور اس سب پر مستزاد ان کی عالی ظرفی اور سمائی۔۔۔ اور اب یہ دیکھیے کہ کہاں تو واقعی میں تو اپنے اور اُن کے درمیان پہاڑ اور گلہری والا اتنا سب بھی نہیں پاتی۔ کہ وہ پھدکتی پھدکتی پہاڑ کی چوٹی تک تو پہنچ جاتی ہے۔ یہاں تو یہ بھی استقامت نہیں۔

دراصل قصہ یہ ہے کہ میں تو اختر بھائی کو حمیدہ باجی کے حوالے سے ہی جاننے کا دعویٰ کر سکتی ہوں۔ البتہ اختر حسین رائے پوری کی شخصیت اور ذات کا احاطہ کرنے کی جرأت یا دعویٰ کروں تو یہ ایک طرح کا جھوٹ ہی ہے۔

اختر بھائی کا قد میرے قامت سے بہت اونچا ہے۔ اور میں اس قطب مینار کی بلندی کے سامنے اپنی کوتاہ قامتی کو چھپانے کے لیے اسی حوالے کی آڑ لے سکتی ہوں۔ اور بات یہ ہے کہ یہ حوالہ اختر بھائی کی زندگی اور کیریر میں بڑی نہیں بلکہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے ہی نہیں بلکہ خاندان کے زیادہ تر لوگوں نے اختر بھائی کی ذات اور صفات کو اسی دل کش حوالے سے پہچانا۔ ان کا احترام کرنا سیکھا اور ان سے محبت کی۔ میں نے حمیدہ باجی کے لیے دل کش حوالہ اس لیے استعمال کیا ہے۔ رفیقۂ حیات اور نصف بہتر کی اس سے دل کش اور خوبصورت تفسیر کسی اور لغت میں نہیں ملے گی۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ پر یہ اعتراض کیا جائے اختر صاحب کے بہانے حمیدہ باجی پر لکھنے بیٹھ گئیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں البتہ میں اس حوالے کو نظر انداز نہ کر پاؤں گی۔ اس لیے کہ میں اختر بھائی سے اس طور پر واقف نہیں ہوں کہ یہ دعویٰ کروں کہ اس سہارے کے بغیر کام چلا لوں گی۔ بات یہ ہے کہ ان کی شادی ہوئی تو ہمارا یہ حال تھا شادی سے قبل جب ہم اورئی گئے (ہمارے خالو آبا یعنی ان کے والد ظفر عمر صاحب کی ان دنوں اورئی میں جو بندیلکھنڈ کا ضلع ہے پوسٹنگ تھی) وہاں ان دنوں ایک عدد شادی کا اہتمام تھا اور جہیز سیا اور کاڑھا جا رہا تھا۔ گھر میں کئی لڑکیاں (کزنس) تھیں مگر ہمیں اتنا ہوش نہ تھا کہ یہ معلوم کرنے کی تکلیف گوارا کرتے کہ ان میں سے کس کی شادی ہے۔ بس اتنا دیکھا کرتے تھے کہ کڑھائی، بنائی، سلائی کے علاوہ کھٹا کھٹ مشین چلتی ہے۔ خربوزے اور تربوزوں کے بیج اور چلغوزے چھیل چھیل کر کھائے جاتے ہیں اور یہ

بڑی بڑی لڑکیاں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتی ہیں۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنے کی کہ شادی کیوں ہے؟ کس کی ہے؟ کس سے ہے؟ فرصت کیسے ہوتی کہ ہم نے اور عزیز عمر مرحوم (حمیدہ باجی کے ایک چھوٹے بھائی نے پچھلے برآمدے میں ایک عدد اسکول قائم کر رکھا تھا۔ جس میں میز کرسیوں کے علاوہ حاضری کا باقاعدہ رجسٹر بھی تھا۔ مکمل پڑھائی، حاضری، ٹن ٹن گھنٹی سب موجود۔ اس اسکول کا واحد طالب علم کرو ڈرا تھا جمعدار کا زخم زخم لڑکا (موصوف نے ایک دن ایک عدد جلتی لکڑی اپنے جسم کے گرد گھمائی تھی۔ کپڑوں نے آگ پکڑی اور وہ سر سے پا تک جل کر زخم زخم ہوئے) یہ کپڑ پکڑ کر لائے جاتے، کرسی پر بٹھائے جاتے، باری باری ہم اور عزیز عمران پر اپنے مبلغ علم کے دریا بہاتے مگر آفرین ہے ان پر کہ موصوف ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ہم نے اپنی تین مہینے کی چھٹیاں ان پر سے قربان کیں مگر ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ پائے۔ بالآخر ایک دن ہماری والدہ نے رخت سفر باندھا اور اورئی سے چل پڑیں۔ پتہ چلا کہ اب ہمارے اسکول کھل گئے ہیں۔ وہ شادی ہم اٹینڈ نہ کر پائے یعنی اس میں شرکت نہ ہو سکی کہ وہ شادی شاید دسمبر میں اس وقت ہوئی جب ہم امتحانوں میں مصروف تھے۔ ہماری والدہ بھی نہ گئیں اور سب کی نمائندگی کو ہماری بڑی بہن شادی کے مہمانوں کی ایک پارٹی کے ساتھ بھیج دی گئیں۔

وہ شادی سے واپس آئیں تو حمیدہ باجی کی شادی اور اس کی دلچسپیاں ان کا محبوب موضوع بن چکا تھا۔ زور جس شے اور بات پر تھا وہ مولوی عبدالحق (یہ اہمیت بھی ان کی معلوم نہ تھی کہ وہ بابائے اردو بننے والے ہیں یا بن چکے ہیں) کی باتیں اور حرکتیں اور براتیوں یعنی مولوی عبدالحق سمیت دولہا کے ساتھیوں کے گائے ہوئے گانے تھے۔ ہمشیرہ موصوف وہ تمام گانے منہ زبانی یاد کر آئی تھیں۔ غرض کہ شادی کی تفصیلات کا محور شادی کے دوران کی جانے والی اپنی (بجملہ بھائی بہنوں کی) شرارتوں کے علاوہ مولوی عبدالحق اور ان گانوں کے علاوہ خود حمیدہ باجی تھیں اور اس تمام بیان میں اوّل تو دولہا مذکور نہ تھا اور اگر ذکر ہوا بھی تو سرسری سا۔

تو حمیدہ باجی کی شادی کا واقعہ یوں رفت گزشت ہوا۔ سال بہ سال گزرنے لگا۔ ہم دبادب امتحانوں میں مصروف رہے اور اب ایک دوپہر کو کیا دیکھتے ہیں کہ حمیدہ باجی آئی بیٹھی ہیں بذات خود (یعنی اختر حسین رائے پوری ساتھ نہیں) تو اب بتائیے ہم کہاں اُن کو دیکھتے اور کہاں ملتے۔ اور حمیدہ باجی کا یہ کہ جس محفل اور صحبت میں بیٹھ جائیں ساری محفل ہنستے ہنستے بے حال ہو رہی ہوگی اور یہ بول رہی ہوں گی۔ ساتھ ہنس ہنس کر خود بھی بے حال ہو رہی ہوں۔ ایسی اعلیٰ درجے کی محاکات کے ساتھ قصے سنائیں گی کہ ہر بات مجسم اور متحرک ہو کر ذہن پر نقش ہو جائے گی (اللہ ہی جانے کیوں اس شخص نے اپنی اس اعلیٰ درجے کی صلاحیت کو بروئے کار لانے کا نہ سوچا۔ خیر اللہ تو جانتا ہوگا لیکن ہمارا بھی ایک تجزیہ ہے جو آئندہ سطور میں کسی جگہ بیان ہوگا) اچھا تو معلوم یہ ہوا کہ وہ اپنے پاسپورٹ وغیرہ کے سلسلے میں آئی ہیں اور اختر بھائی فرانس جا رہے ہیں اسکالرشپ پر، ساہتیہ لنکار یا کیا جانے کون سی ڈگری لینے سنسکرت میں۔ (اب سنتے ہیں تو یہ آتا تھا کہ یہ سنسکرت زبان مردہ ہو چکی ہے۔ اور یہ چلے اس کی ڈگری لینے۔ عجیب شخص ہیں)

اب جو کچھ بھی ہو نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اختر بھائی کم نظر سے اوجھل مع حمیدہ باجی کے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا پھر اس کے بعد جب واپس آئیں۔ اتنی دنیا دیکھ کر بھی تو ان کی گفتگو کا نمایاں موضوع "اختر" ہی رہا۔ اختر نے یہ کہا۔ اختر نے یوں کیا۔ حمیدہ باجی یہ نام کچھ اس انداز سے لیتیں۔ جیسے پجاری اپنے دیوتا کا نام لے یا منبر پر کھڑا خطیب بڑے گاڑھے لہجے میں اللہ کا نام لیتا ہو۔

یقین جانیے اس وقت تک ان کی پسند، ناپسند اور عادتوں کے متعلق جتنی بھی واقفیت اور آگاہی ہوئی وہ سب ان کی زبانی سُنی سنائی۔ اور "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں ان کا"

غرض کہ اختر بھائی کی شخصیت اور لیاقت نہ صرف منہ زبانی یاد ہو گئی بلکہ اس کا سکّہ اور دھاک دل پر بیٹھ گئی۔

اب ذرا دیکھیے کہ ان کی زبانی اور سنی سنائی باتوں سے جو امیج کہ ہمارے ذہن میں بیٹھتا ہے وہ سخت مرعوب کن تھا۔ اتنے لائق، قابل، اتنا گہرا مطالعہ، اتنا تجربہ اور اتنے اصول پرست اور نستعلیق۔ بس یوں سمجھیے کہ ہمارے ذہن کا ساختہ ہوگا کبھی اتنے سال فرانس اور انگلستان میں بسر کر آتے ہیں) ان سے تو دور ہی رہنے میں عافیت ہے۔ جب یہ خیال جم تو نکلنا کیوں کر کہ پاکستان آئے تو یہ لوگ کراچی ہمارے ... سکریٹری وزارت تعلیم اور ہم طالب علم (یہاں پر ایک اور واقعہ یاد آتا ہے سنا تھا کہ ہمارے ایم اے پیر لوسیں کے ... ممتحن اختر حسین رائے پوری ہیں۔ خبر دینے والے محترم کا خیال تھا کہ ہماری تو ہر درج جل ہی جائے گی اور شاید درجہ اور کا کچھ حصہ ہو جائے اور یہاں یہ حال کہ سن کر جان ہی تو نکل گئی کہ ان کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ورنہ ہماری نالائقیوں پر کیا کہیں گے کہ یہ حمیدہ بیگم کی بہن ہے اور ... کا تو نام ہی نہ لے کوئی کہ حمیدہ باجی کے بیان کردہ تمام اصول اختر کے ہم کو منہ زبانی یاد تھے۔ توبہ کرو)

اب یہ دیکھا کہ ایک مدت رہا۔ بدیس کی یوں ... ہو سکی کہ اختر بھائی تو ... مشن کے ہو رہے اور ملک ملک گھر نگر گھومتے ... ساتھ حمیدہ بیگم بھی ہوتیں۔ ... ایک دفعہ جو کراچی جانا ہوا تو یہ لوگ آئے ہوئے تھے۔ اب کے حمیدہ باجی نے بار بار کہنا شروع کیا ... اختر بڑی تعریف کر رہے تھے کہ یہ لڑکی تو اچھا لکھ لیتی ہے۔ اب ہمیں تھیل تھیل کر ان کے پاس بھیج رہی ہیں۔ جاؤ مل کر آؤ۔ کچھ دیر تک تو ہم نے خیال کیا کہ یہ بھی ان کا کوئی "اسٹنٹ" ہے اور یوں ہی اختر صاحب کو امپریشن دے رہی ہیں مگر جب انھوں نے خاصی سنجیدگی اور رعب سے ٹھیلا اور ان کے پاس جا کر بیٹھنے پر مجبور کیا تو ہم دل کڑا کر کے سر ڈھک کر اختر بھائی کے سامنے جا حاضر ہوئے۔ اختر بھائی نے اٹھ کر جس شفقت سے سر پہ ہاتھ رکھ کر میرا استقبال کیا، جس محبت سے پاس بٹھا کر میری ہمت افزائی کی، وہ میرے دل پر ہمیشہ نقش رہے گی وہ میری ہمت افزائی کر رہے تھے اور میرا دل ... مجھ کو یقین کبھی نہیں آ رہا تھا ... صداقت اور خلوص ... ایسا انسان ... ہے۔ بس وہاں سے اٹھی تو عجب سی خوشی اور طمانیت محسوس ہو رہی تھی کہ اس شخص کو عظمتوں اور علم کے ... سمجھ بیٹھی تھی وہ تو شفقت کشادگی اور وسعتِ دل کا ایک نورانی مجسمہ ہے۔

اب میرے ذہن میں اختر حسین رائے پوری کا ایک اور ہی تاثر تھا۔ حمیدہ باجی کے بنائے ہوئے امیج سے بالکل مختلف۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا حد درجہ پرستش اختر بھائی کے لیے کچھ اس نوعیت کا ہے کہ وہ ان کا ذکر کرتی ہیں تو بلا ارادہ اور بے ساختہ ایک دیوتا کی عظمتوں کے مینار کا تصور ہوتا ہے اور وہ بڑا مرعوب کن تصور ہوتا ہے۔ پھر جب آپ ان کو اپنی آنکھ سے (حمیدہ بیگم کی نظر کی وساطت کے بغیر) دیکھیں تو عجیب سی خوشی ہوتی ہے کہ آپ کے سامنے ٹھیٹ اور گوشت پوست کا ایک بشر ہوتا ہے۔ ایک ایسی حیادار شخصیت جس کے ظرف اور سمائی کو یہ بھی گوارا نہ ہو کہ اس کے منہ پر بیٹھ کر ان کے بارے میں تعریفی یا توصیفی کلمات کہے جائیں۔

لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گی، اختر بھائی کی ذات و صفات سے اس وقت تک مکمل آگاہی اور واقفیت ممکن ہی نہیں جب تک کہ حمیدہ باجی کا پائے سخن درمیان نہ ہو کہ اختر بھائی خود اپنے بارے میں اس درجہ منکسر اور شرمیلے کہ اگر حمیدہ باجی کے ... بیٹھ کر ان کی وسعت مطالعہ سے لے کر خاندانی نجابت اور شرافت کا بھی ذکر کریں تو وہ اس قدر جھینپتے اور خفت محسوس کرتے ہیں کہ کوئی اپنی مذمت سن کر نہ ہوگا۔ ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ حمیدہ بیگم روئے سخن بدل دیں۔ ویسے وہ نظارہ دیدنی ہوتا ہے۔ آپ چاہے اختر صاحب کی مدح و توصیف ... کا محبوب موضوع ہے ہی ادھر وہ بات چھیڑیں گی اُدھر یہ گھبرائیں گے اور چہرے پہ وہ تاثر ہوگا گویا کسی نے پردہ نشین کو سر ... کر دیا ہو۔

بے شک علی الحیا دلیل ایمان ہے

ان کے اسلاف میں پیروں کا نام آتا ہے یعنی جنگ آزادی کا وہ ہیرو ... جس نے انتہائی ...

پسپائی کو گوارا نہ کیا اور آخر دم تک دشمن کے مقابل ڈٹے رہے۔ اختر بھائی کے حالات کا مطالعہ کریجیے یا مشاہدہ ایک نمایاں وصف ان کے کردار میں یہی نظر آئے گا کہ ایسے وقتوں اور عالم میں جب لوگ ہراساں ہوتے ہیں یا وقت اور تقدیر کی شکایت کرتے ہیں انھوں نے نہ کبھی پسپائی کو قبول کیا اور نہ مایوس ہوئے۔ ابتدائی زندگی کے بعد ایک عمر آسودگی اور بے حد مصروفیت میں گزار لینے کے بعد جب فراغت اور فرصت کا وقت آیا تو بصارت اور نظر کا یہ حادثہ ایک قیامت سے کیا کم ہوسکتا ہے ایسے شخص کے لیے کہ جس نے سالہا سال فراغت سے بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا منصوبہ بنایا ہو۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

لیکن یہی وہ موقع ہے جب اپنے سلف کے کردار کی جھلک ان کے رویے اور کردار میں نمایاں ہوئی۔ آنکھوں کی تکلیف اور مجبوری کے سامنے ان کے تخلیقی ہنر اور طبیعت کے جوہر اصلی نے شکست تسلیم کی اور نہ ہتھیار ڈالے۔ تقدیر کے اس جبر کے آگے وہ مرد میدان ہی کے انداز میں صف آرا ہیں اور "گرد راہ" اسی کارزار سے اٹھتی ہوئی دھول اور ان کے حوصلے کا زندہ ثبوت ہے۔ بلکہ حقیقتاً یہ تو ایک عام نو کا جنم دن ہے اور ان کے اندر کے جوہر اعظم نے جس نئے روپ کا دھارن کیا ہے اس کا نقطۂ آغاز ہے۔ آغاز یہ ہے اور انتہا کیا ہوگی؟ خدا ہماری اور آپ کی توقعات سے سنہری نتائج دیتا ہے ان کو جنھیں صبر آزما لمحوں کو برتنا آتا ہے، جو تقدیر الٰہی کو صبر جمیل کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ ایسے حوصلے اور عزم نو کو ہم آپ تو مرحبا ہی کہہ سکتے ہیں، لیکن عزم نو کا نقطۂ آغاز تو دیکھیے کس عارفانہ اور ذو معنی جملے سے ہوا ہے۔ لکھتے ہیں۔ ۔

"اسمٰعیلی امام حسن دوم نے ایک بار اپنے معتقدوں سے کہا آج قیامت کا دن ہے آؤ کفن اوڑھ کر داور محشر کے حضور لیٹ جاؤ۔ پھر ایک وعظ سنا کر انھیں سجدے سے اٹھایا۔ نعرہ لگایا اور اعلان کیا کہ اب تمھارا نیا جنم ہوا ہے تم ظاہری شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو گئے۔"

اور خیال کیجیے اس قیامت کا کہ جس نے اجالوں کو رخصت کیا اور اندھیروں، دھندلکوں اور سایوں کو ان کا ہم سفر کیا اور اس جملے کے کرب کو میں کیا کہوں اس کو تو ہر پڑھنے والے ہی نے محسوس کیا ہوگا۔ کہتے ہیں :۔

"جب دن ڈھلنے لگتا ہے تو سامنے دھندلکا ہوتا ہے، وقت پیچھے رہ جاتا ہے اور ماضی سائے کی طرح پاؤں سے لپٹ جاتا ہے۔"

ذرا سوچیے تو کیا کچھ نہیں کہہ دیا ہے انھوں نے اس میں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے اس سانحے اور وقت کے جبر کو جس لطافت اور نفاست سے نبھایا اور اس سے مفاہمت کی وہ بجائے خود ایک نفس لطیف ایک تعمل بن کر رہ گیا۔ انھوں نے اس حالت کو جس انداز میں تحمل کیا اور اس صورت حالات میں اپنے معمول و دستور کو جاری اور برقرار رکھا ہے اس کو بہادری کا نام ہی دیا جاسکتا ہے۔

جب "گرد راہ" کا ذکر آ ہی گیا ہے تو کچھ اس کے بارے میں بات کرتی چلوں، لیکن جب رخ پر آتی ہوں تو پھر جی گھبراتا اور خفقان کرتا ہے کہ وہ پہاڑ اور گلہری کا معاملہ نظر آتا ہے۔ ذرہ آفتاب کو روشنی کیا دکھائے۔ اس خوف اور ہراس کا سبب یہی ہے کہ مجھے علم ہے کہ اختر بھائی کا دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب اور ثقافتوں پر مطالعہ کتنا وسیع اور گہرا ہے۔ بس اب صرف اپنے تاثرات ہی بیان کرسکتی ہوں۔ "گرد راہ" کی جس پہلی بات نے مجھے چونکایا اس میں ان کا وہ رویہ اور اسلوب ہے جس کو آپ آغاز سے اختتام تک ایک دل کش انداز میں موضوعات سے ہم آہنگ پائیں گے۔ بات یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو مغرب کی متعدد زبانوں کے ادب کا بسیط مطالعہ کرتا رہے وہ یقیناً مغرب میں سوانح، حالات زندگی اور آپ بیتی کے نظریات، پچھلے بھی اور جدید ترین سے بھی بخوبی واقف ہوگا۔ اردو سوانح نگاری میں مغربی نظریات بتدریج حاوی ہونے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر بیشتر سوانح نگار ارادی طور پر تقلید مغرب کی سعی فرمانے کے باوجود مکمل طور پر اپنی مشرقیت کے اثرات سے دست بردار

نہیں ہو پائے ہیں۔ اسی طرح آپ بیتی لکھنے والوں میں سے اکثر نے بلا کم و کاست بہ تفصیل لکھنے کے دعوے کیے جن میں سرِ فہرست نام اعمال نامے کے مصنف سر رضا علی کا ہے۔ بڑے تجسس اور اشتیاق سے کتاب شروع سے آخر تک پڑھ کے بعد آپ کو محسوس ہوگا کہ بس اب غالب کا مصرعہ

کہتے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

پڑھیے اور صبر کیجیے اس میدان میں بجز جوش صاحب کسی کی کچھ پیش نہ گئی کہ بہت کچھ کہا گفتنی بھی ناگفتنی بھی، جو ہوا وہ بھی جو خیال میں رہا وہ بھی۔

خیر اختر بھائی سے نہ تو وہ توقع تھی اور نہ ہی یہ توقع تھی۔ ایک اشتیاق تھا کہ دیکھیں یہ عمرِ رواں کا سفینہ کس انداز میں کھیتے ہیں اور حقیقت میں انھوں نے بیان اور حقائق کو کہنے کا جو اسلوب اور قرینہ برتا ہے اس کا کسی تقلید۔ نقالی یا ارادی اسلوب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ بلکہ یہ ان کے علم و دانش اور زبان دانی کا ایک خوبصورت اور مسحور کن کرشمہ ہے۔ ان کے اپنے ٹھہرے ہوئے بے ریا اور بے کبر اسلوب میں۔ ابھی اس مختصر روداد حیات (کہ اختصار کا سبب میرے ذہن میں یہی آتا ہے کہ منھ زبانی بول کر لکھوانے یا ٹیپ کروانے کا مجبوراً) یہ پہلا تجربہ تھا۔ یوں تو بڑا ابن میں بہت بولے ہوں گے بہت سبھائیں بھروائی ہوں گی، مگر روداد حیات کو یوں کوزے میں بند کرنے کا اولین موقع تھا۔ اختصار ہی کو بہتر وسیلہ جانا ہوگا کو جس سادگی سے اجس مہارت سے انھوں نے سمیٹا ہے اسی کا نام دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اس کوزے میں ایک نہیں کئی دریا سمو دیے اس لیے کہ ان کے سفرِ حیات کی روداد کا پیرایہ جس قدر بھی مختصر ہو مگر سفر بہت طویل اور ذو پہلو ہے ان کی فطرت اور مزاج کا سارا تنوع اس میں سمایا ہوا ہے۔ ان کے زمانے کی دھڑکتی ہوئی نبض پر ان کے بیان کی انگلیاں موجود ہیں۔ ان کے لڑکپن سے لے کر عنفوانِ شباب تک کا زمانہ اپنے اندر صدیوں کی تڑپ اور رنگا رنگی رکھتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں زندگی اور ذہن دمادم رواں تھا۔ برصغیر کی آزادی کی تحریک نے معیشت۔ ادب، سیاست اور دنیائے دانش کو اس درجہ فعالیت بخشی تھی کہ جس کا حساب ان ہی جیسا مزاج و قلم کر سکتا ہے۔ اور پھر یہی وہ عرصہ اور زمانہ ہے جب دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ عظیم متعلقہ اقوام میں برطانیہ اور فرانس کے بعد سب سے بڑھ کر برصغیر ہی پر براہ راست اثر انداز ہوئی یعنی زبان۔ ادب، معیشت، سیاست، فکر و دانش۔ غرض زندگی کے ہر زاویے پر اثر انداز ہوئی اور ایک زبردست نفسیاتی اور فکری انقلاب ایک زیریں رو (UNDER CURRENT) کے طور پر اندر ہی اندر کام کر رہا تھا۔ ایک نوخیز ادیب و دانش ور، یک نا ارض نوجوان ایک جوشیلے اور ناتجربے کار انقلابی کی حیثیت میں اختر بھائی اس رو سے دوچار تھے۔ بلکہ اپنے عصر کی ہر دستک کو سنتے بھی تھے، در اپنے اندر کے کواڑ کھول کر اس آوازِ عصر کو اپنے اندر آنے کی اجازت بھی دیتے تھے۔ ان کے تجربے بے بہا اور بیش قیمت ہیں کہ عمر کی ایسی منزل میں کہ جب سارا پیرہن دامن محدود ہوتا ہے اور ایک نادار اور ناشناس نوجوان اپنے آپ کو دانش، ادب۔ سیاست اور اقتدار کے آستانوں سے بہت دور پاتا ہے اور گریزاں رہتا ہے اختر بھائی کی وقت سے اور مقدرات سے مبارزانہ فطرت نے ہر چیلنج کو نہ صرف پس پا کیا بلکہ کامیابی اور کامرانی کے زینے کھٹا کھٹ طے کیے اور نہایت کم عمر میں برصغیر کی دانش و سیاست کی شخصیات سے قرب حاصل کیا (صرف آٹو گراف اور ساتھ فوٹو کھنچوانے والے طالب علم کے طور پر نہیں بلکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر برابری سے تبادلۂ خیال کرنے والے طالب علم کی حیثیت سے بات کروانے والے کے طور پر) ان شخصیات میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔ سروجنی نائیڈو۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی جیسی شخصیات کا نام شامل ہے جن سے نہ کبھی وہ گستاخ ہوئے اور نہ محجوب اور مرعوب ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ان باتوں سے اپنے قاری کو بھی مرعوب اور محجوب کرنے کا خیال ہی دل میں نہ لائے۔ اور حق یہ ہے کہ سفر، تجربے اور مشاہدے کے بیان کے وہ ہی احسن طریق

ہیں۔ بلکہ ہر کہانی اور عصری تاریخ کے واقعات اور سانحات کے اسباب و علل کو تفریح طبع اور خوش وقتی انداز میں بیان کرنا طریق کار رہا اکثر مضبوط الرحمن نے اپنا پیشہ اور دوسرا خود ضبطی کے ساتھ زمانی اور عصری تاریخ کے ابواب میں حیثیت ذات اور فرد اپنے شعور ادراک اور تجربے کے دھارے کا تعین اور اس سے کبھی بڑھ کر بنی نوع آدم کی وہ سرگزشت جو جا بجا کو بکو اور خطہ بہ خطہ عصری تقاضوں اور سائنسی دور کے جبر نے مرتب کی۔ بس یہی وہ روپ ہے جو انھوں نے ایک نہایت کھلے اور فراخ ذہن کے علاوہ منفرد طرز فکر میں اپنایا ہے۔ رہ گیا ان کا اسلوب ہے وہ تو دریا سے بہتی ایک شفاف روانی ہے جو خالص مشرقی انداز اور دامن آگے بڑھتی جاتی ہے۔

آج کل سفرنامہ کا عجب انداز نکلا ہے۔ جن میں سے بیشتر کو ہم بڑا دلکش اور شگفتہ کہتے ہیں لیکن بعض سفرنامے ایسے بھی ہیں کہ جن کی ڈرامائی خصوصیات اور جذبات بہت مرعوب کر دیتی ہے اور پڑھنے والے کو اس سب کی تہہ میں ایک ایڈونچر کا شبہ ہوتا ہے، لیکن داکٹر صاحب کی سفر نامہ کی زندگی کی روداد ہے ایسی کوئی بات نہیں محسوس ہوتی جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ اپنے بے ارادہ اور ناخواندہ سلسلہ سفر میں ایسا چکے ہوں اور سفران کی زندگی کا ایسا ہی روزمرہ بن کر رہ گیا جس کو معمولات میں گنا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر انھوں نے سفر کے واقعات میں سفر کی جزئیات و ترتیب کیا ہے تو اس سے زیادہ ضروری یہ جانا ہے کہ قاری کا تعارف ان کردار اور شخصیات سے کروا تے جاتے ہیں جن کی دنیا اور شخصیات کا دوسری جنگ عظیم، عالمی انقلابی تحریکوں، سیاسی اور ادبی سے کسی نہ کسی طور واسطہ اور باہم رابطہ رہا۔ ان میں سے بعض شخصیتیں ایسی تھیں جو ملک عدم کو سدھار چکیں اور جو موجود ہیں ان سے رسم و راہ ملاقات و تعلقات بھی رہے۔ مثلاً خالدہ ادیب خانم اور سنے عدنان بے، انقلابی، برازیل کا ایک انقلابی کردار، پابلو نرودا، پھر ان لوگوں کے ذہنی مشاغل کے علاوہ عام زندگی کا وہی انداز، ان کے حلقۂ ملاقات میں، پنڈت نہرو کبھی شامل ہوئے اور ان کی معیت میں پیرس کے اس تاریخ کیفے، تو وہ بھی جاکر بیٹھے جہاں بس آکر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کا بوڑھا مالک آج تک ان پرچیوں کو سنبھال سنبھال کر رکھتا تھا اور پنڈت جی کے دستخط پر کئی ان پرچیوں کی قیمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ اس کا کہنا تھا۔

"مجھے لاکھوں روپے پیش کیے گئے میں انھیں بیچ دوں تو میری حیثیت کیا رہ جائے گی۔ پھر آپ جیسے لوگ مجھے کیوں پوچھیں گے۔"

غرض کہ اگر ڈاکٹر صاحب نے سفر اور رخت سفر کے ابتدائی مرحلوں سے اپنے قاری کو محروم رکھا تو اس زمانے اور دور کے ان سنسنی خیز لمحوں سے قدم قدم پر روشناس کرواتے ہیں جو دوسری جنگ عظیم کی بنا پر بہت نئے تجربے اور تاریخی موڑ کہے جا سکتے ہیں۔

لیکن ایسے تاریخی تجربوں کے لب و لہجے کا وہی ٹھہراؤ۔ وہی متین اور سپاٹ تلا پیمانہ ہے کہ کم سے کم لفظوں میں پوری صورت حال کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

"کسی نے کہا اب پولینڈ میں جرمن فوجیں فوراً داخل ہو جائیں گی اور مغربی اتحادی کچھ نہ کر سکیں گے، لیکن ہمارے سیاسی شعور نے اس امکان کو قبول نہیں کیا۔ ہمارے دوست نے پیرس چھوڑنے کا مشورہ دیا کہ جنگ چھڑتے ہی سرحدیں بند کر دی جائیں اور ہم سوئٹزرلینڈ میں پھنس کر رہ جائیں۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"سب کے ساتھ میرے پروفیسر بھی فوج میں بھرتی ہو کر محاذ پر بھیج دیے گئے۔ ہم سب دوست احباب منتشر ہو گئے۔ [illegible] کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور آمدنی

کے [illegible] سوکھ کر خشک ہو گئے۔ مراد مارچ اس طرح نسل ہوا جیسے ۱۹۴۷ء [illegible] تھا۔
الفانسو نے کہا کہ ان ہنگامی حالات میں ایک [illegible] انہوں نے ہوٹل سے [illegible]
اپنے فلیٹ سے اس کی رہائش گاہ پر اٹھ آئے۔ نامساعد حالات [illegible] مجھے [illegible]
متشکل کو کبھی ہنسی میں ٹالنے کا وصف [illegible] ہی غلطیوں [illegible] نپٹنے کا [illegible]
نے اس سے ہی سیکھا ہے۔

ایک اور اقتباس دیکھیے:-

"الفانسو نے اپنے آتش دان کو روشن کیا اور دوسرے [illegible] صندوقوں کو [illegible] کے قریب رکھ [illegible]
کہ ان میں جتنے کاغذات ہیں انہیں جلا ڈالو اور خود اس کی تلاش میں نکل گیا۔"

[illegible] واقعات میں جو [illegible] تاریخ [illegible] کر رہے تھے ملک عام [illegible] ابتدائی افسوس
[illegible] عام طور پر ایسے واقعات [illegible] ایک پر کھا [illegible] کتنی ہی عام
[illegible] ان میں تفکر پیدا کر دیا جائے [illegible] حقیقت [illegible] عمل کی [illegible] ہوتا ہے
[illegible] بات کو [illegible] طرح [illegible] حقیقت [illegible]
[illegible] ہو۔

[illegible] کا سامان [illegible] احسن طریق ہے۔
کہ ماضی اور حصری تاریخ کے [illegible] مذکورہ پہلوؤں کو ہلکے پھلکے [illegible] لطیفاً متعارف کرے چلے جائیں اور پڑھنے والوں
کو محسوس نہ ہونے [illegible] زندگی کی تحریروں میں
[illegible] سلسلہ مسلسل [illegible] ہوتا ہے
[illegible] ہے لیکن [illegible] سبھی وسعت
[illegible] پڑھنے والے [illegible]

عائلہ کی [illegible] صحبت میں ہوئی

[illegible] کے بارے میں کچھ لکھا جا ہو تو [illegible] پہلو اور [illegible] ہیں اور بہت کچھ لکھا
جا سکتا ہے کہ تبصرہ ایک کتاب بن جانے میں سوچتی ہوں [illegible] طور پر لکھا جائے گا اور میری تحریر کی کیا
وقعت ہو [illegible] مقابلے [illegible] کی طرف [illegible] میں کیا ہے۔ یعنی حمیدہ بیگم کا حوالہ
یہ وہی خاتون ہیں جن کے نام [illegible] کا انتساب لکھوں نے [illegible] بہت ہی کم [illegible] جملے
یا فقرے ہی لقرے [illegible] ہوں [illegible] الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یعنی
[illegible] حمیدہ کے نام [illegible] لیکن بہت کچھ [illegible] یعنی جس طرح حمیدہ باجی کی حیثیت اُن کی رہین اعلیٰ اور اولیٰ کے گھرانے میں اور حقیقت
یہ ہے کہ میں نے بہت کیا ہے [illegible] اور بیگمات دیکھی ہیں۔ [illegible] جو حضرت حمیدہ باجی نے اختر جمال کو دی وہ بہت کم دیکھنے میں
آئی۔ بعض وقت بیگمات بڑی اعلیٰ درجے کی [illegible] منتظم بھی ہوتی ہیں اور [illegible] کی آسائش کا انتظام بھی کرتی ہیں [illegible] درجے انہاک

اور استغراق سے خود ان کی اپنی ذات اور شوق کی نفی ہو جاتی ہے۔ وہ امور خانہ داری اور شوہر کے منصبی رکھ رکھاؤ کی کل بن کر بلکہ ایک پرزہ بن کر رہ جاتی ہیں لیکن حمیدہ بیگم کی خانہ داری، رکھ رکھاؤ، اختر بھائی کی آسائشوں کے ہمہ وقت خیال میں بھی تنوع ہے اور دوسروں سے مختلف انداز ہے کہ وہ سنتے ہوں۔ گھر میں سب سے زیادہ ہنس مکھ اور فارغ شخص نظر آتی ہیں۔ اپنے نہایت دلکشا سادہ و پرکار گھر کے برآمدے یا لاؤنج کے تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی ہیں۔ سامنے خوبصورت سا پاندان کھلا رکھا ہے۔ دو چار لڑکے لڑکیاں اور گرد ملاقاتی جن میں بیگمات بھی شامل ہوں گی اور صاحبان بھی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہیں۔ ایک ایسی ٹون میں کہ جس کو نیم سرگوشی کہا جا سکتا ہے۔ محفل زعفران زار بنی ہوئی ہے۔ دیکھنے والے یہ سمجھیں گے کہ عجب بے فکر خاتون ہیں۔ کسی کام سے گھر کے سروکار نہیں۔ لیکن ان کی ظاہری بے فکری کے پردے میں ہمہ وقت ایک فکر کارفرما رہتی ہے۔ وہ یہ کہ اختر کے روزمرہ معمول و دستور میں ذرہ برابر اور سر مو فرق نہ آ جائے۔

پھر صفت یہ کہ خود حد درجہ زندہ دل۔ شوقین طبع۔ وسیع حلقۂ ملاقات رکھنے کے علاوہ خاندان سے لے کر ملنے جلنے والوں کے یہاں بھی شادیاں، منگنیاں، پورے طمطراق سے کروانے کی شائق، ہر تقریب کی روح رواں۔ جب تک حمیدہ باجی نہ پہنچیں ہر محفل سونی سونی نظر آئے گی۔ ادھر وہ اختر بس اور گھر ہر شادی کی تقریب کا رنگ آیا۔ ان کے گھر کا سا آمد و رفت کا سلسلہ بھی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ہر وقت گھر مہمانوں سے بھرا رہتا ہے۔ ہر قسم اور ہر نوع کی تقریبات اور رسومات کا رکھ رکھاؤ برتنے کی حد درجے شائق مگر اس احتیاط اور جان کو ملحوظ رکھ کر کہ اختر کسی طور ڈسٹرب نہ ہوں، ان کے روزمرہ اور معمول و دستور میں فرق نہ آئے۔ وہ ایسی ہر مصروفیت کے دوران ان کے ہر آرام اور آسائش کا کچھ اس انداز میں خیال رکھتی ہیں اور یوں چپکے سے ان کی ہر طلب اور ضرورت کو پورا کرتی ہیں جیسے ماں اپنے شیرخوار کا کام بے طلب اور بر وقت کرتی ہے۔

اختر بھائی کی گوناگوں اور مصروف زندگی میں ان سے بہتر ہاؤس وائف کا تصور کم سے کم میں تو نہیں کر سکوں گی۔ عجب ان تھک اور خندہ رو خاتون ہیں کہ ہر دیس اور ہر منصب کے لوگوں میں نہ صرف گھل مل جانا بلکہ ان کی سوسائٹی اور محفل میں بھی نمایاں رہنا، لیکن جب اختر کا معاملہ ہو حمیدہ باجی ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے حد کم سو دبا لیں گی جب کہ اختر صاحب کی خود ایسی کوئی کوشش ہو گی اور نہ مطالبہ۔ وہ تو ان کے معمولات اور روزمرہ میں ضبط و نظم اور معمول و دستور کا خیال عبادت اور پرستش کے انداز میں رکھتی ہیں۔ اور اس معاملے میں اختر بھائی واقعی خوش نصیب ہیں کہ وہ اپنے گھر کے ہر فرد کے دل میں ایسا ہی مقام رکھتے ہیں جس کا سبب ان کی بے طلب اور رحیمانہ شفقت ہے جو انھوں نے اپنے بچوں اور بیوی سے روا رکھی ہے۔ اس نے ان کے دلوں میں ایک دیوتا کا درجہ دے دیا ہے۔ ان کے گھر کا یہ نظارہ دیکھنے والا ہوتا ہے۔ اماں تو اماں، بیٹے بھی اردگرد یوں بیٹھتے اور ایسے سر جھکا کر کھڑے ہوتے جیسے عقیدت مند پجاریوں کے جھرمٹ میں ہوتا۔ اور یہ فقط ان کے مقدر کا کرشمہ نہیں بلکہ اس میں ان کی سیرت و اوصاف کا بھی دخل۔

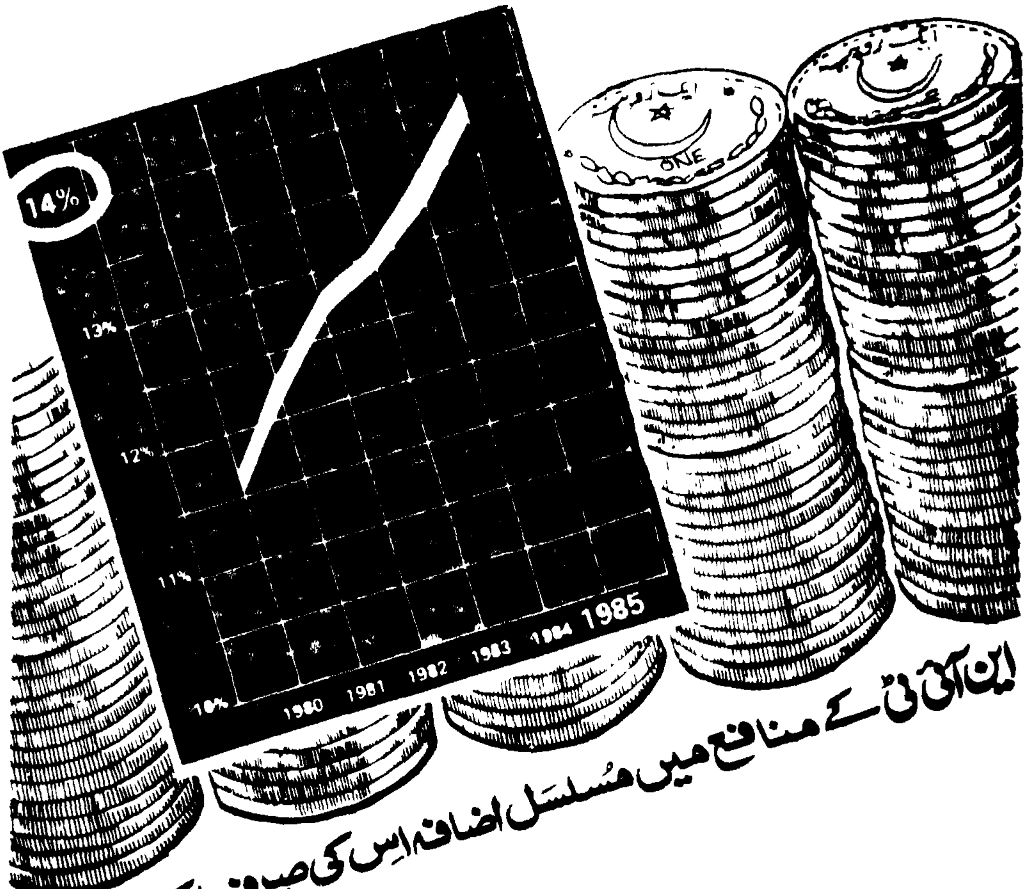
بات یہ ہے کہ حمیدہ بیگم نے تو ڈاکٹر صاحب کی حیثیت، ان کی تحریروں اور انقلابی ذہن کا انتخاب اس وقت کیا تھا جب وہ ڈاکٹر رہے ہوئے تھے اور صرف اختر حسین رائے پوری تھے۔ لیکن ان کے بچوں نے بھی ان کو دیوتا کا مقام دے رکھا ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ وہ انتہائی شفیق باپ اور قابل قدر۔ ذہنی ربط کی نسبت سے ان کے دلوں میں جگہ بناتے رہے، لیکن اس دور کے نوجوان کے مزاج میں بیگانگی رشتوں اور واسطوں سے لاتعلقی بڑھ رہی ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے ان کے بیٹوں کی یہ والہانہ الفت اور عقیدت ایک نعمت ہے۔ دراصل اس معاملے میں اختر بھائی بہت خوش نصیب ہیں کہ بیوی ملی تو ایسی شیدائی اور قدردان اور بیٹے ملے تو ایسے اور ان سب سے پہلے بھائی ملا تو ایسا عمر کے ابتدائی دور میں ان کے بڑے بھائی مظفر حسین شمیم صاحب (کہ خود ایک مستند اور وقیع شاعر تھے) ان کے ہادی اور راہنما تھے۔ ان دونوں کی محبت اور الفت ایک خاموش رو کی صورت میں جاری و ساری رہی۔ شمیم صاحب خود ایک جینئس مگر

ایسا کہ جس کی جنبش ایک بچے موتی کی طرح صدف کے بطن ہی میں سوئی رہی۔ شمیم صاحب کی جنبش کسی نامعلوم حادثے کے بنا پر اپنے خول میں سکڑ گئی اور عمر کے آخری ایام میں وہ ایک گھونگے کی طرح دانش و علم اپنے اندر لیے گھومتے رہے تمام عمر ایک بے قرار و مضطرب موج کی طرح رہے۔ ایسی موج جو نہ سمندر کی حدود و قیود کو قبول کرنے پر آمادہ ہوا اور نہ ہی شرمندہ ساحل ہونا گوارا کرے۔ وہ ہوا کا ایک ایسا جھونکا تھے جو اپنی سمت کا تعین کرنا بھول گیا ہو۔ ان کی سرگردانی دیکھیے اور ان کے بھائی ڈاکٹر اختر حسین کی محبت کھلی دیدنی کہ اس موج کا تعاقب کرتی۔ اُن کو گھر واپس آنے میں دیر ہو جاتی یا کھانے کے وقت موجود نہ ہوتے تو جس تڑپ سے اخترؔ بھائی بار بار کہتے حمیدہ بیگم شمیم صاحب نہیں آئے اب تک وہ انداز اور وہ تڑپ صرف ماں ہی کے دل کا حصہ ہوتی ہے، حمیدہ باجی لاکھ تسلی دیتیں آجائیں گے آپ کو تو معلوم ہے کہ وہ ایک بار نکل جائیں تو واپس آنا بھول جاتے ہیں، مگر ایک ذرا دیر بعد وہی فقرہ سننے میں آتا۔ حمیدہ بیگم شمیم صاحب نہیں آئے اور جو ایسے میں وہ آ ہی جاتے تو ان کو دیکھ کر جو طمانیت اُن کے چہرے پر نظر آتی وہ بیان سے باہر ہے۔

دونوں بھائی گھنٹوں ایک دوسرے کے پاس بغیر ایک لفظ بولے بیٹھے رہتے۔

تو مختصر یہ ہے کہ ایسا شخص جس کی فطرت اور شخصیت کی مبادیات ہی دھیمی دھیمی خاموش محبت کا گداز ہو اس کی تصنیف کا اسلوب زندگی اور دنیا کو برتنے اور اس پر تبصرہ کرنے کا انداز بھی اسی طور کا ہونا چاہیے۔ سو گرد راہ اسی نہاد اور اسلوب پر لکھی ہوئی ایک تصنیف ہے۔



این آئی ٹی کے منافع میں مُسلسل اضافہ اِس کی صِرف ایک خوبی ہے

اور بھی کئی خوبیاں ھیں جن سے سمجھ دار سرمایہ کار فائدہ اُٹھا رہے ھیں ۔

- انکم ٹیکس میں مقررہ حد تک چھُوٹ جو رجسٹرڈ یونٹ میں سرمایہ کاری پر ملتی ہے ۔
- این آئی ٹی یونٹوں کا مُنافع انکم ٹیکس سے بالکل بَری ہے ۔
- "مجموعی سرمایہ کاری پلان" کے تحت، مُنافع کے بدلے مزید یونٹ رعایتی داموں پر خریدے جا سکتے ہیں ۔
- یونٹ بہ آسانی بھُنائے جا سکتے ہیں ۔
- پراویڈنٹ فنڈ، رفاہی اداروں کے فنڈ اور اس طرح کے دوسرے اداروں کے سرمائے کو محفوظ اور مُنافع بخش طور پر لگانے کے لیے این آئی ٹی یونٹ منظور شدہ ذریعہ سرمایہ کاری ہیں ۔

این آئی ٹی سرمایہ کاری کا قابلِ اعتماد ادارہ

نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ

(امانتِ قومی سرمایہ کاری)

کراچی ہیڈ - ۲۲۲۰۵۹ طارق روڈ کراچی ۴۴۷۳۱۹ لاہور ۳۰۱۸۱۱، ۳۰۱۸۱۰ - راولپنڈی ۶۷۲۱۷
اسلام آباد ۸۲۸۷۱۱ ملتان ۷۵۲۱۵ فیصل آباد ۲۷۸۵۹ - حیدرآباد ۳۱۶۹۳
سکھر ۱۵۸۵۴۷ - پشاور ۷۲۶۴۹ کوئٹہ ۷۱۳۰۲ - میرپور آزاد کشمیر ۲۲۲۴۷

سید انور

گردِ راہ کا والہانہ استقبال

گرد راہ کا والہانہ استقبال دراصل ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا والہانہ استقبال ہے۔ انھوں نے بہت کم عمر میں اپنے غیر معمولی ادبی کارناموں سے ادبی حلقوں میں بڑا اونچا مقام پیدا کر لیا تھا۔ پھر وہ یکایک لڑبری سین سے غائب ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد وہ عید کے چاند کی طرح ادبی اُفق پر نمودار ہوئے اور اپنے دوستوں اور مداحوں کے لیے ایک بہت خوب صورت تحفہ لے کر آئے۔ "گردِ راہ" کا تحفہ۔ لیکن گردِ راہ نے ہمیں اس سے بڑا ایک تحفہ دیا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا تحفہ۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری واپس آ گئے ہیں۔ "گرد راہ" کا استقبال ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا استقبال ہے۔

"محفلِ ادب سے طویل غیر حاضری کے بعد چند سال قبل اس طرف لوٹنے کی مہلت ملی حضرت صہبا لکھنوی کی فرمائش پر رسالہ افکار کے لیے ایک سلسلۂ مضامین سپردِ قلم ہوا۔ بات سے بات نکلتی گئی اور کتاب کا نقشہ ذہن میں اُبھرا۔" ——— (گردِ راہ ــ صفحہ ۳۱۷)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے برصغیر کا اردو داں طبقہ بہت پیار کرتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ ہندی اور سنسکرت کے اسکالر ہیں۔ انھوں نے اسکول میں اردو کی بجائے ہندی اور فارسی یا عربی کی بجائے سنسکرت کا انتخاب کیا۔ انھوں نے بنارس یونیورسٹی سے سنسکرت میں ساہتیہ النکار کی ڈگری حاصل کی جس کی سطح ہمارے مولوی فاضل یا منشی فاضل یا ادیب فاضل کے برابر ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنا پہلا ہندی افسانہ پراجت (شکست خوردہ) نواب سراج الدولہ کی زندگی سے متاثر ہو کر ۱۹۲۸ء میں سولہ سال کی عمر میں لکھا جو لکھنؤ کے ایک ہندی رسالے مادھوری میں چھپا۔ انھوں نے کلکتے میں جہاں انھوں نے بی۔ اے کیا تھا، بنگالی زبان سیکھی اور نذر الاسلام کی نظموں کا ترجمہ اردو میں براہِ راست بنگالی سے "پیامِ شباب" کے نام سے کیا جس کے کئی اڈیشن چھپ چکے ہیں۔ انھوں نے براہِ راست سنسکرت سے کالی داس کی شکنتلا کا ترجمہ اردو میں کیا اس کے باوجود وہ ہندی زبان کے ادیب نہیں ہیں۔ اردو زبان کے ادیب ہیں۔

("میری ادبی خدمات کا اصل محور اردو کو ہی سمجھنا چاہیے" ـــ گرد راہ ـــ صفحہ ۷)

اُن کا پہلا اردو افسانہ "زبانِ بے زبانی" ۱۹۳۳ء میں علامہ نیاز فتح پوری کے "نگار" میں چھپا۔

اردو میں دسترس حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں سے انھوں نے تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ بعد میں حیدر آباد دکن کے قیام نے اُن کی اردو کی استعداد میں اضافہ کیا۔ اپنے افسانوں کے پہلے مجموعے "محبت اور نفرت" کے

لیکن گردِ راہ سے اتنا متاثر ہونے کے باوجود مجھے اس میں ایک کمی محسوس ہوئی۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اس میں کراچی کا ذکر نہیں کیا۔ اپنے کراچی کے دوستوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ ایک ابتدائی، بے رونق، بے سروسامان کراچی کا ذکر تو ہے، لیکن جب کراچی عروس البلاد اور روشنیوں کا شہر بن گیا، وہ اس کتاب میں نہیں ہے۔ ادب، موسیقی اور شطرنج کی محفلیں جو ترقی یافتہ کراچی میں ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر اُن دنوں میں منعقد ہوئی تھیں جب وہ وزارتِ تعلیم میں اپنی ملازمت کے دوران میں یہاں تعینات تھے یا بیرونِ ملک سے رخصت پر آتے تھے، اس کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ اس طرح آنندی کے حالی غلام عباس مرحوم جو اُن کے دلّی کے زمانے کے گہرے دوست تھے اور کراچی میں اُن سے متواتر ملتے رہتے تھے (اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں بھی اُن کے ساتھ ڈاکٹر صاحب سے ملنے جاتا تھا) اور شاہد احمد دہلوی مرحوم جو اُن کے ہاں موسیقی کی محفلیں برپا کرتے تھے۔ گردِ راہ ان سب کی یاد کے چند الفاظ کے اعزاز سے محروم رہی۔

میں خاص طور پر گردِ راہ میں شطرنج کی محفلوں کا ذکر پسند کرتا کیوں کہ میں ایک شور مچانے والا، قہقہے مارنے والا کھلنڈرا ادیب ہوں، اور ڈاکٹر صاحب بھی شطرنج کے شوق کو ادیبوں کے لیے مفید سمجھتے تھے۔ کیوں کہ شطرنج انسان کو دفتری ماحول اور دنیاوی مسائل سے نجات فراہم کرتی ہے۔

"میری طرح الفانسو کو بھی شطرنج کا شوق تھا۔ یہ شوق ہمیں کبھی کبھی کیفے نیپولین لے جاتا تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ نپولین یہاں شطرنج کھیلنے آتا تھا۔ ہال کے صدر میں ایک چبوترے پر اُس کی مرصع کرسی ایک خوبصورت بساط کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ اس روایت کی کشش تھی کہ دنیا بھر سے شطرنج کے شائق یہاں جمع ہوتے تھے۔

ایک رات کو میں حسبِ قرار وہاں بیٹھا الفانسو کا انتظار کر رہا تھا کہ میرے ہمسائے نے پوچھا: شطرنج کھیلو گے؟ اس عمر رسیدہ قوی ہیکل شخص سے تعارف کے بغیر میں کھیل پر آمادہ ہو گیا .... تھوڑی دیر میں میں مات ہونے ہی والا تھا۔ کہ الفانسو آ گیا اور اُس شخص کو سلام کر کے مجھ سے بولا یہ ارے تم کس سے کھیلنے بیٹھ گئے ہو۔ جانتے بھی ہو کہ یہ کاپا بلانکا ہے۔ میں نے اُس شاطرِ باکمال سے معذرت کی۔ کچھ وقت پہلے تک وہ عالمی چیمپین رہ چکا تھا۔ ... اب تو مشق نہیں پہلے مجھے شطرنج میں کافی مہارت حاصل تھی ..."

——— (گردِ راہ ۔ صفحہ ۱۳۳)

ہاں، ڈاکٹر صاحب کو شطرنج میں کوئی مہارت حاصل تھی۔ وہ اکثر غلام عباس صاحب کو اور مجھے مات دے دیتے تھے۔ ان کی آنکھیں ضائع ہونے کا نقصان اتنا ادب کو نہیں پہنچا جتنا شطرنج کو پہنچا ہے۔ اُن کی ادبی سرگرمیاں تو محترمہ حمیدہ بھابی اور جن کے نہایت فرماں بردار اور خوش اخلاق فرزند سلمان حسین کی مدد سے محدود پیمانے پر جاری رہتی ہیں، لیکن شطرنج ان سے بالکل محروم ہو گئی ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ سلمان حسین نے اپنے والدِ محترم، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی اعلیٰ ادبی اور شطرنجی صلاحیتیں وراثت میں حاصل کر لی ہیں۔ وہ انگریزی زبان کے جرنلسٹ اور رائٹر ہیں۔ صبح کے وقت ڈاکٹر صاحب کو اخبار پڑھ کر سناتے ہیں۔ شام کو روزانہ سیر کرانے لے جاتے ہیں۔ اُن کی ہابی کتابیں جمع کرنا اور شطرنج کھیلنا ہے۔ وہ شطرنج کے بڑے ہونہار کھلاڑی ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو غلام عباس صاحب کو اور مجھے ان گنت بازیاں دی ہیں۔

لیکن، گردِ راہ، میں شطرنج کی جن محفلوں کا ذکر ضرور آنا چاہیے تھا، وہ تھیں جن میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ ن۔ م۔ راشد۔ غلام عباس اور شوکت صدیقی (اور خوش قسمتی سے میں بھی) شریک ہوتے تھے۔ شہر میں ایسی محفلیں بھی ہوتی ہوں گی جہاں ادیبوں کے درمیان شراب کی بوتلیں اور کباب کی پلیٹیں جلوہ افروز ہوں گی۔ ہماری محفلوں میں شراب کی جگہ شطرنج نے لے لی تھی۔ شراب پی کر آپ اپنے غم اور دنیا کے غم بھولنے کی بجائے اُن کے بارے میں زور

زور سے باتیں کرتے ہیں۔ اگر آپ سے کوئی اتفاق نہیں کرتا تو آپ فوراً بحث پر آمادہ ہوتے ہیں۔ شطرنج کچھ عرصے کے لئے آپ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ سگریٹ نوشی بے
ہماری شطرنج کی محفلیں زیادہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں ہوتی تھیں۔ کیسے ممکن ہیں کہ بیلا کے ساتھ شطرنج کی بازی لگاتے وقت ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
کو کراچی کی شطرنج کی بازیوں کا خیال بھی آ سکتا تھا جس کے دوران میں ادب کا جائزہ بھی ہوا کرتا تھا۔

اب میں "گردِ راہ" کے آخری صفحے پڑھوں۔ اس میں ایک جملے نے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔ میں رونے بیٹھ گیا ہوں۔

"جب یہ کتاب چھپے گی تو میں اسے خود نہیں پڑھ سکوں گا۔" (گردِ راہ۔ آخری صفحہ)

یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ مصنف اپنی تصنیف کو خود نہ پڑھ سکے۔ آپریشن کے بعد اُن کی بینائی واپس نہیں آئی۔ یہ سوانح عمری انھوں نے اپنی بیگم صاحبہ اور اپنے بیٹوں کی مدد سے مکمل کی ہے۔

"کتاب کا تصور ذہن میں اُٹھا ہی تھا کہ بصارت کو جو پہلے ہی کمزور ہو چلی تھی ایک حادثے نے اس طرح متاثر کیا کہ قلم نے ساتھ چھوڑ دیا۔ میری رفیقۂ حیات اور فرزندوں نے سہارا نہ دیا ہوتا تو لکھنے کا دن سے گزر چکا ہوتا۔" (گردِ راہ صفحہ ۳۱۷)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری آنکھوں کے ایسے سے دوچار ہونے کے باوجود ایک خوش قسمت انسان ہیں اور اُن کی خوش قسمتی حقیقت میں اُن کی رفیقۂ حیات، محترمہ حمیدہ بیگم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کامیابیوں میں حمیدہ بھابی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ وہ برصغیر کے مشہور ادیب "سی آئی ڈی" اور بہرام کی گرفتاری جیسی بڑی جاسوسی ناولوں کے مصنف ظفر عمر کی دختر نیک اختر ہیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہیں اور انھوں نے اپنے والد محترم سے ادبی رجحانات ورانت میں حاصل کیے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو اس گنج گراں مایہ کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد بھی کرنی پڑی۔

"ایک دن ڈاک میں مولوی صاحب (مولوی عبدالحق) کے نام ان کے پرانے دوست ظفر عمر صاحب کا خط علی گڑھ سے آیا۔ وہ پولیس کے اعلیٰ افسر تھے مگر نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری وغیرہ جاسوسی ناولوں کے مشہور مصنف تھے۔ علی گڑھ سے چلتے وقت میں اُن کی صاحبزادی حمیدہ کا خواستگار ہوا تھا۔ اس جسارت پر وہ کبیدہ خاطر ہوئے، لیکن فیصلہ مولوی عبدالحق صاحب پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ مولوی صاحب نے وہ خط دکھایا اور پوچھا: کیا تم اس لڑکی کو جانتے ہو اور اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟ میں نے اقرار کیا تو ذرا دیر خاموش رہ کر سوال کیا:

شادی کی ذمے داری کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ ابھی تمھارا تجربہ کم ہے اور عمر کیا ہے؟

میں نے عرض کیا: وقت کے ساتھ یہ ذمے داری اٹھانے کا تجربہ ہو جائے گا۔ اگر آپ کو میری بات قدمی پر بھروسہ ہے تو سفارش کر دیجیے۔ اس طرح کچھ عرصے کے بعد میری شادی ہو گئی۔"

(گردِ راہ۔ صفحہ ۹۲)

یہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی پہلی کامیابی تھی۔ یہ کامیابی اپنے ساتھ ہزار ذمے داریاں لے کر آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ذمے داری کا بوجھ اٹھانے کا وعدہ پورا کیا اور بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے بھی سرد گرم دُکھ سُکھ میں ان کا نہایت وفاداری اور سلیقہ شعاری سے ساتھ دیا۔ پچھلے دنوں مجھے انھوں نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی تخلیقات کو انگریزی میں منتقل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے میری مدد بھی چاہی۔

سب سے بڑی بات جو حمیدہ بھابی کو پریشان کرتی ہے وہ ہے ڈاکٹر صاحب کی تنہائی۔ اس کو کم کرنے کے لیے پچھلے دنوں میں ہم نے ایک بار جمعرات کی ادبی جماعت کے ادبی اجتماع کا انتظام کیا تھا۔ یہ سلسلہ بڑی کامیابی سے جاری تھا۔ حمیدہ بھابی اس تقریب میں جو دلچسپی لیتی تھیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہر تقریب کے بعد وہ بہت شاندار اسنیکس کا انتظام کرتی تھیں اور خوش خوش ہر ادیب کو خوش آمدید کہتی جاتی تھیں اور ڈاکٹر صاحب یقیناً سب کی توجہ کا مرکز ہوتی تھی۔ لیکن ایک دن بیمار ہو کر ہسپتال چلی گئیں۔ آپریشن کے بعد ابھی تک صحت پوری طرح بحال نہیں ہوئی۔ جمعرات کی تقریبوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

ابھی ڈاکٹر صاحب کی تنہائی کی شدت کو کم کرنے کے لیے سب سے بڑا کام جناب صہبا لکھنوی نے کیا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خود نوشت "گرد راہ" چھاپی جس کا پہلا ایڈیشن دو تین ماہ میں ختم ہو گیا۔ دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے اور اب ان کے لیے افکار کا ایک خصوصی نمبر شائع کر رہے ہیں۔

ترقی پسند ادبی (گولڈن جوبلی) کانفرنس۔ کراچی

(۱۹۳۶ء — ۱۹۸۶ء)

انجمن ترقی پسند مصنفین کے پچاس سالہ جشن منعقدہ کراچی کی چار روزہ تقریبات میں برصغیر پاک و ہند اور بیرونی ملکوں کے چار سو ادیبوں اور دانشوروں نے ایک جا ہوئے اور انھوں نے ترقی پسند ادبی تحریک کے اسباب و نتائج، عصری ادب کے رجحانات، ادب اور امن عالم، پاکستانی معاشرے کے نظریاتی مسائل، آزاد ممالک کے ادب کے محرکات، پاکستانی زبانوں کے ادب کا سیر حاصل جائزہ لیا اور تاریخ ساز فیصلے کیے۔

اس جشن کا افتتاح اردو کے بزرگ ترین ادیب و نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری کے ہاتھوں عمل میں آیا اور جس کے سمپوزیم میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ایسے بزرگ ادیب بھی شامل تھے چنانچہ اس یادگار اور مثالی کانفرنس پر

افکار

بصد مسرت

خاص نمبر

پیش کرنے کا اعلان کرتا ہے

ڈاکٹر اسلم فرخی

اختر شناسی

کتابوں اور مصنفوں سے تعلق دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک ذاتی اور دوسرا غیر ذاتی۔ غیر ذاتی تو یہی کہ کوئی درسی کتاب پڑھی۔ کوئی مُتعدد کوئی مضمون دیکھا لیکن لکھنے والے یا کتاب اور مضمون سے کوئی ذاتی تعلق پیدا نہ ہو۔ جس طرح بے شمار لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا رہتا ہے۔ ضرورتاً بھی اور بے ضرورت بھی۔ مگر ذہن میں ان لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی نہ ان میں کوئی کشش محسوس ہوتی ہے۔ ذاتی تعلق کی بات دوسری ہے۔ کتاب پڑھتے ہیں، کوئی تحریر نظر سے گزرتی ہے اور اس کتاب، تحریر اور لکھنے والے سے ایک طرح کی ذہنی قربت اور قلبی تعلق محسوس ہوتا ہے۔ یہ قربت اور تعلق وقتی نہیں دائمی ہوتا ہے۔ مگر اکثر اوقات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ قربت اور تعلق ایک ہمیشہ قائم رہنے والی یاد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے میرا تعلق کچھ اسی قسم کا ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے میری شناسائی کی ابتدا یوں ہوئی کہ میرے ایک پھوپی زاد بھائی آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک تھے۔ خوش گو شاعر اور ادیب تھے۔ ہر سال جب دہلی سے گھر آتے تو ان کے ساتھ کتابوں کے بہت سے بلندے بھی ہوتے جنھیں وہ سلیقے سے الماریوں میں منتقل کر دیتے۔ بس صحیح یاد نہیں غالباً ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء کی بات ہے کہ جب وہ گھر آئے تو ان کے سامان میں ایک نئی کتاب نظر پڑی۔ نام تھا "محبت اور نفرت" اس کتاب پر لکھا ہوا تھا: "محبت ایک کانٹا ہے چبھنے کے لیے۔ نفرت ایک پھول ہے سونگھنے کے لیے۔" میں اس زمانے میں اسکول کا طالب علم تھا۔ مگر میں نے یہ کتاب فوراً پڑھنا شروع کر دی کیونکہ دوسرا جملہ مجھے بڑی حد تک ناقابل فہم معلوم ہوا۔ میں نے پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ کچھ سمجھ میں آئی، کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک بات کا احساس البتہ ہوا کہ مصنف کے یہاں ایک طرح کی جھلاہٹ اور تلخی ہے۔ میں اس عہد میں جن افسانوں اور افسانہ نگاروں کا دلدادہ تھا اُن سب کے یہاں ایک پُراسرار اور خواب ناک فضا، رومانی انداز اور جذباتی وفور کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ عام انداز یہی تھا۔ محبت اور نفرت کا انداز بالکل الگ اور ہماری اپنی دنیا کی تلخیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی۔ لیکن عجیب باتوں کو بھی گوارا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ سطحی لیکن ذاتی اور دیرپا۔

بی۔ اے کے زمانے میں "ادب اور انقلاب" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ محبت اور نفرت کا دوسرا روپ تھا۔ وہ جھلاہٹ اور تلخی جو محبت اور نفرت میں محسوس ہوئی تھی یہاں منطق اور استدلال کا دامن تھامے ہوئے تھی۔ سماجی اور سماجی پس منظر میں ادب کا جائزہ اور تنقید ملکے سے بے رحمانہ اور مناظرانہ انداز میں۔ یہ ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا جو ہم جیسے طالب علموں کو بڑا بے نظر معلوم ہو۔ اردو ادب میں ایسی تنقید کا یہ نقش اوّل تھا جس میں کسی قدر درشتی اور بلند آہنگی تھی۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے یہ دوسرا تعارف تھا۔ اس تعارف سے یہ اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر اختر حسین

اپنے دور کی نمائندگی کرنے والے ادیب و نقاد ہیں۔ وہ ادب و زندگی کے گہرے ربط و تعلق کو اجاگر کرنے والے باشعور نقاد بھی ہیں جن کا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے جو صرف اردو ادب کے مطالعے تک محدود نہیں بلکہ پورے برصغیر اور اس سے آگے بڑھ کر عالمی سطح کے ادب پر بھی محیط ہے۔

۱۹۴۸ء کے اوائل میں ایک دن وزارت تعلیمات کے دفاتر سے گزر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے نام کی تختی ایک دروازے پر نظر آئی۔ میں نے فوراً چٹ اندر بھجوائی۔ ڈاکٹر صاحب نے کسی تامل کے بغیر بلا لیا۔ ایک کم سواد اور غیر معروف طالب علم سے ڈاکٹر صاحب بڑی خوش خلقی سے پیش آئے۔ وہ تمام لوگ جو تدریس سے دوسرے پیشوں میں جاتے ہیں بالعموم نوجوانوں کے ساتھ اسی بزرگانہ شفقت سے پیش آتے ہیں جو اساتذہ کا خاصہ ہے۔ یہ صفت ڈاکٹر صاحب میں کبھی کبھی اگرچہ اس ملاقات میں وہ اپنے آپ کو بہت کچھ لیے دیے رہے تاہم بزرگانہ شفقت کی ایک جھلک نمایاں ضرور رکھی میں دراصل یہ جاننا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی ترقی پسندی، نظریات و خیالات کے باوصف انگریزی حکومت کی ملازمت سے کیوں وابستہ ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر اختر حسین اور ان کی نسل کے بعض اور ترقی پسند ادیب اپنی تند و تیز تحریروں کی وجہ سے ادب کا ذوق رکھنے والے نوجوان قارئین میں بڑے مقبول تھے۔ ان لوگوں کا اپنے آدرش سے کنارہ کش ہو کر اسیر دام فرنگ ہو جانا ہم لوگوں کے لیے ایک ناقابل فہم مسئلہ تھا۔ اپنی زندگی کو حسب خواہش مرتب کرنا اور اپنے لیے کوئی بھی راہ اختیار کرنا ہر شخص کا حق ہے لیکن نوجوانی کے تند و بے مصلحت دور میں ہم لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ادیب اور شاعر قومی ملکیت ہوتے ہیں اور انھیں دوسروں کی راہ سے فرار اختیار کر کے زندگی کی نام نہاد آسائشوں کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو بھی ہوئی۔ خوش اخلاقی کا مظاہرہ بھی دیکھا لیکن دل کی کلی نہیں کھلی تشنگی کا احساس برقرار رہا۔ دل نے کہا یہ شخص بڑا آدمی تو ضرور ہے لیکن اپنے دل کا بھید کسی کو نہیں بتاتا جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ کسی کو اعتماد میں نہیں لیتا۔

اس ملاقات کے بعد ڈاکٹر صاحب سے متعدد بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ ریڈیو اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب تقریر کرنے یا دانش کدہ پروگرام میں حصہ لینے آتے رہتے تھے۔ شاہد بھائی کے یہاں موسیقی کی محفلوں میں بھی ڈاکٹر صاحب برابر شریک ہوتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو موسیقی سے بڑا شغف ہے اور وہ کلاسیکی موسیقی کے رسیا بھی ہیں مگر کیفیت وہی رہی زیر احمد دور کا جلوہ۔ کبھی کھل کر بات نہیں ہوئی۔ شاہد بھائی کو ڈاکٹر صاحب کے سلسلے میں گرویدہ ڈاکٹر صاحب کے مداح تھے۔ ان کے بعض واقعات بھی مزے لے لے کر سناتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے برادر بزرگ شمیم صاحب سے بہت ملاقاتیں رہیں۔ شمیم صاحب نہایت خوش گو۔ ملنسار اور دردمند انسان تھے۔ ایک ذرا چھیڑ دیجیے اور پھر سنتے رہیے جس موضوع پر گفتگو کرتے یہ محسوس ہوتا کہ ساری زندگی اسی موضوع کے مطالعے میں گزاری ہے۔ مجھے دونوں بھائیوں میں بڑا فرق محسوس ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کم گو اور کم آمیز نظر آئے شمیم صاحب خوش گو اور فوراً بے تکلف ہو جانے والے بزرگ تھے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب سے قربت میسر نہ آئی تاہم یہ دیکھتا رہا کہ موصوف نے وزارت تعلیم میں بڑی لگن اور خلوص سے کام لیا۔ کراچی کے اسکولوں کے لیے ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں انتہائی دیدہ زیب اور مستند درسی کتابیں تیار ہوئیں۔ یہ کتابیں ایسی تھیں کہ [illegible] کی درسی کتابوں کے معیار پر رکھا جا سکتا تھا۔ [illegible] بہت اچھی کتابیں علمی اور پیشہ ور ممتاز اساتذہ اور ماہرین کا ترتیب دیا ہوا متن ملا [illegible] تعلیمات میں [illegible] کا [illegible] جاری رہتے تو آج ہماری درسی کتابوں کا معیار کہیں بہتر ہوتا۔

پھر ایک دن یہ اطلاع ملی کہ ڈاکٹر صاحب یونسکو سے وابستہ ہو کر ملک سے باہر چلے گئے۔ لکھنے لکھانے کے افق سے وہ بہت پہلے غروب ہو چکے تھے اب ملک سے بھی رخصت ہو گئے۔ یہ خبریں ملتی رہیں کہ آج صومالیہ میں ہیں۔ آج کل ایران میں ہیں۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ بہاریں خزاں اور خزاں بہاروں میں تبدیل ہوتی رہی کہ ڈاکٹر صاحب کے ملک واپس آنے کی خبر ملی۔ کچھ دن بعد نظر بھی آئے۔ ملاقات بھی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی بھی آتے رہے اگرچہ ان کی بصارت خاصی متاثر ہو چکی تھی لیکن بصیرت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ بصارت متاثر ہونے کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی رفتار۔ گفتار۔ لباس اور انداز میں وہی دیرینہ رکھ رکھاؤ تھا جو ذی عظمت بزرگوں کی خصوصیت ہے۔ میں نے بعض ایسے

بوڑھے بھی دیکھے ہیں جو اپنی پیری میں انتقاماً نہایت شوخ رنگوں کا لباس پہنتے ہیں اور حرکات و سکنات سے جوانی کی سرشوری کا منہ چڑاتے نظر آتے ہیں۔ ادب کی نئی تحریکوں اور نئے لکھنے والوں سے قطعی نابلد ہونے کے باوجود یہ لوگ ہر جگہ اپنی ادبی مہارت کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں اور جس طرح بچے تالاب میں پتھر پھینک کر لہروں کا تماشہ دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی ادبی سطح پر ہنگامے کر کے خوش ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے قدیم انداز کو برقرار رکھا۔ اُن کی گفتگو میں عالمانہ وزن و وقار اور مسائل پر سوچی سمجھی رائے کا اظہار پہلے کی طرح اب بھی موجود ہے۔

کراچی یونیورسٹی نے سال اقبال کی تقریبوں کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کے ایک لیکچر کا اہتمام بھی کیا تھا۔ یہ لکچر سماعت گاہ فنون میں ہوا۔ حاضرین کی تعداد بہت کم تھی بمشکل پچاس ساٹھ افراد ہوں گے شیخ الجامعہ ڈاکٹر احسان رشید تھے۔ وہی اس جلسے کے صدر بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا لیکچر اقبال۔ ٹیگور اور پال ولیری کے فن اور خیالات و افکار کے تقابل و تجزیے سے متعلق تھا۔ مجھے اپنی زندگی میں بے شمار مقرروں کو سننے کا موقع ملا ہے۔ سیاسی تقریریں بھی سُنی ہیں اور علمی خطبات کی سماعت میں بھی شریک ہوا ہوں مگر جو لطف ڈاکٹر صاحب کے لیکچر میں محسوس ہوا وہ کہیں اور حاصل نہ ہوا دھیما لہجہ۔ شائستہ آواز۔ ہر ہر لفظ علمی تبحر میں ڈوبا ہوا۔ اقبال۔ ٹیگور۔ اور ولیری سے ذاتی شناسائی کے پس منظر میں بیسویں صدی کے ان تین عظیم فن کاروں کے فن کا محرمانہ جائزہ۔ افسوس ہے کہ یہ لیکچر ٹیپ نہ ہو سکا کیونکہ ٹیپ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا میری طرح جس شخص نے بھی یہ لیکچر سُنا عش عش کرا ٹھا۔ اُس دن بجا طور پر یہ احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کا علم کتنا تازہ۔ ادبیات عالم پر ان کی نظر کتنی گہری اور ان کا انداز کتنا دل نشین ہے۔ وہ جو ایک تلخی اور درشتی 'ادب اور انقلاب' اور 'محبت و نفرت' میں محسوس ہوئی تھی اس کا دور دور کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس کے بجائے تخاطب میں نرمی اور عالمی سطح کے تجربوں سے مالا مال زندگی کے گہرے مشاہدے کا امتزاج تھا۔ یونیورسٹی میں مدتوں اس لیکچر کی دھوم رہی اور یہ پروگرام بنتے رہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ہر سال ایک آدھ بار اس قسم کے لیکچروں کے لیے زحمت دی جائے لیکن ڈاکٹر احسان رشید یونیورسٹی سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانشین حسن ادب سے بالکل محروم تھے۔

ڈاکٹر صاحب اقبال اور ٹیگور دونوں سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ میرا خیال تھا کہ لیکچر کے دوران وہ اپنے ذاتی تاثرات بھی بیان کریں گے کیونکہ اکثر مقررین ذاتی تعلقات کے اظہار پر بڑا زور دیتے ہیں تاکہ ان کی ذاتی حیثیت کے اعتبار میں اضافہ ہو لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس قسم کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اپنی شخصیت کو ہمیشہ کی طرح پس پشت رکھا۔ میرا تاثر یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے یہاں بھی اپنی ذات کو الگ تھلگ رکھا اور نہاں خانۂ دل میں جھانکنے کا کوئی موقع نہیں دیا۔

"گرد راہ" شائع ہوئی تو میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ اب ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کا موقع مل جائے گا لیکن مطالعے کے بعد احساس ہوا کہ "گرد راہ" وہ خود نوشت ہے جس کے مصنف نے سب کچھ کہنے کے باوجود اپنی شخصیت کے اظہار پر قدغن عائد کر رکھی ہے "گرد راہ" بیسویں صدی کے ایک نہایت ہوش مند۔ زیرک اور با صلاحیت ادیب کی زندگی کا وہ منظر نامہ ہے جس میں ذات کی جلوہ گری کم۔ ماحول اور حالات کا عکس بہت زیادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔ "میں طبعاً خلوت پسند ہوں۔ دنیا کو رازداں بنانا مجھے پسند نہیں" اس خلوت پسندی کا نتیجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ذاتی زندگی۔ پسند۔ ناپسند اور احساسات کی بڑی ہلکی سی جھلک "گرد راہ" میں ملتی ہے۔ مجھے کہیں کہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ جیسے ڈاکٹر صاحب اپنی نہیں کسی اور کی داستانِ حیات بیان کر رہے ہیں۔ آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے کا ہنر میر صاحب کی شاعری میں بھی ہے مگر وہاں جگ بیتی جو سنتا ہے اُسی کی داستان معلوم ہوتی ہے "گرد راہ" میں آپ بیتی سرگزشت غیر معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کسی کو اپنا رازداں بنانا پسند نہیں کیا۔ "گرد راہ" میں سماجی منظر نامے کو فرد پر تفوق حاصل ہے بلکہ کہیں کہیں سماج اور فرد کے تعلق میں فرد بالکل ہی غائب ہو گیا ہے۔ عمرانی مورخ کی نظر میں سماج کا مطالعہ ہی اہم ہے۔ وہ اسباب و علل پر غور کرتا ہے، ان پر بحث کرتا ہے۔ نتائج مرتب کرتا ہے،

فرد کی حیثیت اس کے یہاں علامتی ہوتی ہے۔ "گرد راہ" میں بھی فرد کی حیثیت علامتی ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی چھے عشروں اور ان عشروں سے گزرنے والی زندگی اور ماحول، کا حکیمانہ تجزیہ "گرد راہ" میں جا بجا ملتا ہے۔ مصنف کی نظر بہت گہری، مطالعہ بہت وسیع، ذہن جذباتی لگاؤ اور دباؤ دونوں سے آزاد اور قلم بے باک رقم ہے۔ ہمارے معاشرے کا ایک بڑا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص انا گزیدہ ہے۔ موقع ہو یا نہ ہو ہم زندگی کو اس طرح گزارنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ ہر لمحے انا یا بہ الفاظ دیگر تسکین نخوت ہوتی رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے "گرد راہ" میں کہیں بھی انا پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بہت سے موقعے تھے جہاں وہ اپنے کارناموں کو بجا طور پر بیان کر سکتے تھے، لیکن عقلیت پسندی اور خلوت گزینی دونوں نے انھیں نام نہاد انانیت کے مظاہرے سے محفوظ رکھا۔ اگرچہ اس عمل سے کسی حد تک قاری نے انھیں دل کے قریں محسوس نہیں کیا تاہم ان کی عظمت کا قائل ضرور ہو گیا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے قاری کو اپنی نجی زندگی کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ اپنی جذباتی زندگی کے بارے میں صرف ایک جملہ لکھ کر کہ حیدرآباد آنے ہوئے میں حمیدہ کی خواستگاری کر کے انھیں ناراض کر چکا تھا اس سلسلے کو بالکل ختم کر دیا ہے' یا تو یہ راز داں نہ بنانے والی بات ہے یا پھر آداب مشرق کا اثر ہے۔ یہ انداز اختیار کرنے میں ڈاکٹر صاحب تنہا نہیں۔ کچھ اسی قسم کا انداز سر رضا علی کے اعمال نامے میں بھی ملتا ہے۔ انھوں نے محض چند سطروں میں یہ بیان کر دیا ہے کہ "جنوبی افریقہ دوسری مرتبہ میں ۱۹۳۵ء کے شروع میں گیا تھا۔ تین سال وہاں رہا۔ وہاں پہنچے دو مہینے گزرے تھے کہ میں مس پونز دیلوسامی کا (بعد میں لیڈی رضا علی ہوئیں) کمبرلے میں مہمان ہوا اور میں نے شادی کا تہیہ کر لیا۔" ڈاکٹر صاحب کا انداز اس سے بھی زیادہ مبہم ہے۔ یہاں مجھے دو خود نوشتوں کا خیال آتا ہے بیسویں صدی کے ممتاز سوانح نگار آندرے موریا نے اپنی خود نوشت میں اپنے جذباتی لگاؤ کی روداد بڑے سادہ لیکن پُر اثر انداز سے بیان کی ہے جب ہم اُس کے سر نفتے فرانس سے آکسفورڈ جانے کی روداد پڑھتے ہیں۔ وفورِ جذبات سے آگاہ ہوتے ہیں اور پھر اُس کی ماں کے اس جملے سے دوچار ہوتے ہیں "میں جانتی ہوں کہ تم نے انگلستان میں شادی کرلی ہے۔" تو ہمیں نہ صرف فطری انسانی رویّہ اور نفسیات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے بلکہ ہمیں موریا کے ساتھ ہمدردی بھی ہوتی ہے اور ہم اُس کی زندگی میں خود کو شریک سمجھتے ہیں۔ دوسری خود نوشت منصور عالم، مورخ، ناول نگار اور شاعر رابرٹ گریوز کی ہے۔ گریوز نے بھی اپنے جذباتی سفر کی روداد بڑے اعتماد سے بیان کی ہے۔ لگاؤ اور پھر اس کا اختتام سب کچھ بڑے سلیقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مزاج کے تلوّن اور ذہنی اضطراب کا اندازہ ہر قاری کو ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں خاندانی امور کی بھی کوئی تفصیل نہیں بلکہ اگر "گرد راہ" میں ڈاکٹر صاحب کا فیملی گروپ شامل نہ ہوتا تو قاری کو یہ اندازہ بھی نہ ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ صاحبِ اولاد بزرگ ہیں۔ یہ بات خاصی تعجب خیز ہے اور غالباً وہی راز داں نہ بنانے والا جذبہ یہاں کار فرما ہے۔

"گرد راہ" میں بعض مقامات مصنف کی LOUD THINKING پر مشتمل نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی روداد حیات لکھتے لکھتے (اور یہ اکثر ہوتا ہے) بہ آواز بلند سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہیں کہیں اس سوچ کی حدیں وعظ و تلقین سے بھی جا ملتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ادیب اور مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ سوشل فلاسفر کی حیثیت بھی رکھتے ہیں! اصولی طور پر انھیں مارکس کے نقطۂ نظر سے اتفاق ہے لیکن اس نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہونے میں ذاتی مطالعے، تجربے اور غور و فکر کو بڑا دخل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تحریروں میں ایک نوجوان مارکسسٹ کی سی تندی اور تلخی تھی، لیکن "گرد راہ" تک پہنچتے پہنچتے یہ تلخی ایک خوش گوار توازن، نرمی اور رواداری میں تبدیل ہو گئی ہے۔ "محبت اور نفرت" اور "ادب و انقلاب" میں نوجوانی کا زعم اور شوخی ہے۔ "گرد راہ" میں پند پیر دانا کی نرمی، گھلاوٹ، شعور کی پختگی اور زندگی کا گہرا ادراک ہے! اس بصیرت کا بھرپور اظہار ہے جو صرف مطالعے سے حاصل نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب نے "گرد راہ" میں چونکہ بالعموم اپنی ذات کو پسِ پشت رکھا ہے اور اس کے حوالے سے کم از کم گفتگو کی ہے اس وجہ سے وہ اپنے نامور معاصرین کے بیان میں بھی سرسری گزر گئے ہیں۔ ایک معروف اور عہد ساز ادیب کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کے تعلقات

ملک کے بیشتر ادیبوں ۔ شاعروں اور دانش وروں سے تھے اور پھر ہندی اور بنگالی سے شغف رکھنے کی وجہ سے وہ ہندی اور بنگلہ ادیبوں سے بھی پوری طرح واقف ہیں، لیکن نہ جانے کیوں اُنھوں نے اپنی واقفیت کو کھُل کر بیان نہیں کیا۔ صرف مجاز کے حوالے سے اس کی نظم "رات اور ریل" کی تخلیق کا پس منظر بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے عمر کا بڑا حصہ کلکتے۔ علی گڑھ۔ حیدر آباد دکن۔ امرتسر۔ دہلی۔ شملے اور کراچی میں گزارا، لیکن ان شہروں کی ادبی سرگرمیوں۔ لکھنے والوں۔ ادبی تحریکوں اور ہنگاموں سے ڈاکٹر صاحب نے دامن بچالیا ہے۔ شاید ڈاکٹر صاحب اپنے ذاتی تعلق اور حوالے کو منظرِ عام پر لانا پسند نہیں کرتے۔ میں مجنوں صاحب کے اس خیال سے پوری طرح متفق ہوں کہ "گرد راہ" پچھلے پچاس ساٹھ برسوں کی ادبی۔ تہذیبی۔ سیاسی اور سماجی تاریخ کی زندہ دستاویز ہے، اگرچہ یہ دستاویز ایک فرد کے حوالے سے مرتب کی گئی ہے، لیکن حالات و واقعات پر عصر کا غلبہ ہے فرد کا نہیں۔ فرد کو محض ایک علامت کی حیثیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں یہ بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ سارتر سے اپنی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ سارتر نے اُن سے دریافت کیا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے اور بعد کے پیرس میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کہا کہ آج کی زندگی میں قدروں کا نام و نشان نہیں ملتا۔ اس پر سارتر کا تصور بڑا معنی خیز اور حقیقت پسندانہ تھا۔ اُس نے کہا "نئے انسان کی نظر میں کپڑے دھونے کی مشین قدروں سے زیادہ مفید ہے۔" نئے انسان کی حد تک تو یہ بات بالکل ٹھیک ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی نسل کے افراد نے عصر اور معاشرے کو قدروں اور انسانوں سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

"گرد راہ" اردو کی وہ قابلِ ذکر اور اہم خود نوشت ہے جو جذباتی ہیجان کی نمائش سے بالکل پاک ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی روداد حیات کو علمی اور معروضی انداز سے مرتب کیا ہے۔ اس کا بنیادی وصف وہ عقلیت پسندی ہے جو آہستہ آہستہ جنسِ نایاب کی حیثیت اختیار کرتی جارہی ہے۔ صرف دو مقام ایسے نظر آئے جہاں ڈاکٹر صاحب نے اللہ والی اور جذب میں کل کا تماشہ دیکھنے والے دستِ شناس کی پیشین گوئی کا تذکرہ کرکے خود اپنی عقلیت پسندی کو للکارا ہے، لیکن عمومی تاثر اس سے مجروح نہیں ہوا۔

تاریخ کسی فروگزاشت کو معاف یا کسی خلا کو پُر نہیں کرتی۔ یہ اس کا عمومی رویّہ ہے۔ بہت سے لکھنے والے ایسے تھے جنھوں نے جوانی کی ترنگ اور سرشاری میں بعض بہت اچھی چیزیں لکھیں، لیکن پھر وہ پیشہ ورانہ مصروفیتوں کی نذر ہو کر ادب و شعر کی دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگئے۔ تاریخ نے انھیں فراموش کر دیا اور ان کی ادبی سہل انگاری کو معاف نہیں کیا۔ اردو ادب میں بھی اس فروگزاشت کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے "گرد راہ" لکھ کر اپنی ادبی فروگزاشت کا بھرپور کفارہ ادا کر دیا ہے۔ "ادب اور انقلاب" اور "محبت و نفرت" ان کے ادبی سفر کی ابتدا تھی "گرد راہ" انتہا ہے۔ ابتدا اور انتہا میں جو بُعد اور انقطاع پیدا ہوگیا تھا ڈاکٹر صاحب نے اُسے بڑی خوش اسلوبی سے ختم کر دیا ہے۔ تسلسل کو برقرار رکھنا اور اول کو آخر سے ملا دینا ایک قابلِ ذکر اور اہم ادیب کی خوش گوار بازیافت ہے۔

"گرد راہ" اردو کے سوانحی ادب میں اہم اضافہ ہے۔ اس سے خود نوشت کے ایک نئے معیار کا تعین ہوا ہے۔ خود پسندی کے اس دور میں جب کہ ہر شخص اپنے نام نہاد کارناموں کا ڈھول گلے میں ڈالے دوسروں کی سماعت کو خواہ مخواہ متاثر کر رہا ہے۔ "گرد راہ" ایک متین سنجیدہ اور بصیرت افروز خود نوشت ہے جو "درجنوں از خود رفتن کار ہر دیوانہ نیست" کا سلیقہ بھی سکھاتی ہے، اور "از دلیو و دد ملولم و انسانم آرزو ست" کے ماحول میں ایک انسان کے نقوش بھی اُجاگر کرتی ہے۔



پاکستان کی مقبول ترین
اور پُرسہولت ماہانہ آمدنی اسکیم

ڈپازٹ کے پہلے ہی مہینے سے
مُنافع کی ماہ بہ ماہ ادائیگی

ایک لاکھ روپے کے سالانہ ڈپازٹ پر گیارہ سو روپے ماہانہ مُنافع کمایئے

- گھر بیٹھے نقد/چیک/ڈیمانڈ ڈرافٹ کی صورت میں ماہانہ اقساط کی وصولیابی کی سہولت
- منافع کے حصول میں کوئی پریشانی نہیں
- ڈپازٹ بالکل محفوظ
- ماہانہ اقساط کی ادائیگی کے معنی ہیں مُنافع میں مزید اضافہ

شرح منافع

رقم سرمایہ	ماہانہ مُنافع
ایک لاکھ روپے	۱۱ سو روپے
پچاس ہزار روپے	پانچ سو پچاس روپے
پچیس ہزار روپے	دو سو پچھتر روپے
دس ہزار روپے	ایک سو دس روپے
پانچ ہزار روپے	پچپن روپے

منتھلی انکم سرٹیفکیٹ آف ڈپازٹ (K) اسکیم
پنشن یافتہ افراد، بیواؤں، بیرونِ ملک مقیم پاکستانی حضرات اور سماجی بہبود کے اداروں اور ان افراد کے لئے جنہیں ہر ماہ رقم چاہیئے۔ نہایت موزوں ہے۔

نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن

NDFC

پی این ایس سی بلڈنگ۔ مولوی تمیزالدین خان روڈ۔ پوسٹ بکس ۵۰۹۴ کراچی۔۲
فون: ۵۵۱۰۷۶-۷۹-۰

برانچیں:

کراچی: (۱) شاہین کمرشل کمپلیکس ایم آر کیانی روڈ فون: ۵۲۲۳۱ اور ۵۲۱۱۰ (۲) طارق روڈ پی ای سی ایچ ایس فون: ۴۳۳۴۰۹ اور ۴۳۹۶۳۱ (۳) الصادق چیمبرز کورنگی روڈ فون: ۳۴۴۷۸ (۴) الکرم اسکوائر شاہراہِ پاکستان فون: ۶۸۲۲۱۳ (۵) کے ڈی اے سوک سینٹر گلشن اقبال فون: ۴۲۱۴۳۹ اور ۴۲۱۴۴۹ راولپنڈی: (۱) کلب بلڈنگ دی مال فون: ۶۵۳۱۹ اور ۶۸۲۳۰ (۲) ایم ۲۱ مری روڈ بالمقابل پولو ہار ہوٹل فون: ۸۴۳۷۱۶ اسلام آباد: نمبر ۴۴ جناح سپر مارکیٹ ایف ۶/۲ فون: ۸۲۲۸۵۲ اور ۸۲۷۱۱ لاہور: (۱) رفیع مینشن شاہراہِ قائداعظم فون: ۵۵-۳۰۱۷۵۴ اور ۳۰۴۹۰۴-۰۵ (۲) گلبرگ ۲ نمبر ۷/اے مین بولیوارڈ فون: ۸۸۳۹۰۰/۸۸۳۲۳۰ پشاور: ۶ صدر روڈ فون: ۷۰۰۵۳ ملتان: اسٹیٹ لائف بلڈنگ چوک نواں شہر فون: ۶۹۲۳۴ فیصل آباد: پی ۱۰۸ کوتوالی روڈ فون: ۲۸۹۵۲ گوجرانوالہ: ادوریڈ برج فون: ۳۶۹۴ ٹیکسلا: ہیوی میکینکل کمپلیکس پریمیز فون: ۲۹۳۹ کوئٹہ: جناح روڈ فون: ۱۱۱۷ حیدرآباد: گل سینٹر ٹھنڈی سڑک فون: ۲۲۲۱۱ میرپور (آزاد کشمیر) بنک اسکوائر فون: ۲۵۳۹

ADGROUP

PID/Islamabad

ڈاکٹر کلیم سہسرامی

ڈاکٹر اختر حسین تہران میں

کچھ اپنی اور کچھ ان کی زبانی

ماہنامہ ساقی (دہلی) اور "نگار" (لکھنؤ) کے صفحات پر جب نظر پڑتی تو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام نظر سے گزرتا۔ ان کے مضامین اور افسانے دل چسپی سے پڑھتا، لیکن یہ طالب علمی کا عہد تھا، ان تحریروں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ "ساقی" کے صفحات پر ایک گروپ فوٹو بھی نظر سے گزرا تھا جس میں ڈاکٹر اختر حسین کے علاوہ شاہد احمد دہلوی، انصار ناصری، ظفر قریشی وغیرہ کی تصویریں تھیں، لیکن سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے مزاج و معیار اور نقطۂ نظر کو سمجھنے کا موقع اس وقت ملا جب میں اردو آنرز کے امتحان میں شریک ہونے والا تھا۔ تنقید کے پرچے کے لیے ان کی انقلاب آفریں کتاب "ادب اور انقلاب" خصوصیت سے مطالعے میں رہی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ غیر ملکی خصوصاً فرانسیسی تنقیدی عناصر کو اردو ادب میں جس طرح پیش کیا گیا ہے، اس سے ترقی پسند ادب کے ساتھ ساتھ اردو تنقید کا دامن بھی مالا مال ہو گیا ہے۔ ایم۔ اے کی تیاری کے سلسلے میں تنقید و ادب سے دل چسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتابیں بھی پڑھیں تاکہ ان کے فکر و فن اور ذہن و زاویۂ نظر کو بہتر طور پر سمجھ سکوں۔ اس کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ یہ وہی ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ہیں جنھوں نے "پیامِ شباب" مرتب کر کے پہلی بار بنگال کے مشہور باغی شاعر قاضی نذر الاسلام کو اردو میں متعارف کرایا اور کالی داس کی شہرۂ آفاق کتاب "شکنتلا" کا ترجمہ براہِ راست سنسکرت سے کیا۔ ایک طرف "ادب اور انقلاب" کے معروف ناقد ہیں تو دوسری طرف "محبت اور نفرت" کے مشہور افسانہ نگار اور میکسم گورکی کی "آپ بیتی" کے مترجم بھی۔ لیکن عجیب اتفاق کہ جب برصغیر تقسیم ہو چکا اور میں ایم۔ اے پاس کر چکا تو ڈاکٹر صاحب کی جھلک ایک مخصوص مجلس موسیقی میں دیکھی۔ یونسکو کے جنوب مشرقی ایشیائی ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کراچی سے ڈھاکے تشریف لائے ہوئے تھے اور شاہد احمد دہلوی صاحب جنوبی ایشیا کے دورے سے موسیقی پر لیکچر دے کر واپس ہوئے تھے۔ ہم چند احباب نے ان کے اعزاز میں پروفیسر احد احسن اشک صاحب کے دولت خانہ محلہ آغا مسیح لین میں ایک مجلس موسیقی کا انتظام کیا۔ ڈھاکا ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر برادر محترم کلیم اللہ صاحب کی وساطت سے ریڈیو کے مخصوص موسیقار، طبلہ نواز، سارنگی اور ستار کے ماہرین آ گئے تھے۔ اختر صاحب یہیں اپنے قدیم علی گڑھی دوست ڈاکٹر نفیس احمد صاحب پروفیسر و صدر شعبۂ جغرافیہ ڈھاکا یونیورسٹی کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ نشست کے درمیان جب وقفہ ہوا تو ان سے تعارف ہوا۔ مجھ سے استفسار کیا کہ آپ کا مشغلہ کیا ہے؟ جب بتایا کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی

کی نگرانی میں شاد عظیم آبادی پر ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھ رہا ہوں تو میری طرف کچھ زیادہ متوجہ ہوئے۔ فرمانے لگے کہ شاد کے بھانجے نواب نصیر حسین خیال کے علمی و ادبی مقالوں کو دستیاب کرنے کی کوشش کیجیے، ان پر ایک اچھا کام ہونا چاہیے۔ پھر وہ کراچی واپس چلے گئے اور میرا تقرر راج شاہی گورنمنٹ ڈگری کالج میں ہوگیا اور میں راج شاہی چلا آیا۔

۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر حسین خطیبی (ایران اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر) کی سربراہی میں، ایرانی ماہرین تعلیم اور ممبران پارلیمان کا ایک وفد آیا۔ اس نے ایران۔ پاکستان دوستی کو استحکام بخشنے کے لیے پاکستانی طلبہ کے لیے فارسی زبان و ادب میں ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے بیس وظیفوں کا اعلان کیا۔ مشرقی پاکستان سے قرعۂ فال میرے نام بھی پڑا اور ۱۹۶۵ء میں ۲۷ ویں نومبر کی ایک سرد ترین رات کے دو بجے پاکستانی طلبہ کے ساتھ تہران کے مہرآباد ہوائی اڈے پر پہنچا۔ کراچی سے پاکستانی اور ایرانی دونوں ممالک کے دفتروں کے اطلاع دینے کے باوجود پاکستانی سفارت خانے کا ایک نمائندہ بھی ہوائی اڈے پر موجود نہ تھا۔ ہم "نوزاردانِ بساط ہوائے دل" ایرانی ہواپیما کے عملے سے مخصوص درخواست پر ہوائی اڈے سے لے جاکر تہران یونیورسٹی کے دبیر خانہ (انتظامی امور کے بلاک) کے سامنے چھوڑ دیے گئے۔ کڑاکے کی سردیوں میں نہ رہنما، نہ راستوں سے واقفیت، قلی کا پتا نہیں، سامان کون سنبھالے۔ یہ ایسی ناگفتہ بہ اور عبرت ناک داستان ہے جس کی وجہ جواز پاکستانی سفارت خانے کے ثقافتی دفتر کے پاس آج بھی نہیں۔

تین مہینے بعد میری بیگم بھی ایران پہنچ گئیں۔ آہستہ آہستہ جن اردو داں طبقوں سے واقفیت اور شناسائی بڑھی، ان میں حسن صاحب، سلطان احمد صدیقی صاحب اور ان کے پڑوسی فاروقی صاحب کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ سلطان صاحب اور فاروقی صاحب ردولی (یوپی) کے تھے جو پاکستان اور ایران کی ہوائی کمپنی میں اعلا عہدوں پر تھے اور حسن صاحب کا تعلق مظفر پور (بہار) سے تھا جو ایران کی کسی بڑی تجارتی کمپنی میں حساب دار تھے اور تمام پاکستانیوں میں سب سے زیادہ تنخواہ پاتے تھے۔ ان لوگوں سے روابط استوار ہوئے تو یہ انکشاف ہوا کہ فاروقی صاحب ایک خوش گو شاعر بھی ہیں اور حسن صاحب بہار نیشنل کالج (پٹنہ) میں ۱۹۴۸-۴۶ء کے دوران میرے رفیقِ درس تھے۔ ان حضرات کے یہاں کبھی کبھار دعوتوں میں بھی شرکت ہوتی۔ ۱۹۶۷ء میں ایک مرتبہ حسن صاحب نے خصوصیت سے مجھے مدعو کیا اور یہ بتایا کہ آج ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں۔ میں بڑے اشتیاق کے ساتھ پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب سے تعارف ہوا تو ڈھاکے کی اس مجلس موسیقی کی یاد دہانی کرائی جہاں کئی سال قبل ہم دونوں مل چکے تھے۔ انھیں یہ بات یاد آگئی اور پھر وہ کچھ دیر استاد محترم ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب کی خیر و عافیت دریافت کی۔ اس کے بعد شاد عظیم آبادی اور نواب نصیر حسین خیال کے بارے میں مجھ سے تفصیلی گفتگو کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں شاد کے عہد میں ان سے بہتر غزل گو نہ تھا۔ جب وہ ادبی، تنقیدی اور شاعرانہ زاویۂ نظر سے شاد کے کلام پر گفتگو کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ میر سے لے کر شاد تک کی غزل گوئی کی تاریخ میری نظروں کے سامنے کھلی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا استدلال اور تجزیہ شاد کی موافقت میں ایسا مضبوط اور مستحسن ہوتا کہ اس سے انکار کی گنجائش ممکن نہ ہوتی۔ یہی علمی و ادبی گفتگو بعد میں میری اور ان کی قربت کا سبب بنی اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ خوردی و بزرگی، عزیزداری و سرپرستی میں تبدیل ہوگئی۔ پھر ایسا ہوا کہ ڈاکٹر صاحب سے موقع بہ موقع ملاقات ہوتی رہی جسے مرزا رفیع سودا کے الفاظ میں یوں کہہ لیجیے: ؎

سرسری ان سے ملاقات ہے گا ہے گا ہے
صحبت غیر میں گاہے، سر راہے گاہے

میں یونیورسٹی کی کلاسوں اور اپنے تحقیقی کام میں مصروف ہوگیا، لیکن جب پاکستانی طلبہ میں اجتماعی شعور اور ادبی ذوق پیدا ہوا

تو ماہانہ مشاعرے کی طرح ڈالی گئی اور پاکستانی حضرات مقیم تہران میں فاروقی، بدرالدجیٰ، حسن، سلطان احمد صدیقی، برہان کنڈٹ پالی، زیدی، زکی اور عبدالمقیت صاحبان جیسے اہلِ ذوق حضرات باری باری اپنے یہاں نشستوں کا انتظام کرتے رہے اور تقریباً تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ خوش قسمتی سے ن۔م۔راشد صاحب وہاں یونسکو کے ادارۂ نشر و اشاعت کے سربراہ تھے اور مہدی مسعود صاحب سفارت پاکستان میں کونسلر تھے۔ اختر صاحب کے علاوہ ان حضرات کی شرکت سے مشاعروں میں جان پڑ جاتی، لیکن ن۔م۔راشد صاحب مشکل سے دو بار شرکت کر سکے۔ آپریشن کے بعد فرشی نشست پر وہ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اختر صاحب جب تہران میں موجود ہوتے تو یقیناً تشریف لاتے اور مہدی مسعود صاحب بھی عموماً اپنی شرکت سے مشاعرے کو باغ و بہار بنا دیتے۔ اختر صاحب کبھی کبھار کسی شعر کی تعریف کر دیتے، لیکن مہدی مسعود صاحب کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ انھیں مجازؔ لکھنوی کا کلام اور طویل نظمیں یاد تھیں۔ سامعین کے اصرار پر فرمائش پوری کرتے، صاحبِ ذوق، سنجیدہ اور بڑے خلیق شخص تھے عموماً مشاعروں کی صدارت یہی حضرات انجام دیتے اور جلسے کی ترتیب و تنظیم فاروقی صاحب کے ذمے ہوتی۔ مردوں کے علاوہ خواتین بھی شریک ہوتیں اور یونیورسٹی کی طالبات میں سے ڈاکٹر شمیم ناصر زیدی، ڈاکٹر ممتاز چودھری، ڈاکٹر زبیدہ خانم کی شعرخوانی سے مجلس مشاعرہ رنگین و خوش گوار بن جاتی۔ طلبہ میں ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری، ڈاکٹر صابر آفاقی، ڈاکٹر جعفر حلیم، ڈاکٹر حامد حسین، ڈاکٹر خیال امروہوی، راقم السطور، مستقل ملازمین میں فاروقی صاحب، زکی صاحب، ڈاکٹر شہریار نقوی، ڈاکٹر محمود الحسن انصاری، سفارت پاکستان کے کلچرل اتاشی سید محمد جعفری اور دیگر چند حضرات شعرخوانی میں حصہ لیتے۔ زینت مشاعرہ کے لیے دوسروں کا انتخاب کبھی کبھار ڈاکٹر آفتاب اصغر پیش کرتے اور سامعین کے اصرار پر مرتضیٰ موسوی صاحب کلاسیکل انداز میں کسی خاتون کی غزل سناتے جس سے پکے گانے کا لطف آجاتا۔ پہلی مرتبہ جب ڈاکٹر اختر حسین صاحب شریک مشاعرہ ہوئے اور صدارت کے فرائض انجام دیے تو میں نے ان کی اجازت سے یہ رباعی پڑھی ؎

نقادِ ادب، اخترِ کامل آئے　　　　رہ رو کے لیے رہبرِ منزل آئے
دنیائے ادب جن سے ہے پُرنور کلیم　　　　وہ مہرِ سخن، رونقِ محفل آئے

چند نشستوں کے بعد ایسا ہوا کہ اختر صاحب اور مہدی مسعود صاحب دونوں ہی نے مشاعرے کو اپنی شرکت سے زینت بخشی، بعض احباب نے غزل سے پہلے قطعے اور بعض نے رباعیاں پڑھیں، جب راقم السطور کی باری آئی تو موقع سے فائدہ اٹھا کر حسب حال فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی ؎

بہ شعر و سخن اہلِ ادب کے مابین　　　　شاعر کو بھی ملتا ہے ثواب دارین
یوں اختر و مسعود بہم ہیں دونوں　　　　دراصل جسے کہیے قران السعدین

غزل سے پہلے ابتدا میں رباعی پڑھنے کی قدیم روایت کا یہ نتیجہ ہوا کہ تہران یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کے ایک پاکستانی اُستاد نے قطعے کی ٹکڑوں میں بڑے فخر سے کئی رباعیاں پیش کیں اور طلبہ کی طرف سے جس میں راقم السطور کے علاوہ ڈاکٹر صدیق شبلی، ڈاکٹر مرتضیٰ جعفری وغیرہ نے جب یہ آوازہ بلند کیا کہ واہ کیا بحرِ ذخار میں رباعیاں پیش کی ہیں تو بعض اصحاب سمجھ کر مسکرا دیے اور بعض کچھ نہ سمجھے۔ واہ واہ میں بات آئی گئی ہو گئی اور دوسرے پاکستانی استاد نے غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر جو کتابچہ فارسی زبان میں حاضرین میں تقسیم کرایا اس میں غالب کو حج بیت اللہ اور زیارت قم سے بھی سرفراز فرما دیا جو غالب کے جیتے جی کبھی پوری نہ ہوئی تھی۔ اللہ غریق رحمت کرے انھیں بھی اور ان کے ساتھ ساتھ غالب کو بھی!

اختر صاحب تہران میں یونسکو کے ادارے کے سربراہ تھے۔ اپنی سرکاری مصروفیتوں کے علاوہ اکثر و بیشتر حسن صاحب (۱۷ اپریل ۱۹۸۵ء

میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اللہ کو پیارے ہو گئے) کے یہاں بلاتکلف بیگم حمیدہ اختر کے ساتھ (اگر وہ تہران میں ہوتیں) تو آ جاتے اور کبھی ان کے پڑوسی فاروقی صاحب کے یہاں۔ انھیں سیخ کباب بہت پسند رہے جسے عام طور پر وہ "بہاری کباب" کہتے ہیں۔ اور کبھی تو حسن صاحب سے فرمائش کر کے خاص طور پر تیار کراتے اور دعوت کام و دہن کے بعد لطف اندوز ہوتے۔ ایسے موقعوں پر عموماً میں بھی ہوتا۔ حسن صاحب سے اپنی قربت کے علاوہ ان کی بیگم سے ایک جہت اور بھی نکلی کہ بہار کے مشہور نظم گو شاعر عبدالغنی شمس (کرائے پر سرائے) کی وہ صاحب زادی تھیں اور شمس صاحب پٹنے میں ہماری طالب علمی کے زمانے میں سنجیدہ شاعر کی حیثیت سے ہم لوگوں کے درمیان موجود ہوتے لیکن ڈاکٹر صاحب خود کھانے کے شوقین نہیں، لوگوں کو کھلانے کے بھی شوقین تھے اور ان کے یہاں مجھے یاد نہیں آتا کہ شاید ہی کوئی ایسی دعوت ہوئی ہو جس میں میں مدعو نہ تھا۔ ایسا کم دیکھنے میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کی دولت کے ساتھ ساتھ مادی دولت سے بھی نوازا ہو اور اعلا عہدہ بھی عطا کیا ہو تو ایسے شخص کا مزاج و معیار اعتدال پر ہو۔ عجیب اتفاق کہ اس صفت سے مشیت نے اختر صاحب کی بیگم صاحبہ کو بھی یکساں طور پر نوازا تھا اور وہ چھوٹے بڑے، اعلا عہدے دار اور طالب علم میں قطعی کوئی فرق نہ کرتی تھیں۔ خاندانی وجاہت و امارت کے سلسلے میں اس امر کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ اختر صاحب کے والد انجنیر تھے اور انھیں والدین کی طرف سے اتنی زمین داری ملی تھی جس میں آسودگی کے ساتھ گزارہ ہو سکتا تھا اور ان کی بیگم صاحبہ نیلی چھتری والے ظفر عمر صاحب کی صاحب زادی ہیں لیکن دونوں کا مزاج تناسب و توازن اور سادگی و شرافت کا ایسا نمونہ ہے جس سے دوسروں کو سبق لینا چاہیے۔ میرے مکان کی نیچے والی منزل میں ٹیلیفون تھا۔ جب میں کسی ہفتے ڈاکٹر صاحب کے یہاں نہ پہنچتا تو کبھی وہ اور کبھی ان کی بیگم صاحبہ ٹیلیفون پر خیریت دریافت فرما لیتیں۔ ایک مرتبہ کئی ہفتے کی غیر حاضری کے بعد جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میری اہلیہ علیل ہیں تو ایک دن بعد مغرب ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ میرے دوست حسن صاحب اور ان کی بیگم کے ساتھ میرے یہاں بلاتکلف آ پہنچے۔ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ یونسکو کا سربراہ تہران یونیورسٹی کے ایک طالب علم کے چھوٹے سے کمرے پر آ سکتا ہے اور وہ بھی اس سادگی کے ساتھ کہ پہلے سے کوئی اطلاع نہ دی۔ ان کے خیال میں مریض کی مزاج پرسی اور وہ بھی غیر ملک میں ضروری تھی تاکہ تنہائی و بے مائیگی کا احساس نہ ہو۔ ان کی بیگم صاحبہ تو اور بھی مجھے متہم کرنے لگیں کہ واہ جی، تم نے پہلے کیوں اطلاع نہ دی، کیا ہم لوگ غیر تھے؟ یہ تھا ان کے کردار کا ایک اخلاقی پہلو۔

تیموری آرٹ پر شرکت کرنے کے بعد غیر ممالک کے دورے سے ہوتے ہوئے جب مالک رام صاحب (ماہر غالبیات) تہران تشریف لائے تو پہلی بار ڈاکٹر عبدالودود اظہر (صدر شعبۂ فارسی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی) کے توسط سے ان کا نیاز حاصل ہوا۔ کئی دن ان کے ساتھ مقامی لائبریریوں کی چھان بین کے بعد جب انھیں معلوم ہوا تو وقت متعین کر کے اختر صاحب سے ملے۔ ان دونوں کے درمیان جو علمی و ادبی گفتگو ہوئی اس میں خصوصیت سے مولانا ابوالکلام آزاد کی بعض غیر مطبوعہ تحریروں کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اس موقع پر ڈاکٹر صابر آفاقی (مظفر آباد کالج، آزاد کشمیر) بھی میرے ہمراہ تھے۔ واپسی میں ہم دونوں مالک رام صاحب کو ان کے ہوٹل پہنچا کر واپس آ گئے۔

ڈاکٹر صاحب ایک ماہر تعلیم، معروف نقاد اور مشہور افسانہ نگار ہونے کے باوجود اتنے خاموش طبع تھے کہ ایران کے اہل علم کو بعد میں ان کی علمی و ادبی حیثیت کا اندازہ ہوا، اگرچہ وہ ایران کی وزارت اعلا تعلیم کے بھی مشیر تھے، لیکن کبھی اپنے علم و فن کا پروپیگنڈا یا تذکرہ نہ کرتے۔ چنانچہ جب سفارت پاکستان نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک پاکستانی دانش ور ہیں تو اس کے ایما سے انجمن ایران و پاکستان کے زیر اہتمام ان کے اعزاز میں ایک خصوصی تقریب منعقد کی گئی جس میں ایرانی دانش ور اور اسکالر بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں ایران و پاکستان کے قدیم علمی و ادبی اور تاریخی و ثقافتی تعلقات پر اردو میں بڑی سیر حاصل اور بصیرت افروز تقریر کی جس کا ترجمہ ساتھ ساتھ سفارت پاکستان کے مترجم مرتضیٰ موسوی صاحب نے کیا۔ اس موقع پر ن۔م۔ راشد صاحب بھی موجود تھے۔ جب میں نے راشد صاحب اور اختر صاحب سے

سے گزارش کی کہ اجازت ہو تو ایک گروپ فوٹو لے لی جائے تو یہ دونوں حضرات بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ رضا مند ہو گئے اور میرے علاوہ تہران یونیورسٹی کے دو اور طالب علم شبیر اختر صاحب (مقیم تہران) اور ڈاکٹر جعفر حلیم (شعبۂ فارسی گلگت کالج) بھی اس گروپ میں شریک ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب "گرد راہ" میں یہ گروپ فوٹو یادگار تہران کے طور پر شامل ہے۔ اس تقریب کی تفصیلی اطلاع جب ایران کے اخبارات میں آئی تو پھر کیا تھا۔ رفتہ رفتہ ایرانی اسکالر اختر صاحب سے کبھی ملتے اور کبھی ان کے گرد جمع ہو جاتے۔

تہران یونیورسٹی کے ڈین آف لیٹرز اور تاریخ ادبیات ایران کے مشہور محقق استاد محترم ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا اور غیر ملکی طلبہ کے سرپرست اور شعبۂ فلسفہ اور تاریخ ادیان کے صدر ڈاکٹر سید حسین نصر کو بھی ڈاکٹر صاحب کے دولت خانے پر دیکھا۔ دونوں نے اپنی اپنی تصانیف انھیں پیش کیں اور ایران و پاکستان کے علمی و ادبی مسائل پر بھی گفتگو کی۔ ڈاکٹر صاحب کو فارسی بولنے کی مشق نہ تھی لیکن فرانسیسی اور انگریزی ربا ہیں ڈاکٹر اختر حسین، ڈاکٹر صفا اور ڈاکٹر نصر کے درمیان افہام و تفہیم کا مشترک ذریعہ نکلیں۔ گفتگو بڑے اچھے اور سنجیدہ ماحول میں ہوتی۔ ایرانی اسکالروں میں فلسفۂ اسلام اور تاریخ ادیان پر موجودہ سائنسی نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ ڈاکٹر سید حسین نصر نے کام کیا ہے۔ اسی زمانے میں ان کی تقریباً ایک درجن کتابیں انگریزی زبان میں غیر ممالک کے مختلف معتبر اداروں سے شائع ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر صفا نے یونسکو کی فرمائش پر فارسی شاعری کا انتخاب تین جلدوں میں "گنج سخن" کے نام سے فارسی اور فرانسیسی میں شائع کیا تھا۔ جب یہ کتابیں اختر صاحب کو پیش کیں تو ان پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ان سے سوال کیا کہ حسن دہلوی، امیر خسرو دہلوی کو آپ حضرات لائق توجہ سمجھتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اقبال کو بھی ایران نے وہ اہمیت دی جو اس سے قبل انھیں نہ دی گئی تھی لیکن مرزا غالب دہلوی کو وہ مرتبہ کیوں نہ دیا گیا جس کا وہ مستحق تھا۔ آپ حضرات سمجھتے ہیں کہ وہ اردو زبان کا بہت بڑا شاعر ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی فارسی شاعری کے بارے میں خود اعتراف کرتا ہے کہ ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

پھر غالب کی شاعری پر دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ ڈاکٹر صفا نے یہ صفائی پیش کی کہ انھوں نے اپنے انتخاب میں غالب کو شریک کیا ہے لیکن اختر صاحب نے بتایا کہ ایک دو صفحے کا انتخاب مع سوانح حیات غالب کے شایانِ شان نہیں۔ اس سلسلے میں اختر صاحب نے ایک اہم اور دلچسپ سوال صفا صاحب سے یہ کیا کہ نویں صدی ہجری کے غزل گو عبدالرحمٰن جامی کے بعد کیا ایران نے غالب جیسا کوئی غزل گو تقریباً تین صدی کے عرصے میں پیدا کیا۔ ہے جس کی شاعری مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے؟ ڈاکٹر صفا خاموش ہو رہے اور اختر صاحب نے فرمایا کہ آپ کی کتاب سے ایران کی نمائندگی تو ہو جاتی ہے لیکن برصغیر پاک و ہند کی فارسی شاعری کی صحیح نمائندگی نہیں ہوتی، چنانچہ اس گفتگو کا ردِ عمل یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے برادر محترم مظفر حسین شمیم صاحب کو بہ اصرار آمادہ کیا اور انھوں نے برصغیر کے فارسی گو شعرا کا انتخاب مع سوانح حیات ایک سال کی مدت میں ترتیب دے دیا اور یہ کتاب ایران سے "شعر فارسی در ہند و پاکستان" کے عنوان سے شائع ہو گئی۔ اختر صاحب کا اصل مطمح نظر یہ تھا کہ شعر و ادب کا بالغ نظری سے جائزہ لیا جائے اور ہر قابل ذکر شاعر و ادیب کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔ اشعار کے انتخاب کا معاملہ تو ذاتی پسند و ناپسند پر ہے۔ شمیم صاحب نے اس کتاب پر اردو زبان میں مقدمہ لکھا تھا۔ ایک دن اختر صاحب نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں یہ مقدمہ لے جا کر غور سے پڑھوں اور انھیں اپنی رائے سے آگاہ کروں، پھر اس کا ترجمہ فارسی میں کر دوں تا کہ اہلِ ایران اسے سمجھ سکیں۔ میں مقدمہ لے تو آیا۔ دوبارہ، سہ بارہ پڑھ کر کچھ نشانات لگائے اور کچھ یادداشتیں نوٹ کیں، لیکن یہ خیال ذہن کو بار بار کریدتا رہا کہ میری یہ رائے اختر صاحب کے بڑے بھائی کے افکار کے متعلق ہے بعض لوگوں کی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے یا اپنے بزرگوں کے افکار پر کسی قسم کی تنقید سننا گوارا نہیں کرتے۔ میں بار بار کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح

خوش اسلوبی سے اسے ٹال رہا، لیکن کوئی معقول اور مناسب صورت نظر نہ آئی۔ آخر ایک دن ڈرتے ڈرتے مقدمے کا مسودہ لے کر اختر صاحب کے یہاں پہنچا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انھوں نے دریافت فرمایا کہ اب تک میں نے مقدمے کا مطالعہ کیا یا نہیں؟ میں نے جواب دیا کہ مطالعہ تو کر چکا ہوں، لیکن معلوم نہیں آپ میرے خیال سے متفق ہو سکیں گے یا نہیں۔ میرے انداز بیاں میں پس و پیش تھا۔ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے فرمایا کہ آپ اپنے خیال کا اظہار بلا تکلف کیجیے، پھر ہم دونوں اس پر غور کریں گے اور جو مناسب صورت ہوگی اسے اختیار کریں گے۔ میں نے زیر بحث حصوں کو ان کے سامنے پڑھا، بعض حصوں کو حذف کر دینے کی سفارش کی اور بعض جگہ کچھ اضافے کا خیال پیش کیا۔ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک بالغ نظر ناقد و مورخ ہونے کی حیثیت سے ہر جگہ مجھ سے اتفاق کیا، اور میری سفارش پر آمادہ ہو گئے۔ پھر ترمیم و اضافے کے بعد میں نے اس مقدمے کا فارسی میں ترجمہ کر دیا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات جس کی طرف میں نے اشارہ کیا وہ یہ تھی کہ اس انتخاب میں بنگال کے فارسی شعرا کی نمائندگی نہیں ہوئی، ڈاکٹر صاحب میرے اس خیال سے بھی پورے طور پر متفق ہو گئے اور فرمایا کہ ممکن ہو تو اس میں یہ کمی پوری کر دی جائے، لیکن میرے لیے دشواری یہ تھی کہ میرے پاس خاطر خواہ مواد نہ تھا، غرض کمی پوری نہ ہو سکی اور کتاب ناشر کے حوالے کر دی گئی۔ سنہ ۱۹۷۰ء میں جب میری ملاقات کراچی میں ڈاکٹر صاحب سے ہوئی تو ازراہ لطف و کرم اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے عنایت فرمایا۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ تہران سے واپسی کے بعد بنگلا دیش یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی فرمائش پر "سخن وران فارسی در بنگلا دیش" کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کر دی، لیکن چوں کہ یہ فارسی زبان میں ہے اس لیے اس کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔

ڈاکٹر صاحب کی ادبی و تنقیدی حیثیت کے تعارف کے بعد اس سے متعلق فارسی میں ان پر کچھ مضامین شائع ہوئے اور ان کے بعض مقالوں کے تراجم بھی چھپے اور اس طرح ایرانی اسکالروں کے حلقوں میں ان کا خاطر خواہ استقبال کیا گیا۔ ایرانی اسکالروں سے تاریخ کے موضوع پر جب انھیں گفتگو کرتے سنتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ ان کا حافظہ کس قدر قوی اور حاضر ہے کہ مستند کتابوں کے حوالوں کے ساتھ بعض تاریخوں کی خامیوں پر بھی ان کی نظر گہری تھی، اور وہ غیر مستند تاریخوں کو اپنی گفتگو کے درمیان رد کر دیتے تھے۔ یہ بات میرے لیے اور بھی باعث حیرت تھی کہ تہران یونیورسٹی میں سیاسی، ادبی اور ثقافتی تاریخ کے تین پرچے ہم لوگوں کو الگ الگ پڑھائے جاتے تھے لیکن ایران کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی دست رس حیرت انگیز حد تک تھی۔ بعض واقعات کے سن و سال وقوع بھی ڈاکٹر صاحب بڑی آسانی سے حوالے کے طور پر پیش کرتے تھے اور مزید برآں ہند و پاکستان و ایران کی تاریخ و ثقافت کا تقابلی مطالعہ اور اس پر گفتگو اور بھی دل چسپ ہوتی تھی۔ وہ جس قدر خاموش طبع تھے اس سے کبھی میں نے یہ اندازہ نہ لگایا تھا۔

جب میرے متعلقین سنہ ۱۹۶۸ء کے آخر میں واپس ڈھاکے چلے آئے تو میں تنہا رہ گیا اور کوشش یہ تھی کہ اپنا کام جلد ختم کر کے واپس جاؤں۔ اتفاق سے ان کے متعلقین بھی کراچی آ گئے تھے۔ ان کا مکان کافی بڑا اور تربیت یافتہ باورچی تھا۔ انھوں نے کئی بار مجھ سے فرمایا کہ میرے یہاں چلے آئیے۔ تنہا قیام و طعام اور اخراجات کے بارے نجات مل جائے گی اور ہم دونوں فرصت کے اوقات میں کچھ ادبی گفتگو کر لیا کریں گے، لیکن برابر میں نے ان کی پیش کش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ عذر پیش کیا۔ آخر کار یہ طے پایا کہ ہفتے میں ایک مرتبہ تعطیل کے دن دوپہر یا رات کا کھانا انھیں کے یہاں کھاؤں گا میں گھنٹے دو گھنٹے قبل پہنچ جاتا، بہت سارے ادبی و سیاسی مسائل پر گفتگو ہوتی، ایران کے دستور کے مطابق پہلے تو ڈاکٹر صاحب خشک میوے میز پر منگوا لیتے۔ پھر اختر صاحب کی بیگم صاحبہ خود باورچی خانے میں جا کر دو پیالیوں میں ہم دونوں کے لیے مرغ کی یخنی لے آتیں اور بڑی سادگی سے یہ تقاضا کرتیں کہ یہ یخنی پی لو۔ تم تو یوپی کے نہیں، پھر اتنا تکلف کیوں کرتے ہو؟ اور مجبوراً ان کے حکم پر سر تسلیم خم کرنا پڑتا۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ چلیے آج "رکابی رستوراں" میں دوپہر کا کھانا کھائیں، سنتے ہیں بڑا صاف ستھرا انتظام ہے اور لذیذ

"چلو کباب" کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مکان سے قریب ہی یہ رستوراں ایک گلی میں تھا۔ ہم دونوں ٹہلتے ہوئے پہنچے، واقعی اچھا خاصا انتظام تھا۔ ایک بڑے ہال میں کوئی بیسیوں میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ہماری فرمائش کے مطابق چلو کباب کی دو پلیٹیں آ گئیں۔ اس کے ساتھ اچار اور چٹنی بھی تھی جو عموماً دوسرے رستوراں نہیں دیتے۔ چھری کانٹے ایک پلاسٹک کے پیکٹ میں لائے گئے۔ معلوم ہوا کہ اسٹیرلائز کیے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ جب پہنچے تھے تو صرف ایک میز پر دو شخص تھے، دیکھتے ہی دیکھتے تمام میزیں بھر گئیں۔ تقریباً ساٹھ ستر فی صدی غیر ملکی کھانے والے تھے، بقیہ ایران کے اونچے طبقے کے نمائندے۔ جب بل آیا تو پینتیس[۲۵] تومان ہوئے۔ عام طور سے اچھے اوسط رستوراں میں بھی فی کس دس تومان سے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔

باہر سے آنے والے حضرات اگر انھیں علم ہوتا کہ اختر صاحب تہران میں ہیں تو ان سے ضرور ملنے آتے۔ اس میں قدر مشترک اُن کی سرکاری حیثیت نہ ہوتی بلکہ علم و ادب اور پُرانے تعلقات کو دخل ہوتا۔ برصغیر کے مشہور مورخ اور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی مصر اور ترکی کا دورہ کرنے کے بعد جب ایران پہنچے تو کئی دن یہاں ان کا قیام رہا۔ جب انھیں ڈاکٹر صاحب کے متعلق معلوم ہوا تو میرے ساتھ ان سے ملنے گئے۔ عجیب اتفاق کہ دانی صاحب بھی بنارس ہندو یونیورسٹی کے سند یافتہ تھے اور اختر صاحب نے بھی وہاں سے ساہتیہ النکار (سنسکرت ایم۔اے کے مساوی) پاس کیا تھا۔ تاریخ سے بات شروع ہوئی تو آثار قدیمہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان کا تحفظ کس طرح کیا جا سکتا ہے اور حکومت اس باب میں کیا کر رہی ہے اور یونسکو کا ادارہ کیا کچھ تعاون کر سکتا ہے؟ جب یہ موضوع ختم ہو گیا تو سنسکرت ادب پر گفتگو شروع ہوئی اور بنارس یونیورسٹی کی پُرانی یادوں کو دونوں حضرات تازہ کرتے رہے۔

ایک مرتبہ ابن انشا صاحب کراچی سے کسی سرکاری دورے پر ایران پہنچے۔ ایران شہر میں سفارت پاکستان کے قریب ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر اختر حسین صاحب کی ملاقات کے لیے ان کے یہاں گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اطلاع بھجوائی، لیکن میں پاکستانی سفارت خانے گیا ہوا تھا، ابن انشا صاحب کے متعلق وہیں اطلاع مل گئی۔ واپسی میں سر راہے ان کا ہوٹل تھا۔ دریافت کیا تو موجود نہ تھے۔ ٹیلیفون نمبر چھوڑ دیا۔ جب واپس قیام گاہ پر پہنچا تو میرے قدموں کی آہٹ پاتے ہی خاتونِ خانہ نے بلا کر کہا کہ تمھارا ٹیلیفون ہے، کوئی پاکستانی صاحب تمھارا نام لے رہے ہیں، اُن کی بات سمجھ میں نہ آ سکی، ہندی بول رہے ہیں یا فارسی، میری سمجھ میں ان کی بات نہ آ سکی۔ میں نے ٹیلیفون اٹھایا تو ابن انشا صاحب تھے۔ انھیں بھی شکایت تھی کہ ان کی فارسی مالک خانہ کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ بہر کیف شام کو ملنے کا وقت طے ہو گیا۔ میں اپنے دوست شبیر اختر صاحب کے ساتھ ان کے ہوٹل پہنچا۔ وہاں آر۔سی۔ڈی کے ایک افسر خالد صاحب بھی تھے جو بعد میں وزارت تعلیم و ثقافت کے ڈپٹی سکریٹری متعین ہوئے۔ شبیر صاحب نے ہم سبھوں کو دوپہر کے کھانے پر دوسرے دن مدعو کیا اور "سازمان پلاسکو" کی سب سے بالائی منزل پر لے گئے جہاں سلف سروس رستوراں تھا۔ بڑے سکون کی جگہ تھی، بیٹھے بیٹھے کھائیے اور تمام تہران کے مناظر بھی دیکھیے۔ انشا صاحب نے شبیر صاحب سے دریافت کیا کہ یہاں آتے ہی انھوں نے شبیر صاحب کے نام خط ڈاک کے حوالے کیا ہے کہ مجھ سے ملیے، لیکن یہ خط شبیر صاحب کو نہ ملا۔ کئی دن بعد یہ خط شبیر صاحب کو ملا اور اسی دن ابن انشا صاحب رخصت ہونے والے تھے۔ شبیر صاحب نے بتایا کہ ابن انشا صاحب نے لفافے پر "مقامی" (LOCAL) لکھ دیا تھا اس لیے تاخیر ہوئی۔ ایران کی موجودہ فارسی میں "شہری" لکھتے ہیں۔ واپسی کے بعد ابن انشا صاحب نے اپنے اخباری کالم میں ایرانی ڈاک اور تار کی تساہلی کا تذکرہ کیا اور اس کا ردعمل یہ ہوا کہ پاکستانی سفارت ایران کے کلچرل اتاشی ناخوش ہو گئے کہ دونوں ممالک کے تعلقات پر اس کا اثر پڑے گا۔ ان افسر صاحب کا نام "محمد عثمان" تھا۔ جب ان کا تقرر ایران میں ہوا تو اختر حسین صاحب نے بڑی سنجیدگی سے لیکن مسکراتے ہوئے پاکستان کی وزارت تعلیم کی عہدِ دانش مندی پر نکتہ چینی کی کہ ایران ایک شیعہ ملک ہے، کم از کم ایسے شخص کو یہاں بھیجتے وقت مذہبی رجحانات کا تو خیال کرنا چاہیے تھا، کیوں کہ

کلچرل شعبے کا تعلق زیادہ تر پبلک سے ہے لیکن ان نزاکتوں پر کون غور کرتا ہے؟ میرے خیال میں جعفری صاحب کی بہ نسبت عثمان صاحب زیادہ کامیاب رہے۔ اپنے کاموں میں بڑے سرگرم تھے۔

ایک دن جب ڈاکٹر صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ سفارت پاکستان کے افسروں سے ملتے جلتے آپ کو نہیں دیکھتا، فرمانے لگے، اول تو ان لوگوں میں شعر و ادب کا مذاق نہیں اور دوسرے یہ کہ وہ سمجھتے الیکٹرک کے سامان اور کسٹم فری چیزوں کی گفتگو کرتے ہیں اور یہ نقطۂ نظر کارفرما رہتا ہے کہ مالی منفعت کس طرح ہو سکتی ہے اور مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، کبھی کبھار سفیر صاحب اور کاؤنسلر صاحب کے یہاں خصوصی دعوتوں میں اصولاً اور اخلاقاً چلا جاتا ہوں۔

کبھی بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا تذکرہ آجاتا تو اورنگ آباد میں مولوی صاحب کے ساتھ اپنے قیام کی تفصیل، انگریزی اردو لغت کی ۔۔ میں ۔۔ لوی احتشام الحق صاحب (شان الحق حقی کے والد بزرگوار) اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب (سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ دلی) کے کمروں اور مصروفیتوں کا حال بیان کرتے۔ انھوں نے فرمایا کہ میرے بی۔ اے پاس کرتے ہی مولوی صاحب نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کو ایک خط لکھ کر مجھے اورنگ آباد بلوا لیا اور میں مولوی صاحب کے معاون کی حیثیت سے انجمن کے کاموں میں شریک ہو گیا۔ ایک دن علامہ اقبال کا تذکرہ آیا تو ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ مجھے ان کے بعض بنیادی خیالات سے اختلاف تھا، اس موضوع پر ایک مقالہ لکھ ڈالا جس کی اشاعت مولوی صاحب کے رسالہ "اردو" میں ہوئی، بعض ادبی حلقوں میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ۱۹۳۶ء میں "جشن حالی" پانی پت میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا گیا۔ میں بھی مولوی صاحب کے ساتھ گیا۔ چونکہ اس جشن کے روح رواں مولوی صاحب تھے، اس لیے اسٹیج سکریٹری کے فرائض مجھے انجام دینے پڑے۔ جب علامہ اقبال تشریف لائے تو مولوی صاحب نے تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ یہ ہیں اختر حسین رائے پوری، وہی نوجوان جنھوں نے "اردو" کی ایک اشاعت میں آپ کے خیالات پر تنقید کی ہے۔ علامہ اقبال نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں ایسے نوجوانوں کی قدر کرنا چاہیے۔ یہ مضمون میری نظر سے گزرا ہے۔ اسی طرح ایک دن مولوی عبدالحق صاحب کی ذاتی پسند و ناپسند کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ مولوی صاحب کے ان معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے مزاج میں گویا ایک طرح کی جاگیردارانہ انانیت تھی۔ وہ اپنی جیسی کسی کی پروا کیے بغیر کر گزرتے تھے۔ جب میں نے استفسار کیا کہ مثال کے طور پر کوئی واقعہ بیان کیجیے تو فرمانے لگے کہ جب میں حکومت پاکستان میں شعبۂ تعلیم کا ڈپٹی سکریٹری تھا تو ترقی اردو بورڈ، اردو لغت بورڈ اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے منصوبے بنائے جسے حکومت نے منظور کر لیا اور مولوی صاحب نے بھی پسند فرمایا۔ پھر کہنے لگے کہ مولوی عبدالحق صاحب کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو ۔۔۔ء ۔۔۔ پروفیسر تھے۔ انھوں نے اسی مدت ذات ضعیفی کی بنا پر یونیورسٹی کو مجبور کیا کہ اردو کے پروفیسر کی اسامی پر کسی معقول شخص کا تقرر کر کے انھیں اس ذمے داری سے سبک دوش کر دیا جائے۔ چنانچہ اردو کے پروفیسر کے انتخاب کے لیے جب کمیٹی بیٹھی تو اس میں وائس چانسلر کے علاوہ مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور چند دیگر حضرات بھی تھے۔ امیدواروں میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں، ڈاکٹر سجاد (سابق اردو پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی) اور چند دیگر حضرات تھے۔ انٹرویو کے بعد جب یہ گفتگو شروع ہوئی کہ کس کا تقرر ہونا چاہیے تو مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ ان کی رائے میں ڈاکٹر عبادت سے بہتر اور کوئی امیدوار نہیں۔ اس پر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے کہا کہ یہاں وفاقی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی پروفیسرشپ اور صدارت کا سوال ہے، یہ اسامی کسی سینیئر اور اہل شخص کو دینی چاہیے، مثلاً ڈاکٹر سجاد صاحب عثمانیہ یونیورسٹی میں پہلے ہی پروفیسر کے عہدے پر مامور رہ چکے ہیں اور یونیورسٹی کے اعلان کے مطابق سند یافتہ بھی ہیں۔ حیدرآباد کے قیام کے زمانے ۔۔۔ مولوی صاحب سجاد صاحب سے ناخوش تھے، اس لیے انھوں نے بڑے شد و مد سے ان کی مخالفت کی۔ ایسا محسوس ہوا گویا یہ نزاع مولوی صاحب اور شادانی صاحب کے درمیان شروع ہو گیا۔ شادانی صاحب نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ عبادت صاحب ڈاکٹر بھی ہیں اور صاحب

تصانیف بھی لیکن وہ پنجاب یونیورسٹی میں سینیر لیکچرار ہیں۔ جو شخص سال دو سال ریڈر بھی نہ رہ چکا ہو اسے یک بہ یک کس طرح لیکچرار سے پروفیسر کے عہدے پر مامور کیا جا سکتا ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں یہ دستور نہیں۔ مزید یہ کہ عبادت صاحب کی عمر کا جو تقاضا ہے وہ ریڈر سے زیادہ کی اسامی پر متعین نہیں کیے جا سکتے۔ یہاں یونیورسٹی اور عہدے کے وقار کا سوال ہے۔ مولوی صاحب کافی برہم ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ تو میں چلا آپ ہی لوگ فیصلہ کیجیے۔ دوسرے ممبروں نے گزارش کی کہ مولوی صاحب تشریف رکھیے آپ بزرگ اور صدر شعبہ ہیں، آپ کے بغیر ہم لوگ کس طرح فیصلہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے ممبروں کی بھی رائے لی جائے۔ گفتگو جب آگے بڑھی تو مولوی صاحب نے ڈاکٹر اختر حسین صاحب سے دریافت کیا کہ تم تو حکومت کے نمائندے ہو، تعلیم یافتہ کی تمھاری کیا رائے ہے؟ مولوی صاحب کو یقین کامل تھا کہ اختر صاحب سے ان کے جو دیرینہ تعلقات ہیں ان کی بنا پر وہ مولوی صاحب کے حق میں اپنی رائے دیں گے، لیکن جب اختر صاحب کی باری آئی تو انھوں نے فرمایا کہ عبادت صاحب کی اہلیت سے میں کلی واقف ہوں، ان کی تحریریں نظر سے گزرتی ہیں، لیکن عمر اور تجربے کا یہ تقاضا نہیں کہ انھیں لیکچرار سے براہ راست پروفیسر بنا دیا جائے، میرے خیال میں ڈاکٹر شادانی کی رائے صائب اور متوازن ہے۔ اس پر مولوی صاحب بہت برافروختہ ہوئے اور کہنے لگے کہ تم سے یہ توقع نہ تھی، تم بھی شادانی صاحب کے ہم نوا ہو گئے، تو پھر میری موجودگی کا یہاں سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے کہ میں کسی قسم کا فیصلہ ماننے کے لیے تیار نہیں اور مجلس انتخاب کسی فیصلے کے بغیر ختم ہو گئی۔ دراصل جب ڈاکٹر عبادت بریلوی دلی کالج میں تھے اور انجمن ترقی اردو کا دفتر حیدرآباد سے منتقل ہو کر دریا گنج دلی آ گیا تھا تو اس وقت عبادت صاحب انجمن کے کاموں میں مولوی صاحب کا ہاتھ بٹاتے تھے اور دونوں میں تعلقات بہت استوار ہو گئے تھے۔ بعد میں پھر دونوں پاکستان چلے آئے۔ مولوی صاحب کا خیال تھا کہ عبادت صاحب کراچی آ جائیں گے تو ممکن ہے کہ انجمن کے معاملات میں بھی ان کا تعاون حاصل ہو جائے۔ گویا مولوی صاحب اپنے تعلقات کی بنا پر اپنی کمزوری پر پردہ ڈال سکے اور ان کی ذاتی پسند ایک طرف ڈاکٹر عبادت کی موافقت میں اور دوسری طرف ڈاکٹر سجاد صاحب کی مخالفت میں جاگیردارانہ امانیت کی صورت میں ابھر آئی، یہ تھا مولوی عبدالحق صاحب کے کردار کا مطالعہ، ڈاکٹر اختر حسین کے الفاظ میں۔

قیام ایران کے زمانے ہی میں ان کے پاس رسالہ "اوراق" (لاہور) پہنچنے لگا اور ان کے قدیم شاگرد عارف عبدالمتین صاحب کے تقاضے ہونے لگے کہ ڈاکٹر صاحب ان کے لیے کچھ لکھ دیں۔ موضوع کی تلاش تھی، اسی زمانے میں "مولوی عبدالحق کا چڑیا خانہ" کے عنوان سے نہایت دلچسپ مضمون سپرد قلم فرمایا اور جب اوراق میں چھپ کر آ گیا تو مجھے بھی پڑھنے کے لیے دیا۔

ایران میں ڈاکٹر صاحب کی حیثیت ایک بین الاقوامی افسر کی تھی۔ وہ یونسکو کے سربراہ تھے۔ پورا ایران ان کے اثر و اقتدار کے حلقے میں شامل تھا۔ ان کا دفتر ایران شہر میں پاکستانی سفارت خانے کے قریب تھا۔ جب میں سفارت خانے جاتا تو ڈاکٹر صاحب کے دفتر میں بھی حاضری دیتا۔ سرکاری اصول کے مطابق ان کی سکریٹری خاتون سے دریافت کرتا کہ وہ مصروف تو نہیں ہیں۔ وہ میرا نام پوچھتی اور انھیں اطلاع دے آتی۔ وہ کبھی فوراً بلا لیتے اور کبھی پانچ دس منٹ بعد کام سے فارغ ہو کر۔ کافی یا چائے سے تواضع فرماتے۔ کچھ دیر اردو، فارسی ادب یا پاکستان کے مسائل پر گفتگو ہوتی اور میں جب واپسی کے لیے اجازت چاہتا تو وہ اپنی نشست سے اٹھ کر سیڑھیوں تک مجھے رخصت کرنے آتے۔ انتہائی معذرت کے باوجود کہ وہ کیوں زحمت کر رہے ہیں، فرماتے کہ آپ میرے مہمان ہیں نا۔ ایسے اخلاق کا مظاہرہ سفارت پاکستان کے کسی فرد کی طرف سے کبھی نہ ہوا۔ وہ لوگ ڈاکٹریٹ کلاس کے ریسرچ اسکالر کو مدرسے کے طلبہ سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے، خصوصاً ہمارے کلچرل اتاشی سید محمد جعفری صاحب تو گویا معطل ہو چکے تھے۔ پاکستانی طلبہ کی سرگرمیوں سے متعلق مخبری کا کام ان کے بڑے صاحب زادے کرتے تھے۔ جب تک میں وہاں رہا پاکستانی طلبہ کے اع...

ڈاکٹر کلیم سہسرامی — اختر حسین تہران میں

میں انھوں نے ایک دعوت تک نہ کی اور نہ تہران یونیورسٹی کے استادوں کو مدعو کر کے ہمارا ان سے تعارف کرایا جس کی ذمہ داری ان کے سپرد تھی اور جن کے لئے ماہانہ الاؤنس سرکاری طور پر انھیں ملتا تھا، البتہ وزارت فرہنگ و ہنر میں پاکستانی طلبہ کے متعلقہ افسر علی اکبر جعفری صاحب نے پاکستانی طلبہ کے ساتھ ایسا مخلصانہ، مشفقانہ اور ہمدردانہ سلوک کیا جسے بیس سال گزر جانے کے باوجود بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سلسلے کی ایک دلچسپ کڑی اور یاد آ گئی یعنی آر سی ڈی کے مرکزی دفتر میں جو دعوتیں ہوتی تھیں ان میں صرف ایرانی اور ترکی طلبہ نظر آتے تھے۔ ڈاکٹر اختر حسین صاحب نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ آپ لوگوں کو وہاں نہیں دیکھا۔ میں نے جواب دیا دعوت نہ تھی۔ پھر جس صاحب کے یہاں کھانے کی دعوت پر دو دوسرے دار افسروں نے جن کا تعلق آر سی ڈی سے تھا بطور شکایت پوچھا کہ ایرانی اور ترکی طلبہ سالانہ دعوتوں میں آتے ہیں، آپ پاکستانی طلبہ کیوں نہیں آتے۔ کچھ بے تکلفی ہو گئی تھی۔ میں نے طنزاً کہا، جناب والا دعوت کے بغیر آپ ہم سے یہ توقع رکھتے ہیں۔ وہ دونوں کہنے لگے کہ ہر سال پاکستانی طلبہ کے دعوت نامے ہم لوگ پاکستانی کلچرل اتاشی کو بھجوا دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں یقین رہتا ہے کہ کوئی طالب علم نہ چھوٹے گا۔ ہم لوگوں نے بڑی دلچسپی سے سنا گویا تو بات سچ نکلی۔ پھر ایک دن ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ سفارت خانے کا کارنامہ سنیئے۔ فرمانے لگے کہ یہاں ملک اور طلبہ کے وقار کا سوال ہے تجاہلِ سیکلشن کو ایسا نہ کرنا چاہیے۔ گویا دو سال تک ہم لوگ جعفری صاحب کے طفیل دعوتوں سے محروم رہے۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ ایک بار ماہانہ مشاعرے کی نشست میں میں نے ایک قطعہ پڑھ دیا۔ اتفاق سے مہدی مسعود صاحب کاؤنسلر (جو آج کل کہیں سفیر ہیں) اور ڈاکٹر اختر حسین صاحب بھی موجود تھے۔ اسی زمانے ایک ساتھی سید سجاد حسن رضوی صاحب کو ڈاکٹریٹ ملی تھی کسی کو غلط فہمی ہوئی کہ ان پر چوٹ ہے اور کوئی مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا کہ سفارت پاکستان پر طنز ہے۔ تقریباً آٹھ دس مہینے بعد سفارت پاکستان کے خفیہ ذرائع سے معلوم ہوا کہ مہینوں میرے اس طنزیہ قطعے کی چھان بین ہوتی رہی کہ اس کا نشانہ کون ہے، لیکن سفارت کو مایوسی ہوئی۔ لیجیے آپ بھی اس قطعے سے لطف اندوز ہو لیجیے ؎

گرچہ ہے ہر شخص عاقل اور فہیم — ڈاکٹر بننے سے کچھ حاصل نہیں
سعر پڑھنے کے لیے ہم ہیں کلیم — کاک ٹیلوں کے لیے ہیں اور لوگ

فروری ۱۹۷۱ء میں میری واپسی کے موقع پر پاکستانی طلبہ نے مجسمۂ شاہ رضا کے قریب ایک چھوٹے سے رستوران میں عشائیے کا انتظام کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اسی دن دوپہر کے بعد اطلاع دی گئی لیکن وہ اپنی تمام تر سادگی اور شائستگی کے ساتھ بر وقت تشریف لے آئے، یہ بھی نہ سوچا کہ یہ رستوران ان کے معیار و وقار کے شایان شان ہے کہ نہیں۔ پاکستانی طلبہ بہت خوش ہوئے، ان کی تشریف آوری کا خصوصیت سے شکریہ ادا کیا اور میں ڈاکٹر صاحب کے خلوص و سرپرستی کا قائل ہو گیا۔

ایک دن ایران اور برصغیر کی فارسی شاعری پر بات چل نکلی تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آج تک "سبک ہندی" پر ایران کی نظر سے کوئی سیر حاصل مقالہ نہیں گزرا۔ آپ وطن پہنچ کر ایک خیال انگیز اور مدلل مقالہ اس موضوع پر لکھیے تاکہ ایرانی اسکالر بھی اب تک برصغیر کی فارسی شاعری کے جن اہم نکات اور نازک خیالات کو محض تصنع سمجھتے ہیں اس کے قائل ہو جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مشورہ مجھے پسند آیا اور اس کی تکمیل کا خیال بھی دامن گیر رہا لیکن وطن پہنچتے ہی مثل مجھ پر صادق آئی کہ "سر منڈاتے ہی اولے پڑے"۔ ابھی رہنے سہنے کا ٹھکانا اطمینان بخش طور پر نہ کر پایا تھا کہ خون کا دریا بہنے لگا، انسانی زندگی کی قدر و قیمت ایسی اور اتنی ارزاں ہو گئی کہ اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا اور میری آنکھوں کے سامنے اس شعر کی تعبیر تصویر بن کر گھومنے لگی ؎

آبادیاں تو دیکھیں، بربادیاں بھی دیکھو — کیا کیا حسین گلشن کانٹوں میں ڈھل گئے ہیں

اس وقت ڈاکٹر صاحب تہران سے منتقل ہو کر یونیسکو کے ہیڈ کوارٹر پیرس میں مامور تھے۔ میرے ایک بنگالی دوست متعینہ پیرس کے ذریعے میری خیر و عافیت دریافت کی کیونکہ اس وقت کون زندہ تھا اور کون مردہ اس کی اطلاع ملک سے باہر کیا ملک کے اندر بھی مشکل ہی سے پہنچتی تھی۔ ان کے اخلاق اور محبت کا تقاضا دیکھیے کہ جب ان کی کتاب "گرد راہ" شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ مجھے بھیج دیا۔ کچھ دنوں سے ان کی آنکھیں پڑھنے لکھنے کے کام کے لائق نہیں ہیں لیکن موقع نکال کر وہ مجھے یاد کر ہی لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں سلامت رکھے، آمین!

(بنگلہ دیش سے) ❖ ❖

قمر ہاشمی

اختر حسین رائے پوری

اختر حسین رائے پوری علم کی کرن
دانش فروز نقد و نظر کی اساسِ نو
علم و ادب کے راہ نما صاحبِ کمال
تحریکِ انقلاب کے وہ ترجماں رہے
اُن کا قلم ترقی پسندی کی آبرو
پہچانے گورکی کو اُنہی کے ذریعے ہم
ہے "گردِ راہ" اُن کے نظریات کی بہار
مشرق کی سرزبان کے رسیا اداشناس
ایسی رجائیت کہ امنگیں ہوں بخت ساز
اُن کے قلم کی زد سے نہیں بچ سکا کوئی
مجنوں کو اُن کا طرزِ نگارش پسند ہے

اختر حسین رائے پوری شمع انجمن
ذہنِ رسا دماغِ خرد آفرین کی رو
ہر ملک کے ادب کے ہیں پارکھ وہ بے مثال
نذرل کی شاعری کے بہت مدح خواں رہے
ملتا تھا اُن کی فکر سے تحریک کو نمو
اُن کو پڑھا تو جان گئے حرمتِ قلم
افکار کا نچوڑ نگارش کا شاہکار
تحریر میں کہیں نہ ملا مجھ کو حرفِ یاس
انساں ہو زندگی کے نعائم سے سرفراز
برداشت کر سکے نہ کسی کی غلط روی
سردار کی نگاہ میں بھی ارجمند ہے

سچ پوچھیے تو سب نے کیا اُن سے اخذِ نو
انصاری[1] احتشام خلیل اعظمی سردار

[1] پروفیسر اختر انصاری

محمد عصام عظیم آبادی

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

علم و فن از فکر تو نازش ہنر
از شرارِ قلب تو رخشندہ تر
حرف ہائے تو شود کیواں کتاب
ہم چو سنِ رشد تو موجِ گہر
در لسان و در بیان و در شعور
با ہمہ تخلیق ہا رخشندہ تر
محاذِ کار در یونیسکو
نقشِ حسنِ پاک را تو نقش گر
با لقب تو آمدی از رائے پور
از عظیم آباد لیکن حسن در
تو مشیرِ علم در آغازِ ملک
تو سفیرِ کارگر بالا نظر
علم داری در زبانِ سنسکرت
فارسی و انگلسی را باخبر
آشنائے ہندی و بنگلہ فرینچ
حسنِ اردو از دمِ تو بہرہ ور
فیض یابِ عظمتِ امّ الکتاب
بے کمالِ تو عالمِ ہفتاد در
در صحافت سنگِ میلِ رہ نما
چوں محقق نکتہ سنجِ باخبر

منعکس شد زندگی در "گرد راہ"۵
نکتہ نکتہ شارحِ گردِ سفر
در سرورِ عشقِ احمدؐ تو زفنا
در عقیدت مومنِ مقبول تر
اُبتریِ قومِ مشرق دردِ دل
افسریِ قومِ مسلم در نظر
حرزِ جاں شد فکر ہائے افرقہ۶
فکر ہائے ایشیا را نطق گر
در تخیل حسنِ عالم خیرِ عام
در تجمل بے گماں را کارگر
اسمِ تو اختر حسینِ دلنشیں
علم را دکتور۷ آں بارور
اہلِ دل را دوست دارِ زندگی
طالباں را رہ نمائے با اثر
کے نویسم ایں نکاتِ باصفا
بیشتر از فکرِ حاضر بیشتر
نذر کن اشعارِ خود را اے عصام
در حضورِ اخترِ والا گہر

تشریحات

۱ یونسکو
۲ رائے پور - یک شہر در بھارت
۳ عظیم آباد - شہرے در بہار - بھارت
۴ مشیرِ علم
۵ گرد راہ - یکے از تصنیف ہائے دکتور اختر حسین رائے پوری
۶ افرقہ - افریقہ
۷ ڈاکٹر

احمد ندیم قاسمی
علی سردار جعفری

علی جوّاد زیدی
عزیز حامد مدنی

ڈاکٹر حنیف فوق
مظفر علی سیّد

ڈاکٹر وقار احمد رضوی
تنویرہ خانم

ڈاکٹر فرمان فتح پوری
عتیق احمد

سحر انصاری
مختار زمن

ڈاکٹر اسمٰعیل اسعد
سیّد حامد علی جعفری

ظہور الحسن ڈار

فکر و فن کے زاویے

افکار کی ادبی خدمات کے اعتراف میں

دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ

منجانب

آزاد فرینڈس اینڈ کمپنی (پرائیوٹ) لمیٹڈ

اے/۵۸-ایس-آئی-ٹی-ای-کراچی

احمد ندیم قاسمی

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

گردِ راہ کی روشنی میں

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ہمارے علم وادب اور تہذیب وثقافت کی ایک بہت بڑی شخصیت ہیں۔ ان کا ذکر آتے ہی احترام سے آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ ان کی تصانیف کم سہی مگر ان کے اثرات اتنے ہمہ گیر ثابت ہوئے ہیں کہ گزشتہ نصف صدی کا منصف سے منصف مورخ بھی ان اثرات کا اعتراف کیے بغیر نہیں گزر سکتا۔ ہم سب کو ماہنامہ "افکار" کے مدیر جناب صہبا لکھنوی کا ممنون ہونا چاہیے جنھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنی سوانح لکھنے پر آمادہ کرلیا اور یوں ایک ایسی کتاب وجود میں آئی جو اس خطۂ ارض کے تہذیبی، فکری، ادبی اور سیاسی حوالے کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ آئندہ مورخ کے لیے اس کا اعتراف اس لیے ناگزیر ہے کہ بقول مجنوں گورکھپوری صاحب "ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام ہی اس کے مستند اور معتبر ہونے کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے میری ملاقات ان کے مضامین اور افسانوں کے ایک قاری کی حد تک ہے۔ میں نے انھیں ہمیشہ ترقی پسند ادب کی تحریک کا پیش رو قرار دیا ہے۔ ترقی پسند تنقید میں انھیں وہی اولیت حاصل ہے جو ترقی پسند افسانے میں منشی پریم چند کو حاصل ہے۔ اگر مولانا حالی کے "مقدمۂ شعر وشاعری" نے ہمارے سالہا سال کے ادبی رویے یک سر بدل ڈالے تو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے مقالے "ادب اور زندگی" نے اردو تنقید کے آفاق کو زندگی افروز وسعتیں بخشیں۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کا ابھی باقاعدہ آغاز بھی نہیں ہوا تھا جب ڈاکٹر رائے پوری کے اس مقالے نے ادب میں ترقی پسندی کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ مقالہ وسط ۱۹۳۵ء میں مولوی عبدالحق مرحوم کی زیر ادارت نکلنے والے سہ ماہی "اردو" میں شائع ہوا تھا بلکہ اس سے بھی کچھ عرصہ پہلے ان کا ایک مقالہ "ادب اور انقلاب" بھی ہندی میں اشاعت پذیر ہو چکا تھا۔ حضرت مجنوں گورکھپوری کی مشہور کتاب "ادب اور زندگی" بھی اس کے بعد ہی طبع ہوئی۔ یوں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو ترقی پسند ادب کی تحریک کا اولین مشعل بردار کہنا چاہیے۔ انھیں ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کے طویل قافلے کے میرِ کارواں کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک رجحان ساز بلکہ عہد ساز شخصیت ہیں اور جو عناصر ان کی ترقی پسندی پر انگلی اٹھاتے ہیں (اور ایسے اکا دکا بدنصیب محسن کش موجود ہیں) وہ دنیائے ادب وفن کا ایک بہت بڑا کفر بکتے ہیں۔

اردو میں خود نوشت سوانح کا افسوس ناک فقدان ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوششیں البتہ جاری ہیں مگر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی "گردِ راہ" کو اس لحاظ سے نمایاں انفرادیت حاصل ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کے سوانح ہیں جو ایک طرح سے پورے کرۂ ارض کا شہری ہے اور جس نے ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کی سرزمین پر سالہا سال تک زندگی بسر کی ہے۔ ایسے پردے کھلتے تک ان کے سفر کا آغاز پوری زمین کے سفر کا آغاز ثابت ہوا اور دنیائے عالم

لاہور، امرتسر، اورنگ آباد اور حیدرآباد سے ہوتے ہوئے فرانس، برطانیہ، صومالیہ (افریقہ)، ایران، فلسطین، اسپین، اطالیہ، امریکہ، جاپان، سری لنکا، برما، نیپال، ترکی اور شاید اور بھی بہت سے ملکوں کی طرف نکل گئے۔ یہ درست ہے کہ پہلے صحافتی اور تعلیمی سرگرمیوں اور بعد میں غیر ممالک میں منصبی مصروفیات کے باعث وہ تخلیقی ادب سے ایک طرح سے دست کش ہو گئے مگر ادب اور ادیبوں کے ساتھ انھوں نے قطع تعلق کسی بھی مرحلے پر گوارا نہیں کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ "محبت اور نفرت" نیز "ادب اور زندگی" کے پچاس سال بعد اپنے سوانح لکھنے بیٹھے ہیں تو ان کی تحریر میں وہی روانی اور گہرائی، وہی سلاست اور بلاغت ہے جو ان کے عہدِ شباب کی یادگار تحریروں کا طرۂ امتیاز تھی، بلکہ اب ان خوبیوں میں ان کے مشاہدے اور تجربے کے تنوع نے جو موتی ٹانک دیے ہیں وہ آپ ہی اپنا جواب ہیں۔

ڈاکٹر رائے پوری نے بڑی بے تکلفی سے واضح کر دیا ہے کہ "گردِ راہ" سوانح حیات نہیں ہے کیوں کہ یہ آپ بیتی کم اور جگ بیتی زیادہ ہے۔ ایک طرح سے یہ ڈاکٹر صاحب کی یادداشتیں ہیں جنھیں مربوط انداز میں تاریخ وار لکھا گیا ہے اس لیے ان پر خود نوشت کا شبہ ہوتا ہے۔ دراصل یہ عصرِ رواں کی ثقافتی تاریخ کا خاکہ ہے جو بیک وقت ملک گیر بھی ہے اور عالمگیر بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ملکی اور عالمی واقعات و حادثات کے پس منظر میں اپنے مشاہدات و تجربات کا بیان ایک خود آگاہ اور عالم آگاہ ادیب کی حیثیت سے سپردِ قلم کیا ہے۔ ایک ادیب اور معلم اور عالم اور ایک رسمی اور محبوب شخصیت کا مالک ہونے کی وجہ سے وہ جہاں بھی گئے ہیں وہاں کے علمی، تہذیبی، ثقافتی بلکہ سیاسی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے ہیں اور جس سے بھی ملے ہیں اسے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ یاد رہے کہ خود ڈاکٹر صاحب نے "گردِ راہ" کے کسی ایک لفظ میں بھی اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ دراصل دنیا کی بڑی بڑی شخصیات جس طرح ان سے روابط استوار رکھتی ہیں اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے مل کر جو پہلا جذبہ مقابل کے دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے وہ اپنائیت اور محبت کا جذبہ ہے۔ ورنہ وہ تو مثلاً جب اسرار الحق مجاز کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری کا رنگ انہی کے کہنے پر بدلا اور اپنی پہلی نظم انہی کی فرمائش پر لکھی (اور مجاز کی شراب نوشی کا آغاز بھی انہی کے سامنے ہوا) تو ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں انھیں اپنے مبلغ علم سے (جو مختصر ہونے کے باوجود ان کے لیے قابلِ توجہ تھا) آگاہ کرتا رہتا تھا۔"

اس طرح کا جملہ کوئی ایسا شخص نہیں لکھ سکتا جو اپنی ذات کے حوالے سے اس طرح کی شدید خوش فہمیوں میں مبتلا ہو جو دراصل اس کی غلط فہمیاں ہوں۔ یہ ایک کھرے اور سچے آدمی کا اظہارِ حقیقت ہے اور "گردِ راہ" کے شروع سے لے کر آخر تک یہی کھرا اور سچا لہجہ کارفرما ہے۔

یہ کتاب قارئین کو گزشتہ نصف صدی کی بعض مشہور و معروف سیاسی، تہذیبی، ادبی اور علمی شخصیتوں سے بہت قریب سے متعارف کراتی ہے۔ اس میں جہاں مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر کچلو، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر اقبال شیدائی کے کرداری خاکے موجود ہیں وہاں ہم علامہ اقبال، مولوی عبدالحق، سر عبدالقادر، منشی پریم چند، حفیظ جالندھری، پکاسو، نرودا، پطرس بخاری، چراغ حسن حسرت، راشد، منٹو، مجاز، اصغر، جگر، آغا حشر، خالدہ ادیب خانم، پروفیسر مجیب، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی، عبداللہ چغتائی اور متعدد دوسرے ملکی اور غیر ملکی اہلِ علم اور اہلِ قلم و اہلِ موقلم کے مزاج و کردار کی بعض نمایاں انفرادیتوں سے تعارف کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔

اتنے بہت سے ملکوں کے سفروں اور اتنی بہت سی شخصیتوں سے ملاقاتوں کا اعزاز اس وقت نہایت درجہ بامعنی ہو جاتا ہے جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو دنیا کی متعدد اہم زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ اس غیر معمولی استعداد کی وجہ سے

کرۂ ارض کے کسی مقام پر وہ غیریت محسوس نہیں کرتے اور کسی بھی انسان کو اجنبی نہیں پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس جس ملک یا شہر یا شخص کو دیکھا اور مس کیا ہے، وہ اس کے باطن میں اترتے چلے گئے ہیں۔ باطن میں اتر جانے کا یہ کمال ۔ میری رائے میں ۔ انھیں ان کی افسانہ نگاری کی برکت سے بھی ودیعت ہوا ہے۔ چنانچہ انھیں افسانہ نگاری ترک کیے برسوں گزر چکے ہیں مگر ادب کی تخلیق کے لیے جس گہرے مشاہدے اور تجزیے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ڈاکٹر صاحب کے دل و دماغ میں اب تک پوری قوت اور شدت کے ساتھ موجود ہے۔

بعض مقامات پر ڈاکٹر رائے پوری کے تجزیوں سے اختلاف کی گنجائش بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً انھوں نے شاعری کے مقابلے میں نثری ادب کو زیادہ معتبر قرار دے ڈالا ہے کیوں کہ ۔ ان کے الفاظ میں ۔۔۔ شاعری کی لغت محدود ہوتی ہے اور اس فن نے مشرقی اور اسلامی ذہن کو نقصان پہنچایا ہے۔ وجہ یہ بتائی ہے کہ جدید علوم نے جہانِ معنی میں اتنی وسعت پیدا کر دی ہے کہ شاعری کا دامن سمٹ گیا ہے اور اس لیے بیسویں صدی کے وسط سے اب تک دنیا کی کسی زبان میں کوئی بڑا شاعر نمایاں نہیں ہوا۔ پھر انھوں نے یہ بھی **فیصلہ** صادر فرمایا ہے کہ یہ ادب کے انحطاط کا دور ہے!

یہ محل کسی بحث میں پڑنے کا نہیں ہے۔ مجھے صرف اس حیرت کا اظہار کرنا ہے کہ شاعری، جو فنونِ لطیفہ کی صدر انجمن ہے، ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اس صدی میں گردن زدنی کیوں قرار پائی ہے جب کہ اس صدی میں تو ۔ کم سے کم اردو کی حد تک ۔ شاعری کی لغت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ لغت اور لفظیات کے حوالے سے صرف جوش ملیح آبادی کا کلام ہی ملاحظہ فرما لیجیے جس میں نئے سے نئے لفظوں اور ان کے نئے سے نئے مفاہیم اور ان مفاہیم کی نئی سی نئی پرتوں کا ایک جہان آباد ہے۔ شاعری تو لفظ کو بلیغ بناتی ہے اور اس میں ایسے معانی داخل کرتی چلی جاتی ہے جس پر نثر کو اس لیے قدرت حاصل نہیں ہوتی کہ اسے عموماً لفظ کے مروجہ معانی سے کام نکالنا ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بیسویں صدی کے وسط سے اب تک کوئی بڑا شاعر کسی زبان میں پیدا نہیں ہوا۔ تو پابلو نرودا کا تو ڈاکٹر رائے پوری نے "گرد راہ" میں ذکر بھی فرمایا ہے جو ایذرا پاؤنڈ اور ایلیٹ سے بھی کہیں بڑا شاعر تھا اور جس کا چند برس پہلے ہی انتقال ہوا ہے۔ پھر غالب اور اقبال کا درمیانی دور دیکھیے کہ دونوں کے انتقال کے درمیان پوری پون صدی کا عرصہ پھیلا ہوا ہے۔ بڑے شاعر بلکہ بڑے نثر نگار بھی جلدی جلدی سے تھوک فٹ پیدا نہیں ہوا کرتے۔ اگر دو بڑے شاعروں کے درمیان چند برس کا وقفہ آ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شاعری کو زوال آ گیا ہے۔ یہ ادب کے انحطاط کا دور نہیں ہے۔ آخر جوش اور حفیظ اور فیض اور راشد اور منٹو اور کرشن اور غلام عباس اور بیدی کے انتقال کو چند ہی برس تو گزرے ہیں اور رواں نصف صدی ان کے شعر و ادب سے روشن ہے اور روشنی انحطاط کی مظہر نہیں ہوتی۔ آخری گزارش یہ کہ جس دور میں "گرد راہ" کی سی ادبی و تہذیبی و تاریخی دستاویز تخلیق پا سکتی ہے اسے انحطاط کا دور کہنا گناہ ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے دو چار مقامات پر واضح کر دیا ہے کہ انھوں نے "گفتنی" حقائق میں سے انتخاب کیا ہے اور "ناگفتنی" کو چھوڑتے چلے گئے ہیں۔ کاش وہ چند "ناگفتنیاں" بھی شامل فرما لیتے کہ بعض ناگفتنیاں، گفتنیوں سے بھی زیادہ گفتنی ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد سے مجھے صد فی صد اتفاق ہے کہ ان کی زندگی حقیقت کی جستجو میں بسر ہوئی ہے۔ زندگی کرنے کا یہ نہایت وقیع اور مثبت انداز ہے۔ اس لیے میں نے عرض کیا ہے کہ وہ "گرد راہ" کی آئندہ اشاعت کو ایک آدھ ناگفتنی سے ضرور مزین فرمائیں۔ کوئی سیاسی ۔ کوئی سماجی ۔ کوئی مذہبی ناگفتنی ۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ایک صد درجہ بلیغ فقرے میں اپنی ان سوانحی یادداشتوں کا محاکمہ یوں کیا ہے۔

"دوسروں کی طرح میں بھی اپنے دور کا گواہ ہوں۔" ان کی گواہی ۔ بقول قبلہ مجنوں گورکھپوری ۔ مستند اور معتبر ہے اور حق بات یہ ہے کہ "گرد راہ" لکھ کر انھوں نے تخلیقی ادب کے محاذ پر اپنی طویل خاموشی کی بھرپور اور بے مثال تلافی کر دی ہے۔

علی سردار جعفری

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

اختر حسین رائے پوری اس عہد کے بزرگ دانشور ہیں جنھوں نے علم و فن کے مختلف شعبوں کو اپنی ذہانت اور فراست کا نور عطا کیا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اختر حسین رائے پوری سے میری پہلی ملاقات اُن کی تحریر کے ذریعے سے ہوئی حالانکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اُن سے متعارف ہونا زیادہ فطری بات تھی۔ سنسکرت کے عظیم شاعر کالی داس کے ناٹک شکنتلا کا ترجمہ اور میکسم گورکی کی آپ بیتی کا ترجمہ ان کے ذہنی افق کی وسعتوں کا پتہ دیتا ہے جو ماضی کی اعلیٰ ترین روایات سے بھی آشنا ہیں اور عہد جدید کے انقلابی اذہان کے بعد بھی ہم نوا ہیں۔ شکنتلا میرے لیے علامت ہے اس حسن ذخیر کی جس کی ہمیں حفاظت کرنا ہے اور جس کو بار بار نیا جنم دینا ہے اور گورکی علامت ہے اس مقدس جہاد کی جو آج کی جدید بربریت کے دور میں حسن ذخیر کی حفاظت اور بازیافت کے لیے ہر ایمان دار اور صاحب ضمیر دانش ور کا فریضہ ہے۔ انھیں دونوں کے امتزاج سے ترقی پسند ادبی تحریک پیدا ہوئی جو ہمارے زمانے ہی کی نہیں بلکہ غیر منقسم ہندوستان کی ہزاروں برس پُرانی تاریخ میں ادب اور فن کی سب سے بڑی تحریک ہے۔ اور آج بھارت اور پاکستان دونوں اس کے وارث ہیں۔ یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ اس تحریک کے بانیوں میں اختر حسین رائے پوری کا نام سرِ فہرست ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حیرت کی بات ہوتی، کیونکہ شکنتلا اور گورکی سے آشنا ہونے کے بعد ادب اور فن کا یہی راستہ سب سے روشن راستہ ہے۔ سجاد ظہیر نے اپنی مشہور کتاب روشنائی میں لکھا ہے:

"۱۹۳۷ء یا اس سے کچھ پہلے اختر حسین رائے پوری نے اپنا مشہور مضمون "ادب اور زندگی" لکھا جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالے "اردو" میں شائع ہوا۔ میرے خیال میں یہ ہماری زبان میں پہلا مضمون ہے جس میں مبسوط اور مدلل طریقے سے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ اس اہم مضمون کے مصنف کی حیثیت سے اختر حسین رائے پوری کو اردو کے ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں اولیت حاصل ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے یہ مضمون پڑھا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ ایک بے تاب اور خلاق ذہن ادب کی فرسودہ روایات سے باہر نکل کر زندگی کے رنگ و لولہ میں مجھے شریک ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ اس زمانے میں اُن کے افسانے بھی میں نے پڑھے تھے اور کچھ عرصے بعد نذرالاسلام کی بنگالی نظموں کے ترجمے جن کی صدائے بازگشت ہمیشہ ہندوستان کی ہر زبان کی انقلابی شاعری میں گونجتی رہے گی۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ جب ۱۹۱۲ء کے آس پاس ٹیگور کی شہرۂ آفاق کتاب گیتانجلی کا ترجمہ ہوا تھا تو اردو زبان کا ادب پریم چند سے کترا کر رومانی ماورائیت کے بادلوں میں تیرنے کی کوشش کر رہا تھا اور جب اختر حسین رائے پوری نے نذرالاسلام کی شاعری سے اردو شاعری کی ملاقات

"کا سامان فراہم کیا تو ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑ رہی تھی اور پریم چند یہ کہنے کی تیاری کر رہے تھے کہ ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہے"

اس کے بعد میرا یہ خیال یا خواہش کہ ادبی زندگی کے آنے والے لمحوں میں مجھے ایسا ہم سفر ملے گا جس میں رہبری کی خصوصیات بھی ہوں گی کچھ بے جا نہ تھا لیکن یہ خیال پورا نہیں ہوا کیونکہ میرے اور اختر حسین رائے پوری کے راستے بدل گئے۔ اور جب میں اُن سے ملا تو ہم دونوں الگ الگ راہوں پر گامزن تھے۔ وہ سرکاری ملازمت کی ذمے داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے ادب کی خاطر وقت نہیں نکال سکتے تھے لیکن اپنی ابتدائی تحریروں میں انھوں نے جو خاموش وعدہ کیا تھا وہ اتنا مستحکم تھا کہ اُن کی ادبی حیثیت قلم رکھ دینے کے بعد بھی برقرار رہی۔

برسوں بعد امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ (ROBERT FROST) نے مجھے بتایا کہ ایسا کیوں ہوا۔

TWO ROADS DIVERGED IN A WOOD, AND
I TOOK THE REST TRAVELLED BY,
AND THAT HAS MADE ALL THE DIFFERENCE.

کچھ اسی قسم کا خیال ایک فارسی شعر میں ہے لیکن دوسرے انداز سے ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

اختر حسین رائے پوری نے اپنی تحریروں سے ترقی پسند مصنفین کی بنیاد قائم کرنے میں مدد کی، لیکن اس میں شامل نہیں ہوئے۔ یہ کہنا مشکل ہے، کہ اُن کی کیا مجبوریاں تھیں کہ ایک باغی اور خلاق ذہن سرکاری دفتروں کی نذر ہو گیا۔ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ فکر انگیز یہ حقیقت ہے کہ زندگی کے ریگستان میں ادب کا ایک روشن اور جگمگاتا ہوا ہیرا گم ہو گیا۔ کیا ہم اس کو دوبارہ تلاش کر سکیں گے؟

جب میں نے اُن کی آپ بیتی "گرد راہ" پڑھی تو کتاب ختم کرنے کے بعد تشنگی کا احساس بڑھ گیا۔ یہ ایک اچھی کتاب کی پہچان بھی ہے اور اس خیال کی تصدیق بھی کہ وہ اس سے بہت اچھی اور بھرپور کتاب لکھنے پر قادر ہیں۔ پھر بھی اُن کے قلم نے اپنے قاری کو پوری طرح خوش ہونے کا موقع نہیں دیا۔ گزشتہ سال جب کراچی میں اُن سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا اور یہ خواہش بھی کی کہ وہ اس کے دوسرے ایڈیشن میں بہت سے اضافے کر دیں۔

اُن کے پاس زندگی کا جو تجربہ ہے، علم و دانش کی جو روشنی ہے، چھے سات زبانوں کا جو سرمایہ ہے، اس سے اپنے قاری کو محروم رکھنا "بخیلی ہے رزاقی نہیں ہے" میری دلی تمنا ہے کہ وہ اقبال کے اس مصرع پر پورے اُتریں اور بہت دن زندہ رہیں تاکہ اقبال کا دوسرا شعر اُن کی توجہ اپنی طرف مبذول کر سکے ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

مجاز کا ذکر میں نے بہت شوق سے پڑھا، لیکن مجاز اور اختر رائے پوری کے دوسرے ساتھیوں اور دوستوں کی صورتیں دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیاں ہیں۔ مجاز کی شاعری سے اُن کا جو ذہنی اور جذباتی رشتہ ہے اس کا مجھے پہلے علم نہیں تھا۔

اختر حسین رائے پوری تقریباً نصف صدی پہلے اس راستے سے ہٹ گئے جو انھوں نے اپنے بہت سے ہم عصروں کو دکھایا تھا، لیکن اب جب وہ اپنے بہت سے ذاتی فرائض سے سبک دوش ہو چکے ہیں تو قلم اُن کا انتظار کر رہا ہے۔ اُن کا ذہن زندہ اور تابندہ ہے اور علم کا شوق تر و تازہ ہے۔ فراغت اور اطمینان بھی ہے۔ اس کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ وہ ادب کے اس فرض کو ادا نہ کریں جو اُن پر واجب ہے اور جس کی ادائیگی کے لیے نئی نسلیں

منتظر ہیں ۔

میں نے ادب و شعر کے گلستانوں اور پرخار وادیوں میں نصف صدی آوارہ گردی کی ہے، لیکن اس کے بعد بھی میں اختر حسین رائے پوری کی اس عطا کو فراموش نہیں کر سکتا جس نے بہت سے چراغ جلائے ہیں اور اردو ادب کی تاریخ بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کرے گی۔

میں اپنی مختصر سی بات کو رابرٹ فراسٹ کے چار مصرعوں پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو میں اختر حسین رائے پوری کی آواز میں سن رہا ہوں۔

THE WOODS ARE LOVELY, DARK AND DEEP
BUT I HAVE PROMISES TO KEEP
AND MILES TO GO BEFORE I SLEEP
AND MILES TO GO BEFORE I SLEEP

اس میں اختر حسین رائے پوری کے اور میرے مشترک دوست مرحوم جاں نثار اختر کی آواز کو بھی شامل کر دیا جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ ع

"اور دو چار قدم مشعل جاں لے کے چلو"

علی جواد زیدی

اختر حسین رائے پوری ــ ساحل و طوفان

قدما، شریف عالم اور علم دوست امیر دونوں کو صاحبِ سیف و قلم، لکھ دیا کرتے تھے۔ اُس دور میں شریف کو اپنی شرافت کے تحفظ و دفاع کے لیے تیغِ آہن اور تیغ الفاظ دونوں کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ علم دوست امیر کی شعر پروری اُس کے صاحبِ قلم کہلائے جانے کا جواز بن جاتی تھی۔ رہا صاحبِ سیف ہونا، تو یہ صاحبیّت ملکیت کی علامت تھی، تیغ زنی کی صلاحیت کی نہیں۔ اختر حسین رائے پوری شریف عالم ہیں۔ قلم ہی اُن کے علم و شرافت کی علامت بھی ہے اور قلم ہی اُن کی تلوار بھی ہے۔ اُن میں قلم کو مضبوطی اور ہوشیاری سے سنبھالے رکھنے کی صلاحیت بھی ہے اور تجزیہ و استخراجِ نتائج کی ہمت و جرأت بھی۔ ان سب کے علاوہ جو شے اُس زمانے میں بھی خاصی کم یاب تھی، وہ عام ڈگر سے ہٹ کر سوچنے اور غور کرنے ہی کا نہیں بلکہ بدلتے ہوئے عصری تقاضوں کی تپتی دھوپ میں اجتہادی فکر کی برہنہ پائی اور صحرا نوردی کا حوصلہ بھی ملتا تھا۔ عہدِ حاضر کے نا قدین میں ایک جماعت صاحبانِ سیفِ قلم، کی بھی نکل آئی ہے، جو افراد سے لے کر نظریات تک پر جارحانہ وار کرنے کو ہی کُلِّ ایمان سمجھتی ہے اور قلم کی تیغ زنی کے ابتدائی آداب یعنی موضوع سے متعلق تمام علوم سے بے بہرہ، ماحول سے تخلیقی آگہی کے رشتے اور علم و ادب کے فنّی استعمال کے سلیقے کو لازمی نہیں مانتی۔ اختر حسین رائے پوری کے یہاں مطالعہ و مشاہدہ و تجربہ اپنی وسعت اور تنوّع کے ساتھ موجود ہے۔ وہ خواہ مخواہ کی تیغ زنی اور نیزہ افگنی کے قائل نہیں، مگر جب وار کرتے تو بھرپور وار کرتے۔ وہ ہمیشہ قلم کے دھنی رہے۔ اب تو حالات سے مجبور ہو کر صرف املا کراتے ہیں لیکن اُن کے دل میں بیٹھا ہوا خاموش مجاہد، جیسے انھیں یہ یاد دلاتا رہتا ہے کہ متانت و دور اندیشی حق بجانب، مگر اُن کے ہاتھ میں قلم اللہ کی لاٹھی ہے اور جیسا کہ ہم آپ سنتے چلے آئے ہیں ع

اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی

اختر حسین رائے پوری ہماری ادبی تاریخ کے اہم موڑ پر نمودار ہوئے اور اُس دَور کے معتبر اور مستند ادبی قافلے میں شریک بلکہ ایک وقت کے میرِ قافلہ بھی رہے۔ یہ وہ قافلہ تھا جس کے ایک ہاتھ میں عَلَم اور دوسرے میں قلم تھا۔ مدعا یہ نہیں کہ اس طویل قافلے میں ایسے افراد تھے ہی نہیں جن کے ہاتھوں میں صرف قلم یا صرف عَلَم رہا ہو، لیکن یہ وہ دَور تھا جب مجاز اپنی محبوبہ تک سے یہ فرمائش کرنے لگتے تھے کہ ع

تُو اس آنچل سے اِک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

میں نے جب اپنے ایک دوست کو پہلے پہل یہ مصرعہ سنایا تو نہ جانے کیوں انھیں ناسخ کا شعر یاد آ گیا ؎

دے رہِ و بیٹھ تو اپنا ململ کا ۔۔۔ ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

یادیں کبھی بعض اوقات کیسے ٹیڑھے میڑھے راستے اختیار کر لیتی ہیں۔ کہاں مجاز کا مصرعہ اور کہاں یہ شعر؟ مجاز کا شعر کوری مضمون

زینی سہی تھا بلکہ اپنے دور کا آئینہ دار تھا۔ اُس دور کے انقلابی ادبی مزاج میں محبوبہ صرف زینتِ خانہ یا ڈرائنگ روم کی رونق نہیں رہ گئی تھی بلکہ وہ یدانِ عمل میں مصروفِ جد و جہد بھی تھی۔ علم در دست محبوبہ کی آن بان ایسی ہی تھی کہ آنچلوں کے لہرانے کے مقابلے میں پرچموں کا لہرانا زیادہ حسین معلوم دتا تھا۔ اس واقعۂ معترضہ کے بیان کا مقصد اتنا ہی ہے کہ جہاں محبوبہ سے یہ فرمائش کی جا رہی ہو وہاں اختر حسین سے اس کے علاوہ کیا توقعات رہی ہ‌ول گی کہ وہ ذہنی طور پر ہمیشہ پرچم بہ دست رہیں اور اس عَلَم کو کبھی سرنگوں نہ ہونے دیں!—

اُس دور کے ادبی قافلے میں سب انقلاب و آزادی کے پرچم بردار ہی نہیں تھے۔ اختر حسین رائے پوری کی طرح کے چند باقیات الصالحات رجب دیکھ لیتا ہوں تو ایک قد آور شاعروں اور ادیبوں کی ایک لمبی قطار سامنے آ جاتی ہے۔ شاعروں میں اقبال کا ہم ہمہ اور جوش کا غلغلہ تھا۔ پھر کانہ، عزیز، صفی، ثاقب، حسرت، اصغر، حفیظ، آرزو، سیماب اور جگر تھے۔ اثر، احسان دانش، ساغر نظامی، روش اور جمیل مظہری تھے۔ ترقی پسند شعرا میں جوش کے علاوہ فراق، تاثیر، فیض، مجاز، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جذبی، احمد ندیم قاسمی، سلام مچھلی شہری، صہبا لکھنوی تھے۔ حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ افراد میں میرا جی، ن۔م۔ راشد، صلاح الدین اور پریم ناتھ تھے۔ نثر نگاروں کی طویل صف تھی۔ مولانا بو الکلام آزاد کی صریر کلک کی صدائے بازگشت ابھی گونج رہی تھی۔ نیاز، پریم چند، مولوی عبد الحق، مولانا عبد الماجد دریا بادی، علی عباس حسینی، علامہ سلیمان ندوی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، مجنوں گورکھ پوری، احتشام حسین، آل احمد سرور، سبط حسن، قاضی عبد الغفار، محمد حسن عسکری، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، ممتاز حسین، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر عابد حسین، سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، قاضی عبد الودود، پروفیسر مجیب، صالحہ عابد حسین، چراغ حسن حسرت، غلام رسول مہر وغیرہ وغیرہ—یہ صرف نام شماری نہیں ہے بلکہ اس یاد دہانی سے صرف اس نکتے پر زور دینا مقصود ہے کہ اس کثیر المطالعہ، ذی علم، جوان فکر، باہمت اور صاحب نظر قافلے میں اپنے امتیاز کو باقی رکھنا اور اپنی بلند قامتی کو منواتے رہنا آسان کام نہیں تھا، لیکن اختر حسین رائے پوری اُن افراد میں تھے، جو اپنی حیثیت ہر سطح پر منواتے رہے۔ سرپھرے نوجوانوں سے کبھی جو بڑی مشکل سے کسی کا تفوق تسلیم کرتے ہیں اور رکھ رکھاؤ والے بزرگوں سے بھی جو ہمت افزائی تو آسانی سے کر دیتے ہیں لیکن کسی کی حیثیت بے تامل قبول نہیں کرتے!—

اختر صاحب کا دائرۂ کار وسیع رہا ہے۔ رائے پور، کلکتہ، علی گڑھ، دلی، کراچی اور یورپ، افریقہ اور مغربی ایشیا کے ممالک گردِ راہ ہیں۔ اُن کے کاموں کی نوعیت رنگا رنگ ہے اور اُن کے فتوحات بھی متنوع ہیں۔ انھیں میں "نیلی چھتری" کی فتح بھی ہے، لیکن یہ آتش کی جوانی کی باتیں ہیں۔ انگریزی، ہندی، اردو۔ تین زبانوں کے ادیب اور صحافی ہیں اور ہر جگہ ان کی شخصیت کا نشان موجود ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ ہم سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ ہم دونوں الگ الگ ملکوں کے شہری اور اپنی اپنی شہریت پر نازاں ہیں۔ لیکن دونوں ہی دنیائے ادب کے شہری اور کبھی ختم نہ ہونے والی طلبِ علم کی راہ کے مسافر ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنا کم ملے ہیں کہ عرفِ عام میں اُس پر دوستی کا اطلاق نہیں ہو سکتا لیکن ہمارے روحانی تعلقات رسمی دوستی سے کچھ زیادہ ہی ہیں اس لیے دور ہوتے ہوئے بھی نزدیک ہیں۔ اُن کی یاد ہمیشہ تازہ تھی اور آج بھی تازہ ہے۔ اُن کی زندگی ایسی ہی طوفان خیز رہی ہے جس میں ساحل کی فکر ہو نہیں سکتی۔ اُن کی جو یادیں ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی ہیں اُن کا تعلق طوفانِ بے ساحل کے دور سے ہے۔ اب کہ ظاہر بھی نگاہوں میں وہ ساحلِ بے طوفان نظر آنے لگے ہیں۔ یہی یادیں ایک بے یقینی کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہیں اور اُن کے دماغ کی گہرائیوں میں جھانکنے کی دعوت بھی دے رہی ہیں۔

پچھلے سال میں قیامِ پاکستان کے بعد پہلی بار اُس کے پُرانے دار السلطنت کراچی پہنچا۔ اس سے پہلے جب گیا تھا تو یہ صرف صوبۂ سندھ کا دار الخلافہ تھا۔ اس شہر میں بڑی تبدیلیاں آ گئی تھیں، تقریباً ہر چیز نئی تھی، چمک دمک پہلے سے زیادہ تھی۔ شہر بہت پھیل گیا تھا۔ نئی نئی کالونیاں

آباد ہو گئی تھیں، کئی کئی منزلوں کی عمارتیں، چوڑی سڑکیں، موٹروں کی یلغار تو تھی ہی، آبادی کی نوعیت بھی بہت بدل گئی تھی۔ اس شہر میں برصغیر ہندوستان کے ہر حصے کے رہنے والے آ بسے تھے، یہاں کے قدیم رہنے والے یہاں سے ہندوستان چلے گئے تھے۔ وہ فضا ہی زیر و زبر ہو گئی تھی، لیکن نئے بسنے والوں میں اردو اور پنجابی کے بہت سے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ فطری طور سے میرے دل میں جن اردو ادیبوں سے ملنے کی خواہش بیدار ہوئی اُن میں اختر حسین رائے پوری بھی تھے۔ اِن کے پاؤں میں واقعۃً چکّر تھا۔ ہندوستان میں تھے تب بھی ایک جگہ جم کے نہ بیٹھے اور یہاں آنے کے بعد سے تو "جہاں گشت" ہو گئے تھے۔ بہتر ہے کہ "جہاں گرد"، کہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ذہن "جہانیاں جہاں گشت" کی طرف منتقل ہو کر سوءِ ادب کا مرتکب ہوا۔ غالب نے ویسے بھی متنبہ کر دیا تھا کہ ع

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اختر کو ولایت کا مرتبہ حاصل نہ تھا، دنیا کی سیاحت کا رتبہ البتہ ملا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس سیاحت نے انھیں کچھ نہ دیا ہو۔ جو پایا اُس کو اُنھیں سے سنیے :۔

"میں نے کم عمری میں جو حقیقت کی تلاش شروع کی وہ پیرانہ سالی میں بھی جاری ہے۔ ظاہر کی آنکھ نے تماشا گاہِ عالم میں بہت کچھ دیکھا اور چشمِ باطن نے روح کی گہرائیوں کو کچھ حد تک پہچانا" اور "میں انسان دوستی اور انسان بیزاروں کی بھول بھلیوں سے گزر کر انسان شناسی کی منزل تک پہنچا ہوں۔ یہ روحانی اور ذہنی سفر آسان نہ تھا"

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ کہنا صرف اتنا تھا کہ کراچی پہنچنے کے بعد اختر حسین رائے پوری سے ملنے کی خواہش کی شدت کا جب صہبا لکھنوی تم بھوپالی تم کر جوی کو علم ہوا تو انھوں نے ملاقات کے تمام مراحل یوں طے کرا دیے گویا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ رائے پوری نے مجھے سہ پہر کی چائے پر یاد کیا اور میں دو تین قریبی دوستوں کے ساتھ۔ جن میں ممتاز حسین اور صہبا لکھنوی ضرور تھے۔ وقت سے دردولت پر حاضر ہو گیا۔ یہ ٹھیک سے یاد نہیں کہ مشفق خواجہ اور محمد علی صدیقی بھی ساتھ تھے یا نہیں، میزبان باقاعدہ تیار ملے، وضع دار میزبانوں کی طرح آمادہ اور ہمہ تن استقبال۔ میں اختر صاحب کو برسوں کے بعد دیکھ رہا تھا۔ راست قد اب بھی تھے، لیکن بال جتنے بھی رہ گئے تھے وہ بالکل سفید ہو چکے تھے اور رخسار سوکھے ہوئے تھے۔ اپنے گھر کے پہچانے ہوئے نشیب و فراز سے بھی یوں گزر رہے تھے کہ مجھے معاً محسوس ہوا کہ آنکھوں کی روشنی اب تقریباً جواب دے چکی ہے۔ میں آگے بڑھا۔ ہم دونوں گلے ملے۔ مدتوں کے بچھڑے ہوئے پرانے ہم سفر اب کتنے اجنبی ہو چکے تھے۔ میں نے تو انھیں دیکھ بھی لیا تھا لیکن وہ مجھے صرف سُن سکتے تھے یا چھو کر محسوس کر سکتے تھے! میرا دل بوجھل ہو گیا، مگر میں نے یہ تاثر ظاہر ہونے نہیں دیا۔ ویسے ہم لوگ ہم سفری کے باوجود ہندوستان میں بھی ایک دوسرے سے کم ملے تھے لیکن بعض ذہنی منزلوں کی ہم سفری رسمی ملاقاتوں کی کم محتاج ہوا کرتی ہے! — اِدھر اُدھر کی باتیں رہیں، "گردِ راہ" کا بھی ذکر آ گیا۔ کچھ اُن دوستوں کی باتیں رہیں جنھیں وہ ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے، کچھ اُس دور کی باتیں رہیں جو اُنھیں اور مجھے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ آخر میری اور اُن کی عمروں میں تین، چار ہی برس کا تو فرق تھا۔ تھوڑی دیر یادوں کی اس خنک چھاؤں میں گفتگو چلتی رہی، لیکن پاکستان میں میرا قیام بے حد مختصر تھا۔ کئی پروگرام ایک ایک دن میں پورے کرنا پڑ رہے تھے۔ ہم بادلِ ناخواستہ جُدا ہوئے۔ میں دل کا مریض تھا، وہ بھی پہلے سے چاق و چوبند نہیں رہ گئے تھے۔ پھر بھی اُن میں سینہ تان کر جینے والوں کی آن بان تھی، ایسے جینے والے جو صحت کے اُتار چڑھاؤ سے کبھی ہار نہیں مانتے۔

اختر حسین اُن گنے چُنے ادیبوں میں ہیں جنھوں نے اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں بھی لکھ کر ایک مقام حاصل کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کی ادبی زندگی کی ابتدا ایک ہندی ادیب اور صحافی کی حیثیت سے ہوئی۔ ہندی کے ساتھ سنسکرت بھی پڑھ لی تھی اور "ساہتیالنکار" کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ بنگال میں طویل قیام اور بنگلہ زبان سے محبت کی بدولت اُس زبان کے ادب سے بھی گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اُس دور میں انگریزی تو بہرِ باقاعدہ

پڑھے لکھے انسان کا اوڑھنا بچھونا ہوتی تھی، وہ تو طالب علم بھی انگریزی کے تھے۔ اردو کی طرف بعد میں مائل ہوئے اور اس تمام ادبی اثاثے اور اپنی غیر معمولی ذہانت کے ساتھ انھوں نے اردو کو بہت کچھ دیا۔ وہ جوانی ہی میں ہندی کے ادیب اور صحافی بن گئے اور ہندی میں اُن کے مضامین "مادھوری" اور "وشال بھارت" جیسے معیاری رسالوں میں چھپنے لگے تھے۔ روزنامہ "وشوامتر" کلکتہ کے ادارتی اسٹاف میں شامل تھے اور پھر ہندی رسالہ "وشووانی" نکالتے رہے۔ خود رائے پوری کا بیان ہے کہ اُن کے ہندی مضامین کی نہ صرف یہ کہ تعریف ہوئی بلکہ "آگے چل کر میرا (اختر حسین) کا شمار صاحبِ طرز نثر نگاروں میں ہونے لگا اور پنڈت بنارسی داس کی کسی کتاب میں میری ذات اور اسلوب پر ایک مضمون شامل ہے۔"

اردو صحافت کی طرف انھیں غالباً سب سے پہلے سردار دیوان سنگھ مفتوں نے متوجہ کیا۔ اُن کے "ریاست" کی بڑی دھوم تھی لیکن اختر حسین رائے پوری وہاں مہینہ بھر سے زیادہ نہ ٹک پائے اور پھر مول چند اگروال کے ہندی "وشوامتر" میں واپس آ گئے۔

کلکتے کے دورانِ قیام میں انھوں نے بنگلہ میں اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ ایک دوست کی وساطت سے قاضی نذرالاسلام سے ملاقات کی اور اُن کی شخصیت کی کشش کے زیرِ اثر اُن کی نظموں کا بنگلہ سے اردو میں ترجمہ کر ڈالا۔ یہ نظمیں ۳۲-۱۹۳۱ء میں "نگار" "اردو" اور "ساقی" وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں اور پھر "پیامِ شباب" کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوئیں اور متعدد بار چھپیں۔ بنگلہ ناول نگاروں میں سرت چندر اور بنکم چندر اور شاعروں میں ٹیگور اور نذرالاسلام نے اردو پر ہی نہیں ملک کی سبھی معاصر زبانوں پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اختر حسین رائے پوری کا بھی اس میں ایک حصہ ہے۔

دھیرے دھیرے اختر صاحب اردو سے قریب آتے گئے یہاں تک کہ وہ اردو ہی کے ادیب ہو گئے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ "میری ادبی خدمات کا اصل محور اردو ہی کو سمجھنا چاہیے۔" اصل محور اردو ضرور ہے لیکن چھوٹے موٹے محور اور بھی رہے ہیں۔ ان میں ہندی خاصی اہم ہے۔۔ تخلیقی ادب میں انھوں نے افسانے کو منتخب کیا تھا مگر سب سے زیادہ توجہ تنقید پر مرکوز رہی۔ دونوں ہی سمتوں میں اُن کے سفر کا آغاز ہندی سے ہوا۔ کئی مضامین جیسے "ادب اور زندگی"، "ساہتیہ اور کرانتی" کے نام سے پہلے وشوامتر میں چھپے اور پھر تقریباً اُسی زمانے میں اُس کا ترجمہ اردو میں ہوا۔ یہ اردو ترجمہ جولائی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا اور اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تنقید کا یہ پہلا پتھر ہے جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی ترقی کے راستے میں نصب کیا گیا۔ سجاد ظہیر نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ ان کی تصنیف "روشنائی" کا یہ اقتباس نقل کرنے کے قابل ہے:

> "۱۹۳۶ء یا شاید اس سے بھی کچھ پہلے اختر حسین رائے پوری نے اپنا مشہور مضمون "ادب اور زندگی" لکھا جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالہ "اردو" میں شائع ہوا۔ میرے خیال میں یہ ہماری زبان میں پہلا مضمون ہے جس میں مبسوط اور مدلّل طریقے سے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق کی ضرورت بتائی گئی اور پرانے ادب کی رجعت پسند قدروں کی تشریح کر کے اس کی سخت مذمت کی گئی۔ اس اہم مضمون کے مصنف کی حیثیت سے اختر حسین رائے پوری کو اردو کے ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں اولیت حاصل ہے۔"

اسی بات کو ذرا مختلف انداز سے مجنوں گورکھپوری جیسے قدآور ترقی پسند نقاد نے بھی تسلیم کیا ہے:

"اس دور (۱۹۴۷-۱۹۳۶ء) نے ایسے ایسے مفکر و مدبر پیدا کیے جنھوں نے ہم کو نئے موڑ اور نئے زاویوں سے دیکھنا دکھانا سکھایا۔ انھیں میں ایک بہت اہم نام ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا ہے۔ ان کے عہد آفریں مضمون "ادب اور زندگی" اور چند دوسرے مضامین سے ترقی پسند تحریک اور انجمن کے اصول و نظریات کے تعین اور ترتیب و تدوین میں بہت مدد ملی۔ خصوصیت کے ساتھ "ادب اور زندگی" ترقی پسند تنقید کا سنگِ بنیاد ثابت ہوا۔"

تنقید کے میدان میں اختر حسین رائے پوری نے زیادہ نہیں لکھا لیکن جو لکھا، اُس نے فوراً ہی ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اُن کے دو ہی مجموعے "ادب اور انقلاب" اور "روشن مینار" شائع ہوئے۔ شاید کچھ منتشر مضامین اور ہوں۔ اُن کے پہلے ہی تنقیدی مضمون کا کردار ایسا تھا کہ تاریخ ادب کا جزو بن گیا۔ "ادب اور زندگی" اور دوسرے مضامین کی نوعیت رہبرانہ تھی اور دو مستند ترقی پسندوں یعنی مجنوں گورکھ پوری اور سجاد ظہیر نے اس پر گواہی دی ہے کہ اُن کی ادبی تعبیر و تشریح نے ترقی پسندی کے ابتدائی خطوط کی تعیین کی اور بعد میں آنے والے کارواں نے کم و بیش اُسی راہ کو اپنایا۔ گویا ترقی پسندی کے نظریہ ساز دور میں اُن کی حیثیت بنیادی قرار پائی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ نظریاتی تنقید کے ہی مرد میدان تھے۔ لیکن مسلسل جہاد کے آثار اُن کی نگارشات میں نہیں ملتے۔ انھوں نے سب سے پہلا مگر بھرپور وار ضرور کیا۔

انھوں نے نظریہ سازی کے کام میں پہل تو کی لیکن آخر تک آتے آتے وہ یہ بھی اقرار کرنے پر مجبور ہوئے کہ "تخلیق کا عمل بڑا پیچیدہ ہے اور اُسے آسانی سے کسی مفروضے یا نظریے میں سمیٹا نہیں جا سکتا۔" اس میں کلیدی لفظ "آسانی سے" ہے۔ تخلیقی عمل کی پیچیدگی کو مختلف الجہات اور مختلف الالوان تنقیدی فکر، اسلوب اور جرأت اجتہاد کے وسیلے سے ہی گرفت میں لایا جا سکتا ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں۔

> "جب کسی معاشرے پر روایتوں کی تہیں جم جاتی ہیں تو انھیں تنقید کی چھری ہی سے صاف کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے اجتہاد کا جذبہ ضروری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑے ادب اور آرٹ کی پہچان یہی ہے کہ اُس میں تنقید اور اجتہاد کی شان مضمر ہو۔"

وہ اس بڑے تناظر میں جب مشرقی ذہن کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> "مشرقی ذہن کو بالعموم اور اسلامی ذہن کو بالخصوص، فقہ اور شاعری نے یوں نقصان پہنچایا کہ ایک نے تنقید کی صلاحیت کو اور دوسرے نے اُس کے اظہار کو مسدود کر دیا۔"

فقہ میں اجتہاد کا بھی مرتبہ ہے اور نص کا بھی، لیکن ابدی دین میں اجتہاد کے دروازے بند کر دینے سے باہر کی تازہ ہوا آنی بند ہو جاتی ہے اور اس گھٹی ہوئی فضا میں کم تر اذہان بہکنے اور بھٹکنے لگتے ہیں اور روح عصر سے خود کو ہم آہنگ نہ پا کر بہتے ہوئے چشمے کی بجائے، سرابوں کا تعاقب کرنے لگتے ہیں۔ اجتہاد کے لیے روح عصر کا ادراک اور اس ادراک کے لیے تنقیدی صلاحیت لازمی ہیں اور جب تک یہ بروئے کار نہ آئیں اجتہاد کی راہ کی رکاوٹیں دور نہیں ہو سکتیں۔ رہا رائے پوری کے بیان کا دوسرا ٹکڑا کہ شاعری نے اظہارِ نقد کو مسدود کر دیا، بے حد جزوی طور پر ہی صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ ہماری شاعری میں آزادہ روی کی جو رو سی ہے اُس نے تنقید و اجتہاد کے دروازوں پر کبھی کبھی پوری طاقت سے دستک دی ہے اور اُسے شاعرانہ اظہار سمجھ کے معاف بھی کر دیا گیا ہے۔ نثر میں یہ تاب و تواں بہت بعد میں آئی لیکن جب آئی تو اپنے ساتھ شرح و بسط کے دفتر اور جہاد کے ساز و سامان لے کر آئی۔ غالب اور اقبال کی شاعری اسی لیے بڑے عالمی ادب کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شاعری اور ادب پر فقہی قدغن کی لمبی پرچھائیاں بھی مدتوں پڑتی رہی ہیں اور ان پرچھائیوں نے جرأت مندانہ اظہارِ نقد کو روکا بھی ہے۔ لیکن یہ اردو شاعری ہی ہے۔ خاص کر صوفیانہ شاعری۔ جس نے مفتی و زاہد اور رندی و پرہیزگاری کی حدوں کا احساس دلایا اور اکثر انھیں توڑا بھی۔

اختر حسین کی انسان دوستی زمان و مکان میں محصور و محدود نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں کرۂ ارض کے بسنے والے جن ہولناک تجربوں سے گزر رہے ہیں اُن سے وہ ایک حساس ادیب کی طرح وقتی طور پر افسردہ خاطر ہو جاتے ہیں لیکن انھیں اُن کا ذہن تسلی

دہتا رہتا ہے :

"تاہم اس شکست و ریخت میں انسانیت کی تعمیر کے لیے دو ستون باقی ہیں۔ جمہوریت اور اشتراکیت۔ جمہوریت سے مراد حکومت پر جمہور کا اختیار اور اشتراکیت سے مراد اقتصادی وسائل پر جمہور کی حکمرانی۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور تشنہ ہے۔ میرا ذہن جمہوریت پر سرمایہ داری کے تسلط کو اسی طرح مسترد کرتا ہے جس طرح اشتراکیت پر کسی قسم کی ڈکٹیٹر شپ کو۔"

اس بیان کے پس منظر میں وہ گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لیتے اور بے بسی اور محرومی کے کرب ناک احساس کے ساتھ یہ دیکھتے ہیں کہ۔ "اسلامی ممالک میں اس صدی کے آغاز میں دستور سازی اور حقوقِ انسانی کی جو تحریک شروع ہوئی وہ ہنوز اپنے مقصد کو حاصل نہ کر سکی۔ اس امر کا اقرار کرنا چاہیے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں آمریت اور جمہوریت کے متضاد رجحانات برسرِ پیکار ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں عوام دشمن عناصر مذہب کی غلط تفسیر اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے کرتے ہیں جس سے مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔" اختر حسین کی نگاہ میں حکمراں طبقہ ہی نہیں بلکہ مسلم معاشرہ بھی اس صورت حال کا ذمہ دار ہے۔ "مسلم معاشرے کی دوسری بڑی کمی یہ ہے کہ وہ فرسودہ اوہام کو ثقافتی میراث سمجھتا رہا ہے اور ایسے اداروں کی تعمیر میں ناکام رہا ہے جو دورِ جدید میں بقا کے لیے از حد ضروری ہیں۔" ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ثقافتی میراث کی نفی کر دی جائے۔ ایک فعّال معاشرہ میراث اور ترقی کے تقاضوں کے مابین تطابق کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ یہ ہمت نہ ہو تو ثقافت دوستی اوہام پرستی کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔

رائے پوری ثقافت کے صحت مند تصور کے ساتھ اخلاق کی نوعیت پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں :

"اخلاق کا تصور انفرادی نجات پر نہیں، بلکہ معاشرے کی بہتری پر قایم ہے۔ ضمیر کا تقاضا فقط یہ نہیں کہ وہ ہمہ وقت آخرت کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہوں بلکہ اس دنیا کو عدل و انصاف کی اُن بنیادوں پر قایم کریں جو فی الحقیقت رضائے الٰہی ہے۔"

اسلامی تصورِ حیات میں رہبانیت کو دخل نہیں۔ انسان زمین پر خدا کا نائب اور اُس کا امین تبھی کہلائے گا جب وہ عدل، انصاف، سلامتی اور یکساں مواقع کے حصول کے لیے کوشاں ہو، لیکن جب تک کارکن افراد میں اخلاقی کردار اور جرأت نہ ہو گی۔ یہ معاشرہ وجود میں کیسے آئے گا۔ اختر حسین رائے پوری بھی انفرادی اخلاق کو حصولِ رضائے الٰہی کا ایک وسیلہ قرار دیتے ہیں اور اصل مقصد نہیں مانتے۔

وہ آخری صفحات میں پڑھنے والوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ جاگیردارانہ طرزِ فکر نئی زندگی کی تعمیر نہیں کر سکتا۔ پھر کون سا نظامِ فکر اپنایا جائے؟۔ اس سلسلے میں ہمیں جمہوریت اور اشتراکیت سے متعلق اُن کے اُسی اقتباس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو کچھ دیر پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ اس سے صاف نمایاں ہے کہ وہ سکہ بند جمہوریت اور اشتراکیت میں تسکین کا سامان نہیں پاتے لیکن وہ یہ بتانے سے بھی قاصر ہیں کہ انھیں کس طرح کی جمہوریت یا اشتراکیت چاہیے؟ ظاہر ہے کہ "گرد راہ" میں نظریاتی مباحث ضمنی اور ذیلی طور سے آئے ہیں۔ یادداشتوں سے اس سے زیادہ کی توقع فضول ہے، لیکن بین السطور سے اُن کی تشکیک جھلکتی رہتی ہے۔ اُن کے یہاں اشتراکیت کے تخیل کی نظریاتی لچک اور جمہوری سرمایہ دار نظام سے مایوسی، دونوں کو ملا کر دیکھا جائے تو محسوس ہو گا کہ یا تو وہ فرد کی آزادی اور اشتراکیت میں ایک توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے ہیں یا پھر حالات نے اس سارے منظر نامے کو دھندلا دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ مستقبل کے بارے میں انھیں کا ایک نامکمل جملہ دہرا دینا کافی ہو گا۔

"دھندلکے میں مسافر اسی توقع پر چلتا رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح منزل مل جائے گی۔"

اختر حسین رائے پوری زیرِ لب بھی بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں مثلاً ایک جگہ انھوں نے ناسازگار ماحول کا بھی ذکر کیا ہے۔ کچھ "گردِ راہ" کی نوعیت اور مفاہیم کے پھیلاؤ میں بھی وہ کھو جاتے ہیں۔ یہاں ان سب سے قطعِ نظر کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ عملی تنقید کے میدان میں وہ کچھ گریزاں گریزاں سے نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ جو اُن سے قریب رہتے ہیں جیسے مجاز اور مخدوم محی الدین، اُن کا ذکر بھی وہ شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک، جس کے وہ نظریہ ساز رہے ہیں، اس کے بارے میں وہ خاموش نظر آتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ حفیظ اور ن۔ م۔ راشد کا ذکر زیادہ تفصیل سے کرتے ہیں۔ بعض اوقات، یہ شبہ سر اٹھانے لگتا ہے کہ وہ اپنے ترقی پسند ماضی کے ذکر سے عمداً احتراز تو نہیں کر رہے ہیں؟ بہرحال عملی تنقید کے سلسلے میں اختر حسین کا رد یہ تاثراتی زیادہ اور نظریاتی کم ہے۔ "گردِ راہ" میں جہاں بھی ادبی تنقید کی نوبت آئی ہے، وہ علی العموم کچھ اشارے کر کے آگے بڑھ گئے ہیں۔ فی الحال انھیں اشاروں پر گفتگو کرنا ہوگی۔

ادب کی موجودہ صورتِ حال پر انھوں نے یہ محاکمہ کیا ہے کہ "گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد دنیا نے کوئی عظیم ادب یا شاعر نہیں پیدا کیا۔ سارتر، مالرو اور پابلو نرودا کی موجودگی سے وہ اس لیے صرفِ نظر کرتے ہیں کہ یہ "اس صدی کے شروع میں پیدا ہو کر جنگِ عظیم تک اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے عروج کو پہنچ چکے تھے"۔ وہ یہ نظریہ پیش نہیں کرتے کہ اب تخلیقی عمل بند ہو چکا ہے لیکن آج جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں تکنیک کے تجربے کے نام پر الفاظ کے الٹ پھیر کے ساتھ فکر اور مشاہدے کی تکرار کا ہیجان ہے۔ وہ اس کی "اہمیت اور قوت" کے منکر ہیں۔

اس وسیع تناظر میں ان کا خیال ہے کہ "ہماری شاعری بعض اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتی۔۔۔۔ بیسویں صدی کی شاعری کا طرۂ امتیاز اُس کا فکری عنصر ہے اور اس ضمن میں اقبال کا نام ایلیٹ اور رلکے کے ساتھ لیا جائے گا۔ اقبال کے بارے میں عقیدت کے غلو آمیز جذبات سے الگ ہو کر اُن کی رائے یہ ہے کہ "غمِ دوراں کا ایسا (اقبال جیسا) نوحہ خواں اور عظمتِ انسانی کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہ ہوا"۔ ایک مارکسی نقاد کے قلم سے نکلے ہوئے یہ جملے وزن رکھتے ہیں اور اختصار کے باوجود عام عقیدت مندی کے طویل قصیدوں پر بھاری ہیں۔ یہاں یہ یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ زیڈ لوف لائن کے ماتحت چالیسویں دہائی کے وسط آخر سے وہ اہلِ قلم ترقی پسند نہیں رہ گئے تھے جو اس سیاست سے بے تعلق تھے۔ تقسیمِ ملک سے کچھ پہلے ہی ملازمت کی مجبوریوں یا اور کسی سبب سے رائے پوری بھی فعال ترقی پسند نہیں رہ گئے تھے۔

انھوں نے غزلیہ شاعری کے بارے میں بھی رائے زنی کی ہے۔ اُن کے خیال میں اردو غزل کا کلاسیکی دور داغ دہلوی پر ختم ہوا جب اقبال نے داغ کو جہاں آباد کا آخری شاعر کہا تو مدعا یہ تھا کہ وہ آخری بڑے غزل گو تھے جنھوں نے کلاسیکیت کو نبایا۔

"لیکن اسی موقع پر غزل کی نشاۃ ثانیہ کا وہ دور شروع ہوا جسے نو کلاسیکی (NEO-CLASSIC) کہنا چاہیے۔ حسرت کو اس تحریک کا امام کہا گیا ہے حالانکہ انصاف یہ مرتبہ شاد عظیم آبادی کو دے گا۔ وہ عمر میں حسرت سے کہیں بڑے تھے اور وہ جس قافلے کے پیش رو تھے اُس میں بڑے بڑے سخن ور شامل ہوئے۔ نشاۃ ثانیہ کا یہ دور طویل نہیں تھا بلکہ بقول رائے پوری "جگر پر ختم ہو گیا"۔

متصوفانہ شاعری کے سلسلے میں انھوں نے اصغر کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے اور اس سلسلے میں بھی شاد عظیم آبادی کا نام آ گیا ہے:

"میری رائے میں خواجہ میر درد اور شاد عظیم آبادی کے بعد ہماری زبان میں تصوف

کا مقام سب سے بلند ہے اور غزل کی تہذیب میں کوئی ہم عصر اُن کا ہم پلّہ نظر نہیں آتا۔"

تصوّف کبھی بھی اردو میں رجحانِ غالب نہیں رہا ہے۔ درد اور شاد کی صوفیانہ شاعری ہو یا اصغر آسی غازی پوری کی، ہر صورت میں یہ لوگ انفرادی رجحان کو ظاہر کرتے ہیں۔ میں رسمی صوفیانہ شاعری کی بات نہیں کرتا لیکن درد اور شاد کے ما بین غالب کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ — اس کے علاوہ غزل کی تہذیب میں متصوفانہ شاعری ہی کے پہلو بہ پہلو فلسفیانہ اور عصری رجحانات کا بھی دخل رہا ہے۔ اگر اختر کے ذہن میں درد اور شاد دو انتہائی سِروں کی حیثیت سے اُبھرے ہوں تو اور بات ہے۔ اس ضمن میں جو بات پہلی نظر میں قاری کو متوجہ کرتی ہے وہ اختر حسین کی عقابی نظر ہے جو شاد پر جاکے رُک جاتی ہے اور رسم عام کے مطابق اِدھر اُدھر بھٹک کے نہیں رہ جاتی۔ یہی صورت اصغر و جگر کی بھی ہے —

اس صدی کے نصفِ آخر میں جب نئے ہیئتی تجربوں کا غلغلہ اٹھا تو ن۔ م۔ راشد کا نام سامنے آیا۔ اختر حسین نے راشد پر قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ خاص اجزا یہ ہیں :

"اُسی زمانے (۱۹۳۰ء — ۱۹۳۵ء) کے لگ بھگ آزاد نظم کا تجربہ شروع ہوا اور چالیس سال کے دوران اردو شاعری میں اس نے جو ہمہ جہت اضافہ کیا اُس میں ن۔ م۔ راشد کا بڑا حصہ ہے ... ماورا ... مجموعے کا آدھا حصہ اختر شیرانی کے رنگ کا غماز تھا لیکن آگے ایک نئی آواز سنائی دی جس میں ابہام کے باوجود دلفریبی تھی اور نامعلوم سمتوں میں گونجنے کی صلاحیت تھی۔"

اس بیان میں یہ واقعاتی تسامح ہے کہ آزاد نظم کا تجربہ ۱۹۳۰ء سے بہت پہلے یعنی بیسویں صدی کے آغاز ہی میں شروع ہوا اور شرر کے "دل گداز" میں ایسی نظمیں شائع بھی ہوئیں اور لکھنے والوں کا ایک گروہ بھی سامنے آیا لیکن یہ آتی جاتی رَو دیر پا ثابت نہ ہوئی، یا یہاں تک کہ لوگ اسے بھول گئے۔ ن۔ م۔ راشد اور میراجی وغیرہ نے اسے پھر سے شروع کیا۔ اب فضا ہموار ہو چکی تھی اور وسیع تر حلقہ اُس سے متاثر ہوا۔ ترقی پسندوں میں میں نے اور مخدوم محی الدین نے ان ہیئتی پیمانوں کو پہلے اپنایا۔ لیکن ہم لوگ اس طرف "مزاحمہ کا بدلنے کے لیے" متوجہ ہوئے تھے۔ ن۔ م۔ راشد نے نظم آزاد ہی کو اپنا وسیلۂ اظہار بنائے رکھا اور ترک نہیں کیا۔ اختر حسین رائے پوری نے "نامعلوم سمتوں میں گونجنے کی صلاحیت" کا تو ذکر کیا لیکن انھوں نے اس کا اظہار ضروری نہیں سمجھا کہ یہ صلاحیت کہاں تک بروئے کار آئی۔ یہ فیصلہ بھی صادر کر دیا کہ مقفّٰی نظم پر آدھی صدی میں خزاں آ گئی۔ یہ فیصلہ یقیناً عاجلانہ کہا جائے گا۔

آخری دور کے شعرا میں حفیظ اور عظمت اللہ خاں کا بھی انھوں نے ذکر کیا ہے۔ حفیظ کے کلام کی خوبی یہ بتائی ہے کہ اس میں خاص و عام کے ذوق کی تسکین کا سامان موجود ہے۔ لیکن یہاں یہ تشریح ضروری تھی کہ "ذوقِ خاص" کا کیا سامان موجود تھا؟ گیتوں کے سلسلے میں حفیظ اور عظمت کی خدمتوں کا ذکر ناگزیر ہے لیکن اختر حسین نے اس بات کو اس طرح سے کہا ہے کہ "اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو میں ہندی کے سبک عناصر کو سمونے کی سب سے کامیاب کوشش عظمت اللہ خاں اور حفیظ نے کی ہے۔" ہندی اور سنسکرت کی ادبی وراثت کا ذکر بہت کم کیا گیا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اردو پر ہندی اور سنسکرت کا اثر براہِ راست اور بالواسطہ دونوں ہی طرح سے پڑا ہے۔ بالواسطہ اثر متاخر فارسی گویوں کے شغلِ تمثیل گوئی کی صورت میں پڑا۔ یہ اثر صائب اور غنی کے فارسی دواوین کے رواجِ عام کا مرہونِ منت تھا۔ اس حقیقت کو رائے پوری نے یوں ظاہر کر کے اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے :

"میرا خیال ہے کہ اگر کوئی سنسکرت اور ہندی کے ناصحانہ دوہوں کے پس منظر میں صائب کا مطالعہ کرے تو سبک ہندی کی ڈور ہاتھ لگ جائے گی ... لسانی ناواقفیت کی بنا پر کسی نے ہنوز سبک ہندی سے سنسکرت نیز ہندی

شاعری کا تقابلی مطالعہ نہیں کیا ورنہ بذاتِ خود یہ دل چسپ موضوع ہے"

اس میں شک نہیں ہے کہ سنسکرت اور ہندی اثرات کا جائزہ نہ صرف اردو بلکہ فارسی ادب پر بھی ابھی تک کما حقہٗ نہیں ہو گیا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس طرف کسی کی نظر نہ گئی ہو۔ صائب اور سبک ہندی کے ضمن میں یہ بات راقم الحروف نے "دیوان غنی" کے مقدمے میں ضمناً کہی ہے۔ یہ تحریر سنہ ۱۹۶۲ء کی ہے۔ دو اقتباس:

(۱) "جب لب اظہار پر سرکاری قدغن کی مہر لگی ہو تو لفظی اور معنوی صناعیوں پر توجہ کا مبذول ہونا ناگزیر تھا۔ اس رجحان کو سنسکرت اور برج بھاشا کی روایات سے بھی تقویت ملی جس کا اثر درباروں اور علما کی محفلوں میں بھی محسوس کیا جانے لگا تھا"[۱]

(۲) "اس دور کے بہت سے شعرا خود بھی مذہبی تھے اور چند ایسے بھی تھے جو انتہائی زاہدانہ اور متورعانہ زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ صائب اور غنی دونوں ہی کا اس طبقے سے تعلق ہے۔ ان لوگوں نے اپنے چاروں طرف ایک اخلاقی پستی اور مذہب سے بے تعلقی پھیلی ہوئی پائی تو وہ اخلاقیات کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اخلاقیات کے خشک مضمون میں تازگی پیدا کرنے کے لیے تمثیل کا سہارا یقیناً خوش آیند تھا۔ اسی دور میں شعرا کو سنسکرت، برج بھاشا اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے زیادہ قریبی تعلق پیدا ہوا اور دوہوں وغیرہ کی روایت سے بھی تمثیل کے رجحان کو مدد ملی"[۲]

سنسکرت، برج بھاشا، اودھی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کا جو اثر فارسی، ہندی پر اور خود اردو پر پڑا ہے اس کی تحقیق اور تجزیے کی حاجت عیاں ہے اور اختر حسین رائے پوری نے اس ضرورت کی طرف توجہ دلا کر ایک وسیع النظر ناقد کا فرض ادا کیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادیب اگر اس طرف متوجہ ہوں تو بہت سے مسلّمات صرف مفروضات ہو کر رہ جائیں گے۔ اس سے مختلف رجحانات کے ارتقا اور اُن کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور ہماری تنقید سائنسی خطوط پر آگے بڑھے گی۔

رائے پوری نے سنسکرت سے صرف "شکنتلا" کا ترجمہ کیا ہے، لیکن ترجمے کے میدان میں انگریزی، فرانسیسی اور بنگلہ زبانیں بھی اُن کے لیے جاذب توجہ رہی ہیں۔ "پیاری زمین"، "رگھو ارتھ" گورکی کی آپ بیتی (۳ جلدیں) اور "ترتیبِ مقالات گارسین دتاسی" اور "پیام شباب" اس کی گواہ ہیں۔

نثر میں وہ ہمیں رتن ناتھ سرشار کا کارنامہ یاد دلاتے ہیں؟ نہ صرف انھوں نے اردو میں ناول نگاری کے فن کی ابتدا کی بلکہ نثر کو طلسماتی داستانوں کے اُس چیستان سے نجات دلائی جن کے نام بھی اب یاد نہیں رہے۔ یہی نہیں بلکہ "فسانۂ آزاد" میں سرشار نے اودھ کے زوال پذیر جاگیردارانہ سماج کی جیسی قلعی کھولی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی تھوڑی سی جھلک ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں ملے گی۔ سرشار نے خوجی اور نذیر احمد نے ظاہردار بیگ کی شکل میں لکھنؤ اور دہلی کے کھوکھلے معاشرے کا جیسا خاکہ اڑایا ہے اُس کی تقلید کوئی نہ کر سکا۔ رومان پسند انشا پردازوں میں میر ناصر علی کو انھوں نے صحیح طور پر سر فہرست قرار دیا ہے اور رسالہ "صلائے عام" کا ذکر کر کے ہماری یاد کو جھنجھوڑا ہے۔ "زود فراموشوں کی بستی میں آج یہ کتنوں کو یاد رہ گیا ہے کہ ناصر علی لگاتار بیس برس تک یہ رسالہ اوّل سے آخر تک بقلم خود مرتب کیا کرتے تھے۔ کیونکہ کسی اور کی تحریر اُن کے معیار پر پوری نہیں اُترتی تھی۔" اگرچہ اختر کو اسی رنگین بیانی اور رومان پسندی کا عنصر نیاز فتح پوری کے یہاں بھی نظر آتا ہے لیکن اُن کی رائے ہے "نیاز کا طرز نگارش عربیت کے جس بار سے بوجھل تھا وہ رومان کو

۱۔ دیوان غنی۔ ۲۶ (مقدمہ از علی جواد زیدی) (جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف لٹریچر اینڈ لینگویجز، سری نگر)

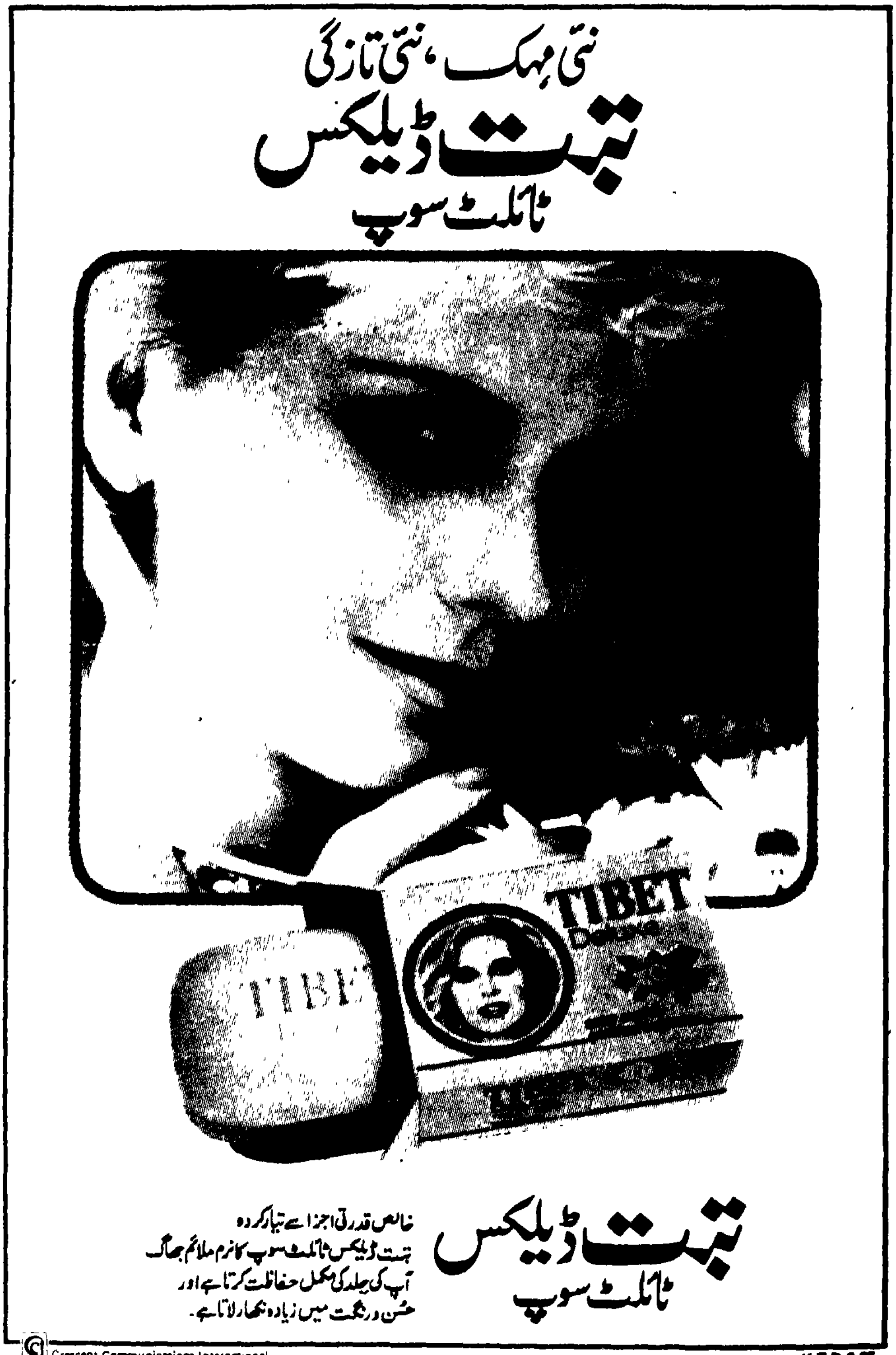
۲۔ ایضاً : ۲۶

زیب نہ دیتا تھا، البتہ انھوں نے ہماری نثر میں آزاد خیالی اور عقلی شعور کا جو رجحان پیدا کیا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔" ضمناً ترقی پسندی اور حقیقت نگاری کا ذکر کرتے ہوئے اور پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو کا نام گناتے ہوئے انھوں نے نثر کی سادگی اور سلاست کا ذکر کیا ہے، لیکن فکشن کے ادب کا ایک بے حد سرسری تجزیہ الگ سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھیں سرشار کے بعد مرزا ہادی رسوا کا نام سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ ان دونوں کی تحریروں کے درمیان سیکڑوں ناولوں کی قطار لگی ہوئی ہے، لیکن ان میں نذیر احمد اور سجاد حسین کے علاوہ کم ہی تحریریں قابلِ توجہ ہیں۔"

سنجیدہ نثری ادب میں اُن کی توجہ مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی مبذول ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ "ترجمان القرآن" اُن کا سرمایۂ حیات قرار پائے گا اور اُن کی بصیرت وحکمت کی شہادت دیتا رہے گا۔" لیکن ان کی رائے میں "تذکرہ" اور "غبارِ خاطر" میں متن کا وزن کم اور انشا کی گرانی زیادہ ہے۔ اُن کے خطوط کا اندازہ (؟) کاروباری زیادہ ہے اور ادبی کم۔ "غبارِ خاطر" اور خطوط کے بارے میں اُن کی رائے سے اتفاق کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس میں لَتی خطوط ادب عالیہ کے اچھے نمونے مذ ورما نے جائیں گے۔ "غبارِ خاطر" کے کسی خط پر کاروباری ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اختر حسین رائے پوری نے مکتوب الیہ کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ اکثر خطوط کے انداز تحریر کو مخاطب کا ذوقِ نظر متعین کر دیتا ہے۔ مولانا کی ہشت پہلو شخصیت میں اُن کی زبردست قوتِ حافظہ کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے جس سے رائے پوری صاحب بے گانہ وار گزر گئے ہیں۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مولانا بہت کم کسی کو اپنے بہت قریب آنے دیا کرتے تھے۔

اگر ان سطور سے یہ اثر مرتب ہو رہا ہو کہ اختر حسین رائے پوری کی "گرد راہ"، اُن کے یا برصغیر کے کاروانِ ادب کا معنوی سفرنامہ ہے تو اسی نقطے پر اس کی تردید ضروری ہے۔ یہ خود نوشت سوانح بھی نہیں ہیں۔ یہ اُن کی زندگی کے بوقلموں سفر کی چند یادداشتیں ہیں جنھیں انھوں نے کہیں افسانوی چابک دستی سے، کہیں ناقدانہ بصیرت سے اور کہیں صحافتی تیز روی سے یک جا کر دیا ہے۔ اس کی روانی، بے باکی، زندہ دلی اور مقصدیت جاذبِ توجہ ہے۔ مجنوں گورکھ پوری نے اسے پچھلے ساٹھ برسوں کی ادبی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تاریخ کی زندہ دستاویز کہا ہے۔ کوئی واحد دستاویز کسی پورے عہد یا ادب یا تہذیب وتاریخ کا احاطہ کلی طور سے نہیں کر سکتی۔ "گرد راہ" میں ہم ایسی تلاش کا ستم کیوں کریں؟ لیکن یہ ایک اہم دستاویز جو ملکوں، براعظموں اور زبانوں کی سرحدوں کو پار کر جاتی ہے اور پھر بھی وحدتِ تاثر باقی رکھتی ہے۔ یہ معاصر دنیا کا منظر نامہ اردو میں ایک خوش گوار اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کی یہ خوبی بھی ہے کہ اختر حسین رائے پوری کے ادبی اور علمی کارناموں پر مستند اور بے حد مفید مواد یک جا ہو گیا ہے، جسے دوسرے ہم عصر ادیبوں اور عالموں کے اکتسابات کے تناظر میں پرکھنے کا موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ لیکن جب ہم معاصر ادب کی بات کریں تو یہ بھی یاد رکھیں کہ اس صدی کی تیسری دہائی کے بعد اختر حسین رائے پوری خالص ادب کے محدود دائرے سے نکل کر وسیع تر دنیاؤں میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ سبب نہیں کہ اُن کی یادداشت جگر کے ذکر پر ختم ہو جاتی ہے اور فیض، جوش اور فراق سے بھی دامن کشاں گزرتی ہے۔ افسانہ نگاروں میں بھی وہ عصمت چغتائی کی صرف نام شماری کرتے ہیں اور قرۃ العین حیدر جن کے ناول "آگ کا دریا" نے پورے برصغیر کو متوجہ کر لیا تھا اُس کا سرسری تذکرہ بھی نہیں کرتے۔ شاید اُن کا جواز یہ ہو کہ وہ کوئی تاریخ ادب نہیں لکھ رہے تھے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی نیم سفارتی مشغولیتوں میں ادب سے وہ گہرا شغف باقی نہ رکھ سکے تھے جو اُن کی ابتدائی زندگی میں نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی ناقدانہ یا معاصرانہ مصلحت ستر راہ رہی ہو۔ مصلحت اندیشی کوئی جرم نہیں ہے لیکن ہم رائے پوری جیسے ادیب سے اس کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟ اگر رہی بھی ہو تو اُس سے اُن کے تاریخ ساز ادبی کردار اور اُن کی قد آور شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔



نئی مہک، نئی تازگی
تبت ڈیلکس
ٹائلٹ سوپ
TIBET
خالص قدرتی اجزا سے تیار کردہ
تبت ڈیلکس ٹائلٹ سوپ کا نرم ملائم جھاگ
آپ کی جلد کی مکمل حفاظت کرتا ہے اور
حسن و رنگت میں زیادہ نکھار لاتا ہے۔
تبت ڈیلکس
ٹائلٹ سوپ
Crescent Communications International
K-T-D-2-86



خوشحالی دراصل پریشانیوں اور ضرورتوں سے نجات اور استحکام کا دوسرا نام ہے۔ بیمۂ زندگی آپ کو ان سے آزاد کرکے زندگی کی حقیقی مسرتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔

خاندانی تحفظ کے لئے اسٹیٹ لائف کے اس خصوصی منصوبے کے تحت بامنافع میعادی بیمہ، خاندان کے لیے آمدنی اور حادثاتی موت کے اضافی معاہدے ایک ہی پالیسی میں یکجا کردیئے گئے ہیں۔ اس پالیسی کی رُو سے حادثے کی وجہ سے وفات کی صورت میں بیمہ کی دوگنی رقم اور جمع شدہ بونس کی ادائیگی کے ساتھ خاندان کے لیے بیمے کی میعاد ختم ہونے تک ماہانہ آمدنی کی ضمانت دی جاتی ہے۔

اسٹیٹ لائف
انشورنس کارپوریشن آف پاکستان

مزید تفصیلات کے لئے اسٹیٹ لائف کے کسی بھی نمائندے سے رابطہ قائم کریں

عزیز حامد مدنی

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ ایک دانشور

دانشوری کی روایات

عہدِ قریب میں جس دانشوری کی روایات کا آغاز راجہ رام موہن رائے اور سرسید احمد خان جیسی قدآور شخصیتوں سے ہوا تھا۔ وہ کئی عہد آفریں منزلوں سے گزرتی ہوئی ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور ان کے رفیقانِ صف تک آئی ہے۔ دانشوری کی روایات سے مراد یہ ہے کہ کسی ایک مفکر یا مفکرین کے گروہ نے [illegible] تاریخی شعور رکھتے ہوئے اس کے سیاسی و معاشی، تہذیبی و مذہبی تقاضوں کی روشنی میں ایک ایسا مربوط فکری اثاثہ مہیا کیا ہو جو آگے چل کر تخلیقی کاموں کا سرچشمہ ہو سکے۔ مشرقی کلچر میں علومِ نو کی آمیزش سے ایک نئے ڈھانچے کی ساخت و پرداخت کا حوصلہ ایک بڑے پیمانے کا کام ہے جو ہنوز ایک تسلسل کار کا محتاج ہے۔ اجنبی حکمرانوں کے دور میں اپنی تہذیب و ثقافت کو بین قومی فکر کی سطح سے ہم آہنگ کرنا۔ زندگی کے ہر شعبے میں تخلیقی عناصر کی تلاش کرنا۔ تاریخ کے مؤثر معاشرے کی بنیادی ضرورتوں کا پاس رکھنا، یہی جنوں کی سخت جانی ہے جو صدمہ در صدمہ سے گزر کر بھی تابناک رہ جائیں۔

اس عہد میں جب بیسویں صدی عیسوی کے چند سال ہی باقی رہ گئے ہیں ہمارا معاشرہ تین عظیم ادوار سے گزر کر ہنوز اپنی منزل کی تلاش میں محو ہے۔ پہلا دور سرسید احمد خان کا تھا۔ جو آج سے سو سال پہلے بھی ۱۸۷۰ء میں لندن میں انجینیروں کی ایک کانفرنس میں نئی دنیا کی مسحور کن فضا دیکھ کر بے تاب ہو کے لکھنے پر کمربستہ کھڑے ہو گئے تھے۔ اُن کے سفر کا مقصد اور اس کی روداد کسی تفصیل کی محتاج نہیں ہے۔ ان کی فکر "اسبابِ بغاوتِ ہند" سے ان کی آخری تحریر و تقریر تک معاشرے کی تعمیر میں جدید تقاضوں کی کھلی ہوئی تائید ہے۔ ان کی آگہی و سید احمد ہی ہماری بے [illegible] فکر پر پہلا سائبان ہے۔ دوسرا دور اقبال و سر راس مسعود کا ہے۔ اقبال جس نے زمستانی ہواؤں میں بھی [illegible] ہماری دانشوری کی روایات کی ایسی پرورش کی کہ اس کے کلام کو ایشیا کی بیداری کا نغمہ کہہ سکتے ہیں [illegible] بےخودی، جاوید نامہ، پیام مشرق۔ وہ کتابیں ہیں جن سے ہماری فکر نے جلا پائی [illegible] ذات کے وسیلے سے مغربی فضا اور مصنفین کو متاثر کیا اور اس حد تک متاثر کیا کہ [illegible] E. M. FORSTER [illegible] A PASSAGE TO INDIA جیسا

ناول لکھا ۔ تیسرا دور اس وقت شروع ہوا جب ہندوستان میں اجنبی حکمرانی سے ایک آئینی جنگ کئی مرحلوں سے گزر رہی تھی ۔ اس کے سیاسی افق پر جہاں عظیم شخصیتیں تھیں وہاں معاشرتی و تہذیبی سوچ ایک نئے پیرہن کی جستجو میں تھی ۔ ڈاکٹر اختر حسین اور ان کی طرح کے ... دور کا مفکرین اور ادیبوں کا گروہ اس وقت سامنے کی صف میں تھا ۔ اختر حسین رائے پوری کی شخصیت نے فکر نو کو ایک نیا افق دیا ۔ گردِ راہ واقعات و حادثات کے پیرائے میں ایک فکری سفر کی روداد ہے اس کے اوراق میں تاریخ کا بہاؤ بدلتے ہوئے معاشرے کا آئینہ ہے ۔ اس میں نئے موضوعات ، سرگرم مباحث ہیں ، سیاسی معرکہ آرائیوں کا احوال ہے ۔ ”دین بزرگاں خوش نہ کرد“ کی رو میں ایک لازمی سرکشی کی داستان ہے فرانس کے ایک بہت بڑے شاعر پال ویلری کا موٹو تھا ۔ NEVER CEASE TO MISTRUST اس مشکل پسند منفی تحریر کے منبت معنی یہ تھے کہ ذوق استفہام اور جستجو زندگی کے لازمی جزو ہیں ۔ اس صدی نے اپنے بہترین ذہنوں کو جستجو کا تحفہ دیا ہے اس جستجو نے برصغیر کے ماحول میں جرأت مند ذہنوں کی کاوشوں کو حریفِ نہ ہوا سن کی بے سپر پیش کیا ہے ۔ ڈاکٹر اختر حسین صاحب کی فکری جرأت کی مثال ان کی کتاب ”ادب و انقلاب“ میں ملتی ہے ان کی دوسری تنقیدی کتاب ”روشنی کے مینار“ میں اسی کا تسلسل ہے ۔ ہمارے تنقیدی ادب میں یہ کتابیں اولیت کا درجہ رکھتی ہیں ان کے مضمون ”ادب اور زندگی“ میں وہ فکری آگہی تھی جو آگے چل کر تخلیقات نو کی بنیاد بنی ۔ اس سیاسی پس منظر میں جو دولتِ انگلشیہ نے پیدا کر رکھا تھا اس مضمون میں ہمارے معاشرے کے لیے سب سے زیادہ حقیقت پسندانہ نظریہ پیش کیا گیا تھا جو اس دور کی فکری انقلاب کی ہم مزاجی سے مل کر ایک تحریک میں بدل گیا تھا ۔ تنقیدی ادب میں ایک نیا موڑ انہی کے معتبر کاموں سے شروع ہوا تھا ۔

اس نوع کی فکر جو آدمی کو ایک مرکزی کردار گردانتی ہے جہاں یہ تی ہے کہ مادی حقیقتیں آدمی کو بدل دیتی ہیں ۔ وہاں اس بات کی تائید بھی کرتی ہے کہ آدمی مادی حقیقتوں کو بدل دیتا ہے اور ایسا کرنے میں خود بدلتا رہتا ہے ۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اس فکر کا بنیادی فلسفہ کہاں سے آیا ہے اور کب آیا ہے ۔ بہرکیف اس فلسفے نے تاریخ میں ایک ثبات پایا ہے ۔ آپ اس فکر سے شدید اختلاف کر سکتے ہیں بیچ سے ہٹا نہیں سکتے ۔ جب کبھی اس نوع کی باتیں نکلتی ہیں تو میرے ذہن میں شخصیت کی شناخت کی کسوٹی اس کا معیار فکر ہو جاتا ہے ۔ اس کی اصل بھی ایک بڑے مفکر ہیگل HEGAL کے یہاں ملتی ہے ہیگل کہتا ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ آزادی کا شعور کسی فلسفے کے انعقاد سے تعلق رکھتا ہے تو پھر یہی ایک بنیادی اصول ہوگا جہاں سے فلسفے کا آغاز ہوتا ہے اور وہ لوگ جو آزادی کا شعور رکھتے ہیں ، اپنے وجود کی بنیاد اس اصول پر اس لیے رکھتے ہیں کہ سارے قوانین و عوامل جو ایک آبادی میں گرم کار ہیں آخر انھیں خیالوں کے پروردہ ہیں جو ایک بڑی فکر ان کے لیے تشکیل دے رہی ہے ۔ یہ فکر اپنی خصوصیت کا الگ دائرہ رکھتی ہے ۔ اس سے زندگی کا ایک عملی رخ منسلک ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ فکری آزادی سیاسی آزادی کا قالب ڈھونڈھ رہی ہے اور سیاسی آزادی اس وقت شروع ہوتی ہے جب ایک فرد واحد خود کو ایسا آزاد فکر تصور کرے جو آفاقی ، حقیقی اور لامحدود معنویت کو خود میں سمو سکے یعنی ساری فکر شخصیت کے شعور میں ڈھل گئی ہو اور خود اس کی موجودگی یہ مطالبہ کرتی ہو کہ اس کا احترام کیا جائے ۔ ہیگل کی فکر کا یہ پیمانہ تاریخ میں اپنے مہلک اثرات بھی دکھا چکا ہے مگر اس کے مثبت اثرات سے تاریخ ساز شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں ۔ ایسی ہی ایک شخصیت سرسید احمد خان کی تھی ، اقبال کی تھی ، عہد فرنگ کے دور میں کئی منتخب سیاسی مدبروں کی تھی اور اس پیمانے کی فکر کی تشریح تہذیبی ۔ ثقافتی زندگی کے لیے کی جائے تو اختر حسین اور ان کے ہم عصروں کی بھی کہی جا سکتی ہے ۔

جدید فکر کا دائرہ

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور ان کی فکر کا دائرہ اثر وسیع تخلیقی تمازت سے بھرا اور بارآور رہے۔ ان کی کہی ہوئی باتیں جو صرف ان کی تحریر و تقریر تک نہیں ہیں بلکہ نجی اور ذاتی گفتگو میں بھی آجاتی ہیں۔ ہمارے ادب کی آبیاری کرتی رہی ہیں۔ وہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے صاحب طرز ادیب ہیں، وہ فارسی و سنسکرت، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کے ماہر ہیں۔ قدیم سنسکرت، رامے برسو . . ن یونیورسٹی سے ڈی لٹ حاصل کر چکے ہیں۔ مترجم کی حیثیت سے قدیم و جدید کئی زبانوں کی کتابیں انہی کی کاوش کا نتیجہ ہیں گورکی؟ آپ بیتی۔ پیام شباب اور شکنتلا، پیاری زمیں اردو کے قاری تک پہنچ چکی ہیں۔ انھوں نے لغت پر بھی کام کیا۔ افسانے بھی لکھے ہیں تہذیبی و ثقافتی موضوعات پر مضامین بھی لکھے ہیں، وہ ماہر تعلیم بھی ہیں۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ میں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ان کی ذہانت کے قصے اپنے بزرگوں اور ان کے پرانے دوستوں سے سنے ہیں۔ خاندانی مراسم کی نہایت نرم و نازک فضا سے الگ جو ان کی فکر کا روشن حلقہ ہے اس میں اس صدی کے مسائل۔ اس کی تلاش کا رخ۔ اس کی عمیق تاریک خندقیں جہاں افلاس اور حری جہل کے خارزار ہیں، عہد حاضر کے سائنس و ٹیکنالوجی کے وہ آتشیں عالے ہیں جو پہلے کبھی نمودار نہیں ہوئے تھے، ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ صدی جو بہت فکر انگیز کارناموں کی صدی ہے ایسے باوقار ناموں کی فہرست رکھتی ہے جو آپ اپنی مثال ہیں۔ اس صدی میں آئن اسٹائن اور فرائیڈ، لینن و چرچل، اسٹالن و ماؤزے تنگ گاندھی و جناح، نہرو، سبھاش چندر بوس، برٹرینڈرسل اور وائٹ ہیڈ، فرمی اور اوپن ہیمر رکیے اور پال ولیری، ٹیگور اور اقبال سی وی رمن اور پروفیسر سلام تک ہیں۔ اس کے سوا ہیں اسلحہ خانوں کے زریں دوزجادوگر بھی ہیں اس کی فضاؤں میں معلق رسدگاہیں بھی ہیں۔ یہ مشکلات کی صدی بھی ہے۔ ہولناک جنگوں کی قتل گاہ بھی ہے۔ اس میں سب بستیں ایسی تمام نفرتیں لے کر ردی کاغذ کے ڈھیر کی طرح جل اٹھی ہیں۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۸۲ء تک ایک نصف صدی کی مدت میں ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان کے سیاسی باغیوں کی آنکھیں بھی دیکھی ہیں۔ جنگ عظیم کے اٹھتے ہوئے بادل بھی دیکھے ہیں۔ سپید و سیاہ اور سرخ و کبود کے حلقوں سے گزرتے ہوئے گرد راہ کے مرقعے میں کیسے کیسے زاویوں سے بدلتی ہوئی تاریخ اور تاریخ ساز چہروں پر روشنی پڑتی ہے۔ معاشی سیاسی اور تہذیبی دائروں کو اس طرح سمیٹنا کہ وہ سوچنے والے ذہنوں کے لیے ایک سوال بن جائے ڈاکٹر صاحب ہی کا حصہ ہے۔ دانشوری کی روایات میں ایک کلیدی حیثیت اس امر کی ہوتی ہے کہ ادیب اپنے معاشرے کا مزاج شناس ہو کر قومی نظریات میں وسعتیں پیدا کرے ان کو ایک بین قومی مزاج دے، اپنے حصار سے باہر چلنے والی ہوا کا سدِ باب نہ کرے۔ اس لحاظ سے ان کی تحریریں تنگ نظری اور فرسودہ خیالی سے ایک جنگ کے مترادف ہیں، وہ اپنے تعمیری رخ میں وہ سارا مواد رکھتی ہیں جو نئے لکھنے والوں کے لیے ایک موضوع بن سکتا ہے۔ اس کتاب کا ایک باب "حقیقت کی تلاش" ہے جو ایک ذاتی جستجو سے چل کر فکر انسانی کے موجودہ دائرۂ عمل کا احاطہ کرتا ہے، کچھ توجہ طلب باتیں یوں ہیں:

"دراصل حیات انسانی کا سب سے اہم جوہر دماغ ہے جس کی سائنٹفک تحقیق ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ ذہنی ارتقا کا جو عمل آفرینش سے شروع ہوا تھا ہنوز جاری ہے۔ دماغ کی ۸۵ فی صد باقی ماندہ صلاحیت جو ابھی بروئے کار نہیں آئی ہے۔ اس میں نامعلوم کتنی قوت مضمر ہے یہ محض غلط فہمی ہے کہ مذہب و سائنس میں کوئی بنیادی تضاد ہے۔ سائنس محض اس علم کا نام ہے جو تجربے سے ثابت کیا جا سکے۔ اس کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ تمام علوم پر حاوی ہو چکا ہے کیونکہ علم کسی نہ کسی عنوان سے زمان و مکان کے نا پیدا کنار ستوں کی جستجو ہے۔"

اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:-

اس ہوش ربا کائنات میں آئن اسٹائن کے نظریے کے مطابق زمان ومکاں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں وقت کی پُراسرار کیفیت نے ہر دور میں مذہب وفلسفہ وسائنس کو یکساں طور پر حیرت زدہ رکھا ہے۔ اس کی مثال سمندر کی ہے جس کا اور چھور نہیں اور جس کی موج مسلسل حرکت میں ہے۔ حال بھی ماضی بھی مستقبل بھی ہے اور حرکت کے سوا کسی شے کو دوام نہیں ہے۔"

بہ کیف کچھ نتائج اخذ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"مذہبی نقطۂ نظر یا مادہ پرستی کے نظریے کے مطابق انسانی زندگی دو متضاد قوتوں کی مسلسل کش مکش میں مبتلا ہے جو خیر وشر کی قوتیں ہیں۔ جسے اسلام نے اللہ اور شیطان، زرتشت نے اہرمن ویزداں، گوتم نے "نروان اور رنج" کا نام دیا ہے۔ کارل مارکس کے جدلیاتی فلسفے میں وہ معاشی قوتیں جو دولت آفرینی کے وسائل کے تسلط کی خاطر طبقاتی جدوجہد میں مبتلا رہتی ہیں ان سب نظریوں کا نصب العین یہی ہے کہ عدل وخیر، مساوات واخوت کی قوتیں کامراں ہوں اور استحصال، ناانصافی اور جہل کی لعنتوں سے انسان نجات حاصل کر سکے۔ تاریخ اسی جدوجہد کی خونی داستان ہے۔"

ان اقتباسات سے پہلے میں نے اس صدی کی تاریخ ساز شخصیتوں، ان کی فکر اور ان کے ہوتے ہوئے ہولناک جنگوں اور انسان کی غاصبانہ خو کا تذکرہ کیا تھا تو اس اشارت سے مراد یہ تھی کہ اس کتاب کے چند آخری باب اس صدی کی فکر کے حوالے سے پڑھے جائیں۔ اس سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ دانشوری کی روایات کا تسلسل کیا ہوتا ہے۔ ایک زبان کی فکر دوسری زبانوں سے مل کر اور آخر کار عالمی فکر کا حصہ بن کر ایک نیا افق پیدا کرتی ہے اور جب یہ روایات باقی نہیں رہتی ہیں تو کس طرح ایک قوم فکری افلاس میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

علم کی تلاش، محبت کی جستجو اور غمِ دوراں

ڈاکٹر صاحب نے اسی باب میں اور خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بیسویں صدی نے شاید برٹرینڈ رسل جیسا مفکر پیدا نہیں کیا ہے میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں کہ کس طرح اس کی تحریروں نے مجھے ابتدا علم سے متاثر کیا تھا اور یہ ہنوز باقی ہے۔ اس نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے میری زندگی کے تین مقصد ہیں۔ علم کی تلاش محبت کی جستجو اور غمِ دوراں۔"

برٹرینڈ رسل غمِ دوراں کے سلسلے میں اپنی عمر کی آخری ساعت تک اس کا پرچار کرتے رہے۔ ایک ایسے ہی سفر میں جب وہ جاپان سے انگلینڈ جاتے ہوئے کراچی کے ایئر پورٹ پر رُکے تو دیگر بزرگوں کی صحبت میں مجھے بھی ان کی گفتگو میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ رات آدھی تو ہو چکی تھی وہ بلیک کافی کی ایک پیالی کے ساتھ جو مسز موسیٰ نے ان کے لیے بنائی تھی۔ وہ صحافیوں اور دیگر حضرات کے سوالات کا جواب دیتے رہے۔ باقاعدہ سوال وجواب ان کے ریتھ لیکچرز (P.EITH LECTURES) پر مبنی تھا میں نے بنایا تھا۔ فارن آفس کے نمائندے کی حیثیت سے ڈاکٹر ریاض الحسن مرحوم ان سے سوال کرتے رہے اور رسل اپنے فلسفے کی تشریح کرتے رہے یہاں اور تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے مگر ایک دو دلچسپ باتیں سن لیجیے جب کسی صاحب نے ان سے اشتراکیت کے خلاف لکھی ہوئی کتاب THE GOD THAT FAILLD کا ذکر کیا تو انھوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

I AM NOT A CONTRIBUTOR TO THIS BOOK, THAT IS THE GOD THAT HAD DISC[illegible] ED FOR THE WORLD

وہ مغربی مفکرین کی صف میں پہنچ آئے تھے جن سے ملاقات کی تھی۔ یہ متضاد تخصیبوں دو متضاد نظریوں ملاقات تھی سپریٹ اور پورٹ کی شخص پر دست ہونے سے پہلے جب ان سے پیغام طلب کیا گیا تو انھوں نے کہا:

THIS MESSAGE IS FOR ALL THE PEOPLE [illegible] OF WORLD [illegible] THIS [illegible] MENT OF HISTORY [illegible] THING IS MORE IMPORTANT [illegible] [illegible] MESS[illegible] OF REACH ALL THE LOVER[illegible] LIFE".

"وگرد... میں دیہ کے شہر کے مقصیں ہرے پاست والوں، مدرسوں، صحیفوں، اور ادیبوں کا احوال ہے ... کی جستجو، زرف بینی اور دریاؤں کی تہہ تک پہنچنے کا ثبوت ہے۔ ان کے شعور ورلا شعور میں جو سیادتی اجزا ملے ہیں وہ بھی علم کی تدریس، محبت کی جستجو اور غم دوراں ہیں۔

ادیبوں سے ملاقات۔

ان کی تحریر، ادب اور اس کا رخ

وہ سوربورن یونیورسٹی میں ایک طالب علم کی حیثیت سے رہ چکے ہیں اس وقت کا پیرس ہی کچھ اور تھا، جنگ کے بعد پیرس میں ان کی ... سے ... تر سے ہوئی اور تعارف کرانے والے نے ان کو یہ بھی بتایا کہ اختر حسین پہلے بھی پیرس میں رہ چکے ہیں تو سارتر نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے پیرس کے ان دونوں ادوار میں کیا فرق پایا۔ جواب میں ڈاکٹر صاحب نے جب انھیں بتایا کہ آج کے ... قدروں کا ... ہندوستان نمس ہے۔ تو انھوں نے ہنس کر جواب دیا۔ کہ نئے انسان کی نظر میں کپڑا دھونے کی مشین قدروں سے زیادہ مفید ہے۔ یہ ایک بڑے ادیب سے ملاقات کی جھلک ہے اسی طرح ایک اور جھلک رومن رولاں سے ملاقات کی بھی روشنی کے مینار میں ہے۔ ان کے ملاقاتیوں میں کئی صاحب طرز ادیب تھے۔ فرانسیسی اور انگریزی کے، اردو اور ہندی کے۔ کہیں اڈولس ہکسلے ہے کہیں لوئی آراگوں ہے، کہیں پریم چند ہیں، کہیں اصغر گونڈوی ہیں۔ مجاز دمنٹو ہیں، راشد اور جوش ہیں جگر اور چراغ حسن حسرت ہیں۔ پنڈت جی دیدی اور بابو سول چند ہیں یہ ان کی شخصیت کی فسوں کاری تھی کہ جو بھی ان سے ملا یا وہ جس سے بھی ملے۔ ملاقات کا نقش ہمیشہ کے لیے رہ گیا۔

ڈاکٹر صاحب کی کتابیں، تنقید، افسانہ اور تراجم ہر صنف میں موجود ہیں کوئی بھی نثر انگیز تحریر سکت اور ... دم ... اس کے پیچ ایک نئی نسل کی مٹی میں گرکر ایک نئے مزاج کی فصل اگاتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا موضوع ہر کتاب میں ... وہ عام پیکار ہے جو محدود جغرافیے کے ... سے ... دراردو زبان کی وساطت سے چند بنیادی سوالات اٹھا رہی ہے ... جو ... بھی دیتی رہی ہے۔ کہانی ہو یا مضمون۔ ان کی گفتگو۔ ان کی فکر ... کو نوڑتی چلی جاتی ہے جو آدمی نے آدمی کے درمیان پیدا کر رکھی ہیں جو خوش حال اور مفلس۔ ایک طبقہ اور دوسرے طبقہ، ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے درمیان زندگی کے بہاؤ کو روکتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار اگر پوچھیے تو وہ تمام آدمی جو اس خود ... تے ہیں۔ ... دل سے ... والے ... سے الگ ملمع سازی سے خائف، معاشرے کی کسی ... مصلحت آمیز سمجھ سے ... کے ... ہوئے ...

ایک دانشور

عزیز حامد مدنی

میں جب غور کرتا ہوں تو ان کے کچھ افسانے اور اکثر مضامین بنا بنایا ایک بساط رنگ نظر آتے ہیں جہاں سے دوسرے ادیبوں کے لیے تنقید کی پروازیں ممکن ہوئیں۔ ان کے فن میں اسلوب کی سادگی کی انتہا ہے۔ وہ کسی بات کی صداقت پر اس حد تک یقین رکھتے ہیں کہ وہی اس کا اسلوب بن جاتا ہے ان کے یہاں فکر نے ایک اسلوب اختیار کر لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اچھا ادیب اپنی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے اور اس کے قاری اس کی دنیا کے مستقل باشندے ہو جاتے ہیں۔ ایک کم مایہ ادیب اپنی مشاطگی تحریر سے کیسے ہی محل بنائے وہاں کے رہنے والوں کو دیواروں میں پڑنے والی دراڑیں صاف نظر آتی ہیں۔ ان پچاس سالوں میں انھوں نے اور ان کے ہم عصر ادیبوں نے اردو ادب کو (اور انھوں نے تو ہندی ادب کو بھی) جو تازگی فکر دی ہے زندگی کے جن بنیادی سوالات کے باب کا اضافہ کیا ہے وہ عہد آفریں ہے۔ اسی صف اول میں مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، آل احمد سرور، احتشام حسین اور ممتاز حسین بھی ہیں۔ اسی دور کے شعرا میں فیض، راشد، ندیم، علی سردار جعفری ہیں۔ افسانہ نگاروں میں منٹو، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ ان ادیبوں اور شعرا نے زندگی کے خاموش دکھ درد کو اپنی تحریروں میں سمو کر معاشرے کو جگا دیا۔

مجھے فرانس کے ایک بے مثال شاعر گیوم اپولینیر کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ رہی ہے کہ دنیا کو جگا دینے کے لیے ایک روح کی جنبش کافی ہے۔ ہوتا یہی ہے کہ کبھی کبھی خلفشار اور بے ترتیب خیالوں سے آرزوؤں کے بنتے بگڑتے گھروندوں سے۔ ایک خواب آلود جستجو سے ابر و باد میں لپٹے ہوئے شاہکار سے جو سدا تکمیل رہ جاتے ہیں، ایسے زاویے پیدا ہو جاتے ہیں جو ایک نئے محاورے اور نئی زبان کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ادب میں تعطل کے آثار سیاسی اور معاشی لاترتیبی کی فضا میں عدم فکر سے پیدا ہوتے ہیں مگر ان بزرگوں کے بعد آنے والے ادیبوں اور شعرا نے ارتقا کے رمز کو سمجھ کر جو کچھ لکھا ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ یہ مختلف مکتبۂ خیال کے لوگ ہیں ان کی تحریر کے بہانے بھی جداگانہ ہیں۔ مذہب سے مابعد الطبیعات تک تہذیب کی معاشی و سیاسی بنیادوں پر استوار ایک عام آدمی کی بیکاری سے ایک خفیف انانیت کے اضطراب تک۔ ان کے ناموں کی فہرست طویل بھی ہو سکتی ہے لیکن چند وہ لوگ جن کی تحریریں ایک عام قاری کے ذہن میں ہوتی ہیں جدید اردو ادب میں اہمیت رکھتے ہیں۔ خواہ وہ ہندوستان میں قرۃ العین حیدر ہوں یا پاکستان میں شوکت صدیقی۔ ممتاز شیریں، انتظار حسین یا انگلینڈ میں عبداللہ حسین۔ ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں میں کراچی اور لاہور میں کئی ادیبوں کا اچھا کام موجود ہے۔ اسی طرح نقادوں میں مستند اور وقیع ناموں کی کمی نہیں ہے۔ ان کے کاموں کی بھی کئی سمتیں ہیں۔ ان ناموں میں سید سبط حسن، پروفیسر عسکری مرحوم، پروفیسر مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر محمد حسن نے ادب کے مختلف اصناف سخن پر لکھا ہے اس کے علاوہ مظفر علی سید، مرحوم سلیم احمد، ڈاکٹر جمیل جالبی۔ فتح محمد ملک، محمد علی صدیقی، شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، کلیم اعظمی اور احمد ہمدانی کی کتابیں محنت سے لکھی ہوئی ہیں۔ ان کی کتابوں کا فکری ماحول قابل داد ہے۔ ہر نئے مؤثر شاعر نے ایک نیا محاورہ ضرور لیا ہے۔ شعرا میں اختر الایمان۔ عالی۔ قتیل شفائی۔ منیر نیازی۔ ظفر اقبال۔ ادا جعفری۔ محشر بدایونی۔ عبید اللہ علیم۔ رضی اختر شوق۔ کشور ناہید اور پھر سال و سن کی ترتیب سے الگ احمد فراز۔ ساقی فاروقی، سحر انصاری۔ پروین شاکر۔ امجد اسلام امجد۔ افتخار عارف۔ شاہدہ حسن۔ خالد احمد اور اختر حسین جعفری نہایت شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ان تازہ فکر شعرا میں ایک نئی سوچ کی معیاری کاوش ہے۔ ان تمام ادیبوں اور شعرا کے کام سے خواہ اس کا پیمانہ کچھ بھی ہو۔ گزشتہ دور کی معنویت میں ایک تسلسل ضرور پیدا ہوتا ہے۔

بات ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم عصروں کی ہو رہی تھی دانشوری کی وہ روایات جو ادب کے تحلیقی کاموں کو سیراب کر سکتی ہے اگر وراق کے اوراق میں موجود ہے بلکہ اسے از سر نو مرتب کر کے ڈاکٹر صاحب نے لکھنے والوں کو ایک راہ دکھائی ہے جن میں سے بیشتر کا

سفینہ رجعت پسندی کے گرداب تک جا پہنچا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتابوں میں یہ بتایا ہے کہ یہ ایک تاریخ کا جبر ہے کہ معاشرے کی تشکیل اس طرح سے کی جائے کہ شہریوں کے گرد ایک حصار کھینچ جائے جہاں معاشرے میں رائج فرسودہ دلیل و برہان، قانون و رسم کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھا سکے۔ اس محفوظ سواد میں کوئی باشندہ اٹھ کر سوال نہ کر سکے، اس دنیا میں محفلیں اور مجلسیں منعقد ہوتی رہیں جس میں ایک فکری گنجفہ باری کے سوا کسی سنجیدہ فکر کا امکان نہ ہو۔ کچھ یہ حقیقت حال ہے بھی کہ معاشرے کے بند دروازے پر دستک دینے والا ادیب کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا۔ صرف ادیب اپنی تاریخ اور معاشرے کی مٹی میں سوالات کے بیج چھڑکتا چلا جاتا ہے اور مشاہدہ یہی کہتا ہے کہ اکثر ان سوالات کے بیج سے اگنے والے پودے اور معاشرے کے بند دروازے پر دستک پریشانی کا باعث ہوتی ہیں جس سے وہ پرانی فکر جس کی کائی کی تہوں کے نیچے معاشرہ اپنی نیند پوری کر رہا ہوتا ہے اپنا وقار کھو دیتی ہے۔ مگر جب دروازے پر یہ دستک غور سے سنی جائے تو وہ لایعنی فکر جو ساکت ہو کر ایک بے حسی میں بدل چکی ہے، چونک اٹھتی ہے۔ سر سید احمد خاں کی نثر اور اقبال کی شاعری نے معاشرے کو نیند سے چونکانے میں ایک عظیم پیمانے کا کام کیا تھا۔ گرد راہ بھی جہاں ایک خود نوشت ہے، خیال کے بند دروازے پر دستک بھی ہے۔

کچھ چہرے، کچھ منظر

گرد راہ میں دنیا کے خوبصورت ترین ملکوں کی سیاحی کی داستانیں ہیں، مختلف تہذیبوں کی مزاج شناسی کی فضا میں ان کی عادات و اطوار کا حال ہے خواہ وہ یروشلم، غزہ کے قدیم آثار ہوں یا جدید شہروں کی تصنع آمیز زندگی ہو، ایک نہایت دل کش انداز میں ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس خود نوشت کی وہ جھلکیاں جو رائے پور سے شروع ہوتی ہیں جس میں سکول کا اینگلو انڈین ہیڈ ماسٹر تابہ ہے جس میں بڑے مندر کے مہنت کے کتب خانے میں نایاب کتابیں ہیں جس میں ہندوستان کے سب سے بڑے شہر کلکتے کی ایک مرکزی حیثیت ہے کہ وہ عہد فرنگ کے دور میں ایک سیاسی انقلاب اور دانشوری کا محور تھا۔ علی گڑھ کے شب و روز ہیں۔ ایک بے قرار روح اور توانا جسم کی فطرت کے تقاضوں پر مائل کبھی ایک دشت نوردی ہے، کبھی ایک کوہ پیمائی ہے، کبھی ستاروں اور اندر دھنش کے رنگوں میں کھوئی ہوئی چشم تماشائی ہے، کبھی سادھوؤں اور درویشوں کے کشکول سے ایک رمز زندگی کی طلب گاری ہے۔ کہیں عملی سیاست کا آتش نفس ہے، کہیں باغیوں کے چہرے ہیں، کہیں سرکردہ دانش مندوں کے سائے ہیں۔ کہیں جیب کتروں کے استاد بٹا سردار کا اڈا ہے۔ کہیں پیرس کے کاروبوے [illegible] کی وقت خوردہ قندیلیں، شکستے اور کستروں کا انبار ہے۔ کہیں برجیش سنگھ اور امتیاز علی خاں کی دوستی ہے۔ کہیں خالدہ ادیب خانم اور سر عبدالقادر کی صحبتیں ہیں، کہیں کیفے روتوند ہے جس کے مالک تزاکوب سے لینن پرچے بھیج کر قرض منگوایا کرتا تھا۔ یہ بھی پتہ مل جاتا ہے کہ لینن جب روس کا سربراہ ہوا تو زاکوب نے پرچیاں فریم کر کے آویزاں کیں اور اعلان کیا کہ یہ وہ جگہ ہے کہ جس کا لینن سرپرست تھا۔ اسی سلسلے میں اس واقعے کا بھی ذکر ہے کہ جب پیرس میں پنڈت نہرو اس کیفے میں کافی پینے گئے تو زاکوب سے ملاقات کے وقت انھوں نے کہا موسیو زاکوب ان پرچیوں کی قیمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے، اور اس فرانسیسی نے ہنس کر جواب دیا۔ مجھے لاکھوں روپے پیش کیے گئے ہیں مگر انھیں بیچ دوں تو میری کیا حیثیت رہ جائے گی، پھر آپ جیسے لوگ مجھے کیوں پوچھیں گے۔ اس کتاب میں کئی حقیقی کردار ناولوں کے کردار کی طرح ملتے ہیں۔ سچ ہے حقیقت افسانے سے زیادہ تعجب انگیز ہوتی ہے۔ ان اوراق میں ایسے خاکے شخصیتوں کے ایسے خط و خال ہیں جو صورت و سیرت دونوں نمایاں کرتے ہیں، بڑے آدمیوں کے فکری جلال ہی نہیں ان کے جمال کے بھی آئینہ دار ہیں۔ کیسے کیسے لوگ ہیں، پروفیسر حبیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی

[redacted]

ایک دانشور

عزیز حامد مدنی

میں جب غور کرتا ہوں تو ان کے کچھ افسانے اور اکثر مضامین بنا بنایا ایک ایسا ٹھا رمیک نظر آتے ہیں جہاں سے دوسرے ادیبوں کے لیے تنقید کی پروازیں ممکن ہوئیں۔ ان کے فن میں اسلوب کی سادگی کی انتہا ہے۔ وہ کسی بات کی صداقت پر اس حد تک یقین رکھتے ہیں کہ وہی اس کا اسلوب بن جاتا ہے ان کے یہاں فکر نے ایک اسلوب اختیار کر لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اچھا ادیب اپنی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے اور اس کے قاری اس کی دنیا کے مستقل باشندے ہو جاتے ہیں۔ ایک کم مایہ ادیب اپنی مشاطگی تحریر سے کیسے ہی محل بنائے وہاں کے رہنے والوں کو دیواروں میں پڑنے والی دراڑیں صاف نظر آتی ہیں۔ ان پچاس سالوں میں انھوں نے اور ان کے ہم عصر ادیبوں نے اردو ادب کو (اور انھوں نے تو ہندی ادب کو بھی) جو تازگی فکر دی ہے زندگی کے جن بنیادی سوالات کے باب کا اضافہ کیا ہے وہ عہد آفریں ہے۔ اسی صف اول میں مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، آل احمد سرور، احتشام حسین اور ممتاز حسین بھی ہیں۔ اسی دور کے شعرا میں فیض، راشد، ندیم، علی سردار جعفری ہیں۔ افسانہ نگاروں میں منٹو، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ ان ادیبوں اور شعرا نے زندگی کے خاموش دکھ درد کو اپنی تحریروں میں سمو کر معاشرے کو جگا دیا۔

مجھے فرانس کے ایک بے مثال شاعر گیوم اپولینیر کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ رہی ہے کہ دنیا کو جگا دینے کے لیے ایک روح کی جنبش کافی ہے۔ ہوتا یہی ہے کہ کبھی کبھی خلفشار اور بے ترتیب خوابوں سے آرزوؤں کے بننے بگڑتے گھروندوں سے۔ ایک خواب آلود جستجو سے ابر و باد میں لپٹے ہوئے افکار سے جو تشنۂ تکمیل رہ جاتے ہیں، ایسے رادیے پیدا ہو جاتے ہیں جو ایک نئے محاورے اور نئی زبان کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ادب میں تعطل کے آثار سیاسی اور معاشی لاترتیبی کی فضا میں عدم فکر سے پیدا ہوتے ہیں مگر ان بزرگوں کے بعد آنے والے ادیبوں اور شعرا نے ارتقا کے رمز کو سمجھ کر جو کچھ لکھا ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ یہ مختلف مکتۂ خیال کے لوگ ہیں ان کی تحریر کے پیمانے بھی جداگانہ ہیں۔ مذہب سے، مابعد الطبیعات تک تہذیب کی معاشی و سیاسی نبردوں پر استوار ایک عام آدمی کی بیکاری سے تکلیف انانیت کے اضطراب تک ان کے ناموں کی فہرست طویل بھی ہو سکتی ہے لیکن چند وہ لوگ جن کی تحریریں ایک عام قاری کے ذہن میں ہوتی ہیں جدید اردو ادب میں اہمیت رکھتے ہیں۔ خواہ وہ ہندوستان میں قرۃ العین حیدر ہوں یا پاکستان میں شوکت صدیقی۔ ممتاز شیریں انتظار حسین یا انگلینڈ میں عبداللہ حسین۔ ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں میں کراچی اور لاہور میں کئی ادیبوں کا اچھا کام موجود ہے۔ اسی طرح نقادوں میں مستند اور وقیع ناموں کی کمی نہیں ہے۔ ان کے کاموں کی بھی کئی سمتیں ہیں۔ ان ناموں میں سید سبط حسن، پروفیسر عسکری مرحوم، پروفیسر مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر محمد حسن نے ادب کے مختلف اصناف سخن پر لکھا ہے اس کے علاوہ مظفر علی سید، مرحوم سلیم احمد ڈاکٹر جمیل جالبی۔ فتح محمد ملک، محمد علی صدیقی، شمس الرحمن فاروقی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، محمد اعظمی اور احمد ہمدانی کی کتابیں محنت سے لکھی ہوئی ہیں۔ ان کی کتابوں کا فکری ماحول قابل داد ہے۔ ہر نئے موڑ پر شاعری ایک نیا محاورہ ضرور چاہتی ہے۔ شعرا میں احمد ندیم قاسمی۔ عالی۔ یقین تسنیم۔ منیر نیازی۔ ظفر اقبال۔ ادا جعفری۔ محشر بدایونی۔ عبید اللہ علیم۔ رضی اختر شوق۔ کشور ناہید اور پھر سال و سن کی ترتیب سے الگ احمد فراز۔ ساقی فاروقی سحر انصاری۔ پروین شاکر۔ امجد اسلام امجد۔ افتخار عارف۔ شاہدہ حسن۔ خالد احمد اور اختر حسین جعفری نہایت شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ان تازہ فکر شعرا میں ایک نئی سوچ کی معیاری کاوش ہے۔ ان تمام ادیبوں اور شعرا کے کام سے خواہ اس کا پیمانہ کچھ بھی ہو۔ گزشتہ دور کی معنویت میں ایک تسلسل ضرور پیدا ہوتا ہے۔

بات ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم عصروں کی ہو رہی تھی دانشوری کی وہ روایات جو ادب کے تخلیقی کاموں کو سیراب کر سکتی ہے، گرد راہ کے اوراق میں موجود ہے بلکہ اسے از سرِ نو مرتب کر کے ڈاکٹر صاحب نے لکھنے والوں کو ایک راہ دکھائی ہے جن میں سے بیشتر کا

سفینہ رجعت پسندی کے گرداب تک جا پہنچا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتابوں میں یہ بتایا ہے کہ یہ ایک تاریخ کا جبر ہے کہ معاشرے کی تشکیل اس طرح سے کی جائے کہ شہریوں کے گرد ایک حصار کھینچ جائے جہاں معاشرے میں رائج فرسودہ دلیل و برہان، قانون و رسم کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھا سکے۔ اس محفوظ سواد میں کوئی باشندہ اٹھ کر سوال نہ کر سکے، اس دنیا میں محفلیں اور مجلسیں منعقد ہوتی رہیں جس میں ایک فکری گنجفہ بازی کے سوا کسی سنجیدہ فکر کا امکان نہ ہو۔ کچھ یہ حقیقت حال ہے بھی کہ معاشرے کے بند دروازے پر دستک دینے والا ادیب کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا۔ صرف ادیب اپنی تاریخ اور معاشرے کی مٹی میں سوالات کے بیج چھڑکتا چلا جاتا ہے اور مشاہدہ یہی کہتا ہے کہ اکثر ان سوالات کے بیج سے اگنے والے پودے اور معاشرے کے بند دروازے پر دستک پریشانی کا باعث ہوتی ہیں جس سے وہ پرانی فکر جس کی کائی کی تہوں کے نیچے معاشرہ اپنی نیند پوری کر رہا ہوتا ہے، اپنا وقار کھو دیتی ہے۔ مگر جب دروازے پر یہ دستک غور سے سنی جائے تو وہ لایعنی فکر جو ساکت ہو کر ایک بے حسی میں بدل چکی ہے، چونک اٹھتی ہے۔ سرسید احمد خاں کی نثر اور اقبال کی شاعری نے معاشرے کو نیند سے چونکانے میں ایک عظیم پیمانے کا کام کیا تھا۔ گرد راہ بھی جہاں ایک خود نوشت ہے، خیال کے بند دروازے پر دستک بھی ہے۔

کچھ چہرے، کچھ منظر

گرد راہ میں دنیا کے خوبصورت ترین ملکوں کی سیاحی کی داستانیں ہیں، مختلف تہذیبوں کی مزاج شناسی کی فضا میں ان کی عادات و اطوار کا حال ہے خواہ وہ یروشلم غزہ کے قدیم آثار ہوں یا جدید شہروں کی تصنع آمیز زندگی ہو، ایک نہایت دل کش انداز میں ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس خود نوشت کی وہ جھلکیاں جو راے پور سے شروع ہوتی ہیں جس میں سکول کا اینگلو انڈین ہیڈ ماسٹر نا بینا ہے جس میں بڑے مندر کے مہنت کے کتب خانے میں نایاب کتابیں ہیں جس میں ہندوستان کے سب سے بڑے شہر کلکتے کی ایک مرکزی حیثیت ہے کہ وہ عہد فرنگ کے دور میں ایک سیاسی انقلاب اور دانشوری کا محور تھا۔ علی گڑھ کے شب و روز ہیں۔ ایک بے قرار روح اور توانا جسم کی فطرت کے تقاضوں پر مائل کبھی ایک دشت نوردی ہے، کبھی ایک کوہ پیمائی ہے، کبھی تاروں اور اندر دھنش کے رنگوں میں کھوئی ہوئی چشم تماشائی ہے کبھی سادھوؤں اور درویشوں کے کشکول سے ایک رمز زندگی کی طلب گاری ہے۔ کہیں عملی سیاست کا آتش نفس ہے، کہیں ذہنوں کے چہرے ہیں کہیں سرگ دانش مندوں کے سائے ہیں۔ کہیں جیب کتروں کے استاد ببا مزار کا اڈا ہے۔ کہیں پیرس کے کاو و بوے ([illegible]) کی وقت خوردہ فنڈلیں، مٹکے اور کستردل کا انبار ہے۔ کہیں بر جیش سنگھ اور امتیاز علی خاں کی دوستی ہے۔ کہیں خالدہ ادیب خانم اور سر عبدالقادر کی صحبتیں ہیں، کہیں کیفے رتوند ہے جس کے مالک تراکوب سے لینن پرچے کھینچ کر قرض منگوایا کرتا تھا۔ یہ بھی قصہ مل جاتا ہے کہ لینن جب روس کا سربراہ ہوا تو تراکوب نے یہ پرچیاں فریم کر کے آویزاں کیں اور اعلان کیا کہ یہ وہ جگہ ہے جس کا لینن سرپرست تھا۔ اسی سلسلے میں اس واقعے کا بھی ذکر ہے کہ جب پیرس میں پنڈت نہرو اس کیفے میں کافی پینے گئے تو تراکوب سے ملاقات کے وقت انھوں نے کہا موسیو تراکوب ان پرچیوں کی قیمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے، اور اس فرانسیسی نے ہنس کر جواب دیا۔ مجھے لاکھوں روپے پیش کیے گئے ہیں مگر انھیں بیچ دوں تو میری کیا حیثیت رہ جائے گی، پھر آپ جیسے لوگ مجھے کیوں پوچھیں گے۔ اس کتاب میں کئی حقیقی کردار ناولوں کے کرداروں کی طرح ملتے ہیں۔ سچ ہے حقیقت افسانے سے زیادہ تعجب انگیز ہوتی ہے، ان اوراق میں ایسے خاکے شخصیتوں کے ایسے خط و خال ہیں جو صورت و سیرت دونوں نمایاں کرتے ہیں، جو بڑے آدمیوں کے فکری جلال ہی نہیں ان کے جمال کے بھی آئینہ دار ہیں۔ کیسے کیسے لوگ ہیں پروفیسر حبیب پروفیسر رشید احمد صدیقی

عزیز حامد مدنی

ایک دانشور

ڈاکٹر ذاکر حسین اساتذہ اور طالب علم کے رشتے، رفیقوں اور ہم عصروں کی محفلیں، افریقہ کا بیابان تاریک، ایشیا کے پہاڑوں کی برف ۔ آب و ہوا کے ہزار رخ ۔ زندگی اور اس کے لیے ایک بے کنار تڑپ!

قومی اور بین قومی سیاست

برصغیر میں عہد انگلشیہ ایک باقاعدہ فرمان شاہی سے شروع ہوا تھا۔ ہر امپیریل مجیسٹی کوئین وکٹوریہ ۔ اور ان کے بعد آنے والے شہنشاہ ہند کے ساتھ لاطینی القاب بھی لگا تھا۔ "ریکس امپریٹر" R X IMPERATOR جو روم قدیم کی جاہ و جلال کی یاد دلاتا تھا۔ روم کے دفاع کے لیے جو سپاہ تھی وہ روم میں گارڈس کہلاتی تھی۔ اس کا میر سپاہ IMPERATOR کہلاتا تھا۔ جب روم کمزور ہوگیا اور سپاہ قوی تر رہی تو میر سپاہ کے ساتھ ایک اور منصب منسوب ہوگیا۔ یعنی اب وہ EMPERATOR ہو گیا۔ یعنی میر سپاہ اور بادشاہ ۔ اسلامی تاریخ میں بھی ایسے کئی واقعات رونما ہوئے ہیں ماضی بعید اور ماضی قریب میں اور کئی ایک ام اتفاق سے ناکام رہ گئے ہیں۔ حکایت تھی عہد انگلشیہ کی جو ایک طرف آئینی اور قانونی جواز کی حکمرانی تھی تو دوسری طرف یک مستقل استحصال اور جبر کی۔ بہرکیف اس کی دانش مندی کا جوہر اسی میں تھا کہ وہ تعبیرات کا رمز پاکر ساٹھ سمندر پار کے تسلط کو آئینی طور پر ختم کردے۔ ہندوستان جنت نشان ۱۹۴۷ء سے پہلے چندر گپت موریا، اشوک، چندر گپت گپتا۔ کوٹیلیا، شنکر اچاریہ، ودیاپتی داس سے دوچار ہو چکا تھا۔ جہاں کی علمی زبان سنسکرت تھی جہاں رامائن اور مہابھارت جیسی رزمیہ نظمیں تھیں جہاں گوتم جیسا مفکر پیدا ہوا تھا۔ غزنوی اور سومنات کے قصے کے بعد ۔ وہیں عہد غلاماں اور عہد مغلیہ نے ایک نئی تہذیب کا آغاز کیا، اور اپنے ہزار سالہ دور میں اپنے صوفیائے کرام کی انسانی محبت اور اپنے حکمرانوں کی انتظامی صلاحیت ۔ عمارت گری، اور نقاشی، اپنے باغ و راغ کے ساتھ ہندوستان کی ثقافت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اس دور کی زبان فارسی تھی ۔ عہد غلاماں کے ذخائر نے ... رقعات عالمگیر تک، امیر خسرو سے غالب تک اس نے ایک لازوال روایات ترکے میں چھوڑی تھیں۔ عہد فرنگ تجارتی منصوبوں سے شروع ہوکر ایک عظیم شہنشاہیت تک پہنچا۔ عہد فرنگ نے اپنے اجنبیت کے پردے میں نئے تصورات اور افکار کی ایک دنیا ہمیں دی جو حکمرانی کے جاہ و جلال سے زیادہ معقول اور منطقی تھی۔ ہم نے ان کے تصورات کو یہاں تک قبول کیا کہ صلح و جنگ میں جو اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں وہ بھی انھیں کی ہیں۔ گفت و شنید، زنجیر و زنداں کے راستوں سے گزرتے ہوئے ہندوستان کی سیاسی جنگ آئینی اور قانونی ہوتی چلی گئی آخرکار وہ ... ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی کہ سلطنت کا ٹھہرنا محال ہو گیا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ بیلٹ باکس کے ذریعے نمائندہ جماعتیں قرار پائی تھیں۔ جب ہندوستان میں انتقال حکومت کا وقت آیا تو انگلستان میں لیبر پارٹی برسر اقتدار تھی جو ہندوستان کی آزادی کے منصوبوں پر غور کر رہی تھی ۔

دو بڑی نمائندہ جماعتوں میں سمجھوتے کی کوششیں خود ... گاندھی جناح مذاکرات، جناح جواہر مذاکرات، راج گوپال چاریہ کی سعی، لارڈ ویول کی شملہ کانفرنس ... کیبنٹ مشن ... پاکستان کے مطالبے ... تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سربراہی میں انتقال اقتدار کا عمل ۳ جون کے بعد زیر عمل آ گیا۔ تقسیم سے پہلے اشتراک کی ایک آئینی صورت کیبنٹ مشن پلان میں موجود تھی۔ لارڈ ویول سے ... تمام نبرد آزما معاصرین نے، حتیٰ کہ مولانا آزاد تک نے اس پلان کو غرق کرنے کی ذمہ داری کانگریس اور پنڈت نہرو پر ڈالی ہے۔ تقسیم ہند کے وقت بقول ... دنیا کی سب سے بڑی

ہجرت کا واقعہ پیش آیا۔ ابتدا آئینی ادراک سے ہوئی تھی مگر انتہائی غم و غصے کے دور سے ہوتے ہوئے تقسیم نئے نئے مسائل اپنی لپیٹ میں لائی۔ ان مسائل کو بھی اختر حسین نے بین قومی پس منظر میں دیکھا ہے۔

تہذیبی اور ثقافتی ہم آہنگی کی جتنی بھی صورتیں نکل سکتی تھیں خواہ وہ دو بڑی تہذیبوں کے صدیوں تک ایک ساتھ رہنے کے مشترک احساس سے ہوں یا ایک سیاسی منصوبے کی رواداری میں برصغیر ہند کو ایک ہی ملک رکھنے کی آگہی کی بنیادوں پر ہوں۔ ممکن نہ رہیں۔ ایک اکثریت جس کے قدیم فلسفے اور فکری عروج کی داستان تاریخ عالم کا ایک حصہ ہے اور ایک نمایاں اقلیت جس نے ہندوستان کی تہذیب کو اپنی وسعت نظر، تصوف، شعر و ادب اور تہذیب محفل سے آراستہ کیا ایک مشترک سیاسی جذبے کو اپنانا بھول گئیں۔ یہ اپنی سیاسی تقدیریں الگ الگ آئینوں میں دیکھنے لگیں۔ اس کا شدید ترین نقصان اس اردو کلچر کو ہوا، جو شمالی ہند میں تو تھا ہی مگر برصغیر کے بڑے شہروں کے توسط سے اس نے معاشرے میں بھی جڑ پکڑ رکھا تھا۔ بہرکیف آئینی طور پر دو مملکتیں وجود میں آگئیں۔ ان کے مسائل پھر بھی جداگانہ نہ تھے اور ان کی نوعیت معاشرے کی ترقی پذیری کے لحاظ سے آج بھی جداگانہ نہیں ہے یہ مسائل اقتصادی ناہمواری کو دور کرنے، تعلیم و تربیت کی سطح کو ترقی یافتہ ملکوں کی سطح پر لانے، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ سے متعلق ہیں اور دونوں ملکوں کا ایک معتبر طبقہ یہ بھی ضروری سمجھتا ہے ایک ۔ ۔ ۔ ہمسائگی کو ایک دوسرے پر آسان بنایا جائے۔ دنیا کی دو بڑی طاقتیں جن کے مقاصد الگ الگ ہیں، وہ بھی اس جغرافیائی حدود میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سمجھانا بھی چاہیں کہ عہد انگلشیہ کے آخری دور میں سواد ہند میں اس کی اکثریت اور عالم اقلیت کا مزاج اور ان کی نفسیات ایک تھی تو غالب فلسفہ ۔ ۔ ۔ کے کسی ۔ ۔ ۔ اطلاق اس پر ہو بھی جائے گا مگر اس شیشے کے محلول میں دو اجزا صاف نظر آتے تھے جن کی کیمیائی مخصوصیات الگ الگ تھیں۔ تاریخ حقیقت پسند ہوتی ہے کسی بھی شکست خواب پر اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے گئے ہیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان اور اس کے معاشرے اور ہندوستان اور اس کے معاشرے کی تنظیم نو کا آغاز ہوا۔ نیا انتظام آگیا۔ ہندوستان نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ ترقی پاکستان نے بھی کی مگر اس کے معاشرے کی الجھن ایک نہ ایک پیمانے پر قائم رہیں۔ یہ ساری باتیں اس وقت ہو رہی تھیں جب بین قومی سیاست ایک نیا رنگ اختیار کر رہی تھی۔ عالمگیر تغیرات میں جہاں سہولتیں بڑھ رہی تھیں وہاں دقتیں بھی بڑھ رہی تھیں۔ سیاست سے الگ پاکستان میں کام کی سمتیں اور ان کا حجم ہر لحاظ سے معتبر ہے۔ یہ بات بھی کوئی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ پاکستان تیسری دنیا اور اسلامی دنیا کے کئی اور ملکوں کی طرح مغربی جمہوریت اور اس کے اقتصادی نظام، اس کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی کارکردگی سے ایک گہرا ربط رکھتا ہے اور اس ربط کی قومی افادیت کو کلیدی حیثیت دیتا ہے لیکن اپنے دیگر ہمسایوں سے ایک متوازن اور معتدل رابطے کی اہمیت کو سمجھتا ہے اس فضا میں اس کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے شعر و ادب میں کس نوع کی اندرونی پیکار تخلیقی صلاحیتوں کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ سارے سوالات پاکستان کے مفکرین کے سامنے رہتے ہیں۔ اگر ایک خاص تہذیبی اور ثقافتی احاطے میں قومی شعور کو نیا رخ دینے کی دولت سرسید احمد خاں اور اقبال کو ملتی ہے تو ان کی آگہی میں بھی ایک سائنٹفک فکری افق بنیادی تھا۔ وہ بھی معاشرے کو زمانہ حال کے تغیرات سے پیوستہ کر کے آگے چلنا چاہتے تھے اسی فکری افق کے تسلسل میں ان کے بعد آنے والوں نے کچھ اور اشارے کیے ہیں۔ اختر حسین اور ان کے عہد کے دوسرے دانشوروں کو مماثلت کا یہی پہلو گزشتہ دور کے مفکرین سے قریب لاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی سیاسی آگہی قومی اور بین قومی امور پر قابل داد ہے۔ یہاں بھی بنیادی بات یہی ہے کہ یہ ایک دانشور اور ادیب کی فکر ہے۔ کسی سیاست داں کی حکمت عملی کا قصہ نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد معاشرتی مسائل کا ایک ابھار جو

ایک دانشور

ریٹر حامد مدنی

ب تک اجنبی حکمرانوں کے تسلط کی وجہ سے دبا ہوا تھا سامنے آیا جن میں غذا کی فراہمی سے لے کر قحط آب تک کے مسائل تھے ہجرت کا مدبند لوں کے جمہوریت کے آئین کے اور تیسری دنیا کی معاشی جدوجہد کے مسائل تھے۔ تیسری دنیا میں برصغیر کے ممالک بھی ہیں اسلامی ممالک بھی ہیں اور بلیک افریقہ بھی ہے۔ پاکستان کا جائزہ ڈاکٹر صاحب نے یوں پیش کیا ہے۔

"اگر پاکستان اپنے مسائل حل کرنے کی آزمائش میں ناکام رہا تو اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ملک پر مفاد پرستوں کی گرفت شروع ہی سے مضبوط ہو گئی تھی، منروکہ جائداد زہر قاتل کی طرح معاشرے میں داخل ہو گئی اور حرص و ہوا کا بازار ایسا گرم ہوا کہ لوگوں کا حلیہ ہی بدل گیا۔ نو دولتیوں، شعبدہ بازوں اور گرہ کٹوں کی بن آئی۔ بارہا وحشت کے عالم میں اس اجنبی شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہوئے اکڑی ہوئی گردنوں، ریشم نما تنزدیر کی کمندوں اور بیگموں کو چھبیلی بھٹیارنوں کے روپ میں رواں دواں دیکھتا تھا۔ یہ طلسم کو آغا اشرف نے یکہ کر توڑا کہ جب یہ مان لو گے کہ ۱۹۴۷ء میں سب کا نیا جنم ہوا ہے تو بات آسان ہو جائے گی"۔۔۔۔ ہندوستان میں عنانِ حکومت تیس سال تک ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک کانگریس کے ہاتھ میں رہی جس سے پالیسی میں تسلسل اور مرکز اور صوبوں میں رابطہ قائم رہا۔ مسلم لیگ کا دارومدار قائد اعظم کی شخصیت اور مسلمانانِ ہند کے اس شعور پر تھا جو ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک غیر مسلم تسلط سے نجات کا طالب رہا۔ تنظیمی اعتبار سے پاکستانی علاقے میں مسلم لیگ کی جڑیں کمزور تھیں اور یہ کمزوری لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد ظاہر ہو گئی۔ صوبائی عصبیت کا جن بوتلوں سے یوں نکلا کہ قومی وحدت خواب و خیال ہو گئی۔ پھر یہ ظاہر ہونے لگا کہ مسلمانوں کا تہذیبی ورثہ وہ نہیں تھا جو پاکستان کے وقت بیان کیا گیا تھا اور اسلامی قدریں وہ نہیں تھیں جن کی تشریح علامہ اقبال اور قائد اعظم نے کی تھیں گویا ان کی تفسیر قبائلی سرداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے پاس تھی"۔

اسی طرح تیسری دنیا میں اسلامی ممالک کا ایک جائزہ بھی سامنے آتا ہے:۔

"سیاسی اور معاشی اعتبار سے ان کا براہ راست تعلق تیسری دنیا سے ہے انھیں بھی ان انتظامی صنعتی اور سیاسی اداروں کی تشکیل کرنا ہے جن کے بغیر دورِ حاضر میں کوئی پنپ نہیں سکتا۔ وہ طرزِ فکر جو محض ماضی کی روایات یا شخصی اقتدار کا سہارا لے، وہ قومیت کے لیے مضبوط بنیاد فراہم نہیں کر سکتا، آزاد رہنا مشکل ہے اور ترقی کرنا مشکل تر ہے۔ قومیں ماضی سے عبرت حاصل کرتی ہیں لیکن امید مستقبل سے وابستہ رہتی ہے اور یہ راستہ مستقل جدوجہد سے طے ہوتا ہے۔ خلافت راشدہ کو اسلامی تاریخ کا سب سے روشن دور اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ اس میں اخوت و مساوات کی عظیم روایتیں قائم ہوئیں، ان کی تفسیر ہمارے زمانے میں جمہوری اور فلاحی اداروں میں ملے گی۔ اگر اس تصور کو ترک کر دیا جائے تو پھر ہمارے ماضی میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو دوسری ملتوں میں نہیں ملے گی ۔۔۔ ہم ہر روز قرآن کریم کی ہدایتوں کو دہراتے ہیں کہ علم کا حصول حاصل حیات ہے لیکن جب کوئی فرسودہ اوہام کو تنقید کے میزان پر تولتا ہے تو اس پر نقد کا شکنجہ کسنے لگتے ہیں، انھیں اسباب کی ستم ظریفی ہے کہ اپنی جغرافیائی وسعت، افرادی قوت اور مالی وسائل کے باوجود ہم اپنے

آپ کو اس حال زار میں پاتے ہیں جس سے بیزار ہو کر اقبال نے کہا تھا ؏

"مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے"

بایں ہمہ مستقبل کو تاریک نہیں سمجھنا چاہیے تاریخ کا دھارا دریا کے سیل رواں کی طرح ہے کوئی کشتی سمت مخالف میں نہیں بہہ سکتی۔ مدتوں کے زوال کے بعد اوروں کی طرح مسلمانوں میں بیداری کا دور اس صدی میں شروع ہوا اور وہ وقت دور نہیں جب رجعت پرور طاقتوں کو تاریخ اپنے خاک داں میں پھینک دے گی۔"

اسی طرح افریقہ کے حالات پر لکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

"مغربی سامراج نے براعظم افریقہ کا جس طرح استحصال کیا ہے اس کی مثال ایشیا میں نہیں مل سکتی کیونکہ یہ لوٹ مار سامان کی درآمد برآمد تک ہی نہیں تھی۔ بلکہ اس میں نسلی تشدد کا وہ جذبہ کارفرما تھا جو وحشی جانوروں کے قتل عام اور مجبور وحشیوں کے قتل عام میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا، اس جذبے کی اس تہذیب حاضر نے پرورش کی ہے جس نے امریکی براعظم میں بے شمار ریڈ انڈین کو اور آسٹریلیا میں ان گنت قدیم باشندوں کو نیست و نابود کر دیا۔ آج بھی وقفے وقفے سے یہ رگ پھڑکتی ہے اور حقوق انسانی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود بے گناہ انسانوں کو کبھی ویت نام کبھی الجیریا اور کبھی فلسطین میں فنا کر دیتی ہے۔ افریقہ کے قیام کے دوران ہر ذی حس عرب سی کی طرح مجھے بھی برابر یہ محسوس ہوتا رہا کہ ہم لوگ ایسے لوگوں میں رہتے ہیں جو تاریخ کے زخم خوردہ ہیں۔"

افریقہ بہار وہ یونیسکو کے کاموں کے سلسلے میں چند سال رہ سکے ہیں ایک اپنی داستان شمر رکھتے ہیں۔ اور آج بھی بیا افریقہ کے کئی حصوں میں جنگ آزادی جاری ہے۔ جہاں جہاں انگریزوں کا تسلط پہلے تھا وہاں نیا افریقی ادب انگریزی میں بھی ارہا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہی رسومات کے حوالے سے اپنی موجودہ زندگی کا جائزہ لینے کی سکت رکھتے ہیں۔ جغرافیے سے ان کی جس معاشی و صنعتی زندگی کا تصور ابھرتا ہے وہ ایشیا سے بالکل مختلف ہے۔ بہرکیف چونکہ شمال و جنوب کی مناسبات کے توازن میں وہ ایک بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اس لیے بڑی طاقتوں کی سیاسی نبرد آزمائی کا شکار وہ بھی ہیں۔

زبان کا مسئلہ

کل جب عہد فرنگ تھا اس برصغیر کی ساری قوت فکر آزادی کی تحریک میں ڈھل کر ہر شعبے میں سوچنے والوں کو مستقبل کے منصوبوں پر مائل کر رہی تھی، دانش مندی کا تقاضہ یہی تھا کہ معاشی سیاسی اور تہذیبی زندگی کا کوئی واضح تصور سامنے ہو تو بہرکیف معاشرے کے لیے ان سب شعبوں سے مل کر ایک کلیت کا تصور ضرور کارفرما تھا۔ آزادی کی تحریک کے ساتھ ساتھ کئی ادارے اپنی اپنی حدوں میں کام کر رہے تھے اس میں زبان یا زبانوں کی ترقی ان کے معیار اور حد تقاضوں کے مطابق اپنی ہی زبان میں علوم کی کتابوں کی فراہمی کے مسائل تھے، ان مسائل کی نوعیت اس وقت کیا تھی اور اب یہ کس طرح طے کیے جائیں گے اس پر تو ایک بڑا فورم الگ ہو سکتا ہے مگر اس سلسلے میں عہد فرنگ ہی میں بدلتی ہوئی کمرشیل زندگی سے یہ بات اجاگر ہو گئی تھی جس کی ایک جھلک روزانہ کی زندگی میں آج بھی نظر آتی ہے۔ پاکستان ہو یا ہندوستان کسی بھی لبرا اسٹاپ، ریلوے اسٹیشن، بندرگاہ، ایرپورٹ، اسٹاک ایکسچینج میں لوگ اشاروں یا سیا فورسگنل میں باتیں نہیں کرتے ہیں، معاشرے کی تجارتی ضرورتوں نے کئی دلچسپ لہجے نئی دلچسپ محاورے زبان کی بدلتی ہوئی صورت حال دراس صورت کی تہہ میں ایک وہ قوت جو ضرورتوں نے عوام میں ان دیکھے تحت سے بند

کردی ہے۔ پیدا کی ہے۔ اس سے ذرا اور گہری تہہ میں جائیے تو سیاسی جلسوں، سینما ہاؤس، کافی ہاؤس، نیم تاریک اور نیم روشن گلیوں میں نئے نئے جملوں کی تیزی میں ایک بالکل بدلا ہوا سماجی شعور ملتا ہے جس کا ادبی لباس سعادت حسن منٹو اور شوکت صدیقی کے یہاں ہے۔ ادب نے کسی بھی نوع کی عصبیت زبان کے سلسلے میں نہیں برتی خواہ وہ کرشن چندر یا عصمت چغتائی ہوں، راجندر سنگھ بیدی یا اختر حسین ہوں، زبان معاشرے کے شعور۔ اس کی کشمکش کا ایک آئینہ ہے جس کی سند ہنگامۂ حیات ہے۔ یہ سارا تذکرہ یہاں اس لیے نکل آیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک وقیع گواہ کی حیثیت سے زبان پر ہونے والی پیکار کا احوال نہایت وضاحت سے لکھا ہے لیکن موقع پر کئی عظیم ذہنوں کی عصبیت کئی پردوں کے اندر سے جھلک اٹھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہندی کے ادیب بھی ہیں اور اردو کے ادیب بھی۔ دونوں زبانوں سے محبت کے باوصف انھوں نے زبان کے متعلق ردیے کا جو منظر پیش کیا ہے، وہ صاف گوئی پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں اردو زبان کے ایک مرکزی کردار مولوی عبدالحق صاحب کے صاف ستھرے عملی نظریے کی جھلک بھی ملتی ہے۔

ادب کی تحریک کا ایک دور

زبان کی تحریک کی طرح ادب کی تحریک کا بھی ایک دور تھا جسے ترقی پسندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس تحریک پر دو مستند کتابیں روشنائی اور ترقی پسند ادب موجود ہیں، مرحوم سجاد ظہیر صاحب اور علی سردار جعفری صاحب نے جو تحریر کیا ہے وہ اس تحریک کے رخ اور فکری پس منظر کو سمجھنے کے لیے وہ دلائل رکھتا ہے جو آج تک دہرائے جارہے ہیں اس پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مرحوم سجاد ظہیر صاحب اپنی سیاسی زندگی سے الگ ایک باوقار اور ذی فہم دانشور سمجھے جاتے تھے۔ ان کے لندن کے قیام میں لکھی ہوئی ناول "لندن کی ایک رات" ناول نگاری میں ایک نئی سمت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس ناول میں اس وقت کی سماجی اور سیاسی سوچ کے علاوہ فکر کا وہ بیج تھا جو آگے چل کر دوسرے تحریروں میں ڈھلا۔ وہ فارسی اور اردو کلاسیکی ادب کے دل دادہ تھے اور جدید فرانسیسی ادب سے آشنا تھے انھوں نے اردو کے قاری سے لوئی آراگوں اور پال ایلوار کو متعارف کرایا۔ ان کی کتاب "ذکر حافظ" بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ علی سردار جعفری صاحب کی نظم و نثر وقیع اور قابل ستائش ہے ان کے [illegible] دیباچوں پر مبنی کتاب پیغمبران سخن، جو کبیر، میرا اور غالب پر ہے، نہایت فکر انگیز ہے۔

راشد اور فیض نے جو کچھ نظم و نثر میں لکھا ہے اس نے ہمارے ادب کا اعتبار بڑھا دیا ہے۔ ادب کے طالب علم کو جستجو رہتی ہے کہ اپنے ادب کے تخلیقی [illegible] کو دوسری زبان کے ہم عصروں کے مقابل رکھ کر دیکھے کہ ہیں قومی فکر کا تسلسل، معیار اور دور حاضر کی جستجو خود اس کی زبان کے ادب میں کتنا وزن رکھتی ہے، ڈاکٹر ملک صاحب اور ان کے ہم عصروں نے ہمیں اس سلسلے میں مایوس نہیں کیا ہے [illegible] دو چار سال کے فرق سے [illegible] اور [illegible] ایک گروہ ملتا ہے جو کہ باعتبار فکر اور لیا باعتبار اسلوب زندگی [illegible] ایک منزل سے دوسری منزل تک [illegible] کے راستے سے جانے والا [illegible] آوبل آڈن سی ڈی لوئس، برٹ چیٹ سرل کانولی میکنیس [illegible] فرانسیسی [illegible] تو اس فرق کے باوجود [illegible] اپنے قال کے اندیشے میں مبتلا تھا اور ہمارے ادیبوں [illegible] سماجی ادب [illegible] ان دیکھی سکت کا طلب گار تھا۔ معیار میں کسی کم تری کا [illegible] ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک [illegible] ہے۔

شخصیت

کسی دانشور ادیب کی شخصیت کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا سیاسی اور معاشی زاویۂ نگاہ، اس کی تہذیبی و ثقافتی ادراک اس کی تخلیقی و تنقیدی صلاحیت اس کے تاریخی شعور سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ فرد کی حیثیت سے اپنی تمام ذمے داریوں کو قومی اور بین قومی فکر سے منسلک پاتا ہے اس کی ذاتی اور نجی زندگی ان سب قدروں کی آئینہ دار ہوتی ہے جو اس کی فکر کا لازمی حصہ ہیں۔ خود نوشت یا ناول یا شاعری میں۔ ہم فن کار کو انھیں بنیادی قدروں کی معرفت پرکھتے ہیں جو ایک بہتر معاشرے کا تعمیری رخ رکھتی ہیں، اس لحاظ سے شخصیت کی اکائی کو توڑنا ناممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جن خیالات سے اپنی تحریر کی ابتدا کی تھی وہ ایک بالغ نظری کے ساتھ اس دور میں بھی بروئے کار ہے۔ وہ بے تاب طبیعت جس کے گرم و سرد سے گزر کر ان کے چہرے نے ایک بے کنار آسودگی پائی ہے آج بھی زندگی کے تازہ ترین مرحلوں اور انکشافات سے گزرنے پر مائل نظر آتی ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ ان کے تیکھے خد و خال کی رعنائی، آتشیں خیالوں سے ہم آہنگ ہو کر بزم یاراں میں ایک ولولہ تھی۔ الجھے ہوئے مسائل میں ایک خطِ مستقیم پیدا کرتی تھی اردو ادب میں ایک نئے شعور کا آغاز تھی اور آج بھی اسے ایک مرکزی کردار ادا کرنے کی برملا داد دی جا سکتی ہے۔ ان کے ہم عصروں نے اختلافی امور کے باوصف ان کی فکر کا پاس کیا۔ بڑوں سے انھوں نے شفقت اور ہم خیالی کا گھنا سایہ پایا۔ چھوٹوں نے ان کے بنائے ہوئے راستے کی ہمواری سے رفتار میں تیزی پائی۔ ان کی خلوت نشیں طبیعت نے ہمیشہ ہجوم کو اپنے اردگرد نہیں چاہا، مگر ہجوم نے ان کی فکر سے ایک انجمن پائی۔ ایک ایسے وقت جب ان کی فکر عروج پر تھی۔ سرکاری اور غیر سرکاری معاش سے الگ ادب کے لیے انھیں وسعت ملی تھی ان کی بینائی اثر انداز ہو گئی۔ اس جگہ ملٹن یاد آتا ہے جس نے کہا تھا THEY ALSO SERVE WHO STAND AND WAIT وہ بھی تیرا ہی کام کرتے ہیں جو منتظر ہیں کھڑے رہتے ہیں۔ فکر بھی ایک عبادت ہے۔ مدتوں کے مسلسل ریاض کے بعد کسی مصنف کے تجربات و خیالات کی کلیت اس کے دور کی کشمکش اس کے داخلی اضطراب اس کے ظاہر و باطن کے ہنگاموں سے پیدا ہونے والے سوالات کا ایک مخزن ہوتی ہے۔ مورخ ہر دور کو ایک ایسے ہی مخزن سے پہچانتا ہے۔ ادیب اپنے ہی خوابوں کی شکست و ریخت میں بنتے بگڑتے ہوئے معاشرے کا احوال کہہ کے وہ مواد فراہم کر دیتا ہے جس کی تلاش میں تاریخ داں کا جذبہ تحقیق کئی اور سمتوں سے تشنہ کام لوٹتا ہے۔ میر کی غزلوں میں، غالب کے خطوط میں رتن ناتھ سرشار کی ناول میں بدلتے ہوئے اسلوب زندگی کی جو حکایت ملتی ہے وہ خود تغیر کا ایک پیمانہ ہے جسے کسی فلسفے یا نظریے کی روشنی میں سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان سے جو رخ متعین ہوتا ہے وہ خود فلسفۂ تاریخ کی تشریح کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہمارے دور میں بھی فیض، راشد کی نظمیں، منٹو کے افسانے۔ اس دور کی تنقید ہمارے خوف و ہراس، ہمارے خواب و تعبیر خواب ہماری معاشرتی اور نامیاتی زندگی کے زخم اور ان کے اندمال کا ایک پیمانہ ہیں۔ بہرکیف جس دور کا تذکرہ آیا تھا وہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک تھا۔ وہ بھی اس سے پہلے گزرنے والے ادوار سے اگرچہ معنویت اور رخ میں الگ تھا لیکن ان کی روایات اور تجسس سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔ آزادی کے بعد دو مملکتیں قائم ہو گئیں مگر زمانے کے تقاضے دونوں پر ایک طرح اثر انداز ہوں گے۔ ایشیا اور افریقہ کی قومیں۔ تیسری دنیا کے عوام۔ ان کا کچھ نہ کچھ بدلا ہوا ساز و سامان۔ ادیبوں اور شاعروں سے کیا کچھ چاہتا ہے وہ ان کی معاشی اور سیاسی زندگی کو موضوع سخن بنا کر کیا کیا لکھیں گے اپنی تخلیقات میں قدیم روایتی فکر کو کس نئے لباس میں پیش کریں گے یا اپنی اپنی قومیت کی شناخت میں منہمک ہو جائیں گے، یہ ان کا کام ہی بتا سکتا ہے۔ اختر حسین نے ان سب باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی کتابیں ان کے عہد کی ساری پیکاروں میں پوری ذہنی شرکت کا احساس دلاتی ہیں۔ ان سے فکر و عمل کے دائروں میں گرم کار زندگی کی شہادت ملتی ہے۔ صحافت، ادب، علمی ہیں اور اس کے بعد

بڑی اسامیوں پر تعلیم اور یونیسکو کی کارکردگی ہیں۔ ان سب مراحل کے طے کرنے میں ان کی جستجو کسی دھند میں الجھ کر نہیں رہ گئی ہے۔ ان کی فکر نے جو نتائج اخذ کیے، ان میں وسعت، کشادہ دلی، مذہب و ملت کا احترام اور آنے والے دور کی جھلک بھی اور وہ اندیشہ و خوف بھی ہے جو ایٹمی جنگ۔ آبادی کے مسائل و خوراک، شمال و جنوب کے معاشی عدم توازن میں موجود ہے، جہاں انھوں نے خود یہ سند پیش کی ہے کہ بابو مول چند سے مجھے کام اور مولوی عبدالحق نے مجھے باضابطگی کا درس دیا، وہاں ان کی زندگی سے یہ سند بھی ملتی ہے کہ خانہ داری اور خانگی معاملات کے بارگراں سے بہن حمیدہ بیگم نے ان کے ذہن کو محفوظ رکھا وہ ہمارے شکریے کی مستحق ہیں۔ ایسے وقت بھائی مظفر حسین شمیم کا ذکر خود بخود لب پر آجاتا ہے کہ صرف ڈاکٹر صاحب کی یادیں ہی ان سے وابستہ نہیں ہیں، بلکہ تا حال لکھنے والوں کی یادوں میں وہ اپنی بزرگانہ شفقت کی وجہ سے موجود اور زندہ ہیں۔


تحفظ
کے پی ایم پائپ سے مکمل تحفظ
کراچی پائپ ملز کے اعلیٰ معیاری اسٹیل پائپس کی ضمانت دیتے ہیں کہ
ان میں کوئی ایسی خامی یا خرابی نہیں ہے جو بناوٹ کے دوران باقی رہ سکتی تھی
اس لئے یہ آپ کے مکمل تحفظ کے ضامن ہیں۔
برقی طریقے سے سیم ویلڈنگ
دوران ساخت خامیوں کی الیکٹرانک طریقے سے جانچ
دونوں جانب جست کی موٹی تہہ
جدید تیکنیکی آلات سے گیلوینائزنگ کی موٹائی اور یکسانیت کی جانچ پڑتال
سو فیصد ہائیڈرو اسٹیٹک پریشر ٹسٹنگ
۳۰ برس کا اعتماد۔ کے پی ایم کے تحفظ کی بنیاد
KPM
کراچی پائپ ملز لمیٹڈ
PID Islamabad K P M 4 85

ڈاکٹر حنیف فوق

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

کے تنقیدی اور تہذیبی تصوّرات

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی آواز ایسے جو زندہ ادب کے ایوانوں میں آج بھی گونج رہی ہے۔ ان کے دوار ے کھوئے ہیں اور نئی بہاروں کی جستجو کو چیلنج کیا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں اس آواز کی بازگشت اب بھی متعدد سلسلے اپنے حیات کو متحرک رکھتی ہے۔ لیکن اس آواز کو پہچاننے کے لیے قریب و دور کی آوازوں سے گوش آشنائی اور اس کے حدود و امکانات کا علم بھی ضروری ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اردو تنقید میں جن صداقتوں کو پیش کیا وہ اپنے عصر سے وابستہ ہوتے ہوئے اور دنیا کی اہم روایتوں سے تعلق رکھتے ہوئے بھی برصغیر کی صورتِ حال سے اس طور پر منسلک ہو گئی تھیں کہ ان کے واسطے سے ایک وسیع تہذیبی حرکت کا اندازہ ہوتا تھا۔ ان کی تحریروں سے تہذیبی بیداری کے نئے افق روشن ہوئے تھے۔ چنانچہ اختر حسین رائے پوری کی تنقید نے جو چراغ روشن کیے تھے ان سے نہ صرف ہماری تہذیب کے بہت سے نقوش واضح ہوئے تھے بلکہ اس تہذیب کی وسیع تر انسانی تہذیب سے تعلق اور اس کی بدلتی ہوئی صورتوں کا علم بھی ہو رہا تھا۔ صحیح علم اس آگہی کا حصہ تھا جو اپنے ماحول کا عمومی شعور عطا کرتی ہے اور اس کو نئی تہذیبی معنویت دیتی ہے۔ شاید اسی لیے اختر حسین رائے پوری کی تنقیدی تحریروں سے جن تہذیبی تصورات کو فروغ حاصل ہوا تھا ان کی سرحدیں وسیع تر ہوتی گئیں اور بعد کے لکھنے والوں نے ادبی تصورات کے بعض حلقوں کو دور کیا اور نئی تجربے کے متعدد نئے گوشے دریافت کیے اور ادب کے احساساتی و تخیلاتی امکانات کا نیا شعور بخشا۔ لیکن اختر حسین رائے پوری کی اوّلیت ابھی تک قائم ہے کہ وہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں فکر کی رہبری کو اقدام بیداری بناتے ہیں اور ادب میں حرکت کا تصور متعین کرتے ہوئے ہیئتِ اجتماعی کے تعلق سے اس حرکت کی حیات افروز تہذیبی سمتوں کو روشنی بخشتے ہیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے زندگی کی حرکت کو انسان کی ارتقائی سرگرمیوں سے منسلک کرتے ہوئے ادب کو معاشرے کی تبدیلیوں کا پرچم بردار بنایا ہے۔ وہ ادب کا انسان کی مجموعی زندگی کی حرکت سے رشتہ قائم کرتے اور اس کی تمام تہذیبی سرگرمیوں کو حالات کے سیاق و سباق میں پرکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ عوامل تغیر اور ذہنی احوال کے درمیان مطابقت قائم کرتے ہوئے کہنہ پرستی اور تازہ کاری کے حدود اور فاصلوں کا سراغ لگاتے ہیں۔ پھر خارجی تسلط، معاشی جبر اور استبداد کے درمیان عواملِ تغیر کی رفتار اور انسانی ذہن کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ انسانی ذہن کی مدافعت بھی ... سید سبطِ حسین لکھتے ہیں "ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ملکوں کے ادب کا جائزہ لیتے ہوئے دو ملکوں ملکوں گشت کرتے ہوئے تابندگی فکر کی شمع جلائے رکھی ہے۔ وہ جس

انسانی آزادی و مسرت کے امین رہے ہیں [illegible] شعلے کو ہوا [illegible] یہ چیز کبھی بجھنے نہیں دیا ہے زندگی کے وسیع سفر پر وہ انسان کی ظفرمندی کے داعی رہے ہیں۔ یہ ان کی بڑی جہت ہے لیکن [illegible] کبھی کبھی شکست کے ذریعے بھی انسانی آرزوؤں کی ترجمانی کرتا ہے۔ کبھی عوامل کی رفتار انسانی آرزو کی نسبت سے سست بھی ہو جاتی ہے اور کبھی اس سے زیادہ تیز [illegible] سے بدلتی ہوئی صورتِ حال کا انسانی ذہن ساتھ نہیں دے سکتا ان دونوں صورتوں میں جو کشمکش رونما ہوتی ہے [illegible] کی حامل ہو سکتی ہے۔ پھر یہ صدا فنی بھی انسان کی بہتر زندگی کی خواہش میں نشاناتِ راہ بن سکتی ہیں [illegible] ادب اور سماج کا رشتہ [illegible] کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے لئے اپنے عہد سے تقویت پائی اور اسے تقویت بخشی ہے۔ ان کا [illegible] ہوئے سماج کی نارہ امنگوں کی آئینہ داری کرتا ہے اور وہ تہذیب کو ماضی کے بوجھ تلے دبے ہوئے دیکھنے سے مستقبل کے [illegible] دکھاتے ہیں۔ ان کی تنقید کی خوبی یہ ہے کہ نئے عصر کے حدود و امکانات میں وہ خوش آئند تبدیلی کی بشارت دے اور [illegible] فکر کو تخلیقی قوت عطا کرتے ہوئے ایسا سیدھا اور صاف راستہ دکھاتے ہیں کہ راہ کی پیچیدگیاں گردِ راہ بن جاتی ہیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے تغیر کے واسطے سے تہذیب کی تعبیر کی ہے لیکن ہر تہذیب کے جذبِ روایت کے عمل کو وہ اس کی بنیاد میں انسان کی باقی رہ جانے والی خصوصیات کی آمیزش ہوتی ہے [illegible] نظر انداز نہیں سمجھا ہے۔ قدیم یونانی تہذیب آج بھی موجودہ مغربی تہذیب کی صورت میں بعض حیثیتوں سے زندہ ہے اور بعض حیثیتوں سے انقلابی وضعیت میں احوالِ ماضی متشکل ہوتے ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی [illegible] کو بیان کرتے ہوئے ادبی تجربے کے باطن کی تہوں تک نہیں اترتی ہے اور بعضوں کو اس پر تنقید ہے [illegible] خاص اس بے وقیع نہیں کہ ہر صورتِ حال ایک سطحی منطق بھی رکھتی ہے۔ یہ الزام ضرور کیا جا سکتا ہے کہ اختر حسین رائے پوری نے صورتِ حال کو صورتِ حال پر ترجیح دی ہے اور دونوں کے مستحکم تعلق کا نظام وضع نہیں کیا ہے۔ اسی طرح [illegible] لیکن اس کے ذریعے ماضی کی نئی تہذیبی دریافت یا اس کے مثبت عناصر کے [illegible] تا کہ آج اور کل کا دائرہ مکمل ہو جائے۔ ان کے تہذیبی تصورات کا رخ حرکت و تغیر کی جانب ہے لیکن [illegible] جو زندہ روایت سانس لے رہی ہے، وہ اس پر اپنی پوری توجہ صرف نہیں کرتے۔ شاید اس لیے کہ وہ [illegible] کی سطروں پر مرکوز رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح وہ ادب کی تاریخی تعبیر کی جان کاہ مسافتوں سے سرسری گزر جاتے ہیں لیکن [illegible] انکار کر سکتا ہے کہ اختر حسین رائے پوری خود ہماری ہی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ ان کی تنقید نے جو روشنی عطا کی ہے [illegible] آج جو منور الفکری نظر آ رہی ہے اس میں ایک حصہ ان تنقیدی خیالات اور ان تہذیبی تصورات کا ہے جنہیں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی مخصوص ادبی بصیرت، اپنے وسیع مطالعے اور اپنی ژرف نگاہی کے ساتھ زندگی اور انسانیت کا پیغام بنا کے [illegible] ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری عصرِ جدید کے مبلغ [illegible] ان کی تحریروں نے فکر کے اصنامِ قدیم پر ضرب لگائی اور نئے تہذیبی تصورات کو [illegible] دیا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ [illegible] پیش کرنے کے بجائے اپنے ماحول اور فضا کی ترجمانی کرتے ہوئے زندگی کی اسمیت و مرہم کا نیا معیار [illegible] شدہ کا نقش جانے اور فرسودگی و پسپائی کی جگہ فراستِ پیش رو کو مطمحِ نظر [illegible] ہیں۔ دراصل اختر حسین [illegible] قدیم اور جدید دنیاؤں کا تصادم مبادی اہمیت رکھتا ہے۔ ہربرٹ ریڈ HERBERT READ نے جنگ کے بارے میں [illegible] دو قوموں کے درمیان محاذ نہیں بلکہ تہذیبوں

کے درمیان تصادم ہے۔ چنانچہ اختر حسین رائے پوری کی تحریروں میں تصورات کی یہ جنگ جو تہذیبوں کے تصادم کو پیش کرتی ہے، بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ البتہ اس تصادم میں ان کو جو بالاتری مل گئی وہ یوں کہ برصغیر کی سیاسی اور سماجی صورت حال میں قدیم تہذیب، عصری ترقی کے معیار سے زیادہ کہنگی کا شکار تھی اور جدید تہذیب کی کشش میں بیرونی دنیا میں رونما ہونے والی نئی تصوراتی ہلچل نے بیرونی سامراج کے خلاف جد وجہد کو ہوا دے کر اضافہ کر دیا تھا۔ چنانچہ ایک جانب قدیم تہذیبی تصورات کی فرورفتگی اور دوسری جانب جدید تہذیبی تصورات کے ساتھ اجتماعی جد وجہد آزادی کی وابستگی نے نئے خیالات کے لیے زمین ہموار کردی تھی۔ اس موقع پر اختر حسین رائے پوری نے ادب اور زندگی کے تعلق کو ایک انقلابی بصیرت کے ساتھ پیش کیا تو ان کے حلقۂ اثر میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ جس طرح یونان کی تہذیبی تاریخ میں پرانے دیوتاؤں کی جگہ نئے دیوتاؤں نے لے لی تھی، اسی طرح برصغیر کی ذہنی تاریخ میں نئے تصوراتِ تہذیب کو فروغ حاصل ہوا۔ ڈاکٹر اختر حسین کی بڑائی یہ ہے کہ وہ تاریخ کے اس موڑ پر جہاں برصغیر کی سماجی وسیاسی جد وجہد سے توانائی پاتے ہیں، وہاں برصغیر کے ادبیات کی نئی تہذیبی لہروں سے سلسلۂ تعلق بھی قایم کر لیتے ہیں۔ ان کو اردو کے علاوہ برصغیر کی دوسری زبانوں کے ادبیات سے واقفیت کا فائدہ بھی حاصل ہوا ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے حدودِ نظر وسیع ہیں اور جہاں وہ موجودہ علوم سے حاصل کی ہوئی واقفیت اور عالمگیر تحریکاتِ ذہنی سے آشنائی کا فائدہ اردو ادب کو پہنچاتے ہیں، وہاں مغربی ادبیات اور برصغیر کے دیگر ادبیات کے مطالعے نے بھی ان کے ادبی ذوق کو جلا دی ہے۔ اس ادبی ذوق نے تنقید، افسانہ، ترجمہ اور ترتیب وتالیف کے مختلف میدانوں میں اپنے اظہار کے راستے نکالے ہیں۔ ان سب سے اس ذہنی تموج کا پتہ چلتا ہے جو ان کے تنقیدی اور تہذیبی افکار میں موجود ہے۔ اپنی تنقیدی تحریروں میں اختر حسین رائے پوری نے مسائل زبان وادب سے بحث کی ہے۔ ادبی رجحانات کا جائزہ لیا ہے، شاعری، افسانہ نگاری، ناول اور ڈرامے کو زیرِ قلم لائے ہیں اور زندگی افروز تصوراتِ تہذیب کو پیش کیا ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے افسانے بھی لکھے اور ان کے افسانوں کے دو مجموعے "محبت اور نفرت" اور "زندگی کا میلہ" منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اپنے زمانے میں یہ افسانے خاصی شہرت کے حامل رہے ہیں اور ان افسانوں کے ذریعے اختر حسین رائے پوری نے تخلیقی طور پر ادب کی حقیقت پسندانہ روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کے علاوہ اختر حسین رائے پوری مقالات کا رسالہ دتاسی کے بہ تعاونِ عزیز احمد مرتب ومؤلف ہیں۔ حبشہ واطالیہ کی جنگ کے پس منظر میں اختر حسین رائے پوری نے "حبشہ واطالیہ" کے نام سے جو کتاب مرتب کی ہے، اس میں مختلف مقالہ نگاروں نے حبشہ کے جغرافیائی، تہذیبی، معاشرتی حالات، اس کی تاریخ اور اس کے عرب اور اطالیہ سے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ خود اختر حسین رائے پوری کے تین مضامین "حبشہ کا دورِ حاضر"، "لیگ، استعمار اور حبشہ" اور "مستقبل" شاملِ کتاب ہیں۔ ان مضامین میں حقائق کو معروضی انداز میں پیش کیا گیا ہے، البتہ حبشہ کی مظلومیت سے ہمدردی اور تہذیب کے ٹھیکے داروں کی بے انصافی اور ستم پروری کے خلاف احتجاج کی لے نمایاں ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے بنگالی، روسی اور سنسکرت ادبیات کا جو مطالعہ کیا ہے، اس کا کچھ اندازہ 'پیامِ شباب'، گورکی کی آپ بیتی اور شکنتلا کے تراجم سے ہوتا ہے۔ معاصر علاقائی ادبیات میں گجرات کے ایک باکمال شاعر اردشیر خبردار کی شاعری پر بھی اختر حسین رائے پوری نے نظر ڈالی ہے اور اس کی بعض نظموں کے ترجمے کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت کی وجہ قومی شاعری کو بتاتے ہوئے خاص طور پر اس کی عاشقانہ شاعری پر توجہ کی ہے اور کلاسک سنسکرت شاعری سے اس شاعری کی مطابقت کا ذکر کیا ہے۔ پرل بک کے ناول گڈ ارتھ کا ترجمہ اختر حسین رائے پوری نے پیاری زمین کے نام سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ان ترجموں نے عالمی ادبیات کے بعض گوشوں کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ خود ان کے ادبی شعور کے فروغ میں حصہ لیا ہے۔ یہی نہیں کہ یہ ترجمے ان کے ذوقِ ادب کے گواہ ہیں بلکہ ان سے ان کے ذہنی دائرۂ کار اور تہذیبی تصورات کی تشکیل میں جو وسیع المشربی، انسان دوستی اور عالی

نظری کی صفات آئی ہیں، ان کا اثر ان کی تنقیدی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات تو ترجموں ہی کے ذریعے کسی زبان کے نئے ادبی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ نارتھ کے پلوٹارک، ڈرائڈن کے ورجل اور پوپ کے ہومر کے ترجموں نے انگریزی ادب پر واضح اثرات چھوڑے ہیں اور دورِ جدید میں مشرق و مغرب کے کئی ملکوں کی شاعری پر فرانسیسی شاعری کے ترجموں، بلکہ ترجموں کے ترجموں نے گہرے نقوش مرتب کیے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے براہِ راست اور بالواسطہ ترجموں نے اردو ادب کے ذہنی افق کو وسیع تر کیا ہے اور دوسرے افقوں سے حاصل کی ہوئی زرنگار روشنیوں کا جلوہ دکھایا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ان ترجموں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک جانب وہ برصغیر کے ادبی حافظے کے بعض گوشوں کے محافظ ہیں اور قدیم تہذیبی میراث سے ہمیں آشنا کر رہے ہیں اور دوسری جانب وہ حال کی کش مکش میں بہتر زندگی کا خواب دیکھنے والے مختلف زبانوں کے بعض تخلیق کاروں کے حسن و قوت کو ہم تک پہنچا رہے ہیں۔ ان کے اس قدیم و جدید کے مطالعے نے اگرچہ قدیم اور جدید کو منسلک کرنے کے لیے تاریخ کے کسی رابطۂ تعبیر سے نتیجہ آزمائی نہیں کی ہے، لیکن ان کے تہذیبی تصورات کو وسعت دے کر ان کی تحریروں کو پختگی اور ذہن کشائی ضرور عطا کی ہے۔

دورِ حاضر کے آغاز ہی سے مشرق و مغرب کے دانش وروں کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ادب کے لیے صرف ادبی طالع آزمائی کافی نہیں بلکہ حقیقتوں کا سراغ لگانے کے لیے غیر ادبی ذرائع اور خارجی دنیا کے علائق پر بھی نظر کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ معاصر انگریزی ادب میں جیمس جوائس، ورجینیا وولف، ارنسٹ ہیمنگوے، ایلیٹ، اسٹیفن اسپنڈر اور ہربرٹ ریڈ وغیرہ نے اپنے اپنے طور پر اس طرف توجہ کی تھی۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تحریروں میں مغرب کے ادیبوں اور دانشوروں میں گورکی اور ٹالسٹائی کے علاوہ خاص طور پر والٹیر، رومین رولاں، کروپاٹکن، مولیر، لوئی آراگاں، دستوئیفسکی، چیخوف، موپساں اور وکٹر ہیوگو وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں اور "گردِ راہ" میں ذہنی سفر کی داستان دلچسپ طور سے بیان ہوئی ہے۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس سفر کے آغاز ہی سے ان تحریکوں سے متفق رہے ہیں جو زندگی کے ارتقا کی علم بردار رہی ہیں۔ چنانچہ بھارتیہ پرشد ناگپور کے اجلاس میں ادب کے مقاصد کے بارے میں جو اعلان نامہ پیش کیا گیا تھا، اس میں یہ وضاحت تھی کہ:

"ادب کے مسائل کو زندگی کے دوسرے مسائل سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا، زندگی مکمل اکائی ہے۔ اسے ادب، فلسفہ، سیاست وغیرہ کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ کاروانِ حیات کا رہبر ہے۔ اسے محض زندگی کی ہم رکابی ہی نہیں کرنا ہے بلکہ اس کی رہنمائی بھی کرنا ہے۔"

اس اعلان نامے پر جواہر لال نہرو، اچاریہ نریندر دیو، مولوی عبدالحق، منشی پریم چند اور اختر حسین رائے پوری کے دستخط تھے۔ اختر حسین رائے پوری برصغیر کی جدوجہد آزادی سے متعلق ہر ذہنی حرکت کے حامی تھے لیکن مسلم قومیت کے وجوب و لزوم کی جھلک ان کی خودنوشت "گردِ راہ" میں ملتی ہے۔ اس سے پہلے کی تحریروں میں ہندو احیا پرستی کے رجحان کا ذکر اور اس کی تنقید ملتی ہے لیکن مسلم قومیت کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر زیادہ کشادہ نہیں اور اس وابستگی نے بعض اوقات انھیں بعض ہندؤں کی پیروی پر مائل کیا ہے۔ اپنی کتاب "روشن مینار" کے آخری مضمون "ادب اور فسادات" میں حیرت ہے کہ وہ اپنے خیال کی وضاحت میں ہٹلر کا قول پیش کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ فسادات پر غور کرتے ہوئے کالی دیوی کی کھوپڑیوں کا ہار پہنے لاشوں پر رقص کرنے کی تصویر آنکھوں میں گھوم جانے کے باوجود وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا یہ پارۂ حکمت نقل کرتے ہیں کہ:

"جنگِ عظیم کی تباہ کاری کے مقابلے میں ان فسادات کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ ان کے بدلے میں ہندوستان کو آزادی جیسی بیش بہا نعمت ملی ہے۔"

اختر حسین رائے پوری کی طرف سے کہ جن کی تحریروں نے استعمار کے خلاف ذہنی حرکت کو مضبوط کیا تھا، اس قول کا تنقید یا تردید کے بغیر نقل کیا جانا، موجبِ حیرت ہے۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ فسادات کے مہیب دور میں انسان کی شکل مسخ ہو چکی ہے لیکن اس سلسلے میں اپنی درماندگیٔ فکر کا وہ یوں اظہار کرتے ہیں کہ:

"میرا احساس اس ٹریجڈی کے جلاد کی شکل صاف نہیں دیکھ سکتا۔"

پھر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا یہ قول ہماری جد و جہد آزادی کی تضحیک و تحریف کی ایسی کوشش ہے اور اس میں استعماری نقطۂ نظر کے ایسے نشتر چھپے ہوئے ہیں کہ تاریخ پر نظر رکھنے والے ہر باہوش کے لیے اس تحقیر و خیانت کی مذمت ضروری ہو جاتی ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے بڑی دیانت سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ادیبوں نے فرقہ پرستی کی حمایت نہیں کی۔ لیکن برصغیر کے مخصوص حالات میں فرقہ پرستی کی منفی تنگ نظری کے علاوہ مسلم قومیت کی وہ وسعت یافتہ اثباتی تحریک بھی تھی کہ جس کے جواز کو متعدد غیر مسلم ترقی پسند دانشوروں اور مورخوں نے تسلیم کیا تھا۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی تنقیدی تحریروں میں انسانیت کی بے تعصبی اور توازن کی تلاش کے لیے جو کوشش کی ہے، وہ لائقِ تحسین ہے، لیکن برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی و تہذیبی سعی اثبات کا اعتراف نہ ہونے سے ایک اہم خانہ خالی رہ گیا تھا۔ لیکن "گرد راہ" میں اختر حسین رائے پوری نے اس طرف توجہ کی ہے اور یہ کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں ان کے تہذیبی و تنقیدی تصورات کی پایاں رسیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے مطالعے کے بغیر ان کے فکر کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے انسان دوستی اور دانش افروزی کی روایت کو فروغ دیا ہے۔ وہ انسانی تہذیب و تمدن کے فکری ارتقا کو پیش کرتے اور اپنی تنقید میں علمی بنیادوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ ادب اور تہذیب کی مختلف صورتوں کا سماجی حالات کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔ دراصل ان کی تنقید اردو میں نئے نشاناتِ راہ قایم کرنے کے باوجود عقلیت پسندی کی اس تحریک سے ارتقائی طور پر منسلک ہے جسے سرسید نے رواج دیا تھا اور جس کے اثر سے حالی نے جدید تنقید کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔ یہ حالات کا عقلی تجزیہ ہی تھا جس نے حالی کو خیالات کی مادی بنیادوں کے تجسس کی جانب مائل کیا تھا اور جس کی طرف اردو شاعری میں شعورِ عصر کی آواز یعنی غالب ان سے پہلے اُسے وجدانِ تصوف سے ربط دیتے ہوئے اپنی دانش مندانہ تہہ داری کے ساتھ اشارہ کر گئے تھے کہ "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی"۔ اس میں شک نہیں کہ سرسید اور حالی نے اردو ادب کو وسیع ہم عصرانہ تناظر عطا کیا تھا، لیکن عقلیت کی آواز ہمیں شاہ ولی اللہ کی تحریروں میں بھی ملتی ہے کہ وہ صرف مذہبی مفکر ہی نہیں تھے بلکہ سماجی آفرینش کے نظریے کے منظرِ عام پر آنے سے بھی تقریباً سو برس پہلے اس کی ماہیت کا ایک تصور پیش کر گئے تھے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنے زمانے کی ذہنی تحریکات کے بعض گوشوں کو بڑی دقتِ نظری اور استخراجِ نتائج کے ساتھ پیش کیا ہے، لیکن ان کی تحریروں نے سرسید کی عقلیت پسندی کی روایت سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کی ادبی شخصیت کی تعمیر میں علی گڑھ تحریک کے اجتہادِ فکری اور آزاد منشی کے عناصر کے ساتھ ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک ذہنی رویّے یعنی عملیت پسندی PRAGMATISM کا اثر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ وہاں کے ایک عزیز زندگی یعنی خوش گزرانی کی لہر بھی ملتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے تہذیبی جائزوں میں اختر حسین رائے پوری نے برصغیر کے نسبتاً بعید ماضی کے ان کارناموں کو زیادہ مدِ نظر رکھا ہے جو ہند و تہذیب سے تعلق رکھتے تھے، لیکن علی گڑھ تحریک کی صورت میں وہ مسلم فکر کی ایک عصری جہت سے ضرور متاثر ہوئے تھے اور اس کی آزاد فکری کو اپنے طور پر پروان چڑھایا تھا۔ ان کی ادبی شخصیت کی طراری میں جہاں کلکتے کے ہیجان پرور ماحول نے حصہ لیا تھا اور انھیں معاصر ہندی اور بنگالی ادب کی اضطراب پرور قومیت پرستی کی خصوصیتوں سے آشنا کرتے ہوئے

نے یہ ماضی کی طرف جھکاؤ کے ساتھ ساتھ بعض نئی ذہنی ہل چلوں کا علم بخشا تھا، وہاں علی گڑھ کی وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی روش کو بھی بڑا دخل تھا۔ یہ اثرات ان کی بعد کی تعلیم اور بین الاقوامی ذہنی تحریکات سے شناسائی کے بعد اپنی زیادہ وسیع شکل میں مستحکم ہوگئے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے تنقیدی و تہذیبی تصورات میں روشن فکری کا وہ سلسلہ نظر آتا ہے، جس نے برصغیر کے اندر اور برصغیر کے باہر ترقی کے نئے مدارج کو پیش کیا تھا اور جس سے ان کے ذہن نے واضح اثرات قبول کیے تھے۔ اسی طرح ان کی تحریروں نے خاص طور پر اس طبقے کو متاثر کیا جسے ہم علمی تحصیل یا فنکاری میں حریتِ خیال کی جانب مائل پاتے ہیں اور جسے روشن فکر کہہ کر اس کی تعریف میں یہ اضافہ کیا جاتا ہے کہ اس میں رائے عامہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے۔ مغرب میں اس طبقۂ ذہن کا محرک انقلابِ فرانس اور محرکاتِ انقلابِ فرانس کو کہا جا سکتا ہے کہ جس کے ذریعے سیاسی اور ذہنی بیداری کے تصورات عام ہوئے اور جن کا فیض و اثر صرف فرانسیسی ہیئتِ اجتماعی اور ادب میں ہی نہیں، ایک دنیا میں اب تک جاری ہے۔ اپنی طالب علمی کے دوران ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے زمانۂ قیامِ فرانس میں اس حریتِ فکر سے آشنا ہوئے جو انقلابِ فرانس کی بنیاد ہے اور جس کا حوالہ ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔ انقلابِ فرانس (۱۷۸۹ء) سے پہلے فرانسیسی دائرۃ المعارف جو پینتیس جلدوں میں ۱۷۵۱ء تا ۱۷۷۲ء شائع ہوا تھا اور جس کے مصنفین میں والٹیر، مونٹیسکو، روسو اور دوسرے معروف دانشور شامل تھے، عقلیت پر مبنی فکر کی اوہام و خرافات کے خلاف ایک نئی مہمیز تھی۔ اختر حسین رائے پوری نے انقلابِ فرانس کا سلسلہ بعد کے انقلابات سے ملا کر سیاسی اور معاشی دائروں میں نئے تصورِ انسانیت کے رنگ بھرے ہیں۔ البتہ یہ احساس ہوتا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں میں ذہنی بیداری کے جو چراغ روشن ہوئے تھے، ان کا ماسوائے علی گڑھ ذکر نہیں کیا گیا ہے اور جدوجہد آزادی کے سلسلے میں مسلم دانش وروں اور رہنماؤں کا تحریکِ جہاد سے لے کر تحریکِ قیامِ پاکستان تک جو حصہ رہا ہے، اس کا اپنے عہد کی تہذیبی سیاسی بصیرت کے ساتھ رشتہ قائم کرنے میں متعدد درمیانی مسافتیں باقی رہ گئی ہیں۔ مثلاً شبلی کے فکر کی سیاسی حریت پسندی اور ہم عصرانہ استدلالیت کو نظر انداز کر کے صرف یہ کہنے پر اکتفا کی گئی ہے کہ "مسلمانوں کے ذہنی جمود اور رجعت پروری کی بہت بڑی ذمے داری مولوی شبلی پر عاید ہوتی ہے۔"

اختر حسین رائے پوری مسلم اکابر کی دوبارہ ذہنی بیداری کی مشعلوں کے روشن کرنے کا ذکر کرتے ہوئے اکبر کی مذہبی رواداری کی تحریک کا جو دینِ الٰہی کہلائی، اور سر سید احمد خاں کی معتزلہ کی روش پر اسلام کی عقلی تفسیر کا نام لیتے ہیں۔ حالانکہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی برصغیر میں مسلمانوں کے مستقبل کے خدشے کو پہلی بار فکر عطا کرتے ہیں اور ان کی یہ فکر اس دینِ الٰہی کی ضد کی حیثیت رکھتی ہے جسے اختر حسین رائے پوری سراہتے ہیں۔ چنانچہ اسے وہ اپنے نقطۂ نظر سے رد بھی کر دیں تو شاہ ولی اللہ کی تحریک تو کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس میں وسیع تعقل کی کارفرمائی ہے اور اس کے اثرات مابعد بھی ذہنی بیداری ہی نہیں، حریتِ عمل کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ ایسی ذہنی مسافتوں کے باقی رہ جانے کے بعد بھی مجموعی حیثیت سے اختر حسین رائے پوری کی تنقیدی تحریروں میں، ادب ایک زندہ حقیقت اور ایک تہذیبی قوت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں ذہنی طور سے اپنے دور کی سرگرمیوں سے وابستگی کے ساتھ ساتھ ان کے مشاہدے اور معلومات کی وسعت کا جو نقش ابھرتا ہے، وہ خود زندگی کا نشان بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تنقید کی ایک بڑی خصوصیت اس کی ذہنی پختگی اور بالیدگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید

تحریریں وسیع اثرات چھوڑ سکی ہیں۔ وہ ادب کی حقیقت کو پیش کرتے ہوئے، زندگی کی حقیقت کو جس انداز سے نمایاں کرتے ہیں اس میں صورتِ حال کے ابلاغ کے ساتھ خود ان کی بالغ نظری کا احساس ہوتا ہے اس بالغ نظری میں ادب کے گہرے یا تفصیلی مطالعے، فکری تحریکوں اور تہذیبی روایتوں کے تعبیر و تجزیے اور ادبی شاہ پاروں کے تقابلِ صورت اور تعینِ قیمت سے زیادہ ذہن کی تیزی اور فکر کی دراکی کی اس جمع آوری کو دخل ہے، جس سے ان کی عصری صداقت پر گرفت مضبوط رہتی ہے۔ وہ ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر اجتماعی اور عمومی صورتِ حال کا نظارہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کی نظر مہماتِ انسانی پر رہتی ہے، معمولات کی بند گلیوں میں نہیں بھٹکتی۔ اسی لیے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تنقیدی تحریریں کسی خطۂ تہذیب کے انجماد و انحطاط کو مرکز بنانے کے بجائے وسیع تر انسانی تہذیب کے تحرک و تبدل کو پیش کرتی ہیں۔ زندگی کی ارتقا پذیری کا تصور رکھنے کے باوجود بعض نقاد لفظوں کے پیچوں یا محدود تصوراتی خولوں میں ایسے بند ہو جاتے ہیں کہ ان کی تحریریں معنوی گیاہِ سنگ شدہ یا لفظی تحجر کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اسی طرح بعض نقاد اپنے پیدا کردہ اندھیروں میں یوں بھٹکتے ہیں کہ باہر کی روشنی مسدود ہو جاتی ہے۔ ایسے نقاد کوئی سلسلۂ روش قایم نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف تہذیب کی ترقی خواہی اور نظر کی رسائی کے درمیان تعلق قایم رکھنے والے نقادوں نے عام طور پر اپنی فکری حرکت سے دوسروں کی فکر کو حرکت بخشی ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تنقید نگاری کے پیچھے جس سماجی حرکت اور ذہنی تگ و دو کی جھلک ملتی ہے وہ اسے کوشش تنہا نہیں رہنے دیتی۔ ان کی فکر نے ادبی افکار کو متاثر کیا ہے اور نئی ذہنی مملکتوں کا علم بخشا ہے اگرچہ خود جہانِ تازہ کی تخلیق کم کی ہے۔ شاید اس لیے کہ ان کی تنقید ذہنی ہل چلوں کو تو پیش کرتی ہے لیکن اس میں کسی بڑے یا گہرے ذہنی اضطراب کی کرب سامانی نہیں ملتی کہ یہی کرب و اضطراب تنقیدی فکر کو اپنے دور کے پرکھنے کا آلہ ہی نہیں خود دور آفریں بنا دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اختر حسین رائے پوری اپنے دور کی ہل چلوں کو بھی نسبتاً ذہنی آسودگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی تنقید حرکت و ادب کو باہمی ربط تو عطا کرتی ہے، ذہن کو نئے وسائلِ حرکت نہیں فراہم کرتی۔ اس ربط کو وہ خبر دادگی کا آلہ تو مانتے ہیں اس سے نئی حسیت کی تراوش کا کام نہیں لیتے۔ وہ عصرِ حاضر کے میدانِ کارزار میں خود سلحشوری کے جوہر دکھانے سے زیادہ برشِ تیغِ عصر کا نظارہ کراتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی تنقید کی بڑائی اور خوبی یہ ہے کہ اس میں حرکت کے تصور نے تہذیبی ارتقا کو موضوعِ نظر بناتے ہوئے ادبی فکر اور سماجی فکر کو نقطۂ اتصال فراہم کیا ہے۔ وہ ہجوم حرکت کے تماشائی نہیں بلکہ اس کے شارح و ترجمان ہیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ان نقادوں میں سے ہیں جو اپنے نتائجِ فکر کو ادراکِ احوال اور بصیرتِ تہذیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس ادراک و بصیرت سے صرف سماجی عوامل کا مطالعہ ہی مقصود نہیں بلکہ اس میں سماجی ارتقا کا شعور، قومی زندگی کے مختلف تہذیبی سلسلوں کا علم، انسان دوستی کا تصور، اور ثقافتِ ذہنی کی وسیع تر واقفیت بھی شامل ہے۔ ان ہی خصوصیات کے کم و بیش استفادے سے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی تنقید کو موثر اور کارگر بنایا ہے اور اس کا اثر اردو کی تنقیدی فکر پر بعض دوسرے نقادوں کے مقابلے میں زیادہ گہرا اور دیرپا ثابت ہوا ہے۔ مثال کے طور پر نیاز فتح پوری اپنی قاموسیت، اپنی اسلوب تراشی، اپنے تفہیم شاعری، اپنی کالبد فہمیٔ شعر، اپنے شیوۂ جمالیات اور اپنی تاثر انگیزیٔ خیال کے باوجود اردو تنقید پر وہ اثرات مرتب نہ کر سکے جو اختر حسین رائے پوری کو نصیب ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ کبھی اپنے فکر کی ایک سطح پر ماحول کی غیر خردمندانہ روش کے خلاف نبرد آزما رہے، لیکن اس فکر کو وہ بڑی حد تک اپنی تنقیدی تحریروں سے الگ رکھتے ہیں۔ اسی طرح احمد علی اپنی انگریزی ادب سے گہری واقفیت، اپنی تخلیقی فطانت، اپنے محاکمۂ معاشرت، اپنی تیز و طرار ذہانت، اپنی محاورہ دانی، اپنے استفادۂ تجدد، اپنی روایت شکنی اور پھر ترقی پسند تحریک کے

پیش رووں میں اپنی شمولیت کے باوصف اردو تنقید کو وہ تہذیبی بصیرت نہ فراہم کر سکے جس سے کام لے کر اختر حسین رائے پوری نے اپنی تحریروں کو مزاجِ عصر سے ہم کنار کیا اور جس کے ذریعے زندگی کی حرکت و کش مکش کو ادبی آگہی کا وسیلہ بنایا ہے۔ لیکن اختر حسین رائے پوری کی آغاز کردہ تنقیدی فکر میں نئے اضافے ہوئے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین نے فکری رجحانات کو تاریخی عوامل سے مربوط کر کے اسالیب اظہار اور تخلیقی کیفیات کی نئی گرفت کی ہے۔ ان دونوں نے ادب کی تہوں کو کھنگالا اور بیش قیمت موتی دریافت کیے ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریروں نے ادب شناسی اور انسان دوستی کی روایت کو ایک دوسرے کا ترجمان بنا کر اس تہذیب فکر کو آگے بڑھایا ہے جو مجموعی انسانی زندگی کے مفہوم و مدعا کا حق ادا کرتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین کی تنقیدی تحریریں ادب کو سماجی معنویت عطا کرتے ہوئے تہذیبی تصورات کی جن فراخیوں کو پیش کرتی ہیں، ان کی باہم دیگری اور ترکیبی صفات سے ان کی تحریروں کو متعدد اور متنوع سمتوں میں وسعت و توانائی ملی ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ادب اور زندگی کے رشتے کو استوار کیا ہے۔ وہ زندگی کی انقلابی تبدیلیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ادب میں بھی تبدیلی کے خواہاں رہے ہیں۔ اس تبدیلی کی مختلف صورتوں اور ان کے پیچ در پیچ سلسلوں کا بعد میں زیادہ گہرا اور سیر حاصل جائزہ لیا گیا، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ضمن میں تاریخی اعتبار سے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو پیشوائی کا شرف حاصل ہے۔ ان کے ادبی مطالعات میں زندگی کی بصیرت جھلکتی ہے۔ وہ زندگی اور ادب کے مقاصد کی یک جائی پر زور دیتے ہیں۔ وہ ادب کو جذبات کا ترجمان مانتے ہوئے بھی تہذیب و تمدن کے تقاضوں، سماجی مطالبوں، اجتماعی صداقتوں، ماحول کی ضرورتوں اور انسانی آرزومندیوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ بدلتی ہوئی زندگی کے مظاہر سے ادب میں تبدیلیوں کا رشتہ جوڑتے اور ادبی تخلیقات میں اپنے زمانے کی تہذیب کا عکس دیکھتے ہیں، لیکن وہ ادب کے صرف عکس بننے پر راضی نہیں بلکہ اسے زندگی کے مقاصد کا آلۂ کار جانتے ہیں اور ادبی حقیقت کی تلاش فکر کی بھول بھلیوں میں نہیں، انسانی ضرورتوں کے دائرے میں کرتے ہیں۔ چنانچہ ادب کے مقاصد کی تفتیش وہ سماجی ارتقا کے واسطے سے کرتے اور ادب کو زندگی کا پیش رو بنانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ وہ ادیب کو فرار نہیں ذمے داری کا سبق سکھاتے ہیں۔ اپنے ان ہی نظریات کی روشنی میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے بعض قدیم و جدید ادبی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن قدیم ادب پر نظر ڈالتے ہوئے وہ سماجی ارتقا کے تاریخی مراحل کو نظر انداز کر کے جو نتائج نکالتے ہیں، اُن پر بحث کی بہت گنجائش ہے۔ اس طرح جدید دور کے ادب سے بحث کرتے ہوئے وہ عموماً ایک رُخ کو اس طرح مرکزِ توجہ بنا لیتے ہیں کہ دوسرے سب رخ فراموش ہو جاتے ہیں۔ مثلاً قدیم سنسکرت ڈراما مرچھ کٹکا کو وہ ان ڈراموں کے زمرے میں رکھتے ہیں جو بد اخلاقی، اوباشی اور جنسی فسادے بھرے پڑے ہیں۔ اس ڈراما MRCCHA KATIKA یا مٹی کی چھوٹی گاڑی کے مصنف کے بارے میں تحقیق نے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا ہے، لیکن اسے ڈرامے کے جدید نقاد قدیم ہندی تہذیب کے شاہکاروں میں شمار کرتے اور اسی کے پیمانے سے اُس کی صفات کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اسی طرح جدید اردو ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اختر حسین رائے پوری نے لکھا ہے کہ:

"سجاد حسین اور مہدی حسن جیسے آزاد خیال ادیب بھی عورت کو شہوت رانی کا آلہ سمجھتے ہیں۔"

یہاں حقیقت کو زیر و زبر انداز میں پیش کیا گیا ہے کیونکہ سجاد حسین اور مہدی حسن کی رومانی جمالیات، اپنی لذت انگیز تصویر کشی کے باوجود عورت کی مورت کی طرح پرستش کی قائل ہے۔ اس کے مقابلے میں منقلب فیصلے کی مثال یہ ہے کہ وہ عورت سے متعلق شرافت کے رومانی تصور کو بنظر پسندیدگی دیکھتے ہوئے زہر عشق کے رچے ہوئے گہرے اور سچے جذبے پر اختر شیرانی کے رومانی اُبال کو ترجیح دیتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ "اختر شیرانی نے عورت کو مخاطب کر کے مجازی عشق کو شرافت کی وہ سند دلائی، جس سے زہرِ عشق کا شاعر محروم رہ گیا تھا۔"

ان کی یہ تنقیدی جسارت قابل تعریف ہے کہ وہ اساطیر اور افسانہ ہائے تاریخ قدیم پر بے جھجک حملے کرتے ہیں۔ اسی طرح جدید ادب کے بعض رجحانات پر بھی ان کے وار کارگر ثابت ہوئے ہیں۔ اگر ادبی تخلیقات کے بارے میں ان کے فیصلوں کو تخلیقی قدر و قیمت کی پرکھ سے زیادہ بعض ادبی تصورات کی تنقید سمجھ لیا جائے تو ان کی فکر انگیزی میں کوئی کلام نہیں رہتا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تحریروں میں جو وضاحت اور اظہارِ خیال کی قوت ملتی ہے، ان سے اردو تنقید آگے بڑھی ہے۔ وہ آج اور کل کے فرق کو بڑی صراحت سے مستقبل کے تصور کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کی تنقیدوں نے بدلتی ہوئی دنیا کا علم بخشا اور ادبی رجحانات پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ فرسودہ تصورات کی تردید کرتے ہوئے فکری تطہیر کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں اور زندگی کی حرکت پر مبنی افکار کی تائید کرتے ہوئے عصری ترقی خواہی کو آئینہ دکھاتے ہیں، لیکن خود ادبی صورتوں میں جو لفظ و معنی کے اسرار، ترتیب و بے ترتیبی کے توازن، حسیات کی مختلف تہوں کے اظہار، حال و ماضی کے رابطوں کی نئی دریافت، ذہنی تجربے کی انفرادی و امتیازی صفات، متوازی اور متنوع خطوط کے تقابلی مناسبات، تاریخی ارتقا کے ساتھ مثبت و منفی کے متغیر تلازمات اور خود تخلیقی قوت کے جذب و توسیع یا ارتسام و استعداد کے حوالے اور امکانات موجود ہیں، ان کی طرف کم توجہ کی ہے۔ ادب بدلتی ہوئی دنیا کی تعبیر ضرور ہے لیکن اس میں عصر و ماورائے عصر دونوں کی جھلک ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی ادبی تخلیق کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ادب میں رونما ہونے والے سماجی شعور کی مختلف سطحیں سماجی ارتقا کے تاریخی عمل سے وابستہ ہیں اور کل پر آج کا فیصلہ عائد نہیں کیا جا سکتا۔ پھر گرد و پیش کی دنیا کے ساتھ ساتھ ادب انسانی زندگی کی ان جہتوں کو بھی پیش کرتا ہے، جو مختلف ادوار و حالات اور مختلف تہذیبی سمتوں میں متوازی خطوط بناتی ہیں۔ اس کے علاوہ ادبی صورت خود ایک دنیا ہے کہ ادیب کی شخصیت سے واسطہ رکھتے ہوئے وہ لفظ و خیال کے سایوں اور حسیات کی پرچھائیوں کے ساتھ اپنے عصر سے تعلق قائم کرتی اور دوسری ادبی صورتوں کے ردّ و قبول سے اپنے قوانین آپ وضع کرتی ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اس دنیا سے کم سروکار رکھا ہے۔ وہ ادبی رجحانات کا مطالعہ سرور کرتے ہیں، لیکن اکثر اس تفصیل کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ جس کے تحت ہر ذہنی ترتیب ایک الگ نظام کی حیثیت رکھتی ہے، جس کا تعین تجزیہ سماجی اثبات و نفی کا تعین کرتا ہے۔ وہ ادب کے بوستانوں پر نظر ڈالتے ہیں لیکن الگ الگ درختوں اور ان کے پھولوں یا پتیوں تک بوموسموں کی رنگ آمیزی یا تخلیقی ادیب کی کارفرمائی ہے، اسے فراموش کر دیتے ہیں۔ ادب کی منطق سماجی منطق کا حصہ ہوتے ہوئے بھی حقیقت کے متنوع بلکہ بعض اوقات متضاد سلسلوں کی آئینہ داری کرتی ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنے فیصلے سماجی ترقی کی آگہی کے سپرد کرتے ہوئے، اس آگہی کے تحت اشیا کے نئے رابطوں کی آگہی کو کہ الفاظ اور حسیاتی پیکر بھی اس کا حصہ بن جاتے ہیں، اس کا صحیح حق نہیں دیا ہے۔ ادب کی دیوانگی بھی اس آگہی کا جزو ہے۔ جس آگہی میں حقیقت کی رسائی کے ساتھ نارسائی کی تڑپ نہ ہو اور جس صورتِ اظہار میں خطاب و خود کلامی کے علاوہ موجودات کی صدائے خفیف سرگندہ نہ ہو اس کے سوز و تاثیر میں ضرور کمی رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ادبی آوازوں کو سماجی حرکت کا نقیب تو بنایا ہے لیکن ان آوازوں کے تلاطم اور ان کے آہنگ کی نازک کیفیتوں کو اپنی بارگاہِ سماعت میں اذنِ باریابی کم عطا کیا ہے۔ وہ ایک نئے سماجی شعور کے بہت بڑے شارح اور بہت محتشم مفسر ہیں۔ انھیں ایک نئے تہذیبی سفر کا اولین پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ ان کی تنقیدی فکر سے پیش قدمی کی راہیں روشن ہوئی ہیں، لیکن جہاں تک عملی تنقید کا تعلق ہے، ان کے تنقیدی فیصلوں سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض فیصلے محدود منطق اور تنگ منطقہ ہائے خیال پر محتوی ہیں۔ ان کی ستائش اور نکتہ چینی دونوں میں کہیں کہیں جوشِ دلم کی

کارفرمائی ہے۔ مثلاً اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نذرالاسلام کی شاعری سے اردو دانوں کو متعارف کرانا ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ شاعری نئی جسارت و قوت کی حامل ہے لیکن اختر حسین رائے پوری نے اس شاعری کے مترنم آہنگ اور جذباتی خطابت کے لیے جو مداحانہ ستائش و تحسین اختیار کیا ہے اس میں توصیفی کلمات کی فراوانی سے منظر علمی بحث آلودہ ہو گیا ہے۔ ان کی پُرجوش وکالت اور ان کے ترجموں کی خوبی نے اردو میں نذرالاسلام کو اُس کے صحیح مرتبے سے کہیں زیادہ بڑے شاعر کی حیثیت سے معروف کیا اور بعض سے تو یہاں تک کہلوا دیا کہ ہندوستان کی کسی زبان میں اس قیامت خیز قوت کا کوئی شاعر نہیں پایا جاتا۔ اس کے بعد عکس ٹیگور کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے تنقید کے عادلانہ تقاضوں کو پورا نہیں کیا ہے اور اس کی تعریف کرتے ہوئے بھی تنقیدی توازن کی میزان کو مرتعش کر دیا ہے مثلاً اس کی نظم سونار تری (سنہری کشتی) کے بارے میں ان کا یہ خیال کہ "ایسی سیدھی سادی نظم میں لاکھ سر مارنے پر بھی کوئی بات نظر نہ آئی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس مشہور و معروف نظم میں نہ تصوف کے نکات ہیں نہ روحانیت کے رموز" اسی ارتعاش کا عکس ہے۔ ورنہ خود اس کے ترجمے سے بھی روشن ہو جاتا ہے کہ یہ نظم ساری عمر کی ریاضت کو روحِ آفاق کی نذر کرتے ہوئے ٹیگور کی دوسری نظموں میں بھی موجود کشمکش فانیت و لافانیت کا عنوانِ جلی ہے۔ پھر اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے جس مناظرانہ حجت سے کام لیا گیا ہے، اس کا شعری منطق سے علاقہ کم ہے۔ اسی طرح ان کا ایک عجیب بیان یہ ہے کہ "وطن پرستی کے نقطۂ نظر سے اردو نے جو سب سے بڑا شاعر پیدا کیا، وہ مسلمان نہیں بلکہ ایک ہندو یعنی برج نارائن چکبست آنجہانی تھے۔" حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری جوش اور جوش کی وطن پرستانہ شاعری کو کیسے نظر انداز کر گئے کہ چکبست کی شاعری کے مقابلے میں کہیں زیادہ برتر و خوب تر ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنے ممدوح نذرالاسلام کا حریف سمجھ کر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ٹیگور اور جوش دونوں کے ساتھ نسبتاً بے اعتنائی سے پیش آئے ہیں، حالانکہ دونوں نذرالاسلام سے بڑے شاعر ہیں۔

اردو کے نقادوں میں اختر حسین رائے پوری کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ معاصر اردو ادب کا جائزہ لیتے ہوئے وہ ہندی، بنگالی اور دوسری علاقائی (زبانوں) کی تخلیقات سے بھی واقفیت رکھتے اور باہمی اثر و تعلق کو پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ مسدسِ حالی سے تحریک پا کر بابو میتھلی شرن گپتا نے "بھارت بھارتی" کے عنوان سے ہندی میں جو نظم لکھی تھی اور اپنے اسلاف کا ذکر کر کے زمانۂ حال کی زبوں حالی کی جو تصویر کھینچی تھی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اسے بیان کرتے ہوئے دونوں نظموں کے سماجی محرکات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بعض تنقیدی جملے وسیع تہذیبی شعور کے حامل ہوتے ہوئے مختصر اور پُرمعنی ہیں۔ مثلاً جب وہ کہتے ہیں کہ "علی گڑھ تحریک درحقیقت نئی تہذیب کی فتح کا اعتراف تھی" تو وہ ایک تاریخ ساز مرحلے پر تہذیبی اقدار کے احوالِ تصادم کو پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری موجودہ صنعتی تہذیب کے تضادات سے پوری طرح واقف ہیں۔ یہ تضادات جہاں ایک جانب فرار، ماضی پرستی، عقل دشمنی اور مسلکِ درویشی کی جانب لے جاتے ہیں، وہاں برتر قومیت کے فاشستی رجحان کو بھی جنم دیتے ہیں اور اطالویوں میں قدرت کی طرف سے دنیا کے نام ایک خاص پیغام کے تصور، جاپانیوں میں برگزیدہ بندہ ہونے کی فکر اور جرمنوں میں خدا کی بہترین مخلوق ہونے کی سوچ کو بھی پروان چڑھاتے ہیں۔ سڈنی ہوک SIDNEY HOCK نے اپنی کتاب استدلال، سماجی اساطیر اور جمہوریت REASON, SOCIAL MYTHS AND DEMOCRACY میں فاشزم کے حوالے سے کہا ہے کہ "یہ سچ ہے کہ اٹلی اور جرمنی کا انقلاب فرانس کے آدرشوں کے خلاف مخالفِ انقلاب احتجاج ہے۔" ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے بھی اپنی دونوں تصنیفات میں جمہوریت کی بنیادیں انقلابِ فرانس کے ذہنی علم بردار روسو کی تحریروں میں تلاش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس آوازِ حق کے برپا کردہ ذہنی انقلاب کے جلو میں جمہوری آئین کی جدوجہد شروع ہوئی۔ موجودہ تہذیبی تضادات نے دنیا کو عالمگیر جنگوں کی ہلاکت میں ڈالا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تنقیدی تحریریں ادبی رجحانات میں ان تضادات کا معروضی تجزیہ کرتی ہیں۔ البتہ ان کا

رویہ ٹیگور کی طرف منصفانہ نہ سہی ہمدردانہ ضرور رہے، لیکن اقبال کے ذکر میں ہمدردی کا یہ عنصر کم ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اردو شاعری کے شہری مزاج کی طرف صحیح اشارہ کیا ہے اور اس کی بعض خصوصیتوں کا تہذیبی دقت نظر سے جائزہ لیا ہے، لیکن ۱۸۵۷ء کے واقعات کے پس منظر میں داغ کے شہر آشوب اور غالب کے خطوط کو دیکھ کر ان کی رجعت پر درانہ فکر پر سرپیٹ لینے کا جو تاثر پیش کیا گیا ہے، وہ ان دونوں کے یہاں نظمِ زندگی کی برہمی کا جو غم اور ایک تہذیب کی بربادی کا جو ماتم ملتا ہے، ان کی رنگ آفرینی کو نظر انداز کرکے، ادبی حقیقت کے ایک ہی رخ کا بیان ہے۔ اس طرح ان کا یہ فیصلہ بھی حقیقت سے بہت دور ہے کہ "کالی داس، کبیر، نظیر اور غالب وغیرہ کے سوا شاید کوئی ایسا شاعر نہیں جسے مستقبل کا انسان عزت سے یاد کرے گا۔" اس بیانِ عمومی میں وغیرہ کا استعمال بھی محلِ نظر ہے۔ اردو شاعری میں عورت کا تخیل پیش کرتے ہوئے ان کا تجزیہ اتنا میکانکی اور یک طرفہ رہتا ہے کہ اسے تنقید سے زیادہ طنز یا استہزا کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے بنگالی اور دوسری زبانوں کی تحریروں میں ہندو نشاۃ ثانیہ اور قدیم ہندو تہذیب کی نئی زندگی کو کارفرما پایا ہے، لیکن سماجی ارتقا کے تصور کے باوجود وہ ہندوستان کا سب سے بڑا ناول نگار شرت چندر چٹرجی کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ہندو قومیت کے احیا کا ذکر کرتے ہوئے اختر حسین رائے پوری نے ادب میں اس رجحان کی مسلم دشمنی کے کردار کو فراموش نہیں کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "جب ہندوؤں کے خفتہ جذبۂ قومیت میں ہیجان پیدا ہوا تو شیواجی اور درگا داس جیسے سورماؤں کے ساتھ بھوشن اور رام داس جیسے شاعر پیدا ہوئے، جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں بڑا اشتعال پھیلایا۔ پچھلے دنوں جب اس ملک میں ہندو مسلم فساد کی آندھی امڈی تھی تو یہ دونوں شاعر قبر میں کروٹ بدلنے لگے تھے۔"

اردو زبان کے مستقبل میں بھی اس لسانی تنازعے کی جھلک ملتی ہے جس نے ہندو قومیت اور مسلم قومیت کی دوران نہروں کو دو الگ تہذیبی قوتوں میں بدل دیا تھا۔ اس پس منظر میں اختر حسین رائے پوری کا یہ فیصلہ کہ ہندی زبان کو روزافزوں مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور اردو میں عوام کے لیے زیادہ کشش نہیں رہی، درست نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ جن حلقوں میں اردو کی عدم مقبولیت کا ذکر کر رہے ہیں، وہ وہی حلقے ہیں جن میں ہندو قومیت ہی نہیں، ہندو احیا پرست کا رجحان پوری شدت سے کارفرما تھا اور جو اردو ہی نہیں مسلم تہذیب سے وابستہ ساری علامتوں کو مٹا دینے کے درپے تھے۔ اس لیے ان کا یہ کہنا بھی کہ اردو اور ہندی کا جھگڑا دراصل ناگری اور اردو رسم الخط کا جھگڑا ہے، مسئلے کو ضرورت سے زیادہ سادہ بنا کر پیش کرنا ہے کیونکہ اس کے پیچھے جو متصادم تہذیبی قوتیں کام کر رہی تھیں، ان کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ جھگڑا تو اس اختلاف و تصادم کی علامت بن گیا تھا جس کا میدان عقائد و تصورات سے لے کر سیاسی مقاصد اور جدوجہد کی صورتوں تک پھیلا ہوا تھا۔ البتہ اختر حسین رائے پوری نے اردو رسم الخط کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ یقیناً فکر پرور ہیں کہ رسم الخط میں اصلاح کی آواز میں تو برابر اٹھتی رہی ہیں لیکن اختر حسین رائے پوری نے لسانیات اور سماجی شعور کو ایک دوسرے سے منسلک کرکے سماجی لسانیات کا تصور پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی ہمیں آگے بڑھا رہی اور ہماری زبان ہمیں پیچھے ہٹا رہی ہے اور بہت صحیح نتیجہ نکالتے ہیں کہ اردو کے مستقبل کا مدار اس پر ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو کیا دے گی اور کس شکل میں دے گی۔ وہ موثر اصرار سے کہتے ہیں کہ "ہمارا تمدن دھ کی ٹانگ سے بندھا ہوا ہے۔ جو تمدن چند حرفوں کی تبدیلی سے مجروح ہو سکتا ہے، اسے جینے کا کوئی حق نہیں۔"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری برصغیر کی تہذیبی اور سیاسی صورتِ حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے تہذیبی مظاہر کے جداگانہ دھنوں میں تفریق کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ "ہندو مسلم نفاق دو مختلف تہذیبوں کی کش مکش ہے۔" لیکن اس کشمکش میں مسلم تہذیب کی انبائی جد و جہد نے تصورِ پاکستان کے لیے زمین ہموار کی تھی۔ اسی طرح ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ادب کے سماجی

رشتوں کا ادراک کرتے ہوئے سرشار اور نذیر احمد کے ناولوں میں سامنتی تمدن کی پستی کے دور کا نقشہ تو دیکھا ہے' لیکن نئی زندگی کے خاکوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ البتہ ان کے تصورِ تہذیب کی پختگی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ انگارے کو، جسے ترقی پسند تحریک میں پیش قدمی کا درجہ دیا گیا تھا، منافقت کے خلاف احتجاج تسلیم کرتے ہوئے بھی اس ذہنیت کا آئینہ دار بتاتے ہیں جو روح یا پیٹ کی طرح مخصوص طور پر جنس ہی کو واحد شعبۂ زندگی قرار دیتی ہے۔ ادبِ جدید کی ضرورت پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے بڑی خوبصورتی سے ادب میں رفت پسندی، خواب آوری، ہوس پرستی، مسلکِ طرف داریٔ زناں (جسے وہ زن مریدی کہتے ہیں) اور مریضانہ رومانیت کا ذکر کیا ہے۔ وہ ان رجحانات کے خواہاں پولیس کے پنشن خوار داروغاؤں، دین کو آڑ بنانے والے دنیادار مولویوں اور تعلیم زدہ لڑکیوں کے گروہوں کی نشاندہی سے نئی تہذیبی گمراہی کی تصویر کشی مکمل کر دیتے ہیں۔ وہ ادبِ جدید کو تعصبات سے پاک، ستم رسیدہ انسانیت کا ترجمان، ظلم سے دشمنی رکھنے والا، ترقی کے دشمنوں کا دشمن، زندگی کا مبلغ اور ذہنی انقلاب کا داعی بنانا چاہتے ہیں۔ وہ ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم بتاتے ہوئے ادب کو ایک سماجی ترجمان مانتے ہیں اور انسان کی مادی ضروریات اور اخلاقی مطالبات دونوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس لیے وہ ادب کے لیے صرف حقیقت پسندی کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس میں حقیقت کے تصور کی آمیزش بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی طرح وہ نری قوم پرستی کے بھی قائل نہیں بلکہ اسے اخلاق اور تہذیب کی اقدار کا پابند بنانا چاہتے ہیں اسی لیے وہ ادب اور عام زندگی کے تعلق پر زور دیتے ہیں۔ وہ اردو ادب کو دوسرے ادبیات کی آوازوں سے آشنا کر کے وسیع النظری کے رجحان کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے جن رجحانات کا جائزہ لیا ہے آج بھی ان کا مطالعہ ادبی فکر کے بعض گوشوں کو سمجھنے میں ہماری معاونت کرتا ہے۔ چنانچہ صرف دکھ کو طائفہ اور فعل کو ہیڈ ماسٹر سمجھنے کا رجحان خود آج کے اردو ادب میں زبان و بیان کے مانے ہوئے اصولوں سے انحراف کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ان رجحانات کا مطالعہ کرتے ہوئے محض تبلیغی نقطۂ نظر کو کافی سمجھا اور تہذیب کو حد بندیوں سے بالاتر تمام بنی نوعِ انسان کی میراث بنانا چاہا ہے۔ وہ نظامی، باقی، صور اسرار ادب کی ان خوبیوں کو سراہتے ہیں' جن میں آزادی کی روح جھلکتی ہے اور جو ہیئتِ اجتماعی کی عکاسی کرتے ہوئے بھی جماعت کے جبر سے آزاد ہیں۔ جنگ اور ادب کے موضوع پر لکھتے ہوئے وہ ادبی تنقید کو دادِ سخن اور دادِ تحقیق کی حد تک محدود رکھنے کے حق میں نہیں بلکہ زبان و ادب کے ساتھ ساتھ خود تہذیب کے مستقبل کا سوال بھی اٹھاتے ہیں۔ وہ دو دنیاؤں کے غالب رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے تیسری طرف یعنی نوآبادیوں کے ادب پر بھی نظر ڈالتے ہیں کہ یہ ادب عافیتِ خلوت اور تصرف کے رنگ محلوں سے نکل کر زندگی سے روشناس ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ فاشزم ان تمام قدروں کا مخالف ہے' جن کے جبر سے ہمارے کلچر، آرٹ اور ادب کی تخلیق ہوئی ہے۔ وہ بہت صراحت سے کہتے ہیں کہ فاشزم اور کلچر میں بنیادی تضاد ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اپنی وسعتِ نظر سے فاشزم کو محض ہٹلر اور مسولینی سے منسلک نہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "جب تک انسانیت کو سرمایہ داری اور سامراجیت کا روگ لگا ہوا ہے، فاشزم کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہے گا۔"

اختر حسین رائے پوری جدت کو پسند کرتے ہوئے بھی کہتے ہیں کہ "ترقی پسندی اور ہر قسم کی جدت پسندی کو ہم معنی سمجھنا صریحاً غلط ہے۔" چنانچہ اردو ادب کے جدید رجحانات سے بحث کرتے ہوئے' وہ اس کے اچھے اور برے پہلوؤں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ وہ فکرا مشاہدے کی کمی کو اس کا عیب اور تنقید کی صلاحیت کو اس کی خوبی بتاتے ہیں۔ نظمِ معریٰ اور نظمِ آزاد کے بہروپ میں جو رومان پسندی منظرِ عام پر آئی ہے' وہ اسے ہمارے مسائل کی طرف توجہ کرنے میں جھجکتا ہوا پاتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں اختر حسین رائے پوری نے جن تنقیدی اور تہذیبی تصورات کا اظہار کیا ہے' وہ تاریخ میں حرکت کے عمل کو روشن کرنے کے ساتھ ساتھ خود اس حرکت کا رخ انسان

زندگی کی بہتری کے لیے متعین کرنے کی کوشش سے روشنی پاتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری قدیم وجدید ادبیات میں حیاتِ تہذیبی کے معنوی سرمائے کا اپنی تنقیدی فکر کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کالی داس کے شاہکار شکنتلا میں قدیم ہند کی تہذیبی زندگی کی عکاسی دیکھتے ہیں تو اس کے فنی قیود اور ذہنی مزاج کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ سنسکرت ڈرامے کے پس منظر میں وہ برہمنوں اور راجاؤں کی حکمرانی پر نظر ڈالتے ہیں۔ وہ پریم چند کے ناولوں کو نئے دور کی مساوات اور آزادی کے تصورات کا علم بردار ٹھہراتے ہیں اور گورکی کی آپ بیتی میں نئی دنیاؤں کی تلاش پاتے ہیں۔ اگرچہ رتن ناتھ سرشار نے بعض نسائی نوعی کرداروں یعنی بیگمات سے بھٹیاریوں تک کی کامیاب مرقع کشی کی ہے، لیکن وہ اسے عورت کے بیان میں گم صم ہی دیکھتے ہیں اور قصہ کہانیوں کی پریوں سے لے کر جدید افسانوں کی عورت تک کا طویل سفر چند اہم نسوانی نمائندوں سے ملاقات کیے بغیر طے کر جاتے ہیں، لیکن انسانی مسائل سے چشم پوشی کو روا نہیں رکھتے۔ ہر صورت میں وہ مزاج کی مخالفت کرنے اور ہر اس احتساب کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں جو "حقیقتِ تہذیب اور ترقی کی آواز کو مسوسنا چاہتا ہے۔" اختر حسین رائے پوری کی تنقیدی تحریروں میں تہذیب اور ترقی کے تصورات میں بھی حرکت وارتقا کی کارفرمائی ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ان کی فکر شگفتہ، رواں، واضح اور موثر پیرائے میں ادا ہوئی ہے، جس میں طرزِ انشا کی لطافت و رنگینی بھی موجود ہے۔ مثلاً "اب شمع پر پروانے بھی کم آتے ہیں کہ آگ کی جگہ بجلی آگئی اور خرمن پر برق بھی کم گرتی ہے کہ اس پر برقی سلاخ نصب کر دی گئی ہے۔" اور "جب اردشیر اپنی محبوبہ کی رفتار کا بیان کرتا ہے تو الفاظ گھنگھرو بجانے لگتے ہیں اور جب اس کی گفتار کا ذکر کرتا ہے تو بندشیں اتنی سست و سبک ہو جاتی ہیں گویا پھول جھڑ رہے ہیں۔"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تازہ کتاب "گردِ راہ" خود نوشت بھی ہے اور اسے ان کے تنقیدی اور تہذیبی تصورات کا تتمہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ دنیا کے مادی احوال میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اس نے ذہنی حالتوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ لیکن یہ تبدیلیاں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوئی ہیں جن میں مثبت و منفی رجحانات اور ان کے مختلف امتزاجات کے ساتھ ساتھ روایاتِ فکر میں تصحیح و تصحیف کے علاوہ خود ادیبوں کے خیالات میں وسعت طلبی اور ترمیم پسندی دونوں کے آثار ملتے ہیں۔ کیرکگارڈ KIER KEGARD نے تو کہا تھا کہ اسے دوسروں کی طرح دنیا کی خباثت سے شکایت نہیں، اسے شکایت اس کی بدبختی سے ہے کیونکہ اس میں جذبے کا فقدان ہے اور انسان کے خیالات فیتے کے مثل پتلے اور بے استقامت ہو گئے ہیں اور خود انسان فیتہ سازوں جیسا قابلِ رحم۔ چارلس پیگو نے CHARLES PEGUY کو شکایت تھی کہ موجودہ دنیا بے اعتبار و خراب کرتی ہے، اس کی یہی خصوصیت ہے کہ اس نے ریاست، انسان، محبت، عورت، طفل، لنسل، قوم، خاندان، یہاں تک کہ موت کو بھی بے وقار کر دیا ہے۔ گراہم گرین - - - - - - - GRAHAM GR... کے ناول 'وزارتِ خوف' کا مرکزی کردار کہتا ہے کہ "اسے ایک غلط نقشے کے ساتھ سفر پر بھیجا گیا ہے۔" ۔ کے دیوتا کے منہ دیکھنے والوں نے اپنا سفرنامۂ حیات لکھا اور اپنی حقیقی و ذہنی سیاحت کی داستان قلم بند کی ہے۔ روسو ROUSSEAU سے سارتر SARTRE تک یہ سلسلہ مختلف ذہنی نوقلمونیوں کا حامل ہے۔ گوئٹے GOETHE کی خود نوشت اپنے دور کے ذہنی طوفانوں کا پختہ عمر کے سکون کے ساتھ جائزہ لینے میں انھیں نرم سیر بنا دیتی ہے تو کولرج ... کی ادبی خود نوشت واقعات و سوانح سے زیادہ کانٹ اور شیلنگ وغیرہ کے فلسفے اور ورڈزورتھ کی شاعری پر بحث و تنقید سے سروکار رکھتی ہے۔ اسٹیفن اسپنڈر STEPHEN SPENDER ——— کی خود نوشت 'جہاں اندر جہاں' WORLD WITHIN WORLD کئی حیثیتوں سے

دگرد راہ' سے مماثلت رکھتی ہے۔ اسپنڈر بھی اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ "سچے شاعر جو اپنے تخیل کی جرأت کاری کی وجہ سے خیال کا بظاہر غیر شاعرانہ حد دد میں بھی تعاقب کرتے ہیں محض شاعرانہ صنعت نہیں رکھتے"۔ وہ بھی اس نسل سے تعلق رکھتا ہے جس نے بے روزگاری' خطرۂ جنگ' اقتصادی بحران اور ظہور پاتے ہوئے فاشزم کے خلاف اپنے ردعمل کا اظہار کیا اور پھر سیاست و ادب کے ساتھ ساتھ خود اپنے اخلاقی تہذیبی رویوں پر نظر ثانی کی ہے۔ اس کی خود نوشت میں خود اس کے قول کے مطابق اس نے خارجی واقعات کے پس منظر سے داخلی تجربات میں شگاف ڈالے ہیں اور اس کے نزدیک خود نوشت نگاری کا مسئلہ اندرونی اور بیرونی دنیاؤں میں سچی کشاکش یا تصادم کی نمود ہے۔ البتہ اسٹیفن اسپنڈر کے یہاں زندگی کی روشنی و تاریکی پر فن کارکی اندرونی بیان آرائی زیادہ ملتی ہے اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے فن کی اندرونی دنیا سے زیادہ ادبی و تہذیبی اور سیاسی و سماجی زندگی کے بیرونی پہلوؤں کو مد نظر رکھا ہے۔ زندگی' ادب اور ادبی تنقید کے ملے جلے عناصر کو نظر میں رکھتے ہوئے سائرل کونولی CYRIL CONNOLLY نے اپنی کتاب "دشمنان امید اور دوسرے مضامین" ENEMIES OF PROMISE AND OTHER ESSAYS کو خود نوشتِ خیالات کہا ہے۔

دراصل سارتر' مالرو MALRAUX' اور کامیو CAMUS وغیرہ اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے جنگ کی تباہ کاریاں دیکھیں اور جسے اقدار کی لاحاصلی کا احساس ہوا۔ مالرو نے کہا تھا کہ ہماری تہذیب دنیا کی پہلی تہذیب ہے جسے ارتفاع سے محروم کیا گیا ہے۔ گراہم گرین اور ہیمنگوے HEMINGWAY بھی انسان کی بے بسی کے گواہ ہیں۔ اپنے عہد کے تردّدات کے مشاہدے نے بعض اوقات اس ادب کو فروغ دیا جسے ادبِ یاس کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن نو امیدی میں بھی نئی معنویت تلاش کی گئی ہے اور کامیو نے ادبِ یاس کو اصطلاحی تصادم مبنی نہ ہونے کے ایک نئے رشتۂ یگانگت کے قیام سے تعبیر کیا ہے۔ سارتر کے خیال میں سب کی خواہش' بعضوں کی بے خبر ہوتے ہوئے بھی' یہی رہی ہے کہ وہ اپنے زمانے' اپنی زندگیوں اور سب سے بڑھ کر خود اپنے آپ کی گواہی دے سکیں۔ اس نے سیاسی مسائل کو پیش کرکے' جن میں الجزائر کا مسئلہ بھی شامل تھا' اپنے عہد کی گواہی دی۔ اگرچہ اسے شبہ تھا کہ اس کی تحریریں کوئی بھی دل خواہ اثر پیدا کر سکی ہیں' لیکن وہ اپنی ذات اور اپنے دور کی شہادت دیتا رہا۔ اس نے تاریخ کی تعبیر کے لیے تاریخی مادیت کے تصور کو قبول کیا تھا' لیکن وجودیت کو حقیقت تک رسائی کا قابلِ اعتبار طریقہ سمجھتا تھا۔ ذات اور حوادث کی کشمکش نے بعض اوقات انسان دوستی کے تصور کو بھی پیہم تصادمات کا شکار بنا دیا تھا۔ چنانچہ برٹرینڈ رسل ---- BERTRAND RUSSELL نے اپنی مفصل خود نوشت سے پہلے اپنے ذہنی ارتقا کی خود نوشت میں کائنات کی اس کے حجم کی وجہ سے مداحی کو عالمانہ اور مضحک بتاتے ہوئے غیر شخصی اور انسانی سچائیوں کو وہم سے تعبیر کیا اور یہ اعتراف کیا تھا کہ اس کا فکر و ذہن انسانیت کے دوستوں کے ساتھ ہے' اگرچہ اس کے جذبات اس کے خلاف شدت سے بغاوت کرتے ہیں' لیکن تین جلدوں میں مفصل خود نوشت لکھتے ہوئے برٹرینڈ رسل نے انسان دوستی کی صداقت اور جذبات کی قوت کو مدغم اور یک جا کر دیا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا حاصل تین سادہ' لیکن نہایت قوی جذبوں کو ٹھہرایا ہے۔ یعنی محبت کی آرزو' علم کی تلاش اور نوعِ انسان کے لیے ناقابلِ برداشت ترحم۔ اس کے خیال میں محبت وجد آفریں اور علاجِ تنہائی ہے اور محبت کی یک جائی سے صوفیوں اور شاعروں کی خیال کردہ جنت کی نقش ریزی۔ اسی طرح اس نے علم کے ذریعے انسان کے دلوں' ستاروں کی چمک کے اسباب اور اعداد کی سیال مادے پر فیثا غورثی طاقت کو سمجھنا چاہا ہے۔ لیکن محبت اور علم آسمان کی طرف لے گئے ہیں تو ترحم اسے زمین کی طرف واپس لایا ہے۔ اس کے دل میں درد کی چیخیں گونجتی ہیں کیونکہ قحط زدہ بچے' ظالموں کا ظلم سہتے ہوئے مجبور و معذور انسان' اپنے بیٹوں پر بار ہوتے ہوئے لاچار بوڑھے اور

تنہائی، غربت، درد کی ماری یہ ساری دنیا جو انسانی زندگی کا جیسا اُسے ہونا چاہیے مضحکہ اڑاتی ہے۔ وہ بُرائی میں تخفیف چاہتا ہے، لیکن کر نہیں سکتا، اس لیے خود بھی دکھ سہتا ہے۔ اپنی خود نوشت کے اختتامیہ میں برٹرینڈ رسل افلاطونی ابدی دنیا کے تصور کو کم مایہ ٹھہراتا ہے، لیکن آزاد و خرم انسانوں کی دنیا کے امکان کو اہم اور اسے نزدیک تر لانے کے لیے جینے کو شایانِ قیمت سمجھتا ہے۔ ان تمام خود نوشتوں میں ذات کے وسیلے سے متعدد جہات روشن ہوتی ہیں۔ البتہ اس کا انحصار خود قامتِ ذات پر ہے کہ کس حد تک ذات کا شعور اپنے گرد و پیش کا حوالہ بن سکا ہے اور تصورات کے بالاخانے میں زندگی کی آگہی، تہذیبی بصیرت اور تنقیدی دیدہ وری نے سورج کی روشنی اور تازہ ہوا کے لیے کتنے دریچے کھولے ہیں۔

اپنے عہد کی گواہی، شخصی قامت، فکری و تہذیبی تصورات، اپنے آپ میں جھانک کر دیکھنے کی اخلاقی جسارت، انسانی ہمدردی کے محرکات، خارج و باطن کے رشتوں کی دریافت، اور تنقیدی شعور کی وسعت کے مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھا جائے تو اُردو میں خود نوشت نگاری کا فن محتاجِ توجہ نظر آتا ہے حالانکہ برصغیر قدیم و جدید تہذیبوں کا میدانِ کارزار رہا اور یہاں ذہنی و فکری معرکہ آرائی جاری رہی ہے۔ شاید ہمارے معاشرے کی ظاہر سازی اور ریاکاری کے علاوہ ادیبوں اور شاعروں کی زندگی کے عملی ہنگاموں سے دوری اس کے بڑے سبب ہیں۔ صوفیائے کرام کے ملفوظات خواہ تذکرۂ غوثیہ جیسے دلچسپ ہی کیوں نہ ہوں، اس دائرے سے خارج ہیں۔ اردو میں حالی، شبلی اور غالب تینوں خود نوشت نگاری کی عظیم عمارت تعمیر کرنے کی بڑی صلاحیت رکھتے تھے، لیکن حالی اور شبلی نے اس صلاحیت کے اظہار کے لیے سوانح نگاری کی طرف توجہ کی اور غالب نے خطوط کو عصری حالات اور ذات کا آئینہ بنایا۔ ظاہر اور باطن کے فرق کو مٹانے اور جستجو کی مشعل جلائے رکھنے کے لیے معقول اور منقول کی تطبیق سے زیادہ فرد کے جذبات اور اجتماعی تصورات کی کش مکش کا مطالعہ اہم ہے اور یہ خود نوشت کا اہم موضوع بن سکتا ہے۔ لیکن اس اعتبار سے دیکھا جائے تو خود نوشتوں میں خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی، مولانا حسین احمد مدنی کی نقشِ حیات اور عبدالمجید سالک کی سرگزشت بے حرکت اور کم عمق ہیں۔ جعفر تھانیسری کی کالا پانی اور ظہیر دہلوی کی داستانِ غدر جزئی بیان پر محیط ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرے میں ہنگاماتِ حال سے زیادہ خیال کی حرکت نے لفظوں کو رنگینی بخشی اور عبارت کو جِلا دی ہے۔ اعمال نامے میں البتہ رضا علی نے فرد اور تہذیب کے رشتوں کو انفرادی اور اجتماعی سلسلۂ واقعات سے روشن کیا ہے اور بعض اوقات ان کے اخفائے حال میں بھی اظہارِ حقیقت کا انداز ملتا ہے۔

ان سب خود نوشتوں میں جوش کی "یادوں کی بارات" اپنے وقت کی ایک اہم دستاویز ہے۔ اس نے اپنے عہد کی تہذیب کی جس طور سے نشان دہی کی ہے، اس کے مطالعے کے لیے دقتِ نظر کی ضرورت ہے کیونکہ یہاں سچ اور جھوٹ، حقیقت و آرزو اور ذات و عصر کی آمیزش سے جو تصویریں بنتی ہیں، ان میں ایک فکری نظام نہ سہی، بعض اہم تمدنی قدروں سے تشویقِ حواس، تقاضائے بدن اور تجسسِ ذہن کی آویزش کے متعدد رنگ ملتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی "کارِ جہاں دراز ہے" اور مشتاق احمد یوسفی کی "زرگزشت" دونوں میں سوانحی رنگ ملتا ہے، لیکن ایک میں افسانہ سازی کی ملاوٹ اور دوسری میں تعاقبِ الفاظ کی بناوٹ سے اطرافِ ذات کے اظہار میں رخنے پڑے ہیں۔ زندگی کی بعض دلچسپ اور گوناگوں صورتوں کا نقش محمد خاں کی "عمر رفتہ"، دیوان سنگھ مفتوں کی "ناقابلِ فراموش" اور نسبتاً مختصر اور حال میں شائع ہونے والی قدوس صہبائی، محمد احمد سبزواری اور شان الحق حقی کی خود نوشتوں میں، بیان کیا گیا ہے۔ قدرت اللہ شہاب کی خود نوشت شہاب نامے کے جو حصے منظرِ عام پر آئے ہیں، ان میں پختہ کاری کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی واقعات کی ناانصافی اور نوکر شاہی کے جمود و بے حسی پر شرفِ انسانیت کے خیال و عمل کی ضربیں لگائی گئی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر سید عبداللہ کی مختصر خود نوشت

علمی تلاش اور عملی تحریکوں کے پس منظر میں وسیع ہوتے ہوئے ذہنی افق اور جدید و قدیم تحقیق و تنقید کی روشنی میں ادبی معیارات کے انکشافات کا پتہ دیتی ہے۔ مجنوں گورکھپوری کی مختصر خود نوشت میں ذہن کی جن وسعتوں کا اظہار ہوتا ہے وہ عصری تخیلات اور تحریکات کے پس منظر میں ذوقِ جستجو کے دل نشیں نقوش ثبت کرتی ہیں۔ مرزا ادیب کی خود نوشت "مٹی کا دیا" خود نمایانہ افسانہ طرازی کی فرنوتیت کی جگہ منکسر المزاجانہ تصور سازیٔ حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ چند نشانات "گردِ راہ" کی ادبی جہت کے تعین میں مدد دے سکتے ہیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تازہ کتاب "گردِ راہ" خود نوشت بھی ہے اور اسے ان کے تنقیدی اور تہذیبی تصورات کا تتمہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ بحیثیت خود نوشت اس کا اس نوع کی بعض تحریروں سے مقابلہ کیا جائے تو بہت فرق نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری زندگی کے وسیع تجربات سے گزرے ہیں، بڑی ادبی تحریکات سے ہم کنار رہے ہیں اور بڑے بڑے لوگوں سے ملے ہیں، لیکن اُن کا ذہن بوڑھے بچے کا ذہن نہیں اور نہ وہ وسیع تحریکات اور اہم تجربات کے سامنے ششدر یا بڑے لوگوں کے حضور سرنگوں نظر آتے ہیں۔ بڑے لوگوں کے ذکر میں وہ ذات فروشی، لجاجت اور رقت کے بجائے زندگی اور کردار کے بھرپور مطالعے سے کام لیتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خود نوشت فرومائگی سے دور اور غبی الذہنی سے پاک ہے۔ اس میں ایک مضبوط ادبی شخصیت کی جھلک ملتی ہے، جس نے حالات و خیالات کا ذہانت و ذکاوت سے جائزہ لیا ہے۔ بعض ادبی سیاسی اور تہذیبی روایتوں پر نظر ثانی بھی کی گئی ہے لیکن اس کے پیچھے جو ذہن کارفرما ہے اس کی صفت خردمندی اور خرد افروزی ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے بعض خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ایک عمر کے فکر و تامل نے خود ان کے لیے ان خیالات کو بدون علاوہ یا اضافہ نہیں رہنے دیا ہے۔ ان کے تنقیدی تصورات پر نظر ڈالی جائے تو بعض جگہ ترمیم اور توسیع کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ارتقائے علم کے علم بردار ہوتے ہوئے بھی اب اس کی حتمی حیثیت کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "آرٹ کی نہ ہی علم کی طرح ارتقا کی محتاج نہیں یعنی جس طرح علم وقت کے ساتھ بڑھتا ہے اس طرح آرٹ میں ترقی نہیں ہوتی۔" یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ وہ آرٹ کے انفرادی کارناموں کا ذکر کر رہے ہیں یا ان کی مراد مجموعی ادبی شعور سے ہے۔ شاید اس کے جواب میں وہ عہد جدید کی تہذیبی صفات کو بیان کرتے ہوئے اب ایک بے صدا، بے رنگ اور بے معنی دور میں داخل ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنی اقبال پر نا روا تنقید سے متعلق وہ اس کے بارے میں خود اقبال ہی کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ "میں بے جان لوگوں کے اتفاق پر جاندار لوگوں کے اختلاف کو ترجیح دیتا ہوں۔" آزاد نظم کو وہ اپنی پرانی تحریروں کے برعکس اب لفظ و معنی میں نئے رشتوں کی تلاش کی حیثیت سے بھی دیکھنے لگے ہیں اور ن م راشد کے "لا = انسان" میں وہ شبِ زندگی کی تاریکی یا چاندنی میں تحت الشعور کے رمز و اشارے پانے اور کہتے ہیں کہ یہ سرگوشی الفاظ میں نئے معنی پیدا کرتی اور اس کا حسن زبان کو نیا آہنگ عطا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مغربی ادب میں گم شدگی اور بے راہ روی کے احساس پر توجہ دلاتے ہیں۔ "گردِ راہ" میں بعض جملے ایسے بھی ملتے ہیں جن میں عمومی رجحان کے بجائے کسی ایک ادبی تخلیق کی خصوصیت کو خوبی سے واضح کیا گیا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ۔ "مجاز نے رات اور ریل سے بہتر نظمیں لکھیں، لیکن ان کے فن کے خدوخال اس میں نمایاں ہو چکے تھے۔" اسی طرح بعض افراد و واقعات کے بارے میں ان کا محاکمہ نشتر کی تیز دھار کی صفت رکھتا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق بڑی تہذیبی قوت اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے محرکاتِ عمل میں ایک اہم محرک تھے۔ ان کے مخالفوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ "افسوس پاکستان میں جن لوگوں نے اُن کی کلاہ اُتاری وہ انھیں کے پروردہ تھے۔" "ادب کا ماضی اور حال" کے عنوان سے "گردِ راہ" میں جو باب ملتا ہے اس سے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے تنقیدی اور تہذیبی تصورات کے بہت سے گوشے روشن ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے پڑھنے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ مصنف خود اپنی فکر کے ماضی و حال کا جائزہ لے رہا ہے جس میں کہیں کہیں بیّن فرق بھی رونما ہوا ہے۔ اس باب میں ہندی، فارسی، بنگالی اور اردو ادب کا جو ذکر کیا گیا ہے اور سبک ہندی کا جو رشتہ سنسکرت اور ہندی کے دوہوں سے ملایا گیا ہے، وہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تنقیدی نظر اور

وسعتِ مطالعہ کی دلیل ہے۔ اس باب کی یہ اہمیت بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس میں وہ برصغیر کے مسلمانوں کی فکرِ تشخص کو متعین کرتے اور اُسے ہزار سالہ تہذیبی ورثے کی شناخت قرار دیتے ہیں۔ دراصل ترکی کی خالدہ ادیب خانم نے انھیں تصورِ پاکستان سے متعارف کرایا تھا اور وہ رفتہ رفتہ پاکستان کی ناگزیریت کے قائل ہو گئے تھے۔ "گردِ راہ" میں مسلم قومیت اور ہندو غلبہ پرستی کے تصادم کی وہ جھلک بھی ملتی ہے، جو اُسے تاریخِ حال کا حوالہ بناتی ہے۔ مسلمانانِ برصغیر کی جدوجہدِ منزل کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ "یہ بھی تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو نے ہندو مسلم آئینی مصالحت کے جس امکان کو صدمہ پہنچایا تھا، وہ ان کے فرزند جواہر لال نہرو نے ہمیشہ کے لیے یوں ختم کر دیا۔" تحریکِ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے وہ ملک کی سیاست میں ہندو سازشوں کا رنگ پاتے اور مسلم قومیت کو پروان چڑھتے دیکھتے ہیں۔ وہ قیامِ پاکستان کے بعد ہند و غلبہ پرستی کے عمل کی یوں تنقید کرتے ہیں کہ "جب حیدرآباد پر ہندوستان نے فوج کشی کی، یہ کسی بہترِ معاشی نظام کا غلبہ نہیں، ہندو قومیت کی یلغار تھی۔" ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے برصغیر کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک خصوصیت سے ترقی پذیر ملکوں کی صورتِ حال کا جائزہ بھی لیا ہے۔ وہ تیسری دنیا کی بے چارگی کا حال بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دنیا کے ممالک فنی اور مالی امداد کے طلب گار رہیں، لیکن مغربی ممالک انھیں اشتراکیت کے مقابلے میں اپنا حلیف تو بناتے ہیں، لیکن یہ کوشش بھی جاری رہتی ہے کہ تیسری دنیا میں اتحاد کی صورت نہ نکلے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے اس تجزیے سے ان کی سیاسی بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ بحیثیتِ مجموعی تہذیب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ اس کی ترقی اور زوال کا فکری زندگی کے نشیب و فراز سے براہِ راست تعلق قائم کرتے ہیں اور اندھی تقلید کو ضابطۂ حیات بنانے والی قوم کو آگے کے بجائے پیچھے چلنے والا اور تاریخ کی شاہراہ سے بھٹک جانے والا قرار دیتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کو وہ مسلمانوں کے زوال کی سیڑھیوں پر اُترنے کی ابتدا اور مغرب کے صنعت اور سائنس کے سہارے بامِ عروج پر چڑھنے کا آغاز بتاتے ہیں۔ وہ مذہب اور سائنس میں کسی بنیادی تضاد کے قائل نہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ جس مذہب نے علم کو سب سے زیادہ اہمیت دی، اس کے پیرو عقل کے سب سے بڑے دشمن بن گئے، لیکن وہ عقل کے ساتھ ساتھ ایمان کے بھی قائل ہو گئے ہیں اور موجودہ تہذیب کو ایسے بے لگام گھوڑے سے تشبیہ دیتے ہیں جو ایمان کی عنان اور عقل کے زین سے بے نیاز کسی نامعلوم سمت میں بھاگا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے علم الاجتماع اور امورِ سیاسی کے تصورات میں بھی تبدیلی آئی ہے اور وہ اس زمانے کی مشکلات کی ایک بڑی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ حکومتیں ہر معاملے میں دخل انداز ہوتی ہیں اور شہری اپنے فرائض سے بری الذمہ ہونا چاہتے ہیں۔ رفتارِ ترقی و تہذیب کی روشِ ترمیمیت سے انکار کرتے ہوئے وہ ہزاروں سال کی کوشش کے باوجود انسان کی فطرت کو غیر متغیر پاتے اور اُس پر صرف تہذیب کی ملمع کاری دیکھتے ہیں۔ ان کے تصوراتِ مردم یا معاشیات میانہ روی کو مستحسن لائحہ عمل قرار دیتے ہیں۔ ان کی تنقیدی فکر کا بنیادی نقطہ حرکت و ارتقا کا تصور ہے۔ اب بھی وہ ارتقا کا عمل جاری و ساری پاتے، لیکن اب وہ مسلسل گردشِ روزگار اور ترکِ دنیا کی بے حرکتی کے درمیان توازن کو ممکن جانتے ہیں۔ اسی طرح وہ تہذیبی ترقی کو روشنی کے مترادف نہیں ٹھہراتے، اس کے برعکس وہ تہذیبِ دورِ حاضر کو تاریکی قرار دیتے ہیں۔ ان کے تنقیدی اور تہذیبی تصورات کا خلاصہ اور نچوڑ ان کے ہی الفاظ میں اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ "علم کی بے قراری، محبت کی خلش اور مظلوم انسانیت کی ہمدردی میں وہ باہمی تعلق ہے، جو تہذیب کے ظلمت کدے کا شب چراغ ہے۔" ان ہی تین سمتوں کی طرف برٹرینڈ رسل نے بھی اپنی سوانح میں اشارہ کیا ہے، لیکن اس نے ان سمتوں کو اپنی زندگی کے قوی اور محرک جذبات کا روپ دیا ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اردو تنقید کو تصوراتِ تہذیب کے ساتھ انسانی خصوصیات کا حامل بھی بنایا ہے۔ ان کے اندازِ فکر کے علاوہ دل آویز طرزِ اظہار نے بھی کہ جس کی خصوصیت صراحت اور شگفتگی ہے، ان کی تحریروں کو جاذبیت بخشی ہے۔ وہ قدیم ہندی اساطیر سے واقفیت کے باوجود اسے بعض دانشوروں اور بالی ووڈ کے فلم سازوں کی طرح سامانِ تجارت نہیں بناتے نہ وہ عہدِ وسطیٰ کے قصوں یا قدیم کاہنوں کی حکایتوں سے دلچسپی لیتے ہوئے

بیسویں صدی کی ذہنی تحریکوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے عصر کے شعور کی روشنی تک پہنچے بغیر اوہام کے اندھیروں میں نہیں بھٹک جاتے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے زندگی کے جس ارتقائی تصور کو آگے بڑھایا تھا، اس نے اردو تنقید میں مختلف ذہنوں کا شعور رکھنے والے کئی اربابِ فکر کو متاثر کیا ہے۔ اب یہ بدقسمتی ہے کہ یہ فکری روایت ایک طرف ایسی تقلید کی محتاج، ناپختہ مطالعہ اور سکالرانہ تراشی کا شکار ہوگئی ہے کہ تحریر پر برے ترجمے کا گمان ہوتا ہے اور دوسری طرف ایسی سہل انگاری آ گئی ہے کہ من مانے دلائل کی تکرار، کم عیاری کے انبار اور پہلے کہی ہوئی باتوں کی بھرمار سے حجم بڑھا کر وصف کو مقدار کی ترازو سے تولا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تحریروں کا بڑا وصف یہ ہے کہ ان کو اپنی نظر و صلاحیت سے شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے برخلاف تنقید کا نام دیے جانے والی بہت سی ایسی تحریریں ہیں کہ ان کے بارے میں جہاں جوہرِ تنقید کی رمق بھی نہیں ملتی، الٹا در صلاحیت خود صاحبانِ تحریر سے شرمندہ ہیں۔ موجودہ دور میں ظرافت نگاری میں پطرس اور تنقید نگاری میں اختر حسین رائے پوری دو ایسی اہم مثالیں ہیں کہ جن کی تحریروں میں کم مقداری نے ان کی ادبی حیثیت کو متاثر نہیں کیا اور اس کا تعین ان کی صنفی خصوصیات کے اعتبار سے کیا جاتا رہا ہے۔ تنقید نگاری اختر حسین رائے پوری کی شہرت کا ستون ہے لیکن ان کی بڑائی کے تاثر کو زندگی اور فکر کی ارتقائی تحریکات نے مستحکم کیا ہے کہ ان سے ان کی ادبی شخصیت نے وقار پایا ہے۔ ان کی تحریروں میں بڑی قوت کی برقی رو دوڑ رہی ہے لیکن اس قوت کا بجلی گھر خود زندگی کا ارتقائی تصور ہے۔ اس لیے جہاں اس رو کی قوت میں کمی آئی ہے، وہاں ان کی تحریر بھی متاثر ہوئی ہے۔ اختر حسین رائے پوری کی تنقید نے علم اور تخلیق کے فاصلے کم کیے ہیں اور خود ان کے تنقیدی اور تہذیبی تصورات کا بیان تخلیقی اثر سے خالی نہیں جس کی وجہ سے ان کی نثر میں وہ رنگ آیا ہے جسے تخلیقی اظہار کا نام دیا جا سکتا ہے اور جو اچھے نثر نگاروں کی خصوصیت رہی ہے۔ یہ تخلیقی اظہار رہی ہے جسے مجنوں نے عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ جمالیاتی رنگینی بخشی تو احتشام حسین نے رنگینی اور رنگ آمیزی کو دانستہ طور پر ترک کرتے ہوئے بھی منطق کی جدلیات اور حصرِ نگار کے ایجاز سے نئے بیان کا اعجاز بنا دیا۔ یہی تخلیقی اظہار مذکورہ بالا روایتِ فکر سے ایک حد تک الگ ہوتے ہوئے بھی تقابل و توازن کے نئے حربوں سے لیس ہو کر آل احمد سرور کی تنقیدی تحریروں میں ادبی خصوصیات کی نشان دہی کے نئے ہدف تلاش کرتا ہے۔ اردو تنقید اظہار کی یہ صفت کھو کر اپنے منصب سے ہٹ گئی ہے اور اس کے لیے تہذیب کے راستوں میں چراغ جلانا تو کجا خود اپنی ژولیدگیٔ بیاں کے اندھیروں سے باہر آنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا بڑا کارنامہ ہے کہ وہ زندگی اور فن میں مطابقت کی جستجو کرتے ہوئے اپنے تنقیدی و تہذیبی تصورات کے اظہار کے لیے ان سے مسلک اور ان کے مناسب بیان کے سانچوں کو وضع کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ یہ وہ خرد افروزی کی اس روایت کو آگے بڑھاتے ہیں جس میں فکر و بیان کی ہم آہنگی جھلکتی ہے۔ وہ اس نکتے سے واقف ہیں کہ جہاں تنقید ان دونوں سطحوں میں مطابقت پیدا کرنے سے قاصر رہی ہے وہاں وہ تنگ نفسی کا شکار ہو جاتی ہے۔ آج تنقید کو زندگی کی ارتقائی فکر کی روشنی سمجھنے کے بجائے جس طرح بعض حلقوں میں متن کی حوالہ نویسی یا ہیئت کی روداد نگاری سمجھا جانے لگا ہے، اس نے تہذیبی تصورات کو منقسم اور محدود کر دیا ہے۔ تنقید تہذیب اور تاریخ کے بنیادی عوامل کے شعور سے ادب کو نئی روشنی ملتی ہے۔ وہ صرف آلۂ ساخت پیما نہیں اور نہ محض کارگاہِ اختصاص۔ وہ فکر و اظہار کا بیک وقت احاطہ کرتے ہوئے خود بھی ایک تخلیقی جست کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس کے بغیر وہ اپنی صحیح منزل سے آشنا نہیں ہوتی اور اس کو نظر انداز کر دینے سے اختصاصی تحدید، توضیحِ متن اور رودادِ ساخت کی طفیلی اور تابع بن جاتی ہے۔ یہ خود زندگی اور تہذیب کا اضمحلال ہے کہ آج تنقید کارِ بے کاراں، شغلِ شہرت خواہاں، مشقِ خود فروشاں، کوششِ سبک سراں، کاوشِ فقرہ بازاں، کنج کاویٔ جائے گیراں، سعیٔ خود سازاں، کسبِ فارغ البالاں، جہدِ ماجرا جویاں، تگ و دوئے انتشار پروراں، پیچ دادگیٔ بازماندگاں، پیش دستیٔ منزلت طلباں، مشقِ حاشیہ نویساں اور وظیفۂ مدرساں بن گئی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تنقید ایک مقتدر جستجوئے درایت ہے۔ وہ فکری آزادی اور انسان دوستی کے تصورات کو وسیع تہذیبی اقدار کا حامل بتاتے ہیں اور اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو عقلی سچائی اور سماجی آگہی کا وسیلہ بناتے ہوئے ادبی شعور کو وسعت دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے فکر و اظہار میں جو روشنی ہے، اسے اپنے عہد کا تصدیق نامہ کہا جا سکتا ہے۔



WILLS
20
WILLS
GOLD FLAKE
KING SIZE FILTER
Brings Together
Rich Traditions and New Trends

[redacted]



United 4/85

مظفر علی سیّد

اختر حسین رائے پوری۔ ناقد بطور پیش رو

ترقی پسند تنقید کی تاریخ میں اختر حسین رائے پوری کی پیش روی مسلمہ ہے۔ سجاد ظہیر نے بھی "روشنائی" میں لکھنؤ کانفرنس (منعقدہ ۱۹۳۶ء) کے بعد والے باب میں اسے تسلیم کیا ہے۔

> ۱۹۳۶ء یا شاید اس سے بھی کچھ پہلے اختر حسین رائے پوری نے اپنا مشہور مضمون "ادب اور زندگی" لکھا جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالے "اردو" میں شائع ہوا۔ میرے خیال میں یہ ہماری زبان میں پہلا مضمون ہے جس میں منضبط اور مدلل طریقے سے ترقی پسند ادب کی تخلیق کی ضرورت بتائی گئی اور پرانے ادب کی رجعت پسند قدروں کی تشریح کر کے ان کی مخالفت کی گئی۔ اس اہم مضمون کے مصنف کی حیثیت سے اختر حسین رائے پوری کو اردو کے ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں اوّلیت حاصل ہے۔

فیض صاحب کے نزدیک رائے پوری کا شمار "ترقی پسند تحریک کے سربرآوردہ ارکین" میں ہوتا ہے اور ان کے "تخلیقی سفر کا آغاز تحریک کے ابتدائی دنوں میں" ہی ہو چکا تھا۔ اسی طرح جناب مجنوں گورکھپوری نے بھی مذکورہ مقالے کو "ایک عہد آفریں مضمون" اور "ترقی پسند ادب کا سنگِ بنیاد" قرار دیا ہے۔ سجاد ظہیر کا "شاید اس سے بھی کچھ پہلے" کہنا صراحت طلب ہے خصوصاً جب کہ خود مصنف کو اصرار ہے کہ رسالہ اردو میں یہ مقالہ ۱۹۳۵ء میں شائع ہو چکا تھا بلکہ اس سے بھی دو سال پہلے "ساہتیہ اور کرانتی" کے عنوان سے اس کی ایک ابتدائی اور مختصر صورت کلکتے کے ایک ہندی ماہنامے میں چھپ چکی تھی۔ اس بنا پر رائے پوری کے پہلے مجموعۂ مقالات "ادب اور انقلاب" کے شروع میں ناشر کی زبان سے دعویٰ کیا گیا ہے کہ مصنف کو "اردو اور ہندی دونوں میں ترقی پسند ادب کے پہلے مجتہد کی حیثیت حاصل ہے۔"

ہندی کی بات تو ہندی والے جانیں، اردو کی حد تک یہ کہنا درست ہوگا کہ جو تنظیم بعد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کہلائی اور جس کا اعلان نامہ سجاد ظہیر لندن سے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اس کی رسمی تاسیس سے کچھ دیر پہلے اختر حسین رائے پوری اس کی تنقیدی بنیاد رکھنے کا فریضہ انجام دینے کا آغاز کر چکے تھے۔ تاہم تخلیقی سطح پر تحریک کا آغاز بالعموم "انگارے" کی اشاعت (۱۹۳۱ء) سے کیا جاتا ہے جس میں سجاد ظہیر کے علاوہ احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر بلکہ نیاز فتح پوری تک کے افسانے شامل تھے۔ ان میں سے نیاز بہت پہلے سے اس قسم کی چیزیں لکھ رہے تھے۔

تاریخ ادب میں کسی بھی نئی تحریک کا آغاز کسی خاص دن، مہینے یا سال سے کرنا بے معنی بات ہے...

[redacted]

رویوں کی ترجمان ہوتی ہیں اور [illegible] دیتے ساں [illegible] کی جذباتی و فکری صورت حال سے نمودار ہوتے ہیں۔ فیض صاحب کا اصرار بجا ہے کہ تنظیم اور تحریک کو ایک ہی چیز سمجھنا درست نہیں۔ [illegible] اس وجہ سے آئی ہے کہ ایک عمومی جذباتی و فکری صورت حال منظم عمل کی متقاضی ہوتی ہے اور یہ بھی ہوتا ہے (جیسا کہ ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں ہمارے یہاں ہو چکا ہے) کہ تنظیم کے بکھر جانے کے بعد بھی ہم نظری اور ہم خیالی کی فضا کسی نہ کسی حد تک [illegible] رہتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے (جیسا کہ ہندوستان میں ہوا) کہ تنظیم تو اپنی قدیم شکل میں قائم رہے لیکن [illegible] مولوی عبدالحق نے یہی بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ تخلیقی فعالیت اصل چیز ہے اور تنظیم [illegible] کے بعد "[illegible] دستانی" میں لکھا ہے کہ "تنظیم ایک فروعی چیز ہے۔ اصل [illegible] اصولوں و مقاصد کے مطابق [illegible] کی تخلیق [illegible] تنقید ہے۔"

ان میں سے [illegible] ہے لوگوں کے لیے مقصدی کوت [illegible] ہے کہ اس کے بغیر کوئی سوچ سکتا ہے، یہ محسوس کر سکتا ہے۔ ملاقات جوں [illegible] ہراول دستہ سرگرم عمل ہو [illegible]۔

[illegible] سجاد ظہیر تنظیم کے [illegible] اور اس کے مورخ بھی لیکن تنظیم کے لیے اصول و مقاصد [illegible] محدود نہیں کی جا سکتی۔ ترقی پسند تحریک ادب کی تشکیل [illegible] آگے نہیں [illegible] تھی۔ [illegible] بعد میں یہ فریضہ [illegible] حسین [illegible] کی خاصی کوشش کی۔ لیکن اختر حسین رائے پوری کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے [illegible] احمد علی کے ایک مقالے (ترقی پسند ادب کا نظریہ) سے بھی پہلے ۱۹۳۵ء [illegible] ۱۹۳۰ء [illegible] تنقیدی مجموعے "ادب اور انقلاب" اور "روشن مینار" کے اہم ترین مقالات شائع ہو چکے تھے۔ [illegible] کی اصطلاح میں ترقی پسند ادب کے "انقلابی ہراول" کو "نظریاتی ہراول" بنانے پر توجہ مرکوز کی۔

ہراولیت یا پیش روی کا [illegible] ہے جسے افکار و خیالات کی اجتماعی اثر انگیزی کسی بھی مفکر کے لیے۔ لیکن نقاد کا منصب اپنے دور کے ادب سے جس قسم کے مسلسل جذباتی رشتے کا متقاضی ہوتا ہے ہراولیت اس کو یک طرفہ اور ہنگامی بنا دیتی ہے۔ بلکہ نقاد اگر ابتدائی پیش روی کو تحریری [illegible] مسلسل نہیں [illegible] تو یہی پیش روی اس کے لیے ایک مسئلہ بن جاتی ہے اور وہ پھر کبھی کسی اور حیثیت [illegible] مشکل [illegible] عمل ہوتا ہے۔

اختر حسین رائے پوری کے طویل ادبی سفر میں [illegible] "گرد راہ" میں اور اس کے بعد چند ایک مطبوعہ گفتگوؤں میں دہرائی گئی ہے، عنفوانِ شباب کی پیش روی کے بعد۔ [illegible] نقاد [illegible] عروج معکوس (یا اینٹی کلائمیکس) کی صورت حال دکھائی دیتی ہے۔ ان کی تنقیدی معاشت ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان عروج کو پہنچتی ہے اور اس کے بعد ۱۹۴۳ء تک بتدریج نزول کرتی ہوئی عزلت گزینی اور منصبی مصروفیات میں غائب ہو جاتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب ان کا تعلق نہ تحریک سے قائم رہا تھا نہ تنظیم سے ان کا اخراج کیا جاتا ہے تو ایک [illegible] ہیں کہ پینتیس برس کے بعد پھر نمودار ہوتے ہیں۔ اس دوران میں انھوں نے کوئی [illegible] کیا علمی اور تعلیمی ذمے داریاں نبھاتے [illegible] مقامات

کی سیر و سیاحت کی، کیسے کیسے مناظر دیکھے اور مشرق و مغرب کی کیسی کیسی شخصیات کے ساتھ ملاقاتیں کیں۔ ان سب یادوں کو سمیٹتے ہوئے بلاشبہ انھوں نے ایک عمدہ زندگی نامہ تصنیف کیا ہے جس کا شمار شاید ان کے بہترین ادبی کارناموں میں کیا جائے۔ ذاتی سرگزشت کی کتاب میں نقدِ ادب کا کوئی موقع نہیں ہوتا، تاہم اردو کے چند ایک ادیبوں کے بارے میں جن سے ان کا ربط استوار رہا، انھوں نے تھوڑی بہت رائے زنی ضرور کی ہے جو اس وجہ سے خصوصی توجہ کے لائق ہے کہ اس بہانے معاصر ادب سے ان کا تعلق، برائے نام ہی سہی، قائم تو رہا۔ ورنہ طویل خاموشی کے دوران تو لگتا تھا جیسے نقدِ ادب کو ترک کرنے کے ساتھ انھوں نے ادب سے ہی رشتہ توڑ لیا ہو۔

"گردِ راہ" کی اشاعت کے بعد لازم ہو گیا ہے کہ ہم ان کے جملہ تحریری آثار (افسانہ نگاری، لغت نویسی، ترجمہ اور تنقید) کی از سرِ نو ارزیابی کریں۔ ان میں سے اُن کے لیے سب سے زیادہ نیک نامی یا بدنامی کا باعث ان کی تنقید تھی، اگرچہ اس میدان میں ان کی مجموعی پیداوار دو مختصر چھوٹی چھوٹی کتابوں سے زیادہ نہیں (جن میں ان کی ترجمہ کردہ کتابوں کے مقدمات اور چند ایک دوسرے دیباچے بھی شامل ہیں) تاہم مفید اُن کے لیے محض ایک ہنگامی مشغلہ یا ایک تدریسی ضرورت نہیں تھی۔ اس کام کے لیے جس قسم کی ذہانت و فراست اور وسعتِ مطالعہ درکار ہوتی ہے، ان کی طبیعت میں شامل تھی۔ تاہم دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ اردو تنقید کی نشوونما میں اپنی ذہنی صلاحیتوں سے کس حد تک کام لے سکے اور آج ہم ان سے کیا کچھ سیکھ سکتے ہیں، خواہ وہ بطورِ عبرت ہی کیوں نہ ہو۔

(۲)

ان کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز مقالہ "ادب اور زندگی"، جو ان کی پہلی تنقیدی تحریر بھی تھا، اولین اشاعت کے پچاس برس بعد پڑھنے بیٹھیں تو سب سے پہلے اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ اس زمانے کے علی گڑھ میں ایم۔اے (تاریخ) کے ایک طالب علم نے اسے لکھا اور مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے رسالہ "اردو" میں اسے شائع کیا۔ حیرت اس بات پر بھی ہوتی ہے کہ اردو تنقید کی تاریخ میں اس کا جو شدید ردِ عمل ہوا اور آج تک جاری ہے، ایسا ردِ عمل بہت کم تنقیدی تحریروں پر ہوا ہے۔ اس ردِ عمل کا تعلق ایک تو اردو ادب کے کلاسیکی سرمائے کے دفاع سے ہے، دوسرے اقبال سے، لیکن سنسکرت ادب اور کبیر، ٹیگور اور پریم چند سے جس بے اطمینانی بلکہ بیزاری کا اظہار اختر حسین رائے پوری نے کیا ہے ردِ عمل والوں کو اس سے زیادہ سروکار نہیں۔ حالانکہ یہاں مسئلہ کچھ کم گھمبیر نہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> سنسکرت شاعری شرنگار رس (جذبۂ عشق) اور شانت رس (جذبۂ اطمینان) پر مبنی ہوتی ہے کیونکہ ایک امیروں کے جنسی رشتہ ہوائی رجحان کو بڑھاتا اور دوسرا بوڑھوں کے احساسِ گناہ کو کم کرتا ہے۔ خود فرہی کا یہ عالم ہے کہ فضائے عبدی کے تذکرے کی متحمل نہیں اور اسے مخدوش سمجھتی ہے۔ چنانچہ اس سماج کا یہ طبقہ کس حد تک عیش و طرب میں ڈوبا ہوا بزم کی رنگینیوں کی داد دے رہا تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس زمانے کے ادب کو دیکھیے۔ اکثر سنسکرت افسانے مثلاً بیتال پچیسی (بیتال پچیسی) اور مرچھ کٹکا (مٹی کی گاڑی) وغیرہ بداخلاقی، اوباشی اور قابلِ نفرت جنسی فساد سے بھرے پڑے ہیں۔ شاعر اور ادیب انھیں یوں مزے لے لے کر بیان کرتا ہے گویا زندگی کے فرائض یہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ عشقیہ شاعری کے لیے جو ہم معنی لفظ شرنگار ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ محبت اور بوالہوسی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ ہندو اصنافِ سخن میں نائکہ بھید اور نکھ سکھ ان یعنی اقسامِ معشوق کی شرح اور معشوقہ کے سراپا کو جو مرتبہ و مقبولیت حاصل ہے وہ اس کی شہوت پرست

ذہنیت کا پرتو ہے۔ نائکہ بھید جس جس تحسس اور انہماک سے صرف لذتوں ہی نہیں بلکہ شادی شدہ عورتوں کی بدکاری کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس [illegible] کا حد تک معیار کیا تھا۔ شعر و ادب اس نقطہ کے لیے قوتِ باہ کی گولیوں کا کام انجام دیتے تھے۔"

لگتا ہے جیسے کوئی وکٹوریائی معلمِ اخلاق [illegible] کو نابالغوں کے نصابِ تعلیم سے خارج کرنے کا جواز فراہم کر رہا ہو۔ بداخلاقی، درا و باشی قسم کے الزامات لگا [illegible] کے ادبی منیجر والوف نے بھی شاید ہی برتی ہو۔ پھر جہاں تک اسی تنقید [illegible] کا تعلق ہے (بقول مصنف [illegible] کا مقصود نظر ہے) تو کہنا پڑے گا کہ نہ تو یہ خالص ہے، نہ معاشی اور نہ تجزیہ [illegible] اور فکشن کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دے اور کسی متن کے لہجے اور اس کی تہ داری سے بحث نہ کرے [illegible] کیسے کہا جا سکتا ہے؟

ایک جگہ انھوں نے ہیگل کے [illegible] فلسفے، طالسطائی [illegible] اصرار دونوں کو معاشی اور مادی نقطۂ نظر کے مقابلے میں "مبہم اور ادھورے معیار" کہا ہے [illegible] کے بارے میں ان کا اعتراض طالسطائی کے بہت قریب ہے اور وہ کالی داس اور بھرتری ہری کے سلسلے میں [illegible] ایک [illegible] بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

سنسکرت ادب کے بارے میں [illegible] معاشی بنیادوں پر اصرار کا اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سنسکرت [illegible] یونیورسٹی سے سنسکرت ڈرامے پر تھیسس لکھ کر ڈگری حاصل کی [illegible] سلوک روا رکھا۔ بلکہ اس ابتدائی مقالے کے بعد بھی انھوں نے کالی داس [illegible] تھیسس [illegible] بعد میں ایک اردو مقالے کے طور پر چھاپا ہے، سنسکرت میں المیہ کے فقدان کی [illegible]۔

سنسکرت کے علاوہ انھوں نے کسی کلاسیکی [illegible] فارسی ادب سے ان کی دلچسپی غالب بہت بعد میں قیام ایران کے دوران پیدا ہوئی [illegible] انھوں نے جو [illegible] باقی ہر اولیت کا [illegible] بنا سکتے تھے۔ چنانچہ قدیم ہندی اور اردو ادب [illegible] (SWEEPING) جائزے [illegible] میں آ گئے۔ اس میں سے وہ کبیر اور نظیر کو قدرے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں [illegible] کہ نظیر محنت کش نہ تھا اور کبیر بھی راجا کی جگہ پر جا کر [illegible] تو بہتر ہوتا [illegible] اس پر اظہارِ افسوس کتنا مفید ہو سکتا ہے اس کا نقادِ محترم نے اندازہ نہیں کیا [illegible] کلام کی وجہ سے دائم رہیں گے۔

غالب کے خطوط میں ان کو پورے ملک کی قسمت [illegible] چند لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ غالب کو اپنے طورے ماننے سے غرض [illegible] زندگی اور شاعری کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ درد کو وہ دنیا سے بے گانہ [illegible] ناکامیوں کی وجہ سے زندگی سے بیزار قرار دیتے ہیں، جب کہ درد کے یہاں زندگی ایک طوفان کی طرح [illegible] ناکامیوں سے کام لینے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور محبت کو نبھانا جانتے ہیں۔

اختر صاحب کو صنعتی دور سے پہلے [illegible] ادب بے حرکتی،

بے حسی، اضمحلال، بے خبری اور بے پروائی کا آئینہ دار ہونے کے سوا ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ یہی ادب اس بے حسی، بے حرکتی وغیرہ پر تنقید بھی کرتا ہے یا نہیں۔ صنعتی دور سے پہلے انسانی تاریخ کے ایک بہت بڑے جُگ کو سامنتی یا فیوڈل یا جاگیرداری کا دور کہا گیا ہے، لیکن اس کا یہ مفہوم کہ اس دور میں سرے سے کوئی تغیر ہی پیدا نہیں ہوا یا تاریخی قوتوں کا کوئی تصادم اس سارے عرصے میں ہوا ہی نہیں، ایک ایسا غیر جدلیاتی اور سہولت پسندانہ انداز نظر ہے جسے اینگلز یا مارکس کی حمایت بھی حاصل ہو جاتی تب بھی ناقابلِ قبول ہی رہتا۔ لیکن شکر ہے کہ مارکس اس حد تک مارکسی نہ تھا اور بقول مشہور مارکسی نقاد لوکاچ کے (جس کا بعد میں اختر حسین رائے پوری نے اظہار پسندیدگی کے ساتھ نام لیا ہے) تاریخ اور تہذیب کے بارے میں ایسے تصورات سوقیانہ سماجیات سے جنم لیتے ہیں۔

لوکاچ ہی نے کلاسیکی ادب کے سلسلے میں دو متقابل نقطہ ہائے نظر کی یوں وضاحت کی ہے:

"اہلِ مدرسہ، کلاسیکی ادب کی جمہوری جڑوں اور اس کی ترقی پسندانہ کیفیت کو محسوس کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ چنانچہ اس ادب کے جمالیاتی مسائل کا رابطہ نازک اجتماعی سوالوں سے اور قومی تاریخ کے ماضی و حال اور مستقبل سے اوجھل رہ جاتا ہے۔ اسی لیے کلاسیکی کارنامے بے جان دکھائی دینے لگتے ہیں اور اسلوب کے اوپری عناصر (جیسے صحتِ الفاظ و تراکیب) محتوے کے بیرونی پہلوؤں (مثلاً فنِ محض، اجتماعی حقیقت سے بلندی، قدامت پسندی) سے بے ربط ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کلاسیک کو ہوّا بنا کر کھڑا کر دینے سے کسی بھی قسم کی سچی ترقی نہیں ہو سکتی۔

ہر چند کہ کلاسیک کی اس مسخ شدہ تصویر اور ہر نئی چیز کا راستہ روکنے کی کوشش کے خلاف احتجاج برحق ہے، تاہم ہراول دستے کے ناقدین، اہلِ مدرسہ کی تاریخ پرستی کی ضد میں بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ وہ تاریخ ذاتی ہی مجرد تحریف کا شکار ہو جاتے ہیں اور جہاں اہلِ مدرسہ کی تاریخ ادب کلاسیک کو ایک "مقدس گائے" بنا کے رکھ دیتی ہے، ہراول دستے کا نظریۂ ادب نئے پن کے نعرے کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ پہلی انتہا فن کے سلسلے میں کسی حال اور کسی مستقبل کو نہیں پہچانتی جب کہ دوسری انتہا کسی قسم کے ماضی سے آشنا نہیں ہوتی۔ ہراول دستے کے ناقدین، لکھنے کی تکنیک میں ہر فرد نئے کمال کے موقع پر ادب میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور سارا زور اس پر دیتے ہیں کہ پرانے فیشن کی ہر چیز کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دینا چاہیے۔

دونوں انتہاؤں کی عدم تاریخیت اس وقت آئینہ ہو جاتی ہے جب وہ اپنے تصورات کو تاریخی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دریافت کتنی بصیرت افروز ہے کہ ایک دوسرے کے اتنے شدید مخالف اپنے بنیادی طریق کار میں کس قدر مماثل ہوتے ہیں۔" (ناقد اور ادیب)

اب اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ تاریخی مطالعے کا شوق رکھنے اور علی گڑھ کے پروفیسر حبیب سے فیض یاب ہونے کے باوجود اختر حسین رائے پوری کا تصورِ تاریخ خاصا تجریدی اور طریق کار خاصا میکانکی ہے۔ پھر کلاسیکی ادب پر اس تصور اور طریق کار کا اطلاق انھوں نے جس بے دریغ انداز میں کیا ہے اس نے صرف اہلِ مدرسہ کی دفاعی حس کو ہی بیدار نہیں کیا بلکہ تنظیم کی طرف سے بھی لامتناہی وضاحتوں کا باعث بنا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یہ فیصلہ بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے معترضین میں سے کون تنظیمی مصلحتوں کی وجہ سے اختلاف

نحو ہے اور کون کلاسیکی ادب کے تقدس کی محافظت پر مامور۔ ایک طرف سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری نے غالب اور میر کو اس تنقیدی قتلِ عام سے بچانے کے لیے جو کچھ کہا ہے اور دوسری طرف احتشام حسین اور وقار عظیم نے قدیم اردو ادب میں ترقی پسندی کی روایت کو دریافت کرنے کی جو کوششیں کی ہیں، ان کا مقصد اس سے زیادہ نہیں لگتا کہ اختر حسین رائے پوری کی انتہا پسندی کا الزام تنظیم کے سر نہ آ جائے۔ جہاں تک لوکاچ کے الفاظ میں ادب پر غیر تاریخی اور غیر اجتماعی اصطلاحات کے غیر تنقیدی اطلاق کا تعلق ہے تو تنظیم کے رسمی اور غیر رسمی مدافعین اس کی جگہ کوئی مثبت اصول وضع کرنے میں ناکام ہو کر ادب کا کوئی مارکسی طریق کار استعمال کر کے دکھاتے ہیں۔

خود اختر حسین رائے پوری نے بعد میں لکھا ہے کہ قدیم شاعروں نے "جو زبان کی خدمت کی ہے اور اسلوب کے جو سانچے تیار کیے ہیں" ان سے استفادے کا امکان موجود ہے، لیکن یہاں بھی وہ جدلیاتِ ادب کی بجائے سہولت پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ جس طرح مارکس کے نزدیک خیال کو زبان سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، اسی طرح زبان اور اسلوب کو بھی خیال اور شعور سے بے تعلق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ روایت سے بے اعتنائی برتنے کے الزام کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ پرانی روایات سے مسلسل لے دلوں سے گریز ناممکن ہے۔ اس لیے زبان و ادب میں کوئی بھی انتہا پسندی ... بر قرار نہیں رہ سکتا۔ ہم اسے پوڑھوں کے نام پیوا اور دیانی دلوا ہیں یہ توضیح کتنی بھی قابلِ قدر ہو، جب تک ہم اپنے بزرگوں پر تنقید کرتے ہوئے ان کے کمالاتِ انسانی اور تہذیبی کردار کی اہمیت دریافت نہیں کرتے اس وقت تک رسمی اقدام کی یہ صورتیں بامعنی نہیں بن سکتیں۔

سنسکرت اور قدیم ہندی ادب کے بعد اختر حسین رائے پوری کا روسی ادب ... مطالعہ ان کے خصوصی امتیازات میں سے ہے۔ ممکن ہے اس کا آغاز کلکتے میں ان کے قیام کے دوران ہوا ہو لیکن علی گڑھ ہی میں جہاں طالب علمی کے دور میں انھوں نے اپنا دوسرا مبسوط مقالہ ۱۹۳۵ء کے دوران "سوویٹ روس کے ادب" پر لکھا، شاید سر دست جو چند مثالیں ... مثال سے اس دلچسپی کو مہمیز ملی ہوگی۔ خواجہ صاحب وہاں کچھ دیر سے روسی افسانوں کا ترجمہ کر رہے تھے۔ یہ مقالہ "ادب اور زندگی" ... طویل تو نہیں تھا، پھر بھی ان کا کوئی تیسرا مقالہ نہ اتنا مفصل ہے اور نہ اتنا اہم۔ پھر بھی عام طور سے اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں کیا جاتا۔ صرف مجنوں گورکھپوری صاحب نے اردو زبان کو روسی ادب سے روشناس کرانے کا ذکر کیا ہے ... جو یہاں محض روشناس کرانے کی بات بھی نہیں۔ درحقیقت یہی ایک تحریر اختر حسین رائے پوری کو تنظیم کے رسمی ناقدین سے ممتاز بنانے کے لیے بہت کافی ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ ہندوستانی ... دو کے عام مدرسین کی طرح یورپی ادب کے علاوہ روسی ادب سے بہت کم ... شناسائی رکھتے ہیں اور جو تھوڑی بہت واقفیت ان کو حاصل ہوتی ہے سوویٹ روس کی تبلیغاتی مطبوعات کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ ... اختر حسین رائے پوری نے سوویٹ دور کے ادب پر ... آزادی اور بے تکلفی سے نظر ڈالی ہے جو انھوں نے اپنے پہلے مقالے میں برصغیر کے ادب سے روا رکھی تھی۔

جب یہ مقالہ لکھا گیا تو روس میں اسٹالن کو برسر اقتدار آئے سولہ برس بیت چکے تھے ... میں ٹراٹسکی کا مہذب انداز تنقید مردود قرار دیا جا چکا تھا جیسا کہ مضمون کے آخر میں پڑھاتے ہوئے لوٹ سے معلوم ہوتا ہے، روسی ادیبوں کی ... کانگریس منعقدہ ۱۹۳۴ء کی رپورٹ مقالے کے بعد ہندوستان پہنچی تھی، اس لیے تہذیبی معاملات میں اسٹالین کے ادبی مشیر ژدانوف کا عروج ابھی سامنے نہیں آیا تھا نہ کارل راڈیک کی گرفتاری عمل میں آئی تھی، لیکن ٹراٹسکی، درنسکی اور یرولنسکی جیسے شائستہ اور با مذاق ناقدین ... کی طرف ... جا چکے تھے۔ یسینن اور مایاکوفسکی خودکشی کر چکے تھے، اسحاق بیبل زیادہ تر خاموش ہو چکا تھا اور رومانی حلقوں کے ... اور پلنیاک جیسے عمدہ ادیب جو انقلاب سے بھی ہمدردی رکھتے تھے محض اس وجہ سے معتوب قرار دیے جا چکے تھے کہ سوویت حکومت کی تبلیغات کا سطحی انداز قبول کرنے میں تامل تھا۔ حتیٰ کہ

گورکی بھی ادب کے محتسبوں سے محفوظ نہیں تھا۔ اختر حسین رائے پوری نے سوویٹ حکومت کے احتساب کی اس "مکروہ صورت" پر تنقید کی "پرولتاریہ پرستوں" کی تہذیب دشمنی کو بے نقاب کیا اور پنج سالہ منصوبے کے ساتھ وجود میں آنے والی سرکاری انجمن دانشوران کے کردار کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ "ادب اور زندگی" کے فوراً بعد یہ فقرہ بھی انھیں کے قلم سے نکلا کہ ان کو رمیوں کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ طرزِ بیان میں کلاسیکل انداز اختیار کیا جائے، ماحول پر کوئی فلسفیانہ یا نفسیاتی بحث کی جائے یا انقلاب کے پس منظر میں انسان کے احساسات کا ذکر کیا جائے۔" حیرت ہے کہ مابعد انقلاب کے ادب میں اتنی اجازت لازمی ہوا اور سیکڑوں برس پہلے کے ادیبوں کو معمولی سی داخلیت بھی حرام ہو۔ بعض فقرے تو یہاں ان کے قلم سے ایسے بھی نکل گئے ہیں کہ پہلے مقالے کی بہترین تردید خود ان کے دوسرے مقالے سے ہو جاتی ہے مثلاً آخری نوٹ میں ان کا یہ کہنا کہ (روسی ادیبوں کی) "اس کانگرس کے بعد روس میں جمالیاتی اور فنی خوبیوں کا چرچا عام ہو گیا . . . روسی اور دوسری زبانوں کے پرانے ادیبوں کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر مقبول عام ہونے لگیں۔ اب اگر کوئی پوچھتا کہ شیکسپیر سولھویں صدی میں کیوں پیدا ہوا اور اگر پیدا بھی ہوا تو آج کی باتیں کیوں نہ لکھ گیا، تو اسے دیوانہ قرار دیا جاتا۔"

ہم تو خیر کالی داس اور بھرتری ہری، کبیر اور نظیر، میر اور غالب کے بارے میں ایسی باتیں لکھنے والے نقادِ محترم کی شان میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتے۔ بلکہ انھوں نے سوویٹ روس کے ادب کا جو تنقیدی جائزہ آج کے پچاس برس پہلے لیا تھا، اس کی وجہ سے ان کی تعظیم کو لازمی سمجھتے ہیں کہ پوری ترقی پسند تحریک میں کم سے کم، اردو زبان کی حد تک نہ کسی نے سوویٹ ادب کی سراسیمگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں عالم گیری شان کے فقدان اور شاعری کے پست معیار کی طرف توجہ دلائی ہے اور نہ تبلیغاتی تصنیفات میں انسانی نفسیات سے تغافل اور بے خبری کی بنیاد پر ان کو رد کیا ہے۔ اس مقالے میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ سرکاری احکام آرٹ کی تخلیق نہیں کر سکتے، اور دوسری جگہ اس بات پر افسوس کیا ہے کہ بیرونی حملے کے خوف اور ملکی ضروریات نے حکومت کو ادب پر ازسرِنو پابندیاں لگانے پر مجبور کر دیا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ "مارکسی نظریے میں انسان کی داخلی کیفیت کے لیے کم گنجائش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوویٹ ادب کلاسیکل روسی ادب کی عالم گیر اپیل سے محروم ہے اور یہ حیرت کا مقام ہے کہ جو انقلاب تاریخِ عالم کا سب سے اہم واقعہ سمجھا جاتا ہو، اس کی ادبی تصویر کوئی بین الاقوامی حیثیت نہیں رکھتی۔ کسی قسم کا فلسفیانہ اور نفسیاتی مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ سطحی ہے اور اس میں کوئی گہرائی اور نکتہ رسی پیدا نہیں ہوئی۔"

اس آخری نقرے پر یہ دلچسپ حاشیہ بھی لگا ہوا ہے کہ "انقلاب روس کے بعد ترقی پسند ادب کا بہترین حصہ روس میں نہیں بلکہ روس کے باہر لکھا گیا۔" بعد میں جب اختر حسین رائے پوری پیرس جاتے ہیں تو بڑے چاؤ کے ساتھ روس کے جلاوطن ادیبوں میں سے کیرین اور مریژکوفسکی سے ملاقات کرتے ہیں جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی ایک نشری تقریر میں اور اس کے علاوہ "گردِ راہ" میں بھی کیا ہے۔ یہاں پہنچ کر محسوس ہوتا ہے کہ ابتدائی فتوے بازی کے بعد اب ان کے اندازِ نظر میں خاصی وسعتِ قلب پیدا ہو چکی ہے لیکن درحقیقت اس کی ابتدائی جھلک سوویٹ ادب پر ان کے جائزے میں ہی مل جاتی ہے۔

پہلے اور دوسرے مقالے کو یکے بعد دیگرے پڑھیں تو یقین نہیں آتا کہ یہ ایک ہی لکھنے والے کی، ایک ہی سال میں لکھی ہوئی تحریریں ہیں۔ ممکن ہے کوئی اس وجہ سے ناقد کی شخصیت کو دولخت قرار دے ڈالے یا پھر تنظیم کے لیے ایک ایسی منضبط شخصیت کو نامناسب سمجھے۔ اتنا بہرحال ماننا پڑے گا کہ انھوں نے مارکسی تنقید کی جدلیاتی اطراف کو باری باری اپنی شخصیت میں جذب کرنے کی کوشش ضرور کی ہے اور تنظیم کی وکالت کرنے کی بجائے آزادی کے ساتھ تحریک سے ہمدردی اور تحریک پر تنقید کا حق استعمال کیا ہے۔

روسی ادب سے ان کی دلچسپی بعد میں ان سے گورکی کی آپ بیتی کا تین جلدوں میں ترجمہ کراتی ہے جس کا شمار اردو زبان کی اہم ترین کتابوں میں ہونا چاہیے اور جس کا مقدمہ اپنی جگہ ایک عمدہ تنقیدی تعارف کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت کا تذکرہ یہاں لازمی ہے کہ اس لحاظ سے بھی ترقی پسندوں کے ناقدوں میں اختر حسین رائے پوری کی ادبی دیانت کو ایک استثنائی حیثیت دینا لازم ہو جاتا ہے۔ ذرا یہ فقرے ملاحظہ ہوں جو اسی مقدمے کے مختلف مقامات سے لیے گئے ہیں۔

"آپ بیتی کی تینوں جلدیں ... روز کے چند اوراق اور چند افسانے گورکی کے شہکار ہیں ... یہاں آ ... کی نہیں ... آرٹسٹ ... کو اپنے اوج کمال پر دیکھتے ہیں ..... من کے سنسار میں جو کچھ ہوتا ہے ... سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہا۔ تو اسے دُور کی چیزوں کو دیکھنے کا ڈھب آتا تھا ... کے دل و دماغ کو سمجھنے کا ... شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی زندگی گھر میں نہیں بلکہ سڑک پر گزری اور اسی لیے وہ باہر کی دنیا سے باخبر مگر اندر کی ہونی انہونی سے بےخبر رہا .... اگر آپ اس آپ بیتی کا مقابلہ اس کے ناولوں سے کریں گے تو میری رائے سے اتفاق کریں گے کہ اس کا اصل میدان سوانح نگاری ہے ... اس کی تحریروں میں نصیحت کا پہلو بہت نمایاں ہے ..... اور یہ گورکی کے آرٹ کا بڑا عیب ہے ... لینن کی دوستی کا اثر تھا کہ رفتہ رفتہ اس کی باغیانہ خو ایک ڈھرّے پر لگ گئی اور اس کا قلم احتجاج سے بڑھ کر انقلاب کی تلقین کرنے لگا۔ اس قسم کی تحریروں میں اس کا ناول "مدر (ماں)" سب سے زیادہ ممتاز ہے ... (روس سے) دور بیٹھ کر گورکی زیادہ وسیع النظری اور توازن سے اپنے خیالات و مشاہدات کو سمیٹ سکتا تھا۔ روس کے اندر وقتی ہنگاموں کا اثر اس کی پُرجوش طبیعت فوراً قبول کر لیتی تھی اور وہ زندگی کی بےکرانی کو فراموش کر جاتا تھا۔"

ممکن ہے کوئی تنظیم پرست محقق یہ ثابت کر دکھائے کہ ان میں سے فلاں فلاں فقرہ، فلاں فلاں برطانوی امریکی یا فرانسیسی نقاد سے مستفاد ہے۔ تب بھی تلقین کی بجائے احتجاج، وقتی ہنگامہ پسندی کی جائے وسیع النظری اور نصیحت کی بجائے آرٹ کے لیے جو ترجیح یہاں موجود ہے اسے کسی اور کے سر کیوں منڈھا جائے؟ ترقی پسندی کے سب سے بڑے دیوتا گورکی کی شان میں جو بےتکلفی انھوں نے روا رکھی ہے کسی مندر کے پجاری سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ تاہم یہ بےتکلفی بےانصافی اور بیہودگی کی حد تک نہیں پہنچتی اور کوئی اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ لکھنے والا گورکی سے یا انقلاب روس سے بیزار ہو گیا ہے تو درست نہیں ہوگا۔

سوویٹ روسی ادب کے جائزے میں انھوں نے شاید ہی کسی جگہ شیفتگی یا ناپختگی کا مظاہرہ کیا ہو۔ "ادب اور زندگی" لکھنے کے فوراً بعد ایسا کیسے ممکن ہوا؟ یقیناً انھوں نے جلاوطن روسی مورخ ادب پرنس میرسکی سے اور (شاید) گلیب ستروف کے مقالات سے فائدہ اٹھایا ہے جو اس وقت تک چھپنے شروع ہو گئے تھے۔ یہاں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اس زمانے میں روس سے شائع ہونے والا "بین الاقوامی ادب" کا تبلیغاتی مجلہ سوویٹ ادب کی وہی تصویر کھینچنے پر مامور تھا جو منظور شدہ ہو لیکن اختر حسین رائے پوری نے محض اس رسمی ذریعے پر انحصار نہیں کیا اور جس طرح انھوں نے استالین کے حریف ٹراٹسکی سے اور نا رکسٹ مفکر کروپاٹکن سے اخذ و استفادہ میں قباحت نہیں سمجھی تھی، اسی طرح روس کے معتوب ناقدین میں سے کارل رادیک اور درونسکی سے انھوں نے پارٹی کی ادبی پالیسی سے اختلاف کرنا سیکھا۔ سوچیے تو ایک ایسا نقاد، ہمارے یہاں کی ادبی تنظیم میں کتنی دیر تک برداشت کیا جا سکتا تھا؟

(۴)

سنسکرت اور قدیم ہندی اور سوویٹ روس کے ادب سے ۔ ان کے علاوہ برصغیر کی جدید زبانوں میں سے بنگالی اور گجراتی اور کناڑی کے ادب سے ان کی دلچسپی (سب میں براہ راست ہو یا چند ایک میں) اختر حسین رائے پوری کا ایک ایسا امتیاز ہے جس میں اب تک کوئی ان کا حریف پیدا نہیں ہوا (اور بعد میں فرانسیسی اور فارسی ادب سے ان کے شوق کو شامل کیا جائے تو پلہ اور بھی بھاری ہو جاتا ہے) اگرچہ ان دونوں کا کوئی خاص تعلق کم سے کم ان کی تنقید سے دکھائی نہیں دیتا۔ ماسوا چند ایک معمولی اشاروں کے) یوں نقاد کے لیے ہفت زبان ہونا ضروری تو نہیں لیکن ایک ایسے ادبی ماحول میں جہاں نہایت معمولی اُردو اور معمولی سے بھی کم تر انگریزی جاننے کو نہ صرف کافی بلکہ درجۂ کمال پر فائز ہونے کے برابر سمجھا جاتا ہو، اس اہلیت کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھنا یا بے مصرف و بے حاصل سمجھنا کون سا مشکل ہے۔ اسی طرح یہی ایک صلاحیت نقدِ ادب کے لیے کتنی ناکافی ہے، اس کا اندازہ بھی اختر حسین رائے پوری کے تنقیدی جائزے پڑھنے کے بعد کوئی دشواری نہیں۔ درحقیقت اگر کوئی یہ نہ جانتا ہو کہ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور چند ایک زبردست ادبی کارناموں کا دوسری زبانوں سے ترجمہ بھی کیا ہے تو ان کی تنقید سے یہ اندازہ لگانا کہ ادب سے انھیں کوئی گہری دلچسپی یا ہمدردی ہے آسان نہیں ہوگا۔ شاید ایک مضمون ("ٹیگور کی ایک نظم") کے سوا ان کا کوئی مقالہ کسی ادبی متن کی تہہ میں اُترتا ہوا نظر نہیں آتا اور جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے اگر ان کا مزاج اس کے مطالعے سے کوئی مناسبت رکھتا تھا تو اس کی شہادت ان کے مقالات سے باہر موجود ہو تو ہو۔ ممکن ہے جیسا کہ "گردِ راہ" کے بعض مقامات سے اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے اپنی چہل سالہ خاموشی کے دوران اپنے ادبی مطالعے کو افقی سمت میں وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ، عمودی سمت میں عمیق بھی کر لیا ہو، لیکن اس کا کوئی فائدہ تنقید کو حاصل نہیں ہوا۔

مثلاً شروع میں انھوں نے برصغیر کے قدیم ادب کا کچھ اس انداز سے تیا پانچا کیا تھا: "کالی داس، کبیر، نظیر اور غالب وغیرہ کے سوا کوئی ایسا شاعر نہیں جسے مستقبل کا انسان عزت سے یاد کرے گا۔" قطع نظر اس سے کہ مستقبل کا انسان کتنا مہذب ہوگا اور ادب سے کوئی سروکار رکھے گا بھی یا نہیں، کیا اس "وغیرہ" کا کوئی جواب ہو سکتا ہے؟ پھر یہ لکھنے کے چالیس برس کے بعد جو انھوں نے کچھ ایسے نام لیے ہیں جن کو اس "وغیرہ" کی جگہ رکھا جا سکے تو کیا یہ تلافی بہت زیادہ بعد از وقت نہیں لگتی؟

اسی طرح انھوں نے "گردِ راہ" میں ایک جگہ فرمائش کی ہے کہ "اگر کوئی سنسکرت اور ہندی کے ناصحانہ دوہوں کے پس منظر میں (مرزا) صائب کی تمثیلی شاعری کا مطالعہ کرے تو سبکِ ہندی کی ڈور ہاتھ لگ جائے گی۔" ساتھ ہی یہ بھی کہ لسانی ناواقفیت کی بنا پر کسی نے یہ تقابلی مطالعہ نہیں کیا اور "سبکِ ہندی" کا کوئی خاطر خواہ تجزیہ نہیں ملتا۔ تاہم خود یہ لسانی واقفیت رکھنے کے باوجود انھوں نے اس تجزیے کی زحمت قبول نہیں کی۔ لیکن انھوں نے یہ فیصلہ ضرور دے دیا ہے کہ اس طرز کے بانیوں نے ہندوستان کے ماحول سے متاثر ہو کر اس نئی طرز کی ایجاد کی، حالانکہ یہ وہی بات ہے جو ایران کے ناقدین شروع سے کہتے آئے ہیں بلکہ اسی وجہ سے اس کو "سبکِ ہندی" کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر چند ہماری تعلیمی بیوروکریسی کا وطیرہ یہی ہے کہ نتیجہ ہمارا، تحقیق تمھاری، لیکن اختر حسین رائے پوری کا رویہ بھی یہی ہو تو فریاد کس سے کی جائے؟

یہاں نکتے کی بات شاید یہ ہو کہ سنسکرت ادب ان کی اولین دلچسپی تھی، لیکن جب فارسی ادب کا شوق بہت بعد میں پیدا ہوا تو ان دونوں کو شخصی اور علمی سطح پر مربوط کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن جدلیاتی تسلسل کا عمل مدت ہوئی منقطع ہو چکا تھا، اس لیے ضرورت، فرمائش بن کر رہ گئی۔ پیش روی کا یہ انجام خاصا عبرت ناک ہے!

ایسی ہی صورت اقبال کے سلسلے میں پیش آئی۔ "ادب اور زندگی" کے ایک حصے کا عنوان تھا: "فاشیزم اور اقبال" اور مقصود تھا یہ دکھانا کہ "اقبال فاشیت (نسطائیت) کا ترجمان ہے اور یہ درحقیقت زمانۂ حال کی جدید سرمایہ داری کے سوا کچھ نہیں۔" اب تو خیر اس قسم کی

باتیں پیش پا افتادہ ہو چکی ہیں لیکن اس وقت جب یہ مضمون لکھا گیا (۱۹۳۵ء میں یعنی اقبال کی وفات سے کوئی تین سال پہلے) تو یہ اندازِ تنقید یقیناً نیا تھا۔ بعد میں رائے پوری نے اپنا یہ حکم لکھا ہے کہ کوئی کچھ لکھے تو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ اس نے کب یہ بات کی تھی اور کیوں کی تھی؟ اس لیے ہم بھی معذرت کے طور پر نہ سہی، وضاحت کی خاطر یہی طریقہ اپنا لیتے ہیں۔ زمانہ وہ تھا جب یورپ میں مسولینی کی زیرِ قیادت 'فاشزم' یعنی اطالیہ کی ضد جمہوری، ضد اشتراکی قومی تحریک کا اثر پھیل رہا تھا چنانچہ جرمنی میں ہٹلر کی "قومی اشتراکی" پارٹی برسرِ اقتدار آ چکی تھی اور ہسپانیہ میں ایک اسی قسم کا گروہ وہاں کی اشتراکی پارٹی کے ساتھ نبرد آزمائی کو تیار ہو رہا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں منعقد ہونے والے یورپی اور سوویٹ ادیبوں کے اجتماعات میں "تہذیب کے دفاع" کی خاطر اور "اشتراکیت کے تحفظ" کے لیے تمام دنیا میں فاشزم کے خلاف مشترکہ محاذ بنانے کی اپیل کی گئی تھی (درحقیقت ترقی پسند تنظیم کا قیام اسی پالیسی کے تحت وجود میں آیا تھا) اور اس وقت سے بہت سے ملکوں میں فسطائی طرزِ فکر رکھنے والوں کی نشان دہی اور ان کی مخالفت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اب اقبال کی "بالِ جبریل" میں مسولینی کے اقتدار کے فوراً بعد یعنی ۱۹۲۲ء میں لکھی ہوئی ایک نظم شامل تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے جمہوریت اور اشتراکیت پر بھی تنقید کر رکھی تھی۔ چنانچہ اقبال کو ایک فسطائیت پسند شاعر بنا کر پیش کرنے کے لیے تھوڑا بہت مسالہ موجود تھا۔

اختر حسین رائے پوری نے یہ فریضہ سب سے پہلے انجام دیا، شاید اس لیے کہ وہ لندن میں مقیم ترقی پسند تنظیم کی قرارداد تیار کرنے والوں کی بہ نسبت بین الاقوامی صورتِ حال سے کچھ کم باخبر نہیں تھے، پھر موقع پر موجود تھے اور ایک نئی قسم کی تنقید کا آغاز کر رہے تھے۔ یوں بھی اقبال اس وقت مسلمانانِ ہند کے ذہنی قائداوران کے لیے ایک جداگانہ ریاست کے طلب گار بن چکے تھے جو اپنا ایک انقلابی نصب العین رکھنے کے باوجود بین الاقوامی انقلابیوں کی نظر میں ایک ارتجاعی قدم تھا۔ اختر حسین رائے پوری کے الفاظ میں وہ لوگ جو "دنیا سے قوم، وطن، رنگ نسل اور طبقہ و مذہب کی تفریق مٹانے کی تلقین کو ادب کا فرضِ اولین سمجھتے تھے اور اس جماعت کے ترجمان تھے جو اس نصب العین کو پیشِ نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہو"۔۔۔ ان لوگوں اور اس جماعت کی نظر میں اقبال سے بڑا سدِ راہ کوئی نہ تھا، گاندھی اور ٹیگور بھی نہیں جن کو یہ لوگ رجعت پسند، لیکن عملی طور پر اپنا شدید مخالف نہیں سمجھتے تھے۔ بہتر تو یہ تھا کہ اقبال نے جو ملوکیت کے ساتھ، اشتراکیت پر تنقید کی تھی یا تو اس کو محکوم اقوام کی مطلق حریت پسندی کا تقاضا سمجھ کر قبول کر لیا جاتا (جیسے آج ہم دونوں سپر طاقتوں سے الگ تیسری دنیا کی بات کرتے ہیں) یا پھر محکوم اقوام کے ساتھ اشتراکیت کی ہمدردی کو واضح کیا جاتا، لیکن آسانی کا راستہ یہی تھا کہ اقبال پر ایک ناگوار لیبل چپکا کر بحث اور دلیل کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ اختر حسین رائے پوری نے یہی راستہ اختیار کیا، بلکہ جو لوگ اقبال کے اثر و نفوذ کو دیکھ کر بے چین ہو رہے تھے، ان کو جوابی عمل کا راستہ بھی دکھایا۔

'جاوید نامہ' سے اشتراکیت اور ملوکیت' دونوں کی یزداں ناشناسی، آدم فریبی پر تین اشعار نقل کرنے سے پہلے انھوں نے یہ لیبل لگانا پسند کیا: "فاشیزم کا ہم نوا ہو کر وہ اشتراکیت اور ملوکیت دونوں کی مخالفت کرتا ہے"۔ یہاں فاشیزم کی ہم نوائی کا جوابی الزام لگانا ضروری نہیں تھا اور یزداں ناشناسی نہ سہی، آدم فریبی کی تردید کر دی جاتی تو کافی تھا۔ اس سے بڑھ کر رائے پوری صاحب نے تو مسولینی کو اقبال کے خواب کی تعبیر تک کہہ دیا، جب کہ اقبال نے جو کچھ کہا روما الکبریٰ کی دگرگونی کے بارے میں کہا اور مسولینی کی "کرشماتی قیادت" کے بارے میں۔۔۔ حالانکہ یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی تغیر رونما ہو یا کوئی بھی شخصیت افقِ عالم پر نمودار ہونے لگے تو اقبال کو اس سے ایک فطری دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی اور جیسا کہ "فاشزم کے تین چہرے" کے مصنف نے لکھا ہے، مسولینی کا پہلا چہرہ نہ صرف اطالیہ کے لیے بلکہ دوسرے یورپی ممالک کے لیے بھی جو پہلی جنگِ عظیم کے بعد مایوسی و بے عملی کا شکار ہو رہے تھے، عمل اور امید کا چہرہ تھا اور یہی اقبال کی نظم کا

مفہوم ہے۔ اور اقبال کا کوئی قصور ہے تو اتنا کہ وہ قیادت کا ایک ہی کرشمہ دیکھ کر مرعوب ہو گئے اور آنے والے خطرات کا اس وقت اندازہ نہ کر سکے، لیکن یہ تنہا ان ہی کا قصور نہیں تھا، فرانس اور جرمنی کے کئی ایک اشتراکی دانشور فلسفی جورج سوریل اور ڈراما نگار برنرڈ شا بھی شروع شروع میں مسولینی سے اسی طرح مرعوب ہوئے تھے۔ (قطع نظر لارنس، ژیٹس اور ایذرا پاؤنڈ کے جن کی فسطائیت زیادہ گہری تھی)۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ 'بال جبریل' کی اس نظم کے بعد بھی اقبال نے مسولینی اور اس کی تحریک پر کم سے کم دو نظمیں اور لکھی ہیں جو 'ضرب کلیم' میں شامل ہیں۔ ان میں سے پہلی نظم "ابی سینیا" پر ۱۸ اگست ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج ہے اور یہ واضح طور پر اطالیہ کے حملۂ ابی سینیا پر اقبال کے ردِ عمل کو پیش کرتی ہے ؎

غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش

ساتھ ہی اقبال نے مسولینی کی طرف اپنی ابتدائی پُر امید رغبت کو بھی مایوسی میں ڈھلتے ہوئے دکھایا ہے ؎

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئنہ
روما نے کر دیا سرِ بازار پاش پاش
پیرِ کلیسا! یہ حقیقت ہے دل خراش

دوسری نظم "مسولینی" کا ذیلی عنوان ہے۔ "اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے" اور اس میں مسولینی کی زبان سے دونوں طرف کے ان استعمار پسندوں کو جواب دیا گیا ہے جو اس کی طرح "ایک ہی تہذیب کے اوزار" ہیں اور اپنی اپنی قسم کی توسیع پسندی میں مصروف رہ چکے ہیں ؎

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

یہاں اقبال مسولینی کی "کرشماتی قیادت" کی کشش سے بہت دور چلے جاتے ہیں اور اس کو محض استعماری تشدد کا ایک تازہ نمائندہ قرار دیتے ہیں جس پر اعتراض کا حق صرف ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جو ہر قسم کے استعمار اور استبداد کے خلاف ہوں، چاہے سرمایہ داری کے نام پر ہو یا اشتراکیت کے نام پر۔

آخر میں جو نوٹ لکھا ہے اس کی رُو سے یہ نظم ۲۲ اگست ۱۹۳۵ء کو شیش محل، بھوپال میں لکھی گئی جہاں اقبال، سر راس مسعود کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ممکن ہے وہیں انھوں نے اختر حسین رائے پوری کا مقالہ "ادب اور زندگی" بھی دیکھا ہو جو مہینہ بھر پہلے شائع ہو چکا تھا اور شاید اسی نے ان کو اُکسایا ہو کہ اس پرانی نظم کو جو اعتراض کا باعث بنی، آگے بڑھا کر بات کو ایک نیا رُخ دے سکیں۔

خود اختر حسین رائے پوری کا خیال ہے کہ ۱۹۳۶ء میں حالی صدی کے موقع پر جب پانی پت میں اقبال سے اُن کی آخری ملاقات ہوئی تو زیرِ بحث مقالہ ان کی نظر سے گزر چکا تھا اور جب کسی نے ان سے کہا (بعد میں ایک انٹرویو سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات حفیظ جالندھری نے کہی تھی) کہ یہ صاحب تو آپ کی شان میں سخن گسترانہ باتیں لکھ چکے تھے تو انھوں نے کمال شفقت سے فرمایا کہ "ایسے مخلص نوجوانوں کی میں قدر کرتا ہوں۔ بے جان لوگوں کے اتفاق پر جان دار لوگوں کے اختلاف کو ترجیح دیتا ہوں۔"

اس واقعے کے بعد "گرد راہ" میں یہ بھی لکھا ہے کہ "اس وقت میں نے اقبال کا کلام جستہ جستہ پڑھا تھا۔ اب یعنی کوئی ۱۹۲۱-۳۲ء

برس کے بعد۔ م ع س) انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی شاعری اور شخصیت کی عظمت کا اقرار کروں۔ غمِ دوراں کا ایسا نوحہ خواں اور عظمتِ انسان کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہ ہوا۔"

انصاف کا تقاضا تو یہ بھی تھا کہ انصاف میں تاخیر نہ ہو لیکن "ادب اور زندگی" کے آخر میں جو نوٹ کتاب میں شامل کیا گیا (شاید ۱۹۴۳ء میں) وہاں بھی "اسلامی فاشیسٹ" نے تصورِ پاکستان میں "اقلیت کی ڈکٹیٹرشپ" قایم کرنے کا الزام موجود تھا، حالانکہ پاکستان کے تصور کا تو مفہوم ہی یہ تھا کہ اقلیت کو ایسا نہ کرنا پڑے۔ حیرت اس پر بھی ہے کہ جب اختر حسین رائے پوری نے پاکستان کے قیام کو ناگزیر سمجھ کر دہلی سے ہجرت کی، بقول محمد حسن عسکری یہ کہہ کر کہ یہاں تو فسطائی حکومت ہوگی، تب بھی انھیں اپنی بے انصافی کا حساب بے باق کرنے کا خیال نہیں آیا۔

طاہر مسعود سے انٹرویو کے دوران البتہ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ بعد میں جب اقبال کا کلام پڑھ کر ان میں اسے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی تو اقبال کی صد سالہ برسی کے موقع پر (یعنی ۱۹۷۷ء میں) انھوں نے "بیسویں صدی کی شاعری میں اقبال کا مرتبہ" کے عنوان سے جامعہ کراچی میں ایک تقریر کی تھی اور اس میں انھوں نے دنیا کے چار بڑے شاعروں (رلکے، والیری، ایلیٹ اور ٹیگور) سے ان کا موازنہ کیا تھا۔ اب یہ تو معلوم نہیں کہ اس موازنے میں انھوں نے خود اقبال کے بارے میں کیا کہا اور دوسرے بڑے شاعروں سے ان کا تقابل کس انداز سے کیا (اس لیے کہ اس تقریر کا متن یا اس کی تلخیص ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے یہ بھی ان مضامین میں شامل ہو جن کے بارے میں انھوں نے "حریت" والے انٹرویو میں کہا ہے کہ ان میں ذرا نوک پلک درست کرنے کی ضرورت ہے جس کی فرصت نہیں اور سچ پوچھیے تو ان کی ضرورت بھی نہیں) تاہم اتنے بڑے شاعروں کا باہمی موازنہ اور وہ بھی ایک بزرگ نقاد کی زبان سے غیر ضروری نہیں ہو سکتا۔

موازنے سے یاد آتا ہے کہ ۱۹۳۸ء میں ایک بار نذر الاسلام پر لکھتے ہوئے بھی انھیں اقبال کا خیال آیا تھا اور وہاں انھوں نے ایک ایسا بصیرت افروز فقرہ لکھ دیا تھا جس کی داد نہ دینا انصاف سے بعید ہوگا۔ یہ فقرہ "پیامِ شباب" کے دیباچے کے آخر میں آتا ہے: "یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہندِ جدید کے دو سب سے بڑے مفکر شاعر، اقبال اور نذر الاسلام، مسلمان تھے۔"

اس فقرے سے پہلے ایک "اگر" اور اس کے بعد ایک "مگر" لگی ہے اور بالآخر اقبال کے مقابلے میں نذر الاسلام کو ترجیح دی گئی ہے لیکن جس وجہ سے "دونوں حرکت اور عمل کی دعوت دیتے تھے اور سرمایہ داری و سامراج کے دشمن تھے" اور پھر جس طرح انھوں نے شاعری میں "زندگی کے مقاصد کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ ان سب باتوں کا کچھ نہ کچھ تعلق ان کے انقلابی مسلمان ہونے سے ضرور ہوگا" لیکن اس وقت اختر حسین رائے پوری، اقبال کے تاریخی شعور کو "پیچھے کی طرف" بلانا سمجھتے تھے اور اسلام کی انقلابیت سے ناآشنا تھے حالانکہ بنگال کے اشتراکی مفکر ایم۔ این۔ رائے سے ان کا رابطہ تھا اور ان کا کتابچہ "اسلام کا تاریخی کردار" انھوں نے ضرور پڑھا ہوگا۔ تاہم مذہب کے بارے میں بائیں بازو کے دانشوروں کا عام رویہ وہی تھا جس کی ترجمانی رائے پوری نے کی۔

(۵)

اقبال، ٹیگور اور نذر الاسلام کے علاوہ اختر حسین رائے پوری نے اپنے دور کے جن ممتاز لوگوں کو اپنی تنقید کا موضوع (یا ہدف) بنایا ہے، ان میں پریم چند بھی شامل ہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو ان کے لیے سب سے اہم موضوع یہی ہونا چاہیے تھا۔ پریم چند سے ان کا شخصی تعلق بھی تھا، اور وہ شاعری سے زیادہ نثر، بالخصوص افسانے کے فن سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ پریم چند کے ناول "میدانِ عمل" پر ان کا تبصرہ سخن گسترانہ باتوں کے باوجود ہمدردانہ ہے۔ وہ پریم چند کی اصلاح پسندی سے متفق نہیں تھے اور انھیں انقلابیت کی طرف مائل ہوتا ہوا

دیکھ رہے تھے تب بھی انھوں نے پریم چند کی خواہش کے باوجود "گؤدان" پر نہیں لکھا، بعد میں بھی نہیں۔ حالی سے لے کر پریم چند تک کے دور کو وہ نثر کا دور کہتے ہیں اور انھیں اس امر کا سخت افسوس ہے کہ اردو نثر کی نشوونما اس دور میں بھی شاعری کی طرف بے وقت توجہ کی بنا پر رک گئی بلکہ اردو صحافت بھی ابوالکلام اور ظفر علی خاں کی شاعرانہ انشا پردازی کی وجہ سے حالات کے تجزیے تک نہ پہنچ سکی۔

خود اختر حسین رائے پوری کی تنقیدی نثر پر کسی اور نقاد کی نسبت، حالی کی سلاست اور متانت کا خاصا اثر دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ عزیز احمد نے جو ان کے یہاں "قبل از بلوغ جذباتیت کا مظاہرہ" دیکھا ہے اور ان کی تنقید کو جس "مضحکہ خیز حد تک دہشت پسندی کا شکار" بتایا ہے تو یہ مبیّنہ خصوصیات ان کے اسلوبِ تحریر کا حصہ ہرگز نہیں کہی جا سکتیں۔ آپ ان کی تنقیدی آرا کو کتنا بھی انتہا پسندانہ لیوں نہ کہیں، اس میں وہ "جوشِ جہاد" نہیں ملے گا جس کی شکایت ہمارے مہربان شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے کی ہے۔ لگتا ہے کہ زمانۂ تعلیم اور ابتدائی صحافیانہ مصروفیات کے دوران جو وقت انھوں نے کلکتے میں گزارا ہے، اس میں انھوں نے بنگالی دہشت پسندوں کی پیشہ ورانہ قاتلوں جیسی "سرد خونی" (COLD - BLOODEDNESS) کا خوب مشاہدہ کیا ہوگا اور وہیں سے انھوں نے تنقید کا ایک ایسا انداز سیکھا ہوگا جس میں سبج سبھاؤ کے ساتھ کشتوں کے پشتے لگائے جا سکیں۔ یوں تو ان سے پہلے یگانہ چنگیزی ہو چکے تھے اور کلیم الدین احمد تشریف لانے والے تھے، لیکن جس طرح وہ تاریخی طور پر ان دونوں کے درمیان واقع ہیں، اسی طرح ان کا اسلوبِ تنقید اور ان کی بے دردی دونوں کا نقطۂ اتصال معلوم ہوتی ہے۔

جیسا کہ "گرد راہ" سے معلوم ہوتا ہے، ان کی ذہنی تربیت کلکتے میں ہوئی تھی اور علی گڑھ محض ان کا میدانِ عمل تھا۔ درحقیقت اردو زبان میں ترقی پسند تحریک کی جو پیش روی انھوں نے انجام دی اور تنقید کو جس طرح بطورِ محرّک انھوں نے استعمال کیا، بنگالی زبان میں اس کا آغاز کچھ دیر پہلے سے ہو چکا تھا (بلکہ لندن میں ترقی پسند تنظیم کے اعلان نامے پر دستخط کرنے والوں میں بھی کم سے کم دو بنگالی ادیب شامل تھے اور جیسا کہ سجاد ظہیر نے بھی لکھا ہے، بنگال کے دانشوروں میں اشتراکیت کی طرف میلان پہلے سے موجود تھا) بعد میں جو شکایت ترقی پسند تنظیم کو اختر حسین رائے پوری کی انتہا پسندی سے پیدا ہوئی اس کی بنیاد بھی ایسا محسوس ہوتا ہے، بائیں بازو کی داخلی فرقہ بندی میں پوشیدہ تھی ورنہ اقبال ہوں یا کلاسیکی ادب، ان دونوں موضوعات پر کسی ترقی پسند نقاد نے (ماسوا فیض کے) بہت دیر تک کوئی متوازن آواز بلند نہیں کی چاہے وہ احتشام حسین ہوں یا علی سردار جعفری یا ہمارے محترم ممتاز حسین —

ایک اور امتیاز جو ترقی پسند تحریک میں اختر حسین رائے پوری کو حاصل ہے وہ اسٹالین کے مغضوب ادیبوں سے ہمدردی کا ہے بلکہ وہ تو اسٹالین کے حریف رہنماؤں میں ٹراٹسکی، بخارین اور راڈیک تک سے متاثر معلوم ہوتے ہیں اور فسطائیت کے خلاف ان کے ردِعمل کو اس لحاظ سے پائیدار اور مستحکم کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسٹالین کی آمریت کو کسی وقت بھی قبول کرتے نظر نہیں آتے۔ "گرد راہ" میں ایک جگہ انھوں نے پیرس میں مقیم ایک خوش باش ہندوستانی دانشور کو "غیر مقلد اشتراکی" کہا ہے اور غالبًا یہی لقب، خوش باشی کے بغیر ان کو بھی دیا جا سکتا ہے لیکن ساتھ ہی ان میں جو ترقی پسندی کے مجتہد بننے کی صلاحیت موجود تھی، اسے ان کی پیش روی نے بہت کم بروئے کار آنے دیا۔

درحقیقت تقلید اور اجتہاد، معاشرتی جدلیات میں ایک دوسرے کے مقابل بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے لازم بھی اور جہدِ مسلسل کے بغیر اجتہاد کا رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا جب کہ پیش روی کے مزاج میں تسلسل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اب ترقی پسند تنقید میں اختر حسین رائے پوری کے پیش رو ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن ان کے یہاں ایک جدلیاتی خلا بھی شک و شبہے کے بغیر موجود ہے۔ اس کی وجہ سے جب ترقی پسند تنظیم وجود میں آتی ہے تو ان کو اس میں اپنے لیے کوئی جگہ مناسب نظر نہیں آتی اور وہ اس سے دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں گویا پیش روی

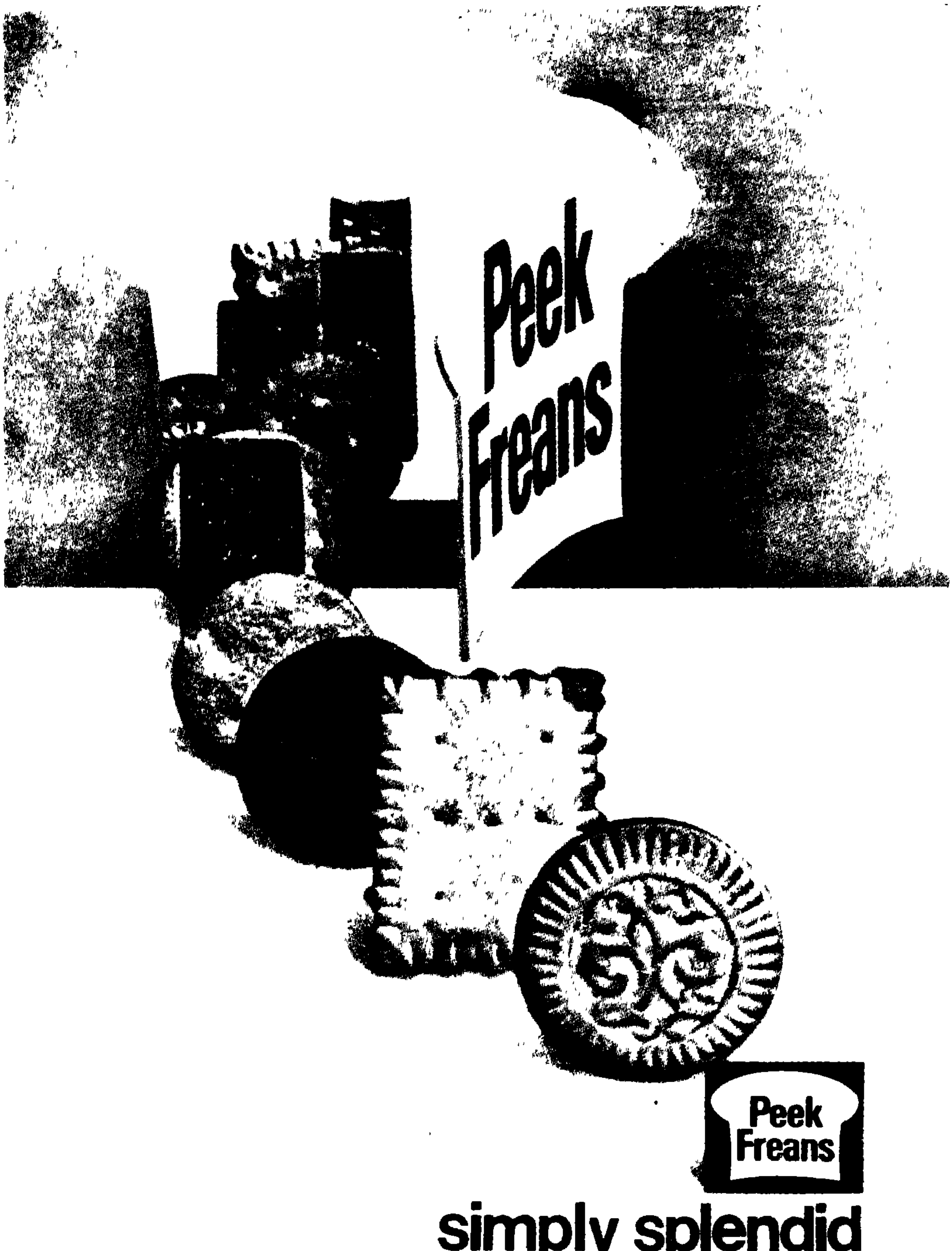
کے مقابلے میں منتظمی ان کو حقیر محسوس ہوتی ہے۔ پھر نئے نئے لکھنے والے پیدا ہو جاتے ہیں جن کو وہ اپنی پیش روی کی دُھن میں کوئی اہمیت نہیں دیتے (بلکہ میراجی اور علامتی شاعری سے انھوں نے جس بیزاری کا اظہار کیا ہے، ترقی پسند ساتھیوں کا اتنا ذکر بھی انھوں نے نہیں کیا) ان کے لیے کوئی لکھنے والا اہم ہے تو اس وجہ سے کہ ان کی پیش روی کا مرہونِ منت ہے۔ مجازؔ کو ترقی پسندانہ شاعری کی طرف انھوں نے مائل کیا، جوشؔ کی شاعری میں ایک نیا موڑ نذر الاسلام کے تراجم پڑھ کر آیا، علیٰ ہذا القیاس۔ فیض کے ان کے مراسم قدیم تھے اور باہمی پسندیدگی بھی ضرور ہوگی لیکن ان کی کسی تحریر سے یہ اندازہ نہیں ہوتا۔ فراق سے انھیں کوئی ربط نہیں۔ لیکن بعد میں ن۔ م۔ راشد سے اور ابنِ انشا سے جو ان کا تعلق رہا تو اس کا باعث منصبی مصروفیات تھیں۔ اگرچہ ابن انشا کے سفرناموں پر اُن کا یہ فقرہ اچھا ہے کہ ان میں کسٹم کے عملے سے تکرار یا ہوٹل کے کارندوں کی بے پروائی یا بازار کے بھاؤ کا ذکر ہوتا تھا اور ابن انشا کا یہ جواب بھی کہ آپ کی مشکل پسندی اور کوتاہ قلمی پر عمل کروں تو عمر بھر کچھ نہ لکھ سکوں۔

کوتاہ قلمی کے باوجود اور پیش روی کو ہم قدمی میں تبدیل کرنے کی مشکلات کے باوصف، ترقی پسند تنقید کی شناخت جس طرح اختر حسین رائے پوری سے ہو سکتی ہے کسی اور سے نہیں ہو سکتی۔ ایک تو ان جیسا وسیع المطالعہ نقاد اردو زبان کو شاید محمد حسن عسکری کے سوا نہیں ملا۔ دوسرے انھوں نے جس آزادی کے ساتھ تنقید لکھی ہے (شاید کلیم الدین احمد کے سوا) کم ہی کسی نے لکھی ہوگی۔ پھر انھوں نے اپنے اسلوبِ تنقید کو نہ انشائیہ بننے دیا نہ کسی غیر ملکی ناشر کی فہرستِ مطبوعات۔ وہ نہ کسی تنظیم کے ترجمان بنے، نہ کسی ادبی شخصیت کے آلۂ کار۔ انھوں نے اپنے مطالعے اور سوچ بچار کی روشنی میں وہی کچھ لکھا جسے انھوں نے درست سمجھا۔ اور اس کے باوجود اپنی تنقیدی ہونہاری کو تسلسل کے ساتھ جاری نہ رکھ سکے اور اس کو پوری طرح نشوونما نہ دے سکے تو اس کی ایک ہی وجہ ہے — تنقید مشکل کام ہے۔

اختر حسین رائے پوری — مجنوں گورکھپوری کی نظر میں

سنہ ۱۹۳۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ برصغیر کی تاریخ میں صحیح معنوں میں نشاۃ الثانیہ کا دور تھا جس نے ہماری قومی فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس دور نے ایسے ایسے مفکر و مدبر پیدا کیے جنھوں نے ہم کو نئے موڑ اور نئے زاویوں سے دیکھنا سکھایا۔ انھیں میں ایک بہت اہم نام ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا ہے۔ ان کے عہد آفریں مضمون "ادب اور زندگی" اور چند دوسرے مضامین سے ترقی پسند تحریک اور انجمن کے اصول و نظریات کے تعین اور ترتیب و تدوین میں بہت مدد ملی۔ خصوصیت کے ساتھ "ادب اور زندگی" ترقی پسند تنقید کا سنگِ بنیاد ثابت ہوا۔ اسی دوران میں انھوں نے اردو زبان کو مغربی اور بالخصوص روسی ادب سے بھی روشناس کرایا۔ اس کے علاوہ "محبت اور نفرت" کے عنوان سے اُن کے افسانوں کا بھی ایک مجموعہ شائع ہوا۔ پھر ملک کی تقسیم کے بعد منصبی مصروفیات کی وجہ سے ان کے لکھنے لکھانے کی رفتار سست رہی۔

ادھر پھر ایک مدت کے بعد "افکار" کے گزشتہ شماروں میں ان کی خود نوشت کا سلسلہ قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اور اب یہ "گردِ راہ" کے نام سے کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ آپ بیتی کے پیرائے میں دراصل یہ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں کی ادبی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تاریخ کی زندہ دستاویز ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام ہی اس کے مستند و معتبر ہونے کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ وہ راہی بھی رہے ہیں اور رہبر بھی۔ اُن کی یہ کتاب بھی ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے سنجیدہ حلقوں میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ —————— (ماخوذ از "گردِ راہ")


Peek Freans
Peek Freans
simply splendid


رکسونا میں شامل آئل آف کیڈ
جلد کو ملائم اور شگفتہ رکھتا ہے
REXONA
for smooth skin beauty

ڈاکٹر وقار احمد رضوی

ڈاکٹر رائے پوری کی ادبی اور علمی حیثیت

ڈاکٹر [illegible] رائے پوری کی [illegible] جو ساہتیہ پریشد ناگپور کے تاریخی اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء میں [illegible] کی توضیح [illegible] کے طور پر شامل ہے۔ اس اعلان نامے پر پنڈت نہرو، مولوی عبدالحق، [illegible] کے دستخط ہیں۔

ڈاکٹر [illegible] رائے پوری [illegible] ترقی پسند خیالات کے بارے میں انھوں نے سب سے پہلے ایک مضمون "ادب اور انقلاب" کے عنوان سے [illegible] ۱۹۳۵ء میں لکھا۔ پھر "ادب اور زندگی" کے عنوان سے انھوں نے [illegible] ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون بہت مقبول ہوا۔ کیونکہ اس میں ادبی مسائل کا مطالعہ نئے نقطۂ نظر سے [illegible] کا مضمون "ادب اور زندگی" بعد کا ہے وہ ۱۹۳۸ء میں چھپا۔ اس لحاظ سے ادب اور زندگی کے موضوع پر ترقی پسندی کے باب میں اختر حسین رائے پوری کی حیثیت پیش رو کی ہے۔ کیونکہ انھوں نے ادب اور زندگی کے موضوع کو خوں گوں [illegible] سے پہلے اردو داں طبقے سے روشناس کرایا اور ساہتیہ پریشد ناگپور کے اجلاس کے ذریعے انجمن ترقی پسند مصنفین کی [illegible] کانفرنس منعقدہ لکھنؤ ۱۹۳۶ء سے پہلے ترقی پسندی کی تحریک چلائی۔ کیونکہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا ناگپور اجلاس اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کانفرنس سے کچھ دن پہلے ہوا۔

تاریخی اعتبار سے ترقی پسند ادب میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اردو میں ان کے مقالے "ادب اور زندگی" کی حیثیت نشان راہ کی ہے۔ اسی طرح ہندی میں ان کے مضمون "ادب اور انقلاب" کو بھی تقدم حاصل ہے۔ اس لحاظ سے اختر حسین رائے پوری اردو ہندی دونوں میں ترقی پسند ادب کے [illegible] کی حیثیت رکھتے ہیں اور بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مقدمہ شعر و شاعری کے بعد کسی تحریر نے اردو تنقید کو اس درجہ متاثر نہیں کیا جتنا کہ ان کے مقالے "ادب اور زندگی" نے کیا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل بعد میں ۱۹۳۶ء میں پڑی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو کے نوجوان ادیب پرانے راستوں سے ہٹ کر اپنی الگ راہ بنا رہے تھے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنے مضمون "ادب اور زندگی" میں کہا کہ

"تخلیقی ادب اجتماعی زندگی کا [illegible] ہے۔ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ادب اپنے گرد و پیش سے متاثر ہوتا

ہے کسی ادب کی روح کو سمجھنے کے لیے اُس زمانے کو سمجھنا ضروری ہے جس میں اس نے پرورش پائی۔ ادب ماضی حال، مستقبل میں رشتہ جوڑتا ہے۔ رنگ و نسل اور ملک و قوم کی بندشوں کو توڑ کر بنی نوع انسان کو وحدت کا پیغام سناتا ہے۔ زندگی کھیتوں اور کارخانوں میں ہے نہ کہ آرام کرسیوں اور آراستہ ایوانوں میں۔ ادب زندگی سے عبارت ہے۔ زندگی دب رہی ہے۔ ادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے چارگی کا نوحہ پڑھتا آیا ہے۔ اب اسے اس حد سے بڑھ کر نکلنا چاہیے۔ ادب ایک سماجی فریضہ ہے۔ ادب کی تخلیق میں دو طاقتیں کام کرتی ہیں۔ ماحول اور شخصیت۔[1]

یہ وہ خیالات ہیں جن کو بعد میں مجنوں نے اپنے مضمون "ادب اور زندگی" میں پیش کیا۔ مثلاً مجنوں نے کہا کہ

"ادب براہِ راست ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے متاثر ہوتا ہے۔ ادب انسان کے جذبات خیالات کا ترجمان ہے۔ ادب آئینہ ہے زندگی کا۔ کامیاب ترین ادب وہ ہے جو حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشارہ ہو۔ ادب معاصرانہ میلانات و رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔"[2]

یہی وہ خیالات ہیں جن کو اختر حسین رائے پوری اپنے مضمون "ادب اور زندگی" میں پیش کر چکے تھے۔

اسی طرح انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا منشور (اجلاس لکھنؤ اپریل ۱۹۳۶ء) اور بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگپور اپریل ۱۹۳۶ء کے اعلان نامے کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ساہتیہ پریشد کے اعلان نامے میں کہا گیا کہ

"ہندوستانی زبانوں کے لکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ادب کو عوام کی زندگی میں پیوست کریں۔ زندگی مسلسل تغیر و تبدل کی راہ پر گامزن ہے۔ ادب، فلسفہ، سیاست کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے بلکہ وہ کاروانِ حیات کا رہبر ہے۔"[3]

بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اس اعلان نامے میں جن اغراض و مقاصد کو سامنے رکھا گیا ہے۔ یہ تقریباً وہی ہیں جو ترقی پسند ادیبوں کی انجمن چاہتی تھی۔ چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنے پہلے منشور (پہلی کانفرنس لکھنؤ اپریل ۱۹۳۶ء) میں جن خیالات کا اظہار کیا ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

"ہمارا ادب ایک عرصہ سے قدامت کا شکار رہا ہے اور زندگی کے حقائق سے گریز کر کے کھوکھلی رومانیت اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھونڈھ رہا ہے جس کے باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں۔ ادب میں سائنسی عقلیت کو فروغ دیں۔"[4]

---

1. رائے پوری، اختر حسین، ڈاکٹر، "ادب اور زندگی" مشمولہ کتاب "ادب اور انقلاب" ص ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۱۴، ۱۷۔ قدیم ایڈیشن
2. گورکھپوری، مجنوں، "ادب اور زندگی" ص ۵۵، ۵۶، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۹۰، کراچی ۱۹۶۲ء
3. اعلان نامہ ساہتیہ پریشد مشمولہ کتاب "ادب اور انقلاب" از ڈاکٹر اختر حسین ص ۸ قدیم ایڈیشن
4. جعفری، سردار، "ترقی پسند ادب" ص ۴۲، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، طبع دوم

اس تحریک کا ساہتیہ پریشد کے اعلان نامے سے موازنہ کیا جائے تو دونوں کے اغراض و مقاصد میں زیادہ فرق نظر نہیں آتا ۔ دونوں اعلان ناموں کا لب و لہجہ ایک سا ہے کیونکہ دونوں ادب کو زندگی کا ترجمان مانتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی بڑی تحریک خواہ وہ ادبی ہو یا سیاسی یا سماجی کبھی کسی ایک شخص کا کارنامہ نہیں ہوتی ۔ ترقی پسند تحریک اس لیے وجود میں آئی کہ اس کا وجود میں آنا اس وقت کی ایک تاریخی ضرورت تھی ۔ اور نئے دور کے میلانات کا تقاضا یہی تھا ۔ سجاد ظہیر سے پہلے نیاز فتح پوری ۔ قاضی عبدالغفار، جوش ملیح آبادی، مروجہ اخلاقی مزعومات، سماجی تعصبات اور مذہب کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکے تھے ۔

اختر حسین رائے پوری نے ۱۹۳۳ء سے ترقی پسند ادب کا جائزہ لیا ۔ فرانسیسی، روسی اور بنگالی ادب سے اردو کو روشناس کرایا ۔ گورکی کی آپ بیتی کا ترجمہ کیا ۔ اور قاضی نذرالاسلام کی بنگالی نظموں کو تراجم کے ذریعے اردو و ہندی میں منتقل کیا ۔ انھوں نے نذرالاسلام کی ایک نظم کا ترجمہ باغی کے عنوان سے کیا ۔ جوش نے اپنی نظم بغاوت میں انہی خیالات کا اعادہ کیا جو نظم باغی میں ہیں ۔ ورنہ اس سے پہلے جوش رومانی شاعر تھے ۔ جوش کے ہاں بغاوت اور انقلاب کا تصور ۔ قاضی نذرالاسلام کی باغی نظموں سے آیا جن کے تراجم اختر حسین رائے پوری نے کیے ۔ اسی طرح اختر حسین رائے پوری نے تنقیدی مضامین لکھ کر انقلابی ادب کے تصور کو اردو میں واضح طور پر پیش کیا ۔ ان مضامین سے ترقی پسند تحریک اور اس کی نشو و نما کے لیے زمین تیار ہوئی ۔ اختر حسین رائے پوری ترقی پسند تحریک کی پیداوار نہیں ۔ وہ ترقی پسند تحریک کی ابتدا سے بہت پہلے ترقی پسند تھے ۔

تنویرہ خانم

مشہور ترقی پسند نقاد[1]

حالی کے بعد اگرچہ نقادوں کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے لیکن جن لوگوں نے یورپ کی نظریاتی تحریکات سے متاثر ہو کر اپنے خیالات و [نظریا]ت کی تشکیل و تعمیر کی ہے۔ غور و فکر کیا ہے اور جن کے یہاں ہمیں صحیح معنوں میں تنقیدی بصیرت ملتی ہے۔ وہ معدودے چند ناقدین ادب ہیں۔ [ا]ردو تنقید کی تحریر دراصل دوسری جنگ عظیم کے دوران و بعد سے ہماری اردو ادب کی ایک نئی شاہراہ پر گام زن کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اس [م]یں ممتاز اور قابل ذکر نقاد وہ نظر آتے ہیں جن کا ترقی پسند ادبی تحریک سے براہ راست تعلق تھا۔ ان کے پہلو بہ پہلو خاص تعداد میں ایسے [نقاد] بھی ملتے ہیں جن کا انداز نظر کلاسیکی یا تاثراتی ہے۔ ادب کو سائنسی نقطۂ نظر سے پرکھنے کا کام ترقی پسند نقادوں نے ہی انجام دیا۔ اس [م]یں ادب کو زندگی کا ایک حصہ سمجھنے پر زور دیا گیا۔ ادب کا تجزیہ مختلف رشتوں سے کیا گیا اور ادب، زندگی، معاشرے اور معاشیات کے باہمی [مخت]لف النوع رشتوں کو واضح کیا گیا۔ اگرچہ ادب کا کلاسیکی نقطۂ نظر رکھنے والے نقادوں اور دانشوروں نے ترقی پسند نظریات کی تکذیب اور [مخال]فت بھی کی ہے لیکن ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند نقادوں کے آگے ان قدامت پسند اور کلاسیکی نقطۂ نظر رکھنے والے نقادوں اور دانشوروں [کا چ]راغ نہ جل سکا۔ ادیبوں اور دانشوروں کی ایک بڑی اکثریت ترقی پسند نقادوں کے نظریۂ ادب سے متاثر ہوئی۔

[اس سل]سلے میں سب سے پہلے جس نقاد نے نظریاتی بحث کا آغاز کیا وہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ہیں۔ انیس سو پینتیس (۱۹۳۵ء) [میں] ان کا ایک مضمون "ادب اور زندگی" کے عنوان سے رسالہ "اردو" میں شائع ہوا۔ اختر حسین رائے پوری کا یہ مضمون ایک اجتہادی [کو]شش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ہر مضمون میں آ جاتا ہے کہ ابتدا میں پرانے بتوں کو توڑنے والے شدت اور انتہا پسندی کا شکار [ہو]تے ہیں۔ یہ بات ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ابتدائی مضامین پر پورے طور پر صادق آتی ہے۔ اپنے مضمون "ادب اور زندگی" میں [و]ہ کسی حد تک انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تاہم ان کے خیالات اور نظریات بنیادی طور پر ترقی پسند نقطۂ نظر کی وضاحت ضرور [کر]تے ہیں۔ وہ ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ ادب کی تخلیق اور ذہنی ارتقا کو وہ معاشی حالات اور زندگی سے الگ تھلگ [نہی]ں سمجھتے۔ ان کے خیال میں۔

"۔۔۔ کسی ادیب کی روح سمجھنے کے لیے اس فضا کو سمجھنا ضروری ہے جس میں اس نے پرورش پائی جب

---

[1] تنویرہ خانم کا یہ مقالہ ایم۔اے اردو کے لیے لکھا گیا تھا جو "ترقی پسند تنقید" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ (صبا)

تک اس زمانے کی زندگی نہ سمجھی جائے یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ ادیب نے یہی کیوں کہا اس کے خلاف کیوں نہیں کہا۔ اس لیے کہ ادیب اپنے جذبات کی نہیں اپنی فضا کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس کی زبان سے اجتماعی انسان بول رہا ہے [1] "

"۔۔۔۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ادیب انسان ہے اور یہ انسان کی طرح ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اگر یہ حقیقت ہے کہ ادب نگاری بھی ایک قسم کا سماجی عمل ہے اور انسانیت اس سے متاثر ہوتی ہے تو ادب اور انسانیت کے مقاصد ایک ہیں [2] "

ان کا نظریۂ ادب مارکسی فلسفے سے مستعار نظر آتا ہے اور اس نقطۂ نظر سے انھوں نے ہندوستان کے قدیم اور جدید ادب کا غائر نظر سے جائزہ بھی لیا ہے۔ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اُردو کے پہلے مصنف ہیں جن کے ذریعے ترقی پسند تحریک کی اُردو ادب اور تنقید میں ابتدا ہوئی اپنے مقالات میں انھوں نے روسی ادب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اُن کی کتاب " ادب اور انقلاب " میں روسی فن اور ادب پر دو مضامین "سوویٹ روس کا ادب" اور "سوویٹ تھیٹر" موجود ہیں۔ اختر حسین رائے پوری سنسکرت، ہندی اور بنگالی زبانوں سے بھی خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قدیم اُردو، ہندی اور سنسکرت ادب کا براہِ راست مطالعہ کیا ہے۔ قدیم ادبی شاہکاروں پر وہ بڑی بے رحمی سے نکتہ چینی کرتے ہیں اور انتہا پسندی کے عالم میں قدیم ادب میں موجود بعض قابلِ قدر اور عمدہ عناصر کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"۔۔۔ تمام ہندوستانی شعرا زندگی سے کتنے بے خبر اور بے پروا تھے۔ اُن کے جذبات کتنے اوچھے اور احساسات کتنے بے حقیقت تھے۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے جسم مدت کی ضرورت ہے [3] "

وہ اپنے ایک مضمون میں اس بات کا تعجب کی بس دیتیں کے اظہار کرتے ہیں کہ اُردو شاعری میں درد اور نظیر جیسے معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ وظیفہ خوار تھے۔ درد دنیا سے بیگانہ اور میر اپنی ناکامیوں کی وجہ سے زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے ان وجوہ کی بنا پر یہ دونوں شاعر زندگی کے بیشتر ضروری جذبات کے اظہار سے اجتناب برتتے ہیں۔ افسردگی، رہبانیت اور حزنیت کا ایک لامتناہی سلسلہ وہ اُردو شاعری میں دیکھتے ہیں۔ وہ دونوں میں صرف نظیر ہی کو صحیح معنوں میں شاعر قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگرچہ نظیر کے یہاں حسنِ بیان کی کمی اور عامیانہ جذبات کی زیادتی ضرور ہے جس کی وجہ سے اس کی آوارہ اور خانہ بدوش زندگی ہے لیکن پورے اُردو ادب میں وہی ایک ایسا شاعر ہے جو عوام کے ساتھ رہتا، انھیں سمجھتا اور ان کے تاثرات کو انھی کی زبان میں بیان کرتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کو پہلی بار اس انداز نظر سے دریافت کیا گیا تھا اور اس کی دریافت میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا بھی پورا پورا حصہ ہے۔ اسی طرح، رابندر ناتھ ٹیگور اور نذرالاسلام پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں اور ان کی شاعری کے اچھے اور بڑے پہلوؤں کا ژرف نگاہی سے جائزہ لیتے ہیں۔ وہ ٹیگور میں اصلاح، عدم تشدد اور تصوف کی تبلیغ کو مستحسن نہیں سمجھتے تاہم ان کا خیال ہے کہ ٹیگور کے کلام کا بڑ

---

[1] ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری : ادب اور انقلاب ص ۱۳

[2] ڈاکٹر حسین رائے پوری : ادب اور انقلاب ص ۱۵

[3] ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری: ادب اور انقلاب ص ۳۶

حصۂ زمان و مکان سے بالاتر ہے۔ اسی طرح وہ قاضی نذرالاسلام کی شاعرانہ شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

— "مسلمانوں کی کم کسانی، کسان کی حقیقت پسندی اور سپاہی کا جوش یہ تینوں چیزیں نذرالاسلام کو ودیعت کی گئی تھیں۔ مزدور کی انقلابی سرشت کی کمی تھی سو وہ بھی بعد میں پوری ہو گئی۔"[1]

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا مقالہ "ادب اور نظریۂ زندگی" سمجھنے کے لیے قاضی نذرالاسلام کے بارے میں ان کی رائے کا ایک اقتباس پیش کرنا اس لیے بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قاضی نذرالاسلام میں جس سماجی اور فنی شخصیت کے خدوخال اس کی شاعری میں دیکھ کر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ان الفاظ سے خود ان کی اپنی شخصیت بھی واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

— "نذرالاسلام کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی دائم و قائم ہے۔ اور انسان لاشریک لہ اس کا کارساز ہے وہ شباب کا ہم دوش اور انقلاب کا نقیب ہے۔ وہ بغاوت کا حامی و جمود کا دشمن ہے۔ وہ قدامت کا حریف اور جدت کا علم بردار ہے۔ وہ قدیم سماج کے مظالم کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے اور شاعری کو اس مہم میں جنگ کی دیوی بنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان سب سے افضل اور اکمل ہے۔"[2]

ان کی کتاب ادب اور انقلاب کے مطالعے سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ وہ ادب کو اشتراکی نظریہ کی تبلیغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کی عملی تنقید میں بھی ان کے اشتراکی اور مارکسی نظریات موجود نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بعض لوگوں نے ان کے نظریات سے اختلاف کیا ہے خاص طور پر اقبال کے بارے میں انھوں نے بعض مقامات پر اپنی حق آگاہی کا اظہار کیا ہے ان سے بعض اوقات ہم بھی بالکل طور پر اتفاق نہیں کرتے۔ وہ اقبال کو فسطائیت کا ترجمان سمجھتے ہیں اور ان پر الزام لگاتے ہیں کہ اقبال قوم کے ایک مخصوص طبقے کو مخاطب کرتے ہیں۔ یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے تاریخ اسلام کا ماضی انھیں بہت روشن اور درخشاں معلوم ہوتا ہے۔ اس بارے میں اپنے ایک مضمون فاشزم اور اقبال کی آخری سطور میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

"مختصر یہ کہ اقبال اسلامی فاشیت ہے اور اس کا ردِعمل ڈاکٹر ساورکر اور ڈاکٹر مونجے کے ہندو فاشزم کی صورت میں ظہور پذیر ہو رہا ہے جن کے نزدیک ویدک عہد کی تہذیب انسانیت کی معراج ہے اور ذات پات کی تقسیم عمل کا بہترین نمونہ ہے۔"[3]

وہ اقبال پر الزام لگاتے ہیں کہ اقبال مسولینی جیسے ڈکٹیٹر کو ہی اسلامی پاکستان کے استحکام کا ضامن سمجھتا ہے اور خلافت کا تصور اس کے نظریے کی تائید کرتا ہے۔ شدت اور انتہا پسندی کی خامیوں کے باوجود ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اردو زبان کے ایک اہم نقاد ہیں۔ ان کے نظریات سائنٹفک ہیں۔ ترقی پسند نقطۂ نظر کی انھوں نے کافی حد تک ترجمانی کی ہے۔ اردو زبان میں اُن کی تنقیدی نگارشات میں فکر و فن کے نئے مسائل بحث کے لیے پیدا کیے۔ ادیبوں اور دانشوروں کو ایسے موضوعات پر سوچنا سکھایا جن پر ان سے پہلے کسی نے کچھ نہیں سکھایا تھا۔ ان کا اندازِ بیان شگفتہ اور جاندار ہوتا ہے اور وہ اپنے نظریات ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان خوبیوں کی بنا پر ہم انھیں ناقدین کی صف میں جگہ دے سکتے ہیں جنھوں نے اردو زبان میں ترقی پسند تنقید کو رواج دیا اور اردو ادب کو نئی قدروں سے روشناس کیا۔ (ماخوذ از "ترقی پسند تنقید" شائع کردہ تخلیق مرکز لاہور)

[1] ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ ادب اور انقلاب۔ ص ۱۳۸

[2] ایضاً ص ۱۴۷

[3] اختر حسین رائے پوری۔ ادب اور انقلاب ص ۶۲

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

روزن چہ احتیاج اگر خانہ تار نیست

تخلیقی و تنقیدی ادب کے حوالے سے اردو میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی چار حیثیتیں بہت نمایاں ہیں۔ ایک حیثیت افسانہ نگار کی ہے۔ ان کا پہلا افسانہ "زبان بے زبانی" کے عنوان سے ۱۹۳۴ء میں علامہ نیاز فتح پوری کے مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔

> "ہمارے فاضل دوست جناب اختر حسین رائے پوری نے یہ افسانہ روسی ادب جدید کے مشہور علم بردار ببل کے ایک افسانے کو سامنے رکھ کر لکھا ہے جس کا عنوان "درخت کے تاثرات" ہے۔
>
> اردو میں افسانہ نویسی کا یہ انداز بالکل نئی چیز ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ اختر حسین صاحب بڑی حد تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین نگار جذبات و تخیل کی اس فضا کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کریں گے جو اس رنگ کے افسانہ نگاری کی اصل روح ہے۔"[1]

اردو افسانے کا یہ وہ دور ہے جس میں یلدرم، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ کے رومان پرور افسانوں کی گونج اگرچہ مدھم پڑ گئی تھی لیکن حقیقت نگاری کی راہ پوری طرح ہموار نہ ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے افسانوں نے اس راہ کو ہموار بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اردو میں ڈاکٹر صاحب کی دوسری نمایاں حیثیت ایک نہایت جان دار کامیاب مترجم کی ہے۔ انھوں نے کالی داس، نذرالاسلام، گورکی اور بعض دوسری زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات کو اردو میں منتقل کرکے اسے عالمی ادب کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی راہ دکھائی اور ایسی دل آویزی کے ساتھ کہ شاید کوئی دوسرا اس کام کو مشکل سے کر سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ایسے لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں جو ڈاکٹر صاحب کی طرح اردو، انگریزی، ہندی، سنسکرت، بنگالی، فارسی اور فرانسیسی وغیرہ پر گہری دسترس رکھتے ہوں اور اردو میں ان کے ترجمے ترسیل کا حق بھی ادا کر سکتے ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کے ادبی کارناموں کی روشنی میں ان کا تیسرا اہم مقام یہ ہے کہ وہ ایک منفرد اور بے لاگ نقاد ہیں۔ انھوں نے ادب و زندگی، ادب و انقلاب، روایت و بغاوت، طبقاتی کش مکش، اقتصادی جبریت، سماجی مساوات، ترقی پسند رجحانات اور ان کے لوازم سے

---

[1] نگار۔ ص ۱۸، مارچ ۱۹۳۴ء

پیدا ہونے والی لفظیات و معنیات، سے اردو کو اس وقت بہرہ ور کیا جب کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا خاکہ لندن میں مرتب ہو رہا تھا اور کسی باقاعدہ تحریک یا انجمن کا قیام ہنوز عمل میں نہ آیا تھا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی ادبیت کا چوتھا اہم رخ، ان کی خود نوشت "گرد راہ" کی اشاعت کے بعد سامنے آیا۔ اردو کے خود نوشت سوانحی ذخیرے میں ان کی کتاب فی الواقع ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ "خود نوشت" کو سوانح نگار کی ذات و صفات اور اردگرد کی تہذیبی کائنات کے تعلق سے حقیقتاً کیا ہونا چاہیے؟ "گرد راہ" اس کا خوب صورت اور بھرپور جواب ہے۔ اردو میں اس قبیل کی خود نوشتیں ایک ہاتھ کی انگلیوں سے زیادہ نہیں ہیں۔

یہ چاروں پہلو جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اختر حسین رائے پوری کی ادبی شخصیت کے بہت اہم پہلو ہیں اور ان سب پر کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے، البتہ ایک پہلو ایسا ہے جس پر اب تک توجہ نہیں دی گئی۔ میری مراد ڈاکٹر صاحب کی ادبی زندگی کے اس سیاسی پہلو سے ہے جسے اردو کے دفاع کے سلسلے میں تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ ہر چند کہ اس پہلو کے نشانات ان کی پہلی تنقیدی کتاب "ادب و انقلاب" سے لے کر "گرد راہ" تک بکھرے پڑے ہیں اور یہ نشانات برعظیم کی جدوجہد آزادی، ثقافتی و تہذیبی زندگی، دو قومی نظریے کی اساس، ہندی اردو تنازع، تحریک پاکستان اور پاکستانی ادب کے تناظر میں اتنے اہم ہیں کہ ان کا تذکرہ کسی نہ کسی نہج سے ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں مجھے چند لمحوں کے لیے تحریک پاکستان اور اس کے ثقافتی پس منظر میں جانا پڑے گا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تحریک پاکستان کے محرکات میں متعدد سیاسی و سماجی، اقتصادی و تہذیبی اور مذہبی و ثقافتی عناصر شامل ہیں۔ ان میں سے ہر عنصر اپنی جگہ اہم ہے اور ہندو مسلم سیاست میں شروع سے لے کر آخر تک زیر بحث رہا ہے تاہم ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی تقریباً سو سالہ جدوجہد آزادی اس بات کی شاہد ہے کہ تحریک پاکستان کا آغاز حقیقتاً دو قومی نظریے کی اساس پر ہوا ہے اور اس نظریے کا آغاز و ارتقا اور استحکام اور تکملے میں اردو ہندی کے قضیے نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔

اردو ہندی کا قضیہ جیسا کہ برعظیم پاک و ہند کی تحریک و تاریخ آزادی سے ظاہر ہے، اگرچہ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد رونما ہو گیا تھا۔ لیکن اس میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب آزادی کے دن بہت قریب آ گئے اور کانگریس نے اپنے پچھلے لسانی فیصلوں اور معاہدوں کو پس پشت ڈال کر ہندو اکثریت کے زعم میں یہ طے کر لیا کہ آزادی کے بعد پورے برعظیم کی قومی و سرکاری زبان ہندی اور صرف ہندی ہوگی۔

آزادی سے دس بارہ سال پہلے تک کانگریس اور اس کے ذمے دار رہنما، مسلمانوں کو دو قومی نظریے اور جداگانہ انتخاب کے مطالبات کی طرف سے غافل رکھنے کے لیے کم از کم اتنا کہتے آئے تھے کہ:

"آئندہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی اور وہ ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی"

بعد کو "ہندی ساہتیہ سمیلن" کے ایک اجلاس میں "ہندوستانی" کو "ہندی، ہندوستانی" کے الفاظ سے بدل دیا گیا اور اس کی توثیق گاندھی جی نے بھی کر دی۔ یہ تبدیلی معمولی نہ تھی۔ اس نے ہندوؤں کے عزائم اور گاندھی جی کی چالوں کو پوری طرح واضح کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد زبان کے مسئلے نے ایسی سنگین صورت اختیار کر لی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر تارا چند نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:۔

"SAMMELAN UNFORTUNATELY MODIFIED THE RESOLUTION OF THE CONGRESS AND SUGGESTED THAT HINDI-HINDUSTANI SHOULD BE LINGUA FRANCA OF INDIA. THE DECISION CREATED A GREAT DEAL OF STIR, SPECIALLY AMONG THE NATIONALLY MINDED MUSLIMS, WHO KEENLY DESIRED A SETTLEMENT BUT WERE DISAPPOINTED BY THE RESOLUTION. AT INDORE THE DECISION OF SAHITYA SAMMELAN WAS CONFIRMED WITH THE RESULT THAT THE COMMUNAL TANGLE BECAME MUCH WORSE. THE ESTABLISHMENT OF THE HINDI PARCHAR SABBA + THE INTENSIFICATION OF ATTEMPTS TO PROPAGATE SANSKRITIZED HINDI, LED TO A REACTION + THE MUSLIM LEAGUE DECIDED THAT URDU SHOULD BE CONSIDERED THE LINGUA FRANCA OF INDIA." [1]

ہندی ساہتیہ سمیلن اندور کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۵ء جس میں "ہندوستانی" کی جگہ "ہندی، ہندوستانی" کے الفاظ رکھ دیے گئے تھے، اس پر اظہار کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں ۴ رمئی ۱۹۳۵ء کے "ہریجن" کی چند سطریں دیکھنے کے لائق ہیں:-

"THE HINDI SAHITYA SAMMELAN, RECENTLY HELD AT INDORE PASSED SOME USEFUL RESOLUTIONS. AMONG THEM WAS ONE, GIVING A DEFINITION OF HINDI + OTHER EXPRESSING THE OPINION THAT ALL THE LANGUAGES THAT HAD DESCENDED FROM OR HAD BEEN LARGELY INFLUENCED BY SANSKIRT SHOULD BE WRITTEN IN DEWNAGRI SCRIPT. THE AUTHORIZED SCRIPT OF THE SAMMELAN STILL REMAINS DEWNAGRI. THE PROPAGATION OF THE DEWNAGRI SCRIPT AMONG HINDUS OF THE PUNGAB, AS ELSEWHERE, WILL STILL CONTINUE. THE RESOLUTION IN NO WAY DETRACTS FROM THE VALUE OF DEWNAGRI SCRIPT." [2]

---

[1] دی پرابلم آف ہندوستانی ص ۱۵، از ڈاکٹر تارا چند مطبوعہ الہ آباد ۱۹۴۶ء

[2] دی لینگوج پرابلم ص ۲، مہاتما گاندھی، مرتبہ ڈی۔ ہینگورانی، مطبوعہ کراچی ۱۹۴۲ء

اس طرح گاندھی جی نے ہندی ساہتیہ سمیلن کی منظور کردہ قرارداد کو کانگریس کی قرارداد بنا دیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک کمیٹی قایم کردی۔ چند روز بعد اس کمیٹی نے ایک فعال انجمن اور ادارے کی صورت اختیار کرلی۔ یہی انجمن "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" (انجمن ادبیات ہند) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس انجمن یا ادارے کا مقصد یہ تھا کہ برعظیم کے برعلاقے کے ادیبوں کو اس کا ممبر بنایا جائے اور انھیں یک جا کر کے ہندی ساہتیہ سمیلن کی منظور کردہ قرارداد کی تائید حاصل کرلی جائے۔ چنانچہ اس کام کے لیے ۲۴/۲۵ اپریل ۱۹۳۵ء کو ناگپور میں "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کا ایک اجلاس بلایا گیا اور اس میں ہر زبان کے ادیبوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ عموماً ایسے ہی لوگ مدعو کیے گئے تھے جن سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ کانگریس اور ہندی ساہتیہ سمیلن کی قرارداد کی حمایت میں رائے دیں گے۔ پھر بھی اس میں کچھ ایسے لوگ بھی پہنچ گئے جن کا موقف اکثریت کے موقف سے مختلف تھا۔ ان میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مولوی عبدالحق کا نام یوں سب سے اہم اور محترم ہے کہ انھوں نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اس جلسے میں اردو کے دفاع کے سلسلے میں تن تنہا وہ کام کیا جو ایک پوری جماعت ہی کر سکتی تھی۔

مولوی صاحب کی عمر اس وقت پینسٹھ[۶۵] سے اوپر تھی، لیکن ان کے ساتھ اس تاریخی اور معرکہ آرا اجلاس میں اردو کی دفاعی لائن میں ایک ایسا نوجوان بھی شامل تھا جس کی عمر اس وقت مشکل سے بائیس تیئیس سال تھی[۱]۔ یہی نوجوان بعد کو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نوجوان نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس میں خاموش تماشائی کی حیثیت میں شرکت نہیں کی تھی بلکہ اردو کے باشعور مندوب اور سپاہی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ بحث میں حصہ لیتے ہوئے قرارداد میں ترمیمات کا مطالبہ کیا تھا، متبادل تجویزیں پیش کی تھیں اور مسئلے پر دوبارہ غور کرنے پر مجمع کی توجہ مبذول کرا دی تھی، لیکن اکثریت چونکہ ہندی کے پرستاروں اور اردو کے مخالفوں کی تھی اس لیے کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ من مانے طور پر وہی پرانی قرارداد منظور کرلی گئی کہ آزادی کے بعد پورے برصغیر کی قومی و سرکاری زبان "ہندی، ہندوستانی" ہوگی اور وہ ناگری رسم الخط میں لکھی جائے گی۔

"بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کی اس قرارداد کا منظر و پس منظر اور اردو کے سلسلے میں کانگریس اور اس کے متعصب ہندو سیاسی زعما کے معاندانہ رویّے کی تفصیلات، مولوی عبدالحق نے اُسی وقت شائع کردی تھیں[۲] اور ان کے ذریعے دو قومی نظریے اور تحریک پاکستان کو غیر معمولی تقویت ملی تھی۔

"بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کے اجلاس منعقدہ ناگپور میں، اگرچہ زبان کے مسئلے پر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تجاویز و ترامیم کا نوٹس نہ لیا گیا، لیکن ادبیات کے حوالے سے اس نوجوان کی بعض باتیں اتنی اہم تھیں کہ ان پر چھوٹے بڑے سب نے یکساں توجہ دی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو، اچاریہ نریندر دیو، مولوی عبدالحق، منشی پریم چند وغیرہ جیسے بزرگ ادیبوں اور سیاسی رہنماؤں نے برملا تائید کی تھی۔ اس کی تیار کردہ ایک روداد یا بیان پر دستخط کیے تھے اور اس کو جلسے میں پڑھ کر سنانے کی اجازت دی تھی۔ اس روداد یا بیان میں ادیبوں کے فرائض اور ادب کے وظائف کی تشریح کی گئی تھی اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کے بعد اردو میں پہلی بار زندگی و ادب کے رشتوں کو جوڑنے اور ایک دوسرے کے لیے کارآمد و کارگر بنانے پر زور دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تیار کردہ یہ روداد، ان کی مشہور تصنیف "ادب اور انقلاب" میں بصورت پیش لفظ اس طور پر ہنوز محفوظ ہے[۱]۔

---

[۱] "ہندی اردو تنازع ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں" ص ۲۸۵ مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۷۷ء
[۲] تفصیل کے لیے دیکھیے رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۳۶ء

"ہمارے دیس میں یہ پہلا موقع ہے کہ مختلف زبانوں کے ادیب باہمی تعاون کی غرض سے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس تعاون کی بنیاد کیا ہو۔ کئی تجویزیں اس جلسے میں پیش ہوئی ہیں، لیکن ایک بہت اہم مسئلہ نظر انداز کر دیا گیا ہے جس پر سب سے پہلے غور ہونا چاہیے تھا۔ ہم نے یہ تو طے کر لیا کہ ادب کا قالب کیا ہو مگر یہ نہیں بتایا کہ اس کا قلب، روپ رنگ کیا ہو۔ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ کیا کہنا اور کس سے کہنا ہے، کیسے کہنا ہے، کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ادب کے مسائل کو زندگی کے دوسرے مسائل سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی مکمل اکائی ہے۔ اسے ادب، فلسفہ، سیاست وغیرہ کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ کاروانِ حیات کا رہبر ہے۔ اسے محض زندگی کی ہم رکابی ہی نہیں کرنا ہے بلکہ اس کی رہنمائی بھی کرنا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کدھر جا رہی ہے اور اسے کدھر جانا چاہیے۔ ادیب انسان بھی ہے اور اسے سماج کی ترقی کے لیے اتنا تو کرنا ہی ہے جو ہر انسان کا فرض ہے۔

انسانیت کے نام پر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا آج جب ترقی و پستی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے ادب اپنے کو غیر جانب دار رکھ سکتا ہے؟ کیا حسن، آرٹ وغیرہ کی نقاب پہن کر وہ کارزارِ حیات سے راہِ فرار اختیار کر سکتا ہے۔ کیا وہ واقعہ نگاری کی فصیل پر بیٹھ کر انقلاب و رجعت کی طاقتوں کی تصویر لے سکتا ہے۔؟

احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حالِ زار ہمیں بے حس کیوں کر رکھ سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بے کاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں تو خاشا یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو، وہ کیا کہے۔ کن سے کہے اور کس طریقے سے کہے؟

چنانچہ ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے۔ زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔ اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور ساری نوعِ انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک کا ادب زندگی سے اپنے کو وابستہ کرے گا اور زندگی کے ارتقا کا علم بردار ہو گا۔"[1]

عجیب اتفاق ہے کہ جس سال ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ادب کے اغراض و مقاصد کے سلسلے میں، اپنا یہ بیان بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس میں پیش کیا اسی سال جولائی ۱۹۳۵ء کے سہ ماہی "اردو میں" ادب و زندگی "کے عنوان سے ان کا وہ تاریخی و انقلابی مضمون شائع ہوا جو بعد میں ان کی کتاب "ادب اور انقلاب" میں شامل ہوا۔

ان کے اس بیان اور مضمون[2] کو ہمارے ادب میں نشانِ راہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ان سے ہمارے ادب اور ادیب دونوں نے بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ خصوصیت سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ بیان اور مضمون ایک ایسے نوجوان ادیب کی کاوشِ ذہن کا نتیجہ ہیں جو

---

[1] ادب اور انقلاب ص ۱۰۱ ادارۂ اشاعت اردو حیدر آباد دکن طبع اول، اکتوبر ۱۹۴۳ء

[2] اس مضمون کا ابتدائی روپ، کلکتے کے ہندی ماہنامہ "وشوامتر" بابت اپریل ۱۹۳۳ء میں پہلی بار شائع ہو چکا تھا۔

ابھی کالج کا طالب علم تھا اور جس کی عمر بائیس اور تیئیس سال کے درمیان تھی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ نوجوان، تقسیم ہند کے بعد پاکستان آگیا اور ڈاکٹر اختر رائے پوری کے نام سے آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس کا جسم بوڑھا دکھائی دیتا ہے، لیکن ذہن اسی طرح جوان ہے۔ ظاہری آنکھیں بصارت سے محروم سہی خانۂ دل بصیرت سے معمور ہے۔ یوں بھی جو لوگ روشن دل ہوتے ہیں ظاہری آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور دل کی آنکھ سے وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جو ظاہری آنکھیں بھی بمشکل دیکھ سکتی ہیں بقول صائب ؎

روشن دلاں حباب صفت دیدہ بستہ اند
روزن چہ احتیاج اگر خانہ تار نیست

عتیق احمد

اختر حسین رائے پوری کی افسانہ نگاری

ایک اُردو افسانے ہی پر کیا منحصر ہے، برصغیر پاکستان و ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی افسانہ نویسی اور ترقی پسند تحریک کا بیک وقت تذکرہ لازم و ملزوم بن کر رہ گیا ہے۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ تکنیک، مواد اور فن کے اعتبار سے افسانہ نویسی میں جیسی وسعت، نت نئے فنی تجربات اور برصغیر کی تہذیبی، سیاسی اور معاشی زندگی سے جتنی قربت اور لگاؤ ترقی پسند تحریک نے پیدا کیا، ان ہی عوامل سے نئی افسانہ نویسی کی بے گانگی اور دوری نے اُسے ثابت کر دیا ہے۔ خیر یہ صورتِ حال تو الگ ہی بحث موضوع ہے، اشارتاً عرض کرنا یہ تھا کہ اُردو افسانے کا عروج تو بلاشبہ ترقی پسند تحریک ہی کا مرہونِ منت ہے، لیکن اردو افسانہ نہ صرف اس تحریک سے کوئی ربع صدی سے دس پانچ برس اوپر پہلے ہی معرضِ وجود میں آچکا تھا۔ یعنی یہ کہ سجاد حیدر یلدرم کی نیم افسانوی اور ہم ادبِ لطیف نما تحریریں ۱۹۰۰ء میں اور منشی پریم چند کی رومانوی تاریخی کہانیاں ۱۹۰۸ء میں ضبطِ تحریر میں آنے اور اشاعت پذیر ہونے لگی تھیں۔ یہ تو باقاعدگی سے اردو میں افسانہ نویسی کی داغ بیل پڑنے کا دَور تھا، لیکن ذرا سے تجسس اور تفتیش سے کام لیا جائے تو یہ اندازہ بہ آسانی ہو جاتا ہے کہ اردو میں افسانہ نویسی کا آغاز اُنیسویں صدی کے نصفِ آخر کے اولین برسوں ہی میں وجود میں آنے لگا تھا۔ اس ضمن میں سرسید احمد خاں کا گذرا ہوا زمانہ، ماسٹر رام چندر کا "نصیحت" اور مولانا عبدالحلیم شرر کا "عمر رفتہ" ان ابتدائی نقوش کو واضح طور پر سامنے لاتے ہیں جن پر بیسویں صدی کے آغاز میں یلدرم اور پریم چند کے افسانوں سے پہلے علی محمود اور فیض الحسن اپنے اپنے طور پر اردو کہانی اور قصّہ گوئی کو خالص افسانوی رنگ دینے کی قریب قریب کامیاب کوشش کر چکے تھے۔

اُردو میں افسانہ نویسی کے آغاز کے ذکر میں یوں تو اُن ناموں کی تلاش بے حد ضروری ہے جنھوں نے اس کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا ہے، لیکن اردو افسانے کی کوئی باضابطہ تاریخ نہ لکھے جانے کے سبب اب تک گوشۂ گم نامی میں پڑے ہیں، لیکن یہاں ان تفصیلات کا محل اور موقع نہیں ہے، اس لیے ترقی پسند افسانے کے آغاز سے پہلے سرسری طور پر اُن رجحانات کا تذکرہ زیادہ اہم ہے جن کے بغیر ترقی پسند افسانے کی اٹھان کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اُنیسویں صدی کی آخری اور بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں برصغیر کی سیاسی اور سماجی زندگی، جس تیزی کے ساتھ غیر ملکی حکمرانوں کی غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کے لیے اضطرار اور اضطراب کا مظاہرہ کر رہی تھی، اُس نے پورے معاشرے کو ایک غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار کر دیا تھا۔ یعنی صنعتی مراکز میں جس انداز سے پُرتشدد احتجاجات کی لہریں اُٹھ رہی تھیں، غیر صنعتی مراکز

(جاگیردارانہ ماحول) میں ماحول انتہائی پرسکون اور ناقابلِ تغیر نظر آتا تھا۔ آبادی کا تیسرا حصہ یعنی تعلیم یافتہ اور ملازمت پیشہ طبقہ، جس سے لکھنے لکھانے والوں کا تعلق تھا، اُن دنوں بالعموم کسی انقلابی جدوجہد اور پُرتشدد احتجاج کا حامی اس لیے نظر نہیں آتا تھا کہ اُن کے نزدیک وسائل اور ذرائع پر مکمل گرفت رکھنے والی حکومت سے ٹکر لینا قبل از وقت اور غیر دانش مندانہ تھا۔ غلامی سے آزادی کی منزل تک پہنچنے کی اس غیر یقینی فضا میں اہلِ فکر اور اہلِ قلم طبقے نے انقلاب کے بجائے علم اور تعلیم کے پھیلاؤ پر زور دے کر ذہنی تربیت کے ذریعے "ایوولوشن" کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ راجہ رام موہن رائے (انقلاب پسندی کے ساتھ ساتھ) اور سر سید احمد خان کا لائحۂ عمل اس ایوولوشن کی تکنیک ہی پر تھا، "اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ آنے والی نسلیں جیسے جیسے علم اور تعلیم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں آتی جائیں گی انقلاب کی راہ از خود اُن کے سامنے کھلتی چلی جائے گی۔ یعنی یہ کہ نئے علوم کی تعلیم سے آنے والی نسلوں میں اگر ایک طرف روشن خیالی پیدا ہوتی رہے گی تو دوسری طرف اُن کے اندر خود آگہی، وطن دوستی اور غلامی کے خلاف انقلاب برپا کرنے کا شعور پختہ ہوتا چلا جائے گا۔

اُردو میں فکشن کا آغاز فورٹ ولیم کالج کے داستانی تراجم سے شروع ہوتا ہے۔ ان داستانوں کی خواب آور نوعیت اپنی جگہ کتنی ہی دُرست ہو لیکن اِن کے کرداروں کی جفاکشی اور مصیبتوں کے خلاف مقاومت کا جذبہ ناقابلِ تردید ہے۔ ماضی سے لگاؤ پیدا کرنا اور حال کی درستگی اِن داستانوں کا بنیادی وصف بھی ہے دیکھنا یہ نہیں ہے کہ اس میں حال کی درستگی صرف عشق و عاشقی کے میدان میں منزلِ مراد کا حصول ہے۔ دیکھنا یہ بھی ہے کہ اس منزلِ مراد کے حصول میں کردار کس بھٹی میں تپ کر کندن بنتا ہے۔ یہ داستانیں فورٹ ولیم کالج کے دور کی تصانیف نہیں صرف تراجم ہیں اور ان کی اوریجنل شکل صدیوں پرانے ماحول کی ساختہ پرداختہ ہے اُس ماحول کو آج کے ماحول سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ یہ ہم سب بخوبی جانتے ہیں۔ لہٰذا ان داستانوں کا یہ مقصد قرار دیا جانا کہ وہ ہمیں ماضی کے طلسماتی اور خواب آور ماحول میں واپس لے جانا چاہتی ہیں، یک طرفہ اور یک رُخا فیصلہ ہے۔ اصل فیصلہ اس بات کا کرنا ہے کہ یہ داستانیں اپنے کرداروں کے توسّل سے پڑھنے والوں کے اندر حالات کی ابتری کے سامنے ٹھہرنا اور مقابلہ کرنا سکھاتی ہیں یا نہیں؟

داستانوی دور کے بعد اردو فکشن کا پہلا موڑ ناول نگاری ہے۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ہوں یا شرر اور سرشار کے، ان کے کرداروں میں اپنے مقصد کے حصول کی لگن میں داستانوں کے کرداروں کے جذبۂ سرشاری کا گہرا عکس پایا جاتا ہے۔ حالات کی درستگی کا جذبہ بھی بنیادی طور پر ویسا ہی پسندیدہ ہے۔ ماضی سے لگاؤ کی کیفیت بھی اتنی ہی شدید ہے۔ البتہ ان عوامل اور عناصر کو برتنے کا سیاق و سباق خواب میں کسی حسینہ کے نظر آ جانے، یا کسی حسینہ کی تصویر دیکھ لینے، یا کسی طوطے یا مینا کی زبانی کسی کے حسنِ جہاں سوز کی باتیں سُن کر عشق میں مبتلا ہو جانا نہیں ہے (سرشار کے دو ایک ناولوں میں بنیادی جذبہ عشق و عاشقی بھی ہے) بلکہ انیسویں صدی کے بدلے ہوئے ماحول کا سیاق و سباق ان کرداروں کی جدوجہد اور جذبۂ مقاومت کو جنم دیتا ہے جس میں انگریزوں کی لائی ہوئی تہذیب اور تعلیم کے اثرات کے خلاف (غلط یا صحیح جیسا بھی رہا ہو) ایک جذبہ جہاد ملتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے اہلِ قلم نے متذکرہ بالا عناصر اور عوامل کو غیر ملکی تہذیب اور تعلیم کے اثرات کی جگہ اس نظام ہی کے خلاف جذبۂ نفرت اُبھارنے کے لیے استعمال کرنے کا ڈول ڈالا جو ان خرابیوں کو جنم دے رہا تھا۔ اس طرزِ عمل کو ہم اپنے ادب میں حبِ وطن کی بیداری کا نام دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ماضی کے صحت مند عناصر کی یاد دہانی کی واضح لکیر اس ادب میں بھی برابر سے کھنچی نظر آتی ہے۔ شاعری میں حالی، شبلی، اکبر الٰہ آبادی اور اقبال نے سب عناصر کو برتا اور افسانے میں اس صدی کے ربع اوّل تک یلدرم، پریم چند، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری تو ان عناصر کو کسی نہ کسی شکل میں برتنے والے اہم نام ہیں، لیکن اس دور کے ایسے بہت سے نام اب طاقِ نسیاں ہیں جنھوں نے اپنی اکا دُکا تحریروں سے اس طرزِ نگارش اور طرزِ فکر کو عام کرنے اور ایک فضا کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایسے نام ایک دو

نہیں درجن بھر سے زیادہ ہی ہیں اور ان کی تحریریں اس دور کی ادبی فضا میں خاصے ذوق و شوق سے پڑھی بھی جاتی تھیں۔

یہ جو ہمیں بیسویں صدی کے ربع اوّل کے خاتمے کے چار پانچ برسوں کے اندر "اندر مدز" انگارے"، جیسے افسانوی مجموعے سے سنا سائی ہوتی ہے تو یہ کوئی راتوں رات قلبِ ماہیت کا معجزہ تو نہیں تھا؟ اس کے پس پشت کم از کم پچاس برسوں کی وہ تحریریں تھیں جن میں مختلف بھیس اور روپ میں نئی نسل کو خود بینی اور خود آگہی اور خود شناسی کا درس دیا جا رہا تھا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کے ناولوں اور افسانوں کو اُٹھا کر دیکھ لیجیے، ان میں ایک تصوراتی اور رومانوی انداز کا وہ ہیرو یا ہیروئن ضرور ملے گی جس کے اندر معاشرے کے کسی نہ کسی قدیم طرزِ معاشرت کے خلاف یا انگریزی تعلیم اور تہذیب کے اثرات کے خلاف مبہم جوہانہ اور مبالغہ آمیز طرز مقاومت بنیادی وصف نہ ہو۔

ترقی پسند تحریک نے اس جذباتی انداز کے سامنے پہلی بار علم، عقل، آگہی اور معاشرتی زندگی کے حقائق سے لگ کر چلنے کی راہ سجھائی۔ ترقی پسند ادب کے صحیح نمائندوں نے ماضی کے خلاف بھی پرچار کیا ہے اور حال کی خرابیوں کو بھی نوکِ قلم پر رکھا ہے، حالات کے خلاف مقاومت کا درس انھوں نے بھی دیا ہے، حب الوطنی کے گیت انھوں نے بھی گائے ہیں اور جھوٹی حب الوطنی اور منافرت کے خلاف انھوں نے بھی قلم اٹھایا ہے۔ حالات کی تبدیلی کے لیے انقلاب کی راہ انہی نے دکھائی ہے، لیکن اس سارے طرزِ عمل کے پس پشت جذباتیت نہیں علم اور آگہی ہے۔

اس سارے پس منظر کو پیش نظر رکھیے اور اختر حسین رائے پوری کے افسانوں پر ایک نظر ڈالیے تو ان افسانوں میں آپ کو ہماری افسانہ نگاری کی جدید روایت کا ادراک کرنا کچھ مشکل نہیں لگے گا۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں افسانے لکھنا شروع کیے اور ان کے پہلے مجموعے "محبت اور نفرت" میں کوئی چار برس کے لگ بھگ لکھے ہوئے افسانے شامل ہیں۔

ان چار برسوں میں غیر منقسم ہندوستان کی سیاسی اور سماجی فضا کئی اہم موڑ کاٹ کر بڑی تیزی سے انقلابی راہ پر آ گئی تھی۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان ۱۹۳۱ء میں کانگریس پارٹی نے کھل کر "بنیادی حقوق اور معاشی پالیسی" کے حق میں قرارداد میں پاس کیں جو اسے سوشلسٹ پروگرام کے نزدیک لے آئیں۔ اس طرح ۱۹۳۱ء کے اواخر میں کراچی میں "آل انڈیا ورکرز اینڈ پیزنٹس پارٹی" کا اجلاس بھی منعقد ہوا جس کے فیصلوں نے ماحول میں انقلاب آفرینی کی رفتار کو مزید تقویت اور تیزی دی۔ ۱۹۳۴ء میں آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نارائن کی کوششوں سے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ "اس طرح ۱۹۳۵ء سے کچھ پہلے کمیونزم، سوشلزم اور گاندھی واد ہندوستان کی تقریباً تمام اہم تحریکات پر اثر انداز ہو رہے تھے۔" (ڈاکٹر صادق۔ ترقی پسند تحریک کا سیاسی اور سماجی پس منظر) ادبی سطح پر اسی دوران میں ترقی پسند تحریک نہ صرف وجود میں آئی بلکہ ۱۹۳۶ء کے وسط تک تمام سیاسی، سماجی اور معاشی تحریکات "تغیر و تبدل کا آئینہ دار بن کر مستحکم ہو گئیں۔ "محبت اور نفرت" کے افسانوں میں ان تغیرات اور تبدیلیوں کا بالراست بیان نہیں بلکہ ان کے پس پشت محرکات اور جذبات سے اثر پذیری کے تحت ماحول میں رچی بسی ناانصافیوں اور ان کے خلاف شدید نفرت کے اظہار کو ریکارڈ کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کا عنوان "محبت" ہے۔ جس میں "خیال کی رو" کی تکنیک میں سات ادبِ لطیف، طرز کی تحریریں شامل ہیں جنھیں کسی نوع بھی افسانے کا نام تو نہیں دیا جا سکتا، ہاں ان میں ماحول کی سنگینی اور سنگلاخی کو معاشرتی حوالوں سے جس انقلابی شعور کے ساتھ اُبھارا گیا ہے وہ فی الواقع پڑھنے والوں کے دل و دماغ میں متذکرہ ماحول کے خلاف شدید نفرت اور تلخی پیدا کر دیتے ہیں۔

"محبت اور نفرت" میں تین مختصر تحریریں ـــ کاغذ کی ناؤ، عورت اور بھیں۔ کو عنوان دینے کے بجائے صرف سوالیہ نشان (؟) سے ان کی نوعیت کو متعین کیا گیا ہے۔ یہ تینوں ادب پارے مصنف کے اندر دراصل تین اہم سماجی عوامل سے متعلق ردِ عمل ہیں جن میں اُن کے ابتدائی طرزِ فکر کی بڑی واضح تصویریں کھینچ گئی ہیں۔ اس حصے کا سرعنوان شلر کا قول "اچھا ہوتا جو کسی چیز کا کوئی نام نہ ہوتا" اس طرزِ فکر کا واضح

نما ز ہے جہاں عمر کے مخصوص حصے میں بالغ ہوتا ہوا ذہن تمام حقائق کو اپنے طور پر سمجھنا اور نئے عنوانات دینا چاہتا ہے۔

'نفرت' کے زیر عنوان سات افسانے ہیں۔ اس حصے کا سر عنوان "نفرت ایک پھول ہے سونگھنے کے لیے" اُس جذبے کی تصدیق ہے جس جذبے کی طرف ابھی ابھی اوپر کی سطور میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ان افسانوں میں نفرت کو بیشتر 'محبت' کی تفہیم پر مبنی واقعات کی مدد سے اُبھارا گیا ہے۔ تکنیکی اعتبار سے یہ عمل پورے طور پر نہیں تو جزوی طور پر JUXTAPOSITION کی تکنیک کے ذیل میں آتا ہے۔ جیسے فارسی کے مصرعے "کجا می نمائی کجا می زنی" کی مدد سے اپنے روایتی سیاق سباق میں بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس حوالے سے ان کا افسانہ "مجھے جانے دو" خصوصی مطالعے کا تقاضا کرتا ہے جس میں انھوں نے ایک طوائف کی گھناؤنی زندگی کے بڑے عبرت ناک انجام کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ عبرت ناک انجام طوائف ہی کا نہیں فی الواقع ہمارے اُس گندم نما جو فروش اخلاقی نظام کا ہے جس کا ناصح اس افسانے کا "مولوی نورالاسلام" ہے جو فرد نہیں بلکہ ہمارے یہاں اخلاقیات کا پورا انسٹی ٹیوشن ہے۔ اس انسٹی ٹیوشن کی ایک جھلک اختر حسین رائے پوری ہی کے الفاظ میں آپ بھی دیکھ لیجیے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار کوڑھ زدہ طوائف کہتی ہے:

> "جب میں مر جاؤں تو میری لاش لاوارثوں کے قبرستان میں پھینک دی جائے تو تم علی گڑھ کے مولانا نورالاسلام سے ملنا۔ اس وقت ان کے پاس جانا جب وہ منبر پر بیٹھے جمعہ کا خطبہ دے رہے ہوں اور تمھیں شرافت کی قسم کہ جب وہ اخلاق کی تفسیر بیان کرنے لگیں تو اپنی صف سے نکل کر کہنا 'مولانا! میں ایک پردیسی ہوں اور آپ کو یہ پیغام سنانے کے لیے کلکتے سے آیا ہوں کہ بد اخلاقی اس دنیا سے چل بسی۔ اب آپ ناحق نہ تُرسو رہیے۔'"

یہ طوائف ان ہی مولانا کی بیٹی ہے جسے مولانا نے ایک حرام کا بچہ پیدا کرنے کی سزا میں گھر سے نکال دیا تھا۔ کچھ دنوں یہ لڑکی ایک "مردِ مومن" کے گھر کی رونق سی رہی اور پھر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ منتقل ہوتی ہوئی کلکتے پہنچ کر طوائف بن گئی۔ جہاں اس کے گاہکوں نے اُسے گھناؤنی بیماریاں تحفے میں دیں۔ اس طوائف کے یہ آخری الفاظ اور پڑھ لیجیے:

> "تم لوگ جانوروں پر رحم کھاتے ہو، ان پر کوئی تشدد کرتا ہے تو سزائیں دیتے ہو۔ میں نے سیٹھوں کو دیکھا ہے کہ چیونٹیوں کو شکر اور سانڈوں کو پوریاں کھلاتے ہیں۔ مگر عورت! آہ عورت پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو؟"

"محبت اور نفرت" کے اس حصے کے افسانے دراصل ایسے ہی لاتعداد معاشرتی جبر اور استحصال کے خلاف سوالیہ نشانوں کے حامل ہیں۔ ان افسانوں پر ڈاکٹر اعجاز حسین نے 'مختصر تاریخ ادب اردو' میں بڑی جچی تُلی رائے دی ہے وہ لکھتے ہیں:

> "ایک خاص بات جو ان کو رومانی قسم کے ترقی پسند ادیبوں کی صف میں ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ وہ عام ادیبوں اور شعرا کی طرح ہماری روح میں تسکین اور آسودگی کا عنصر نہیں آنے دیتے بلکہ اس کو مضطرب، بے چین اور تڑپتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں جن سے ہمارے دلوں میں موجودہ نظام کی خرابیوں کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر اعجاز حسین کی مندرجہ بالا رائے پر کسی قسم کی حاشیہ آرائی کی گنجائش نہیں ہے۔ انھوں نے اختر حسین رائے پوری کی افسانہ نگاری کے جس بنیادی وصف کی نشان دہی کی ہے وہ ہمارے سروں پر مسلط نظامِ حیات اور نظامِ حکمرانی کے سہارے معاشرے میں پھیلائی جانے والی بُرائیوں کے خلاف ایک مستقل نفرت اور حقارت کا الاؤ ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ "نفرت اور محبت" ہی کے افسانوں میں نہیں بلکہ "زندگی کا میلہ" نامی مجموعے کے افسانوں میں اختر حسین کے یہاں اس شعلے کی تندی اور تیزی بدستور قایم رہتی ہے۔

"زندگی کا میلہ" میں شامل آٹھ افسانے جنگِ عظیم دوئم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کے دوران میں لکھے گئے تھے۔ ان افسانوں میں

بھی اختر حسین رائے پوری کے لہجے میں وہی " بیزاری، تلخی اور بے تابی" ہے جو سدا سے اُن کے تخلیقی جذبے کو مہمیز کرتی چلی آئی تھی۔ البتہ ان افسانوں کے لب و لہجے میں عمر، تجربے اور علم کی گہرائی کے ساتھ ساتھ ایک گہری اور دبیز سنجیدگی اور قدرے یاس انگیز تلخی لے لیتی ہے۔ پہلے مجموعے کے تمام افسانوں میں ایک بے قابو تڑپ ہے جو ہزار آہنی دیواروں میں سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ دوسرے مجموعے کی افسانوی فضا میں یہ تڑپ گرفت میں آتی ہوئی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اب اس میں وہ والہانہ پن نہیں جو بے خطر جست کی شکل میں تھا۔ اب تذلیلِ انسان اور انسانیت پر سوزِ دروں کی کیفیت حاوی ہے جس میں " بیزاری تلخی اور بے تابی" ہے مگر بے محابا اور اُبال کی صورت نہیں۔ اس مجموعے کا ایک افسانہ 'بیزاری' اس قدرے بدلے ہوئے انداز کی اچھی مثال ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

" میں جس پل پر کھڑا ہوا تھا اس کی محرابوں میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں اور اس کے نیچے جو دریا بہتا تھا اس کا پانی مٹ میلا اور کثیف تھا۔ میں یہاں صرف اس لیے کھڑا ہوا کرتا تھا کہ اپنے آپ سے بھاگ کر انسانوں کی بھیڑ میں گم ہو جاؤں۔ اس طرح مجھے یاد بھی نہ رہے کہ میرا نام کیا ہے۔ تصوف کی کوئی خاص کیفیت طاری کر کے میری وحدت اس کثرت میں گم ہو جائے تو میں ایک بہت بڑے عذاب سے نجات پا جاؤں۔ ایک ایسا عذاب جو گھن کی طرح میری روح کو چاٹ رہا ہے اور اس کے ہونٹوں کا لمس میرے دل کی دھڑکن کو بند کر کے آسمانی کتوں کی طرح چٹخارہ بھر رہا ہے "

اس مختصر سے اقتباس میں اختر حسین رائے پوری نے اپنے دور کی ساری معاشرتی کیفیتوں اور ان کیفیتوں کے دھارے پر اپنے دور کے انسان کی پوری ذہنی، نفسیاتی اور روحانی کش مکش کا سانچہ تحریر کر دیا ہے۔ محرابوں میں دراڑیں پڑ گئیں، وہ معاشرہ ہے جو اپنے اندر بسے ہوئے جیتے جاگتے انسانوں کے سروں پر تباہی اور بربادی کا پیغام بنا کسی بھی لمحہ ڈھے جانے کو تیار کھڑا ہے۔ اس ماحول میں انسان کی نجات کی کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی اور نہ اُسے کوئی خوش کُن نوید ہی دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ یہ بات اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے کہ اس مجموعے کے افسانوں میں جنگِ عظیم دوئم کے سارے معاشرتی، اقتصادی، اخلاقی اور روحانی اثرات اپنی دل گرفتگی کے ساتھ ایک ایک سطر میں اسا اعلان کر رہے ہیں۔ وہ 'دیوان خانہ' کی بظاہر خوش گفتار بیگم نادرا اور بیگم لوٹ والا، ہوں یا ڈاکٹر نادرا اور سردار بخش، سب کی بناوٹی خوش طبعی اور جبلی نازیوں کی ملمع کاری کے نیچے اُن کی کھوکھلی روحیں ہیں اور دہک جاتے ہوئے دل و دماغ جن میں ناکامیوں کا غم اور سہولی جذبات کی آخری اور بے مصرف بھڑک کا اندوہ مکڑی کے جالوں کی طرح اُن کے انسانی اور روحانی وجود کے اطراف کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ اُن کی بصارت اور بصیرت اپنے اُتھلے مسائل کے سوا اور کچھ دیکھنے سے عاری ہے۔ اس ماحول میں کبیدگیٔ خاطر کے علاوہ کسی حساس فن کار کے حصے میں اور کیا آئے گا؟ لیکن اختر حسین رائے پوری کے ان افسانوں میں کبیدگی، دردمندی، منفعل جذبہ نہیں بنتی کہ وہ کڑھتے اور بڑھ کے رہ جاتے ہیں۔ 'بیزاری' کے علاوہ "دل کا اندھیرا" "جسم کی پکار" اور "ہنر کی موت" میں ان کی جبلی شدید بیزاری کی نوکیلی نبض اپنے آپ کو محسوس کراتی ہے۔ 'دل کا اندھیرا' جنگِ عظیم کے فوراً بعد اس پیرس کے بجھے ہوئے دل کی داستان ہے جس میں مورس کی بوڑھی ماں اور جوان بیوی ہر آہٹ پر میدانِ جنگ سے لوٹتے ہوئے "مورس" کے لیے آنکھیں بچھائے منتظر ہیں اور جب آندرے میدانِ جنگ میں کام آئے ہوئے مورس کی شادی کی انگوٹھی عیسیٰ کی تصویر اور لوہے کی زنجیر اس کی ماں کی میز کے کونے پر رکھ کر چپکے سے کھسک آتا ہے تو دوسرے دن گرجا میں وہ مورس کی ماں کو دیکھتا ہے جو اپنی بیوہ بہو کے ساتھ آئی ہے۔ مورس نے دیکھا کہ " بڑھیا نہ دعا مانگ رہی نہ رو رہی ہے نہ اُس نے سجدہ کیا ہے نہ فریاد کی ہے اُس نے مریم کے منھ پر تھوک دیا ہے " یہ تھوک

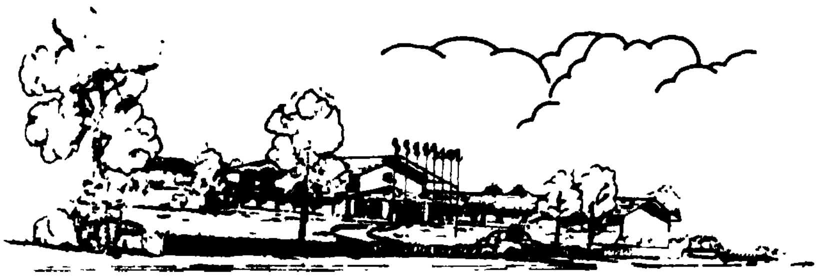
خدا کی ماں کے گالوں پر بہہ رہا ہے۔" "تلاشِ گم شدہ" جنگ کے بعد کے اثرات کا دوسرا افسانہ ہے جس میں نبو خان اپنی ٹانگ گنوا کر گھر واپس آتا ہے۔ پورا گاؤں تو اُس کی ٹانگ کے حوالے سے اس پر ترس کھاتا ہی ہے، اُس کی اپنی بیوی بھی اُس سے سرکش ہو کر گاؤں کے کسی غیر مرد سے ملنے رات کی تاریکی میں کھیتوں میں جانے لگتی ہے۔ نبو خان نے اپنی گم شدہ ٹانگ کی بازیابی کی راہ یوں تلاش کی وہ ایسی ہی ایک رات کو جب اس کی بیوی گھر سے اپنے یار (مہر) سے ملنے نکلی تو وہ شدید بخار کے باوجود گنڈاسہ لے کر نکل پڑا اور مہر کی ٹانگ کاٹ کر خون آلود حالت میں اپنے زخمی گھٹنے کے ساتھ باندھ لیتا ہے اور دیوانوں کی طرح ہنس رہا ہے۔

"زندگی کا میلہ" کے سارے افسانوں میں معاشرے کے مسخ ہوتے ہوئے خدوخال پر اختر حسین رائے پوری نے اسی فن کارانہ انداز میں بھرپور وار کیے ہیں جن سے پڑھنے والے کے دل و دماغ جھنجھنا اٹھتے ہیں اور اُس کی روح میں ان عناصر کے خلاف تلخی کا زہر اُترجاتا ہے جو اُس کے معاشرے کے دراڑ پڑتے ہوئے پُل کے نیچے سے گزرنے والے پانی کو مٹ میلا بنا رہے ہیں۔ اسی ایک مجموعے کے نہیں بلکہ اُن کے دونوں ہی مجموعوں کے افسانے ایک ایسی دُکھی اور مضطرب روح کی چیخ ہیں جو اپنے چاروں طرف لہولہان معاشرے کی مٹھی میں مسخ ہوتی ہوئی مخلوق کے حالِ زار کو ناقابلِ برداشت پاتی ہے۔

فنی اور تکنیکی اعتبار سے یہ سبھی افسانے ("نفرت اور محبت" کے چند افسانوں کو چھوڑ کر) سیدھے سادے بیانیہ ہیں۔ افسانہ نگار نے ان افسانوں میں کہیں اسٹائلزم کے اوچھے حربے کو استعمال نہیں کیا ہے اس لیے کہ یہ حربہ لکھنے والے کے پاس کچھ نہ ہونے کا پردہ ہوتا ہے۔ یہ بات کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ جہاں لکھنے کو کچھ نہیں ہوتا وہاں فن کار محض ایک قیاسی فضا میں اپنے اسٹائل کا تانا بُنتا ہے اور یوں وہ نہ صرف خود اپنے حقیقی ماحول سے کترا کر گزر جانے کے لیے داؤ پیچ دکھاتا ہے بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی قیاس اور گماں کے ایسے گورکھ دھندے میں پھنسا دیتا ہے کہ وہ لکھنے والے کے کھینچے ہوئے حصار سے باہر نکلنے کی راہ نہیں پا سکتے۔ مگر یہ سب کچھ بہرحال ایک نظربندی کا عمل ہوتا ہے جس کے دائرۂ اثر سے نکلتے ہی فن کار اور اُس کی شعبدہ بازی کا بھرم کھل جاتا ہے۔

اختر حسین رائے پوری کی سرگزشت "گردِ راہ" اب شائع ہو چکی ہے۔ انھوں نے اپنے ماحول اور معاشرے سے جتنی قربت کی زندگی گزاری ہے اُس کی خاصی جھلکیاں اس سرگزشت میں موجود ہیں۔ اس سرگزشت کی اشاعت سے پہلے بھی ان کے افسانے اُن کی زندگی سے قربت، اس سے لگاؤ اور اس کے کیف و کم سے آگاہی کا ثبوت خود ہی تھے۔ ہمارے جدیدیت پسند افسانہ نگاروں کی بہت بڑی اکثریت نہ جانے اس رمز سے اپنی آگاہی کا ثبوت اپنی تحریروں میں کیوں نہیں دیتی کہ عام اور روزمرہ کی سیدھی سادی زندگی میں بھی اتنے اسٹائل، اتنی تہیں اور اتنے دھنک رنگ موجود ہیں کہ اس کو جیسی وہ ہے کی بنیاد پر گرفت اور پیش کش کے لیے کسی ادبری اور درآمدی اسٹائل کی نہ گنجائش ہے اور نہ اس کے حسن اور اس کی کشش، اس کی بدنمائی اور بدہیتی کو گرفت میں لانے میں کوئی کمی یا خامی رہ جاتی ہے۔ بس شرط ایک ہی ہے کہ زندگی کی آب جو میں شناوری شوقِ محض نہ ہو بلکہ پورے انہماک کے ساتھ ہو نہ یہ کہ تختہ بندی کا گُر آزمایا جائے اور تر دامنی کا خوف دامن گیر رہے۔

اختر حسین رائے پوری کے سیدھے سادے افسانے زندگی کی آب جو کے مٹ میلے پانی میں تندہی، انہماک اور وابستگی کے ساتھ پیراکی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، وہی ان افسانوں کا حسن بھی ہے اور ان کے زندہ رہنے کی ضمانت بھی۔ ان کے آخری (یعنی دوسرے) مجموعے کے افسانوں کو لکھے ہوئے اب چالیس برس سے زیادہ ہوتے ہیں لیکن مدت میں اُردو افسانوں کا کوئی جائزہ ان چالیس برس "پرانے" افسانوں سے اغماض نہیں برت سکتا ہے۔ زندگی کا ڈھرا کتنا ہی جدید سے جدید تر فرض کر لیا جائے جب تک کسی معاشرے میں لکھے والا ظلم پھیلانے والے عناصر اور عوامل کی گرفت اور نشان دہی عصرِ رواں کے مادی تناظر میں جرأت کے ساتھ کرتا رہے گا اس کی تحریر پڑھنے والے کے دل کی آواز بنی رہے گی۔ اختر حسین رائے پوری کے افسانے آج بھی اپنے پڑھنے والوں کا قلب گرمانے اور اپنے گرد و پیش میں جاری و ساری بدعنوانیوں کے خلاف سینہ سپر ہو جانے کا عزم اور حوصلہ بیدار کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔



وقفہ سفر کیلئے فضائی مُسافروں کی مقبول ترین قیام گاہ!
ایئرپورٹ ہوٹل، کراچی

ایئرپورٹ ہوٹل، مشرقِ وسطیٰ، خلیج کی ریاستیں، مشرقِ بعید، اور یورپ جانے والے یا وہاں سے آنے والے مسافروں کی روایتی قیام گاہ ہے۔ وہ مسافر حضرات جو شہر کے شور و غل سے دور، پرسکون اور آرام دہ قیام کے متمنی ہوتے ہیں وہ صرف ہمارے مہمان بننا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ایئرپورٹ ہوٹل کے پرسکون ماحول، مہذب خدمات اور کمروں کے معقول کرایوں کے سبب ان کی توقعات کی حسبِ مرضی بھرپور تکمیل ہوتی ہے۔

کل تک "دی اِن" کے نام سے جانا پہچانا آج کا ایئرپورٹ ہوٹل نہ صرف وکٹورین طرزِ تعمیر کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس کے وسیع سبزہ زاروں میں پہنچ کر اور ہماری میزبانی سے مطمئن ہو کر فوری طور پر ہر مسافر سکون و آرام کی حسین دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔

ایئرپورٹ ہوٹل کراچی انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہمیں شرفِ میزبانی سے نوازیئے، اپنے وقفہِ سفر کو پُرلطف بنائیے۔ اور تازہ دم ہو کر اپنی منزل کی سمت سفر کیجئے۔

Airport Hotel

کراچی انٹرنیشنل ایئرپورٹ۔ فون: ۴۸۰۱۴۱ (پانچ لائنیں)

۲۵۰ گیسٹ روم — سبزہ زاروں سے ملحق — ایئرکنڈیشنڈ — ٹیلیفون — درخواست پر ٹی وی سیٹ کا انتظام ریستوران — پاکستانی، مغربی اور چینی کھانے — کافی شاپ — شاپنگ آرکیڈ — سوئمنگ پول — کانفرنس ہال ۵۰۰ افراد کی گنجائش — آؤٹ ڈور کیٹرنگ — پارٹی، کاروباری ظہرانہ اور شادی کی تقریبات — شہر جانے اور آنے کے لئے ٹرانسپورٹ کا انتظام — ایئرپورٹ جانے اور آنے کیلئے مفت ٹرانسپورٹ۔

IAL - AH - 1 - 83

آپ

کا اعتماد ہماری کامیابی ہے

۱۹۸۵ء کے دوران پریمیم کی مجموعی آمدنی

۱۶۰ ملین روپے سے زائد

ہم اپنے محترم کرم فرماؤں کے شکر گزار ہیں، جنہوں نے ہم پر اعتماد کیا۔ پاکستان میں ۱۹۸۵ء کے دوران پریمیم کی ۱۶۰ ملین روپوں سے زائد آمدنی ہمارا ایک شاندار کارنامہ ہے اور یہ ہمارے کرم فرماؤں کی سرپرستی کی بدولت ہے، جو ہمارا اساسی میں نصف اثاثہ ہے

ایسٹرن فیڈرل کی جنرل انشورنس پالیسیاں دالی حادثات آتش زدگی خطرات بحری و ہوائی حادثات مشینوں کی ٹوٹ پھوٹ، بوائلر کے پھٹ جانے اور ایسے ہی عام خطرات کے خلاف تحفظ کی ضامن ہیں

efu آپ کی اپنی بیمہ کمپنی

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

THANER 86

سحر انصاری

ڈاکٹر اختر حسین اور ترجمے کا فن

ترجمہ ایک مشکل فن ہے اور جب بات ترجمے سے گزر کر ترجمانی تک پہنچ جائے تو یہ فن اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ترجمے مختلف موضوعات اور اصناف کے ہو سکتے ہیں۔ لیکن سب سے مشکل کام شاعری کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے۔ شاید اسی لیے رابرٹ فراسٹ نے کہا تھا کہ ترجمے کے بعد جو چیز ترجمے میں آنے سے رہ جاتی ہے وہی دراصل شاعری ہوتی ہے۔ شاعری کے بارے میں بعض شعرا اور بھی حساس رہے ہیں۔ کسی نے کیٹس سے کہا کہ آپ کی فلاں نظم میری سمجھ میں نہیں آئی تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ جو الفاظ میں نے نظم میں استعمال کیے ہیں ان کے علاوہ دوسرے لفظوں میں اس بات کو بیان کروں، تو آپ سخت غلطی کر رہے ہیں۔ شاعری کے ترجمے کے بارے میں ایک اور قول بھی بہت مشہور ہوا ہے کہ شاعری کا ترجمہ اس محبوبہ کی طرح ہے جو خوب صورت ہو تو وفادار نہیں ہوتی اور وفادار ہو تو خوب صورت نہیں ہوتی۔

یہ اور اس طرح کی باتیں ہر اچھے مترجم کے ذہن میں ضرور موجود رہتی ہوں گی۔ ذاتی طور پر میں اگر کسی شاعر کا ترجمہ کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بغیر اجازت کسی کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے۔ ان تمام تحدیدات کے باوجود اگر کوئی شخص نہ صرف ترجمہ بلکہ کالی داس جیسے مہاکوی کی "شکنتلا" کا ترجمہ کرنا چاہے بلکہ کامیابی سے کر بھی دے تو اسے بلاشبہ غیر معمولی صلاحیتوں کا انسان ماننا پڑے گا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بے پایاں دیانت اور ادبی و علمی خزانوں کے امین ہیں اور وہ ان خزانوں کا بڑی دیدہ وری اور ندرت پسندی کے ساتھ استعمال کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا ذہن کس معاشرت، کس عہد اور ماحول کا پروردہ ہے اس کا اندازہ تو ان کی خود نوشت "گردِ راہ" کے مطالعے سے ہو سکتا ہے لیکن یہ امر کہ وہ کلکتہ، علی گڑھ، حیدرآباد، دہلی اور پیرس میں اپنی زندگی کے تشکیلی ادوار بسر کرتے رہے، اور فارسی، اردو، ہندی کے ساتھ ساتھ گجراتی، بنگالی، سنسکرت اور فرانسیسی پر بھی عبور رکھتے تھے، انھیں اردو ادیبوں کی عام تخلیقی، نیم... دانش ورانہ روایت سے خاصا مختلف اور منفرد بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی کئی حیثیتیں ہیں۔ وہ نقاد، مبصر، افسانہ نگار، مورخ اور ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ کے دلدادہ اور ترجمے جیسے فن کے بہت بڑے شناور ہیں اور صاحب طرز نثر نگار بھی۔ انھوں نے جن کتابوں یا مصنفین کی تخلیقات کا ترجمہ کیا ہے ان کا اندازہ اور تنوع اس فہرست سے ممکن ہے:

۱۔ شکنتلا (کالی داس)
۲۔ گورکی کی آپ بیتی (میکسم گورکی) تین حصوں میں۔
۳۔ ہماری زمین (پرل بک)
۴۔ پیامِ شباب۔ قاضی نذر الاسلام کی بنگالی نظموں کا ترجمہ

اس کے علاوہ گارساں دتاسی کے اُن خطبات کا فرانسیسی سے ترجمہ کیا جو اردو زبان کی تاریخ اور مضامین کے بارے میں تھے اس نوعیت کا کام اردو زبان میں کم ہی ہوا ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اختر حسین رائے پوری کے یہ سارے تراجم نہ صرف مقبول ہوئے بلکہ ان کا گہرا اثر اس وقت کے ادب اور اسالیبِ تحریر پر بھی مرتب ہوا۔

سب سے پہلے شکنتلا کو لیجیے۔ اس کے بارے میں جرمنی کے عظیم شاعر گوئٹے کے یہ خیالات شاید اس ڈرامے کی عظمت اور اس کے خالق کی شاہکار اہمیت کے حضور بہترین خراجِ عقیدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے "فاؤسٹ" کا آغاز جو دو کرداروں کے مکالمے سے کیا ہے اسی طرز پر ہے) :

> "بہار کے تازہ دم پھولوں کا ذکر، یا خزاں کے پکے پھلوں کا۔ یا تمام ان چیزوں کا جن سے روح مسحور و مبہوت ہوتی ہے، یا تسکین پاتی ہے۔ یا اس کی پرورش ہوتی ہے یا اگر تم چاہتے ہو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اسے ایک لفظ میں بیان کر دو تو 'شکنتلا' کا نام لینا کافی ہے۔ اور یہی سب کچھ کہہ دینا ہوگا"

اردو میں شکنتلا کا ایک ترجمہ فورٹ ولیم کالج کلکتے کے معروف مصنف، مترجم و شاعر کاظم علی جوان نے کیا تھا اور اس کا سراغ یوں ملا یا تھا کہ فرخ سیر کے عہد میں نواز کشور (۱۷۱۶ء) نے سنسکرت سے برج بھاکا میں شکنتلا کا ترجمہ کیا پھر مارکوئیس ولزلی کے عہدِ حکومت میں ۱۸۰۱ء میں جان گلکرسٹ کے حکم سے "کاظم علی جوان نے اسے زبانِ ریختہ میں بیان کیا۔"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ترجمۂ شکنتلا کو کئی لحاظ سے نہ صرف اپنے پیش رو ترجموں پر بلکہ بعد کے تراجم پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ پہلی بات جو انھیں اردو کے دیگر مترجمین سے ممتاز و ممیز کرتی ہے، یہ ہے کہ شکنتلا کا یہ ترجمہ انھوں نے براہِ راست سنسکرت سے کیا ہے جب کہ دوسرے ترجمے ہندی یا انگریزی سے کیے گئے ہیں۔ دوسرے ڈاکٹر اختر حسین کو سنسکرت ساہتیہ سے گہری واقفیت تھی آپ کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ سنسکرت ڈرامے ہی کے بارے میں تھا۔ اس طرح آپ شکنتلا اور اس کے خالق کے ساتھ ساتھ سنسکرت ادب، اس کی تاریخ اور ارتقا سے بھی براہِ راست واقفیت رکھتے ہیں۔ اس پر مستزاد وہ شعور اور اظہار کی وہ قوت ہے جو شاعرِ اعظم کالی داس کے ذہن اور محسوسات تک رسائی سے تعلق رکھتی ہے۔ میں نے ابتدا میں ترجمہ اور ترجمانی کی بابت جو کچھ کہا ہے اس سے میری مراد یہی تھی کہ زبانِ غیر میں شرحِ آرزو ایک محالِ عمل ہے لیکن اگر اس کو ممکن کر دکھایا جائے تو سحر و اعجاز میں اس کا شمار ہوتا ہے اور اسے بسا اوقات تخلیق اور طبع زاد تحریر سے زیادہ وقعت حاصل ہوتی ہے۔ شکنتلا کا جو ترجمہ اختر حسین صاحب نے کیا ہے وہ ترجمے اور ترجمانی کی اسی ذیل میں آتا ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین ایک وسیع المطالعہ انسان ہیں انھوں نے یک رخا علم حاصل نہیں کیا ہے اسی سبب سے "شکنتلا" کے الفاظ، اسلوب اور کیفیات میں جو لطافتیں، نزاکتیں اور تجربوں کی لہریں پوشیدہ ہیں اُن تک رسائی حاصل کر کے انھیں اردو جیسی زبان میں اب سے کوئی پچاس سال قبل منتقل کر دینا یقیناً ایک اہم کارنامہ ہے۔

کالی داس چندر گپت موریا کے عہد (۳۷۵-۴۱۵ء) میں تھا۔ یہ عہد اپنے تہذیبی عوامل کے حوالے سے "عہدِ زریں" کہلاتا تھا۔ یوں تو تقریباً سارا کا سارا کلاسیکی سنسکرت ادب انتہائی تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ قارئین وسامعین کے لیے لکھا گیا ہے لیکن کالی داس کے ڈرامے بطورِ خاص اس امر کے متقاضی ہیں کہ ان کی مکمل تفہیم کے لیے انسان کے پاس خود بھی ایک دانش ورانہ ذہن ہو۔ ایسے ڈرامے کے ترجمے نے بلا شبہ اردو زبان کے تمثیلی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

ترجموں کی اہمیت کو ہر دور اور ہر زبان میں محسوس کیا گیا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ دوسرے یا تیسرے درجے کے طبع زاد کام سے بہتر ہے کہ اگر کسی میں صلاحیت ہو تو وہ درجہ اول کا ترجمہ کرے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ ان میں طبع زاد اور ترجمے دونوں کے اصلی معیار یکجا ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا اہم کارنامہ قاضی نذر الاسلام کی بنگالی نظموں کا ترجمہ ہے۔ جب پہلے یہ ترجمے رسالہ سہ ماہی "اردو" میں شائع ہوئے تو مولوی عبدالحق نے اپنے نوٹ میں لکھا:

"ہندوستان کی کسی زبان میں اس قیامت خیز قوت کا کوئی شاعر نہیں پایا جاتا۔ اس کے کلام میں ایک آگ بھری ہوئی ہے جس کے آگے ہماری شاعری کے عامیانہ خیالات اور مضامین گھاس پھوس معلوم ہوتے ہیں۔"

اختر حسین رائے پوری خود اس عہد میں سانس لے رہے تھے جس نے نذر الاسلام کی شاعری کو جنم دیا تھا۔ وہ بنگال کی سیاسی اور تہذیبی اہمیت کے شروع ہی سے قائل ہیں انھوں نے مختصر لیکن بصیرت افروز فقرے میں گویا ایک طلسم بند کر دیا ہے کہ:۔

"ہماری قومیت کا تمدنی سانچا بنگال میں تیار ہوا تھا۔"

ڈاکٹر اختر حسین کے یہ تراجم "اردو" کے علاوہ دیگر اہم ادبی رسائل میں بھی شائع ہوئے اور جب ہر طرف سے اصرار بڑھا تو انھوں نے یہ تراجم کتابی صورت میں "پیامِ شباب" کے عنوان سے شائع کر دیے۔ اس کتاب کا دیباچہ اُس عہد کی بنگالی شاعری پر جسے "ٹیگور کا عہد" کہا جاتا تھا، نہایت معروضی انداز کے محاکمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں اختر حسین صاحب نے قاضی نذر الاسلام کی زندگی اور شاعری کی تفصیلات کے علاوہ ان کے موضوعات اور اسالیب پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ "پیامِ شباب" ۱۹۳۶ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس میں ایک جگہ ڈاکٹر اختر حسین لکھتے ہیں:

"اس مجموعے کی تکمیل کے وقت ہمیں یاد آتا ہے کہ اس کی چند نظمیں ایک موقع پر ہم نے اقبال مرحوم کو دکھائیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور ہم سے دیر تک نذر الاسلام کا ذکر کرتے رہے انھوں نے بھی یہ فرمائش کی کہ انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ افسوس کہ اقبال آج ہم میں نہیں ہیں۔ وہ نذر الاسلام کے خیالات کے سخت مخالف تھے لیکن اس کے شاعرانہ کمال کے بڑے معترف تھے۔ اس کاوش کی وہ یقیناً داد دیتے۔"

قاضی نذر الاسلام کی بعض نظموں مثلاً "باغی"۔ "صورِ اسرافیل"۔ "مجاہد کی صدا" "پیری و شباب" "طائرِ صبح" "یادِ ایام" اپنی اپنی نوعیت کی بہت شان دار نظمیں ہیں۔ ان کے اثرات جوشؔ سمیت کئی شعرا کے ہاں دیکھے جا سکتے ہیں اور اس آغاز کا سہرا ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے سر ہے۔ ان تراجم میں بعض بہت بلیغ جمالیاتی تراکیب بھی نظر آتی ہیں مثلاً۔ شمس گہر ریز۔ مایاندی۔ فریب و دجل کا ریگستان۔ ناخدائے انقلاب۔ معبودِ شباب۔ برق گفتار۔ بربادی کی نیلی چادر۔ قسمت کے سنتری۔ نوخانی جوانی کا پانی۔ توہمات کی چار دیواری۔

ـــــ ایک نظم "افلاس سے خطاب" کی یہ سطریں دیکھیے:

"کڑکڑاتے جاڑوں کی صبح کی طرح میرا دل لرزتا تھا
جیسے اُس سے بھیگی ہوئی زمین کو باد زمہریر بوسہ دے رہی ہو
شبنم کی بوند میں درد کا دریا تیر رہا تھا۔
آہ! تو نے دھوپ بن کر اسے خشک کر دیا۔
راحت و آرام کی سپنا پوری اُجڑ گئی۔
میرے حلق میں بکھ کا گھونٹ ڈال کر پوچھتا ہے "آبِ حیات میں
کیا رکھا ہے۔ نہ درد ہے اور نہ خمار"
بدبخت! اس دکھیاری دنیا میں جینا تیرے بس کی چیز نہیں۔
تو نے افلاس کی گود میں پرورش پائی ہے۔
کانٹوں کے کنج میں بیٹھ کر آنسوؤں کے ہار گوندھا کر۔
درد تیری کتاب زندگی کا عنوان ہے۔
اس حد تک رو یاد کر اور مصروفِ شکوہ سنجی رہ کہ تیری قوتِ گویائی
ختم ہو جائے"

آخری سطر اس وقت اور بھی شدید تاثر چھوڑتی ہے جب یہ خیال آتا ہے کہ قاضی نذرالاسلام زندگی کے آخری برسوں میں قوتِ گویائی بلکہ شاید بیشتر حواس سے محروم ہو گئے تھے۔ اختر حسین رائے پوری کے یہ ترجمے بلاشبہ شاعری کے اندرونی جوہر اور اس کے گہرے تاثر کی ازسرِ نو بازیابی کی اعلیٰ مثال ہیں۔ زبان، اسلوب اور ترجمہ شدہ مصرعوں کی ساخت ایسی ہے کہ اگر انھیں جدید آزاد اور نثری نظموں کا پیش رو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بلکہ آج کے نثری نظم لکھنے والے ان ترجموں کے پیرایۂ بیان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

ان تراجم کی کامیابی کا عنصر اس حقیقت میں مضمر ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین ترجمے کی بنیادی شرائط پر نہ صرف دسترس رکھتے ہیں بلکہ اُن کو منفرد انداز میں برتنا بھی جانتے ہیں۔ ترجمے کے باب میں عام طور پر یہ رائے دی جاتی ہے کہ مترجم کو اصل اور ترجمے کی زبان دونوں پر مکمل عبور ہونا چاہیے۔ لیکن ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا خیال ہے کہ اس کے علاوہ بھی ایک زبان ہوتی ہے جو اصل متن کے بین السطور ہوتی ہے جب تک مترجم اس زبانِ بین السطور سے واقف نہیں ہوتا اُس وقت تک وہ اچھا اور کامیاب ترجمہ نہیں کر سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کالی داس اور قاضی نذرالاسلام کی شاعری کے انتہائی مشکل نمونوں کو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے کس سہولت اور بے ساختگی کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھال دیا اور اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ وہ ان دونوں شاعروں کی تخلیقات میں چھپی ہوئی زبانِ بین السطور تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر اُسے اُردو میں پیش کرنے کے لیے انھیں اپنا ایک اسلوب بھی مل گیا۔

شاعری کے تراجم کے علاوہ اختر حسین رائے پوری نے اپنے عہد کے ایک دلچسپ اور مقبول ناول "گڈ ارتھ" کا بھی ترجمہ "پیاری زمین" کے نام سے کیا۔ یہ ناول نوبل انعام یافتہ امریکی مصنفہ پرل ایس۔ بک کا تحریر کردہ ہے۔ مصنفہ کو ۱۹۳۸ء میں نوبل انعام دیا گیا تھا اس موقع پر پرل بک کی خصوصیات پر سویڈش اکیڈمی کی طرف سے یہ الفاظ ادا کیے گئے تھے:

"پرل بک کو ان کی ممتاز تصنیفوں کے لیے جو قومی اور نسلی حد بندیوں سے بے نیاز ایک عالمگیر ہم خیالی اور ہمدردی کا ڈول ڈال رہی ہیں نیز ان افکار اور تحریروں کے لیے جو انھوں نے انسانی نصب العین کے متعلق لکھی ہیں اور اب جن کی حیثیت بلاشبہ ایک اعلیٰ اور زندہ فن کی ہو گئی ہے۔ سویڈش اکیڈمی اس سال کا انعام دیتے ہوئے محسوس کرتی ہے کہ وہ الفرڈ نوبل کے مستقبل کے منصوبوں کے مطابق عمل کر رہی ہیں۔"

ان الفاظ سے اور خود ناول کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمے کے لیے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اس ناول کا اور اس مصنفہ کا انتخاب کیوں کیا۔ اس وقت تک ڈاکٹر اختر کا مشہور تنقیدی مضمون "ساہتیہ اور کرانتی" ہندی میں شائع ہو چکا تھا جس کا اردو روپ "ادب اور انقلاب" ہے۔ اس مضمون ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر حسین خود بھی قومی اور نسلی حد بندیوں سے آزاد ایک عالمگیر ہم خیالی اور ہمدردی کے حامی اور متلاشی تھے۔ اور انسان دوستی کی روایت سے وابستگی رکھتے تھے، آج تک اپنی علمی اور فکری گہرائی کے ساتھ ان میں موجود ہے۔

"پیاری زمین" چین کے ایک معمولی کسان وانگ لنگ کے بارے میں ہے جو ترقی کر کے بڑا زمیندار بن جاتا ہے اور اپنی زمینوں اور فصلوں پر فخر کرتا ہے۔ اسے اپنی زمین اپنے خاندان بلکہ دیوی دیوتاؤں سے بھی زیادہ عزیز تھی لیکن اچانک سیلاب اور قحط اس کے اور "پیاری زمین" کے مابین فاصلے پیدا کر دیتا ہے۔ ان حالات کو پرل بک نے انتہائی لگن اور خلوص سے ناول کی صورت میں تحریر کیا ہے اور بقول اختر حسین رائے پوری "مسز پرل بک امریکی ہیں لیکن ان کا ذہنی اور روحانی تعلق چین سے ہے۔"

ڈاکٹر اختر حسین نے ابتدا میں ایک مضمون بھی چینی ناول کی تاریخ اور ارتقا پر شامل کر دیا ہے۔ یہ مضمون اس تقریر سے ماخوذ ہے جو پرل بک نے نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد ۱۲ دسمبر ۱۹۳۸ء کو سویڈش اکیڈمی کے سامنے کی تھی۔ "پیاری زمین" ترجمے کے اعتبار سے اس قدر اعلیٰ ہے کہ اس پر ترجمے کا گمان ہی نہیں ہوتا۔ اختر حسین صاحب کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ زبان کا مزاج موقع محل کے اعتبار سے اختیار کرتے ہیں، جہاں عالمانہ زبان کی ضرورت ہے، پیرایۂ تحریر اسی کے مطابق ہوتا ہے اور جہاں عام بول چال مقصود ہے وہاں نہایت چابک دستی سے عام معاشرتی لغت سے کام لیتے ہیں۔ "پیاری زمین" کے آغاز کا یہ حصہ ترجمے کی خوبیوں کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے:

"آج وانگ لنگ کے بیاہ کا دن ہے۔ آنکھ کھلنے پر مچھر دانی کے دھندلکے میں پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آج صبح میں یہ نرالا پن کیوں ہے۔ مکان میں سناٹا تھا، بس بوڑھے باپ کی ٹھوں ٹھوں کا سلسلہ جاری تھا، جس کا کمرہ اس کے اپنے کمرے کے مقابل تھا۔ بڑے میاں کی کھانسی اس کے لیے بانگِ فجر تھی۔ وانگ لنگ بستر پر پڑے پڑے اسے سنا کرتا، تاوقتیکہ یہ آواز قریب تر نہ آ جاتی اور ابا کے کمرے کا دروازہ اپنی چول پر چرچرانے نہ لگتا۔

لیکن آج اس نے الکسی نہ کی اور لپک کر پردہ کھینچ دیا۔ بھور کے گلابی پن میں ابھی سیاہی کا پہلو باقی تھا اور اس چوکور سوراخ سے جو کھڑکی کا کام دیتا تھا، ایک لجلجا کاغذ اڑ اڑ کر تمتماتے ہوئے آسمان کی جھلک دکھا رہا تھا۔ پاس جا کر اس نے وہ کاغذ پھاڑ دیا اور زیر لب کہا: "بسنت میں اس کی کیا ضرورت۔"

یہ ناول اور اس کا ترجمہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کو بھی بہت پسند آیا تھا چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے ہی اسے ۱۹۴۱ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے شائع کیا تھا۔

نثری ترجموں کے سلسلے کی ایک اہم کتاب مشہور روسی مصنف میکسم گورکی کی آپ بیتی ہے جو تین جلدوں میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر اختر حسین اور ترجمے کا فن

سحر انصاری

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اس ادب پر خصوصی توجہ دیتے رہے جس میں سماجی شعور کے ساتھ ساتھ انسان کے ذہن و دل کی فضا تک دوسرے انسان کی رسائی ہو سکے۔ اس ضمن میں میکسم گورکی نے بلاشبہ دنیا کے سوچنے والے ذہنوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ اس کا ناول "ماں" تو ایک کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکا ہے لیکن اس کا ایک اہم شاہکار گورکی کی آپ بیتی ہے۔

اردو میں گورکی کی آپ بیتی کا ترجمہ سب سے پہلے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے کیا۔ یہ ترجمہ بھی انجمن ترقی اردو سے ہی سنہ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ کتاب کا پہلا حصّہ "میرا بچپن" ہے۔ اس پر اختر حسین صاحب کا مقدمہ ایک خاصے کی چیز ہے۔ اس سے گورکی کی شخصیت اور فن کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ اس کتاب کا لب لباب ان سطور میں سمٹ آیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> "اس کتاب میں گورکی ناظر کو بتلاتا ہے کہ ہر معمولی سے معمولی آدمی اپنی شخصیت رکھتا ہے، اس کے عذاب و ثواب الگ ہیں، خواب و ارمان جدا ہیں۔ ہر زندگی ایک افسانہ ہے۔ ہر آدمی ایک کیرکٹر ہے۔ آنکھوں والا چاہیے۔ یوں اس نگار خانے میں تماشوں کی کمی نہیں۔ مگر ان سب کے اردگرد گویا کوئی مکڑی جالا بُن رہی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ زنجیروں میں کسے ہوئے ہیں، کن بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ اُن کے سینے بھیانک، ان کے ارمان گھنونے۔ وہ سب اسیر ہیں، زندگی کے اسیر۔"

اس کے علاوہ نہایت اختصار لیکن بصیرت افروز انداز میں ڈاکٹر اختر حسین نے گورکی کا موازنہ طالسطائی، دستوویسکی اور چیخوف سے کیا ہے اور یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ان میں کیا فرق ہے:

> "طالسطائی میں ایک قسم کا ریکسانہ تپاک ہے، دستوویسکی میں بیماروں کا چڑچڑاپن ہے، چیخوف میں متکبرانہ تنہا پسندی ہے جو ناظر کو اُن کے قریب جانے سے روکتی ہے۔ مگر گورکی میں ایسی اپنایت ہے جو اپنے پرائے میں تمیز نہیں کرتی۔"

میکسم گورکی (سنہ ۱۸۶۸–۱۹۳۶ء) روسی تہذیب اور ادب کی عکاسی میں انقلاب سے قبل اور بعد کی دنیا کے مابین ایک پُل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ناول اور مختصر کہانیاں اپنا ایک الگ مزاج اور اعتبار رکھتی ہیں۔ رومین رولاں نے اس عظیم ادیب کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔

> "آپ ایک بلند قوس قزح کے مانند ہیں جو ماضی اور مستقبل کی دو دنیاؤں کو ملا رہے ہیں۔ میں اس قوسِ قزح کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ شاہراہِ حیات پر چھائی ہوئی ہے۔ اور جو لوگ ہمارے بعد آئیں گے وہ طویل عرصے تک اس کا نظارہ کرتے رہیں گے۔"

میکسم گورکی نے حقیقت نگاری اور جمالیات کو جس عمدگی سے یک جا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اس امتزاج کو اردو میں اس خوبی سے منتقل کیا ہے کہ بعد میں گورکی کی آپ بیتی کے وہ ترجمے جو براہِ راست روسی زبان سے کیے گئے ہیں، اُن کے ترجمے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اختر حسین صاحب نے اس کتاب کی روح کو اردو میں اس طرح منتقل کیا ہے کہ ترجمہ روشِ عام کے مطابق ایک میکانکی عمل ہونے کے بجائے تخلیقی عمل سے جا ملا ہے۔

گورکی کی "آپ بیتی" پوری کی پوری پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے دوبارہ شائع ہونا چاہیے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے وہ اب بھی بہت شگفتہ، شاداب اور تازہ ہے۔ پھر جو تجرباتِ زیست اس کے دامن میں سمٹ آئے ہیں اُن سے واقف ہو کر

آدمی بہت سی چھوٹی چھوٹی خود غرضیوں اور کمینگیوں کو خیرباد کہہ کر بہتر انسان بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین کے ترجمے کی ایک جھلک دیکھیے:

"کتاب چھوڑ کر میں اس کے متحیر اور شکن پر ور چہرے کو دیکھنے لگا اس کی جھپکتی ہوئی آنکھیں گویا میرے آر پار ہوئی جا رہی تھیں اور اُن سے ایک اُداس جوت نکل رہی تھی۔ مگر میں جانتا تھا دم بھر میں ان میں وہی سرد مہری آجائے گی۔ میز پر وہ انگلی سے باجا سا بجانے لگا۔ اس کے داغ دار ناخن چمک رہے تھے اور سنہری بھنویں تلے اوپر ہو رہی تھیں

"ناناجان"

"ایں؟"

"کہانی سنایئے"

اس نے یوں آنکھ مل کر گویا ابھی نیند سے جاگا ہے، کہا:

"ابے پوستی، پڑھنا ہے یا نہیں! تجھے مناجات سے زیادہ قصّوں کا شوق ہے"

فکشن، شاعری، ڈراما اور آپ بیتی کے علاوہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے مشہور فرانسیسی مستشرق گارسیں دتاسی کے بعض مقالات کا بھی فرانسیسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے یہ تنوع اور یہ معیار کم ہی ادیبوں کے حصّے میں آیا ہے۔ انھیں ان تراجم کے باب میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے یہ تراجم ہماری ادبی تاریخ کا اہم سرمایہ ہیں اور ضرورت اس امر کی ہے کہ جو ادارے معیاری کتابوں کی کم یابی کا رونا روتے ہیں، وہ ان تراجم کو دوبارہ شائع کریں۔ ڈاکٹر اختر حسین نے ترجمے کے فن کو جس طرح تخلیق اور طبع زاد کی سطح تک پہنچا دیا ہے وہ خود اس عہد کے ترجمہ نگاروں کی رہنمائی کر سکتا ہے اور اس سے عام پڑھنے والوں کے ذوق کی بھی تربیت ہو سکتی ہے۔

کسی تحریر کی سب سے بڑی امتحان گاہ خود وقت ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اندازہ ہوتا رہتا ہے کہ کون مقدم تھا جو مؤخر ہو گیا اور کس گوشہ نشین کے حصّے میں روشناسِ خلق ہونا لکھا گیا۔ ہمیں مسرت ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے یہ ترجمے آج کم و بیش نصف صدی کے شب و روز اور ماہ و سال طے کرنے کے بعد بھی اتنے ہی تابناک اور خوش رنگ ہیں جتنے اس وقت تھے جب وہ پہلے پہل منظرِ عام پر آئے تھے۔

ان ترجموں کی وقعت اور قدر و قیمت وقت کی امتحان گاہ میں اپنا نقش ثبت کر چکی ہے۔

مختار زمن

درخشاں گرد

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی شخصیت بھی ایک دل چسپ "طرفہ تماشا" ہے۔ اُن کا خاندانی تعلق صوبۂ بہار سے ہے مگر موصوف خود کو رائے پوری لکھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ رائے پور میں پلے بڑھے اور اسی نے اُن کی طبیعت کے موتی کو چمکایا۔ رائے پور سی پی میں واقع ہے۔ گویا یوں سمجھیے کہ ڈاکٹر صاحب ؏

سیپی کے رہنے والے ہیں دُرِ یتیم ہیں!

موصوف نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہندی سے کیا۔ ہندی میں کہانیاں اور مضامین لکھے، ہندی رسالوں کی ادارت کی۔ ہندی کے علاوہ سنسکرت کا علم حاصل کیا اور خوب نام کمایا، مگر کاتب تقدیر نے ان کا نام تاریخ ادب اردو میں جلی حروف میں لکھ دیا۔ اُردو لکھنا بعد میں شروع کیا تھا مگر وہی سرمایۂ زندگی ٹھہرا۔ ملازمتوں کے سلسلے میں بھی یہی طرفگی قایم رہی۔ آغاز صحافت و انشاپردازی سے ہوا، پھر معلوم ہوا کہ کبھی وہ امرتسر کالج میں لڑکوں کو پڑھا رہے ہیں، کبھی انجمن ترقی اردو کی لغت تیار کر رہے ہیں، کچھ دن بعد حکومتِ ہند کے محکمۂ تعلیم سے منسلک ہو کر اس گروہ میں شامل ہو گئے جسے عرف عام میں لوگ "بیوروکریٹ" کہتے ہیں اور جس پر آئے دن تنقید کے تیروں کی نشانہ بازی ہوتی رہتی ہے، مگر ڈاکٹر اختر حسین وہاں بھی ایسے چکے کہ نوکر شاہی کے دور میں بھی شاہی کی۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب "بیوروکریٹ" سے "ڈپلومیٹ" ہو گئے۔ سب سے اچھی سول سروس اقوام متحدہ کی ملازمت ہے۔ وہ اسی بین الاقوامی برادری میں شامل ہو گئے اور دنیا بھر کی سیر کر ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب کی متاہلانہ زندگی کا حال بھی سُن لیجیے، بڑا دل کش ہے۔ آپ ایک پولیس افسر کی بیٹی کو بیاہ کر لائے، مگر وہ پولیس افسر بھی منفرد اور لاکھوں میں ایک تھے۔ وہ ڈنڈے کے بجائے قلم کے رسیا نکلے۔ ڈاکٹر صاحب کے خسر "نیلی چھتری" والے ظفر عمر صاحب مرحوم سچ پوچھیے تو اردو کے کانن ڈائیل تھے۔ ان کی بیٹی حمیدہ بیگم، ڈاکٹر صاحب کی چہیتی بیگم ہیں۔ اُن کی انفرادیت کا یہ حال ہے کہ انھوں نے ہی ڈاکٹر صاحب کو ڈاکٹری کی ڈگری لینے کے لیے پیرس جانے کی ترغیب دی۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کی بیویاں انھیں پیرس جیسے شہر نگاراں جانے اور وہاں رہنے پر اصرار کریں! بات یہ ہے کہ ؏

اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟

ڈاکٹر صاحب کی تازہ ترین تصنیف "گردِ راہ" ان کی ایسی آپ بیتی ہے جس میں جگہ جگہ جگ بیتی کے جلوے نظر آتے ہیں تیزرو سیلانی طبع مصنف کے سفر سے جو گرد اٹھی ہے، وہ بھی عجیب ہے۔ اس سے دھند پیدا نہیں ہوئی بلکہ وہ بڑی درخشاں اور روشنی پھیلانے

والی گرد ہے جس میں جگہ جگہ دل چسپ فقروں اور طنز و مزاح کے ذرات چمکتے نظر آتے ہیں اور مصنف کے کردار کو چمکاتے ہیں۔

ایک شخص جو موٹی موٹی ڈکشنریاں لکھتا رہا ہو سنجیدہ تحریروں کے ترجمے کرتا رہا ہو۔ جس نے ٹھوس تنقید کے ایسے بھاری اور معرکہ آرا مضامین لکھے ہوں جو ادب کی شاہراہ کے سنگ میل ہوں، جس نے اپنے افسانوں کے ذریعے سماج کے دردناک پہلوؤں کو آئینہ دکھایا ہو۔ اس کا ذکر سن کر یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ نہایت خشک، سرد و سخت اور دیر ہضم سنجیدگی کا پیکر ہوگا اور ہما شما کو ہرگز خاطر میں نہ لاتا ہوگا۔ کتابوں کے ڈھیر کے پیچھے سے وہ آپ کو ایسے دیکھتا ہوگا جیسے شیر کچھار سے بھیڑ کو دیکھتا ہے اور ایسے دبنگ قاموسیانہ انداز میں بولتا ہوگا جیسے لغت ہائے حجازی کا کوئی قارون ہم جیسے غریب گنہگاروں سے خطاب کر رہا ہے۔ مگر اُن کے متعلق اس قسم کا وہم بھی دل میں لانا غلط ہے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے لائق فائق آدمی ہیں مگر ہم جیسے نالائقوں سے بھی یوں "آپ جناب" سے بات کرتے ہیں گویا ہماری بھی کوئی حیثیت ہے۔ خود ادب اردو کا ستون ہیں مگر بے ادبوں پر بھی نظر کرم رکھتے ہیں۔ خود کم خوراک ہیں مگر دوسروں کو کھلا کر کھل اٹھتے ہیں۔ اُن کی دل کش شخصیت بڑی متوازن ہے۔ اُن میں چھچھلے پانی کا شور شرابہ نہیں، عمیق دریاؤں کا وقار ہے۔ اصول پرستی کے ساتھ رواداری ہے، فکر کی خنک گہرائی ہے غصے اور جھنجھلاہٹ کی گرم چنگاریاں نہیں اُڑتیں۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ اُن کے دور میں جیتے ہیں اور اس شہر میں رہتے ہیں، جہاں اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری اور پروفیسر احمد علی جیسے لوگ بستے ہیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اردو میں سنجیدہ، نپی تُلی، نکھری اور کسی ہوئی نثر لکھنے کے ماہر ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ فرانسیسی نثر نگاری کے قائل ہیں۔ جس کے متعلق ان کا خیال ہے کہ بڑی تحفہ چیز ہے۔ وہ ادبی نقاد، مبصر اور افسانہ نگار مشہور ہیں۔ اُن کی شہرت خالص مزاح نگاری اور نثر نگاری کے باعث نہیں ہے، مگر بعض اعلیٰ درجے کے نثر نگاروں کی طرح ان کی تحریر میں شوخی اور شگفتگی کا نمک اور طنز و مزاح کے چٹخارے اکثر نظر آتے ہیں۔ یہ خوبیاں ان کی تحریر میں اسی طرح پنہاں ہیں جیسے پھول میں خوشبو جس کا احساس پھول سامنے آتے ہی ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ الفاظ کے دروبست سے وہ کیفیت پیدا کرتے ہیں جو پڑھنے والے کے لبوں پر مسکراہٹ لاتی ہے کہیں ان کی آنکھ زندگی کے مضحک پہلوؤں کو دیکھ لیتی ہے جسے ان کا قلم اس طرح بیان کرتا ہے کہ بے ساختہ گدگدیاں ہونے لگتی ہیں۔ اکثر واقعات کو وہ اس طور سے سپرد قلم کرتے ہیں کہ طبیعت میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں سماج کی کمزوریوں پر طنز کے نشتر بھی کچوکے لگاتے نظر آتے ہیں ۔ شاید وہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت طنز و مزاح کی کوشش نہیں کرتے بلکہ لکھتے لکھتے اُن کے قلم سے بے ساختہ پھلجھڑی سی چھوٹ جاتی ہے۔ اُن کے اسلوب میں آمد ہے آورد نہیں۔ وہ جیسے بولتے ہیں ویسے ہی لکھتے ہیں۔ بے ساختہ، بلا تکلف، شائستہ طور پر۔ اس وقت میرے سامنے اُن کی کتاب "گرد راہ" ہے۔ اس میں سے چند نمونے پیش کرتا ہوں، اس قسم کے نمونے ان کی دوسری تحریروں، مثلاً ادب و زندگی اور افسانوں میں بھی جگہ جگہ نظر آئیں گے۔

ڈاکٹر صاحب نوجوانی کے زمانے میں جب رائے پور سے کلکتے پہنچے تو وہاں اُن کا قیام چند علم دوست حضرات کے ساتھ تھا جو عمر میں ان سے بڑے اور ان کے بڑے بھائی مظفر حسین شمیم کے ساتھی تھے۔ لکھتے ہیں کہ "پہلے ہی علم و ادب کے ایسے شائق مل گئے کہ سب نے برادر خرد سمجھنا شروع کر دیا اور شروع میں میری رہبری کی۔ اسی نسبت سے کسی نے فرمائش کی کہ "اختر میاں چائے کا ایک دور ہو جائے"۔ برادر خورد ہونے کی طرف جو لطیف اشارہ ہے اُسے پڑھ کر مجھے مولانا محمد علی جوہر کی ایک انگریزی تصنیف یاد آئی۔ مولانا لکھتے ہیں کہ علی گڑھ کے دوران قیام میں اُن کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی نہ صرف اُن سے اپنا کام کراتے، گوشمالی کرتے بلکہ اُن کے وظیفے کے پیسے ہتیا کر فیشن ایبل کپڑے بھی بنوا لیا کرتے تھے۔ یہی غنیمت ہے کہ ڈاکٹر صاحب صرف چائے پلا کر اپنے فرض سے سبک دوش ہو جاتے اور بڑے بھائی کی ڈکشنری تکیے کی

جگہ سر کے نیچے رکھ کر سو جاتے۔ لکھتے ہیں شاید اس لیے عمر بھر ڈکشنریوں سے سابقہ رہا۔

کلکتے کے ایک اور واقعے کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے مزے لے لے کر یوں کیا ہے:

"..... کلکتے پر سیاست کا سرسام طاری رہتا تھا لیکن اُن دنوں اس نے مالی خولیا کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہر کس و ناکس کوئی نہ کوئی جھنڈا اٹھائے جلسہ جلوس رچا رہا تھا اور فضا نعروں کے شور سے لرز رہی تھی۔ جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ میں نے چراغ حسن حسرت کو ایک دن سڑک پر للکارتے سُنا ؎

وہ سامنے ہے حریت کا راستہ، بڑھے چلو، بڑھے چلو

"اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے اوپر کسی شے کو گھورتے اور انگلی سے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے اس زور سے یہ بول الاپ رہے تھے کہ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ مغالطہ ہوا کہ "حریت" نامی کوئی عورت منڈیر پر بیٹھی ہوئی ہے!..." اس فقرے کا لطف وہ حضرات خوب اٹھائیں گے جو مولانا چراغ حسن حسرت اور اُن کی رنگین مزاجی سے واقف ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کی نثر میں پُر معنی شوخی اور بلاغت بڑا لطف دیتی ہے۔ مثلاً مجاز کے بارے میں لکھتے ہیں:

"... مجاز نے شراب کو اور شراب نے مجاز کو جس طرح بدنام کیا وہ سب کو معلوم ہے۔ پہلے جام کے ساتھ ان کے ہاتھوں میں لرزش اور پاؤں میں جو لغزش آئی وہ آخر وقت تک قایم رہی۔"

رابندرناتھ ٹیگور لاہور آئے تو بڑے بڑے دانشوروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ لکھتے ہیں:

"..... سب سے زیادہ چندہ بھلا نامی امیر کبیر کفش فروش نے دیا جس کے جوتے سارے پنجاب میں چلتے تھے۔ البتہ دس ہزار کی تھیلی کمیٹی میں پیش کرتے وقت اس نے شرط لگائی کہ ٹیگور اس کے دولت کدے پر ٹھہریں گے۔ اس کی ضد تھی کہ جب میری کوٹھی کسی سے چھوٹی نہیں اور سامان میں کسی سے ہیٹی نہیں تو ٹیگور کو وہاں کون سا آرام میسر نہیں آئے گا۔ اب اسے کون سمجھاتا کہ اس میں وہ شے لطیف نہ ہوگی جسے پہلے تہذیب اور اب ثقافت (ر کی اضافت کے ساتھ) کہتے ہیں۔ غرض کہ ٹیگور کو بھلا کی مہمانی بھگتنا پڑی۔۔۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بھلا نے جب سنا کہ ٹیگور کو صبح سویرے بھجن سننے کی عادت ہے تو اس نے گوردوارے سے سکھ خوش الحانوں کو بلا بھیجا) اور انھوں نے شاعر کے گوش ہوش درست کر کے رکھ دیے۔"

ڈاکٹر صاحب کو دلچسپ لطیفے از بر ہیں۔ مثلاً اُنھیں کی زبانی ہمیں مولوی عبدالحق کے فلسفۂ حیات کی اس تشریح کا پتہ چلا کہ ؎

جو کوئی ہم سے سیدھم سادھا		ہم بھی اُس سے سیدھم سادھا الخ

جو کوئی ہم سے ٹیڑھم ٹاڑھا		ہم بھی اس سے ٹیڑھم ٹاڑھا الخ

کتاب میں مولوی عبدالحق اور ان کے بھائی مولوی ضیاء الحق کے کردار کے متعلق دلچسپ معلومات درج ہیں۔ البتہ ایک بات کتاب میں درج نہیں مگر مجھے بیگم رائے پوری کی زبانی معلوم ہوئی وہ بھی سننے کے قابل ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شادی میں مولوی صاحب نے "لڑکے والے" کا کردار ادا کیا۔ برات نے کرظفر عمر صاحب کے یہاں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب کے کچھ دوستوں نے ایک سہرا کہا تھا جس کا ٹیپ کا بند تھا ؎

ایک بنجارہ یار ہمارا		پھرتا تھا یوں مارا مارا

یار لوگ لہک لہک کر سہرا گا رہے تھے۔ مولوی صاحب کو بھی جوش آ گیا۔ وہ بھی چھڑی اٹھا کر گانے میں شریک ہو گئے۔ ریش دراز

سنجیدہ صورت، اس پر طرہ وہ دبنگ الحان، خوب اُچھلے کودے، بقول ڈاکٹر صاحب یہ حالت دیکھ کر خسر صاحب بھی دم بخود تھے۔ مولوی صاحب کے اندر جو بچہ چھپا ہوا تھا اُس کا جواب نہیں اکثر شرارتیں کیا کرتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے چھوٹے چھوٹے سادہ فقروں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے کے پیرس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس انسان نواز، غریب نواز شہر میں سب کے لیے جگہ تھی اور رواداری کا یہ حال تھا کہ نسل، رنگ، زبان کے تعصب کا ذکر بھی نہ آتا تھا۔ البتہ انگریز سیاح مزاج کے ویسے ہی تختۂ مشق تھے جیسے ہمارے یہاں سکھ۔ جب کسی سے بدتمیزی سرزد ہوتی تو کہا جاتا کہ یہ انگریز معلوم ہوتا ہے اور امریکن کا درجہ وہی تھا جو ہماری کم عمری میں شریفوں کی محفل میں نیچے بقال کا...."

زندگی کے مضحک پہلو پر اس کتاب میں دو قصے بھی بڑا دلچسپ ہے۔ جب ایک مدراسی ماہر رقص پیرس آیا، اور اس کے رقص کا انتظام کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا تعارف کرایا اور ہندوستانی رقص کی باریکیاں سمجھائیں۔ رقاص صاحب سر پر پگنا باندھے، ہاتھوں میں مُرلی لیے، دھوتی باندھے اسٹیج پر تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: "..... ساز کی گت پر ٹھوکر لگا کر اس نے جھونکا بھرا تو پاؤں کے انگوٹھے میں پھنس کر دھوتی کھل گئی اور بر سر عام ننگا ہو گیا، وہ تو خیر لنگوٹی رہ گئی۔ ایک لمحے کے لیے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ پھر لڑکیوں نے فرانسیسی میں "اوئی لزج" کی آوازیں لگائیں۔ یہ نامعقول دھوتی باندھنے لگا تو میں نے ڈانٹا کہ میاں عورتیں بے لباس ناچتی ہیں تو کیوں شرماتا ہے۔ اُس نے میری بات رکھ لی۔ اور ننگ دھڑنگ وہ دھاچوکڑی مچائی کہ سب عش عش کرتے رہ گئے۔ جب وہ اسٹیج سے رخصت ہو تو تماش بینوں کو سمجھایا کہ یہ رقص اس عاشق مہجور کی کیفیت بیان کرتا ہے جو ہماری آب و ہوا میں چاک دامن ہو کر کوچۂ یار میں ناچتا پھر رہا ہے۔" اُس منظر کا تصور کیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بدبخت کی پردہ دری کا پردہ رکھ لیا۔ اس پر غور کیجیے اور لطف لیجیے۔ اسی طرح ایک قصہ میڈن تھیٹر کا بیان کیا ہے کہ اسٹیج پر عاشق ناکام الوداعی نغمہ سنا کر اور خنجر گھونپ کر مرجاتا ہے۔ مجمع سے "ونس مور" کی آوازیں آتی ہیں تو وہ پھر "زندہ" ہو کر وہی سین دُہراتا ہے اور پھر خنجر گھونپ کر مرجاتا ہے۔ "ونس مور" کی آوازیں جس ایکٹر کی بے مثال ایکٹنگ پر آجاتی تھیں اُسے سو روپے انعام ملتا تھا۔

مرزا جعفر علی خاں اثر سنجیدگی کا مرقع، بڑے ثقہ آدمی اور پُرگو شاعر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مزے دار فقرہ چست کیا ہے کہ:

"آنے جانے والوں کو اس اطمینان سے اپنا کلام سناتے کہ دیر تک اردو شاعری سے دل اچٹ جاتا تھا۔"

مولانا آزاد پر ایک فقرے میں جامع تنقیدیوں کی ہے کہ "تذکرہ اور غبار خاطر میں متن کا وزن کم اور انشا کی گرانی زیادہ ہے۔"

بعض فقروں کی تہہ میں گہرا مگر لطیف طنز نظر آتا ہے، مثلاً: "..... بہت سے سادہ لوح یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ۱۵ راگست کو آزادی کا پرچم بلند ہوتے ہی سارا فتنہ و فساد ختم ہو جائے گا۔ ہندوستان میں رام راج اور پاکستان میں خلافت راشدہ کا دور شروع ہو جائے گا۔" ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ "جیسے دیکھیے سوٹ کیس اٹھائے حج کے لیے نہیں حج اکبر کے لیے یورپ یا امریکہ اڑا جا رہا ہے۔" یا "ہمارے ملک میں گورستانوں میں بدنظمی اور بے ترتیبی کا یہ عالم ہے کہ مرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔"

بدنظمی و بے ترتیبی سے کم از کم یہ فائدہ تو ہوا کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے درمیان زندہ و پائندہ موجود ہیں۔ خدا انھیں تادیر زندہ و سلامت رکھے۔ اُن سے مل کر خود زندگی پر پیار آنے لگتا ہے۔


The
GOLDEN
link
in the chain of
progress
CRESCENT JUTE
PRODUCTS LTD.
7th Floor, Habib Bank Building Circular Road Faisalabad
Tel (0411) 24039 24040 Telex 4371 CJP PK

ڈاکٹر اسمٰعیل سعد

ڈاکٹر رائے پوری ۔۔۔ بحیثیت ماہرِ تعلیم

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اردو ادب کے لیے رحمت ہیں لیکن ادب ان کی چمکتی ہوئی شخصیت کا صرف ایک پہلو ہے۔ اکثر ذہین اور بڑے آدمیوں کے ساتھ یہ ستم ہوتا ہے کہ ان کی متنوع شخصیت کے کسی ایک پہلو کی چکاچوند اتنی تیز ہوتی ہے کہ شخصیت کی دوسری جہتیں نگاہ کے سامنے نہیں ٹھہر پاتیں۔ ادب ڈاکٹر صاحب کی علمی محبتوں کا پہلا قرینہ ہے اور اس کی آب و تاب شخصیت کی بھرپور جلوہ گری میں دامن گیر نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے سلسلے میں نسبتاً کم حضرات کو واقفیت ہے کہ وہ متعدد مشرقی و مغربی زبانوں، بالخصوص سنسکرت زبان کے اچھے عالموں میں ہیں اور اپنی لسانی علمیت کے لیے علامہ اقبال اور خالدہ ادیب خانم جیسی شخصیتوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یہ بات اور بھی کم لوگوں کے علم میں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا اصل علمی میدان تاریخ ہے اور آپ کی علمی تخصیص کی اعلیٰ سند کا تعلق اسی مضمون سے ہے۔ پھر بہت ہی کم حضرات کو اس بات کا پتہ ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا شمار ممتاز ماہرینِ تعلیم میں کیا جا سکتا ہے اور آپ کی تمام تر عملی زندگی اسی چمن کی تزئین و آرائش میں گزری ہے۔ شخصیت کے ان دوسرے پہلوؤں کی نسبتاً گمنامی میں جہاں ادبی شہرت کو دخل ہے وہاں اس کا کچھ نہ کچھ الزام خود ڈاکٹر صاحب پر بھی آتا ہے۔ دوسروں میں دلچسپی اور اپنی ذات کے بارے میں کم آمیزی، طبیعت کی سادگی اور ظاہرداری سے اجتناب، اپنے کام میں درویشانہ شغف اور خاموش زندگی گزارنے کی عادت، ایسے پردے ہیں، جو شخصیت کو پوری طرح سامنے نہیں آنے دیتے۔ ادب میں بھی جو کچھ ہم ان کے بارے میں جانتے یا سمجھتے ہیں، وہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کے باوجود اور زیادہ تر ان حقیقی خدمات کی بنا پر ہے کہ جن کی پردہ داری خود ان کے لیے بھی کسی طرح ممکن نہ تھی۔

یونیسکو کے ساتھ اپنی مدتِ ملازمت کے خاتمے کے بعد ڈاکٹر صاحب کراچی میں مستقل رہائش پذیر ہو گئے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ اس دوران ڈاکٹر صاحب سے ذاتی طور پر ملاقات کے مواقع ملتے رہے اور مجھے نہ صرف ان کی علمی گہرائی کا احساس ہوا بلکہ اس بردباری کا بھی جس نے ان کی ذات کے بیشتر روشن پہلوؤں کو ہمارے سامنے بے نقاب نہ ہونے دیا۔ میری پیشہ ورانہ دلچسپی چونکہ تعلیم کے میدان سے ہے اس بنا پر میرے لیے ان کی شخصیت کا یہی پہلو زیادہ باعثِ کشش تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی منکسر المزاجی کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی شخصیت کے اس پہلو کا لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہنا محض ان کی اپنے ساتھ ہی زیادتی نہیں بلکہ کہیں زیادہ ہمارے ملک اور ملک کے رہنے والوں کے ساتھ بھی زیادتی ہے کہ جہاں تعلیم ہنوز نوزائیدگی کے عالم میں ہے اور اسے فکری اور عملی رہنمائی کی شدید ضرورت ہے۔

[redacted]

تعلیم سے ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی اور وابستگی کی مختلف نوعیتیں رہی ہیں۔ اس میں درس و تدریس سے پیشہ ورانہ وابستگی بھی شامل ہے اور وزارتِ تعلیم ہند اور بعد کو وزارتِ تعلیم پاکستان میں منصبی فرائض کی انجام دہی بھی۔ اس کے بعد عمر کا ایک معتدبہ حصہ یونیسکو اور بین الاقوامی تعلیم کے میدان میں خدمات کی بجاآوری میں گزرا۔ گو شعبۂ تعلیم سے ڈاکٹر صاحب کا تعلق زیادہ تر عملی نوعیت کا رہا اور اسی بنا پر آپ کو تحریری طور پر اس کا موقع کم نصیب ہوا کہ اپنے خیالات کو ترتیب اور سلیقے سے مرتب کر سکتے۔ لیکن پھر بھی جستہ جستہ تحریروں سے ایک منضبط نظریۂ تعلیم کا حصہ ابھرتا دکھائی دیتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ملکی تعلیم کے موضوعات پر سنجیدگی اور گہرائی سے سوچنے کی کوشش کی ہے۔

یوں تو آپ کی ذہنی افتاد کو شروع سے علمی تحقیق کے کاموں سے موزونیت تھی اور اسی لیے برسوں مولوی عبدالحق کی صحبت میں مختلف علمی کاموں میں مصروف رہے، لیکن درس و تدریس کے لیے بھی آپ کی طبیعت میں ایک خاص کشش تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے درس و تدریس کا سلسلہ ۱۹۴۲ء میں امرتسر میں ایم اے او کالج سے شروع کیا اور تاریخ اور سیاسیات کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ محض یہی نہیں کہ اپنے طلبہ میں بے انتہا مقبول رہے، بلکہ اپنی علمیت، سلجھے ہوئے خیالات، منطقی قوتِ استدلال اور عالمانہ بصیرت کی بنا پر کالج کی علمی زندگی پر اثر ڈالنے والوں میں وہ شاید سب سے نمایاں استاد تھے۔ کام کی لگن اور خدمت کا یہ حال تھا کہ کالج کے پرنسپل نے انتظامی امور کی تمام تر ذمے داری بھی ڈاکٹر صاحب پر ڈال دی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ کالج میں دو مشترک پرنسپل ہیں، لیکن تدریس کا دور تین سال سے زیادہ نہ بڑھ سکا اور ۱۹۴۵ء میں آپ اول شملہ اور بعد کو دہلی میں وزارتِ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ درس و تدریس کا دوسرا سلسلہ ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی یونیورسٹی میں اس وقت پھر جڑا جب آپ جامعہ کراچی میں شعبۂ تاریخ میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے شریکِ کار ہوئے۔ چنانچہ یہ بھی اپنی جگہ دلچسپ بات ہے کہ پیشہ ورانہ سفر کا آغاز اور اختتام دونوں درس و تدریس سے ہوئے اور بنیادی طور پر آپ کی شگفتہ شخصیت میں وہ پہلو حاوی اور غالب رہا جو ایک اچھے استاد کا خاصۂ طبیعت ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی طبیعت کے لحاظ سے شروع سے آخر تک استاد رہے اور آج بھی جب کہ آنکھوں کی روشنی کم ہو چکی ہے آپ کی صحبت میں علم کی روشنی کا اجالا ہر ملنے والے کو محسوس ہوتا ہے۔

۱۹۴۵ء سے آپ کی تعلیمی ملازمت کا دور شروع ہوتا ہے جو مختلف شکلوں میں تمام تر پیشہ ورانہ زندگی پر حاوی رہا۔ سب سے پہلے آپ ہندوستان کی وزارتِ تعلیم سے منسلک ہوئے جس کی سربراہی مولانا ابوالکلام آزاد جیسی مقتدر ہستی کے ہاتھ میں تھی لیکن اس علمی صحبت نے سلسلۂ تعلیم کے مدارج میں آپ کو ایسے ممتاز انگریز ماہرینِ تعلیم کی قربت حاصل رہی جس کی ایک مثال سرجان سارجنٹ ہیں کہ جن کی رپورٹ اب تاریخِ تعلیمِ ہند کا ایک مستقل باب بن چکی ہے۔ سرجان سارجنٹ نے آپ کی صلاحیتوں کا پورا پورا اعتراف کیا اور یہاں تک خراجِ تحسین پیش کیا کہ تعلیمی نظم و نسق میں بالخصوص اور تعلیم کے فروغ کے دوسرے شعبوں میں بالعموم آپ کی صلاحیتیں خداداد اور غیر معمولی ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اگست میں وزارتِ تعلیم پاکستان سے متعلق ہونے کا انتخاب کیا اور پھر اس نوزائیدہ مملکت میں تعلیمی چمن بندی کے کام میں منہمک ہو گئے۔ اپنے فرائضِ منصبی کے طور پر محض یہی نہیں کہ پاکستان میں تعلیمی امکانات اور ضروریات کے گہرے مطالعے کا آپ کو موقع ملا بلکہ اس بات کی بصیرت بھی پیدا ہوئی کہ کسی بھی تعلیمی سعی کو کس طرح بے سروسامانی اور وسائل کے فقدان کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے اور اپنی تمدنی ماحول کے تقاضوں کو پورے طور پر ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ملکی تعلیم کو کس طرح بین الاقوامی رجحانات و معیارات سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۵۶ء میں یونیسکو نے آپ کی خدمات حاصل کر لیں اور اس طرح بین الاقوامی سطح پر ڈاکٹر صاحب دنیا کے سب سے ے تعلیمی ادارے کے سرگرم رکن بن گئے۔ سولہ برس تک اس ادارے سے آپ کی وابستگی آپ کی تعلیمی کوششوں کا محض یہی نہیں کہ ب سے زیادہ سرگرمی کا دور تھا بلکہ سب سے زیادہ مبارزت آزما بھی۔ اس عرصے میں آپ کا بیشتر وقت ایسے ترقی پذیر ممالک میں را جن کو ابھی اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کرنا تھا اور تعلیمی نظام کی عمارت کی تشکیلِ نو کرنا تھی۔ یونیسکو کے نمائندے کی حیثیت سے ستان میں بھی آپ نے وقت گزارا اور ۱۹۵۸ء کی ملکی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ میں آپ کے مشورے پوری طرح شامل رہے۔ ب میں کتابوں کے فروغ کے لیے ادارہ جاتی سطح پر اولین خدمات آپ ہی کی کاوشوں کی رہینِ منت ہیں۔ محض یہی نہیں کہ آپ یسکو کے کتابی مواد کے علاقائی مرکز کے سربراہ تھے بلکہ آپ نے اپنی خصوصی دلچسپی اور کوششوں سے نیشنل بک سنٹر قائم کیا جو موجودہ نل بک کاؤنسل کا پیش رو تھا۔ یونیسکو کی خدمات کے سلسلے میں آپ نے ایران میں بھی اپنا وقت گزارا اور وہاں کی خواندگی کی ریک میں آپ کی دلچسپیاں پورے طور پر شامل رہیں۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے زیادہ بھرپور مشاورت کا موقع آپ کو جمہوریہ صومالیہ ں ملا جہاں آپ ۱۹۶۵-۶۷ء میں یونیسکو مشن کے سربراہ تھے۔ تعلیم کے تقریباً ہر شعبے میں مثلاً ابتدائی مدارس کے اساتذہ کی بیت، فروغِ نصاب، مدرسے کی عمارات کی تعمیر، اعلیٰ تعلیم، درسی کتب کے انتظامات، ان سب شعبوں میں آپ کے مشورے رخدمات شامل رہیں اور اس ملک کے نوخیز تعلیمی نظام پر آپ کی تعلیمی شخصیت کی گہری چھاپ ہے۔ خود یونیسکو کے مرکزی دفتر ں بھی آپ کے ساتھی اور یونیسکو کے سربراہ آپ کی شخصیت و خدمات سے ہمیشہ متاثر رہے اور آپ نے پورے طور پر اس ادارے ں پاکستان کی تعلیمی نمائندگی کا حق ادا کیا۔

یہ صحیح ہے کہ آپ کی عملی مصروفیات اور ادبی نگارشات میں مشغولیت کی بنا پر تعلیمی موضوعات پر جو کچھ آپ لکھ سکتے تھے اس میں بہت کمی رہی۔ اس ضمن میں ان تمام لوگوں کو جو آپ کی تعلیمی شخصیت سے متاثر ہیں محرومیت کا شدید احساس ہوتا ہے ر جی بے اختیار چاہتا ہے کہ اگر نگاہ میسّر تھی تو فرصتِ نظر بھی ملی ہوتی، لیکن پھر بھی ڈاکٹر صاحب کی جو تھوڑی بہت تحریریں سامنے ئی ہیں ان میں اس بات کی جھلک ضرور نظر آتی ہے کہ آپ کی تمام تعلیمی کاوشیں ایک باضابطہ تعلیمی فکر کے اظہار کی صورتیں تھیں اور ر کر ہمیں ایسے بنیادی خد و خال ضرور مل سکتے ہیں کہ جن سے تعلیمی میدان میں فکری رہنمائی کا کام لیا جا سکے۔

ڈاکٹر صاحب تعلیم کو انسانی معاشرتی زندگی کے ایک بنیادی رشتے کے طور پر دیکھتے ہیں اور تعلیمی کارروائی کی ماہیت کو سماجی عمل تصور کرتے ہیں۔ تعلیم معاشرے کے لازمی وظائف میں ہے اور اسی پر معاشرے کی بقا و فروغ کا تمام تر انحصار ہے۔ اگر یہ بنیادی کارروائی نہ جاری رہے تو معاشرتی زندگی نہ تو نئی نسلوں میں اپنے کو دُہرا سکتی ہے اور نہ ہی بدلتے ہوئے حالات میں اپنی مزید ترقی کا اہتمام کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم میں معاشرتی زندگی کا پورا رنگ جھلکتا ہو۔ اس لیے کہ تعلیم محض کسی سماج کی بقا کا وسیلہ ہی نہیں بلکہ معاشرتی زندگی کی انفرادیت کا تحفظ بھی اسی سے وابستہ ہے۔ لیکن تعلیم کا یہ تصور اس کے معنی کو وسیع مفہوم میں دیکھنے کا متقاضی ہے اور اس میں وہ تمام تعلیمی عوامل موجود رہتے ہیں جنھیں ہم رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے زمرے میں شامل خیال کرتے ہیں۔ آج کی ملکی زندگی میں تعلیمی نظام کا بیشتر تعلق رسمی تعلیم سے رہتا ہے اور عمومی مفہوم میں ہم تعلیم کی اصطلاح انہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی عملی زندگی مختلف ممالک میں نظام ہائے تعلیم کی پرداخت اور آبیاری میں گزری اور آپ کو اس بات کا شدید احساس رہا ہے کہ بغیر تعلیم کے کوئی بھی ملک بالخصوص ترقی پذیر ممالک اپنی صورتِ حال میں کسی قسم کی خاطر خواہ تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ ہر ملک میں تعلیم کی ترویج اس طور پر ہونا چاہیے

کہ وہ ملک کے تہذیبی مزاج میں ڈھل جائے اور تعلیمی رشتہ ایسا ادارہ بن جائے کہ ہم اسے تعلیمی نظام کہہ سکیں۔ کسی بھی تعلیمی نظام کے لیے دو بنیادی شرائط کی تکمیل لازمی ہے۔ ایک تو یہ کہ تعلیم کا ملکی معیشت سے گہرا ربط ہو اور دوسرے یہ کہ تعلیم کسی تصورِ حیات کی آئینہ دار ہو۔

موجودہ دور میں تعلیم مملکت کی ذمے داری ہے اور یہ ذمے داری اس وقت تک پوری نہیں ہوسکتی جب تک کہ تعلیم کے ذریعے ملک کے ہر شہری میں یہ احساس نہ رچ جائے کہ اس کے ملک کو اس کی ضرورت ہے اور ملک کی معاشرتی زندگی میں اس کا ایک مقام ہے اور اس کا تکمیلی جذبہ یہ ہے کہ آدمی میں خود اپنے تحفظ و نگہداشت کے لیے ملک کی ضرورت کا احساس پیدا ہو اور اسے یہ محسوس ہو کہ یہ اس کا اپنا ملک ہے اور یہ کیفیت آدمی میں اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ معاشی اعتبار سے کسی کارکردگی کا اہل نہ بن سکے اور اپنی جسمانی، ذہنی، جذباتی قوتوں کو بامعنی انداز میں صرف نہ کرسکے۔ یہ احساس اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب تعلیم کے ذریعے انسان معاشی طور پر خودکفیل ہو سکے۔ تعلیم کے اس تصور کو سراسر مادی قرار دے کر نظرانداز کردینے کی کوشش انتہائی سادہ لوحی پر مبنی ہوگی کہ جس سے نہ تو ملک کی کوئی خدمت ہوگی اور نہ کوئی بھلا تعلیم حاصل کرنے والے فرد کا ہوگا۔ آج کی صنعتی طور پر ترقی یافتہ زندگی میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم تعلیم کو انسانی افرادی قوت کی سرمایہ کاری کے طور پر دیکھ سکیں اور انسانی دولت کو کسی ملک کا سب سے قیمتی سرمایہ قرار دے سکیں۔

مادی پہلو کی تکمیل اگرچہ تعلیم کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، لیکن اسے کافی خیال نہیں کیا جاسکتا۔ تعلیم کے بارے میں موجودہ ذہنی الجھاؤ یہی ہے کہ ہم نے اسے صرف نوکری، روزگار اور معیشت کے وسیلے تک محدود کردیا ہے، لیکن تعلیم ایک جامع تصور کی متقاضی ہے۔ اسے فرد کی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہونا چاہیے اور اسی طرح خود معاشرتی زندگی کی پوری وسعت کی جھلک تعلیم میں ہونا چاہیے۔ جب ہم تعلیم کو اس طرح دیکھنے کی کوشش کریں گے تو یہ ہمیں کسی تصورِ حیات کے لازمی تقاضے کے طور پر عمل پیرا نظر آئے گی اور اپنی بھرپور شکل میں انسانی زندگی کی جو بنیادی قدر اسے مرتب و متاثر کرے گی وہ اخلاقی قدر ہے۔ تعلیم کا بنیادی کام انسانی زندگی اور خود ملکی زندگی میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کی ترویج ہے اور اسی کے ذریعے ہم معاشرتی زندگی میں وہ توازن اور اعتدال پیدا کرسکتے ہیں جسے افلاطون نے "عدل" کا نام دیا تھا۔ تعلیمی نظام کے لیے اخلاقی قدروں کی رہنمائی محض فرد کی شخصیت کی برداخت یا ملکی زندگی کے توازن کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ خود ایک بین الاقوامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی بھی لازمی شرط ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے تعلیم کو ہر سطح پر، چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، ملکی ہو یا بین الاقوامی، دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ہر مسئلے کو فکری اور عملی طور پر اچھی طرح پرکھا ہے اور ان کے تصورِ تعلیم میں توازن، اعتدال، وضاحت، واقعیت پسندی، فکر کی رعنائی، اور اقدارِ عالیۂ مطلقہ کی تڑپ اسی طرح موجود ہے جس طرح یہ عناصر خود ان کی اپنی شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہیں اور جنھوں نے انھیں ایک اچھا انسان، ایک عالم باعمل اور ایک شفیق استاد بنایا ہے۔

سید حامد علی جعفری

ڈاکٹر اختر حسین کی تعلیمی خدمات

صدر کے علاقے میں، شاہراہ عراق کے آخری حصے کے بائیں جانب ایک پرانی دو منزلہ عمارت ہے جس میں قیام پاکستان سے قبل پی ڈبلیو ڈی کا دفتر تھا۔ اب یہ عمارت خستہ حالت میں ہے اور اس کا کچھ حصہ منہدم بھی کرا دیا گیا ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد اسی بیرک میں وزارت تعلیم و تجارت اور وزارت داخلہ کے دفاتر قائم کیے گئے تھے۔

میں ملازمت کے سلسلے میں وزارت تعلیم کی اس بیرک میں پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء کے شروع میں گیا تھا۔ پاکستان آنے سے قبل میں جے پور۔ راجستھان کے محکمۂ تعلیم سے منسلک تھا اور تعلیمی مطالعاتی دورے کے زمانے میں مرکزی اور چند اہم ریاستوں کی وزارت تعلیمات کی عمارات دیکھ چکا تھا۔ جب میں نے پاکستان کی وزارت تعلیم کی یہ بیرک دیکھی تو ہندوستان کی مرکزی حکومت کے دفاتر ہی نہیں بلکہ وہاں کی چند ریاستوں کی وزارت تعلیمات کے دفاتر کی عمارات میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئیں، مگر مجھے یہاں پاکستان کی وزارت تعلیم کی یہ بیرک دیکھ کر مایوسی نہیں ہوئی کیوں کہ میں جانتا تھا کہ پاکستان میں ہر کام نئے سرے سے شروع کیا جا رہا ہے اور بڑی ہمت اور لگن سے کاموں کا آغاز کیا گیا ہے۔

اس زمانے میں وزرا کے دروازے عوام کے لیے واقعی کھلے ہوئے تھے۔ اس لیے مجھے اس وقت کے وزیر تعلیم فضل الرحمٰن صاحب سے ملازمت کے سلسلے میں ملاقات کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ موصوف نے میرا مدعا سن کر فرمایا کہ میں ان کے نائب مشیر تعلیم سے ملوں۔ چند منٹ بعد میں ایک چھوٹے سے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ فوراً اندر بلا لیا گیا۔ ایک نہایت جاذب نظر اور پروقار شخصیت نے مجھے نرم لہجے میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں نے تعلیمی میدان میں اپنے تجربے اور اپنی اسناد کا ذکر کیا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ موصوف نے میری باتیں بڑی ہمدردی سے سنیں اور فرمایا کہ اس وقت صرف اسسٹنٹ ماسٹروں کی آسامی پر تقرر ہو رہا ہے لیکن میرے تجربے اور اسناد وغیرہ کے مدنظر انھوں نے مشورہ دیا کہ میں سنٹرل گورنمنٹ ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری کی آسامی کے لیے پاکستان پبلک سروس کمیشن کو درخواست دوں جو کچھ عرصے بعد اس آسامی کے لیے درخواستیں طلب کرنے والا تھا۔ اس تمام گفتگو کے دوران مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں اپنے کسی نہایت ہمدرد دوست یا عزیز سے گفتگو کر رہا ہوں جو میری بہتری کا خواہاں ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ حکومت پاکستان کے افسران جذبۂ خدمتِ قوم و ملک سے سرشار تھے اور عوام کی مدد اور رہبری کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔

یہ ہمہ جہت شخصیت جن سے میری ملاقات ہوئی، جناب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تھی جو اس وقت نائب مشیر تعلیم کے عہدے پر

فائز تھے اور پاکستان میں قومی تعلیمی پالیسی وضع کرنے، مرکزی حکومت کے افسران اور اہل کاروں کے بچوں کے لیے تعلیمی ادارے قایم کرنے اور دیگر ضروری اقدامات کے نگراں تھے۔

اس وقت اگرچہ کراچی پاکستان کا دارالخلافہ تھا، لیکن یہاں ہر شعبے میں بے سروسامانی کی حالت تھی۔ اس شہر میں تعلیمی اداروں اور دیگر شعبوں میں قیام پاکستان سے قبل اکثر ہندو کام کررہے تھے اور پاکستان بننے کے بعد وہ لوگ ہندوستان چلے گئے تھے۔ اس وقت ان کی چھوڑی ہوئی آسامیوں کو پُر کرنے کے لیے مناسب صلاحیت کے لوگ کافی تعداد میں دستیاب نہ تھے۔ درحقیقت پاکستان کے مسلمانوں کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج تھا، خاص طور پر شعبۂ تعلیم میں۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں مرکزی حکومت کے ملازمین کے بچوں اور دیگر مہاجر طلبہ و طالبات کے لیے تعلیم کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ جو مدرسے اس شہر میں تھے، ان میں اسٹاف نہیں تھا۔ ضروری اسٹاف کی تقرری کے بعد بھی یہ ادارے ناکافی تھے۔ علاوہ ازیں جو تعلیمی نظام اس وقت پورے پاکستان میں رائج تھا وہ ملت اسلامیہ کی امنگوں اور خواہشات کے مطابق نہ تھا۔ چنانچہ مرکزی وزارت تعلیم کے تحت نئے ادارے قایم کرنے، اس میں ضروری اسٹاف اور سامان مہیا کرنے، نصاب میں ضروری ترمیم ورد و بدل کرنے اور درسی کتب کی فراہمی کا انتظام کرنے میں وزارت تعلیم کے جن دو چار افسروں نے نہایت تھوڑے عرصے میں بڑا کام انجام دیا ان میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سرفہرست ہیں۔ وہ ان تمام منصوبوں کی تکمیل میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔ یہ ان کی ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سنٹرل گورنمنٹ کے دو ہائی اسکول (ایک لڑکوں کے لیے اور دوسرا لڑکیوں کے لیے) جیکب لائن کی بیرکوں میں قایم ہوئے۔ ایک اور ہائی اسکول طلبہ کے لیے اسٹریچن روڈ پر قایم ہوا جو کچھ عرصے بعد پرنسس اسٹریٹ پر منتقل کردیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں تین مڈل اسکول بھی مختلف مقامات پر کھولے گئے تھے۔ فرنیچر ان پرانے اسکولوں سے حاصل کیا گیا جہاں مہاجرین مقیم تھے یا ایم۔ ای۔ ایس کے ذریعے مہیا کیا گیا تھا۔ مہاجر اساتذہ بڑی تعداد میں پاکستان آگئے تھے۔ ان میں سے بعض کو ان اسکولوں میں متعین کیا گیا۔ چند اساتذہ دہلی میں مرکزی حکومت کے اداروں میں کام کرتے ہوئے آگئے تھے۔ ان کو بھی ان اسکولوں میں مقرر کردیا گیا۔ یہ سب اسکول بڑی تیزی اور سرعت سے قایم ہوئے اور باقاعدہ کام کرنے لگے۔ اس وقت کی بے سروسامانی کی حالت میں یہ سب کام اس طرح ہوا کہ یوں لگتا تھا کہ شاید ناظم شعبۂ تعلیم کے ہاتھ علاء الدین کا چراغ آگیا ہے۔

مرکزی حکومت کے سویلین افسروں اور اہل کاروں کے بچوں کے لیے مناسب تعلیمی انتظام کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فوجی افسروں اور ملازمین کے بچوں کی تعلیم کے لیے ضروری اقدامات کیے۔ اس وقت ملیر کینٹ میں کافی تعداد میں فوجیوں کا قیام تھا۔ چنانچہ وہاں دو ہائی اسکول ایک لڑکیوں کے لیے اور دوسرا لڑکوں کے لیے اور دو پرائمری اسکول قایم کیے گئے۔ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا تقرر پبلک سروس کمیشن کے ذریعے ہوا تھا جس نے اس اسامی کے لیے راقم الحروف کا انتخاب کرلیا تھا۔ میرے ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے بعد یہ چاروں اسکول ملیر کینٹ میں بخوبی کام کرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے اسکول کے اساتذہ کے لیے ملیر کینٹ کی فوجی انتظامیہ نے رہائشی کوارٹر مع فرنیچر مہیا کردیے تھے، جس سے اساتذہ سکون اور پوری توجہ سے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے لگے۔ ان سب اسکولوں کے قیام کے بعد ڈاکٹر صاحب ہر لمحے ان کی ضروریات پوری کرنے، ان میں توسیع کرنے اور ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں مصروف رہتے تھے۔ وہ دفتر کے پیچیدہ طریقوں کو بالائے طاق رکھ کر فوراً حکم دے دیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ امیدوار طلبہ و طالبات کی بڑھتی تعداد کے مدنظر مزید اساتذہ، بلڈنگ اور سامان وغیرہ کی ضرورت ہوئی تو ڈاکٹر صاحب فوراً مطلوبہ اساتذہ کا تقرر کردیتے تھے اور خود جاکر محکمہ خزانہ سے منظوری حاصل کرلیتے تھے اور اگر کمرے یا بیرک میسر نہ ہوتے تو خیمے بھجوا دیے جاتے تھے تاکہ قوم کے نونہالوں کا تعلیمی نقصان نہ ہو۔ غرض کہ ڈاکٹر صاحب کی ان انتھک کوششوں سے کراچی شہر اور ملیر کینٹ کے مرکزی حکومت

کے افسروں، اہل کاروں اور ان کے عزیزوں کے بچوں کے لیے تعلیم کا انتظام کافی حد تک خاطر خواہ ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب وزارت تعلیم میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک نائب مشیر تعلیم، ڈپٹی سکریٹری اور مشیر تعلیم کے عہدوں پر فائز رہے۔ اسی زمانے میں سرکاری سطح پر تعلیمی سہولیات مہیا کرنے کے علاوہ نجی شعبے میں بھی ڈاکٹر صاحب نے لوگوں کی ہمت افزائی کی تاکہ وہ لوگ نجی تعلیمی ادارے قایم کریں۔ ان کی امداد کے لیے سرکاری امداد کا طریقہ رائج کیا گیا جس کے تحت پرائیویٹ اسکولوں کے خسارے کا پچھتر فی صدی حکومت ادا کرتی تھی اور اسکولوں کی عمارات کی تعمیر کے کل اخراجات کا نصف حصہ گورنمنٹ ادا کرتی تھی۔ یہ اسکیم نہایت کامیاب ثابت ہوئی اور ڈاکٹر صاحب کی کوششوں کے نتیجے میں خاصی تعداد میں پرائیویٹ اسکول بھی قایم ہو گئے۔

ان تمام تعلیمی منصوبوں کی تکمیل کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے زمانے میں چند دوسرے اہم اقدامات بھی ہوئے۔ صوبہ سندھ سے کراچی کی علحدگی اور اس کے مرکزی انتظامیہ کے تحت آنے کے بعد یہاں تعلیمی اداروں کے انتظام، اس کی نگرانی اور نئے تعلیمی منصوبوں اور اسکیموں پر عمل کرنے کے لیے کراچی ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن قایم کیا گیا جو کراچی میں سیکنڈری اور پرائمری ایجوکیشن کے انتظام اور ان کی نگرانی کا ذمے دار تھا۔ کچھ عرصے تک اس ڈائرکٹریٹ نے مرکزی وزارت کے تحت کام کیا۔ اس کے بعد یہ محکمہ کمشنر کراچی کے ماتحت کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ امتحانات کے انتظام اور کنٹرول کے لیے کراچی بورڈ آف سیکنڈری اور انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اس ادارے کے قیام کے کچھ عرصے بعد ڈاکٹر صاحب خود بھی اس کے پریزیڈنٹ رہے۔ کراچی یونیورسٹی کا قیام بھی اسی زمانے میں عمل میں آیا۔ پرنسس اسٹریٹ پر پانچ سابقہ اسکولوں کی عمارتوں میں عارضی طور پر یونیورسٹی قایم کی گئی اور وہاں ضروری تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

علاوہ ازیں اسی زمانے میں کالج آف ہوم اکنامکس کے قیام کا منصوبہ فورڈ فاؤنڈیشن کی امداد سے تیار کیا گیا۔ اس منصوبے کا آغاز ایک دلچسپ واقعے سے ہوا۔ اتفاق سے اس وقت امریکہ کی خاتون اول مسز آئزن ہاور پاکستان آئیں۔ یہ طے کیا گیا کہ کالج کا سنگ بنیاد ان کے ہاتھ سے رکھوایا جائے مگر اس وقت نہ کالج کے قیام کے لیے کسی فنڈ کا تعین ہوا تھا اور نہ کوئی پلاٹ عمارت کے لیے حاصل کیا گیا تھا اور نہ کوئی نقشہ تیار کرایا گیا تھا، مگر یہ سنگ بنیاد رکھنے کی رسم ضرور ادا کرائی گئی۔ آج کل کے کولمبس ہوٹل کے سامنے اس وقت بہت بڑا میدان خالی پڑا ہوا تھا۔ وہاں شامیانے لگائے گئے اور ایک بڑا سنگ بنیاد تیار کرایا گیا۔ اس میدان کے ایک کونے میں کچھ حصہ کھود کر ایک چبوترہ بنایا گیا اور بڑی شان و شوکت سے سیکڑوں مہمانوں کی موجودگی میں مسز آئزن ہاور سے یہ سنگ بنیاد اس چبوترے پر نصب کرا دیا گیا، مگر جلسے کے اختتام پر سب سامان وہاں سے ہٹایا گیا تو یہ سنگ بنیاد بھی ہٹا لیا گیا۔ کیوں کہ وہاں کالج کی عمارت تعمیر نہیں ہونی تھی۔ اس رسم کی ادائیگی کے بعد کالج کے قیام کا منصوبہ جلد جلد تمام ضروری مراحل سے گزرنے لگا اور آخر کار موجودہ مقام پر عالی شان عمارت تعمیر ہوئی۔

غرض کہ تعلیم کے ہر اسٹیج پر موجودہ تعلیمی نظام کی بنیادیں ڈاکٹر صاحب کے زمانے میں رکھی گئیں۔ متعدد ایجوکیشنل کانفرنسیں ہوئیں... نظریۂ پاکستان کے مطابق تعلیمی اسکیمیں اور سلیبس کی تیاری عمل میں آئی۔ علاوہ ازیں نئی نصابی کتب کی فراہمی کا انتظام کیا گیا۔ ساتھ ہی فیڈرل ایریا کراچی کے لیے ایجوکیشن کوڈ کی تیاری اور دیگر متعلقہ امور بڑی تیزی اور خوبی سے مکمل کیے گئے۔ ان تمام منصوبوں کے بنیادی مراحل کی تکمیل ڈاکٹر اختر حسین کی مرہون منت ہے۔

۱۹۵۹ء کے بعد ڈاکٹر صاحب پیرس چلے گئے اور وہاں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۲ء تک اقوام متحدہ کے ادارے یونسکو سے وابستہ رہے جہاں وہ شعبۂ ثقافت کے نائب ناظم مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد کراچی میں یونسکو کے علاقائی دفتر کے پہلے ڈائرکٹر ہوئے۔ صوبہ [illegible] میں بھی ڈاکٹر صاحب نے خدمات انجام دیں اور چند سال قبل تک ان کو جامعہ کراچی میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت حاصل رہی۔

تقسیم ہند سے قبل ڈاکٹر صاحب دہلی وزارت تعلیم میں معاون مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم تھے چنانچہ تقسیم سے قبل جتنے بھی تعلیمی منصوبے اس وقت بنے وہ سب ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزرے اور جن مراحل سے یہ منصوبے گزرے، ڈاکٹر صاحب ان سب سے پوری طرح واقف تھے۔ اسی زمانے میں سر جان سارجنٹ مشہور ماہر تعلیم، وزارت تعلیم کے سکریٹری ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بحیثیت معاون مشیر تعلیم کے جان سارجنٹ کے بہت قریب تھے اور جان سارجنٹ تعلیمی معاملات میں ڈاکٹر صاحب کے نقطۂ نظر کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ جو تعلیمی رپورٹ جان سارجنٹ نے تیار کی تھی اس میں ڈاکٹر صاحب کے بیشتر مشورے شامل تھے۔ اس رپورٹ کو ہندوستان میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔

قیام پاکستان کے بعد ڈاکٹر صاحب پاکستان آ گئے اور مرکزی وزارت تعلیم میں نائب مشیر تعلیم کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ اسی زمانے میں جان سارجنٹ ہندوستان سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے ملک واپس جانے لگے تو انھوں نے چند دن کراچی میں قیام کیا اور اپنے دیرینہ تعلقات کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی اور اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر پاکستان کی حکومت چاہے تو وہ یہاں تعلیمی خدمات انجام دینے کو تیار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں نواب صدیق علی خاں کی معرفت لیاقت علی خاں اور قائد اعظم تک یہ بات پہنچائی، مگر اس وقت کے وزیر تعلیم کی نظر ان خدمات کے لیے کسی اور شخص پر تھی۔

بہرحال ڈاکٹر صاحب نے بحیثیت نائب مشیر تعلیم، ڈپٹی سکریٹری وزارت تعلیم اور مشیر تعلیم، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک مختلف تعلیمی منصوبے تیار کیے اور ان پر ان ہی کے زیر نگرانی عمل ہوا۔ درحقیقت موجودہ نظام تعلیم کے اکثر بنیادی منصوبوں کا آغاز ڈاکٹر صاحب کے زمانے میں ہوا۔ مرکزی محکمۂ تعلیم میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

ڈاکٹر صاحب بڑے منکسر المزاج، صاف گو، کھرے اور سچے انسان ہیں۔ علم و ادب میں ان کے قد و قامت کی شخصیتیں رہ گئی ہیں۔ وہ ادیب بھی ہیں، نقاد بھی ہیں، افسانہ نگار بھی اور ماہر تعلیم بھی ہیں اور ان سب شعبوں میں ڈاکٹر صاحب نے بین ... حاصل کی ہے۔ ان کی شخصیت میں بے پناہ جاذبیت ہے ان سے باتیں کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں پر کتابیں کھلتی چلی ... ڈاکٹر صاحب بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور ان کی علمی و ادبی حیثیت بہت بلند و بالا ہے اس کے باوجود ان کی شخصیت میں بڑ... وہ اپنے مخاطب کو اس بات کا ہرگز احساس نہیں ہونے دیتے کہ وہ شخص ایک بڑی مشہور و معروف بین الاقوامی شخصیت سے ...

ڈاکٹر صاحب کے اعلیٰ کردار، ان کی غیر معمولی قابلیت، انتظامی صلاحیت، ان کی پُرخلوص اور گراں قدر خدمات کی ... لیے ہر دل میں عزت اور احترام ہے۔

بساتذہ دہلی میں
تیزی اور سرعت سے
اتھا کہ شاید نائب مشیر
صاحب نے فوجی افسروں
یہاں روہائی اسکول
چین کے ذریعے ہوا تھا
میں مخولی کام کرنے لگے۔ ڈاکٹر
بیٹے تھے، جس سے اساتذۂ سکول
ضروریات پوری کرنے، ان میں
فوراً حکم دے دیتے تھے۔ اکثر
... ہوئی تو ڈاکٹر صاحب فوراً
... نہ ہوتے تو خیمے بھجوا دیے
... اور رطیہ کنیٹ کے مرکزی حکومت

ظہور الحسن ڈار

اختر حسین رائے پوری — ایک جائزہ

ظہور الحسن ڈار (مرحوم) نے تقریباً چالیس سال پہلے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی گراں مایہ ادبی خدمات پر آج کل۔ دہلی میں ایک سیر حاصل مضمون دو قسطوں میں تحریر کیا تھا جو اپنی نوعیت کا شاید پہلا اور بھرپور جائزہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی ادبی قدر و اہمیت، اُن کے تراجم، اُن کی افسانہ نگاری، اُن کی طنز نگاری اور اسلوب وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہم یہ دونوں مضامین۔ آجکل۔ دہلی کے شکریے کے ساتھ اس خاص اشاعت میں شامل کر رہے ہیں۔ یہ مضامین ۵ ارستمبر ۱۹۴۶ء اور یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء کے شماروں میں شائع ہوئے تھے۔

——— صہبا

جدید اردو ادب میں بیسویں صدی کا پینتیسواں سال یادگار رہے گا۔ یہی وہ موقع تھا جب رسالہ اردو کی اشاعت جولائی میں ...ین رائے پوری کا مشہور مقالہ "ادب اور زندگی" شائع ہوا اور اس دلیس میں نئے اور صحت مند ادب کے بیج بو گیا۔ اس وقت اردو ادب ...ت روسی ادب کے اس دور سے کچھ مختلف نہ تھی جب زار روس کا سامنتی نظام مغربی وملکی سرمایہ داری کے بھنور میں پھنس کر پوچھ رہا تھا کہ اب ...یں کیا کروں! روسی کردار مایوسی اور قنوطیت کا پرچار کر رہے تھے اور احتجاج کا نعرہ زبان پر آتا بھی تھا تو اس کا ردعمل فرد کی موت کے سوا کچھ نہ ہوتا ...دوستانی ادیب بھی کم و بیش اسی راہ پر چل رہے تھے۔ ملکی سیاست کے رنگ ڈھنگ کا اثر ادب پر یہ ہوا کہ اس میں قوم پرستی، آزادی، مزاج ...ا ور خود پسندی کے مورچے قایم ہو گئے تھے۔ ایسے متضاد رجحانات میں ظاہر ہے کہ ادب کی حیثیت ایک سماجی فریضے کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے ...ئی زندگی کی سچی قدروں کی تلاش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ماحول کے اندھیرے میں کہیں اُمید اور امنگ کی بجلی تڑپتی بھی تھی تو اس لیے کہ تاریکی ...اور بھی گہرا ہو جائے۔ پرانے ادیب اگرچہ زمانے کے بدلتے ہوئے چلن سے مرجھا رہے تھے۔ پھر بھی وہ میدان چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ نئے لکھنے والوں کے لیے یہ مصیبت تھی کہ ابھی تک وہ یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ کچھ من چلے جو جنگ عظیم کے بعد یورپ ...کی خاک چھان چکے تھے اور مغربی ادیبوں کے شان دار کارناموں سے واقف ہو گئے تھے، وہ اپنی اپنی جگہ ہندوستانی ادب کو بھی اس ہار میں گوندھ ...

کی فکر میں تھے جن کے سدا بہار پھول چنتے ہیں مغربی فن کاروں کو بڑی جاں کاری سے واسطہ پڑا تھا۔ مختصراً اس وقت اردو ادب میں زندگی کی ایسی لہر دکھائی نہ دیتی تھی۔ جو اس کے ارتقا کی خبر دیتی، بلکہ اگر کہیں آندھی کا نشان بھی ملتا تو ناظر کے حصے میں خاک دھول کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کے لق و دق صحرا میں کہیں کہیں ننھے پیڑ پودوں نے سر نکال لیے تھے مگر ان کی نشو و نما اسی وقت ممکن ہو سکی جب ادبی افق پر ایک نئی بجلی نے کڑک کر ادب اور زندگی کا بے کار بلند کیا اور آناً فاناً صحت مند خیالات کی برکھا سے ہر طرف زندگی کی لہر دوڑا دی۔

"ادب اور زندگی" دراصل اختر رائے پوری کے اس مضمون کا پھیلاؤ تھا جو "ساہتیہ اور کرانتی" کے عنوان سے تین سال قبل ہندی کے مشہور ماہنامہ وشوامتر کلکتے میں شائع ہو چکا تھا۔ جس طرح اس مضمون نے ہندی ادب کے سوچ بچار کی نہج بدل کر ایک نئے دور کی بنیاد ڈالی اسی طرح اردو ادب میں بھی اس کی اشاعت نے صور اسرافیل کا کام دیا۔ نئے دور کے تقاضوں کی پہلی للکار نے جہاں رجعت پسندی اور قدامت پرستی کے قلعوں میں رخنے ڈال دیے وہاں نئے ادیبوں کے اس گروہ کو بھی راہ دکھلائی جو ابھی تک سوچ رہا تھا کہ ہمیں کیا کہنا چاہیے اور کیسے کہنا چاہیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لے دے کے ایک منشی پریم چند کی ذات نظر آتی تھی جس کے کردار خیال کے محلوں سے نکل کر حقیقت کی سڑکوں پر چلنے پھرنے لگے تھے۔ گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد سے متاثر ہو کر اب ان کا کسان ستیہ گرہ کرنا بھی سیکھ گیا تھا اور طالسطائی کے کرداروں کی طرح چوگانِ ہستی کا اندھا سورداس من کے سنسار میں بھگتی کی جوت جگانے نکل آیا تھا۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اجتماعی طور پر اردو ادب کے دھارے کا رخ بدلنے اور ادیبوں کو ادب کا مفہوم اور اس کے مقاصد سمجھانے میں جو کام اختر رائے پوری کے "ادب اور زندگی" نے کر دکھایا وہ منشی پریم چند کے محض افسانوں سے ممکن نہ تھا۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ خود منشی پریم چند نے اختر کے خیالات کو بے حد پسند کیا بلکہ اختر کے ساتھ مل کر ہندوستانی ادیبوں کو جدید کے ادبی تقاضوں سے باخبر کرنے میں انھوں نے جو کام کیا وہ اس تحریک کے پھیلاؤ کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوا۔ "ادب اور زندگی" کی اشاعت کا فوری اثر یہ ہوا کہ اردو ادب میں ہرجائی معشوقوں کی کمی ہونے لگی۔ رقیب اور عاشق دونوں پھانسی لگا کر مرنے لگے۔ فراق یار کے نالے اور آہیں دھیمی پڑ گئیں اور اب اس میں ایسے کردار پیش ہونے لگے جو چلمن کے پیچھے بیٹھ کر جھلک دکھلانے کی بجائے اس دیس کی سڑکوں گلیوں اور کھیتوں میں گھوم پھر کر اپنے دکھ درد کی کہانی سناتے تھے۔

"ادب اور زندگی" کی اشاعت کا بڑا مقصد بھی یہی تھا کہ ادب کو اپنے ماحول سے متعلق دکھایا جائے اور بتایا جائے کہ ادب اور زندگی کے مقاصد ایک ہیں۔ اس مقالے کی تائید اور شہرت کے اسباب کی تلاش کچھ اتنی مشکل نہیں۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ نظر آئے گی کہ اس دور کے ہندوستانی ادب، ادب کا کوئی واضح تصور نہ رکھنے کے باعث اپنے آپ سے مطمئن نہ تھے۔ دل میں جذبات کا ہجوم ہو اور اندھیرے میں راستہ نہ سوجھتا ہو ایسے میں کوئی من چلا مشعل جلا کر دوسروں کو راہ دکھا دے تو اس کی ہمت پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مشعل کی جوت ایسی شفاف اور سہانی تھی کہ نہ صرف ہندوستانی ادیبوں کو اپنی منزل کی جھلک نظر آنے لگی بلکہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر زندہ قوم کا ادبی قافلہ اسی جانب رواں ہے۔ کہاں بیشتر ادیبوں کی خود پسندی اور "ادب برائے ادب" جیسا مہمل نقطۂ نگاہ اور کہاں اختر رائے پوری کی انسان دوستی اور "ادب برائے زندگی" کی مجاہدانہ صدا۔

"ادب اور زندگی" کی اشاعت کے بعد ہندوستانی ادب کے دھارے میں ایک عظیم تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے تاریخی جلسے میں جب ہندوستانی ادیب ادب کے مقاصد کی توضیح کے لیے مل بیٹھے تو ظاہر ہو گیا کہ اب ہندوستانی ادب کے مڑتے ہوئے دھارے نے اپنے جوش کا مظاہرہ کرنے کے لیے نیا میدان تلاش کر لیا ہے۔ اس جلسے میں اختر حسین رائے پوری نے "ادب اور زندگی" کے نعرۂ انقلاب کی تجدید کی اور کھلے الفاظ میں اعلان کیا۔

"ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کدھر جا رہی ہے اور اسے کدھر جانا چاہیے۔ ادیب انسان بھی ہے اور اسے سماج کی ترقی

کے لیے اتنا تو کرنا ہی ہے جو ہر انسان کا فرض ہے انسانیت کے نام پر ہم پوچھتے ہیں کہ آج جب ترقی و پستی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے، ادب اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھ سکتا ہے؟ کیا حسن، آرٹ وغیرہ کی نقاب پہن کر وہ کارزارِ حیات سے راہِ فرار اختیار کر سکتا ہے؟ کیا واقعہ نگاری کی فصیل پر بیٹھ کر انقلاب و رجعت کی طاقتوں کی تصویر لے سکتا ہے؟ احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے، تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حالِ زار ہمیں بے حس کیوں کر رکھ سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بے کاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں تو حاشیہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو وہ کیا کہے کن سے کہے اور کس طریقے سے کہے۔ چنانچہ ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے۔ زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے، اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جملہ بنی نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔[۱]

ظاہر ہے کہ ان سطور میں ادیب اور ادب دونوں کو انانیت اور خود پسندی کے حجروں سے نکال کر زندگی کے بھرے میلے میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہیں سے ادب اجتماعی زندگی سے آشنا ہوتا ہے، انسانیت کے دُکھ درد کو کہتا سنتا ہے، قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور وحدت کا پیغام سناتا ہے اور ان تمام عناصر کے مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے جو زندگی کو محدود اور تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہی صدائے حق ہے جسے روس میں میکسم گورکی اور پرنس کروپاٹکن، فرانس میں رومان رولاں اور ہندوستان میں قاضی نذرالاسلام نے بلند کی اور یہی وجہ ہے کہ ان فن کاروں کے آرٹ میں زندگی کی ایسی جوت جگمگا رہی ہے جو غم زدہ انسانوں کے تاریک دلوں کو اجالتی ہے اور محبت کے ساتھ ان کے دکھ درد کی عیادت کرتی ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ اختر رائے پوری کا نظریہ ادب کسی دل جلے کی پکار نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں روشنی کی وہ لکیر نظر آتی ہے جو ماضی کا رشتہ حال سے اور حال کا ناتا مستقبل سے جوڑتی ہے۔ اپنے وسیع سیاسی، معاشی اور ادبی مطالعے کی مدد سے ہمارا نقاد جب ہند قدیم اور ہند جدید کے ادب کا تجزیہ کرتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بے چین لہر ٹھہرے ہوئے پانی میں تلاطم برپا کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے، ایک عظیم قوت ادبی مزاج سے نبرد آزما ہونے کے لیے میدان میں آگئی ہے جو ایکا ایکی اس دیس کے ادب کی بے حسی اور بے راہ روی کو بہالے جائے گی۔ چنانچہ حقائق کو ایک نظر دیکھ کر دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ یہ توقع غلط نہیں ثابت ہوئی۔ ہندوستانی ادب میں آج جو خوش آئند تبدیلیاں نظر آتی ہیں وہ اختر کے "ادب اور زندگی" کی ہی مرہونِ منت ہیں۔ ہند جدید کے ادب کا معاشی تجزیہ دراصل اختر کے اس قول کی صحت کا ثبوت ہے کہ ادب درحقیقت اپنے ماحول کی نمائندگی کرتا ہے۔

پریم چند جب مزدوروں کو زندگی کی جد و جہد کا پیام سنانے کی بجائے سرمایہ داروں کے من میں نیکی کی جوت جگمگانے کی توقع کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیگور کی طرح انھیں بھی اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ ایک طرح سے یہ ادیب کے عجز کا اظہار ہے کہ وہ اپنی منزل پر پہنچنے کی بجائے تھک ہار کر راستے ہی میں کہتا ہوا بیٹھ گیا! "کیوں نہ سمجھ لوں کہ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا" من کے سنسار میں کیسے تبدیلی ہوتی ہے، اسے ہزار کوشش کے باوجود پوری طرح سمجھنا مشکل ہے۔ پھر کسان اور مزدور زمینداروں اور سیٹھوں کے دل کی تاریکی پگھلنے کی توقع میں کیوں بیٹھے رہیں۔ سوال یہ ہے کہ زمیندار و کارخانے دار اور کسان و مزدور کی تمیز ہی کیوں باقی رہے، کیوں نہ پیداوار کے ذرائع پر پوری سماج کا قبضہ ہو اور ان کی تقسیم مساوات کے اصول پر ہو۔ ادب جب زندگی کا ترجمان اور ناقد ٹھہرا تو کیا وجہ ہے کہ وہ انسان کی صحیح رہنمائی کرنے کی بجائے اسے قسمت اور دھرم کی افیون کھلاتا رہے۔ "ادب اور زندگی" کا مصنف ایسے ادب کا سخت مخالف ہے جو حقیقت کا سامنا ہوتے ہی راہِ فرار ڈھونڈنے لگتا ہے۔ ادب دراصل حقیقت کا جویا ہے۔ پھول کے حسن اور خوشبو

کی تعریف کرتے ہوئے وہ کانٹوں کی بے دردی جتلانا نہیں بھولتا۔ اسی طرح جب وہ بلبل کے نغمے کا ذکر کرتا ہے تو اس کی دل ربائی کے ساتھ سوز اور درد کی داستان سنانے سے نہیں چوکتا پھر یہ کیوں ہو کہ ادیب ظلم کو نیست و نابود کرنے کی بجائے مظلوم کو بہلانے میں اپنی قوت صرف کر دے۔ ہندوستانی ادیبوں کی بے راہ روی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نہ تو وہ اپنے ماحول کے متعلق کوئی واضح تخیل اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور نہ انھیں اپنی شخصیت پر قابو تھا ورنہ ممکن نہ تھا کہ خالص فرقہ وارانہ جذبات کے زیر اثر ناول لکھے جاتے اور شعر کہے جاتے یا گھبرا کر ماضی سے لپٹنے کی بے سود تمنا میں آرٹسٹ کی قوت کا بیشتر حصہ برباد ہوتا۔ اختر کے نقطۂ نگاہ سے ایسا ماحول سچے ادب کی تخلیق کے لیے موزوں نہیں۔

"سچے ادب کی تخلیق صرف اسی وقت ممکن ہے جب شخصیت ماحول کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر حق کے اذن پر لبیک کہے۔ ماحول کو بدلنے سے پہلے ہمیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا، لیکن ہم ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ ہماری شخصیت نے ایثار کا سبق نہیں پڑھا۔ وہ ضبطِ نفس سے بیگانہ ہے۔ وہ خودی کی کینچلی میں دبی ہوئی ہے۔ اس پر تن آسانی نے چربی کی تہیں چڑھا رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ ہم لکھتے ہیں اس میں حقیقت نہیں ہوتی، وہ کذب و افترا کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور اگر ہماری طبیعت حق کی طرف جاتی ہے تو ماحول سے نامانوس ہو کر نامراد رہ جاتی ہے"

"ادب اور زندگی" کی اشاعت کے بعد اس موضوع پر اتنے مضمون لکھے گئے ہیں کہ ناظر کو بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی کا خیال آنے لگا۔ ہر ادبی حلقے میں اس مقالے پر بحث اور تفسیر کا سلسلہ چل نکلا۔ رجعت پسند طبقہ بگڑنے لگا اور نئے ادیبوں نے مصنف کے خیالات کو مشعل راہ بنا کر اس طرح نو کی بنیاد ڈالی جو بعد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک اختر رائے پوری نے باقاعدگی سے ہندوستانی ادب کی راہ نمائی کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ ان میں وہ تنقیدیں اور تبصرے بھی شامل ہیں جو وہ ناخدا کے نام سے انجمن ترقی اردو کے مشہور رسالہ اردو میں لکھتے رہے۔ ان میں سے کچھ مضامین "ادب اور انقلاب" کے نام سے مجموعے کی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ یہ مضمون اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ انھوں نے ادب میں زندگی کا — تنقیدی احساس پیدا کیا اور قدروں کو جانچنے کے لیے ادیب کو ایک سماجی معیار فن سے آشنا کیا۔ "ادب اور زندگی" کے بعد "ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم"، "اردو شاعری میں عورت کا تخیل"، "جنگ اور ادب" اور "اردو ادب کے جدید رجحانات" اسی سلسلے کی مضبوط کڑیاں ہیں۔ پچھلے دس سال میں ہندوستانی تنقید نگاری کی جو کایا پلٹ ہوئی، وہ براہ راست ان ہی مضامین کی اشاعت کا نتیجہ ہے۔

اختر ایک آئیڈلسٹ نقاد ہے۔ وہ اس تکلیف دہ احساس کے ساتھ مضمون لکھتا ہے کہ ہندوستان میں صحت مند ادب کی تخلیق کے آثار نہیں ملتے۔ یہ احساس اس کی تحریر میں بلا کا جوش اور تیکھا پن پیدا کراتا ہے! اس حقیقت کو جتلا کر ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے، وہ سچے ادب کی قدروں کا تعین کرتا ہے، ان قدروں کی جڑیں زندگی کے بنیادی جذبات میں پیوست ہیں۔

اس کسوٹی پر جب وہ ہندوستانی ادب کو پرکھتا ہے تو اسے اپنے آئیڈیل کی تصویر کہیں نہیں ملتی۔ اس کے ذوق و شوق اور بلند نظری کا یہ عالم ہے کہ وہ اس دیس کی دو عظیم ادبی شخصیتوں ٹیگور اور اقبال، تک سے مطمئن نہیں۔ ان کے آرٹ کی عظمت کا وہ قائل ہے، مگر نئے دور کے نئے تقاضوں سے آنکھ چرا کر عہد گزشتہ کی کمیں گاہوں میں پناہ کی تلاش کو وہ مطعون قرار دیتا ہے۔ زندگی کے حقائق سے گریز کے اس رجحان کو نظر انداز کرنا اس کے مسلک کے خلاف ہے۔ یاد رہے کہ اس مرحلے پر ادبی حلقوں میں اختر کے خلاف بڑی شورش پیدا ہوئی، مگر وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس طوفان کو سہہ گیا۔ اپنے خواب کی تعبیر اگر اسے کسی فن کار میں نظر آئی ہے تو وہ نذرالاسلام ہے جس کی شاعری اس کسوٹی پر پوری اترتی ہے جہاں ادب ظلم کے لیے تلوار اور مظلوم کے لیے صور بیداری کا کام دیتا ہے۔ اختر کے تنقیدی شعور میں گہرائی اور پختگی اور اس کی تنقید میں ضبط و توازن کی حیرت انگیز ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ مصنف کے مطالعے کی وسعت، تجربے کی گہرائی، خیالات کا ستھرا پن اور انداز بیان کا وہ نکھار ہے جو اس کی تحریر میں جا بجا جھلکتا ہے۔ اس کا خلوص اور تجسس جس کی کوئی انتہا نہیں، ان خوبیوں کو جلا دیتا ہے۔ ہر ادبی تحریک میں اس کی باریک بین آنکھ پس منظر کے مدھم سے مدھم نقش کو دیکھ لیتی ہے

اور حقیقت نگار قلم اسے کمال خوبی سے اجاگر کرتا ہے۔" ادب اور انقلاب" میں مکمل چھان بین کی یہی صفت ہر موقع پر آشکار ہوتی ہے اور اختر کو ہندوستان کے منفرد نقاد کے روپ میں پیش کرتی ہے۔

سوویٹ روس کے ادب پر اختر کا جامع مقالہ اردو تنقید کے شاندار مستقبل کی خبر دیتا ہے۔ کہاں اردو تنقید کی کم عمری اور خامیوں کا شدید احساس اور کہاں اس حقیقت کا بولتا ہوا ثبوت کہ اب اس میں دنیا کی دوسری زبانوں پر بھی کامیاب تنقید کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے! موضوع کی وسعت کے مقابلے میں مصنف کا اختصار دیکھو تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک پورے ملک کے ادبی ارتقا کی ایسی مکمل تصویر چھوٹے سے چوکھٹے میں کیوں کر سما گئی۔

جن خوبیوں نے اختر کی تنقید کے سر قبول عام کا سہرا باندھا ہے ان میں طرز بیان کا وہ حسن اور رسیلا پن بھی شامل ہے جس نے اسے پُر بہار بنا دیا ہے۔ اس کی مثال ہمیں "بنگال کا باغی شاعر" میں ملتی ہے۔ یہ مضمون گو نذر الاسلام کی شاعری کے متعلق لکھا گیا ہے، مگر مصنف کے جوشِ عقیدت اور خلوص نے نثر میں بھی شعر و نغمے کے رنگا رنگ پھول کھلا دیے ہیں۔ پورے مضمون میں ایک باقافیہ اور حسین نظم کی سی رعنائی پائی جاتی ہے۔ ہندوستانی تنقید میں ایسے دل ربا مضمون کی مثال کہیں نہ ملے گی جہاں نقاد فن کار کے اس قدر قریب آ گیا ہو کہ اس کے احساسات کی خفیف سے خفیف تھرتھری کا نظارہ بھی دکھانے میں کامیاب ہو جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تنقیدی شعور کے ساگر کی وسعت اور گہرائی میں بے کرانی پیدا ہوتی ہے اور تنقید اپنی معراج کو پہنچتی ہے۔

یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ صرف یہی ایک مضمون اختر کو ہندوستان کے نقاد کا درجہ دلانے کے لیے کافی ہے۔

بحیثیت مترجم۔

دنیا کی ہر زندہ زبان میں ترجمے کو خاص درجہ حاصل ہے اس اعتبار سے اسے بھی ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ ہے بھی بڑا کٹھن کام۔ فن کار کو ادب کی تخلیق میں یقیناً جگر خون کرنا پڑتا ہے، مگر مترجم کو اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فن کار سے بھی زیادہ پتہ مارنا پڑتا ہے۔ اس کی مشکلات کی انتہا نہیں۔ جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اس کے اُتار چڑھاؤ سے باخبر ہونا اس کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اپنے دیس کی زبان سے۔ کوئی ترجمہ اسی وقت کامیاب کہلائے گا جب مترجم کا رباب فن کار کے گیت کا پوری طرح ہم نوا ہوگا۔ یاد رہے کہ جب تک وہ مصنف کی روح کی لرزش محسوس نہیں کرتا، اس کے جذبات و احساسات کے دھارے میں نہیں بہتا اور اس کی تحریر کے ہر انداز کو نہیں پہچانتا، اس کے ترجمے اور اصلی تحریر میں وہ مکمل ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی جو کامیاب ترجمے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اردو میں تراجم کی ویسے کبھی کمی ہے، مگر اس کسوٹی پر پرکھیے تو گنے چنے مترجم ہی معیار پر پورے اتریں گے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس میدان میں ظفر علی خاں جیسے پُر تکلف بزرگوں کا سکہ چلتا تھا، مگر ادب کے ہیبت ناک تراجم کا یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا اور مولوی عنایت اللہ اور ڈاکٹر عابد حسین جیسے باکمالوں نے اردو ترجمے کا سنگھار نکھار شروع کیا۔ تراجم کے لیے صحیح کتابوں کی دیکھ بھال شروع ہوئی، زبان و بیان کی اونچ نیچ کو مدنظر رکھا جانے لگا اور کوشش کی گئی کہ مترجم کی بے راہ روی سے مصنف کی تحریر کا خون نہ ہو۔ اس سلسلے کی تکمیل موجودہ دور میں اختر رائے پوری کے ان تراجم سے ہوئی جو انجمن ترقی اردو کی اسکیم کے مطابق وجود میں آئے اور انجمن نے ہی انھیں زیور طبع سے آراستہ کیا۔ اسے اتفاق نہیں بلکہ حسن اتفاق کہیے کہ ادب عالیہ کے تراجم کی جو اسکیم انجمن نے سوچی تھی اس کی تکمیل کے لیے اختر جیسے ادبی مجتہد کا تعاون حاصل ہوا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں کے اشتراک سے کس کو زیادہ فائدہ پہنچا، مگر اردو ترجمے کی خوش قسمتی میں کلام نہیں کہ اختر جیسا گوہر نایاب اس کے ہاتھ لگ گیا۔ اب تک جو ادبی شاہ پارے اختر کے ذریعے اردو میں منتقل ہو چکے ہیں، ان میں کالی داس کا مشہور ناٹک "شکنتلا" نذر الاسلام کی نظموں کا مجموعہ "پیام شباب"، "گورکی کی آپ بیتی" اور پرل بک کا شہرت یافتہ ناول "پیاری زمین" "گدار تھ" شامل ہیں۔ ان تراجم کو دیکھ کر

ظہورالحسن ڈار

محسوس ہوتا ہے کہ اردو ترجمہ مدت سے جس انقلاب کی راہ دیکھ رہا تھا اس کا آغاز ہوگیا ہے۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ ہندوستانی تنقید اور ادب کی طرح اردو ترجمے میں انقلاب کی بنیاد بھی اختر رائے پوری کے قدامت شکن ہاتھوں سے رکھی گئی۔

ہمارے دیس میں اس آمر انقلابی کی شخصیت اس جھومر کی سی ہے جو ادب کی دیوی کے روپ کو نئی شان سے جگمگا رہا ہے۔

اختر کے تراجم کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں کے جو شاہکار اس نے اردو کے سینے میں اُتارے ہیں، ادب میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ ان فن پاروں میں کالی داس، میکسم گورکی، پرل بک اور رندر الاسلام جیسے بین الاقوامی شہرت کے ادیبوں نے اپنی صناعی کا پورا کمال دکھایا ہے۔ اس اعتبار سے مترجم کو جن مشکلات سے واسطہ پڑا ہوگا ان کا اندازہ ممکن نہیں، مگر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی قیامت خیز قوت کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ٹھہرتی، ایک سیلاب کی طرح وہ ہر بلند و پست پر چھا جاتا ہے اور اپنی عظمت کے نقش کو اور بھی گہرا کر دیتا ہے۔

کالی داس کی "شکنتلا" کا ترجمہ براہِ راست سنسکرت اور اردو کی فطرتوں میں وہی فرق ہے جو بقول مترجم، کسی مالوا کے پنڈت اور لکھنؤ کے میرزا میں ہو سکتا ہے اور سنسکرت بھی کالی داس کی جو اس منجھی منجھائی اور دُھلی دھلائی زبان کا سب سے بڑا صاحب طرز ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آدھی کتاب اس صاحبِ طرز کی مدھر شاعری سے بھرپور ہے۔ سنسکرت جیسی وسیع زبان کو جس میں نازک سے نازک احساسات کو حسن و خوبی سے بیان کرنے کے لیے الفاظ کا بہترین ذخیرہ موجود ہے، اردو جیسی تہی دست زبان میں گھلانا، واقعی ایک حد درجہ کٹھن کام تھا، لیکن مترجم نے اسے جس خوبی سے کر دکھایا ہے وہ داد سے مستغنی ہے۔

میکسم گورکی کی آپ بیتی کو ادب عالیہ میں جو درجہ حاصل ہے وہ بہت کم فن پاروں کے حصے میں آیا ہے۔ اس کتاب کے ہر لفظ میں آرٹسٹ کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ گورکی کو نہ صرف اپنے احساسات کے اظہار میں کمال حاصل ہے بلکہ وہ زبان و بیان کا بھی بہت بڑا استاد ہے۔ اس کی رام کہانی زندگی کے رنگا رنگ جذبوں کی سچی تصویر ہے اور غالباً اس کے ادبی رنگ محل کی سب سے البیلی اور موہنی صورت ہے۔ اختر نے جس نفاست سے روسی ادب کے اس شاہکار کو اردو کے قالب میں سمویا ہے، اس کی مثال کہیں نہ ملے گی۔ مترجم یوں بھی گورکی کا شیدائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ترجمے میں مصنف کی روح کے اس جوہر کو دکھانے میں کامیاب ہوگیا جو اس کی اصلی تحریر میں ہر جگہ جھلکتا ہے۔ گورکی کی آپ بیتی کے ترجمے میں ایسی دل فریبی اور سچائی پائی جاتی ہے کہ اس پر ترجمے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کتاب اردو میں ہی لکھی گئی ہے اور اردو بھی کیسی جس کی رعنائی اور دل کشی ناظر کی سدھ بدھ بھلانے کے لیے کافی ہے۔

ترجمے کا سچا روپ دکھانے کے لیے ایک دو ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں۔

"کبھی کبھی غروب آفتاب کے وقت آسمان میں نور کی ندیاں بہنے لگتیں اور گمان ہوتا کہ ان میں آگ لگ گئی ہے، باغ کے مخملی سنہرے پر آتش پاروں کی بارش سی ہونے لگتی تھی، رفتہ رفتہ ہر شے یک گونہ تاریک ہو کر وسیع تر ہو جاتی۔ پھول سی جاتی، اس وقت جب کہ شام کی لالی گہری ہو جاتی تھی، دھوپ میں جُھلس کر پتیاں مرجھا جاتی تھیں اور گھاس کے تنکے سر جُھکا لیتے تھے، ہر چیز زیادہ نازک معلوم ہوتی اور ایسی مہک پھیلاتی جو موسیقی کی ترنگیں کھیتوں سے اٹھ کر آتیں جہاں لوگ رہ رہ کر کچھ بجانے لگتے تھے، رات آتی۔ اور اس کے ساتھ ماں کے پیار کی سی شگفتگی اور حیات آفرینی پیدا ہونے لگتی۔ نانی نے اپنے گرم و گداز ہاتھوں سے دل کو تھپکی دی اور سارے گرد و غبار کو دھو کر وہ سب کچھ بھلا دیا جسے بھول جانا چاہیے۔

چھت پیٹھے ہوئے آسمان کی نامحدود گہرائی۔ ایسی گہرائی جو اپنی ہر بلندی میں ستاروں کی ایک نئی محفل سجاتی ہے۔ ستاروں

کی چاپ رنگ کے سہارے ہیں کہ ... اور اس موقع پر ... عدم رسوخ گمان ہوتا ہے کہ یا تو وہ مٹ گئی ہے یا ہم بہت بڑے ہو گئے ہیں ... سامنے ... یہ لمحہ ... اور خاموشی بڑھتی جاتی ہے، تاہم نہایت ہی دھیمی اور نازک احساس ... جاری رہتا ہے ... خواہ وہ کسی ... کا نہ ہم سب ہو یا کسی حرکت کا سراسیمہ خرام یا کسی ... کی ... گفتگو۔ دن کی آوازوں سے قطعاً مختلف ہے۔ ایک خاص نرالا پن اس کے حساس سکون کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔"

چلتے چلتے اردو میں بنگال کے نامی شاعر ندرالاسلام کے تعارف کا ذکر ضروری ہے جو ترجمہ کے سلسلے میں اختر کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ "پیام شباب" کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے نرم و نازک جذبات کے ساتھ ساتھ انقلاب کے آتشیں ترانوں کو بھی پوری کامیابی سے اپنے فنی طلسم خانے میں سجا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک نظم کا مختصر سا ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے۔

"میں دھرتی ماتا کی سرکش اولاد ہوں
اس قدر سعادت ... ورد ... آشنا کر میں اسے ... کی آتش غم میں جھونک دوں گا
اس آگ کو میں ... کے پنکھے سے ہوا دوں گا، یہاں تک کہ زمین و آسمان اس میں جل کر خاک سیاہ ہو جائیں گے،
میرے آنکھوں میں مصائب و آلام کی مشعل روشن ہے۔
ایک آدمی ... سب کہو،
تو ... ہے، تو سبب ہے، تو مالک اجل ہے،
نہ تو کسی سے ڈرتا ہے نہ تجھے کوئی مار سکتا ہے،
تو قیامت کا پیامبر ستارۂ تخریب ہے،
تو دیوانگی اور وحشت کی روشنی ہے،
تو وہ جان ہے، تو قہر و غضب کا دیوتا ہے،
یکا اور درست ... میں نقیب قیامت ہوں،
میں ستارۂ تخریب ہوں ____"

بحیثیت افسانہ نگار

اختر حسین رائے پوری کو اردو کے افسانوی ادب میں روشناس کرانے کا سہرا نیا ادب ... "افسانہ نگار" کے سر ہے۔ ان کا پہلا افسانہ "بے زبانی" اسی رسالے میں شائع ہوا اور شدت احساس، خلوص اور منفرد طرز بیان کی ایسی مثال چھوڑ گیا جس کا سہرا غالباً ان کے آرٹ کے سر ... ملنا مشکل ہے۔ اس زمانے میں جب رائے پوری نے لکھنا شروع کیا، منشی پریم چند اس دیس کے افسانوی ادب کی چوٹی پر براجمان رہتے تھے۔ قاعدہ ہے کہ کسی بڑی ادبی شخصیت کی موجودگی میں اچھے اچھے فن کاروں کو بھی اپنا چراغ جلانے میں بڑی جانکاری سے واسطہ پڑتا ہے، مگر اختر حسین نے اس قلیل مدت میں نہ صرف اس دیس کے ادبی حلقے بلکہ خود منشی پریم چند کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ بجائے خود ان کی عظمت کی بڑی دلیل ہے۔

اردو افسانے سے اختر کا تعلق محبت ... سے ہوا اور نفرت کے عنوان پر گھوم آیا۔ ان کے افسانوں کے مجموعے کا نام بھی یہی ہے۔ ان افسانوں کے پس منظر میں زندگی کے دو ہی مثبت جذبے کارفرما ہیں۔ انسان کے دل کی پھیلی ہوئی تاریکی میں یہ جذبے حواس کے تاروں پر رقص کرتے رہتے

ہیں۔ زندگی کے ہر حادثے میں ایک نہ ایک جذبے کا دخل ہوتا ہے۔ محبت یا نفرت۔ محبت نیلے آسمان کی طرح حسین اور نسیم بہار کی طرح معطر ہے، اس کی بے کنار وسعت میں زندگی کا سارا حسن اور رس موجود ہے۔ جب آدم کو شجرِ ممنوعہ چکھنے کے جرم میں جنت سے نکالا گیا، تو جذبۂ محبت نے ہی اس کے محزون و بے قرار دل کو تسکین بخشی، مگر ایک ایسا زمانہ آیا کہ آدم کی اولاد نے خود محبت کو بھی شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا اور سماج کا جامہ اوڑھ کر اخلاق کے کھوٹ کی مدد سے اس کے گرد پہرہ دینے لگی۔

یہ پہرا آج بھی قائم ہے۔ آدمی فطرت سے مجبور ہو کر اس شجرِ ممنوعہ کی طرف بڑھتا ہے، اور سماج کے کلہاڑے کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ قربانی بڑی دردناک ہے، مگر اس کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ محبت جیسے حیات بخش جذبے کا تحفہ موت کیوں ہے؟ اس کی ذمے داری ہمارے ماحول پر ہے، اس ماحول میں ہندوستانی سماج کے قوانین کا سکہ چلتا ہے، ان بہیمانہ قوانین کا جو زندگی کے منفی پہلو کے نمائندہ ہیں اور جن کی موجودگی میں حیات کا کوئی بھی صحت مند سدا بہار پھل اور پھول نہیں سکتا۔ ہندوستانی سماج نے سب سے زیادہ ظلم جذبۂ محبت کے ساتھ کیا ہے، خاص طور پر عورت کی محبت پر۔ مرد تو خیر خدا کا خلیفہ ہے، مگر عورت، کیا اس کے گناہ بھی معاف کر دیے جاتے ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو آج اس دیس کے چکلے ویران نظر آتے، اندھیری گلیوں میں حوا کی بیٹیاں عصمت فروشی کرتی دکھائی نہ دیتیں، آتشک کے جراثیم آبائی ورثے میں تقسیم ہوتے دکھائی نہ دیتے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ ہندوستانی سماج کی نظر میں محبت گناہ ہے اور اس کی سزا جہنم کی جلن سے کہیں زیادہ تلخ ہے۔

اختر نے "محبت" کے عنوان سے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں، وہ محبت، نامرادی اور سزا کی اسی ہی کشمکش کے عکاس ہیں۔ ان افسانوں میں ایک بے قرار روح کا کرب، ایک ناکام تمنا کا سوز ہے جو ناظر کے دل میں گہرا غوطہ لگا کر آنسوؤں کے موتی چن لاتا ہے۔ ان افسانوں میں "زبانِ بے زبانی"، "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" اور "منزلِ ناتمام" بڑے معرکے کی چیزیں ہیں۔ "زبانِ بے زبانی" کا ہیرو برگد کا ایک بوڑھا درخت ہے جو اس بیابان میں صدیوں سے چپ چاپ کھڑا اپنی بے زبانی سے انسانی محبت کی داستان سنتا ہے اور اپنے مشاہدے اور تجربے میں سے ایک ایسی پُرسوز کہانی مرتب کرتا ہے جو ناظر کے دل میں ... سے بدگمانی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ محبت ... مگر اس کا مشاہدہ بتلاتا ہے کہ محبت کا انجام بربادی کے سوا اور کچھ نہیں، وہ خود بھی اپنے سینے سے لپٹی ہوئی "انبیلی امربیل" سے محبت کرتا ہے، اس کے بوسوں کی لذت میں مسرور رہتا ہے، مگر اس کے دل میں یہ کھٹک موجود ہے کہ آخر کار یہ محبت میری زندگی کا رس چوس لے گی اور یہی محبوبہ امربیل "ایک دن میرے خاتمے کا عنوان لکھے گی۔" اس کا مشاہدہ اس کھٹک کو اور بھی پختہ کر دیتا ہے۔ اپنی بے بہرہ آنکھوں سے وہ دو تین مرتبہ انجامِ محبت دیکھتا ہے اور اپنی قسمت کو سراہتا ہے کہ وہ انسان نہ ہوا ورنہ اس کی محبت کا بھی وہی حشر ہوتا جو اس عورت کا ہوا جس نے مرتے وقت کہا۔

"دیوتا! سب نے مجھے ٹھکرا دیا، انسان کے رحم و کرم سے میں محروم ہو چکی، میں نے بے وفائی کی، احسان فراموشی کی، کس امید پر؟ محبت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ محبت! فریب، مکر، دھوکا! اس ظالم نے مجھے دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا، مہذب دنیا اب مجھے عصمت فروش ہرجائی کے نام سے پکارتی ہے، دیوتا! کیا تم مجھے اپنے دامنِ عاطفت میں جگہ دو گے۔ جانتے ہو، اپنے کاندھوں پر کیسے گناہِ عظیم کا بار لیے آئی ہوں۔ ایک ایسے بچے کی ماں ہوں جس کا باپ بننے پر کوئی مرد تیار نہیں۔ دیوتا کیا تم میرے گناہوں سے درگزر کرو گے ... کیا عورتوں کو بھی دراصل خدا نے ہی پیدا کیا تھا اور اس بچے کو؟ اس بچے کی پیدائش کا ذمے دار کون ہے؟ خیر میں ہی سہی، مگر میرے گناہوں کا خمیازہ وہ کیوں اٹھائے گا۔ خدا رحیم و کریم ہے، شاید مردوں کے لیے، لیکن عورتوں کا خدا کہاں ہے؟ خدا - جنت - روح - دنیا - عاقبت - سب مردوں کے لیے۔ آہ میرا بچہ — میرا بچہ —"

اس عورت کا جو برگد کی آغوش میں اپنے نوزائیدہ بچے سمیت تڑپ تڑپ کر مر گئی صرف یہ جرم تھا کہ اس نے محبت کرنا چاہی، محبت،

مگر محبت کی بجائے اسے موت ملی۔ یہ موت مرد کی ناپاک ہوس رانی کا عطیہ تھی یا سماج کے رسم و رواج کا تحفہ۔ بہرحال وہ عورت سوسائٹی کی قربان گاہ پر ذبح ہوگئی اور اس کے ساتھ وہ بے گناہ بھی جو اُسی رات اس کے بطن سے پیدا ہوا تھا، ایک سچے آرٹسٹ کی طرح اس افسانے میں اخترؔ رائے پوری نے اخلاقیات پر کوئی وعظ نہیں کیا، نہ ہی انھوں نے ہندوستانی سماج کے متوازی کوئی فلسفۂ حیات مرتب کیا ہے، وہ یہ نہیں بتلاتے کہ ان خرابیوں کو جو انسانیت کی جڑ کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں کس طرح برباد کیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ ان ہولناک خامیوں کی سچی تصویر پیش کر کے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں۔ اب یہ ناظر کا کام ہے کہ وہ اپنا راستہ خود متعین کرے۔ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" بہت حد تک "زبانِ بے زبانی" کا ہی آخری حصہ ہے۔ رات کی تاریکی میں بجلی نے ایک کہنہ برگد کے بوڑھے درخت کا دل چیر دیا ہے، اب وہ مین پر گرا پڑا ہے، مگر عالمِ نزع میں اس کی بے زبانی زیادہ شدت اختیار کر گئی ہے۔ "زبانِ بے زبانی" میں اس نے ایسی عورت کو دیکھا جو سماج کی ساری پابندیاں توڑ کر اپنے محبوب سے جا ملی، مگر بجام کار اسے واپس آنا پڑا۔ مگر کہاں؟ اسی برگد کے بوڑھے ٹھنٹھ کے پاس جو اس مرد کے دل کی طرح بے حس تھا جس نے اسے محبت کے بدلے فریب دیا تھا یا گناہ کی وہ گٹھری جو اس کے پھولے ہوئے پیٹ میں دفن تھی۔ لیکن "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" میں وہ ایک ایسی لڑکی کا ذکر کرتا ہے جس نے محبت کی آگ میں جلنا پسند کیا مگر سماج کی پابندیاں توڑ کر اپنے محبوب سے ملنے کی ہمت اس میں پیدا نہ ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے وصال کا نتیجہ موت ہوگا یا ایک ہرجائی کی زندگی جو موت سے بدتر ہوگی۔ برگد کے درخت کے نیچے کھڑی وہ سوچتی ہے کہ "کیا میری آواز میں اتنی طاقت ہوگی کہ ماں باپ کی گرجدار ضد، بھائی بہن کی منت سماجت کو بند کر دے اور عشق کی بلندیوں پر چڑھ کر یہ کہے کہ عورت اپنی روح کو پا گئی، اس کی خودی اپنے لیے ایک الگ خدا بنائے گی، وہ صرف رسم الفت کو مانے گی، وہ اپنی دنیا الگ بسائے گی، اس کے آئین الگ ہوں گے، کیا میں یہ سب کچھ کر سکوں گی، کیا یہ ممکن ہے؟ ــــــ" یوں ہوتا تو کیا ہوتا" کاش وہ ایسا کر سکتی۔ مگر وہ عورت ہے، بے بس، لاچار اور مجبور عورت اپنی موت کو آواز دیتے ہوئے اس کے حلق میں پھندا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنے محبوب کو ان الفاظ میں الوداع کہتی ہے "میں پچھلی سی نئی مگردش میں جا کر اپنے آپ کو یا ریخ کر چکی ہوں، کل تو نداں شادی کے بازار میں اس باندی کا نیلام کرے گا، بہت سے سوداگر میری خرید کو آئیں گے۔ میرے والدین انھیں روپیوں کی تھیلیوں میں بند کر کے دقار کے زرز دیر تولیں گے اور جو سب سے بوجھل ہوگا، میں اسی کے سپرد کر دی جاؤں گی۔ کیا تم بھی اس نیلام میں بولی بولو گے، اگر تم تو سودے کے لیے تیار ہو کر نا ... مجھے دہیں پہنچا دو جہاں سے محبت کا مقناطیس مجھے کھینچ لایا تھا، کہیں میں زندگی کے میلے میں کھو نہ جاؤں "ــــــ" یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

کتنی حیرت ہے ان الفاظ میں، کیسی جگر گداز تلخی جیسے عورت کی روح عالمِ نزع میں ہو۔ کیا ہندوستانی سماج کے پاس طلوعِ حسرت کی اس حسرت ناک فریاد کا بھی کوئی جواب ہے؟ شاید ہو اور شاید نہ بھی ہو۔ مگر برگد کے بوڑھے ٹھنٹھ کا بے حس دل بھی اس ہولناک منظر کی تاب نہیں لا سکتا۔ وہ جذبۂ محبت کی خودکشی پر ان دیکھے آنسو بہاتا ہوا زبانِ بے زبانی سے پکار اٹھتا ہے "مجھے لوگ خدا سمجھتے ہیں، اگر ان کی دل شکنی کا خیال نہ ہوتا تو میں ہزار زبانوں سے چیخ اٹھتا کہ اے وہ جو مجھ سے بڑا ہے، اگر تو میری چنگاریوں میں اتنی شدت پیدا کر دے کہ وہ مشعل بن جائیں اور میں محبت کی پگڈنڈی اسے دکھا سکوں تو تجھ پر ایمان لے آؤں گا۔"

اخترؔ رائے پوری واحد ہندوستانی فن کار ہیں جو اپنے آرٹ میں نغمہ و فریاد کو پوری طرح گھلانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے افسانے ایک عجیب قسم کی پُرسوز موسیقی کی طرح ہیں جس کی دل کشی میں حزن و ملال کی لہریں کانپ رہی ہیں، جس کے زیر و بم میں کسی کا دل دھڑک رہا ہے، وہ دل جو صرف خلوص آشنا ہے، جس نے پوری شدت سے محبت اور نفرت کی ہے۔ یہی ہے ان کے افسانوں میں احساس کی ایسی شدت، خیالات کی ایسی گہرائی اور تاثرات کی ایسی گرمی پائی جاتی ہے جو صرف خلوص سے عبارت ہے۔ خلوص کی دنیا بڑی کٹھن ہے

ایک جائزہ

ظہور الحسن ڈار

اس دور میں انسان کی زندگی ایک ایسے نغمے کی مانند ہو کر رہ گئی ہے جو ٹوٹے ہوئے دل کی دھڑکن سے ابھر کر عرش کو چھو لیتا ہے۔ وہ محبت کرنا چاہتا ہے مگر سماج کے بے رحم قوانین کی موجودگی میں اس پاکیزہ جذبے کی گنجائش کہاں؟ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے زمانہ، سماج، قدرت سبھی طاقتیں انسان کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہو گئی ہیں۔ وہ رونا چاہتا ہے مگر آنسو ساتھ نہیں دیتے۔ فریاد کرنا چاہتا ہے مگر کس سے کہے اور پھر الفاظ کی کم مائیگی بھی آڑے آتی ہے، منجمد ہونٹوں سے آہ کا نکلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ کیا انسان ہمیشہ اس المیے کا شکار رہے گا؟ کیا اس کی زندگی میں کبھی بہار نہ آئے گی؟ کیا وہ کبھی محبت کے چراغ سے زندگی کی تاریکی کو روشنی میں مبدل نہ کر سکے گا۔ زندگی، محبت کے بغیر یہ کیسی زندگی ہے؟ اندھیرے سے زیادہ بھیانک، سناٹے سے زیادہ خوف ناک اور سمندر سے زیادہ ویران۔ کاش سماج کے مسند نشین دیوتاؤں کی بے بہرہ آنکھوں میں کبھی کبھی حقیقت کی روشنی جھلک اٹھے اور یہ نہیں تو کم از کم منزل ناتمام کے مسافر کی طرح ہر انسان پکار اٹھے۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے شباب کو وقف کر دیں گے اضمحلال، افسردگی اور بڑھاپے کو مٹانے کے لیے۔ نظام زندگی کو ہم ایسا روپ دینے کی سعی کریں گے کہ اس میں صرف شباب نواز اور حسن پرور عناصر کے لیے جگہ رہے۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ بیوہ کے آنسو سہاگ میں آگ لگا دیں، غریبوں کی آہ انسانیت کو مسل ڈالے، یہ نہ ہو کہ ذلت اور معصیت کا تسلط ہمیشہ کے لیے نیکی کا گلا گھونٹ دے۔ صرف کوئی اس کارنامے ہی انسانیت کو برباد ہونے سے بچا سکتا ہے، مگر کون جانے ایسا کب ہو۔!"

''نفرت'' کے عنوان سے اختر حسین رائے پوری نے جو افسانے لکھے ہیں، ان میں ''مجھے جانے دو''، ''موت''، ''مرگھٹ'' اور ''میرا گھر'' بہت اہم ہیں۔ یہ افسانے ہندوستانی سماج کے ترجمان بھی ہیں اور ناقد بھی۔ کچھ عرصے سے ہندوستانی افسانہ نگاروں نے رنڈی کی زندگی کو بڑی توجہ سے دیکھا ہے۔ بہت سی کہانیاں سماج کے اس بدنام طبقے سے متعلق لکھی گئی ہیں، مگر خیالات کے الجھاؤ اور مشاہدے کی کمی کی وجہ سے ادب میں ان کا درجہ بہت پست ہے۔ اردو ادب میں ایسی رنڈیوں کی کمی نہیں جو اپنے ناظر کی طرح تماش بین اور حریص ہیں، مگر ''مجھے جانے دو'' کی ہیروئن اپنی قسم کی واحد کسبی ہے جس کے پاس انسان کے لیے نفرت کے سوا اور کوئی تحفہ نہیں۔ اس کے الفاظ میں ایسا زہر ہے جس کا تریاق نہیں مل سکتا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا غصہ ہے جس کا کوئی اتار نہیں۔ اس کے دل میں ایسی نفرت ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں۔ اور یہ سب کس کے لیے؟ انسان کے لیے — سماج کے لیے ان کے لیے جو رات کے اندھیرے میں کشاں کشاں اس کے پاس آتے ہیں، اس کے خرابے کو آباد کرتے ہیں اور وہاں سے نکل کر نفرت سے کہتے ہیں ''ان ٹکیتی طوائفوں کو عصمت و عزت کا ذرا بھی پاس نہیں، انھیں شہر سے نکال دینا چاہیے۔'' ایسا کیوں؟ اس لیے کہ وہ عورت ہے؟ بے بس اور لاچار عورت جسے خود سماج نے ہی عصمت فروش ہرجائی بننے پر مجبور کیا ہے۔ اب اس کے جسم کو گھن لگ چکا ہے، کئی خوف ناک بیماریاں اس کے جسم کو اندر ہی اندر گھلا رہی ہیں اور وہ مرد کا ذکر کرتے ہوئے مجسم نفرت ہو کر کہتی ہے ''اور یہ بیماریاں مجھے کہاں سے لگیں، تم جیسے چاہنے والوں کا ہی عطیہ ہیں مرد۔۔ سوزاک اور آتشک کے جراثیم کا باپ۔'' مگر اب اس کے مزاج میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ مرد نے اسے جو کچھ دیا ہے اسے وہ مع سود لوٹا رہی ہے۔ وہ ساری انسانیت کو اپنے جسم میں جلانا چاہتی ہے، اپنے چاہنے والے بے رحم خاردار کہتی ہے:

''میں تم سے انتقام نہیں لینا چاہتی، مگر کوئی اور ہوتا تو میں بقصد تشہیر آتشک و سوزاک کے جراثیم اس کو منتقل کرتی، وہ کسی اور کو دیتا، اور یہ اس کے بچوں کو ورثے میں ملتے، غرض ساری انسانیت ان امراض میں مبتلا ہو جاتی تب شاید سماج کے ٹھیکے داروں کو ہوش آتا کہ اس بلا کی جڑ کہاں ہے۔''

جب ناظر اس افسانے کو دیکھتا ہے تو اس کا دل عورت کے ہولناک درد پر کانپ اٹھتا ہے۔ کسبی کی زندگی کا تانا بانا بننے کا ذمے دار کون ہے، عورت یا خود سماج؟ — پھر اس کی طرف نفرت سے کیوں دیکھا جاتا ہے؟ کیوں نہیں ایسا ماحول پیدا کیا جاتا جس میں کسبیوں کا

وجود ہی نہ ہو؟

ایک بڑے فن کار کی طرح اختر رائے پوری کے افسانوں کے کردار بڑے جان دار ہیں۔ اردو ادب میں ایسے کرداروں کی کمی ہے جنھیں زندگیِ دوام حاصل ہو سکے، مگر جب میں اختر رائے پوری کے افسانے دیکھتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے کہ اردو ادب اس معاملے میں بالکل ہی کنگال نہیں بلکہ اس کی جھولی میں ایسے ہیرے بھی ہیں جو ادب کی منڈی میں غیر ملکی جواہر ریزوں سے آنکھ ملا سکتے ہیں۔ "مجھے جانے دو" کی کسبی کی طرح "موت" کا ہیرو چراغ علی بھی ایک ایسا ہی کردار ہے۔ وہ زندگی کے منفی پہلو کا نمائندہ ہے۔ ایک ہوس پرست اور شقی القلب انسان، زندگی بھر جس کے دل میں روشنی کی ایک حقیر سی کرن بھی پیدا نہ ہو سکی۔ "موت" میں اس زندگی کے آخری لمحات کی تصویر کھینچی گئی ہے، مگر اس میں ایسے پراسرار رنگ استعمال کیے گئے ہیں جن کا نظارہ دل میں عجب طرح کی بے کلی پیدا کرتا ہے۔ مرتے ہوئے اس سنگ دل کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، اس کا ایک ٹکڑا آپ بھی دیکھیے: "روپیہ صرف ایک چمکتا ہوا روپیہ۔ سامنے طاق پر رکھا ہوا ہے۔ روشن دان میں سے صرف ایک کرن مسکراتی اور جگمگاتی ہوئی گھس آئی ہے اور اس روپے سے آنکھ مار رہی ہے۔ وہ کسی سہرکالی آنکھ کی طرح دمک رہا ہے۔ بڈھا اسے صاف دیکھ رہا ہے۔ اس کا دماغ مختل ہونے لگا ہے۔ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس روپے پر خدا کی مہر لگی ہوئی ہے۔ خدا چاندی کی کانوں کا مالک، امیروں کی عمارت بڑھانے والا، غریبوں کے خون کی چاندی بنانے والا، چراغ علی کا خدا کہاں ہے وہ اگر وہ ہے تو یقیناً وہ اس وقت بھی ہوگا جب اس نے اپنی بیوی کو مار ڈالا۔ وہ نیک عورت اس کے ظلم سہتے سہتے مر گئی۔ اس کی بہن اس کی آنکھوں کے سامنے عصمت فروشی کرنے لگی۔ ایک عورت اس کی ناپاک ہوس رانی کا شکار ہو کر پاگل ہو گئی۔ اور اسی عالم میں ایک رات سردی نے اس کی زندگی کی حرارت چوس لی۔ اس وقت خالق ارض و سما خاموش رہا۔ وہ آج بھی خاموش ہے، مگر چراغ علی کا روزِ مکافات آ پہنچا۔ اب اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں اسی پاگل عورت کا خوف ناک چہرہ گھوم رہا ہے۔ وہی چہرہ اس کے لیے خدا ہے، موت کا فرشتہ ہے [illegible] کا دارو [illegible] ہے۔ وہ [illegible] یہ چراغ علی [illegible] اپنے انجام کو پہنچ گیا مگر بے شمار ایسے چراغ علی ابھی زندہ ہیں اور نہ جانے کب تک انسانیت کے سینے پر سوار بن کر زندہ رہیں گے"۔

"مرگھٹ" ہمارے دیہی [illegible] کی زندگی کی ایک مکمل تصویر ہے۔ اختر کے جابکدست ہاتھ نے اس میں ایسے منجھے ہوئے رنگ لگائے ہیں کہ اس مختصر سے افسانے میں انقلابی تحریکوں کے دوران میں عوام کی ذہنی کش مکش کا ہر پہلو اجاگر ہو گیا ہے۔ سرکار کی گولی لکھو مستری کے بیٹے کو ٹھنڈا کر چکی مگر ابھی وہ خود ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ اب وہ اجنبی لوہا شمبھو اور چھوٹو کے دماغ میں گھوم رہی ہے۔ گھومتے گھومتے وہ سرکار کے داروغہ حوالدار کریم خاں کا روپ اختیار کر لیتی ہے، اور یہ لوگ جو لکھو مستری کے بیٹے کی ارتھی جلانے آئے تھے، اسے اکیلا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کہ کہیں وہ بھی سرکار کے مخالفوں میں شمار نہ ہونے لگیں۔ یہ کہانی ادنیٰ طبقے کے ذہنی اتار چڑھاؤ کی نفسیاتی تحلیل ہے اور خوف [illegible] دل میں رینگتی ہوئی [illegible] دہشت کو بے نقاب کرتی ہے جو حکومت کی طاقت کے تصور سے ان میں گھر کر چکی ہے۔

اختر رائے پوری کا یہ مطالعہ ان لوگوں کو ضرور شرمائے گا، جو انقلاب کے نعرے بلند کرتے [illegible] بیٹھے ہیں [illegible] ہو تو کچھ احتیاط سے میدان میں نکلیں۔ کسبیوں کے ذکر خیر کی طرح اردو کے افسانوں میں [illegible] انقلاب کا تذکرہ بھی بہت ہے مگر ان میں سے ایک بھی مطالعہ "مرگھٹ" کے [illegible] تک نہیں پہنچ سکا۔ اس افسانے میں اختر رائے پوری نے جو فنی کمال دکھایا ہے وہ ناظر کو افسانے کے مطالعے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ مجموعی طور پر اختر رائے پوری کے افسانے اپنے خالق کی انفرادیت کے کامیاب مظہر ہیں۔ ان کے مطالعے سے ناظر کے دل میں تاثر کا جو تلاطم برپا ہوتا ہے وہ [illegible] بیان ہے۔ ان کی [illegible] ایسا جادو جو ایک ہی جھلک میں [illegible] والے کو ہمیشہ کے لیے مسخر کر لیتا ہے۔ انھوں نے جس کامیابی سے ہندی اور اردو کے میل سے اپنے لیے ایک اچھوتا اور

دل فریب اسلوبِ بیان ڈھونڈھ نکالا ہے وہ ہمارے سارے ادب کے لیے باعثِ فخر ہے۔ منظر نگاری کو افسانے میں بڑا درجہ حاصل ہے، خاص طور پر ایسی حالت میں کہ فن کار منظر نگاری سے ماحول کی وضاحت کر رہا ہو۔ اخترؔ رائے پوری کو اس میں بڑا کمال حاصل ہے۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے جملے میں بھی ایک جہانِ معنی آباد ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک منظر دیکھیے! "اس مکان سے لگ کر کالی دیوی کا ایک چھوٹا سا مندر تھا، یہ کالی کلوٹی اور ننگ دھڑنگ دیوی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے لیل و نہار کا تماشا دیکھا کرتی ہے۔ شام کو جب آرتی شروع ہوتی ہے اور کم سن لڑکیاں اس کے سامنے ناچنے لگتیں تو مٹی کے چراغوں کی دھندلی جوت میں اس کی شکل زیادہ پراسرار ہو جاتی۔ یوں معلوم ہوتا کہ عورت کی روح ایک سیاہ کفن اوڑھے ہوئے اپنی قبر سے اٹھی ہے اور ایک آن میں مرد کو فنا کر دے گی۔ جو لوگ درشن کے لیے آتے، وہ ہاتھ باندھے للچائی ہوئی نظروں سے ان رقاصاؤں کو تاکا کرتے تھے اور جب وہ التفات نہ کرتیں تو زیادہ بے باکی سے ان طوائفوں کو گھورنے لگتے۔ جو پجاری کے ڈر کے مارے سیڑھی کے نیچے سر جھکائے کھڑی رہتی تھیں"۔۔۔۔۔۔ ("مجھے جانے دو")

موت کا تصور خوف ناک ہے، مگر اس کو الفاظ میں ڈھالنے کے لیے بڑی کاوش کی ضرورت ہے۔ کوئی تصور جتنا جاندار ہوتا ہے۔ اس کے بیان میں اتنی مشکل پیش آتی ہے۔ مگر دیکھیے فن کار نے چند جملوں میں کیسی ہولناک تصویر کھینچی ہے۔ "مرگھٹ ندی کے کنارے تھا، چھوٹا سا میدان جس میں کبھی کچھ نہ اگتا تھا اور اس کی مٹی سیاہ تھی، جمے ہوئے خون کی طرح سیاہ! ندی کے کنارے کے پیڑوں پر ہمیشہ پت جھڑ رہتی تھی اور ان کی شاخیں قحط زدہ انسانوں کی طرح بادلوں کا منہ تاکا کرتی تھیں۔ ان پر گدھوں اور کوؤں کے علاوہ کوئی پرندہ نہ بیٹھتا تھا۔ دور تک ہڈیوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے اور یہاں وہاں ایک آدھ کھوپڑی زندگی کے انجام پر باچھیں چیر کر ہنس پڑتی تھی۔ ندی کا دھارا ہولے ہولے بہتا چلا جاتا تھا۔ کبھی کوئی موج گھاٹ سے ٹکرا کر سر اٹھاتی، مرگھٹ کی اداسی دیکھتی اور پھر سر جھکا کر اپنی راہ لگ جاتی تھی"۔

"اسی مرگھٹ میں لوگ ایک لاش کو جلانے آئے ہیں۔ آپ بھی دل کڑا کر کے اس جلتی ہوئی لاش کا نظارا دیکھیے۔ چتا تیزی سے جلنے لگی، دو آدمی لمبے لمبے بانسوں سے لاش کو اِدھر اُدھر لوٹانے لگے، گوشت کے ادھ جلے ٹکڑے اڑ اڑ کر زمین پر گر پڑتے تھے اور شعلے کتوں کی طرح ہڈیوں کو جبڑے میں دبا کر چٹخارہ بھرتے اور بے بصر آنکھوں سے ہر طرف گھورتے تھے، اندھیرا ہو چلا تھا، بادلوں کے دو چار گلابی ٹکڑے اڑ رہے تھے اور ایک دو تارے تیروں کی نوک کی طرح آسمان میں پیوست تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا، ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ کے سوا کوئی آواز نہ آتی تھی"۔ (مرگھٹ)

بحیثیت طنز نگار

منظر نگاری کے کچھ نمونے آپ نے دیکھ لیے، اب اس طنز نگاری کی چند مثالیں بھی سنیے جو اخترؔ کے آرٹ کا خاص حصہ ہے۔ طنز نگاری ادب کی ایک مشکل صنف ہے۔ اس دیس کی تو بات ہی کیا دنیا کے بھی چند فن کار اسے کامیابی سے اپنا سکے ہیں۔ اخترؔ رائے پوری نے فن کے اس پہلو میں جو چابک دستی دکھائی ہے وہ تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ٹکڑا دیکھیے۔ "وہ گھر جو ملک کا پڑ لوتا تھا، صوبے کے پیٹ شہر کے چھوکرے، محلے کا لڑکا۔ وہ بہت بڑا تھا، یہ نہ میرا گھر تھا نہ میرے باپ کا بلکہ ایک سیٹھ کا مکان تھا، اس میں بہت سے کمرے تھے جس طرح مکڑی کے جالے میں بہت سے خانے ہوتے ہیں، بہت سے لوگ مکھیوں کی طرح ان خانوں میں رہتے تھے۔ ایک منزل دوسری منزل کے اوپر اس طرح چڑھتی چلی گئی تھی، جس طرح ایک آسمان دوسرے آسمان پر رکھا ہو اور چوتھی منزل پر وہ سیٹھ عیسیٰ مسیح کی طرح رہا کرتا تھا"۔ (میرا گھر)

رنڈیوں اور گھر بار والی عورتوں کی چشمک بڑی پرانی ہے، مگر فن کار نے اسے جس انداز میں بیان کیا ہے، وہ اردو میں طنز نگاری کے ایک صحت مند باب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "ٹریم پر شریف زادیوں اور موٹروں پر امیر زادیوں کے کھیپ کے کھیپ گزرا کرتے تھے ان مستی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ توبہ واستغفار کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔ یہ بدبخت نسوانیت کی کلنک خدا انھیں غارت کرے! چند ٹکوں کے لیے

شراب کی ایک بوتل یا سگریٹ کی ایک ڈبیا کے لیے یہ اپنا تن ہر ابرے غیرے کے سپرد کر دیتی ہیں ــ اور ہم: ــــ پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کرنے لگتی تھیں جنھوں نے انھیں اونچی حویلیاں، ریشمی ساریاں اور چھپے چھپے بچے عطا کیے تھے۔" (مجھے جانے دو)

افسوس ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں اختر کے آرٹ کی خوبیاں پوری طرح نہیں دکھائی جا سکتیں، بلکہ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کو ان فنی بلندیوں کی ایک جھلک بھی نہ دکھلا سکا جو اس فن کار کے آرٹ میں جا بجا نظر آتی اور اس کی انفرادیت کو چمکاتی ہی چلی جاتی ہیں۔ جدتِ طبع، رعنائی بیان، دردمندی، خلوص اور سوز، یہ وہ جواہر پارے ہیں جن سے اختر حسین رائے پوری کی ادبی زنبیل بھری پڑی ہے اور وہ عمر عیار کی طرح ہمیں اپنی فنی سحر طرازیوں سے مسحور ہی کرتے چلے جاتے ہیں۔ قدرت نے انھیں ایسا دردمند دل عطا کیا ہے جو بے حس چیزوں تک کی فریاد پر تڑپ اٹھتا ہے۔ جو شخص برگد کے بوڑھے ٹھونٹھ کے دل کی دھڑکن سن سکتا ہے، اس کے احساس کی رسائی کا کیا کہنا۔ جب ان کا قلم جذبات کو الفاظ کے جال میں گرفتار کرتا ہے تو ان کی تحریر میں ایسی پرسوز دل ربائی پیدا ہو جاتی ہے جو صرف مجروح نغمے کی آرزومندی میں پائی جاتی ہے۔ زندگی کے بیتے ہوئے لمحوں میں بہت کشش ہے۔ انسان تنہائی کے عالم میں آنکھیں بند کرتا ہے، تو ان دیکھے دریچوں سے نامعلوم نظریں ماضی کے سہانے چمن زار کو دیکھتی ہیں۔ اس چمن میں پھول ہی پھول ہیں، کانٹے نہیں۔ حسین یادوں کے معطر پھول۔ ان کی خوشبو سے ذہن مہک اٹھتا ہے، مگر دل میں درد پیدا ہوتا ہے، کیا جو کچھ گزر چکا وہ لوٹ کے نہ آئے گا، دیکھیے ایک بے زبان نے اس موقع پر فن کار سے سرگوشیوں میں کچھ کہا ہے اور اس نے ان تاثرات کو اپنے انداز میں لکھ دیا ہے، مگر کیسے دل ربا، پرسوز اور حسرت ناک انداز میں ــ "کل تک میں گنگا جل میں نہلایا جاتا تھا، چندن اور سیندور سے سنوارا جاتا تھا، صبح کے وقت کنول کے ڈنٹھل سے بھی زیادہ نازک انگلیاں پھولوں کی چادر مجھے اڑھاتیں اور سرِ شام میرے اردگرد چراغِ حسن محبت کی لو بھڑکائے ہوئے حصولِ آرزو کی دعائیں مانگتیں، گویا عشق کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور منجمد ہو کر مورت بن گیا۔ میرے سینے میں اس جھلسے ہوئے پیڑ اور مرجھائی ہوئی بیل کی کہانی دفن ہے، حالانکہ یہ مورت عورت کے دل سے زیادہ لچیلی اور مرد کے دل سے زیادہ نازک ہے۔ مگر اس کی زبان و عبارت کو سمجھنے کے لیے ہوشیاری کی نہیں بے ہوشی کی، فہم کی نہیں جنون کی ضرورت ہے۔ جب زمین ماضی کے خواب دیکھتے دیکھتے بڑبڑانے لگتی ہے اور اس کی دبی ہوئی آواز کی بازگشت جھرنوں کے ترنم اور چنار کے پتوں کی سرسراہٹ میں سنائی دیتی ہے، جب وقت گردشِ ایام کی داستان قلمِ شفق سے لکھنے کے لیے شب کی سیاہی گھولتا ہے تو انسان اور بوم کے سوا ہر ذی حیات اس کا ہم نوا اور ہم گوش ہو جاتا ہے ... دوپہر کو جب گڈریا مجھ پر سر رکھ کر بانسری کی تان چھیڑتا ہے اور اس کے دل فریب سروں کو سن کر دھوپ سے پریشان پرندے دم بخود رہ جاتے ہیں کہ یہ نغمۂ حیات پہلے کب سنا تھا یا جب کوئی دیہاتی برات میرے گرد دمیش ٹھہرتی ہے اور کوئی معصوم دوشیزہ دوسرے پتھروں کے ساتھ مجھے بھی چولھے میں لگا دیتی اور ہنڈوں کے ڈر سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی جھجکتی آواز میں پریت کے گیت گاتی ہے یا جب گاؤں کی ننھی لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی مجھے آ کر چھوتی ہیں تو میں ان سے کچھ کہنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہوں، مگر جیسے پھانسی کی رسی کا جھٹکا دمِ واپسیں آخری چیخ کو زبان پر آنے کی اجازت نہ دے، جیسے اوہام کی پابندی کسی دلہن کی زبان سے بوقتِ ایجاب "نہیں" نہ نکلنے دے۔ یہاں ویسے ہی میرے جسم لرزاں سے عالمِ نزع کی سی ایک ہچکی سی نکلتی اور سینے میں رہ جاتی ہے۔ البتہ جب کوئی ٹوٹا ہوا ستارہ میرے قریب گر پڑتا ہے اور مجھ سے ہم سخن ہوتا ہے تو آسمان والوں کی داستان سنتے سنتے میں بھی فرطِ اضطرار سے اسے زمین والوں کی سیاہ کاری سنانے لگتا ہوں۔"

(یوں ہوتا تو کیا ہوتا)

اوپر بیان کی گئی تمام خوبیوں کے علاوہ جو چیز اختر رائے پوری کو دنیا کے بہترین فن کاروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے، وہ ان کے خیالات کی پاکیزگی اور نکھار ہے۔ زندگی کے متعلق ان کا مشاہدہ حقیقی ہے اور انسانیت کے متعلق ان کا تصور اپنے مشاہدے کی طرح واضح

ہے۔ ان کے دل میں عہدِ حاضر کے ادیبوں کی طرح انسان کے لیے کچھ کھوکھلے نعرے اور بےکار جذبات نہیں بلکہ گہری ہمدردی ہے جو اس مظلوم کے زخمی دل پر محبت کے پھائے کا کام دیتی ہے۔ اس اندھی اور اندھیری دنیا میں آدم کی اولاد سے جو سلوک ہو رہا ہے اختر رائے پوری کا آرٹ اس کے خلاف ایک صحت مند صدائے احتجاج ہے۔ وہ ایک سوال ہے اس دنیا سے، دنیا کے قانون سے، قانون کے بنانے والوں سے اور قانون بنانے والوں کے خالق سے کہ ایسا کیوں ہے، انسان پر عرصۂ حیات کیوں تنگ ہے، اس کائنات میں وہ اس طرح زندگی بسر کرنے پر کیوں مجبور ہے۔ یہ گورکھ دھندا فن کار کو عجیب شبہے میں مبتلا کردیتا ہے اور کئی جگہ وہ اپنے آرٹ میں اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔

یہ کائنات کتنی عجیب ہے اور کس قدر پُراسرار۔ انسان اس طلسم کے دروازے پر کھڑا ہو کر قیامت تک دستک دیتا رہے گا اور قیامت کے دن جب یہ دروازہ ٹوٹے گا تو یہ نظر آئے گا کہ خون کا ایک دریا ہے جس کے بیچوں بیچ ہڈیوں کا محل بنا ہوا ہے اور اس میں وہ معبود رہتا ہے جس کی پرستش فریب خوردہ انسانیت ہمیشہ سے کرتی آئی ہے ۔۔۔۔ (دل کا اندھیرا)

شاید کچھ لوگوں کو اس سے اختلاف ہو، مگر وہ اسی طبقے سے ہوں گے جن پر خالقِ ارض و سما کی رحمتوں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، مگر وہ کروڑوں انسان جو ان رحمتوں سے محروم ہیں ان کا گناہ کیا ہے، کس جرم کی پاداش میں وہ ایسی گھناؤنی اور شرم ناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ سڑکوں اور گلیوں میں گھومتے ہوئے بھکاری، یہ چکلوں میں بیٹھی ہوئی ننگی طوائفیں، یہ غم کے بوجھ سے دبے ہوئے فاقہ کش انسان [illegible] جائیں گے۔ اگر فن کار [illegible] مخلوق [illegible] سبب دریافت کرتا ہے یا سماج سے اس [illegible] گر ہے وکھ [illegible] ہونٹوں پر آئے تو کیا ہو۔ کاش فن کار [illegible] جھلکے [illegible] ہوتا [illegible] کی طرح انسان کو چلتا پھرتا اور بولتا ہو [illegible] مصنف [illegible] وہ مبارک ساعت کب آئے ۔۔؟

"محبت اور نفرت" کی اشاعت کے بعد اختر رائے پوری نے لکھے ہیں ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اب ان کا آرٹ ملکی قیود کو توڑ کر بین الاقوامی ادب سے رشتہ جوڑ رہا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس دور کی ابتدا بھی ایسے دلس سے بہت دور پیرس کی رومان پرور زمین میں ہوئی جو ان دنوں ہٹلر کے طوفانی دستوں کے مقابلے میں بری طرح گھائل ہو رہا تھا۔ آرٹسٹ نے وہیں اپنا ہمیشہ زندہ رہنے والا افسانہ "دل کا اندھیرا" لکھا اور آندرے جیسے امر کردار کی تخلیق کی جو اپنی دردمندی اور انسانیت کی بدولت سدا زندہ رہے گا۔ فرانس کا یہ حساس سپاہی اجتماعی انسان کی زبان سے بولتا ہے۔ اس کی آواز میں ساری انسانیت کی فریاد ہے۔ اس کی آنکھوں میں نیکی کی معصومیت اور دل میں سچے جذبوں کا نور ہے۔ افسانے کے آخر میں جب دکھیاری ماں بیٹے کی موت سے مشتعل ہو کر مریم کے بت کے منہ پر تھوکتی ہے اور وہ کلیسا کے تقدس کی مجرمہ کو اپنی پناہ میں لیتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ان جانی طاقت روندی ہوئی زندگی کی حفاظت کے لیے میدان میں آ گئی ہے۔ افسانے کا وہ حصہ بے حد درد ناک ہے جہاں آندرے اس ہولناک کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے کہ اپنے دوست کی موت کی خبر اس کی ماں اور بیوی کو کیوں کر سنائے۔ یہاں سے اس کا [illegible] طرح سے [illegible] شکست ہے مگر [illegible] شکست پر بھی عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

"تلاشِ گم شدہ" کا ہیرو ہوخاں بھی آندرے کی طرح جنگ کے [illegible] کی [illegible] کی نذر کر آیا ہے۔ ہوخاں کے کردار میں آندرے جیسی دل کشی نہیں مگر اپنی نامردی کے سبب سے وہ [illegible] ہماری ہمدردی کا مستحق ہے۔ یہ افسانہ حرکے

آرٹ کا نادر نمونہ ہے، مگر ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اب اس کے آرٹ کا ساتھ دینے کے لیے بھی کافی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ رداسی کا بیان ہے کہ موضع نام پور کے لنگڑے سپاہی بنو خاں کے سوکھے ہوئے گھٹنے سے از سرِ نو شجرِ زندگی پھوٹ رہا ہے" کا مطلب خواہ کچھ ہی ہو، مگر اس کی ہمہ گیر ٹریجک ویلیو سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بنو خاں کے کردار کے آئینے میں اس دیس کے سیکڑوں سپاہیوں کا عکس نظر آتا ہے جو اپنے کٹے پھٹے اعضا اور مسخ چہرے ہلا ہلا کر زندگی کے انجام کا ماتم کر رہے ہیں۔ اردو زبان کی خوش قسمتی میں کلام نہیں کہ یہ جنگ کی ہولناکیوں کے خلاف، جو نعرہ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں گونج اٹھا تھا، اس کی صحت مند آواز بھی اس میں شامل ہے۔

"دیوان خانہ" فنی لحاظ سے اردو ادب میں بڑا بلند درجہ رکھتا ہے۔ اس افسانے میں آرٹسٹ بظاہر ایک جذباتی لڑکی کے کردار کی تشکیل میں مصروف نظر آتا ہے، مگر اس افسانے کا حقیقی موضوع۔ ایک آرٹسٹ ہے۔ یہاں آرٹسٹ کا کمال دیکھیے کہ وہ اصلی کردار کو بلا واسطہ پیش کرتا ہے۔ سارے افسانے میں ایک جگہ آرٹسٹ کا وجود نظر آتا ہے، وہ بھی دھندلا سا، مگر اس کے باوجود وہ ہر جگہ موجود ہے، ہر منظر میں گھوم رہا ہے، ہر احساس میں جھلک رہا ہے۔ معلوم نہیں کیوں مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ افسانہ آرٹسٹ کی آپ بیتی کا ایک دردناک حصہ ہے۔ بورژوا طبقے کی معاشرت کی ایسی گھناؤنی تصویر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آرٹسٹ کی موت کا احساس بڑا پر معنی اشارہ ہے اور اس حقیقت کا عکاس ہے کہ آرٹسٹ کی شخصیت کسی بھی ماحول کی تاریکی میں کم نہیں ہوتی، مرنے کے بعد بھی اس کی یاد سیکڑوں ارمانوں سے عزیز رکھی جاتی ہے۔

"دل کا اندھیرا" کو چھوڑ کر "بیزاری" نئے دور کا بہترین افسانہ ہے۔ اس افسانے میں آرٹسٹ ہمیں دنیا سے بیزار نظر آتا ہے۔ خود غرضی معاشی مجبوریوں اور قابلِ نفرت جنگ وخوں ریزی سے تنگ آکر اب وہ ستاروں کی دنیا کے خواب دیکھ رہا ہے، مگر اس خواب کے رنگ بڑے پراسرار ہیں۔ اس افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں طنز کی تلخی مفقود ہے، اس تلخی کی جگہ بیزاری نے لے لی ہے جو افسانے کا اصلی موضوع ہے۔ ایک لحاظ سے یہ افسانہ موجودہ دور کی سیاست اور معاشرت کی مکمل تصویر ہے، مگر حیرت ہے کہ بڑی سے بڑی بات کو مختصر سے اشارے میں بڑی کامیابی کے ساتھ کہہ دیا گیا ہے "حوا کی بیٹی کے ساتھ دوسری ملاقات، وہ جان دار جن کی ایک آنکھ سے نیلی روشنی کی کرن جھانکتی ہے اور دوسری سے حیوانی جذبہ جھلکتا ہے، شمال میں آسمان پر ابھرتا ہوا دم دار سرخ ستارہ۔ اور یہ آرزو کہ اس کی ضرب سے تمام چیزیں پاش پاش ہو جائیں" ایک ذہین پڑھنے والے کے لیے ان میں بہت کچھ موجود ہے، مگر یاد رہے کہ اسے یہ گوارا نہیں کہ آرٹسٹ اب جمشید کے پیالے میں ہی ڈوب کر رہ جائے بلکہ وہ اس انتظار میں ہے کہ آرٹسٹ اب اس کے لیے کوئی ایسی چیز لائے گا جو "مجھے جانے دو"، کی کسبی کی طرح تلخ، "مرگھٹ" کے لکھو مستری کی طرح دل فگار اور "دل کا اندھیرا" کے آندرے کی طرح درد مند ہوگی۔ "محبت اور نفرت" کے آرٹسٹ سے یہ توقع عبث نہیں اس نے ہر نئے افسانے میں اپنے ذہنی اور فنی ارتقا کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے آرٹ میں زندگی کی جو خوش نما جوت جگمگا رہی ہے، کسی دن اسی روشنی سے بین الاقوامی ادب کے رنگ محل میں ہندوستان کا نام کندہ کیا جائے گا۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ جب میں اپنے دیس کے ادب پر نظر ڈالتا ہوں تو اس بے رنگ و بو چمن میں اختر حسین رائے پوری کا آرٹ ہی ایک ہرا بھرا پودا نظر آتا ہے جس کی شاخوں میں سدا بہار پھول لہلہا رہے ہیں۔ ان پھولوں میں ایک فن کار کے خلوص کی سرخی جھلک رہی ہے اور اس سرخی میں ایسی بہارِ بے خزاں ہے جو انھیں ہمیشہ معطر اور تر و تازہ رکھے گی۔


لیمن
اینو
جس میں ریگولر فرحت بخش اینو
کی آزمائی ہوئی خوبیاں موجود ہیں اور
لیموں کا تروتازہ مزہ بھی!
LEMON
ENO
Fruit Salt
Refreshing
Relief from
Stomach
Upsets
نیا خوشنما ہرا رنگ اور لیموں کا تروتازہ مزہ۔ لیمن اینو ریگولر
فرحت بخش اینو کی طرح فائدہ بخش اور مؤثر۔ بدہضمی، گرانی کی تکلیف یا
معدہ کی جلن میں آرام کے لئے۔
جس نے آزمایا اُس کو پسند آیا۔ ذائقہ آپ کا بھی من پسند
ریگولر فرحت بخش اینو بھی دستیاب ہے۔
لیمن اینو خوش ذائقہ اور بدہضمی میں فوری فائدہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	حکیم محمد سعید	ڈاکٹر جمیل جالبی	پروفیسر ممتاز حسین
انجم اعظمی	پروفیسر نظیر صدیقی	محمد خالد اختر	عبیداللہ قدسی
محمد احمد سبزواری	ڈاکٹر سلیم اختر	سیّد مقصود زاہدی	فضل قدیر
رئیس امروہوی	نصراللہ خاں	میرزا ادیب	انتظار حسین
شبنم رومانی	ڈاکٹر آغا سہیل	ریاض صدیقی	ادارہ
حسن عابدی	ا۔ س	پروفیسر مجتبیٰ حسین	سیّد شبیّر علی کاظمی
فضل من اللہ	کریم بخش خالد	سحر انصاری	ڈاکٹر انور سدید
زیتو	ایریل	یونس احمر	انور عنایت اللہ
	آصف اسلم فرخی	اکرام بریلوی	

تبصرے
تذکرے

افکار کے لئے

بہترین دعاؤں اور نیک تمنّاؤں کے ساتھ

منجانب

یونائیٹڈ کنسٹرکشن کمپنی

۸۳-بی، بلاک III، ناظم آباد۔ کراچی فون ۶۷۰۸۶۱

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

کچھ اپنے اور سوانح نگاری کے بارے میں....

صدر محترم خواتین وحضرات!——

میں حکیم محمد سعید صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس جلسے میں شرکت کی دعوت دی۔ موقع کی مناسبت سے میں سوانح نگاری کے فن کے متعلق کچھ عرض کردوں۔ گزشتہ تین سو سال میں جدید علوم میں جیسی ترقی ہوئی اس کا عکس ہمیں مغرب کے ادب میں واضح طور پر ملتا ہے جس طرح علوم نے جدید انکشاف اور ایجاد کے وسیلے سے بہت سی نئی سمتیں تلاش کیں (اور یہ سفر ابھی جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا) اسی طرح ادب نے علم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے لیے نئے نئے راستے نکالے۔ اب ادب کے چار بڑے ستون سمجھے جاتے ہیں۔ شاعری، ڈراما، فکشن اور سوانح نگاری۔ سوانح نگاری کو عہد قدیم میں تاریخ نویسی کا ضمیمہ سمجھا جاتا تھا۔ سوانحی ادب قدیم یونان اور روم میں لکھا گیا، لیکن اُسے تاریخ کا محض ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔ سوانح نگاری اب بذاتِ خود ایک صنفِ ادب ہے۔ اُسے بھی چار اقسام کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو سوانح حیات وہ جو ایک شخص دوسرے کے متعلق لکھتا ہے اور دوسری خودنوشت سوانح حیات یا آپ بیتی' اور تیسری یادداشت۔ میری کتاب" گردِ راہ" اسی زمرے میں شامل کی جائے گی۔ چوتھی ڈائری جسے آپ روزنامچہ کہہ سکتے ہیں۔ ڈائری کی بذات خود کوئی ادبی حیثیت نہیں ہوتی، لیکن یورپ میں بعض بڑے ادیبوں نے جس انداز سے ڈائری لکھی، یورپین زبانوں میں اس کو جرنل کہا جاتا ہے۔ میں دو مثالیں دیتا ہوں۔ فرانس کے مشہور ادیب "آندرے ژید" نے ناول بھی لکھے لیکن اس کا بڑا کارنامہ اس کا جرنل ہے جس میں اس صدی کے نصف اول کی ادبی زندگی کا جیتا جاگتا مرقع ملتا ہے وہ شاید ہی کہیں اور دستیاب ہو۔ اسی جرنل کی بنا پر اس کو نوبل پرائز ملا تھا۔ دوسرا گزشتہ صدی میں ڈنمارک کے مشہور فلسفی "کرک گارد" نے جو جرنل لکھے وہ اپنے اسلوب اور فکر کے اعتبار سے لاجواب ہیں۔ ہم خودنوشت یا سوانح حیات سے واقف ہیں لیکن جسے جرنل کہتے ہیں اُردو اس سے ناواقف ہے۔ یہ خاص چیز ہے یورپین زبانوں کی۔ اب مغرب میں تو اور اصنافِ ادب کی طرح سوانح نگاری نے بھی بڑی ترقی کی ہے۔ وہاں ہر قابلِ ذکر آدمی کی سوانح حیات آپ کو ملے گی وہاں بیاگرفیکل ڈراما جس افراط سے ملتا ہے اس کا حساب لگانا بھی مشکل ہے۔ البتہ اردو میں شاعری کے علاوہ جس طرح نثری ادب میں اور اصناف کی کمی ہے اسی طرح سوانحی ادب کی کمی محسوس کی جائے گی! اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ اردو نثر کی عمر نسبتاً کم ہے۔ یوں تو کہنے کے لیے فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج میں اردو میں کتابیں لکھی گئیں۔ اور اس طرح نثر میں اظہار کا سلیقہ پیدا ہوا لیکن دراصل اس نے ترقی کی سرسید احمد کے زمانے سے۔ جہاں تک فکشن کا تعلق ہے رتن ناتھ سرشار کا نام لیا جائے گا کہ انھوں نے اردو فکشن کا آغاز کیا۔ اب اردو میں سوانح عمری کے کئی اچھے نمونے ملیں گے اور جہاں تک خودنوشت سوانح عمری کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ نثو

کتابیں تو لکھی گئی ہوں گی، البتہ ان میں آپ کو معیاری کتابیں کم ملیں گی۔ اب اگر میں نام لینے بیٹھوں تو مولانا ابوالکلام آزاد کا "تذکرہ" یاد آتا ہے اپنے زمانے کے بڑے عالم، دانشور اور انشا پرداز تھے۔ مجھے ان کی صحبت میں کئی مہینے بیٹھنے کا فخر بھی حاصل ہوا جب وہ میرے وزیر تعلیم تھے اور میں معاون مشیر تعلیم کی حیثیت سے تقسیم سے پہلے دہلی میں کام کرتا تھا۔ مولانا کا علم بے پناہ تھا اور اُن کے زبان و قلم میں بڑی قوت تھی۔ تاہم جب وہ اپنا حال "تذکرہ" کے عنوان سے لکھنے بیٹھے تو اہل نظر کو محسوس ہوا کہ مولانا کی شخصیت الفاظ کے انبار میں دب گئی اور کتاب پڑھنے کے بعد آپ کو اندازہ نہیں ہوگا کہ وہ کس مزاج کے آدمی تھے، انھوں نے کیا کیا، اپنی زندگی کس طرح شروع کی اور ان کے ماحول نے ان کے حالات کو کس طرح متاثر کیا۔ بس وہ الفاظ کا ایک طومار ہے، خطابت کا ایک مخصوص انداز جو اُن کا حصہ تھا وہ ہے تو آپ تنقید کی نظر سے دیکھیں تو مایوسی ہو۔ پھر ایک دوسرے بزرگ کا ذکر کروں جو ان کے ہم عصر تھے۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی جو خود اچھے انشا پرداز تھے۔ اُن کی آخری کتاب ان کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ کتاب کے نصف اول میں تین باب ہیں۔ ایک کا عنوان ہے "میرے آباواجداد" اور دوسرے کا عنوان ہے "میرے والد ماجد" تیسرے کا عنوان ہے "میری والدہ ماجدہ"۔ باقی آدھی کتاب میں مولانا اپنے دوستوں کا کچھ اپنے معمولات کا ذکر کرتے ہیں اور بات ختم ہو جاتی ہے۔ تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں سوانحی ادب کی کمی ہے۔ ڈرامے کا تو ذکر ہی نہ کیجیے کیونکہ ڈراما تو ہمارے یہاں برائے نام لکھا گیا۔ مدعا یہ ہے کہ جب تک نثر کی طرف خاطرخواہ توجہ نہ دی جائے اور مصنف و ناشر اس کی ترقی کے لیے کوشاں ہوں تو صحیح معنوں میں اُسے فروغ حاصل نہیں ہوگا اور اُسے ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکے گا۔ اس لحاظ سے شام ہمدرد کے منتظمین کا یہ فیصلہ اچھا ہے کہ اپنے جلسوں کو اس سال سوانح نگاری کے لیے مخصوص کر دیا۔

میرے متعلق ابھی دوستوں نے جو کچھ کہا یہ ان کا کرم ہے۔ مجھے اپنے متعلق کچھ کہتے ہوئے جھجک ہوتی ہے کیونکہ یہ میرا مزاج نہیں اور زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں بادل ناخواستہ ایک ایسے جلسے میں آیا ہوں جہاں میرا ذکر کیا جا رہا ہے۔ تعریف وہی بہتر ہے جو آدمی کے پیچھے کی جائے۔ البتہ شکایت اس کے سامنے کرنا چاہیے تاکہ اس کا جواز پیش کیا جا سکے۔ میرا یہی اصول رہا ہے۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو "مدح خود را می گویم" کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ میں ان چیزوں سے بے نیاز ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے بے نیاز بنایا۔ میں اب زندگی کی اس منزل پر ہوں کہ اب آگے نہیں دیکھ سکتا صرف پیچھے دیکھ سکتا ہوں اور مدت کے بعد اتنی فرصت ملی کہ پیچھے مڑ کر دیکھوں اور زندگی کے سود و زیاں کا حساب لوں اور اپنے تجربے اور مشاہدے کو قلم بند کر سکوں۔ اس کاوش میں مشکل بھی پیش آئی اس لیے کہ جب میری بینائی خراب ہوئی تو نامکمل مسودے کو تکمیل تک پہنچانے میں خاصی دقت پیش آئی۔ بہرحال یہ کتاب جیسی بھی ہے آپ کے سامنے ہے۔ البتہ یہ سفر جب ختم ہونے آتا ہے تو سب کی طرح میں اپنے سے پوچھتا ہوں کہ حاصلِ حیات کیا تھا۔ ہر ذی حس یہ سوال خود سے پوچھتا ہے۔ جب میں نے یہ سوال اپنے سے پوچھا تو اس کا جواب مجھے مولانا رومی کے اس شعر سے ملا جسے میں نے کتاب کے سرورق پر چھاپ دیا ہے وہ شعر یہ ہے ؎

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست

خام بودم، پختہ شدم، سوختم

اس شعر کی جان وہی ایک لفظ ہے "سوختم" ہر آدمی اپنی آگ میں خود جلتا ہے۔ بہت سے حرص و ہوس کی آگ میں جلتے ہیں۔ بہت سے بغض و عداوت میں جلتے ہیں کچھ روشن ضمیر وہ ہیں جو انسان کی بے بسی، بے چارگی، معاشرے کی بے انصافی اور ریاکاری کو دیکھ کر جلتے ہیں کم عمری میں یہ احساس مجھ میں پیدا ہوا اور میں نے "گرد راہ" کے ابتدائی حصے میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

جب یہ شعور مجھ میں پیدا ہوا تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی زندگی کو اپنی بساط کے مطابق، اپنی صلاحیت کے مطابق معاشی خرابیوں کی

اصلاح کی خاطر صرف کر دوں۔ وہ آگ جو میرے سینے میں جلتی رہی اس کی آنچ میں اب بھی محسوس کرتا ہوں اور میرے خیال میں یہی حاصلِ حیات ہے۔

غالب کو بھی اس آگ نے جھلسایا تو اس نے کہا کہ ؏

دیکھ کر طرزِ تپاک اہلِ دنیا جل گیا

لیکن میر تقی میر نے اس سے بڑی بات کہی ہے

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمن و صد کوہ طور تھا

تو دوسرا آدمی کس طرح اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس کے دل میں کتنا سوز ہے البتہ اپنے عمل سے وہ اس کا احساس دلا سکتا ہے۔ ایک ادیب اپنی تحریر سے اس کا اظہار کر سکتا ہے۔ اب اس تپش کو دوسرے محسوس کریں یا نہ کریں یہ بات اور ہے۔ بہرحال جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں کوئی بڑا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بڑے دعوے تو چھوٹے لوگ کر سکتے ہیں۔ البتہ میں نے اپنی حد تک جتنا ممکن تھا قارئین میں اُن انسانی اور اخلاقی قدروں کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کی جو شعور قدرت نے مجھے ودیعت کیا تھا۔

(۲۲ر فروری ۱۹۸۴ء کو شام ہمدرد کی تقریب میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا بطور مہمان خصوصی اظہارِ خیال)

حکیم محمد سعید

کلماتِ ابتدائیہ

(بسلسلہ سرمایۂ حیات — میرے مشاہدات و تجربات)

خواتین و حضرات!

میں آج کی اس شامِ ہمدرد میں آپ سب کو دلی مسرت کے ساتھ خوش آمدید کہتا ہوں اور شکرگزار ہوں کہ آپ نے اس محفل میں شرکت کرنے کی زحمت فرمائی۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اس سال شامِ ہمدرد کا موضوع بزرگوں کے مشاہدات و تجربات ہیں۔ ان بزرگوں کے مطالعے زندگی کی مدد سے ہم زندگی کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اہلِ علم کے سامنے یہ بات دُہرانے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ہر دانش در کے ذہنی اور عملی تجربات مختلف ہوتے ہیں اور انھیں تجربات سے تاریخ کا شعور اور تہذیب کی شناخت پیدا ہوتی ہے۔ ہر صاحبِ علم و فن کی نگاہ اس جہانِ تگ و تاز میں ایک جہانِ دیگر کا مشاہدہ کرتی ہے۔ ان ہی مشاہدات سے انسانیت کو رہنمائی ملتی ہے۔ اس لیے ہم ان اصحابِ نظر سے درخواست کر رہے ہیں، جنھوں نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور جنھوں نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انسان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے محب مکرم ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے میری درخواست پر آج ہمیں اپنے افکار سے مستفید کرنا منظور فرمایا۔

محترم ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ایک ادیب، نقاد، افسانہ نگار، مترجم اور ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب علم و ادب کے ان خدمت گزاروں میں سے ہیں جنھوں نے ابتدائی زندگی ہی سے نئی ادبی روایات کے چراغ روشن کیے اور تعلیم و تہذیب کے فروغ میں حصہ لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک پروفیسر کی حیثیت سے ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور ۱۹۷۶ء میں کراچی یونیورسٹی کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی زندگی کا اختتام کیا۔ درمیان میں آپ حکومتِ ہند اور حکومتِ پاکستان کے محکمہ ہائے تعلیم سے بحیثیت ماہر اور مشیر وابستہ رہے اور سولہ سال تک اقوامِ متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے، یونیسکو میں اہم خدمات انجام دیں۔ پیرس یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے زمانے سے لے کر مختلف ملکوں میں یونیسکو کے نمائندے کی حیثیت سے ۱۹۷۲ء تک ڈاکٹر صاحب متعدد مغربی اور اسلامی ملکوں میں رہے اور وہاں نہ صرف پاکستان کی نمائندگی کی بلکہ گوناگوں تجربات و مشاہدات کیے۔

ڈاکٹر صاحب ہفت زبان بھی ہیں اور اردو کے علاوہ ہندی، بنگالی، فارسی، انگریزی، گجراتی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے مغرب اور مشرق کے متعدد ادبی شاہکاروں کو اردو میں منتقل کر کے اردو ادب کی ثروت اور اعتبار میں اضافہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو تنقید کو ترقی یافتہ زبانوں کی تنقید سے آنکھیں ملانے کے راستے پر ڈالا اور اردو نثر کو علمی اسلوب عطا کیا "شکنتلا"، "پیامِ شباب"، "گورکی کی آپ بیتی" اور "پیاری زمین" جیسے تراجم آپ کے قلم سے نکلے۔

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ۱۹۸۱ء کے لیے شامِ ہمدرد کا موضوع "فکر سرمایۂ حیات" منتخب کیا گیا اور اس سال کے آغاز میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری جیسے صاحبِ طرز ادیب کی خود نوشت "گردِ راہ" شائع ہوئی۔ "گردِ راہ" ڈاکٹر صاحب کی آپ بیتی ہی نہیں تہذیب و ثقافت، علم و ادب اور تعلیم و تاریخ کے حوالے سے جگ بیتی بھی ہے اور نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ اس طرح یہ بیسویں صدی کے درمیانی حصے کی شخصیات، تحریکات، افکار اور رجحانات کی ایک ادبی دستاویز ہے۔ آپ گردِ راہ پڑھتے جائیں اور ایک صاحبِ نظر کی نظر سے مسائلِ عالم کا جائزہ لیتے جائیں۔ آپ اکثر مقامات پر ٹھہریں گے، اوراق کو پلٹ کر دوبارہ نظر ڈالیں گے اور غور و تامل کے بعد ڈاکٹر صاحب کے گہرائی کے قائل ہو جائیں گے۔ کہیں آپ ڈاکٹر صاحب کے اخذ کردہ نتائج سے متفق نہ بھی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں، اس سے صرف یہ بات ظاہر ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب نے آپ کو سوچنے پر مائل و مجبور کر دیا۔ میں "گردِ راہ" کی اشاعت پر ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

خواتین و حضرات!

میں عزیز محترم ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب شیخ الجامعہ کراچی کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی اہم مصروفیات اور منصبی ذمے داریوں کے باوجود اس محفل کی صدارت منظور فرمائی۔ جناب محترم پروفیسر ممتاز حسین صاحب اور جناب محترم عزیز حامد مدنی صاحب بھی ہمارے دلی شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب کی علمی و ادبی خدمات اور "گردِ راہ" پر اپنے افکار سے مستفید کرنا منظور فرمایا۔

(یہ تعارفی تقریر ۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء کو شامِ ہمدرد۔ کراچی میں
حکیم محمد سعید کے بیرونِ ملک ہونے کی وجہ سے مختار زمن نے پڑھ کر سنائی)

ڈاکٹر جمیل جالبی

گردِ راہ ـــ ایک منفرد کتاب

محترمی ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب ـــ معزز خواتین و حضرات!

کہیں پڑھا تھا، یاد نہیں کہاں، کہ ہر بالغ نظر اور باشعور انسان کی زندگی میں مشاہدات و تجربات کا اتنا تنوع اور اتنا انوکھا پن ہوتا ہے کہ اگر انھیں بیان کیا جائے تو ایک دلچسپ ناول وجود میں آ سکتا ہے لیکن عام طور پر انا پرست اور خود پرور انسان اپنی بڑائی کے پہاڑ بنانے میں لگ جاتا ہے اور اس کے اصل تجربات جھوٹی بڑائی کے ملبے تلے دب کر رہ جاتے ہیں۔ اسی لیے بہت کم خود نوشتیں ایسی ہوتی ہیں جو پڑھنے والوں کے دل کو چھوتی ہیں۔ "گردراہ" اس اعتبار سے اردو زبان میں ایک مختلف خود نوشت ہے۔ گردراہ کی خوبی یہ ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی زندگی کے حالات، اپنے تجربات و مشاہدات کو انتہائی دھیمے انداز میں، انکسار و معروضیت کے ساتھ، انا پرستی اور خود پروری سے بچ کر، اس سادگی سے بیان کیا ہے کہ یہ خود نوشت، ناول سے زیادہ دلچسپ اور زندگی سے زیادہ حقیقی بن گئی ہے۔ "گردراہ" کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ پوری کتاب میں ہمیں ایک جہت، ایک زاویے کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں زندگی اپنے زمانے کی روح سے پیوست ہے اور زمانہ حالات سے مربوط ہے۔ ساتھ ساتھ واقعات، حالات، تجربات و مشاہدات کے مربوط بیان سے اس دور کی زندگی کے خدوخال اس طور پر ابھرے ہیں کہ زندگی اور زمانے کے رنگ نکھر کر اس تصویر کو خوب صورت سا دیتے ہیں۔ کتاب بظاہر مختلف ابواب میں تقسیم کی گئی ہے لیکن زاویۂ نظر اور جہت کے سرے اس میں ایک ایسا ربط اور ایسی ترتیب پیدا کر دیتے ہیں کہ شروع سے آخر تک یہ ایک دل کش اور جاذب نظر تحریر بن جاتی ہے۔ یہی ربط "گردراہ" کو ایک خوبصورت اور دل فریب "ساخت" عطا کرتا ہے اور اسے ایک باقاعدہ تصنیف بنا دیتا ہے۔ ایک ایسی تصنیف جس میں فلسفۂ حیات بھی ہے اور نظریات و افکار بھی ہیں اور ساتھ ساتھ وہ انوکھی دلچسپی بھی جو ایک داستان میں ہوتی ہے۔ ایک ایسی داستان جسے ایک بالغ نظر، پختہ کار اور لفظوں کا پارکھ ادیب کر رہا ہو۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے جب مجھ سے کہا کہ "گردِراہ" کے آخری پروف میں دیکھ دوں تو میں نے اس محبت کے پیشِ نظر جو تقریباً تیس۳۰ سال سے میرے اور ان کے درمیان ہے، حامی بھر لی اور عرض کیا کہ ایک ماہ میں پروف دیکھ کر واپس کر دوں گا لیکن جب میں نے پروف پڑھنے شروع کیے تو تین دن میں سارے پروف پڑھ ڈالے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ میں تین دن تک اس کے علاوہ کوئی اور کام نہ کر سکا۔ اپنی زندگی کے حالات و واقعات دوسروں نے بھی بیان کیے ہیں اور متعدد خود نوشتیں اردو میں لکھی اور شائع ہوئی ہیں لیکن گردراہ اس صنفِ ادب میں ایک ایسا اضافہ ہے کہ آئندہ خود نوشت لکھنے والے اس تصنیف کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں گے۔ بظاہر یہ ایک عام سا جملہ ہے

لیکن اس میں بہت سی ایسی باتیں پوشیدہ ہیں جن کے اظہار کے لیے ایک تفصیلی مضمون کی ضرورت ہے جو میں آج تو نہیں لیکن جلد لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ سردست تو میں آپ کی توجہ اس اہم تصنیف کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں تاکہ جب میں اپنے اس جملے کا طلسم کھولوں تو آپ بھی میرے ساتھ شریک ہوں۔

"گردِ راہ" میں ایک اور چیز جو دل کو موہتی اور پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لیتی ہے وہ سچائی کا جرأت کے ساتھ واقعاتی اظہار ہے جسے اتنی سادگی اور خلوص سے بیان کیا گیا ہے کہ سچائی کا اظہار قاری کو اپنے اثر کے سیلاب میں بہائے جاتا ہے۔ ادبی صحافت کے اس دور میں، جب ساری زندگی اخبار کے صفحات پر اگر مبتذل ہو گئی ہے، گردِ راہ اپنے خاص ادبی اظہار اور ادبی رنگ کی وجہ سے ہمیشہ ویسی ہی تازہ رہے گی جیسی آج ہے اور جسے پڑھنے والا بار بار پڑھ کر بھی اس کی معنویت سے، اس کی خوشبو اور رنگوں سے لطف اندوز ہوتا رہے گا۔

خواتین و حضرات! —

یہ باتیں میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری میرے سامنے موجود ہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کتاب کو دوسری بار پڑھ کر میں اس کے طلسم میں اور زیادہ گرفتار ہو گیا ہوں۔ کتنی کتابیں ہیں جو آپ دوبارہ پڑھ سکتے ہیں۔ کتنی کتابیں ہیں جو آپ لفظاً لفظاً اور سطر بہ سطر پڑھ سکتے ہیں۔ گردِ راہ ایک ایسی کتاب ہے جو ایک عرصے کے بعد ہاتھ آئی ہے۔

یہاں میں ایک بات کی طرف اور اشارہ کروں گا۔ گردِ راہ میں ایک ایسا اسلوب اُبھرا ہے جو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی شناخت بن جاتا ہے اور جو لہجے کے دھیمے پن، لفظوں کو کفایت کے ساتھ استعمال کرنے کے ہنر، مشاہدات و تجربات کو ناپ تول کر بیان کرنے کی خصوصیت اور صاف ذہن کے ساتھ اپنی بات پوری طرح پڑھنے والوں تک پہنچانے کے شعوری عمل سے وجود میں آیا ہے۔ اسی اسلوب نے اس تصنیف کو بلند پایہ، منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب نے اس تصنیف میں بہت سے اردو فارسی اشعار بھی استعمال کیے ہیں اور یہ سب اشعار ایسی برجستگی اور خوبی کے ساتھ نثر کا حصہ بن کر آئے ہیں کہ سوائے ابوالکلام آزاد کے کسی دوسرے ادیب کے ہاں یہ حسن اشعار مشکل سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین صاحب نے نثر کی انگوٹھی میں اشعار کو نگینے کی طرح جڑ دیا ہے۔ اور بھی کئی پہلو ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن یہ سب پہلو میں آئندہ کسی وقت پیش کروں گا۔ فی الحال تو میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب کو ایسی اچھی کتاب پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں صحت کے ساتھ عمرِ دراز عطا فرمائے اور اس بصیرت افروز کتاب کے مصنف کو بصارت کی نعمت سے جلد سرفراز فرمائے۔

(خطبۂ صدارت جو ۲۲ فروری ۱۹۸۱ء کو شامِ ہمدرد کراچی کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خود نوشت سوانح عمری "گردِ راہ" کی تقریبِ اشاعت میں پڑھا گیا)

پروفیسر ممتاز حسین

ر ایک جھکے ہوئے مینارے سے زندگی کو دیکھنے کا رویہ تھا اور جس طرف مینارہ جھکا ہوا تھا وہ عوام کی زندگی کا رُخ تھا۔ محکومی کے بالمقابل آزادی، ظالم کے خلاف مظلوم کی طرف داری کا رخ تھا۔ یہ سوالات پہلی بار اختر حسین نے اپنی ادبی تنقید میں اٹھائے ورنہ جہاں تک ہماری شاعری کا تعلق ہے اقبال کی نظمیں، ملوکیت کے خلاف۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف، جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت کے جذبات کو مشتعل کر رہی تھیں۔ ع

گرما دُ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے

اور وہ سوزِ یقیں یہ تھا کہ ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر مداری گیا

اور پھر یہ پیغامِ حضر ع اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

اس آواز میں فرانسیسی انقلاب کے بین الاقوامی گانے کی لے کا اثر نمایاں تھا۔ (چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اختر حسین کے خیالات نئے تھے) مختلف سیاسی جماعتیں ان خیالات کو پھیلا رہی تھیں لیکن اُردو تنقید میں وہ خیالات ۱۹۳۵ء سے پہلے ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ (اس وقت تک اردو تنقید نیم رومانی اور نیم حالیاتی تھی۔ (اس تنقید میں انھوں نے کھنڈت ڈال دی) اس زمانے میں ایک انقلابی نعرہ اقبال کا یہ بھی تھا ؎

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

یا پھر مایاکوفسکی کی یہ آواز تھی:

گوئٹے کے تخیل سے زیادہ اہم میرے لیے اس تکلیف کا مداوا ہے
جو جوتے کے کاٹنے سے میرے پیر میں پیدا ہو گئی ہے

اب الٹرا ماڈرنزم یا انتہا پسندانہ لفٹ ازم کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا جو اس زمانے کے ترقی پسند مصنفین کی تحریروں میں بالعموم ملتی ہے اور جس کا اثر اختر حسین رائے پوری کے مضمون "ادب اور زندگی" میں نمایاں تھا۔

اقبال کی فکر پر نطشے کا اثر ہے وہ بے انتہا گہرا ہے کہ اسے مٹانا ممکن نہیں ہے اور یہ اثر پذیری کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے جس کے لیے معذرت کی ضرورت ہو۔ ۱۹۱۴ء سے لے کر پہلی جنگ عظیم کے زمانے تک نطشے کا سُپرمین انگریز مصنفین کے تخیل پر چھایا گیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندو پاک کی کئی شخصیتیں اس کے سُپرمین کے تخیل اور دوسرے تخیلات بالخصوص فلسفۂ قوت سے متاثر تھے۔ ان میں اقبال کے ساتھ ساتھ جوش اور فراق کا بھی نام لیا جا سکتا ہے۔ نطشے سے دوری ہٹلر کے زمانے میں شروع ہوئی جب کہ اس کے خیالات کو نازی ازم کا لباس دے کر پیش کیا جانے لگا۔ اس وقت سے نطشے کا نام لینا ایک گناہ بن گیا۔

لیکن اقبال کے یہاں نطشے سے اثر پذیری کا ایک دوسرا مسئلہ تھا۔ جب ان کی مثنوی "اسرارِ خودی" شائع ہوئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کے ایک انگریز دوست مسٹر ڈکنسن ——— DICKINSON ——— نے یہ لکھا کہ اس کا بنیادی خیال نطشے کے تصورِ خودی یا "ول ٹو پاور" یعنی حصولِ قوت کی قوتِ ارادی سے ماخوذ ہے اور اس مثنوی میں شتر یا شیر وغیرہ کی جو امیجری یا علامتیں استعمال ہوئی ہیں وہ نطشے کی تصنیف "بقول زرتشت" سے ماخوذ ہیں۔ ڈکنسن کی یہ بات علامہ اقبال کو سخت ناگوار گزری اور اس کے جواب میں انھوں نے یہ کہا کہ اس وقت تک تو میں نے نطشے کا مطالعہ بھی نہیں کیا تھا۔ مگر اس انگریز کا یہ الزام ان کا پیچھا کرتا رہا۔ سید نذیر نیازی اور اقبال کی جو گفتگو جرمنی سے شائع کی گئی ایک کتاب "MOHAMMAD IQBAL AND THE THREE REALMS OF SPIRIT"

میں شائع ہوئی ہے اس میں اقبال نطشے سے اپنی فکری مشابہت کو سطحی بتاتے ہیں، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ایک تجسیم، متحد یا علامت کو مختلف شعرا مختلف طریقوں سے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ فاؤسٹ کا نام لیتے ہیں۔ اس گفتگو سے یہ اثر مرتب ہوتا ہے کہ وہ نطشے سے استفادے کے منکر نہیں ہیں۔ اس کے برعکس اس کی پاس داری میں وہ اُسے ایک مسٹک مجذوب اور مصلح قرار دیتے ہیں اور اس کو نجات دہندہ یا پیر اپنے کو قرار دیتے ہیں۔ اسے مقامِ کبریا بتانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہ گفتگو ۱۹۳۷ء کی ہے۔ علامہ اقبال کا ایک مضمون ۱۹۱۰ء میں لکھنؤ کے نیو ایرا NEW ERA میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں وہ ہمیں یہ باور کراتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ نطشے کا سپرمین جو صرف مستقبل میں نہیں ہوگا بلکہ ماضی میں بھی رہا ہے۔ کم وبیش وہی "انسان" "شیرِ خدا" "رستمِ دستان" ہے جس کی آرزو رومی کو تھی ؎

دی شیخ باچراغ ہمی گشت گردِ شہر کزدام و دد ملولم و انسانم آرزوست

بہرحال اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انقلاب روس سے پہلے کے زمانے میں اقبال بلا خوف تردید نطشے کے خیالات سے متاثر تھے اور اس کے ثبوت مختلف قطعات اور اشعار سے پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن انقلاب روس کے بعد کے زمانے میں جب کہ ایک بہت بڑے خطۂ ارض میں ملوکیت اور سرمایہ داری کا سفینہ ڈوب گیا اور انھیں مزدوروں کی قوت دنیا میں اُبھرتی ہوئی نظر آئی تو اُن کی توجہ نطشے سے ہٹ کر کچھ کچھ مارکس اور لینن وغیرہ کی طرف مڑ گئی۔ ہر چند کہ امامت کے لیے انھوں نے رومی ہی کو منتخب کیا۔ چنانچہ ان کے ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء کے بعد کے زمانے کے کلام کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ اس دور میں انھوں نے اس اسلامی نظامِ معیشت اور اخلاق کی تبلیغ شروع کی جس کی اساس آیۂ العفو باُن کی اس تفسیرِ قرآنِ پاک میں ہے ؎

چیست قرآں، خواجہ را پیغامِ مرگ دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

اور اپنے خطبات میں اسلام کی جو تین بنیادی اقدار متعین کی ہیں، مساوات، حرّیت اور وحدتِ انسانیت، ان سے نطشے کی نظامِ اقدار کی مکمل نفی ہوتی ہے۔ اقبال کے یہاں نطشے سے گریز رموزِ بےخودی کی تصنیف کے زمانے ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ نیاز زیدی کے اس سوال کا جواب کیا نطشے کے یہاں کوئی تصور، سوسائٹی، معاشرے یا آدمی کی مجلسی زندگی کا ملتا ہے، اقبال نے نفی میں دیا اور یہ بالکل درست ہے کیونکہ نطشے کا فرد صرف یگانہ اور یکتا ہے، یونیک UNIQUE ہے وہ نوعی، سماجی یا یونیورسل نہیں ہے۔

میں یہ بات درمیان میں اس لیے لایا ہوں کہ "اقبال شناسی" ترقی پسند تنقید کا ایک اہم مسئلہ بن رہا ہے "ادب اور زندگی ... م" کے مقالے میں اگر میرا حافظہ خطا نہیں کر رہا ہے اختر حسین نے اقبال کی فکر میں جو NIETSHISM دریافت کی تھی اس کا دوسرا نام اس زمانے میں فاشسزم تھا کیونکہ ہٹلر نازی ازم کی تبلیغ نطشے کے فلسفے کے ذریعے کروا رہا تھا، وہ اقبال کے جزوی کلام کے مطالعے پر مبنی تھی نہ کہ ان کے کلّی کلام کے مطالعے پر۔ (چنانچہ اس زمانے میں ان کے ترقی پسند احباب نے اقبال سے متعلق ان کی رائے سے اختلاف بھی کیا تھا) مگر یہ بات آج سے ۴۵ سال پہلے کی ہے معلوم نہیں اس عرصے میں کتنی پرانی باتیں بدلی ہیں اور کتنی نئی باتیں پیدا ہوئی ہیں۔ یہ ایک سلسلۂ عمل ہے جو ہنوز جاری ہے۔ اقبال سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں نئے مواد کے سامنے آنے سے دور ہوتی جا رہی ہیں اور صحیح تصویر روز بروز اُبھرتی جا رہی ہے۔

اختر حسین رائے پوری نے جو کچھ اردو ادب کو تنقید، افسانے اور مضمون کی صورت میں دیا ہے وہ اردو ادب کا ایک ناقابلِ فراموش سرمایہ ہے۔ ان کا نام جدید اردو ادب کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے وہ اس ادب کے معماروں میں ہیں۔ انھوں نے ایک طویل خاموشی کے بعد ہمیں پھر چونکایا ہے۔ پیری میں شباب کی باتیں یاد کی ہیں "گردِ راہ"۔ گزشتہ ۵۰ ـ ۵۵ سال کے اہم سیاسی واقعات پر روشنی بکھیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جگہ جگہ ان کی اپنی ذاتی رائے اور تاثرات ہیں جن پر تبصرہ کرنا میں اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتا ہوں۔ اس میں بعض بعض

پروفیسر ممتاز حسین

شخصیتوں کی قلمی تصویریں بھی بہت اچھی ملتی ہیں۔ ان میں مولوی عبدالحق کی تصویر بہت ہی دل پذیر ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اختر حسین رائے پوری کی شخصیت میں جو مصنف چھپا ہوا تھا اُسے اُبھارنے میں دو شخصیتوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک مولوی عبدالحق نے اور دوسرے پنڈت بنارسی داس چترویدی نے۔ چنانچہ اگر آپ اختر حسین رائے پوری کو کریدیں گے تو ان دونوں کے خیالات کی نہیں ان کے لاشعور میں لطافتیں گی۔ مولوی عبدالحق سرسید اور حالی سے اپنی عقلیت پسندی میں کئی ہاتھ آگے تھے اور ان کی انسان دوستی حالی سے کچھ کم وسیع نہ تھی۔ یہی خصوصیات عقلیت پسندی اور انسان دوستی کی پنڈت بنارسی داس چترویدی میں بھی میں نے پائیں بس ان میں اور مولوی صاحب میں یہ فرق تھا کہ مولوی صاحب گرم اور نرم دونوں ہی تھے پنڈت چترویدی ایک بندہ فرشتہ تھے معلوم نہیں فرشتہ بندہ ہوتا ہے کہ نہیں بہرحال مثل تو یہی مشہور ہے کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔ ان دونوں کی رہنمائی میں اختر حسین نے تا دیر اپنی زندگی کا سفر طے کیا۔ پھر وہ ان دونوں سے آزاد ہو کر تلاش حقیقت اور تلاش حقیقت سے زیادہ حصول معاش کے تعلق سے ملک ملک سیر و سیاحت میں مشغول رہے۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ پڑھا، لیکن لکھا کم۔ انھوں نے اس زندگی میں کیا کھویا اور کیا پایا۔ کون اس کا حساب لگائے پھر یہ کہ زندگی کچھ حساب کم و بیش کی شے تو ہے نہیں کیونکہ مرنے والا اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے جاتا ہے۔ زندگی تو ایک پیمانِ وفا ہے اور اس پیمانِ وفا میں انھیں دست تہ سنگ ہی پایا لیکن کبھی تنگ دست نہ دیکھا۔ قسمت اُن کی یاوری کرتی رہی۔ اب جو آخر آخر یہ سوانح حیات بول کر لکھوائی ہے تو کھُل کر تو اس میں کچھ کم ہی کہا ہے۔ پھر بھی بہت سی ناگفتنی باتیں بھی کہہ گئے ہیں۔ لیکن ایک شکایت ہے اپنے معاصر ادیبوں کا ذکر تو بہت ہی کم کیا ہے۔ شاید اس لیے کہ باہر باہر رہنے کی وجہ سے ان سے ملنے کا انھیں بہت کم موقع ملا۔ ویسے وہ دیر آشنا اور خلوت نشین بھی ہیں —

بہرحال جو کچھ بھی لکھوایا ہے وہ خاصا دلچسپ ہے۔ اس کو پڑھنے میں ایک ناول کے پڑھنے کا لطف ملتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے جہاں ہمیں بہت کچھ ان کی شخصیت کے گوشوں میں جھانکنے اور ان کی شخصیت کی تعمیر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے وہاں ان کے دور اور ان کے زمانے کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ مکتبۂ افکار کی یہ ایک قابلِ تحسین پیش کش ہے۔ اس کی کچھ داد صہبا لکھنوی کو بھی ملنی چاہیے —

(۲۲ رفروری ۱۹۸۴ء کو زیرِ اہتمام ہمدرد کراچی کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خود نوشت سوانح عمری "گرد راہ" کی تقریب اشاعت میں پڑھا گیا)


viceroy
Parfum Talcum Powder
world famous french fragrance that separates you from the crowd.
وائسرائے
پرفیوم ٹالکم پاؤڈر
دنیا کی شہرت یافتہ فرانس کی خوشبو
جو آپ کو دوسروں سے منفرد کرتی ہے
Parfum

7/85


First ever
FPCCI
worsted yarn
BEST EXPORT
PERFORMANCE
TROPHY
1984
FPCCI
worsted yarn
BEST EXPORT
PERFORMANCE
TROPHY
1985
ایکسپورٹ کے اوّل انعام
ثناء اللہ کے نام
ABC
Cashmira
BLANKETS
ABC
KNITTING
YARNS
SANAULLA
CARPET
YARNS
SANAULLA
CARPET YARN
Plush Mink
BED SPREADS
SANAULLA
WEAVING
YARNS
انٹرنیشنل کوالٹی وولن اور ایکریلیک
مصنوعات بنانے والے
SANAULLA
وولن ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
تیسری منزل، پینوراما سینٹر، فاطمہ جناح روڈ، کراچی۔ 4۔ پاکستان
پی او بکس 8631 کراچی۔ 4
ٹیلیکس: 24899 ثناپاک
فون 516034 & 516035
کیبل۔ اے بی سی وول، کراچی۔

انجم اعظمی

ایک عہد آفریں کتاب

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی "گرد راہ" ایک عہد آفریں کتاب ہے۔ ایک زمانے میں "ادب اور انقلاب" کی دھوم تھی۔ ادب کا کارواں ایک نئے موڑ سے آگے چل پڑا تھا۔ "ادب اور انقلاب" کے ذریعے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ادب کے اس کارواں کی رہنمائی کی۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک بڑی مدت انھوں نے بیرونی دنیا میں گزار دی۔ یورپ، امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں رہے وہاں علمی اور تعلیمی مشغلہ تو جاری رہا۔ لیکن ادب کی طرف سے بے توجہی رہی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دوبارہ کراچی میں مستقل قیام ہوا تو اپنی یادداشت کو آزمایا، کھنگالا اور "گرد راہ" لکھی جو ان کی عمر بھر کی سیر و سیاحت کا نچوڑ ہے۔

میں اس کتاب کو شروع سے آخر تک کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ اکثر کتابیں ایک بار بھی بڑی مشکل سے پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن اس کتاب کا سحر کم نہیں ہوتا۔ اس سحر انگیزی کی ایک وجہ تحریر کی دل کشی ہے تحریر کی شگفتگی اور دل کشی کا سبب زبان کی سادگی، بیان کا اختصار اور رمزیت کا حسن ہے جو بات دو جملوں میں بیان ہو سکتی تھی اسے پوری کتاب میں کہیں بھی ڈاکٹر صاحب نے دو جملوں سے زیادہ میں بیان نہیں کیا ہے۔ جزئیات نگاری کا بے جا طول ان کے مزاج ہی میں نہیں ہے۔ وہ آرائش اور نمائش کے بھی قائل نہیں ہیں۔ وہ بات کے ہر پہلو پر غور کرتے ہیں اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں اس کے بعد سادگی سے لکھ دیتے ہیں جھوٹ میں بڑی پیچیدگی ہوا کرتی ہے اس کے مقابلے میں سچ میں کوئی پیچ نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں زبان کی سادگی میں زندگی کی سچائیاں عکس ریز ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جیسے اندھیری رات میں شمعیں قطار در قطار جلتی چلی جائیں اور آنکھوں میں ٹھنڈک بن کر اترتی جائیں۔ اسی طرح ان کی زبان کی سادگی دل میں سکون بن کر اترتی ہے محمد علی صدیقی نے "افکار" کے بعض اداریوں میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جدید زندگی اور علوم کی پیچیدگی کی وجہ سے زبان میں بھی پیچیدہ طرز اظہار ناگزیر ہو گیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری زندگی کی پیچیدگیوں کو سادگی اور سہولت سے بیان کر دیتے ہیں جس سے ان کی فکر کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ نازک مقامات سے گزرتے ہوئے انھوں نے رمز و اشارہ اور تلمیح کا سہارا لیا ہے۔ ان کی زبان کی سادگی، بیان کے اختصار اور رمزیت میں ٹھہراؤ بہت ہے۔ تحریر میں ضبط اور ٹھہراؤ کی یہ کیفیت جیسی ان کے یہاں ملتی ہے، مجھے اس پورے عہد میں کسی نثر نگار کے یہاں نظر نہیں آتی۔ یہ حرف آغاز ہے۔

"جب دن ڈھلنے لگتا ہے تو سامنے دھندلکا ہوتا ہے وقت پیچھے رہ جاتا ہے اور ماضی سائے کی طرح پاؤں سے لپٹ جاتا ہے۔"

"جمہوریت سے مراد حکومت پر جمہور کا اختیار اور اشتراکیت سے مراد اقتصادی وسائل پر جمہور کی حکمرانی ہے۔"

"تاریخ خیر و شر کی مسلسل کش مکش کا ڈرامہ ہے۔"

جب خدا انسان سے اور انسان خدا سے روٹھ گیا تو شاعری اس عظمت سے ہٹ گئی جہاں رومی نے اسے پہنچایا تھا۔

ان کی تحریر زبان کی سادگی، بیان کے اختصار اور رمزیت کے حسن سے مالا مال ہے۔ اور ضبط اور ٹھہراؤ کی کیفیت کے سبب اعلیٰ معیار کی حامل ہے۔

اس کتاب کی سحر انگیزی کا دوسرا سبب زندگی کی وہ حکایت ہے جو ڈاکٹر صاحب نے درمیان سے سُنی ہے ایک شعر کے حوالے سے کہتے ہیں کہ انھیں زندگی کی ابتدا اور انتہا نہیں معلوم۔ لیکن زندگی کی اس حکایت کو انھوں نے جس شوق سے سنا ہے اور زندگی سے جیسی گہری وابستگی رکھی ہے اسی طرح اس کی حکایت سنائی ہے اور زندگی سے اپنی اس وابستگی کو کتاب کے حرف حرف میں پرو دیا ہے۔ کچھ عرصے سے سوانح نگاری کی طرف بہت توجہ دی گئی ہے۔ لیکن بیشتر افراد واقعات اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ان کی ذاتی اہمیت میں اضافہ ہو اس کے لیے کچھ واقعات اختراع کر لیے جاتے ہیں اور بعض سچے واقعات کا بیان بھی لکھنے والے کی ذہنی پیچیدگی کے سبب بے مزہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے جھوٹی کہانیوں کے بجائے زندگی کی سچائیوں کو اس انداز سے لکھا ہے کہ قاری بڑی آسانی سے اس حقیقت تک پہنچ جاتا ہے کہ اپنے سارے اتار چڑھاؤ اور غم و آلام کے باوجود زندگی کی حکایت ہی سب سے دل کش اور حسین ہوتی ہے۔ اور اس انداز کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے "میں" کے بجائے اپنے مطالعے، مشاہدے اور تجربے کو قلم بند کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ تحریریں "میں" کہاں نہیں ہوتا لیکن اس کا ذکر زیادہ ہو تو تحریر پر رقت طاری ہو جاتی ہے الفاظ گریہ کرنے لگتے ہیں اور معروضی طرز اختیار کیا جائے "میں" کا ذکر کم سے کم ہو تو "میں" اپنی پوری آب و تاب سے ابھرتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اس رمز سے آشنا ہیں۔ انھوں نے حکایت ہستی کے بیان میں معروضی طرز اظہار کو اپنایا ہے اور اسے چابک دستی سے برتا ہے اسی لیے ان کی زندگی کی حکایت بیسویں صدی کے ایک باہوش اور دل والے انسان کی بھی حکایت ہے اور خود بیسویں صدی کی بھی حکایت ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے اسلوب پر ان کے دو استادوں کا گہرا اثر ملتا ہے۔ وہ رشید احمد صدیقی اور پروفیسر محمد حبیب سے متاثر ہوئے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی سے انھوں نے ایسے جملے اختراع کرنے سیکھے جو نگینے جڑنے کے فن کی مثال ہیں۔ جگر مراد آبادی کے بارے میں لکھا۔

"ترک مے نوشی کے بعد کسی میں ایسا نکھار آتے نہ دیکھا اور نہ کسی بدشکل کو ایسا دل ربا پایا۔"

مجاز اور اختر شیرانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"دونوں کسی اصلی یا خیالی معشوق کی تلاش میں جام بکف سرگرداں رہے اور جب جوانی کا نشہ اترا تو جام سفال ان کے ہاتھوں سے گر کر چور چور ہو گیا۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"کچھ وقت میں نے میرزا حاتم بیگ کے ساتھ جوہر شناسی میں گزارا اور کھرے کھوٹے کی جو پہچان ہو گئی وہ اب تک نہیں بھولا۔"

ایک اور اقتباس :

"چراغ حسن حسرت اور مظفر حسین شمیم کی اخبار نویسی نے ان کی شاعری اور شاعری سے دلچسپی نے اخبار نویسی کو نقصان پہنچایا۔"

ن۔م۔ راشد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ایک نئی آواز سنائی دی جس میں ابہام کے باوجود دل فریبی تھی اور نا معلوم سمتوں میں گونجنے کی صلاحیت تھی۔"

ان جملوں کی ساخت میں رشید احمد صدیقی کے کمال فن کی جھلک ملتی ہے لیکن مجھے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے علاوہ کوئی دوسرا ادیب نظر نہیں آیا جس نے رشید صاحب کے اس فن کو آگے بڑھایا ہو اور اپنے اسلوب کا حصہ بنا سکا ہو۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ رشید احمد صدیقی نے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں ایسے بلیغ جملے لکھے ہیں جو لوگوں کے پورے پورے تنقیدی مضامین پر بھاری ہیں۔ اختر حسین رائے پوری نے رشید صاحب کی اس روایت سے وابستہ ہو کر اپنی زبان کو ایسی جلا دی ہے جو بہت کم ادیبوں کا نصیب بنتی ہے۔

پروفیسر حبیب سے انھوں نے تاریخ کو سمجھنے کا سلیقہ اپنایا ہے۔

"جب کانگریس کے اجلاس میں نہرو رپورٹ منظوری کے لیے پیش ہوئی تو اس کی تمہید میں کہا گیا تھا کہ نصب العین برطانوی سلطنت میں ڈومینین کی حیثیت کا حصول ہے۔ سبھاش چندر بوس نے اس میں ترمیم کی کہ نصب العین مکمل آزادی ہے اور اپنی تقریر میں برطانوی استبداد اور مظالم کا ایسا قلع قمع کیا کہ سب انگشت بدنداں رہ گئے اور مولانا محمد علی نے فرط جوش میں ان کی پیشانی چوم لی جواہر لال نہرو نے مصلحت شناسی سے کام لیا اور غیر جانب داری اختیار کر لی۔"

"سی آر داس، سبھاش چندر بوس اور راج گوپال اچاریہ تین ایسے وسیع النظر لیڈر تھے جو مسلمانوں سے مصالحت کی راہ نکال سکتے تھے لیکن سی آر داس کی اچانک موت اور باقی دونوں کی کانگریس سے بے تعلقی کے بعد اس کی کوئی صورت نہ رہی۔"

ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے سلسلے میں اختر حسین رائے پوری ایک جگہ لکھتے ہیں :

"مسلم لیگ سے ان کی وابستگی کو پنڈت نہرو نے معاف نہ کیا اور تقسیم کے بعد میں نے انھیں دہلی میں بیماری اور عسرت کے دن کاٹتے دیکھا۔"

"تہذیبوں کو جاگیردار بورژوا اور پرولتاری کے کنٹوپ نہیں اڑھائے جا سکتے ان کا جوہر ہر انقلاب زمانہ کے بعد بچ رہتا ہے وہ انسانیت کے سیہ خانے کو اجالتا اور آگے کا راستہ بھاتا ہے۔"

اس اقتباس کو غور سے پڑھیے۔ اس میں تاریخ کی نظر اور اسلوب کی جو ندرت ہے اس میں پروفیسر حبیب اور رشید احمد صدیقی کے اثرات یک جان ہو کر ڈاکٹر صاحب کے مضبوط دل نشیں، سادہ اور بلیغ اسلوب کے اجزائے ترکیبی بن گئے ہیں۔

تاریخ کا علم ادب سے مختلف ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ادب سے بھی گہرا رشتہ جوڑا ہے اور تاریخ سے بھی ان کی وابستگی گہری ہے۔ اور "گرد راہ" لکھتے وقت انھوں نے اپنی دونوں بصیرتوں سے کام لیا ہے۔ نہ ذوق جمال کو کہیں ہاتھ سے جانے دیا ہے اور نہ تاریخ کی بصیرت کو۔ اسی لیے ان کے تبصرے بے لاگ ہیں کھرے ہیں ان میں تاریخ کی گہری نظر کام کر رہی ہے اور زندگی سے دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے واقعے کا رس نچوڑ لیا ہے۔ یہ ان کے ذوق جمال کا کرشمہ ہے۔ گہری سنجیدگی کے

ساتھ ان میں جو کھلنڈرا پن ہے وہ بھی اسی ذوق جمال کا حصہ ہے۔ یہی کھلنڈرا پن انسانوں میں زندگی کے عذاب سہنے کا حوصلہ جگائے رکھتا ہے۔ سیر و سیاحت کا اصلی مزا بھی اسی کا فیض ہوتا ہے۔ روڑھے انسانوں کو کیا معلوم کہ زندگی کی رنگا رنگی کیا ہوتی ہے اور اس کا لطف کیا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنے کھلنڈرے پن کے سبب زندگی کی رنگا رنگی سے پورا پورا لطف اٹھایا ہے۔ اور سیر و سیاحت کی ایسی عکاسی کی ہے کہ بعض مقامات پر قاری تمام تر سحر کے زیر اثر ہوتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے کا پیرس ہو یا گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا افریقہ ہو۔ زندگی دریا کی طرح ٹھاٹھیں مارتی نظر آتی ہے۔ سنسان پیرس کی ویران سڑکوں پر انسانی نصب العین جاگتے نظر آتے ہیں اور افریقہ کے گھنے جنگلوں کے وحشی قبائل کے بدلتے ہوئے آداب سے انسانیت کے مستقبل کی روشنی پھوٹتی ہے۔۔

زندگی کی رنگا رنگی کا ایک پہلو ایڈونچر ہیں۔ کچھ کتابیں صرف ایڈونچر پر لکھی جاتی ہیں ان میں بے حد مبالغہ ہوتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان واقعات کو بیان کیا ہے جو یا تو انسانی فطرت کے ایک خوش گوار پہلو کے ترجمان ہیں کہ انسان کو کبھی کبھی معمولات سے ہٹے ہوئے حالات سے دلچسپی ہوتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اچانک غیر معمولی صورت حال سے دوچار ہو جاتا ہے۔

"دوسرے دن ان کے ساتھ میں نے اور سنت کمارنے جوگیا کپڑے پہنے۔ ہم آٹھ دس جوگی ہاتھوں میں کشکول لیے اپنے سردار قافلہ کے پیچھے بھجن گاتے ہوئے پولیس چوکی تک پہنچے تھے کہ کسی نے پکار کر کہا "یہی وہ لڑکے معلوم ہوتے ہیں"

"میں نے کشتن لبلا اور اس زناصر کی تعریف میں تقریر کی پھر سازکی گت پر تھرکنے لگا کہ اس نے جھونکا بھرا تو پاؤں کے انگوٹھے میں پھنس کر دھوتی کھل گئی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ لنگوٹی رہ گئی۔ یہ نامعقول دھوتی باندھنے لگا تو بس نے ڈانٹا کہ یہاں اگر عورتیں بے لباس ناچتی ہیں تو تم کیوں شرماتا ہے۔ اس نے میری بات رکھ لی اور ننگ دھڑنگ وہ دھما چوکڑی مچائی کہ سب عش عش کرتے رہ گئے"

"ہرن کی کھال بچھائے کمبل اوڑھے سادھو اسی میں لیٹا اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں رہتا تھا چیتے کا بھٹکا ہوا بچہ یہیں کہیں ملا تو اسے پال لیا اور وہ اس سے اتنا ہل گیا تھا کہ دن بھر کی سیر کے بعد شام کو اس کے پاس لوٹ آتا۔ میں نے پوچھا۔ یہ دنیا تج کر تمھیں کیا ملا۔ تو اس نے جواب دیا کہ دنیا میں رہ کر تم نے کیا حاصل کیا"

"گرد راہ" کے یہ تین حوالے اختر حسین رائے پوری کی زندگی کے تین مختلف ادوار سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلا واقعہ لڑکپن کا ہے، دوسرا پیرس یونیورسٹی کا جب اختر حسین رائے پوری تاریخ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے وہاں گئے تھے۔ تیسرا کشمیر کی سیر کو جاتے ہوئے پیش آیا۔ جب وہ زندگی کی رزم گاہ سے کچھ وقت نکال کر کشمیر کے حسن فراواں میں کھو جانا چاہتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے کسی موڑ پر زندگی کے انوکھے واقعات اور ایڈونچر سے اپنی دلچسپی کو کم نہیں ہونے دیا۔ ذوق جمال کے ساتھ ساتھ مجھے اس دلچسپی میں ان کی وہ گہری بصیرت بھی نظر آتی ہے جس نے ایڈونچر کے بہانے ہمیشہ ان کے حوصلوں کو جگائے رکھا۔

افریقہ کے قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب کا واسطہ ایک ایسے ملازم سے پڑا جو نیم دیوانہ تھا۔

"اگلی بہار آئی۔ درختوں میں شگوفے کھلنے لگے۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہوا البشیر نے جھپٹ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ البشیر نے درشت آواز میں کہا۔ آپ مجھے ملازمت سے برطرف کرنا چاہتے ہیں' میں نے کہا میاں تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ نے میرے الاؤنس میں اضافے کی سفارش کیوں نہیں کی۔ میں نے جواب دیا تمھارا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے اس سفارش کی

نقل بھی فائل میں موجود ہے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی، الشیر نے چٹخنی کھولی۔ میں نے باہر نکل کر وزیر تعلیم یوسف کنا دید کو اس واقعے کی اطلاع دی ان کے چوب داروں نے بڑی حکمتِ عملی سے الشیر پر قابو پایا۔"

"جب ہوٹل میں سناٹا ہو گیا تو الشیر چپکے سے چھرا لیے میرے کمرے کی طرف بڑھا۔ کمرے کے دروازے پر وہ آکر کھڑا ہی ہوا تھا کہ ہوٹل کے ملازموں نے اسے پکڑ لیا۔"

یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے جو اچانک زندگی کے کسی موڑ پر رونما ہوا۔ ایسا ہوتا ہے۔ اسے بیان کرنے کا ایک مقصد ہے تاکہ زندگی کے اتار چڑھاؤ کو آدمی بہتر طور پر سمجھ سکے۔ ڈاکٹر صاحب خواب دیکھنے والے آدمی ہیں لیکن زندگی کو اس کی تمام برکتوں کے ساتھ ساتھ ان سفاکیوں کے ساتھ قبول کرتے ہیں جن سے مفر نہیں ہے انھوں نے زندگی کی دشواریوں اور مصائب کے درمیان اپنے لیے راہ نکالی۔ انھوں نے زندگی کے کسی موڑ پر اپنے اوسان خطا نہیں ہونے دیے۔ نہ مصائب کے دوران، نہ نازنینوں کے جھرمٹ میں۔ ان کی زندگی کا لائحۂ عمل "توازن" ہے۔ میں ان سطور میں یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب میں نے "گرد راہ" پڑھ کر میز پر رکھی تو محسوس ہوا کہ میں نے کتاب کے بجائے میز پر لمبا طالم لپیٹ کر رکھ دی ہے۔ عظیم شخصیتوں اور بیسویں صدی کے پیچیدہ حالات کے طوفان سے گزر کر میں سکون سے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کتاب سے بڑی ہماری زندگیوں کی کوئی گواہی نہیں۔

" فرانس کے عظیم دانشور "سارت" (سارتر) سے جب میرا تعارف یہ کہہ کر کرایا گیا کہ میں جنگ سے پہلے پیرس یونیورسٹی کا طالب علم تھا تو انھوں نے فوراً پوچھا اس پیرس اور آج کے پیرس میں تم کیا فرق پاتے ہو۔ میں نے بلا تامل جواب دیا۔ آج کی زندگی میں قدروں کا نام و نشان نہیں ملتا۔ سارت نے ہنس کر جواب دیا "انسان کی نظر میں کپڑے دھونے کی مشین قدروں سے زیادہ مفید ہے۔"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے دنیا میں ہونے والی بہت بڑی تبدیلی کا گواہ اس عہد کے عظیم فلسفی سارتر کو بنایا ہے۔ ایک طرف زبردست سائنسی ترقی ہے جس پر ہمارے عہد کا بھولا انسان نازاں ہے دوسری طرف قدروں کا نام و نشان تک نہیں ملتا جس پر تمام عظیم روحیں بے چین ہیں۔ لیکن ہمارے کام کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے تضاد کے مد مقابل ڈاکٹر صاحب نے اپنے توازن پر حرف نہیں آنے دیا۔ اس بڑے عظیم تضاد کو نہ صرف یہ کہ سادگی سے بیان کر دیا ہے بلکہ زندگی پر اپنے ایمان کو سلامت رکھا ہے۔

"صدر کینیڈی کی اہلیہ جیکولین بزعم خود آرٹ کی ماہر بنتی تھیں، پیرس کے دل آویز کلیسا "نوترے دم" کی زیارت کو گئیں اور ڈیگال سے کہا اس عمارت کی تعمیر میں کثیر رقم صرف ہوئی ہوگی، ڈیگال نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس کی تعمیر میں ہزاروں سال کی تہذیب صرف ہوئی ہے۔"

جیکولین کے ایک جملے سے زندگی کے بارے میں امریکی نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے جو صدیوں پرانا یہودی نقطۂ نظر ہے جس کی وجہ سے انھوں نے کبھی اپنے پیغمبروں اور نبیوں کا سچا احترام کرنا نہیں سیکھا اور ڈیگال کا ایک جملہ ماضی، حال و مستقبل کو ملا دیتا ہے۔ زندگی کے جس موڑ پر ہم ہیں وہاں قدروں کا نام و نشان باقی نہیں رہا ہے لیکن صدیوں کی تہذیب اور انسانی روایت اس صورت حال پر غالب آجائے گی۔

جدید دنیا اس اعتماد سے خالی نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جو بربادی ہوئی اس میں جرمنی اور جاپان کے بارے میں کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنی جلد نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے بلکہ ترقی کی راہ میں دوسروں کو پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ جاپان نے تو سائنسی اور تکنیکی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی طور پر بھی اپنے کو بہت مضبوط رکھا ہے۔ اس کے علاوہ عہد حاضر کی دانش بہر حال ڈاکٹر صاحب کے لکھے ہوئے ان الفاظ سے بے نیاز نہیں ہے۔

" انسان نے فطرت کے اس قانون کو منسوخ کر دیا کہ اس دنیا اور اس کے وسائل پر سب انسانوں کا مساوی حق

ہے اور دولت کی منصفانہ تقسیم ممالک کے درمیان اتنی ہی ضروری ہے جتنی ملک کے اندر۔"

وسائل پر انسانوں کے مساوی حق کے شعور اور معاشی ناانصافی میں سرد اور گرم جنگ جاری ہے۔ قدروں کی شکست و ریخت کی ایک بڑی وجہ معاشی ناانصافی ہے۔ مغرب نے قدروں کے انکار پر جدید فلسفے کی عمارت تعمیر کی ہے۔ چلیے اچھا ہوا - - - - - - - - - - - - - - - - - - ۔ قوت انکار کو آزمایا گیا ہے تو ہو سکتا ہے کل کو اقرار و اثبات کی منزل بھی آئے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے جمہوریت اور اشتراکیت کے حق میں ووٹ دے کر بھی اپنے ذہن کو کھلا رکھا ہے۔ کیونکہ ابھی حکومت پر جمہور کا اختیار اور معاشی وسائل پہ جمہور کی حکمرانی کہیں بھی نہیں ہے۔ اور ممکن ہے اپنا ذہن کھلا رکھنے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب مجھ سے اتفاق کریں کہ جمہور کو انارکی اور غلامی سے بچتے ہوئے آزادی کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے اپنی معاشی اور جبلّی سطح سے بلند ہو کر کسی ایسے مربوط اخلاقی دائرے میں قدم رکھنا ہوگا جہاں انسانی رشتے فطری بھی ہوں اور منطقی بھی۔

ڈاکٹر صاحب سے بعض لغزشیں بھی ہوئی ہیں۔ نہ ہوتیں تو حیرت ہوتی۔ انسان ہیں تو انسانی کمزوریوں سے کہاں تک بچیں گے۔

"کالج میں حاضری اور خانہ پُری کے لیے جاتا تھا کیونکہ کلاس میں بیٹھ کر نہ وہاں اور نہ علی گڑھ میں میں نے کچھ سیکھا۔ ذہنی اعتبار سے کلاس میں ہمیشہ آگے رہا۔"

"دراصل میرے کردار میں ایسا استغنا ہے کہ مشفق ہو یا معشوق، مطلب کی بات نہیں کی جاتی۔"

باتیں دونوں درست ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ذہنی اعتبار سے ہمیشہ اپنے ہم جماعتوں سے بہت آگے تھے۔ اپنے ہم عمروں سے ادب کے میدان میں بھی آگے ہی رہے۔ اور ان کے مزاج میں استغنا بھی ہے۔ ان کی کمزوری صرف اتنی ہے کہ ان کا ذکر اس سادگی سے نہیں کر سکے جیسے بقیہ پوری کتاب لکھی ہے اور سچ پوچھیے تو نئی زمانہ شریف سے شریف آدمی اتنا بگڑ چکا ہے کہ ان جملوں پر کسی کی نظر ہی نہیں جائے گی۔ اس کے علاوہ ہمارے جدید تر ادبی ماحول، ناموں اور کتابوں کے ذکر سے انھوں نے گریز کیا ہے۔ یا ممکن ہے اس طرف دھیان نہ گیا ہو۔

خودنوشت کے باب میں بہت سارے لوگ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اپنی کمزوریوں کے اشتہار کا نام خودنوشت ہے۔ حالانکہ زندگی کے رزمیے میں بھرپور شرکت کے بعد اس کی داستان رقم کرنے کا نام خودنوشت ہے۔ "گردِ راہ" اسی معیار کی حامل ہے۔ بچپن، لڑکپن، جوانی، عمر کا بڑھاپا۔ برصغیر اس کے مختلف علاقے اور شہر۔ وہاں کی بود و باش اور لوگ۔ سیاسی، سماجی، معاشی حالات۔ عالمی صورت حال۔ فکر و فن۔ اور عالمی شخصیتیں۔ انقلابات۔ یہ سب کچھ "گردِ راہ" میں موجود ہے۔ روحِ عصر موجود ہے اور ان سب کے ساتھ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ان کی روح کی توانائی، علم، تجربے، مشاہدے اور مستقبل کے خواب حرف حرف میں گندھے ہوئے موجود ہیں۔

وہ کل بھی حقیقت کے جویا تھے، آج بھی حقیقت کے متلاشی ہیں۔ حقیقت کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ حرفِ آخر تک ایک سوالیہ نشان ہیں۔ تلاش جاری رہے گی۔

خودنوشت کے باب ختم ہوئے۔ زندگی کے نئے باب وا ہوتے رہیں گے۔ اپنے تسلسل میں بھی اور اس عہد آفریں کتاب کے حوالے سے بھی۔

پروفیسر نظیر صدیقی

گردِ راہ ۔۔۔ ایک غیر معمولی کتاب

گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر اردو ادب میں دو بڑی تحریکیں چلیں جو مجموعی طور پر نہایت مفید نتائج اور دور رس اثرات کی حامل تھیں۔ ان میں سے پہلی تحریک سید احمد خاں کی تحریک کے نام سے جانی جاتی ہے اور دوسری ترقی پسند تحریک کے نام سے۔ ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ایک نہایت اہم نام سجاد ظہیر کا ہے جنھوں نے اس تحریک کی سب سے پہلی اور مفصل تاریخ 'روشنائی' کے نام سے لکھی تھی۔ اس اہم کتاب میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ

> "۱۹۳۶ء یا شاید اس سے بھی کچھ پہلے اختر حسین رائے پوری نے اپنا مشہور مضمون 'ادب اور زندگی' لکھا جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالہ اردو میں شائع ہوا۔ میرے خیال میں یہ ہماری زبان میں پہلا مضمون ہے جس میں مبسوط اور مدلل طریقے سے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق کی ضرورت بتائی گئی اور پرانے ادب کی رجعت پسند قدروں کی تشریح کر کے اس کی سخت مذمت کی گئی۔ اس اہم مضمون کے مصنف کی حیثیت سے اختر حسین رائے پوری کو اردو کے ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں اولیت حاصل ہے۔"

جب کسی تحریک کا ایک اہم بانی کسی دوسرے کو اس تحریک کے بانیوں میں اولیت کا درجہ دے تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کتنی اہم شخصیت کا مالک ہے۔ ترقی پسند تحریک کے معاملے میں اختر حسین رائے پوری کی بنیادی یعنی ۔۔۔ ۔۔۔ حیثیت کا اعتراف اس تحریک کے سب سے ممتاز نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری اور اس تحریک کے سب سے بڑے شاعر فیض احمد فیض نے بھی کیا ہے اور بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے کہ

> "اُن کے عہد آفریں مضمون 'ادب اور زندگی' ترقی پسند تنقید کا سنگ بنیاد ثابت ہوا۔"

اختر حسین رائے پوری کے بارے میں فیض نے لکھا ہے کہ

> "آپ نے ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دنوں میں اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا اور اس تحریک کے سربرآوردہ اراکین میں شامل رہے۔"

سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری اور فیض احمد فیض کے اقتباسات سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ترقی پسند تحریک کے مسلمہ پیش رو بھی ہیں، بانی بھی اور رہنما بھی۔ اردو ادب کی تاریخ میں اُن کے زندہ رہنے کے لیے ان کی یہ حیثیت کافی تھی ۔۔۔

جہاں تک اُن کی ادبی تخلیقات کا تعلق ہے ان کا عہد آفریں مضمون "ادب اور زندگی" بھی اُنھیں ناقابلِ فراموش بنانے کے لیے کافی تھا۔ لیکن اُن کے کارنامے اور بھی ہیں۔ وہ صرف اردو کے ادیب نہیں، ہندی کے ادیب اور سنسکرت کے عالم بھی ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں انھوں نے سنسکرت کے مشہور ڈرامانگار کالی داس کے سب سے مشہور ڈراما "شکنتلا" کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے بنگلہ زبان کے انقلابی شاعر قاضی نذرالاسلام پر "پیامِ شباب" کے نام سے کتاب لکھ کر اردو ادب کو نذرالاسلام سے روشناس کرایا تھا۔ مجنوں گورکھپوری کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین نے اردو زبان کو مغربی اور بالخصوص روسی ادب سے بھی روشناس کرایا۔ اس سلسلے میں انھوں نے گورکی کی شہرۂ آفاق آپ بیتی کی تینوں جلدوں کے ترجمے اردو میں شائع کیے۔ ترجمے کے سلسلے میں ان کا ترجمہ "پیاری زمین" بھی قابلِ ذکر ہے جو مشہور امریکی ناول نگار پرل بک کے ناول "گڈ ارتھ" کا ترجمہ ہے۔ ترجمے اور تنقید سے پہلے انھوں نے افسانے بھی لکھے جن کے دو مجموعے "محبت اور نفرت" اور "زندگی کا میلہ" ۱۹۳۸ء اور ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا افسانہ "برگد کا درخت" اردو کے نہایت اہم افسانوں میں سے ہے۔

لیکن اس تمام کارکردگی اور ان تمام کارناموں کے باوجود ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ہمارے ذہنوں سے تقریباً اوجھل ہو چکے تھے جس کا ایک سبب تو وہی تھا کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ وہ ایک طویل عرصے تک اپنی منصبی ذمے داریوں کے سلسلے میں پاکستان سے باہر رہے۔ اس دوران میں انھوں نے نہ تو اردو رسالوں میں کچھ لکھا نہ ان کی کوئی کتاب چھپی اور نہ ان کی نایاب کتابوں کے نئے ایڈیشن منظرِ عام پر آئے۔ زمانہ یوں بھی کسی کو یاد رکھنے سے زیادہ بھول جانے کا قائل ہے۔ اردو ادب میں اپنے محسنوں کو یاد رکھنے اور ان کی یادوں کو مختلف طریقوں سے تازہ رکھنے کی روایت بھی کچھ زیادہ استوار نہیں۔

ڈاکٹر اختر حسین شہرت اور اہمیت کی نعمتوں سے کبھی محروم رہے۔ شروع سے وہ بڑوں کی صحبتوں میں رہے اور انھوں نے دنیا کے بڑے بڑوں کی صحبتیں اٹھائیں۔ یوں بھی وہ اُردو ادیبوں کی اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو شہرت و اہمیت کے لیے نہ کسی بیساکھی کا سہارا لیتی تھی نہ کوئی لابی رکھتی تھی، نہ اپنے پروپیگنڈے میں وقت ضائع کرتی تھی۔ ایسے لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور جب اپنے عہدے سے سبک دوش ہوتے ہیں تو فراموش اور گم نام سبک دوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین بھی ایسا ہی کر رہے تھے کہ صہبا لکھنوی نے ان کی زندگی میں مفید مداخلت کی۔ انھوں نے ڈاکٹر اختر حسین کو آپ بیتی لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ چونکہ وہ ضعفِ بصارت کے باعث لکھنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے اس لیے انھوں نے اپنی آپ بیتی اپنے ہاتھ سے نہیں لکھی بلکہ اپنی زبان سے لکھوا دی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی یہ لکھوائی ہوئی کتاب بھی اپنے اسلوب و انشا کے اعتبار سے کتنی مربوط و مزے دار کتاب ہے اور مواد و متن کے اعتبار سے کتنی مرتب اور منظم تصنیف۔ کتاب کا نام بھی نہایت عمدہ تجویز کیا گیا ہے "گرد راہ"۔

اس کتاب کو ڈاکٹر اختر حسین کی خود نوشت سوانح عمری کہنا کچھ زیادہ صحیح نہ ہوگا۔ یہ خود سوانحی - - - - - - - - AUTOBIOGRAPHICAL - ضرور ہے لیکن خود نوشت سوانح - AUTOBIOGRAPHY نہیں ہے۔ اس آپ بیتی میں جگ بیتی کا رنگ زیادہ ہے۔ یہ ان کے ذہنی اور روحانی سفر کی ایک روداد ہے سو وہ بھی مختصر اور نامکمل۔ اس کا اختصار اور اس کی نا تمامی ان کی بعض مجبوریوں اور معذوریوں کا لازمی نتیجہ ہے۔ بقول انھیں کے ناسازگار حالات نے کئی گفتنی مضامین کو بھی ناگفتہ رہنے دیا۔

اس کے باوجود اس کتاب کا ہر صفحہ پڑھنے کے قابل ہے اور ہر صفحے میں کچھ ایسی باتیں محفوظ ہو گئی ہیں جو کہیں اور نہیں مل سکتیں

ڈاکٹر اختر حسین صرف قلم کے دھنی نہیں قسمت کے بھی دھنی ہیں۔ انھیں قدرت اور زندگی نے بڑے عمدہ اور نادر مواقع سے نوازا۔ انھوں نے ایک خوش حال گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اچھی تعلیم پائی۔ پیرس کی سوربون یونیورسٹی سے ڈاکٹر کی سند حاصل کی۔ ہندوستان کے بہترین تہذیبی مرکزوں پر زندگی کے مختلف ادوار گزارے۔ ملک سے باہر نکلے تو مشرق و مغرب کے بے شمار اہم ممالک سے گزرے۔ ہندوستان اور پاکستان میں اچھے عہدوں پر رہے۔ پھر یونیسکو جیسے بین الاقوامی ادارے میں ایک جلیل القدر منصب پر فائز ہوئے۔ ہندوستان، پاکستان اور بیرونی ممالک میں بیسویں صدی کی ممتاز ترین ادبی، ثقافتی اور سیاسی شخصیتوں میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن سے ان کے دوستانہ یا نیازمندانہ تعلقات نہیں رہے۔ برصغیر کی شخصیتوں میں ان کے روابط گاندھی، نہرو، ٹیگور، مولانا ابوالکلام، علامہ اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس بخاری)، ڈاکٹر عبدالحق، سر شیخ عبدالقادر، پروفیسر عبداللہ چغتائی، آغا حشر، سید سلیمان ندوی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ن۔م۔ راشد، مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر سید حسین، ڈاکٹر تارا چند، پریم چند، مولانا صلاح الدین احمد، شاہد احمد دہلوی، چراغ حسن حسرت، سعادت حسن منٹو، اسرار الحق مجاز، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، ڈاکٹر تاثیر، سجاد ظہیر وغیرہ اور مغربی شخصیتوں میں پکاسو، پابلو نیرودا، آلڈس ہکسلے، خالدہ ادیب خانم اور کتنی ہی نامور ہستیوں سے ان کے تعلقات رہے ہیں جن کا تھوڑا بہت عکس 'گرد راہ' میں موجود ہے۔ لیکن ہر عکس جاذب توجہ۔

خالدہ ادیب خانم کے بارے میں ڈاکٹر اختر حسین ایک جگہ لکھتے ہیں:

"پاکستان کے تصور کو مغرب سے متعارف کرنے کا سہرا خالدہ ادیب خانم کے سر بندھا . . . . جب ۱۹۳۸ء میں کتاب INSIDE INDIA کا نیا ایڈیشن لندن میں چھپنے لگا تو اس کی پریس کاپی خانم نے مجھے پڑھنے کے لیے دی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کا ایک باب چودھری رحمت علی کے منصوبے اور پاکستان کے بیان کے لیے وقف تھا۔ میرے سوال پر خالدہ ادیب خانم نے جو کچھ کہا وہ ذہن پر نقش رہ گیا۔

"ہندوستان کی سب سے بڑی حقیقت اشتراکیت نہیں قومیت ہے۔ اور اس کا خمیر کسی وحدت سے نہیں بنا ہے بلکہ یہ ہندو مسلم تہذیبوں کی کش مکش کی مظہر ہے۔ اگر ہندوستانی مسلمان اس انجام سے بچنا چاہتے ہیں جو سات سو سال کی حکومت کے بعد اسپین میں عربوں کا یا چار پانچ سو سال کی حکومت کے بعد بلقان میں ترکوں کا ہوا تو آزاد مملکت کی تشکیل کے سوا ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں۔"

ڈاکٹر اختر حسین نثر نگار ہیں۔ انھوں نے شاعری کبھی نہیں کی۔ لیکن ان کا ذوقِ شعر نہایت عمدہ ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ کلاسیکی شاعری اور جدید شاعری دونوں سے لطف اندوز ہوئے اور ان کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ 'گرد راہ' میں کہیں کہیں انھوں نے دونوں قسم کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے جو ان کی خوش ذوقی اور سخن شناسی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مثلاً انھوں نے شاد عظیم آبادی، عظمت اللہ خاں اور ن۔م۔ راشد کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اُس کی صحت سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ مجاز کو مجاز بنانے میں ان کی دوستانہ نکتہ چینی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین نے جب اپنا عہد آفریں مقالہ 'ادب اور زندگی' لکھا تھا اس وقت وہ ایم۔ اے کے طالب علم تھے اور اپنے زمانے کے ایک برافروختہ نوجوان بھی AN ANGRY YOUNG MAN بھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس مقالے میں علامہ اقبال سے ان کی آخری ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر کسی نے ان کا تعارف علامہ اقبال سے ان الفاظ میں

کرایا کہ یہ آپ کی شان میں سخن گسترانہ باتیں لکھ گئے ہیں۔ اس پر علامہ نے کمال شفقت سے فرمایا:

"۔ ایسے مخلص نوجوانوں کی میں قدر کرتا ہوں۔ بے جان لوگوں کے اتفاق پر جاندار لوگوں کے اختلاف کو ترجیح دیتا ہوں۔"

علامہ اقبال کے اس جواب کو نقل کرنے کے بعد ڈاکٹر اختر حسین لکھتے ہیں کہ:

"اس وقت میں نے اقبال کا کلام جستہ جستہ پڑھا تھا۔ اب انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کی شاعری اور شخصیت کا اقرار کر دوں۔ غمِ دوراں کا ایسا نوحہ خواں اور عظمتِ انسان کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہ ہوا۔"

ڈاکٹر اختر حسین کی یہ ذہنی رواداری، وسیع المشربی، انصاف دوستی، بے تعصبی یا اپنے تعصبات سے بلند تر ہونے کی کوشش "گرد راہ" میں جا بجا نظر آتی ہے۔ انھوں نے زندگی کو بندھے ٹکے نظریات کی عینک سے نہیں دیکھا ہے۔ وہ اپنے عقائد اور نظریات میں ترمیم کرنے پر ہمیشہ آمادہ رہے ہیں۔ وہ ایک کھلے ذہن کے آدمی ہیں۔ انھوں نے زندگی کو مارکس اور فرائڈ کے فارمولوں سے الگ ہو کر بھی دیکھا ہے۔ وہ حیات و کائنات کے پُراسرار یا ناقابلِ تشریح ہونے کا احساس رکھتے ہیں۔ ویسے وہ ایک تجزیاتی ذہن کے مالک ہیں اور "گرد راہ" میں ان کی تجزیاتی صلاحیت کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔ فلسفے سے انھیں کوئی شاعرانہ لگاؤ نہیں، لیکن ان کی شعوری زندگی کا آغاز کچھ فلسفیانہ سوالوں ہی سے ہوا تھا۔ جب وہ میٹرک کے طالب علم تھے ان کے ایک استاد نے انھیں اس بات کا قائل کر دیا تھا کہ کائنات کا کوئی خالق ضرور ہے۔ البتہ انھیں ان سوالوں کا تسلی بخش جواب ابھی تک نہ ملا کہ خالقِ کائنات کا منشا کیا ہے اور زندگی کا مقصد کیا ہے۔؟ ان دو سوالوں کا تشفی بخش جواب تو خیر آج تک کسی بھی مفکر کو نہیں ملا۔ زیادہ سوچیے تو یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر اس کائنات کا کوئی خالق ہے تو وہ کہاں سے آیا ہے اور کیوں کر آیا ہے—!

دنیا کے سارے فلسفے مل کر بھی شاد عظیم آبادی کے اس شعر سے آگے نہیں جاتے کہ ؎

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے یہ کتاب لکھ کر اور صہبا لکھنوی نے ان سے لکھوا کر اردو ادب پر احسان کیا ہے "گرد راہ" ایک نہایت معلومات افزا، بصیرت افروز اور فکر انگیز کتاب ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ ایک غیر معمولی کتاب ہے۔

محمد خالد اختر

اختر حسین کی گردِ راہ

'گردِ راہ' پیہم درخشاں زندگی کا بچپن ہے۔ اس کا مصنف جانتا ہے کہ ایک آدمی اس دنیا میں درس دینے نہیں آیا، منصب ذات لوگوں میں شادی کرنے، روپیہ کمانے، بنگلہ بنانے، یا یادگار کتابیں لکھنے کے مقصد سے نہیں آیا۔ وہ یہاں دوسروں کا دکھ محسوس کرنے، خوب صورتی اور تابانی، اور دردمندی سے جیون کا سفر بتانے اور اس وقتی میلے کی رونقوں میں بھرپور طور پر شریک ہونے کو آیا ہے۔ اور اگر وہ ان جذبوں سے کورا ہے تو بہتر تھا کہ اس نے اس حیرت ناک دنیا میں آنکھ ہی نہ کھولی ہوتی۔ مصنف کے نزدیک گہرا اپنی ذات کا اظہار اہم ہے۔ مگر اچھی طرح جینا اس سے بھی اہم ہے۔

یہ پڑھنے والے کی توجہ کو جذب کرنے والی آپ بیتی کئی لحاظ سے ایک حیران کن کتاب ہے ..... شاید اردو زبان کی دلچسپ ترین آپ بیتی جو جدید دور میں کسی نے لکھی ہے۔ یہ ایک قندھاری انار کی طرح رسیلی اور بھری پُری ہے .... یہ محض آپ بیتی نہیں ہے۔ جگ بیتی بھی ہے..... یادداشتوں کی کتاب بھی۔ نصف صدی کی ادبی، سیاسی، ثقافتی، تہذیبی، داستان بھی۔ اور نابغۂ روزگار ہستیوں کے چلتے پھرتے مرقعوں کا رنگ محل بھی۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ایک نادر انسان ہیں اور انھوں نے ایک نادر کتاب لکھی ہے۔

کتاب کے دل پذیر اور عالمانہ حرفِ آغاز سے پڑھنے والا مصنف کے دام میں آجاتا ہے۔ اس کے کئی پیرے جونکا دیتے ہیں اور ہم جان لیتے ہیں کہ ہم اک بے حد دردمند انسان، تربیت یافتہ ذہن کے مالک، دنیا کے شہری کی رفاقت میں ہیں جس کی باتیں دل بھانے والی بھی، اور عقل و دانش سے پُر ہیں۔ ان پیروں کو یہاں پورے کا پورا درج کرنا تو ممکن نہیں، مگر چند اِدھر اُدھر سے اٹھائے ہوئے فقروں کو نقل کیے بغیر بھی نہیں رہا جا سکتا جن سے مصنف کی ذہنی افتاد اور اسلوبِ فکر کی غمازی ہوتی ہے۔

"گوتم بدھ کے ایک شاگرد نے کہا "آپ نے سب کچھ بتایا، لیکن یہ معمّا حل نہ کیا کہ آفرینش سے پہلے کیا تھا اور موت کے بعد کیا ہوگا۔ گوتم بدھ نے کہا کہ اس طلسم کی کلید انسان کے پاس نہیں۔ اس کا مقدر فقط یہ ہے کہ حیاتِ مستعار کے مسائل کو سمجھے اور حل کرے یعنی بقول کارل مارکس فلسفی زندگی کو سمجھنے میں بہت سر کھپاتے ہیں ...... اصل مسئلہ اسے بدلنے کا ہے۔"

"اس شکست و ریخت میں انسان کی تعمیر کے دو ستون باقی ہیں۔ جمہوریت اور اشتراکیت، ایک کے بغیر دوسرے کا تصور تشنہ ہے۔ فرد کا جواز فرد کی اصلاح ہے۔ میرا ذہن جمہوریت پر سرمایہ داری کے تسلط کو مسترد کرتا ہے،

"حسن رضوی اس بات پر اپنی فکر کی بنیاد رکھتے ہیں کہ
مشرقی ذہن کو بالعموم اور اسلامی ذہن کو بالخصوص نقاد اور شاعری نے دو نقصان پہنچایا کہ ایک نے تنقید کی
صلاحیت کو اور دوسرے نے اس کے اظہار کو مسدود کر دیا ہے۔ شاعری کی لغت محدود ہے کیونکہ یہ
اصل عالم ہے دری کی نہیں، محبوب کی مدحت ہے۔ اس کا مقصد گفتگو نہیں سرگوشی ہے۔۔۔"
"۔۔۔ جب ادبیت اور شرارت کی گرد حاصل ہونے لگی تو زندگی اور خطِ آواز اور سرگم، لفظ و معانی کا ربط ٹوٹنے
لگا۔۔۔ ہم ایک بے صدا بے رنگ بے معنی دور میں داخل ہو گئے۔۔۔"
"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ذہن کو یا دہ نقصان ہم جوانمردی سے پہنچا ہے۔۔۔"

اختر حسین اس عالمِ رنگ و بو میں ۲ جون ۱۹۱۲ء میں آئے۔ وہ بیدر تور ہے پور (متوسط ہند) میں ہوئے، مگر اُن کے والد
اکبر حسین کا تعلق شہر کے ایک پُرانے خاندان سے تھا۔ اکبر حسین علی گڑھ کالج اور ٹامسن انجینئرنگ کالج سے فارغ التحصیل تھے اور محکمہ آب پاشی
میں ایک اچھے عہدے پر فائز۔ اختر حسین تین سال کے تھے کہ والدہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اُن کے ایک بھائی اور تھے، منظر حسین نسیم،
ان سے تین سال بڑے۔ والدہ سے وراثت میں دو گاؤں اور اچھی خاصی شہری جائداد دونوں بھائیوں کے حصے میں آئی جس میں سے بہت
سی ان کے رشتے دار کھا پی گئے۔ ایک آپا، پیرن جی نے دونوں بھائیوں کو پالا پوسا۔ جب ان کے والد اکبر حسین نے دوسری شادی کر لی تو
وہ اپنے لڑکوں سے دور ہو گئے اور انھیں اپنے حالوں چھوڑ دیا۔ اکبر حسین خوب مرے کے آدمی تھے۔ آزاد خیال، وسیع المشرب، رنگین مزاج،
شطرنج کے کھلاڑی، قوم پرست، "الہلال" اور "کامریڈ" کے خریدار۔ اختر کو چھے سال کی عمر میں مکتب میں داخل کیا گیا۔ قرآن شریف کا درس
شروع ہوا تو مولوی صاحب کے پیچھے پڑ گئے کہ انھیں عربی عبارت کے معنی بھی بتائیں۔ مولوی صاحب کو طیش آ گیا اور کہنے لگے بڑے
بڑوں کی سمجھ میں خدا کا کلام نہیں آتا، تیری سمجھ میں خاک آئے گا۔ اختر کی افتادِ طبع بچپن سے یہ تھی کہ جب تک اُن کا دماغ قائل نہ ہوتا،
کسی دعوے کو قبول نہ کرتے تھے۔ انھوں نے مکتب جانے سے انکار کر دیا۔ لوگوں نے کہا باپ تو علی گڑھ میں پڑھ کر نیچری ہو گیا تھا۔
بیٹا بھی نیچری رنگ پکڑ رہا ہے۔ ان کے والد اکبر حسین پر اس واقعے کا اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے بیٹے کو اردو نہیں۔۔۔ بلکہ ہندی کے
پرائمری اسکول میں داخل کر دیا۔ وجہ یہ بتائی کہ جب ہندو اردو، فارسی پڑھنے سے دریغ نہیں کرتے تو مسلمان ہندی کیوں نہ پڑھیں۔
اس سے پتہ چلتا ہے کہ باپ بیٹا فطرتاً کرٹیل، باغی اور شیشی طبیعت کے تھے جو اپنا جھنڈا الگ اٹھا کر چلتے تھے اور اس بات سے بے پروا
تھے کہ لوگ ان کے متعلق کیا سوچتے اور کہتے ہیں۔ وہ ان مرنجاں مرنج مصلحت کوش اور دھیمے لوگوں میں سے نہ تھے جو زندگی کے راستوں
پر بیچ بچا کر چلتے ہیں اور جو اپنی راہ کے بغیر پانی کی طرح گزر جاتے ہیں اور اسی پھیکی، سطحی، بے رنگ زندگی گزار کر اس دنیا سے
رخصت ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے اپنے والد کے بارے میں بہت تفصیل سے نہیں بتایا۔ جو کچھ بتایا ہے وہ کافی ہے۔ مجھے اکبر حسین ایک دل کش
شخصیت لگتے ہیں جو خود اس قابل ہیں کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے۔ بیٹا بھی اپنے باپ سے مختلف نہیں۔ وہ دونوں ہتھیار ڈالنا نہیں
جانتے۔ مگر میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ بیٹے میں حالات کا سامنا کرنے کی قوت کچھ زیادہ تھی۔

اسکول میں اختر نے بہت تھوڑے عرصے میں ہندی میں اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی۔ پھر مطالعے کا جنون سوار ہوا اور کتابوں
کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے۔ ایک مندر کی لائبریری دریافت کر لی اور اس کی سب ہندی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ تاریخ سے انھیں رغبت
تھی۔ اس لائبریری کی طلسماتی اور جاسوسی نوعیت کی کتابوں میں انھیں نپولین بونا پارٹ کی زندگی پر ایک کتاب مل گئی، جسے انھوں نے

بار بار پڑھا۔ جب وہ ساتویں میں تھے تو ان کے مطالعے کا رخ اردو اور انگریزی کتابوں کی طرف ہو گیا۔ اسکول کی تعلیم ختم کرنے تک وہ انگریزی کتابوں کے رسیا ہو گئے۔ جب وہ سولہ سال کی عمر میں میٹرک کے امتحان سے امتیاز کے ساتھ فارغ ہوئے تو انھیں انگریزی، ہندی اور اردو پر اچھا خاصا عبور حاصل ہو چکا تھا۔ ان کے والد اکبر حسین نے قبل از وقت پنشن لے لی تھی اور مہینوں کے لیے ان کی سوتیلی ماں کے پاس پٹنے چلے جاتے۔ عملی طور پر وہ بیٹوں کی زندگی سے نکل چکے تھے ...... ان کے مستقبل سے بے نیاز۔ اکبر حسین جو دنیاوی معاملات اور کاروبار سے ناواقف تھے، اپنی جمع شدہ عمر بھر کی پونجی کا بیشتر حصہ ایک جنگل کے ٹھیکے میں گنوا بیٹھے اور قلاش ہو گئے۔ گاؤں اور زمین کا نظام انھوں نے ایک مختار کے سپرد کر دیا جس نے سب مختاروں کی طرح خوب ہاتھ رنگے۔ جو کچھ وہ دے دیتا یہ چپکے سے لے لیتے اور خود گاؤں میں داخلے کی ہمت کبھی نہ ہوئی۔ جب بھوک کا بھیڑیا دروازے پر منڈلانے لگا تو اکبر حسین نے بیٹے کو ایک ملازم بہشتی میاں کے ہمراہ بیل گاڑی پر گاؤں روانہ کیا اور اس جائداد کے سنبھالنے کی ذمہ داری بیٹے پر ڈال دی۔ وہاں مفلوک الحال کسان جو 'مالک' کا انتظار کر رہے تھے۔ اُن کے پاؤں پر جھکے، جس نے اختر کو دکھی اور پس ماندہ انسانوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اختر کے بڑے بھائی پہلے ہی تعلیم و معاش کی خاطر کلکتے جا چکے تھے۔ اب میٹرک کے بعد اختر نے بھی علم کی تلاش میں وہاں جانے کا قصد کیا۔ والد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بولے: "میری بھی یہی آرزو ہے کہ تم اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرو لیکن میں فی الحال اس قابل نہیں کہ تمھاری کچھ مدد کر سکوں۔" اکبر حسین نے بیٹے کو والدہ کی جائداد سنبھالنے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی تلقین کی۔ یہ نصیحت کرکے وہ گویا سب ذمے داریوں سے سبک دوش ہو گئے۔ انھوں نے گھر سے بیٹے کو دو سو روپے دیے اور اختر دو سو روپے جیب میں ڈالے، قسمت آزمائی کرنے ریل سے کلکتے روانہ ہو گئے۔ چند ماہ تو سیر سپاٹے اور بے فکری میں گزارے جب باپ کے دیے روپے ختم ہو گئے تو فکرِ معاش نے آن دبوچا۔ کیونکہ بھائی کی آمدنی کم تھی۔ ہندی میں اپنے مطبوعہ مضامین کے تراشے اور غیر مطبوعہ مضامین کے مسودے لے کر ہندی کے سب سے مقبول روزنامے 'وِسوامتر' کے دفتر جا دھمکے۔ انھوں نے جونیئر ایڈیٹری کی درخواست دے دی۔ اور پنڈت مول چند اس کی ہندی دانی اور ذہانت سے بھونچکے رہ گئے اور انھیں رکھ لینے کی ہامی بھر لی۔ گو ایک مسلمان کا ایک ہندی روزنامے میں کام کرنا اَن ہونی بات تھی۔ مول چند نے انھیں کام دیا اور اختر نے اپنی خداداد لیاقت اور ذہانت سے انھیں گرویدہ کر لیا ... یہیں سے ان کی ... تعلیم کا آغاز ہوا۔

میرا ارادہ یہاں اختر حسین کی آپ بیتی کا مکمل خاکہ دینے کا نہیں۔ اس کے لیے پڑھنے والے کو اس حیرت ناک کتاب کا خود مطالعہ کرنا پڑے گا۔ مگر 'پڑے گا' شاید صحیح لفظ نہیں کیوں کہ یہ اس قسم کی کتابوں میں سے ہے جو خود اپنے آپ کو پڑھواتی ہیں۔ یہ راتوں کی نیند حرام کر دینے والے ایک ناول سے زیادہ دلچسپ داستان ہے ..... اور اختر سے بہتر اس داستان کو کون بیان کر سکتا ہے؟ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے یہ آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی اور ان وقتوں کی تاریخ اور تہذیبی دستاویز بھی ہے۔ ان کی زندگی کی کہانی کا سلسلہ ان پُربصیرت دلچسپ سیاسی اور اخلاقی نوعیت کے تذکروں سے بار بار ٹوٹتا ہے۔ مگر یہ ٹکڑے جگ بیتی میں اس طرح گندھے ہیں کہ اختر حسین نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتے۔ ان ٹکڑوں سے اس دور کی سیاست کا رنگ صفائی سے اور شوخی سے سامنے آتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سیاست سے شوق انھیں اپنے والد اکبر سے ورثے میں ملا۔ اخبار میں کام کرنے اور ان موضوعات پر لکھنے سے ان کا اسلوب منجھا اور انھیں حالات کو سوئی کے سے تیکھے نوکس سے دیکھنے اور مجمل روشن نثر میں بیان کرنے کا ملکہ حاصل ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ اخبار میں کام کرنا ایک تخلیقی ادیب کے لیے بڑی اچھی تربیت ہے اور اس سے اس کی اوریجنل صلاحیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ ہیمنگوے کی مثال ہمارے سامنے ہے جو بھی

اختر حسین کی گرد راہ

[illegible] حسرت اور ابن انشا بنیادی طور پر اخباری لوگ تھے۔

[illegible] کی ایک گیدڑ بھبکی ہے۔ دو چار تیکھے رواں جملوں میں وہ اُن جانے
[illegible] کلکتہ ہمدمی اخبار میں کام کرتے تھے ان کی رہائش
[illegible] کمرے میں تین دوست منظر حسین شمیم چراغ حسن حسرت
[illegible] رپورٹر ہوتا اور رضا نقوی کے شور سے
[illegible] حریت کا راستہ، بڑھے چلو، بڑھے چلو، حسرت
[illegible] جیسے حریت نام کی کوئی دوشیزہ منڈیر پر بیٹھی ہو۔
[illegible] اشارہ کرتے [illegible] بنگالی پڑھنے بولنے لگے۔ انھوں نے
[illegible] صلاحیت تھی۔ چند ماہ میں [illegible]
[illegible] ہے۔ اس طرح وہ اردو سے قریب آتے گئے۔
[illegible] اردو کے ادیب ہے۔ پھر بی۔ اے کے پہلے زینے پر پہنچ کر
[illegible] دوستوں سے مل کر 'پیام' کے نام سے ایک
[illegible] یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ علی گڑھ جاتے ہی انھوں نے چند [illegible] سر راس مسعود وائس چانسلر تھے۔
[illegible] علی گڑھ میں بیداری اور آزاد خیالی کی رو دوڑے۔
[illegible] اسرار الحق مجاز کا یہاں ان سے سارا ہوا۔ مجاز بہت پرانے انداز کی
[illegible] کے کان میں پھونک دی اور ان کے کہنے سے مجاز نے اپنی راہ بدلی اور نظم لکھنے لگے۔ مجاز کی پہلی نظم
غزل سرائی کرتے تھے۔ [illegible] سے بیزار تھے اور ان کے کہنے سے مجاز نے اپنی راہ بدلی اور نظم لکھنے لگے۔ مجاز کی پہلی نظم
[illegible] اسٹیشن کی سیر کرنے گئے تو ریل گاڑی کے تیسرے درجے کے ایک ڈبے کے
دروازے کی کالا لال، کی نشان مرد [illegible] ہے۔ دونوں دوست [illegible] بیٹھی تھی کہ خواب
[illegible] کانوں میں پیتل کا بالا، پھٹے حالوں اس آن بان سے بیٹھی تھی کہ خواب
آگے ٹھٹھک گئے۔ [illegible] دونوں دوست اس پر درود و سلام بھیجتے ہوئے
[illegible] انھیں نگاہ غلط انداز سے حدا حافظ کہا۔ او [illegible]
[illegible] نظم لکھنے کو کہا اور اس کے چند ہفتے بعد مجاز نے انھیں [illegible] رات اور ریل، کا مسودہ
لوٹے۔ اختر حسین [illegible] پہلی بار شراب [illegible]
دکھایا۔ [illegible] نے ان کی محبت میں [illegible] کی دعوت کی تھی [illegible] ہوسٹل لے آئے۔
[illegible]
چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ [illegible] اختر حسین کو مجاز اور اختر حسین رائے پوری دونوں کی شخصیت اور شاعری
اس کے بعد [illegible] مصوم لوگ نہیں دیکھے۔ علی گڑھ
میں حیرت ناک مماثلت نظر آتی ہے اور انھوں نے [illegible] ان دونوں سے زیادہ محروم اور معصوم لوگ نہیں دیکھے۔ علی گڑھ
میں ان کے استاد [illegible] تھے جنھوں نے انھیں تاریخ اور کلاسیکی ادب کا صحیح ذوق بخشا اور ان کی شوریدہ
سری کو لگام دی۔ [illegible] نیاز صاحب کے نگار میں چھپا۔ ۱۹۳۲ء کی گرما میں کلکتے میں آغا حشر
سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ بقول ان کے آغا صاحب کے طبع جارت [illegible] وہ سودا اور انشاء اللہ خاں کے سوا
اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے [illegible] علی گڑھ میں طالب علمی کے دوران یہ اور سبط حسن دلّی جا پہنچے اور کسی
طرح پنڈت جواہر لال نہرو کو علی گڑھ آنے پر راضی کر آئے۔ وائس چانسلر سر راس مسعود کو بعد میں پتہ چلا کہ یہ حرکت ہوئی ہے۔ جس طرح
انھوں نے پنڈت جی کو اسٹیشن [illegible] اور عملی طور پر ایک نامعلوم موٹر گاڑی میں اغوا کر کے لے گئے۔

وہ واقعہ بہت دلچسپ ہے اور پنڈت جی ہمیشہ اسے یاد کرکے ہنسا کرتے تھے۔ علامہ اقبال سے وہ ڈاکٹر انصاری کے گھر جاکر ملے اور ان کی خوب سمع خراشی کی۔ وہ بے لطف نہ ہوئے اور بوقت رخصت تاکید کی کہ لاہور آؤ تو مجھ سے ملو۔ جب ان کی ملاقات دوبارہ ۱۹۳۶ء میں پانی پت میں ہوئی (جب ان کا مقالہ "ادب اور زندگی" علامہ پڑھ چکے تھے) تو کسی نے ان کا تعارف علامہ سے ان الفاظ میں کرایا کہ یہ آپ کی شان میں سخن گسترانہ بات لکھ گئے ہیں۔ علامہ نے شفقت سے کہا: "ایسے مخلص نوجوانوں کی میں قدر کرتا ہوں۔ بے جان لوگوں کے اتفاق پر جان دار لوگوں کے اختلاف کو ترجیح دیتا ہوں۔" کچھ کم دو سال کا عرصہ اختر حسین نے حیدر آباد اور اورنگ آباد میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی نگرانی میں لغت نویسی میں گزارا۔ اور انھوں نے مولوی صاحب کے شب و روز کا حال جس مزے اور لطف سے لکھا ہے اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ مولوی صاحب کے مکان پر باہر سے آنے والے عالموں اور دانش وروں کی گہما گہمی رہتی تھی اور ان کا دسترخوان وسیع تھا۔ شعرائے کرام ان کی مہمان نوازی سے محروم رہتے تھے۔ کیوں کہ عہد حاضر کے اردو شعرا میں مولوی صاحب اقبال کے سوا کسی کو جانتے نہ تھے۔ ایک دن ڈاک میں مولوی صاحب کے نام "نیلی چھتری"، "بہرام کی گرفتاری" وغیرہ جاسوسی ناولوں کے مشہور مصنف ظفر عمر کا خط آیا، جو پولیس کے اعلیٰ افسر تھے۔ علی گڑھ سے چلتے وقت اختر حسین ان کی صاحب زادی حمیدہ کے خواست گار ہوئے جس پر ظفر عمر بڑے ناراض ہوئے مگر فیصلہ مولوی صاحب پر چھوڑ دیا۔ مولوی صاحب نے انھیں وہ خط دکھایا اور پوچھا "کیا تم اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" اختر حسین کے اقرار کرنے پر مولوی صاحب بولے "شادی کی ذمے داری تم نہیں جانتے، تمھارا تجربہ کیا ہے، عمر کیا ہے؟" اختر حسین بولے: "وقت کے ساتھ یہ ذمے داری اٹھانے کا تجربہ ہو جائے گا۔ آپ کو میری ثابت قدمی پر بھروسہ ہے تو سفارش کر دیجیے۔" مولوی صاحب کی سفارش پر ان کا گھر آباد ہو گیا اور جب تک ان کی بیوی حیدر آباد میں رہیں، مولوی صاحب نے ان سے بیٹی کا سا سلوک کیا۔ اس قصے کے آخر میں اختر حسین نے ایک خوب صورت جملہ لکھا ہے:

"حمیدہ میری رفیقۂ حیات ہیں اور گو میں تاعمر پتنگ کی طرح دور دور اڑتا رہا لیکن انھوں نے نہ ڈور چھوڑی، نہ پتنگ کٹنے دی۔"

حیدر آباد میں وہ اس حیرت ناک خاتون مسز سروجنی نائیڈو کے دولت کدے پر بھی آنے جانے لگے۔ مسز نائیڈو کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر جیسوریہ سے جنھیں سب بابا کہتے تھے، ان کی خوب دوستی ہو گئی اور بابا نے انھیں مغربی موسیقی کی لذت سے آشنا کیا۔ اس وقت تک وہ موسیقی کے کوچے میں نہ آئے تھے۔ بابا غیر مقلد اشتراکی تھے۔ اور حیوانوں کے عاشق۔ ان کے چھوٹے فلیٹ میں چرند پرند امن و آشتی سے رہتے تھے۔ یہی شوق مولوی عبدالحق کو تھا۔ حیدر آباد میں وہ باغِ عامہ جاکر ایک شیرنی کے دو نوزائیدہ بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ جب وہ اورنگ آباد میں نگرانِ تعلیم تھے انھوں نے ایک السیشن کتا پالا تھا جس سے انھیں بڑا انس تھا۔ ایک بار ایک شکاری جنگل سے ننھی سی شیرنی پکڑ لایا اور مولوی صاحب کو دے گیا۔ جب شیرنی بڑی ہو گئی تو مولوی صاحب کو بھی اس سے لگاؤ ہو گیا۔ مگر شیرنی کو السیشن کتا زہر لگتا تھا اور کتے کو بھی شیرنی کی صورت اور وضع قطع سے نفرت تھی۔ مولوی صاحب نے اپنے دونوں محبوب حیوانوں میں صلح کرانے کے سب جتن کیے مگر وہ نہ مانے۔ ایک دن موت السیشن کتے کو شیرنی کے پنجرے کے قریب لے گئی۔ (پہلے وہ اکثر پنجرے سے کچھ دور کھڑے ہو کر شیرنی کو گھورا کرتا تھا) شیرنی نے پنجے سے اس کی گردن کو پکڑ کر اس طرح مروڑا کہ کتا مر گیا۔ مولوی صاحب کو اتنا افسوس ہوا کہ انھوں نے پھر جانور نہ پالنے کا عہد کیا۔ مولوی صاحب کی پیرانہ سالی پر طفلانہ معصومیت کا پرتو باقی رہا۔ اور وہ اصلاً بھولے بھالے آدمی تھے۔ ایک دن اختر حسین قاضی عبدالغفار سے ایک کتیا مانگ لائے جس کے نرم نرم سفید

کالے اور گھنگریالے بال تھے اور آنکھیں مہر و وفا میں تیرتی تھیں۔ مولوی صاحب نے اسے پال لیا اور اختر حسین کے پُرزور احتجاج کے باوجود نازی اس کا نام رکھ دیا۔ اختر حسین نے سوچا میں کیوں پیچھے رہوں وہ بھی مسز سروجنی نائیڈو کے ہاں سے ایک کالا کلوٹا بلونگڑا اٹھا لائے کیونکہ مسز نائیڈو نے انھیں یقین دلایا تھا کہ ان کی حسین و جمیل سیامی بلّی کا فرزند ہے۔ اختر حسین نے مولوی صاحب کے مشورے بغیر اس بدصورت بلونگڑے کا نام 'لاما' رکھ دیا۔ نازی اور لاما کے دل کبھی ایک دوسرے کی طرف مائل نہ ہوئے۔ بعد میں لاما گھر سے ناراض ہو کر چلا گیا اور آوارہ بلوں کی ایک ٹولی کا مکھیا بن گیا۔ مولوی صاحب نے ایک دفعہ ہرن بھی پالے۔ جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو کتب خانے کے برآمدے میں کھڑے دیر تک ان وحشیوں کو تکتے رہتے اور میر کا یہ شعر پڑھتے ؎

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے ان اچھی آنکھوں والوں کا

کتاب میں ایسے قصّے جگہ جگہ جواہر کی طرح ٹنکے ہوئے ہیں جنھیں پڑھ کر جی شاد ہوتا ہے اور دل نہیں بھرتا۔ اختر حسین کو یہ گزری ہوئی باتیں اتنی اچھی طرح یاد ہیں جیسے وہ کل کی باتیں ہوں۔ ان کا حافظہ بلا کا حافظہ ہے۔

اُن کی زندگی کی کہانی جاری رہتی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں وہ ڈاکٹریٹ کرنے کی خاطر اپنی حوصلہ مند شریکِ حیات حمیدہ کے ہمراہ یورپ کا پہلا سفر کرتے ہیں۔ اس غرض کے لیے وہ انگلستان نہیں جاتے کیونکہ انگریز کی محکومی کا انھیں اتنا احساس ہے کہ اس کے ملک میں رہنا تک انھیں گوارا نہیں۔ وہ پیرس جاتے ہیں کیونکہ فرانس کی فضا آزاد ہے اور اس غریب پرور شہر کے لیٹن کوارٹر کے ایک ہوٹل میں کرائے پر رہتے ہیں۔ جیسے ان سے پہلے ارنسٹ ہیمنگوے وہاں رہا کرتے تھے۔ وہ پیرس کے جادو تلے آجاتے ہیں۔ یہاں امتیاز اور برجیش سنگھ جنھوں نے آگے چل کر اسٹالن کی بیٹی سوتیلانا سے بیاہ رچایا ان کی زندگی میں آئے۔ (برجیش سنگھ جو پکّے اشتراکی تھے اپنی رندِ مشربی اور رشب باشی کے باوجود ماسکو میں جا مرے اور سوتیلانا ان کی راکھ ہندوستان لے کر آئی۔) وہ یہاں ہمّت سنگھ 'فیروز گاندھی' اور جلا وطن ترکی ادیبہ خاندہ ادیب خانم سے بھی ملتے رہے۔ فرانسیسی میں وہ چند ماہ میں رواں ہو گئے اور جب زبان کے وسیلے سے ان کی فرانسیسی ادب تک رسائی ہوئی، تو ان کی سمجھ میں آیا کہ فرانسیسی نثر اتنی بے ہمتا اور مکمل کیوں ہے۔ پیرس کے قیام کے دوران سب سے مسرور کرنے والا واقعہ انڈین ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام (جس کے یہ صدر رہے) یونیورسٹی یونین میں ایک مدراسی کا رقص ہے۔ مدراسی نے خود کو ماہر رقص بتایا اور جب وہ کرشن جی مہاراج کی سج بنائے اور کمر کے نیچے دھوتی لٹکائے اسٹیج پر وارد ہوا تو ہجوم نے داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے۔ جب اس نے ساز کی گت پر ٹھمکا کر جھولا بھرا تو دھوتی پاؤں کے انگوٹھے میں پھنس کر کھل گئی اور وہ سرِعام ننگا کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو پیرس کے تماشائی سنّاٹے میں آگئے مگر مدراسی نے ننگ دھڑنگ وہ اُچھل کود کی کہ سب عش عش کر اٹھے۔ اس کے اسٹیج سے رخصت ہو جانے کے بعد اختر حسین نے اسٹیج پر آکر تماشائیوں سے وضاحت کی کہ یہ رقص اس عاشق ہجور کی کیفیت بیان کرتا ہے جو ہماری آب و ہوا میں کوچۂ یار میں چاک دامن ہو کر ناچتا پھرتا ہے۔ وہ فرانس کی ایک خفیہ تنظیم کے رکن الفانسو دی نگیر بڈو (جو ان کا دوست تھا) کی صحبت میں کئی نامور لوگوں سے بھی ملے جن میں یگانۂ روزگار پابلو پکاسو، پابلو نرودا اور کرنل وائڈ مین (جو ایک حیران کن جرمن حریت پسند تھے) سے بھی ملے۔ سر عبدالقادر اور حفیظ بھی پیرس آئے۔ پیرس کے قیام میں انھوں نے انگریزی اخبار نویسی بھی کی۔ یورپ سے واپسی کے بعد وہ احمد شاہ بخاری کے کہنے پر آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوئے۔ ن۔م۔ راشد۔ کرشن چندر۔ سعادت حسن منٹو اور دوسرے لوگ اسٹیشن کے کارپرداز تھے مگر یہ تذکرے آپ مصنف کی زبانی ہی سنیں تو مزہ آئے گا۔

اس آپ بیتی کو پڑھ کر ایک ایسے تیز پسند، شوریدہ سر، حوصلہ مند، جمالیات کے عاشق شخص کی تصویر سامنے آئی ہے جس نے کبھی زندگی سے ہار نہیں مانی، جس نے زندگی اور انسانوں سے محبت کی ہے، جو گہرا تہذیبی اور سیاسی اور ادبی شعور رکھتا ہے۔ اور شگفتہ اور جاندار نثر میں اپنے مشاہدات اور تاثرات بیان کرنے کا سلیقہ بھی۔ ان کو زبان پر قدرت کاملہ حاصل ہے اور جس مضمون کا بیان مقصود ہو اُسے بے تکان اور بے تکلف کاغذ پر بہہ دیتے ہیں۔ جاہلیت، کور ذوقی اور استبداد سے انھیں نفرت ہے اور تیسری دنیا کے تیسرے درجے کے دل و دماغ رکھنے والے بندوقچی آمروں پر جو اپنے تخت کے تحفظ کے لیے پوری قوم اور ملک کی تذلیل کرتے ہیں، ان کا خون کھولتا ہے۔ وہ انسانیت کے مستقبل سے مایوس نہیں اور ان کے نزدیک وہ وقت دور نہیں جب تاریخ کا سیل رواں رجعت پسند طاقتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا اور ایک جگہ انھوں نے اپنے نظریۂ حیات کو چند سطروں میں یوں سمیٹا ہے :۔

"جب میں اپنی زندگی کے سود و زیاں کا حساب کرتا ہوں تو اس میں مجھے نام و نمود، جاہ و منصب کا شائبہ نہیں ملتا البتہ دنیا کے بڑے بڑے مفکّروں، ادیبوں، شاعروں کے مطالعے سے جو فیض اٹھایا ہے، وہ حاصلِ حیات ہے اس طرح ان آوازوں کی یاد جو مغنّیوں کی گلوکاری یا پردہ ساز سے یا کسی پرندے کی کوک یا پہاڑی جھرنے کی گنگناہٹ میں سُنی اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔"

سچ مچ وہ ورڈز ورتھ کی طرح فطرت (نیچر) اور مہم جوئیوں کے عاشق ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ریڈیو سے چھٹکارا ہوا تو چترال اور کافرستان جا بھاگے (اس زمانے میں چترال کے دور دراز اور دشوار گزار حصّے میں کوئی نہیں جاتا تھا) اس مہم جوئی نے ان کی کہانی "کافرستان کی شہزادی" کا مواد دیا۔ وہ طبعًا ایک 'رومنٹک' ہیں۔ کشمیر کی وادی اور پہاڑیوں کی دشت نوردی کی۔ "زوجی لا" کے درّے سے گزر کر سولہ ہزار فٹ اونچے کولا ہائی گلیشیر کے دامن میں خیمہ زن ہوئے، لیکن راتوں رات برف کا ایسا طوفان آیا کہ گلیشیر کی چوٹی سر نہ کر پائے۔ تین ہفتے کے پیدل سفر کے بعد سری نگر میں نواب جعفر علی خاں اثر کی کوٹھی پر وارد ہوئے تو حلیہ ایسا بگڑا ہوا تھا کہ ان کے ملازموں کو ان فقیروں کو پہچاننے میں دشواری ہوئی۔ (اثر ریاست کشمیر میں وزیر تھے اور بقول مصنّف کے آنے جانے والوں کو اس اطمینان سے اپنا کلام سناتے تھے کہ دیر تک اردو شاعری سے دل اُچٹ جاتا تھا) بلاشبہ اس آپ بیتی کے آخری ابواب انھیں جہانیاں جہاں گشت کے روپ میں دکھاتے ہیں اور یونیسکو میں تقرّری کے بعد انھوں نے جی بھر کے سیرِ عالم کی۔ دو سال سومالیہ افریقہ میں رہے اور افریقہ نے ان پر جادو کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مغرب کی زندگی نظر کو فورًا خیرہ کرتی ہے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ چمک ماند پڑ جاتی ہے۔ افریقہ کی کشش دیر میں محسوس ہوتی ہے اور دیر تک باقی رہتی ہے۔ سومالی لوگ انھیں پسند آئے۔ مہم جوئی تو ان کے خون میں تھی۔ "کس مایو" کی چھوٹی بندرگاہ سے بادبانی کشتی میں وحشی جانوروں کے دیدار سے "آف موگو" نامی سنسان جزیروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور پانچ دن تک کھلے سمندر میں تھپیڑے کھاتے رہے ..... پھر ایران میں چار سال رہے۔ شاہی خاندان کے افراد کی فرعونیت اور خفیہ پولیس 'ساوک' ہر جگہ موجود۔ انھیں اپنی خوش وقتی اور آسودگی کے باوجود اکثر روحانی اور ذہنی خلا محسوس ہوا۔ کیوں کہ شاہ کا ایران ایک وسیع زندان تھا۔ یہاں بھی انھوں نے ایک خفیہ انقلابی تنظیم کے ایک مفرور انقلابی کو تین دن اپنے گھر میں چھپائے رکھا..... فلسطین بھی گئے اور اسرائیلی پایۂ تخت تل ابیب میں بھی رہے جہاں ہوٹل میں کمرے کا کرایہ تیس ڈالر تھا۔ جملہ آسائشوں کے علاوہ دیواریں خفیہ مائکروفون بھی نصب تھا ..... اسپین میں ایک ماہ گزارا۔ بارسلونا میں ایک قہوہ خانے کے مالک سے دوستی ہو گئی۔ وہاں کلیسا کے مظالم کا ذکر ہوا تو ایک عمر رسیدہ شخص بول اٹھا کہ کلیسا نے بے شک بڑے ظلم ڈھائے لیکن آج جنرل فرانکو کی حکومت میں کیا تشدد کم ہے۔ اس شخص نے مصنف سے مخاطب ہو کر کہا، میں کبھی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا لیکن آمریت

کی مخالفت کی پاداش میں نہ صرف ملازمت سے برطرف ہوا بلکہ قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں اور اب اس قہوہ خانے کے سوا میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔ پھر ایک تلخ قہقہہ لگا کر اس نے کہا: کیا ستم ظریفی ہے کہ چوکیدار گھر پر یہ کہہ کر قبضہ کر لے کہ اہل خانہ اس قابل نہیں کہ انتظام سنبھال سکیں...!

وہ اطالیہ بھی گئے۔ یہاں انھیں وائلن سیکھنے کا شوق ہوا۔ میلان کے ایک پرانے ہم جماعت برٹو نے انھیں اپنے ایک رشتے دار کی دکان سے ایک پرانا وائلن دلا دیا۔ یہ "اسٹرادیوریس" مارکے کا وائلن تھا جس کی قیمت آج کئی ہزار ڈالر ہے... وہ امریکہ بھی گئے۔ وہاں انھوں نے کئی خوش حال امریکیوں سے پوچھا کہ کیا وہ زندگی سے خوش نہیں تو جواب ملا خوشی ایسی کیفیت ہے جس سے ہم نا آشنا نہیں البتہ ہم آرام سے رہتے ہیں کیونکہ آرام کا سامان بازار سے خریدا جا سکتا ہے۔ جاپان میں یہ ایک شناسا کے ہاں دعوت کھانے گئے جب جوتے اتار کر اندر داخل ہوئے تو ملازمہ 'کیمونو' پہنانے آئی۔ یہ اپنے سوٹ پر ڈالنے لگے تو ہنس کر کہنے لگی یہ برہنہ جسم پر اوڑھا جاتا ہے۔ وہ ان کو بے لباس کرنے 'کیمونو' پہنانے پر مصر تھی۔ کولمبو میں وہ 'براؤنیو ورلڈ' کے مصنف آلڈس ہکسلے سے ملے۔ نیپال اور برما بھی ہو آئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اپنے سفروں کی ان کی یہ یادیں کتنی دل آویز اور خوبصورت ہیں۔ کاش وہ ہر اس ملک کا ایک مکمل سفر نامہ لکھ سکیں جہاں وہ گئے، کیونکہ ان کی سی آنکھ اور اُن کا سا قلم اور کوئی کہاں سے لائے گا۔ اُن کی بچے کی سی حیرت ابھی تک تازہ ہے اور ان کا تاریخی شعور ان سفروں کو بھرپور اور اعلیٰ 'رسوریج' بنا دیتا ہے۔

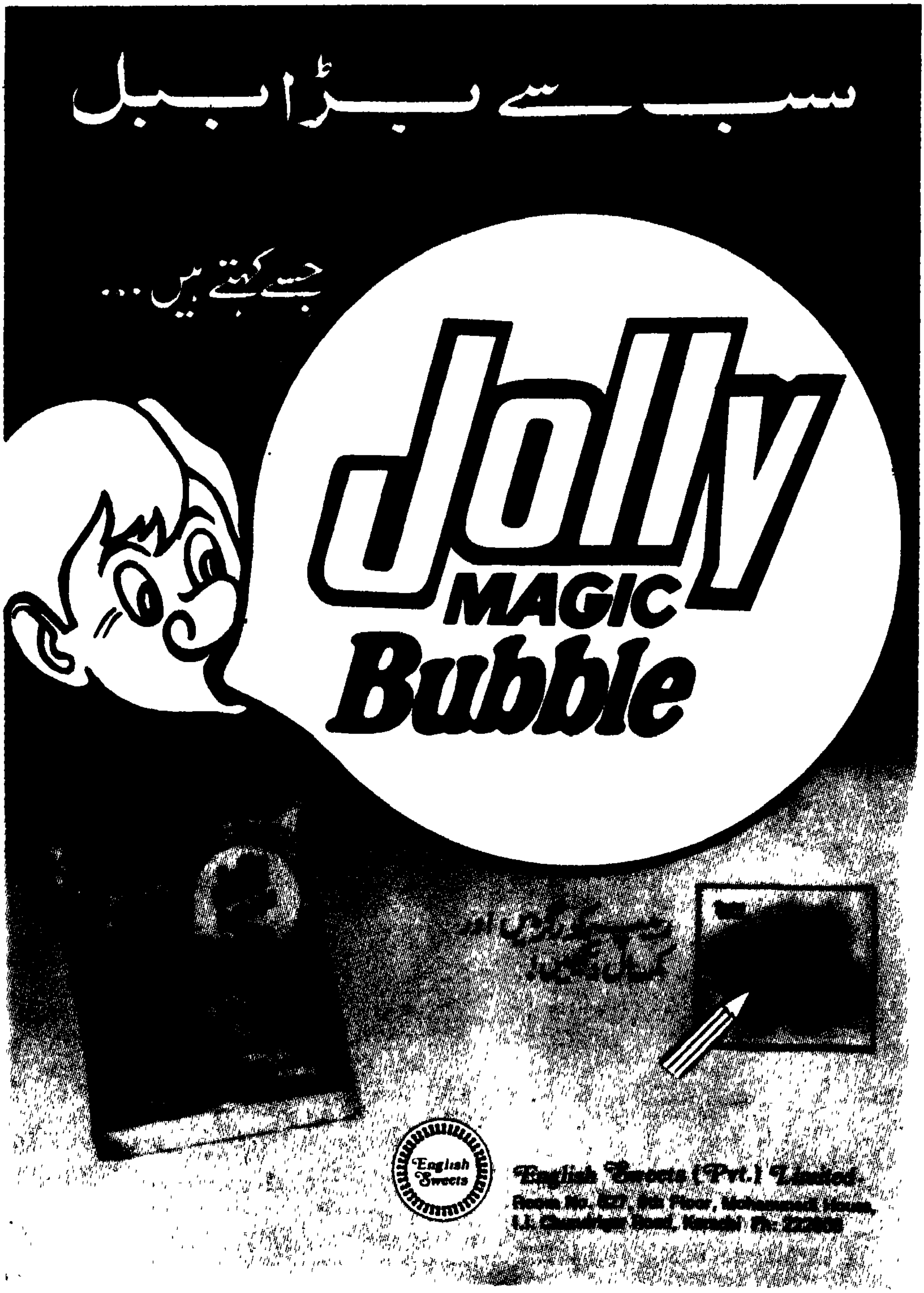
آپ بیتی کے آخری تین ابواب کے عنوانات یہ ہیں: 'ادب کا ماضی و حال' 'حسن کی تلاش'۔ 'اور حقیقت کی تلاش'۔ وہ عالمانہ اور فکر انگیز 'ایسے' یا انشائیے ہیں۔ بڑے ادراک اور پڑھے جانے کے لائق۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ حسن بے پروا کو حسین خود آرا سے زیادہ دل آویز پایا اور ان کو جلوہ گاہوں کے حسن میں وہ تابانی نظر نہیں آئی جو کوہ و صحرا میں ان کی نظروں کو خیرہ کر گئی۔ وہ دماغ اور عقل کی رسائی کے قائل ہیں اور ان کی رائے میں انسانیت کی تعمیر و تخریب کی ذمہ داری خود انسان پر عائد ہوتی ہے اور انسان ہی اپنا سب سے بڑا دوست اور اپنا سب سے بڑا دشمن ہے۔ جمہوریت ہی وہ قابلِ عمل طریقۂ کار ہے جو فرد اور جمعیت کے مفاد میں توازن پیدا کر سکتا ہے... قدرت نے جب اس کرۂ ارض کی تشکیل کی تو بظاہر اس کا منشا نہ تھا کہ اسے صدہا چھوٹے بڑے ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ لیکن تاریخ انسانی کا سب سے بڑا المیہ قومی تعصب اور وطن پرستی کا وہ جذبہ ہے جو انسانیت پر مہیب آسیب کی طرح سایہ فگن ہے۔ پیغمبروں اور مفکروں نے انسانوں کو جن عداوتوں اور نفرتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی وہ نسل، رنگ اور زبان کا پرچم اٹھائے ہر طرف ان آدرشوں کو پامال کر رہی ہیں۔

مشہور ڈاکٹر سموئیل جانسن نے جب یہ کہا تھا کہ 'وطن پرستی' ایک بدمعاش کی آخری پناہ گاہ ہے تو اس نے بھی کم و بیش وہی بات کہی جو اختر حسین نے کہی ہے۔ حرفِ آخر میں وہ امیرِ اندلس عبدالرحمٰن ثالث کے وزیر المنصور کے متعلق ایک حکایت نقل کرتے ہیں کہ جب وہ کسی مہم سے لوٹتا تو اپنی قبا کی گرد کو کوزے میں جھٹک دیتا۔ جب مہم جوئی ختم ہوئی اور اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو کوزے کی خاک اس کے کفن پر چھڑک دی گئی۔ اختر حسین پھر کہتے ہیں: "میں اتنی گرد کہاں سے لاؤں لیکن بساط میں جو باقی رہ گئی اسے ان اوراق پر جھٹک دیا ہے۔"

اختر حسین کے روحانی اور ذہنی سفر کی کہانی اس شعر پر ختم ہوتی ہے ؎

کفن بیار و تابوت و جامہ نیلی کن
کہ روزگار طبیب است و عافیت بیمار

اپنی اس حیران کن آپ بیتی میں اختر حسین نے بہت سی باتیں کہہ دی ہیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں انھوں نے نہیں کہیں۔ شاید اس لیے کہ فن بات کہنے میں نہیں بلکہ اسے اَن کہا چھوڑ دینے میں ہے یا شاید وہ باتیں ہمارے تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں کہی ہی نہ جا سکتی تھیں۔ ہم ان خالی خانوں کو خود پُر کر سکتے ہیں......!



سب سے بڑا ببل
جسے کہتے ہیں...
Jolly
MAGIC
Bubble
English Sweets
English Sweets (Pvt.) Limited.



عبیداللہ قدسی

گردِ راہ — ایک مطالعہ

"گردِ راہ" ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی زندگی کے سفر کا مختصر لیکن نہایت جامع خلاصہ ہے، جو اس صدی کے ایسے خوش نصیب صفِ اول کے مصنف ہیں جنھیں ابتدا سے لے کر آخر عمر تک علمی اور عملی طور پر مطالعے، مشاہدے اور تجربات کے اس قدر متنوع مواقع میسر آئے جو کم مصنفوں کو میسر آتے ہیں۔

ابتدائی نشو و نما اور خانگی زندگی ہی سے ان کے تجربات اور مشاہدات کے شخصیت ساز دور کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ گھر سے نکل کر سیدھے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے گئے ہوتے تو ہمیشہ علیگ ہی رہتے۔

بہت سے روشن دماغ عزم و عزیمت والے، علیگ بن جانے کے بعد وسیع تر مشاہدہ اور تجربہ کی کمی کی وجہ سے ثقافت اور سیاست کی ذہنی کشمکش سے نا آشنا رہنے کے سبب خود سے نبرد آزما نہ ہو سکے۔ دل و دماغ میں ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی، پختگی نہ آئی اور دل نا آشنا ہے۔

اپنی افتادِ طبع، عزائم اور مساعی اپنی جگہ بے شک اہم چیز ہے، لیکن جس طرح عقل، بغیر علم بے نور ہے، اس طرح علم بغیر تجربہ مشاہدہ اور ابتلا کے خالص اور کھرا نہیں ہو سکتا۔

کلکتہ میں ہندو رسائل، اخبارات، انگریزی میں تراجم، صحافت، پنڈتوں کے ماحول، ہندی لغت نویسی، کانگریسی اور مہا سبھائی سیاست کی تربیت، ترقی پسند مسلم صحافت اور مسلم ثقافت کے علمی ماحول اور ہم نشینی نے ذہنی ارتقا کے لیے شاہراہ تیار کر دی تھی۔

اس کے بعد حیدر آباد دکن، علی گڑھ، امرتسر اور دہلی سے لے کر کراچی تک کی ملازمت، مطالعہ، عرق ریزی، دیدہ دوزی اور متنوع کمیاب، مشاہدات، تجربات اور غیر معمولی حالات و واقعات ایسا تربیتی نصاب بن گئے، جس نے یونسکو کو ایک پختہ تر ماہرِ تعلیم، ادیب، نقاد، تجربہ کار عالم دے دیا، جس نے انسانیت کی خدمت میں اپنے عمل کو ایک معیار بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اختر حسین صاحب نے "گردِ راہ" کو بڑے سلیقے سے مدون کیا ہے، اُردو ادب میں یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے، جو لوگ گرد جھاڑے بغیر چلے گئے، وہ آئے اور گرد آلود گئے، اور جنھوں نے گرد کو جھاڑا وہ خود بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے۔

مجھے اس وقت ایک مثال یاد آئی، اجمیر میں درگاہ کی طرف سے پہاڑی کے پانی کا بہاؤ ایک سڑک پر تھا اس لیے اس سڑک پر دکانیں چار فٹ بلند بنی ہوئی تھیں، اس کا نام نلہ بازار تھا۔ اس میں صرافہ بازار بھی تھا۔

صرافوں اور سناروں کی دکانوں کے نیچے جھاڑی ہوئی گرد کو، ایک قوم دھول دھوئے، چھانتے اور پانی سے دھو کر سونے چاندی

عبید اللہ قدسی

کے ذرّے جمع کرتے تھے، دھول دھوئے کو یہ معلوم ہوجاتا تھا کون سا سنار کس قسم کا ملمع ساز ہے، اور کتنا کھوٹ ملاتا ہے، جب وہ دھول چھانتا اور دھوتا تو اسے یہ بھی پتا چل جاتا تھا کہ دوسری دھاتوں کی آمیزش کس دوکان کی جھاڑن میں کتنی ہے۔

گردِ راہ کو بھی میں نے اسی نظر سے پڑھا اور پورا پڑھ گیا، پڑھنے کے بعد معلوم ہوا مصنف نے گردِ راہ جھاڑ کر جمع ہی نہیں کر دی ہے، بلکہ اسے بڑی احتیاط سے پھونک پھونک کر چھنے ہوئے کانٹے کنکر دیکھ کر تنقید کے ساتھ سوچ سمجھ کر مستقبل کی نسل کے لیے پیش کیا ہے۔ البتہ نمونے کے طور پر نئی نسل کے لیے چند لوکیں اور خلشیں رہنے دی ہیں۔

مصنف نے ؏ من نکردم شما حذر بکنید۔ کے مذکرے سے احتراز کیا ہے، اور "درجوانی چنانکہ افتد دانی" کے مرحلے کو بھی نے "چھو" دیا ہے، اس ذکر سے خلط مبحث ہوتا، یا علمی ثقافتی اور تعلیمی مقصد فوت ہوجاتا۔

میں نے اپنی کتاب میں سعدی کا یہ جملہ لکھتے ہوئے یہ کہہ کر دامن چھڑایا تھا کہ عالموں کے گھرانے میں ہونے کی وجہ سے ایسے مواقع میسر نہ آئے۔

بیان مصنف نے اس باتوں کے ذکر کو بڑی خوش اسلوبی سے اس طرح عالمانہ رنگ دیا ہے جس سے مصنف اور قاری بڑی متانت سے اس مرحلے سے گزر جاتے ہیں، یہ علمی ثقافت یہ باب کی متانت میں روشن ہے۔

سعدیؒ نے پرانے زمانے میں دوٹوک فیصلہ کر دیا تھا ؏

جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ

ان کے زمانے میں غلط بیانی کی تصدیق کے ذرائع بہت محدود تھے، لہٰذا سیاح ہاتھی کے پاؤں کے نشان کو اگر گوکھر کا پاؤں کہہ دیتا تو کون جھٹلا سکتا تھا، بقول سعدی کسی وزیر نے کہہ دیا اس کے ملک میں گیہوں کے درخت ہاتھی کے قد کے برابر ہوتے ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے کا سیّاح اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ہر ذی علم کے سامنے ذرا سی کوشش سے چودہ طبق روشن ہوجاتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے تیسری دنیا کے کمزور دانشوروں نے مغرب کے شور سے مرعوب ہو کر ایک نئی کہانی قبول کر لی تھی، اور نئی پرانی نسل کے تفاوت کا فتنہ کھڑا کر لیا تھا۔ اگرچہ یہ بات چین سے آئی تھی، مگر مغرب کی پیروی میں تیسری دنیا نے اس کمزور استدلال کو معتبر سمجھ لیا تھا۔ لیکن نئی نسل اس ملمع سازی کے چکر میں نہیں آئی۔

"گردِ راہ" کے مصنف نے اپنا دامن اس گرد سے آلودہ نہیں ہونے دیا، چنانچہ گرد راہ نہ غبارِ خاطر ہے، نہ سیاحت و سفرناموں جغرافیہ تاریخ اور ڈائری سے جمع کیے ہوئے تعلیمی کتابوں کے نکات کا خلاصہ ہے، نہ معلوماتِ عامہ اور اطلاعات کا خزانہ ہے۔

یہ تذکرہ پیمائی، ہوا پیمائی، بادیہ نشینی اور صحرا گردی کی داستان ہے، نہ اس میں صحافت اور سیاست کے تقابلی نظریات کا بیان ہے، نہ بڑے لوگوں کی شناسائی اور تعارف کا تفاخر نامہ ہے، نہ مقولوں اور تصاویر کا البم ہے۔

بلکہ یہ ایک اولی العزم، تجربہ کار، تربیت یافتہ پروفیسر، منتظم، محقق اور ادیب کا مشاہدہ اور تجربہ ہے، جس کا پیشہ ہی اہل کاروں، محققوں اور دانشوروں کے رابطے سے علم کی خدمت انجام دینا تھا۔ اور کاتب تقدیر نے اس قسم کے انہماک اور گردش کا چکر تلوے میں نقش کر دیا تھا۔ لہٰذا علمی و ادبی رکھ رکھاؤ اور آداب کے ساتھ جس طرح تقریر و تحریر اور نوٹس لکھنے میں نوک پلک کے عادی رہے ہیں اسی طرح یہ ان کی تمام علمی عملی کاوشوں اور سرگرمیوں کا خلاصہ ہے جس میں "گردِ راہ" کے مصنف کے وجود کا مکمل اظہار ہے۔

محمد احمد سبزواری

مقبول ترین خود نوشت۔ گردِ راہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا، جاپان اور یورپ کے بعض ملکوں میں "بیسٹ سیلر" (کثیر الاشاعت، مقبول ترین) کی اصطلاح عام ہے۔ ہمارے ہاں اس کا تصور سرے سے موجود ہی نہیں اور اس کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے کہ ہماری زبان میں یہ اصطلاح ہی مفقود ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو تعلیم کی کمی ہے۔ اس وقت بھی پاکستان میں خواندگی کا اوسط ۲۵ فی صد سے کم ہے (خواندہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی زبان کی عبارت لکھ پڑھ سکے) اس اوسط میں سے اگر درمیانی اور ثانوی جماعتوں کے طلبہ اور اس معیار تک پڑھے ہوئے خواندہ افراد کو علاحدہ کر دیا جائے تو تعلیم یافتہ آبادی کا تناسب پانچ فی صد سے بھی کم رہ جاتا ہے۔ دوسرے تعلیم یافتہ آبادی کا ایک بڑا حصہ اس قابل نہیں کہ وہ مہنگی یا سستی کتابیں خرید سکے۔ تیسرا اور سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں پڑھنے کا شوق بہت کم ہے۔ اساتذہ، کالج کے لیکچرار اور جامعات کے پروفیسر جو ملک میں علم کی روشنی پھیلانے کے ذمے دار ہیں ان میں سے اکثریت مطالعے کی شوقین نہیں اور وہ اپنے موضوع کی نئی نئی کتابیں نہیں پڑھتے۔ چند سال ہوئے میں نے اپنی ایک کتاب گن کر پچاس تعلیم یافتہ دوستوں میں تقسیم کی۔ تین ماہ بعد میں نے ان سے کتاب کے بارے میں استفسار کیا۔ بیشتر نے جواب دیا کہ ان کو ابھی فرصت نہیں ملی۔ تین چار اصحاب کو سرے سے یہ واقعہ ہی یاد نہیں رہا۔ اثبات میں جواب دینے والوں سے جب کرید کی گئی تو معلوم ہوا کہ صرف ایک صاحب نے اس کا مطالعہ کیا اور چند نے صرف اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ ہوسکتا ہے کہ خریدی ہوئی کتاب کی یہ صورت نہ ہو مگر وہاں بھی ڈھائی تین فی صد سے زائد پڑھنے والے نہیں ہوتے۔ چند ماہ ہوئے جمیل الدین عالی نے روزنامہ اخبار جنگ میں کتابوں کی خرید اور مطالعے کے جو نتائج اپنے ایک جائزے سے نکالے وہ نہ صرف حیرت انگیز بلکہ بڑے حوصلہ افزا تھے۔ پتہ نہیں کہ ان میں سے کتنوں نے اپنی خودی کو بلند کرنے کے لیے دل فریب جوابات دے کر عالی صاحب کو خوش کر دیا ہو۔

اس موقع پر مجھے پطرس مرحوم کا وہ مضمون یاد آگیا جس میں انھوں نے اپنا اور ایک انگریز لڑکی میبل کا قصہ بیان کیا ہے جو نئی نئی کتابوں کو برق رفتاری سے پڑھنے اور پھر ان پر بحث کرنے کی بڑی شوقین تھی۔ بدیں پطرس کو اس سے مقابلہ کرنے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ یہ رات رات بھر جاگ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے تاکہ اس سے بحث کر سکیں۔ ایک دن جب یہ اس کے گھر گئے تو خود ان کی دی ہوئی کتابوں کا ایک پیکٹ وہاں پڑا تھا جس کو کھولا تک نہیں گیا جب کہ موصوفہ ان پر بڑی شدت سے

محمد احمد سبزواری

بحث طلب نہیں۔ اس گُر کے معلوم ہونے کے بعد پطرس نے بھی کتاب کا نام دیکھا، گرد پوش کی عبارت پڑھی، عنوانات پر نظر ڈالی اور اس پر لے دھڑک تبصرے کرکے میل پر اپنے مطالعے کی دھاک بٹھا دی۔ گو یہ مضمون کافی پرانا ہے مگر آج کل جو بیشتر تبصرے ہوتے ہیں ان کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ گویا ہمارے اکثر تبصرہ نگار بھی پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے۔ اس پس منظر میں گرد راہ کا پہلا ایڈیشن جو گیارہ سو نسخوں پر مشتمل تھا دو ماہ کے قلیل عرصے میں بغیر کسی پبلسٹی کے ختم ہو جانا پاکستان کی ادبی تاریخ میں ایک معجزے سے کم نہیں اور اس کے لیے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بحیثیت مصنف اور صہبا لکھنوی بحیثیت ایک ناشر قابل مبارک باد ہیں۔

دراصل اس کتاب کے مقبول ہونے کی کئی وجوہ ہیں۔ مثلاً اس کی ابتدا کلکتے سے سمجھنا چاہیے۔ یوں تو کلکتہ بنگال کے دار الحکومت کے نام سے مشہور ہے مگر دراصل کالی کتے نے برصغیر کی سیاسی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں انگریز نے ۱۶۹۰ء میں قدم رکھا اور فورٹ ولیم تعمیر کیا۔ نواب سراج الدولہ کے عہد میں جب نواب کے چند مخالفین نے یہاں پناہ لی تو نواب نے حملہ کرکے قلعہ فتح کر لیا اور لفرنٹا ڈیڑھ سو انگریزوں کو گرفتار کر لیا۔ دوسرے دن ان کو رہا کر دیا گیا جس کی تسکر گزاری میں "بلیک ہول" کا افسانہ تراشا گیا جس کا پرچار ڈیڑھ سو سال تک رہا۔ یہیں پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں کی سازشیں تیار ہوئیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی ابتدا میں بنگال (جو آسام تک پھیلا ہوا تھا) بہار و اڑیسہ کی حکمران بن گئی۔ بنگال کا گورنر بمبئی اور مدراس کے گورنروں کے مقابلے میں گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ صورت حال یہ تھی کہ ہر سرکاری اعلان سے پہلے ڈھنڈورچی صدا لگاتا "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا ۔ ۔ ۔"

۱۸۵۸ء میں یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور حکومت ہند تاج برطانیہ کے تحت آ گئی اور کلکتہ نئی حکومت کی راج دھانی بن گیا۔

عیسائی سلطنتوں کے نمائندے جہاں بھی گئے وہاں ان کے ساتھ عیسائی مبلغ بھی منسلک رہے جن کا مقصد عیسائی مذہب کی تبلیغ تھا۔ یہ سلسلہ ایشیا، افریقہ اور امریکہ غرض کہ ہر جگہ پھیلا گیا۔ انگلستان کے جیمس اول نے سر طامس رو کو جب اپنا سفیر بنا کر دربار مغلیہ (عہد جہانگیر) میں بھیجا تو اس کے ساتھ ایک پادری ٹیری بھی تھا۔ یہ سلسلہ بعد میں نہ صرف جاری رہا بلکہ اس میں توسیع ہوتی رہی۔ مثلاً ۱۷۹۳ء میں ایک عیسائی مبلغ ڈاکٹر ولیم کیری جو ماہر زراعت بھی تھا یہاں آیا اور جس نے بنگال میں زرعی پیداوار بڑھانے کے نئے تجربات کیے اور ۱۸۲۰ء میں ہندوستان میں انجمن زراعت و باغبانی قائم کی۔

۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد ایشیا کی تاریخ، تہذیب، ادب و فنون کا مطالعہ تھا۔ اس نے ایک جرنل بھی نکالا۔ گو اس سوسائٹی کے ممبران میں کوئی مقامی باشندہ شامل نہیں تھا مگر اس کے جرنل میں ہندوستانیوں کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا آغاز ہوا، جہاں متعدد لوگوں نے منشیوں کی خدمات انجام دے کر اردو نثر کو تقویت پہنچائی۔ اگلے سال پہلا پریس قایم ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں مدراس اور بمبئی کے ساتھ ہی ساتھ یہاں مغربی تعلیم کی یونیورسٹی قایم ہوئی جو اپنے دائرۂ کار اور کالجوں کے وسیع جال کی وجہ سے اپنے حریفوں پر بازی لے گئی[1] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کے ہندوؤں میں مغربی تعلیم عام ہو گئی اور یہ لوگ شمالی ہندوستان کے دفتروں اور خصوصاً محاسبی (اکاؤنٹ) میں چھا گئے۔ مشہور تھا کہ "فتح انگریز نے کی اور حکومت بنگالی چلا رہے ہیں" لفظ بابو اسی عہد کی یادگار ہے۔ علوم جدیدہ کی تعلیم نے یہاں کے لوگوں کے سیاسی شعور کو جلا بخشی۔ کمپنی نے یہ قانون بنا رکھا تھا کہ دیسی عدالتیں ان مقدمات کی سماعت نہیں کر سکتی ہیں۔

---

[1] کلکتے میں حاجی محمد محسن کے بہت بڑے مذہبی وقف کو ضبط کر کے حکومت کے زیر اثر یہ روپیہ ہگلی کالج میں لگا دیا گیا جہاں اس وقت چار سو طلبہ میں صرف پانچ مسلمان تھے۔

جن میں ایک فریق فرنگی ہو۔ لارڈ رپن (۸۴-۱۸۸۰ء) نے اس فرق کو دور کرنے کے لیے ایک مسودہ قانون وضع کیا جو "البرٹ بل" کے نام سے مشہور ہے۔ انگریزوں نے اس کی مخالفت میں بڑا زور لگایا اور رپن ہندوستانیوں میں مقبول ہو گیا[1] مگر اپنے ہم وطنوں میں اور ارباب حکومت میں ناپسندیدہ شخصیت قرار پایا اور بالآخر اس کو مستعفی ہونا پڑا۔ اسی زمانے میں کلکتے سے چند رسالے شائع ہوئے جن میں ایک "ستارۂ شرق" تھا جس میں برطانوی حکام کی شکایات درج تھیں اور شائع کرنے والوں کا نام نہیں تھا۔ جب سول سروس کے ایک سابق رکن ہیوم نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس بمبئی میں بلایا تو اس کی صدارت بنرجی نے کی جو ایک بنگالی عیسائی تھے۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال دو صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا جس کی ہندوؤں نے شدید مخالفت کی کیونکہ مشرقی بنگال (تقریباً موجودہ بنگلہ دیش مع آسام) میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی تھی۔ اسی زمانے میں بنگال میں بم افگنی کے واقعات ہوئے جن میں علی پور کا واقعہ خاص طور پر مشہور ہے۔ مشرقی بنگال کے گورنر اور وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر حملے ہوئے۔ ولایتی مال کے بائیکاٹ کی مہم شروع کی گئی جس نے کافی شدت اختیار کر لی اور حکومت کو ولایتی مال کی بڑی دکانوں پر پولیس متعین کرنا پڑی۔ گو حکومت نے ۱۹۱۲ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کر دی اور دہلی کو برصغیر کا دارالحکومت بنا دیا مگر بنگالیوں نے انگریز دوستی کے طفیل جو کچھ حاصل کیا تھا اس میں رفتہ رفتہ کمی آ گئی۔ ۱۹۰۶ء ہی میں بنگال (ڈھاکہ) میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا اجلاس ہوا۔ مولانا محمد علی نے ۱۹۱۱ء میں کلکتے سے کامریڈ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ الہلال نے ساکن پانی میں وہ تموج پیدا کیا جو گھٹنے کے بجائے طوفان ہی کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ دارالحکومت کی کلکتے سے منتقلی، ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی اور ۱۸۸۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے قیام، کامریڈ کے دہلی منتقل ہونے اور الہلال کے بند ہو جانے کے بعد شمالی ہند کے بیشتر رشتے کلکتے سے ختم ہو گئے اور اردو داں طبقے کی نظریں اب دہلی، لکھنؤ، لاہور، رام پور، حیدرآباد، بھوپال وغیرہ کی طرف منتقل ہو گئیں۔ ڈاکٹر اختر حسین نے اسی منقطع دور کی سرگزشت "کلکتے کی یادیں" کے عنوان سے پیش کی ہے۔ اس میں پچھلی تاریخ بھی ہے اور ہم عصر اور زمانہ ساز اداروں اور شخصیتوں کا ذکر بھی جن سے اردو داں طبقے کا بڑا حصہ قطعاً ناواقف تھا۔

پھر حیدرآباد دکن کی "انجمن آرائی" کا ذکر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت حیدرآباد کی تہذیبی و ثقافتی روایت کے ڈانڈے دہلی اور لکھنؤ سے ملتے تھے مگر جامعہ عثمانیہ، دارالترجمہ، دائرۃ المعارف، انجمن ترقی اردو نے ایک ایسے تابناک باب کا اضافہ کر دیا تھا جس کی مثال دہلی اور لکھنؤ میں نہیں ملتی، جہاں علم و ادب، شعر و شاعری یا تو شاہی محلات کی چار دیواریوں تک محدود تھی یا غالب و مومن، انشا و اللہ خان، انیس و دبیر کی ذاتی ڈیوڑھیوں تک۔ مگر جامعہ عثمانیہ میں بقول پروفیسر قاضی محمد حسین (مرحوم) نائب معین امیر جامعہ "جو علم نامانوس زبانوں میں قید تھا، سرزمین جامعہ عثمانیہ پر آزاد ہوا، عام ہوا۔" اس میں شک نہیں کہ جامعہ عثمانیہ اب وہ جامعہ نہیں رہی مگر برصغیر میں علم کو عام کرنے میں اس نے جو کردار ادا کیا وہ تعلیم کی تاریخ میں ایک سنہری باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ حیدرآباد، جامعہ عثمانیہ یا انجمن ترقی اردو کا تذکرہ ہو اور وہاں مولوی عبدالحق کا ذکر نہ ہو جب کہ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو "زندگی میں باضابطگی کا درس بھی دیا ہو۔" مولوی صاحب نے بہت سی زندگیاں بنائیں لیکن اختر صاحب کی طرح کم ہی لوگوں نے اس کا برملا اعتراف کیا ہے۔ ویسے مولوی صاحب کی شخصیت بڑی ساحرانہ تھی۔ جو ملتا مسحور ہو جاتا۔ پھر جن شخصیتوں

---

[1] سرسید نے جو پہلے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھ چکے تھے لارڈ رپن کو علی گڑھ بلایا اور تمام مجمع میں بٹھا کر جلوس نکالا۔

مقبول ترین سرگزشت۔ گردِ راہ

محمد احمد سبزواری

نے ان کو بہت قریب سے دیکھا تو ان کی تو بات ہی جدا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب کی زندگی کے بعض گوشوں کو اس کتاب میں بڑی اچھی طرح نمایاں کیا گیا ہے۔ اس سے اُس خلوص، محبت اور احترام کا پتہ چلتا ہے جو اختر صاحب کے دل میں مولوی عبدالحق کے لیے تھا۔ رہ گئی کمزوریاں تو کون انسان ہے جو ان سے خالی ہے۔ حالی نے کیا خوب کہا ہے ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

یورپ میں اس سرگزشت کا مرکزی [illegible] جو عام طور سے بنا ہوا ہے۔ برصغیر کے طالب علم سید محمود کے زمانے سے دوسری عالمگیر جنگ تک قانون، طب اور دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جایا کرتے تھے۔ جنگ کے بعد عالمی سیاست میں ریاست ہائے متحدہ کو برتری حاصل ہوئی تو طلبہ کی کثیر تعداد کا رخ امریکہ کی طرف ہو گیا۔ پیرس اور برلن جانے والوں کی تعداد کو ہمیشہ سے انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ برطانوی دور میں انگلستان جانے کی ایک وجہ تو [illegible] کوئی تعلق ہی تھا کہ کچھ جانے پہچانے لوگ وہاں مل جایا کرتے تھے۔ وہاں کے باشندوں سے دوستی اکثر اوقات سرکاری ملازمتوں کے حصول کو بھی آسان بنا دیتی تھی مگر سب سے بڑی وجہ زبان کی آسانی تھی۔ جیسا کہ ڈاکٹر لیکلرک نے فرانسیسی سے ناواقفیت کی بنا پر ڈاکٹر صاحب سے تعجب سے کہا تھا کہ "انگلستان کیوں نہیں جاتے وہاں تمھیں آسانی ہوگی" جس پر ان کو جواب ملا "انگریز کی محکومی کا اتنا شدید احساس ہے کہ اس کی سرزمین میں رہنے کو جی نہیں چاہتا"۔ دراصل میرے خیال میں یہ شعور انھیں بنگال کے طویل قیام اور وہاں کی صحافت میں کام کرنے کی بدولت ہی حاصل ہوا۔ انقلاب فرانس کے بعد مختصر وقفوں کو چھوڑ کر فرانس اور بالخصوص پیرس نے جمہوریت، مساوات، علم و ادب، موسیقی اور مصوری میں جو نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا اس کو ڈاکٹر صاحب نے بھی چند جملوں میں بڑی خوبصورتی سے صفحہ ۱۳۹ پر سمو دیا ہے۔ انھیں پیرس سے خاصی دلچسپی ہو گئی تھی اور وہ خوشی خوشی وہاں سے رخصت کے بجائے افسردہ و پژمردہ وطن واپس لوٹے۔

"پاکستان ناگزیر تھا" ایک ایسی کہانی ہے جو متعدد اصحاب نے سنائی ہے۔ "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" (آزادی نیم شب) میں حقائق کو افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے مگر یہاں داستان گو ایک ایسا کردار ہے جو اپنی آپ بیتی سنا رہا ہے جس نے غیروں کی ریاکاریوں، سرد مہریوں اور مجبوریوں اور اپنوں کی کاوشوں، آزمائشوں اور حرص و ہوس کی کمندوں کو نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ ان سے گزرا بھی لہٰذا داستان تلخ ہونے کے باوجود دلچسپ ہو گئی اور اکثر اندرونِ خانہ باتیں بھی منظرِ عام پر آ گئیں اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جہاں ان کو اکثر محبِ وطن لوگوں کی طرح دیارِ غیر کا رخ کرنا پڑا اور سترہ سال تک یونیسکو کی ملازمت میں رہے اور وہیں سے وظیفہ خوار ہیں۔

پھر اس میں ایران، فلسطین اور اسپین کا ذکر ہے۔ ایران و پاکستان کے رشتے بڑے قدیم ہیں۔ قدیم فارسی تو اردو کی بڑی بہن ہے۔ فارسی ادب سے رشتہ بہت گہرا ہے۔ اس سرزمین میں صوفیائے کرام کی جڑیں بھی بہت مضبوط ہیں جو مثنوی مولانا روم کو قرآن در زبان پہلوی کہتے ہیں۔ اب بھی سب تعلیم یافتہ طبقوں میں قوالی کی محفلیں ہوتی ہیں تو مثنوی کے کچھ حصے ضرور پڑھے جاتے ہیں جن پر اچھے اچھے بزرگ مست ہو جاتے ہیں۔ پاکستان ریڈیو اور ٹی وی پر بھی اس کے پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال اپنے ما فوق معدودہ غیرہ [illegible] شاعر معلوم ہی نہیں ہوتے تھے۔ فلسطین سے ہمارا جذباتی اور مذہبی رشتہ ہے اس لیے اسرائیل سے ہمارے سفارتی تجارتی اور دیگر روابط ابھی تک نہیں ہیں۔ ہمارے بین الاقوامی پاسپورٹوں پر لکھا ہوتا ہے "دنیا کے سارے ممالک کے لیے ما سوائے

اسرائیل سے اس وجہ سے صرف وہی پاکستانی وہاں جا سکے ہیں جن کا تعلق اقوامِ متحدہ یا اس کے ذیلی اداروں سے ہوتا ہے اور ایسے اصحاب کی تعداد گنی چنی ہوتی ہے اور ان کے ذاتی مشاہدات کی بڑی اہمیت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی حیثیت میں مقبوضہ فلسطین کا سفر کیا۔ اسپین سے مسلمانوں کو تاریخی طور پر والہانہ لگاؤ ہے۔ تاریخوں میں مرقوم ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں اسپین کا دارالخلافہ قرطبہ یورپ کا سب سے زیادہ متمدن اور مہذب شہر تھا بلکہ دنیا میں قسطنطنیہ اور بغداد کے بعد تہذیب و تمدن کا تیسرا مرکز تھا جہاں ایک لاکھ تیرہ ہزار مکان، محلات، اکیس نواحی محلے، شاندار مساجد، ایک جامعہ، ستر کتب خانے اور کتابوں کی بہت سی دکانیں تھیں۔ کپڑے اور چمڑے کی صنعت عروج پر تھی، منقش چمڑے کے لئے انگریزی اور فرانسیسی کا لفظ کورڈووان اسپینی کا کورڈووان، اور کارڈوین اسی دور کی یادگار رہیں۔ اسپین کے متعلق ... بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ غالباً سب سے پہلے دو تفصیلی مصور کتابیں "سیاحت نامہ اندلس" کے نام سے ریاست بھوپال کے ایک معتمد تعلیمات ... محمد نے آج سے ساٹھ باسٹھ سال پہلے لکھی تھیں مگر بہت کم لوگوں کو ان کا علم ہے۔ البتہ علامہ اقبال کی ولولہ انگیز نظم "مسجد قرطبہ" سے اردو داں طبقہ خوب واقف ہے لہٰذا ان ممالک کے تذکروں نے کتاب کی مقبولیت میں اضافہ کر دیا۔ یہی صورت بعض دوسرے ابواب کی ہے۔

گرد راہ نہ تو محض ایک شخصی خود نوشت ہے اور نہ صرف برصغیر کی علمی و ادبی تاریخ کی سرگزشت، بلکہ یہ گزشتہ نصف صدی کی عالمی سیاست، معاشرت، تہذیب و تمدن کی کہانی ہے جس کو بڑی مہارت اور خوبصورتی سے تقریباً سوا تین سو صفحات میں سمو دیا گیا ہے۔

حوالے جات

(اس مضمون میں مندرجہ ذیل کتب و مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے)

۱۔ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی
۲۔ ڈاکٹر حمید الدین، تاریخ اسلام، فیروز سنز۔ لاہور
۳۔ ہندوستان ایرٹیک ۱۹۴۷ء (انگریزی) نئی دہلی
۴۔ محمد خالد، تعارف سماجی بہبود، کفایت اکیڈیمی، کراچی
۵۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے افکار برطانیہ میں اردو ایڈیشن۔ کراچی
۶۔ محمد احمد سبزواری، حرف آخر

ڈاکٹر سلیم اختر

روشن اختر

> "میں نے کم عمری میں جو حقیقت کی تلاش شروع کی وہ پیرانہ سالی میں بھی جاری ہے۔ ظاہری آنکھ نے تماشا گاہِ عالم میں بہت کچھ دیکھا اور چشمِ باطن نے روح کی گہرائیوں کو کچھ حد تک پہچانا۔ اب نہ کوئی تمنا ہے نہ کوئی خواہش، ماضی ایک دوست سادن کی طرح پہلو بہ پہلو چل رہا ہے۔ اب خواب اور بیداری میں کوئی فرق نہیں رہا۔ کل ناگہ فجر کے وقت جب میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو ستارۂ صبح مسکرا کر کہتا ہے یونانی اساطیر کا یہ گمان صحیح ہے کہ جسمِ خاکی سے جدا ہو کر روحیں افلاک میں تاروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اختر سوختہ نومبر سے قریب آ، تیرے لیے ایک خاص مقام کا تعین ہو چکا ہے۔"
>
> ــــ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری "گرد راہ" (ص: ۳۱۶)

قطرے نے گوہر بننے تک کتنے پر پیچ مراحل طے کیے یقیناً دنیا والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، لیکن کیا خود قطرے نے کبھی کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ میں کیسے گوہر بنا؟ میں نے جب بھی کوئی خود نوشت سوانح عمری پڑھی تو مجھے اس سوال نے ہمیشہ پریشان کیا ہے کہ آخر وہ کون سا نفسیاتی محرک ہے جو لوں اپنی قلمی تصویر کھینچنے پر مجبور کر دیتا ہے؟ انا، خودستائی، تعلّی نرگسیت ــــ؟ اصطلاحیں متنوع سہی مگر محرک ایک ہے یعنی انکشافِ ذات۔ لیکن کیا انکشافِ ذات کہ روسو کے "اعترافات" کی صورت میں خود نوشت گویا ملزم کا اقبالی بیان بن جاتی ہے، ژونگ کی صورت میں تلاشِ حق کا داخلی سفرنامہ بن جاتی ہے، جوش کی صورت میں تعلّی اور جنس تفاخر کے نقوش کا مجموعہ تو قرۃ العین حیدر کی صورت میں ایک تہذیب کا استعارہ قرار پاتی ہے۔ عالمی اہمیت کی لاتعداد شخصیات نے تو مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زبان میں، کے مصداق آپ بیتی سنائی ہے ورآندرے ژید، فرینک ہیرس، برٹرینڈ رسل، سارتر، سیمون دالوار، سارتر اور بالمو رودا کی آپ بیتیوں کا عالمی ادبیات میں بلند مقام ہے اور یہ ان اس معیار کی دیگر آپ بیتیاں پڑھنے کے بعد یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ہر شخص نے بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر خود نوشت کو ایک نرگسی آئینے میں تبدیل کر دیا۔ یوں کہ کتاب زبانِ حال سے یہ سوال کرتی محسوس ہوتی ہے۔

MAGIC MIRROR ON THE WALL
AM I THE FAIREST OF ALL

اگرچہ اردو میں خود نوشت سوانح عمری کو بالعموم انگریزی اثرات کے باعث اور جدید عہد کی پیداوار سمجھا جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب

نہیں کہ مشرق اس سے یکسر عاری رہا ہے۔ بابر اور جہانگیر کے تزک آج بھی دلچسپی سے پڑھے جا سکتے ہیں اور میر تقی میر کی "ذکرِ میر" تو اس کے ایام جنون کی اچھی خاصی کیس ہسٹری مہیا کرتی ہے، ایسی کیس ہسٹری جس کی روشنی میں اس کی "بے دماغی" کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس طرح غالب نے اپنے خطوط میں جس بے تکلفانہ انداز میں سوانحی کوائف مہیا کیے اور نجی باتیں بیان کی ہیں، نفسیاتی لحاظ سے وہ اتنی اہم ہیں کہ کم از کم اس لحاظ سے تو خطوط کو "یادگارِ غالب" پر فوقیت دی جا سکتی ہے اور اس سے یہ نکتہ منکشف ہو جاتا ہے کہ سوانح نگار کو صرف اس سے دلچسپی ہوتی ہے کہ قطرہ کیسے گوہر بنا جب کہ خود نوشت سوانح عمری دراصل قطرے کی اپنی حکایت بن جاتی ہے۔ اُس قطرے کی جو بالآخر گوہر بن گیا ہے۔ اب اس حکایت کو لذیذتر بنانے کے لیے قصہ گو شوخ رنگ استعمال کرتا ہے یا سادہ، دودھ میں پانی ملاتا ہے یا لسی میں، اپنے عصر اور معاصرین کے بارے میں اس کا کیا رویہ ہے، دوستوں اور دشمنوں کا تذکرہ کس اسلوب میں کرتا ہے، اپنے منہ آپ میاں مٹھو بنتا ہے یا انکساری سے کام لیتا ہے۔ ان سب کا انحصار اس کی شخصیت کی نفسیاتی اساس پر ہوتا ہے۔ اگر خود نوشت سوانح عمری کو عمر کی نقدی کی میزان قرار دیا جائے تو کچھ لکھنے والے اسے بیلنس شیٹ میں تبدیل کر دیتے ہیں جب کہ بعض اسے آڈٹ رپورٹ بنا دیتے ہیں تو کچھ کی خود نوشت کوائف، معلومات اور حالات کا محض روز نامہ ثابت ہوتی ہے، ایسا روزنامچہ جو اتنا ہی بے رنگ ہوتا ہے جتنی کہ دھوبی کو دھلائی کے لیے دیے گئے کپڑوں کی فہرست جب کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنے ایک مشہور افسانہ "زبانِ بے زبانی" مطبوعہ نگار ۱۹۳۲ء) کے بوڑھے برگد کو اپنی ذات کا استعارہ بنا کر اس کی ابتدائی سطروں کا اقتباس پیش کیا ہے:۔

> "میں برگد کا ایک عمر رسیدہ درخت ہوں۔ نہ جانے کتنی مدت سے تنِ تنہا اور خاموش کھڑا ہوں، برقرار اور بے قرار، بے زبان اور نغمہ زن۔ نہ جانے کتنی مرتبہ کڑکڑاتی سردیوں میں اپنی بے برگ شاخوں سے کُہر کی چادر کو ہٹا کر میں نے فریاد کی ہے؟ نہ معلوم کتنی مرتبہ موسم گل میں عطر بیز نسیم بہار نے میرے بے حس جسم میں سنسنی ڈال دی ہے، لیکن کچھ دنوں سے میرے چہرے پر جھرّیاں پڑ گئی ہیں، جسمانی تاثرات سے کبھی بے پروا ہو گیا ہوں۔ سردیاں اور گرمیاں میرے لیے یکساں ہیں۔" (ص: ۱۶)

آخری سطروں میں اس سطر کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے اب میرے لیے روشنی اور تاریکی میں کبھی امتیاز نہیں رہا!

یہ آج کا ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ہو سکتا ہے، لیکن کل وہ ایسا نہ تھا کہ جوان اور متحرک تھا، امنگوں اور آرزوؤں کے بھرے دل اور الفاظ اور ذات کے حسن سے لذت حاصل کرنے والی آنکھ کا مالک، دراصل خود نوشت سوانح عمری کا رنگ شخصیت کے رنگوں سے چوکھا ہوتا ہے بنیادی بات یہ کہ اس نے کیسی زندگی گزاری اور اتنی ہی اہم بات یہ کہ وہ بیان کرنے میں کتنے اخفا سے کام لیتا ہے۔ (مثال: فرائڈ نے اپنی "AN AUTOBIOGRAPHICAL STUDY" میں اپنی محبوبہ کا نام تک درج کیا) اور یا پھر یہ کہ کتنا کھل کھیلتا ہے۔ (مثال: نشیا گراہم کی A STATE OF HEAT جو اس کی جنسی زندگی کی بارہ معاملے کی جاتی ہے)

اس تناظر میں جب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی "گردِ راہ" کا مطالعہ کریں تو وہ اخفا اور اظہار کا نمونہ نظر آتی ہے۔ یہ ایسی آپ بیتی ہے جس میں ذات کم ہے اور زمانہ زیادہ ہے۔ یوں دیکھیں تو یہ مرد اختر حسین کی آپ بیتی کے بجائے دانشور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ذہنی سفر کی روداد معلوم ہوتی ہے چنانچہ خود ڈاکٹر اختر حسین نے کچھ یہی لکھا ہے:۔

> "میں طبعًا خلوت پسند ہوں اور دنیا کو راز داں بنانا مجھے پسند نہیں، البتہ دوسروں کی طرح میں بھی اپنے دور کا گواہ ہوں۔ اپنے مشاہدے اور مطالعے پر مجھے اعتبار ہے اور کئی ایسی تحریکوں اور شخصیتوں سے

[redacted]

واسطہ پڑا جنھوں نے کسی نہ کسی طرح ماحول کو متاثر کیا۔ فطرت اور تاریخ سے دلچسپی نے کیا کیا تماشے دکھائے۔ مشرق اور مغرب کی کیسی کیسی سیاسی اور ثقافتی محفلوں سے روشناس ہوا اور فکر و عمل کے کیا کیا تجربے ہوئے۔ یہ تذکرہ خالی از لطف نہیں۔" (ص: ۱۰)

اور یہ بالکل درست ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ذہنی سفر کے مختلف مراحل دراصل برصغیر کی تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور ادبی زندگی کے روشن نقوش و رسور نقطوں سے عبارت ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے برصغیر کی تاریخ کے اس دور میں جنم لیا جب سامراجی تسلط کے خلاف سیاسی جدوجہد اور عملی مزاحمت کے ساتھ ساتھ ادب و ثقافت اور شعر و نقد کے حوالے سے تجربات اور بغاوت کی صورت میں نئے ذہنی رویے، نگاہ کے متنوع زاویے اور سوچ کے بدلتے دھارے، جامد سماج میں ہل چل پیدا کر رہے تھے اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اس لحاظ سے ۸۱۱ ۔۔۔ ۱۴ قرار پاتے ہیں کہ وہ ان سب میں پیش پیش رہے ہیں۔

"گردِ راہ" کے سرورق پر بریکٹ میں ذیلی ٹائٹل کے طور پر تین الفاظ ملتے ہیں۔ خود نوشت، مطالعہ، مشاہدہ۔۔۔ اور ان تین خطوط سے مرتب ہونے والے مثلث کے کوزے میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی زندگی کا دریا موجزن نظر آتا ہے، لیکن شخصی اور اس کے مطالعے یا مشاہدے کو الگ الگ ہوا بند ڈبوں میں بند بھی تو نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ سب مل کر ہی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب کے تحت الشعور میں کوئی اس طرح کی غیر مرئی حد و دسول، لیکن قاری کو اس کا احساس نہیں ہوتا، کیونکہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ ان کی شخصیت میں یوں شیر و شکر ہوئے ہیں کہ اب ان میں امتیاز ممکن نہیں رہا اور اس لیے اس خود نوشت کا مطالعہ اس کے لکھاری کی صحبت میں ایک خوش گوار سفر نامے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسا سفرنامہ جس کے اختتام پر قاری ذہنی لحاظ سے خود کو پہلے سے زیادہ امیر محسوس کرتا ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے طرزِ تحریر کا یہ وصفِ خاص ہے کہ وہ نہ تو معلم کا روپ دھارے ہوئے معلومات کے دریا بہاتے ہیں، نہ دانشور بن کر زندگی، ادب اور فنونِ لطیفہ کے مسائل سلجھاتے ہیں نہ اپنے عصر پر الزام دھرتے ہیں اور نہ اداروں کی تضحیک سے بیانات اونچا کرتے ہیں نہ تعلّی ہے نہ انکسار اور پھر سرنامے کا یہ شعر:

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست — خام بدم، پختہ شدم، سوختم

الغرض انھوں نے اپنے رواں انداز میں اپنی زندگی کے حوالے سے اپنے زمانے کی تصویر کشی کی ہے۔ اس میں قومی اور بین الاقوامی اہمیت کی حامل جن شخصیات سے ان کے روابط رہے ان کے بارے میں ان کا رویہ تکریم کا رہا ہے تاہم ان کا اگر کہیں تو اس کا تذکرہ بھی تلخی سے خالی رہا۔

یہ ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب ہمیں بتاتے ہیں کہ [illegible] اور ان کے معدرہائت کی [illegible]

[illegible] کہا جا سکتا ہے [illegible] اور لیاقت تعلیم [illegible] ہوتی تو وہ اتنی ترقی نہ کرتے اور پھر ہمارے ہاں ذہانت و لیاقت والے لوگوں کی کمی بھی نہیں۔ ہمارے تمام اعلیٰ حکام اور سی۔ایس۔پی افسران یقیناً ذہین اور لائق ہی تو ہوتے ہیں، ورنہ وہ یہ بلند مقام حاصل نہ کرتے۔ اس لیے مجھے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں ذہانت اور لیاقت کے عناصر نے بطورِ خاص متاثر نہ کیا۔ متاثر جس نے کیا وہ ہے ان کا مطالعہ۔ یہ مطالعہ جو محض کتابوں تک محدود نہیں بلکہ اس میں انسان اور فطرت کا مطالعہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی کشش کا ایک باعث اس ہمہ جہت مطالعہ اور کثرتِ نظارہ سے وا چشم کے زاویوں کی دل کشی بھی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:۔

"گاہے گاہے خانۂ خالی را پری می گیرد، ہما کا سایہ ہو تو پیغمبری اور شاہی مل جاتی ہے، جن گر نیک مزاج ہو تو الہ دین کا چراغ دیتا ہے، لیکن پری کے سائے تلے صرف خلل دماغ کی پرورش ہوتی ہے۔۔۔" (ص: ۱۴۰)

اور اس کے ساتھ مندرجہ ذیل سطریں ملا کر پڑھیں تو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو سمجھ میں آجاتے ہیں ۔

"حسن کا ہر روپ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ۔ ان میں عورت کا حسن سب سے آنی جانی چیز ہے جو بقول "دے گول " گلاب کی طرح ورق ورق کھلتا اور اسی طرح مرجھاتا جاتا ہے ۔ آرٹ، کردار اور فطرت کے حسن کو دوام ہے ۔ جب کبھی انسانوں سے مجھے دکھ درد ملا تو سکون کی تلاش میں پہاڑ کے دامن یا سمندر کے ساحل پر چلا گیا ۔ برف پوش پہاڑ میں میرے لیے خاص کشش ہے ۔" (ص: ۱۴۱)

عام افراد کی مانند ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو بھی زندگی نے کئی معاملوں میں زک پہنچائی ہو گی، لیکن فطرت پرستی نے ہمیشہ زخموں کے لیے مرہم کا کام کیا ہو گا، اس لیے کہ فطرت میں صحت مندی کی بہت بڑی قوت موجود ہے جس سے ہم کثیف شہروں میں رہنے والے انسان اس حد تک دور ہو چکے ہیں کہ اگر کبھی پک نک کے بہانے "فطرت" سے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو ٹرانسسٹر، تاش اور کافی کے تھرمس ساتھ لے جا کر اس کے تاثر کو غارت کر دیتے ہیں ۔ اسی لیے تو فطرت اور انسان کے رابطے کی صحت مند بنیاد کی گواہی کے طور پہ ورڈز ورتھ کی شاعری امر ہے، اور مجھے اس کی روح ڈاکٹر صاحب میں بھی محسوس ہوئی جن کے لیے پہاڑوں میں "کوہ ندا" کی سی ایسی کشش تھی" (ص: ۱۴۰) کہ وہ اسے "سحرِ سامری کا سا اثر" قرار دیتے ہیں۔ (ص: ۱۴۱)

خود نوشت سوانح عمریوں میں فطرت کے مناظر کی جیسی خوبصورت تصویریں پابلو نرودا نے کھینچی ہیں وہ اتنی سچی ہیں کہ ترجمے کے باوجود بھی ان کے حسن کا جادو قاری کو مسحور کر دیتا ہے ۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے اس انداز پر منظر نگاری تو نہیں کی لیکن فطرت سے اپنی محبت کے اظہار کے کسی بھی موقع کو وہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ شاید ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب خود نہیں لکھی بلکہ لکھوائی ہے اور ظاہر ہے بولنے میں وہ بات نہیں جو لکھنے میں ہو سکتی ہے ۔

"گرد راہ" میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے تہذیب، سیاست، ثقافت اور ادب و نقد کے حوالے سے اپنے عصر کے بارے میں جو لکھا اور اہم شخصیات کے جو قلمی مرقعے کھینچے (جن میں مولوی عبدالحق کا مفصل خاکہ سرفہرست قرار پاتا ہے) وہ اپنی انفرادی حیثیت میں دلچسپ یا معلومات افزا ہونے کے ساتھ ساتھ ادب و ثقافت اور تہذیب و سیاست کی وسیع تاریخ میں کہیں اضافے کرتے ہیں، کہیں مسالا زاد یہ مہیا کرتے ہیں، کہیں تردید کرتے ہیں تو کہیں فٹ نوٹس کا بھی کام کرتے ہیں ۔ اس مختصر مضمون میں ان سب کا محاکمہ آسان نہیں لیکن اتنا یقین ہے کہ ہماری ادبی اور ثقافتی تاریخ لکھنے والے "گرد راہ" کو اہم حوالے کی چیز پائیں گے اور اس کے لیے ہمیں صہبا لکھنوی کا ممنون ہونا چاہیے جنھوں نے ان سے نہ صرف یہ خود نوشت قلم بند کرائی بلکہ "افکار" میں چند اقساط کی اشاعت سے قارئین کا ذوق تجسس بیدار کیا اور پھر بعد میں اسے ایک دیدہ زیب کتاب کی صورت میں پیش کیا ۔

سید مقصود زاہدی

گردِ راہ — ایک مطالعہ

"۔۔۔ سال کی عمر میں میں علم کی روشنی کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا اور اب گردِ راہ کو دامن سے جھٹکنے کی فرصت ملی ہے ۔۔"

حرفِ آغاز میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے لکھا ہے۔ وہ طبعاً خلوت پسند رہے ہیں، پھر بھی اُن کی ساری عمر تحصیلِ علم اور علم کو پھیلانے میں بسر ہوئی ہے۔ جو کچھ اُنھوں نے اپنے عہد اور اپنے ماحول سے اخذ کیا ہے اسے ابتدا میں افسانوں، مضامین اور تنقید کی صورت میں اپنے اِرد گرد پھیلاتے رہے اور عمر کے آخری دور میں اپنی عمر کا حاصل اُنھوں نے سرگزشت کی شکل میں اردو خواں طبقے کی نذر کیا ہے۔ گردِ راہ ایک عہد آفریں تخلیق ہے اور اس کا خالق بجا طور پر کہہ سکتا ہے ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

اس ادبی تخلیق سے اگر ہم خرد افروز جواہر پارے تلاش کریں تو ہمارا دامن بھر جائے گا۔ پھر بھی بہت کچھ بچ جائے گا۔ بہر حال قارئین کے لیے تھوڑا سا اپنا مطالعے کا حاصل پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے نثر میں گُل کاریاں کی ہیں۔ وہ انتہائی حسین خیالات کو بڑی خلاقی کے ساتھ کتاب کے صفحات پر بکھیرا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"۔۔۔ لامکاں کے مقابلے میں ہمارا ارضی مکان کتنا حقیر ہے، ناپیداکنار زمانے کے مقابلے میں حیات کے لمحات کتنے مختصر۔ لاکھوں سال پہلے کسی ارتقا کے کرشمے نے ایک دو ٹنگے جانور کو پیدا کیا جو بھوک، شہوت اور زمین گردی کی تسکین میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اس کاوش کی داستان کو تاریخ کہتے ہیں۔ مذہبوں اور نظریوں کی کشمکش، رنگ و نسل کے تنازعے، طبقاتی جدل اور قومی و لسانی تعصبات کے نرغے میں انسان اس طرح مبتلا ہے کہ تہذیب کا ملمع ڈھل گیا اور آدمی بساطِ ہستی پر اُسی طرح اوندھا پڑا ہے جہاں اُس کے جدِ امجد نے باغِ عدن یا پہاڑ کی کھوہ سے نکل کر خود کو پایا تھا۔"

ایک جگہ زندگی اور انسانی جدوجہد پر خیال آرائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"۔۔۔ میں ازل اور ابد کے رازوں سے ناواقف، نقط عالمِ وجود کے عجائبات کا تماشائی ان سوالوں کا کیا جواب دے سکتا ہوں ۔۔۔

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم"

اس شعر کا حوالہ دے کر ڈاکٹر صاحب نے بظاہر اپنے علم کے عجز کا اظہار کیا ہے، لیکن اُن کی کتاب کا مطالعہ یہ بتلاتا ہے کہ وہ زندگی کے مسائل و افکار پر ایک منفرد رائے بھی رکھتے ہیں۔

"۔۔۔ زبان کی ترقی معاشرے کی ترقی سے وابستہ ہے۔ معاشرے کی ترقی کا تصور تنقید کے بغیر نہیں کیا جا سکتا اور یہ کام نثر کا ہے۔ جب ہم کسی ملک کی پس ماندگی کا ذکر کرتے ہیں تو مُراد صرف اُس کی معاشیات سے نہیں۔ یہ بات دور تک پہنچتی ہے اور تجزیہ بتلاتا ہے کہ بنیادی طور پر تصور ذہنی پستی کا ہے اور اس کی اصل وجہ تنقید سے گریز ہے ۔۔۔"

شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے (اس سے قطع نظر کہ دوسروں کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں، وہ اپنی رائے کا بلا تکلف یوں اظہار کرتے ہیں ۔۔۔

"۔۔۔ شاعری کی لغت محدود ہے۔ کیونکہ یہ اصلاً عالمِ بیداری کی نہیں، عالمِ خواب کی لغت ہے۔ اس کا مقصد گفتگو نہیں سرگوشی ہے۔ جب تک جہانِ ایجاد قبائلی اور زرراعتی معاشرے تک محدود تھا اور شاعری کی نغمگی پر موسیقی کا دھوکا ہوتا تھا، شاعری خدا، فطرت اور عورت کی رازدانی کا دعویٰ کر سکتی تھی، لیکن جب جدید علوم کا دور چند صدیوں پہلے شروع ہوا اور اس کے ساتھ صنعت و ابلاغ کا دور دورہ ہوا تو جہانِ معنی میں ایسی وسعت ہوئی کہ شاعری کا دامن سمٹ کر رہ گیا۔ اس حد تک کہ بیسویں صدی کے وسط سے لے کر اب تک دنیا کی کسی زبان میں کوئی بڑا شاعر نہیں ہوا ۔۔۔"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تمام زندگی حصولِ علم اور تبلیغِ علم میں بسر ہوئی۔ وہ بڑے ادیب، بڑے نقاد اور بڑے معلم رہے ہیں۔ وہ حکومتِ ہند اور بعد ازاں حکومتِ پاکستان کے تعلیمی مشیر رہے ہیں اور اقوامِ متحدہ کے ادارہ یونیسکو کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ وہ ایک عظیم ادیب کی حیثیت سے نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں بلکہ مشرقِ وسطیٰ اور یورپ میں بھی جانے پہچانے گئے۔ علم اور زبان و ادب کے بارے میں ان کے خیالات سے استفادہ کرنا ہمارے معاشرے، ہماری حکومت اور علمی اداروں کا فرض ہے۔ وہ زبان اور تعلیم کے مسائل پر فرماتے ہیں۔

"۔۔۔ تعلیم کسی نہ کسی زبان کے وسیلے سے دی جاتی ہے، اور اس کی افادیت ذریعۂ تعلیم کے علمی و ادبی ذخیرے کے اعتبار سے گھٹتی اور بڑھتی ہے۔ اپنی بولی سب کو پیاری ہوتی ہے، لیکن اسے ذریعۂ تعلیم بناتے وقت فیصلہ جذبات کو نہیں عقل و شعور کو کرنا چاہیے۔ اگر افریقہ کے نو آزاد ملک بارہ پندرہ سال کی مدت میں ترقی کے پہلے زینے پر آ کھڑے ہوئے تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی پس ماندہ قبائلی بولیوں کو نہیں بلکہ انگریزی اور فرانسیسی کو اپنی مرضی سے منتخب کیا ۔۔۔"

اس سے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ ہم انگریزی یا فرانسیسی کو اپنا لیں، لیکن اس کا یہ مدعا ضرور ہے کہ ہماری ذریعۂ تعلیم وہ زبان ہو جس کا معاشرتی اور تہذیبی لٹریچر بھرپور ہو۔

علم کے حصول کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے ساری عمر حقیقت کی تلاش بھی جاری رکھی اور نتائج وہ اس سرگزشت میں قدم قدم پر بیان کرتے ہیں۔

"ازل و ابد کے متعلق تو اختلاف رائے ہوسکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار کا چارہ نہیں جس سے ہر فرد کو اپنی پیدائش اور موت کے درمیان زندگی میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اگر پیدا ہونے سے پہلے جان داروں کو معلوم ہوجائے کہ زندگی میں انھیں کن مراحل و مسائل سے گزرنا ہوگا تو غالباً وہ وجود پر عدم کو ترجیح دیں گے۔"

آرٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"آرٹ بشمول شعر و ادب وقت کی قید کے پابند ہیں اور علم کی منطقی ترقی کے اصولوں کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ علم بحرِ بے کراں ہے جس کے کنارے نیوٹن جیسا بے ہمتا سائنس داں ششدر کھڑا رہ گیا تھا اور آرٹ ایک سلسلۂ کوہ ہے جس میں چھوٹی بڑی چوٹیاں ہوتی ہیں اور پھر یہ سلسلہ گھٹتے گھٹتے زمین سے آلگتا ہے۔"

ایک مقام پر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

"یہ سچ ہے کہ رات کی خاموشی کو کبھی نہیں سن سکتا اور نہ اُفق کے پرے ماورا کو دیکھ سکتا ہوں۔ لذت جو حاصلِ حیات ہے مجھ سے الفاظ میں بیان نہیں ہوتی ۔ ۔ ۔"

یہاں میں یہ سوچتا ہوں کہ جب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری جیسے ادیب کو بعض باتوں کے اظہار کی راہیں الفاظ کے ذریعے نہیں سوجھتیں تو یہ نہیں ہوسکتا کہ اظہار کی راہیں قطعی مسدود ہوں۔ عین ممکن ہے کہ یہی تمام ماورائی باتیں رقص، موسیقی اور مصوری کی صورتوں میں تشکیل پذیر ہوجاتی ہوں یا وہی شاعری جسے وہ کہتے ہیں کہ اُس کی لغت محدود ہے اُسی میں ایسے مظاہر اور محسوسات کا احاطہ کیا جانا ممکن ہو۔ اور یہ بات تو بالکل درست ہے کہ انسان سب کچھ جاننے کے باوجود آخر دم تک طفلِ دبستان ہی رہتا ہے۔ اسی بات کو میرؔ نے کہا ہے ؎

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا میرؔ
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

حسن کے بارے میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے تاثرات بہت منفرد ہیں۔ کہیں اُنھیں آواز کی یاد ستاتی ہے، کہیں کردار کی۔ ایک عمر گزرنے پر اور موسیقی میں یکتا مُطرباؤں کی خوش نوائیوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد اُنھیں جو آواز بے طرح یاد آتی ہے وہ بلغاریہ کی رہنے والی پیرزن مادام برتر سیر کی ہے۔ جس کے گیت کی لے، بقول اُن کے "دل کی گہرائی سے فضا کی بلندی تک پہنچ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ آواز ایسی روشن تھی گویا چاندی کی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ پھر ایسی آواز کبھی سننے میں نہیں آئی۔"

اسی طرح ایک فلسطینی لڑکی کی یاد وہ ذہن سے محو نہ کرسکے۔ جسے "میں نے غزہ کے اسرائیلی قید خانے میں کتاب کا مطالعہ کرتے دیکھا تھا۔"

یہاں اُنھیں ظلم اور بے انصافی سے برد آزما کردار کا حسن متاثر کرگیا۔ اس بارے میں وہ کہتے ہیں:۔

"یہی وہ نکتہ ہے جہاں جمالیات کے فرسودہ نظریے لاجواب ہوجاتے ہیں"

کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب کو سب سے زیادہ حُسنِ فطرت نے متاثر کیا ہے۔

"بالخصوص برف پوش پہاڑوں کے منظر نے، سمندر کی ازلی بے قراری نے"

دراصل حُسن کا کوئی معیار ایسا نہیں جو سب کے لیے یکساں قابلِ قبول ہو۔ حُسن کے بے شمار روپ ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:۔

مشہور فرانسیسی مفکر والٹیر اس نتیجے پر پہنچا کہ "حُسن کی کوئی تعریف ممکن نہیں"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اِدارہ یونیسکو میں تقریبًا ستّرہ برس ملازمت کی ہے اور تمام مشرقِ وسطےٰ بالخصوص ایران اور صومالیہ میں مشیرِ تعلیم کی حیثیت سے خدمات سرانجام دی ہیں۔ انھوں نے احتیاط اور جرأت سے مسلمان ملکوں کے تہذیبی اور معاشرتی ارتقا کے باب میں محاکمہ کیا ہے جس کا نچوڑ یہ ہے کہ مسلمان ایک جانب تو ہر مقام پر یہ کہتے ہیں کہ ان کا مذہب اور ان کی تعلیمات انھیں تسخیرِ کائنات کے سبق پڑھاتی ہیں، لیکن ساتھ ہی ہر نئے قدم پر جو ترقی کی جانب اُٹھے، وہ کفر کا فتویٰ لگانے سے باز نہیں آتے۔ اس طرح وہ ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے چلتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے ان کی ہر ترقی، ترقیِ معکوس کا درجہ رکھتی ہے۔۔ مسلمان حکمراں طبقہ مذہبی جذبات کو بھڑکا کر مسلمان عوام کو آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ یوں ایک طرف مسلمانوں کی آبادی اپنے تمام مسائل کی خاطر بڑی طاقتوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے محکوم اور مفتوح جاپانی قوم کا ذکر کر کے ثابت کیا ہے کہ محنت کی دھنی اور عزمِ صمیم کی مالک قومیں ہر حالت میں خود کو سنبھالنے کا دم رکھتی ہیں۔ جاپان اور جرمنی کی مثالوں سے اُنھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ مقصود بلندی ہو تو زینے ہیں بہت۔

سولہ سال کی عمر میں علم کی تلاش میں گھر سے نکلنے والے طالب علم اور آج کے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری میں کئی قرنوں کا فاصلہ ہے۔ اس دوران وہ اپنے ملک اور بیرونِ ملک ہزاروں انسانوں سے ملے ہیں۔ یہ سب انسان اپنے اپنے ملکوں اور تہذیبوں کے نمائندے تھے۔ ان میں مردم بیزار اور انسانیت دوست سبھی طرح کے لوگ تھے۔ ان سب کو قریب سے دیکھنے اور دنیا جہان کا ادب پڑھنے اور اہلِ عقل اور اہلِ ایمان حضرات کی صحبت میں بیٹھنے سے جو شعورِ زیست اور انسان شناسی کا جوہرِ قابل مصنف میں پیدا ہوا ہے اور جنگِ عظیم دوم سے قبل اور مابعد کے معاشرتی، علمی اور ادبی ہنگاموں نے جس طرح اس جوہرِ قابل کی تربیت کی ہے اُس کی وجہ سے "گردِراہ" حقائق شناسی کی ایک ایسی یادگار دستاویز بن گئی ہے جس پر اُردو ادب نازاں ہوسکتا ہے۔

فضل قدیر

گردِ راہ — ایک نظر میں

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام کسی ادبی تحریر کے انتہائی معتبر اور ثقہ ہونے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ علم و ادب ساری زندگی ان کا اوڑھنا بچھونا رہے ہیں اور انھوں نے پرورشِ لوح و قلم کے لیے بڑے کشٹ جھیلے ہیں۔ اور اسی کے نتیجے میں انھیں آج چوٹی کے نقادوں اور تخلیق کاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین پہلے نقاد ہیں جنھوں نے ادب کو معاشی پس منظر میں دیکھا اور پرکھا۔ ان کی کتاب ادب اور انقلاب جو اُن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ تھی ایک انقلاب انگیز کتاب تھی جس نے تنقید کے فرسودہ اسلوب کی کایا پلٹ دی۔ اس میں انھوں نے منفعل مرنجان مرنجی اور کسی کو ناراض نہ کرنے کا ڈر نکال دیا۔ ان کے لب و لہجے میں ایک بے باک انداز کے ساتھ ایک جرأت مندانہ قطعیت بھی تھی جو گہرے مطالعے کے ساتھ ایک مزاجی صداقت کی غماز تھی۔ چبا چبا کر باتیں کرنا، کمزور نحیف اور مبہم انداز میں آرا دینا ان کے مزاج کے قطعی منافی ہے۔ جب یہ کتاب منظرِ عام پر آئی تو سال خوردہ لوگوں نے اس پر ناک بھوں چڑھائی اور انھیں ہدفِ ملامت بنایا۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے اس قدیم سیاسی اور معاشی پس منظر پر نظر کرنا ہوگی جس کے تحت دل و دماغ میں ایک انداز کی دوئی اور منافقت کی جڑیں مضبوط ہو گئی تھیں۔ علم و ادب بادشاہوں کی ڈیوڑھیوں میں پروان چڑھنے کے باعث اظہار کی بے باکی اور بے ساختگی سے تہی تھے۔ تنقید کا جو قدیم سرمایہ نام نہاد تذکروں کی صورت میں ڈاکٹر اختر حسین کی تانتی کو ملا اس میں حقیقت پوچھیے تو عقلی اور استدلالی کوئی بھی زاویہ نہیں تھا۔ یہ مختصر رسیا رکس یا اس انداز کے تعارف تک محدود تھے جیسے کہ آج کل بعض تجارتی مقاصد رکھنے والی کمپنیاں اور ناشرین ضلعی ڈائرکٹریاں شائع کرتے ہیں جس میں تصویریں بھی شائع کی جاتی ہیں اور متعارف کیے جانے والے شخص سے ایک معقول رقم بھی اس تعارف کی وصول کی جاتی ہے۔ اس تعارف میں اس شخص کے خاندانی اور معاشی مرتبے کا ذکر ہوتا ہے اور کچھ کلماتِ خیر اس کی شخصیت کے متعلق کہے جاتے ہیں جو سراسر یک طرفہ ستائش پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ روایت بڑی دیر تک ذرا سی تبدیلی کے ساتھ جاری رہی۔ حقیقی تنقید کے اس فقدان سے الجھ کر ہی کلیم الدین احمد نے اردو تنقید کے متعلق کچھ نا ملائم جملے کہہ دیے تھے اور اسے معشوق کی موہوم کمر سے تشبیہ دی تھی۔ اس پر کئی دہائیوں تک ان کی تھیڑی پٹتی رہی اور ہر ثقہ ادیب نے اس پر ضرب لگانا اپنا فرض گردان لیا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے جب ادبی تخلیق کا آغاز کیا تو سماجی اور سیاسی منظر میں بڑی تبدیلیاں آ چکی تھیں اور اس کے نتیجے میں شعر و ادب کے سانچوں اور نقد کے پیمانوں میں بھی بڑی کشادگی آئی تھی۔ حالی کی بے مثال تنقیدی کتاب مقدمہ شعر و شاعری منظرِ عام پر آ چکی تھی اور سرسید کی عقل پرستی کا رنگ بھی چوکھا ہو چکا تھا۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حالی اور سرسید دونوں نے مغرب کے افکار و خیالات

کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا تھا یا کسی نہ کسی حد تک بالواسطہ ان تک پہنچے تھے اور شاید انھیں خاطر خواہ انداز میں پچ نہیں سکے تھے۔ ڈاکٹر اختر حسین کے بُستانِ ادب میں داخلے کے وقت، مخزن، نگار اور زمانہ نامی ادبی رسائل کا شباب تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ بھی خیال کی گہرائیوں کے بجائے الفاظ کے پیمانوں سے کھیلنے کے عادی زیادہ تھے اور معرکۂ چکبست قسم کی تحریری مناظرہ بازی میں زیادہ الجھے ہوئے تھے۔ گویا یہ بھی شاہی دور کی ساختہ روایات میں لپٹے ہوئے تھے۔ اصناف شعر میں کچھ ڈرے سہمے سے تجربات بھی ہوئے تھے۔ قصیدہ دم توڑ گیا تھا اس لیے کہ اب وہ ڈیوڑھیاں نہیں تھیں، وہ نام نہاد جہاں پناہ بھی نہیں تھے جن کے لیے غالب کو یہ کہنا پڑا تھا کہ منبر اس لیے بلند ہیں کہ خطیب کو خطبہ میں ان کا نام لینا پڑتا ہے۔ مگر پھر بھی جارج پنجم کی سالگرہ پر تہنیت منظوم اور صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر اور سیشن جج بہادر کے فرزندانِ دل بند اور دختران نیک اختر کے سہرے دھڑلے سے کہے جاتے تھے اور اس میدان میں اس دور کے بعض ثقہ شعرا بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے بُرّاں اور قطعی لہجے نے فکری سانچوں کو مرتعش کر دیا۔ ان کی بے لاگ آرا نے دنیائے انتقاد میں ایک کھلبلی سی ڈال دی اور اب تنقید نے بھی ایک چولا بدلا۔ مگر بڑی بات تو یہ ہے کہ جو لہریں متمدن سائنسی دنیا سے اٹھتی تھیں وہ جوں کی طرح رینگتی ہوئی ہم تک پہنچتی تھیں اور حد تو یہ ہے کہ رسل و رسائل کے اس سریع الحرکت دور میں بھی ان کی رفتار کچھ زیادہ تیز نہیں ہوئی ہے۔

اختر حسین رائے پوری کے افکار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اس میں انھیں کوئی آزردگی نہیں۔ میں اپنے ذاتی تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ قطعی ہٹ دھرم نہیں ہیں۔ اقبال کے ضمن میں انھوں نے اپنے خیالات پر نظر ثانی کی ہے اور اس کا اعتراف پیش نظر کتاب میں بھی ہے۔ اب تک ڈاکٹر اختر حسین صاحب کے تنقیدی نظریات پر بات ہو رہی تھی جو ان کی پیش نظر کتاب کو سمجھنے کے لیے مجھے ضروری محسوس ہوئی۔ اب میں خاص "گرد راہ پر آتا ہوں" کہ اس جھاڑی ہوئی گرد میں بہت آب دار موتی نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کتاب میں بھی اور ان کے افسانوں میں بھی ان کا اسلوب منفرد ہے۔ اس میں ایک شائستہ مزاج ندی کی پوری کو ملتا ہے جو ہموار میدانی علاقے میں چھالوں سے کتراتی رساں رساں بہتی کھیت کیاری کو سیراب کرتی کسی بڑے دریا میں جا گرتی ہے۔ اسلوب کا یہ سبھاؤ انھیں شاید اس لیے میسر آیا ہے کہ ان کا بچپن اور جوانی مدھیہ پردیش کی بھاشا کے دامن میں گزرا اور انھوں نے تعلیم کا پہلا زینہ ہندی کی پوڑی چڑھ کر طے کیا۔ اس وقت کی ہندی پر تعصب اور تنگ نظری کا ملمع نہیں چڑھا تھا اور وہ مقامی بولی کی بے ساختہ ترجمان تھی۔ پھر مدھیہ پردیش کی بھاشا کے ساتھ بانکی پور (پٹنہ) کا جیت پوری لب و لہجہ جو انھوں نے اپنے والد کی زبان سے سنا، سونے پر سہاگے کا کام کر گیا ہے۔ ۲۱۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کوئی ایک سطر بھی ایسی نہیں جہاں یہ جوئے شیر تھمی یا گدلائی ہو۔

کتاب کا پہلا باب "زندگی کے ابتدائی سال" میں مختصر اور محتاط سوانح ہے کیونکہ حرف آغاز میں وہ کہہ چکے ہیں کہ "میں طبعاً خلوت پسند ہوں اور دنیا کو رازداں بنانا مجھے پسند نہیں"۔ تاہم اس مختصر سوانحی خاکے کے ساتھ انھوں نے جو سماجی و سیاسی پس منظر پیش کیا ہے وہ ایسے فن کارانہ انداز میں ہے جس سے پورا عہد سانس لیتا محسوس ہوتا ہے اور اس میں کہیں خشکی اور گرانی محسوس نہیں ہوتی۔ اس پس منظر کی کڑیاں کچھ اس خوب صورتی سے جوڑی ہیں کہ مصنف کا فکری سفر بڑی دل پذیری سے واضح ہو جاتا ہے اور نہ صرف یہ کہ اس سے مصنف کے ذہن پر مرتب ہونے والے اثرات کا پتہ لگتا ہے بلکہ پورے سماج کے ذہن میں آنے والے موڑ عیاں ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ادب و شعر کے سانچوں میں تبدیلی بھی نظر آ جاتی ہے۔

کلکتے کی یاد میں دوسرا باب ہے جو بہت رنگا رنگ ہے۔ اس میں ہندی صحافت کے بنتے ہوئے کاخ و کو کے ساتھ ساتھ بعض اہم علمی و سیاسی شخصیتوں کی جھلکیاں قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتی ہیں۔

چوتھے باب میں حیدر آباد دکن کی انجمن آرائی کے ذیل میں اردو ہندی کی آویزش کی پوری تاریخ سامنے آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی

فضل قدیر

دو قد آور شخصیتوں مولوی عبدالحق اور سر ڈینی سن راس سے قریبی واقفیت اور ان کی زندگی کے بعض پوشیدہ گوشے منکشف ہوتے ہیں اور یہ باب قاری کی محویت کو انتہائی مرکزیت تک پہنچا دیتا ہے۔ اور قدم قدم پر لطیف و شریف اور استعجاب انگیز انکشافات اس کا دامن تھامے رہتے ہیں اور اس کی ضیافت طبع کا سامان تسلسل سے موجود رہتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے قاری کے اعتماد کو کہیں ٹھیس نہیں پہنچائی۔ ٹھیس اس صورت میں پہنچتی ہے جب مصنف کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو اور قاری کو طول طویل عبارتوں میں چکر پھیریاں دے کر اسے دم دلاسا دیتا رہے۔ یہاں صورت یہ ہے کہ قاری کو احساس ہوتا ہے کہ مصنف کے پاس بہت کچھ ہے اور وہ اختصار سے کام لے رہا ہے۔ کتاب کی آخری دو سطریں اس حقیقت کا سچا اظہار ہیں۔

"یہ روحانی اور ذہنی سفر آسان نہ تھا اور اس کے بیان میں مجھے لامحالہ اختصار سے کام لینا پڑا۔ ناسازگار حالات نے کئی گفتنی معاملات کو بھی ناگفتہ رہنے دیا ہے"

میرے ذاتی علم میں یہ بات ہے کہ پریم چند سے ڈاکٹر صاحب کے نہایت پرتپاک تعلقات تھے اور باہمی خط و کتابت بھی تھی۔ وہ پریم چند پر بہت کچھ لکھ سکتے ہیں مگر زیر نظر کتاب میں ان کا ذکر بہت سرسری ہے۔

اس کتاب میں حسن و رنگ اس طرح سمٹ آیا ہے کہ اس میں بیک وقت کئی کیف پیدا ہو گئے ہیں۔ یورپ کا پہلا سفر۔ سیر عالم' ایران میں چار سال' فلسطین میں چند ہفتے' اسپین کی جھلکیں' امریکہ کے چند تاثرات' جاپان کی دل آویزی' چند دیگر ممالک کی بھولی بسری یادیں۔ ایسے ابواب ہیں جو اس مجموعے کو رپورتاژ اور سفرنامے کا روپ بھی دیتے ہیں۔ یہ بیک وقت سیاسی و سماجی تاریخ بھی ہے اور ادبی تاریخ بھی۔ موضوعات کا یہ تنوع اور بوقلمونی تحریر کی تصویر کشی کی یہ زنگارنگی' تخیل کا کیف' مقام حیرت ہے کہ نثر کی مدھر بل کھاتی لہراتی آب جو کس طرح داغ داغ اور جستہ مناظر اور حسن کی کیفیات کو ایک کل میں مربوط کرتی آگے بڑھتی رہتی ہے کہ کوئی ٹکڑا کوئی پیراگراف بے ڈول نہیں ہوتا۔ ایک خوبصورت چوکھٹے میں ایک بڑی سی سبز میں جڑی ہے۔ اور ایک منظر کے بعد دوسرا تیار ہے۔ یہ جامعیت اور مرتب فکر کا کمال ہے۔

اس کتاب کا ہر باب ایسے محاسن کا حامل ہے کہ اس کی توصیف آسان نہیں۔ البتہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن پر مصنف سے اور کچھ سننے کو جی چاہتا ہے۔ میرے ذہن میں چند باتیں جو ابھری یہ ہیں:

(۱) مصنف کا لغت نویسی سے خاصا طویل عرصے تعلق رہا ہے۔ اردو زبان کو وسیع کرنے کے لیے ان کے ذہن میں کیا منصوبے آتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے بعض الفاظ غریب ہو چکے ہیں اور اپنی ساخت کے اعتبار سے خاصے بے جوڑ نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے پاس رسوئی یا کچن کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں۔ باورچی خانہ اپنا ایک جاگیردارانہ پس منظر رکھتا ہے۔ ایک امیر کا باورچی خانہ جہاں باورچی' برتن دھونے والے اور بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک غریب کلرک' ایک کسان ایک مزدور کے گھر کا وہ گوشہ جہاں وہ خود یا اس کی بیوی کھانا پکائے باورچی خانہ کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔ پھر رسوئی کا مطبخ بھی کام نہیں دیتا اس کی ثقالت کانوں پر گراں گزرتی ہے۔ پھر خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم "بھوک ہڑتال" اپنا سکتے ہیں تو رسوئی کو اپنانے میں کیوں پس و پیش ہو۔ اس طرح بھاشا کے بہت سے سیدھے سادے الفاظ اپنے دامن میں سمیٹے جا سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی چند باتوں کا اور بھی خیال آتا ہے۔ غالب نے کہا تھا

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہم ایسا کیوں کرتے ہیں۔ نہایت ثقہ موضوعات حتیٰ کہ حمد و نعت میں "شراب الست"، "حب علی" وغیرہ وغیرہ استعارات سے کام کیوں لیتے ہیں۔ یہ روش کن اثرات سے آئی؟ کیا اس سے اجتناب ممکن نہیں۔ یہ اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر ڈاکٹر صاحب ایک زبان داں کی حیثیت سے بہت کچھ لکھ سکتے ہیں۔


Miss
Fay

رئیس امروہوی

گردِ راہ

بعض اشخاص روایتوں اور اساطیری کہانیوں کی طرح تاریخ کے حافظے میں زندہ رہتے ہیں اور بلاشبہ انھیں بقائے دوام کی عظمت نصیب ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری انہی اساطیری افراد میں سے ایک ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں رائے پور (سی پی) میں پیدا ہوئے۔ حیران کن اتفاق یہ ہے کہ اردو کے بجائے ہندی سے تعلیم کا آغاز ہوا اور ہندی نگارش میں اتنی پختگی حاصل کرلی کہ سولہ برس کی عمر میں ان کا پہلا افسانہ "پراجت" کے نام سے منشی پریم چند کے رسالہ "مادھوری" میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو کی حد تک صرف قاعدہ بغدادی پڑھا تھا (اسی قاعدے سے ہم سب کی تعلیم کی بسم اللہ ہوتی تھی) ان کے نفسِ ناطقہ کی تعمیر اردو ادب کے سنگ وخشت سے ہوئی تھی۔ ایک دورساں نہ گمان! طبعِ خلاق نے جو زور مارا تو بیک لمحہ اردو ادب کا مکمل ذوقِ سلیم ان کے قلب میں جاگزیں درجلوہ گر ہوگیا۔ "گردِ راہ" ڈاکٹر صاحب کی سرگزشت ہے۔ ان کی زندگی کا امنگوں بھرا دور کلکتے سے شروع ہوا۔ بنگالی، ہندی، اردو اور انگریزی کے مختلف پرچوں سے تعلق رہا۔ صحافت اور سیاست معاشرے کی جڑواں بہنیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات ایک ایسا سنگم ہے جس میں سات دریا آکر ملتے ہیں۔ صحافت، ادب، سیاست، تنقید کا اعلیٰ ذوق، لسانیات پر ان کی نظر، شاعرانہ نکتہ شناسی، سیاحت، عالمی امور میں ان کی بصیرت، امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی سرگزشتیں اردو میں بہت کم ہیں۔ اور اس کارنامے کے شعبدہ گر دو ہی حضرت ہیں جن کی پوری زندگی ادبی جہاد میں گزری ہے۔ یعنی جناب صہبا لکھنوی! ڈاکٹر صاحب سے ان کی رودادِ حیات لکھوانا، "افکار" میں ان ابواب کی اشاعت، پھر کتاب کی شکل میں اس کی پیش کش! غرض کتنے مرحلے ہیں جو اس وادیِ پُرخار میں پیش آئے۔ آفریں ہے صہبا صاحب پر کہ وہ بہ کشادہ پیشانی ان مرحلوں سے گزر گئے۔ افکار کا ایک اور شمارہ قابلِ ذکر ہے، برطانیہ میں اردو کا نہایت ضخیم، پُرمغز معلومات، خوبصورت اور قابلِ قدر نمبر ہے۔ ادب کے ہر طالب علم کو ان خاص ادبی پیش کشوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی — ۱۶ مارچ ۱۹۸۶ء)

نصر اللہ خاں

آداب عرض

گردِ راہ

"گردِ راہ" ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت بھی ہے، ان کا حاصلِ مطالعہ بھی اور اس میں ان کے مشاہدات بھی شامل ہیں۔ یوں تو یہ کتاب ۳۱۸ صفحات پر مشتمل ہے لیکن اسے ختم کرنے کے بعد یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ جیسے کچھ کہنے کی باتیں ان کہی رہ گئی ہیں اور رجحان

تفصیل کی ضرورت تھی وہاں ڈاکٹر صاحب نے اجمال سے کام چلایا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب یہ فرمائیں کہ ؎

سنی باتوں کا کیا سننا کہی باتوں کا کیا کہنا

میں اکثر اپنے جواں سال دوستوں سے یہ کہا کرتا ہوں کہ زندہ مصنف کی کتابوں سے زیادہ وہ خود پڑھنے پڑھانے کی چیز ہوتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر رائے پوری ایسے مصنف ہیں کہ جو یہ کلیہ توڑ دیتے ہیں کیوں کہ ان کا شمار ایسے مصنفوں میں ہوتا ہے جو خود بھی پڑھنے پڑھانے کی چیز ہونے کے علاوہ اپنی زندگی میں جو کچھ لکھ جاتے ہیں تو وہ نہ صرف ان کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد بھی پڑھنے پڑھانے کے قابل ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی فکر کا سلسلہ کہیں ٹوٹتا نہیں ہے اور یہ ہر زمانے میں جاری رہتا ہے۔ وہ ماضی کے حوالے سے حال کو مستقبل کی طرف اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

ڈاکٹر رائے پوری جو میری طالب علمی کے زمانے میں ایک اہم شخصیت تھے اب میرے بڑھاپے میں ایک ادارہ اور ایک عہد بن گئے ہیں اور ادارہ اور عہد بھی کیسا ؟ ایک تاریخ ساز عہد اور بڑی اہمیتوں کا حامل ادارہ۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء کا زمانہ ایسا زمانہ ہے جسے برصغیر کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہی زمانہ ڈاکٹر اختر حسین کی فکری بلوغت کا زمانہ ہے اور اس زمانے میں ساری علمی و ادبی اور عالمی سطح کی سیاسی تحریکیں اپنے شباب پر تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان تحریکوں کا بہت قریب سے مطالعہ و مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا اور انھیں آگے بڑھانے والوں میں ڈاکٹر رائے پوری کا بھی نام آتا ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالنے والوں میں ان کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس کے علاوہ ہندی، بنگالی، سنسکرت، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں پر قدرت تامہ رکھنے کی وجہ سے اردو ادب کو عالمی سطح پر لانے کی کوششوں میں ڈاکٹر رائے پوری صاحب نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر رائے پوری کی زبان نہاری کی زبان یا چٹخارے کی زبان نہیں ہے۔ اس کا تعلق جذبات سے نہیں بلکہ ان کی فکر سے رہا ہے لہٰذا ان کی زبان اس کے باوجود کہ اس میں چٹخارے نہیں ہیں ایسی زبان ہے کہ اس پر اکبر کے اس مصرع کا اطلاق ہوتا ہے۔ ؎

بیاں ایسا کہ سب مانیں زباں ایسی کہ سب سمجھیں

اور ایسے ہی بیان و زبان کے بارے میں ایک بزرگ فارسی میں بہت پہلے یہ فرما گئے تھے۔ ؎

از دل خیزد و بر دل ریزد

ڈاکٹر صاحب کا مزاج اور ان کی فطرت ان چٹخاروں کی متحمل نہیں۔ وہ اپنی خودنوشت میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"اردو اخباروں کو ادبی چٹخاروں کی جو عادت پڑ گئی ہے اگر غور کیجیے تو اس سے ممکن ہے کہ ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہو، لیکن معیار پر برا اثر پڑا۔ مولانا آزاد، قاضی عبدالغفار اور مولانا ظفر علی خاں جیسے انشا پردازوں تک کو اس قسم کی اخبار نویسی نے نقصان پہنچایا کیوں کہ واقعات کا تجزیہ جذبات سے نہیں کیا جاتا۔"

ہم یہاں ڈاکٹر صاحب سے اتفاق نہیں کریں گے۔ اگر وہ موجودہ زمانے کی صحافت پر اس نوعیت کا اعتراض کرتے تو ہم مان لیتے لیکن جس زمانے کا وہ ذکر کر رہے ہیں تو ہم یہ عرض کریں گے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ عہدِ غلامی اور حصولِ آزادی کے زمانے میں اس قوم کے لیڈروں اور صحافیوں نے پبلک پلیٹ فارم اور قومی پریس سے عوام کے جذبات کو انگیخت نہ کیا ہو۔ یہ کام تو ایسے زمانے میں کہ جس کی توقع ڈاکٹر صاحب صحافیوں سے رکھتے ہیں باشعور سیاسی لیڈر کیا کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں تو بیشتر سیاسی لیڈر بھی جذبات سے کام لیتے رہے ہیں۔ زمانہ ہی کچھ ایسا تھا ویسے بھی ہمارے اعصاب پر جب سے اب تک جذبات کا غلبہ رہا ہے اور صحافیوں کی نئی نسل بھی جسے واقعات کا تجزیہ ڈاکٹر صاحب کے کہنے کے مطابق جذبات سے نہیں کرنا چاہیے تھا اپنے بزرگوں کی میراث پر اب تک کاربند ہے اور ماشاء اللہ یہ واقعات کا تجزیہ جذبات سے بلکہ جذبات کا تجزیہ بھی جذبات

سے ہی کرتی ہے۔

شاید آسکر وائلڈ نے ہمارے بارے میں یہ کہا تھا کہ "سوچنا" دنیا میں سب سے بڑی غیر صحت مند چیز ہے اور لوگ اس سے بھی اسی طرح مرتے ہیں جس طرح دوسری بیماریوں سے مرجاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی طرح ہماری بھی یہ خواہش تھی کہ ہمارے بزرگ صحافی جذبات سے کام نہ لیتے لیکن اسے کیا کیا جائے کہ وہ زمانہ ہی جذبات کا تھا اور ہمارے یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا بدل جاتی ہے، لیکن ایک ہم ہیں جو کبھی نہیں بدلتے۔ اگرچہ ہمارے شاعر ہر دور میں ہمیں یہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ ؎

یہ کہہ رہی ہے پلٹ کر نگاہِ یار ابھی		زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی

اور ؏		دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

اور ؎

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل قصور تیرا ہے یا کہ میرا		مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

ڈاکٹر اختر حسین کی تصنیف "گرد راہ" حقیقت میں عصری ادب و سیاست اور ان کے زمانے کی اہم شخصیتوں کا ایک تجزیہ اور اس پورے عہد کا ایک فکری اور تنقیدی جائزہ ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں ان کی شعوری کوشش کے باوجود غیر شعوری طور پر ان کی زبان دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ہر چند کہ اس میں چٹخارے نہیں ہیں لیکن چٹخاروں کا مزا ضرور ہے۔ ہم نے اس کتاب میں یہ بھی دیکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنا اور قاری کا وقت برباد نہیں کیا جو بات کہنے کی ہوئی نہایت اختصار اور جامعیت سے کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ جو شخصیت انھیں پسند آئی اور ان کے مزاج کے مطابق نکلی تو اس پر کچھ زیادہ لکھ ڈالا۔ باقی لوگوں کو ٹرخا دیا۔ ڈاکٹر رائے پوری نے آپ بیتی میں جگ بیتی اس سلیقے اور قرینے سے کہی ہے کہ وہ قطرے میں دریا دکھا گئے اور اردو ادب میں خود نوشت لکھنے کی ایک اچھی مثال قایم کر گئے۔ انگریزی زبان کی کسی آٹو بیاگرافی سے ڈاکٹر رائے پوری کی یہ خود نوشت کم نہیں ہے۔

ہم اس کامیاب تصنیف پر انھیں مبارک باد دیتے ہیں اور اس طرح جناب صہبا لکھنوی کے کارناموں میں ایک اور گراں قدر کارنامے کا اضافہ ہوگیا کیوں کہ ڈاکٹر صاحب کو دولھا بنا کر انھیں گھوڑے پر چڑھانے سے لے کر ان کی برات نکالنے تک کا سارا کام صہبا صاحب نے بڑے سلیقے سے انجام دیا ہے۔

(روزنامہ "حریت" کراچی — ۶ر مئی ۱۹۸۴ء)

میرزا ادیب

اذکار و افکار

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی "گرد راہ"

"گرد راہ" ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خود نوشت سوانح عمری ہے اور ڈاکٹر صاحب کی یہ تصنیف اس منزل پر وجود پذیر ہوئی ہے جب وہ نصف صدی تک ادب میں مسلسل تگ و دو کی زندگی بسر کرنے کے بعد اس بات کا پورا پورا استحقاق رکھتے ہیں کہ جو کچھ اتنی لمبی مدت میں ان پر بیتی ہے اسے

ضبطِ تحریر میں لے آئیں۔

گردِ راہ کا خالق اس کاروان کی گردِ راہ ہرگز نہیں جو اس صدی کی تیسری دہائی میں جادہ پیما ہو کر برق رفتاری سے آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین اس کارواں کے قائدین میں سے تھے اور اس کارواں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے پامال راہوں پر گزرنے کی بجائے اپنے لیے نئی راہیں تراشی تھیں۔ اس کی نظر ان افقوں پر تھی جو ابھی تک دھندلکوں میں چھپے ہوئے تھے اور اس نے پرانی روایات کے جسدِ مردہ میں نیا خون دوڑا کر انھیں نئی زندگی دی تھی۔ وہ نئی زندگی جو حوصلہ مند بھی تھی۔ بے باک بھی اور حقائق شناس بھی۔

یوں تو کوئی مصنف بھی اپنی تحریر میں نقاب پہن کر نہیں آ سکتا۔ اس کی ذات وہ جیسی بھی ہے، ظاہر ہوتی رہتی ہے اور خود نوشت میں تو شخصیت کسی صورت بھی نہیں چھپ سکتی۔ الفاظ گونگے نہیں ہوتے۔ وہ بولتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہم جس قلم سے ٹپکے ہیں وہ سچائی چھپاتا ہے یا اس کا اظہار کرتا ہے جھوٹ بولنے والے لفظ، دلوں کے دروازے پر دستک نہیں دے سکتے۔ دیں گے بھی تو یہ دروازہ نہیں کھلے گا اور اس کے برعکس وہ لفظ جو سچائی کی مشعل تھے سینوں میں اترتے ہیں انھیں گہرائیوں میں پہنچنے کے لیے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ اور میں ایک لمحہ توقف کیے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ اختر حسین نے کہیں بھی اپنی طرف سے جھوٹ نہیں بولا۔ اس امر کی گواہی ان کے الفاظ دیتے ہیں اور میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ لفظ بھی گواہی دیتے ہیں۔ جھوٹی گواہی دے ہی نہیں سکتے۔

ڈاکٹر اختر حسین کی پہچان اردو ادب سے کرائی ہے۔ ان کے مبسوط اور حقیقت افروز مقالے "ادب اور زندگی" نے ہمارا اولین تعارف اُن سے کرایا تھا۔ لیکن اختر نے اپنے لیے ذریعۂ معاش ہندی میں ڈھونڈا تھا۔ اگر وہ ہندی کے ساتھ ساتھ یا ہندی سے بہت حد تک الگ ہو کر اُردو کی طرف نہ آتے تو ہندی ادب کو مالا مال کر دیتے مگر اردو ادب کی تاریخ ایک مستقل زریں باب سے محروم ہو جاتی۔ ڈاکٹر اختر حسین نے اردو کو بہت کچھ دیا ہے وہ ہمارے ادب کا بیش بہا اثاثہ ہے۔

گردِ راہ کے مصنف کی کئی حیثیتیں ہیں۔ نقاد، افسانہ نگار، مترجم، ماہرِ تعلیم، سفارت کار، یونسکو کے اعلیٰ افسر اور گردِ راہ کے حوالے سے ان کی کچھ حیثیتیں اور بھی بنتی ہیں جن کا ذکر آگے چل کر کروں گا۔ جن حیثیتوں کا ذکر میں نے کیا ہے یہ بڑی اہم ہیں۔ "ادب اور انقلاب" دنیائے نقد و نظر میں ایک قسم کی طوفانی آواز تھی جس کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ اس مقالے میں اتنی گنجائش کہاں کہ میں ان کی ہر حیثیت پر تسلی بخش طریقے سے غور کروں، باقی سب کچھ چھوڑ کر فقط یہ عرض کروں گا کہ مترجم اختر حسین رائے پوری کی کاوشیں بڑا اونچا مقام رکھتی ہیں۔ شاید بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ سنسکرت میں اختر منتہی ہیں۔ یعنی سنسکرت میں وہ سب سے اعلیٰ ڈگری لے چکے ہیں۔ چنانچہ کالی داس کے ناٹک شکنتلا کا ترجمہ انھوں نے براہِ راست سنسکرت سے کیا تھا۔ گورکی کی آپ بیتی کا ترجمہ اور اس کے ساتھ امریکہ کی نوبل انعام یافتہ مسز ایس پرل بک کے شاہکار گڈ ارتھ اور بنگالی شاعر قاضی نذرالاسلام کی باغیانہ نظموں کا ترجمہ ۔ اختر کی بڑی قابلِ قدر اور قابلِ تحسین کوششیں ہیں۔

ماہرِ تعلیم ہونے کی حیثیت سے یونسکو کے پروگرام کے مطابق انھوں نے افریقہ کے تاریک حصوں میں جا کر علم کی شمع روشن کی تھی۔ یہ بھی ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ان کی ایک حیثیت ایسی بھی ہے جس نے مجھے خصوصی طور پر متاثر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اختر ایک خاص تہذیب کے اصلی اور حقیقی نمائندے ہیں۔ یہ تہذیب کیا ہے؟ ذرا وضاحت سے عرض کرتا ہوں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہمارا پُرانا نظامِ اقدار تباہ ہونا شروع ہو گیا تو کچھ خاندانوں نے ان صاف ستھری اقدارِ زندگی کو متاعِ بے بہا سمجھ کر اپنے سینوں سے لگا لیا تھا۔ ان خاندانوں میں ڈاکٹر اختر حسین کا خاندان بھی تھا۔ اس تہذیب کے بنیادی جوہر تھے۔ انسانیت سے محبت، فرض شناسی، شائستگی، ذہنی توازن اور صداقت شعاری۔

یہاں یہ ضرور کہا جائے گا کہ اختر حسین تو ہماری پرانی تہذیب کے باغی تھے اور ہیں۔ انھیں ان چیزوں سے کیا تعلق۔ عرض کروں گا کہ وہ یقیناً

باغی تھے ۔ ان کی بغاوت پرانی روایات کے خلاف کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، لیکن ان ساری روایات کو رجعت پسندانہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔ ان روایات کا وہ حصہ جو ان قدروں سے عبارت ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ۔ اختر حسین کو ورثے میں ملی تھیں ۔ ان کے والد گرامی ایک درویش منش آدمی تھے ۔ دنیاداری سے لاتعلق ۔ اختر کی خود نوشت بتاتی ہے کہ انھوں نے دولت جمع کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی ۔ ان کو انسانوں سے گہری محبت رہی ہے اور یہی محبت انھیں افریقہ کی تاریک دنیا میں لے گئی تھی ۔ زندگی کے کروفر کی انھوں نے کبھی تمنا نہیں کی ۔ کلکتے میں فرش پر سوتے رہے، ایک تکیہ تک نہ خریدا ۔ بھائی کی موٹی ڈکشنری کو چادر میں لپیٹ کر تکیہ بنائے رکھا ۔ ان کے لب ولہجے سے شائستگی کبھی رخصت نہیں ہوئی ۔ صومالیہ میں ایک خطرناک شخص برے ارادے سے ان کے پاس پہنچا ہے تو ان کا شائستہ لب ولہجہ اس حالت میں بھی برقرار رہتا ہے ۔ علم کی لگن انھیں جہاں تہاں گھماتی رہی ہے ۔ اس لگن کی خاطر وہ برہنہ پا خارزاروں پر بھی گزرتے ہیں اور ان کے ہونٹ شکوے سے ناآشنا رہتے ہیں ۔ کوئی کام کرنے سے پیشتر اس تہذیب کے نام لیوا دیوانِ حافظ سے تفاول کرتے تھے ۔ ڈاکٹر اختر نے بھی اس روایت کو زندہ رکھا ہے ۔

ڈاکٹر اختر حسین نے بھرپور بڑی معروف زندگی بسر کی ہے ۔ اس مصروف زندگی میں عشق کرنے کی فرصت کہاں ۔ چنانچہ انھوں نے اپنا سرِ نیاز صرف ایک ہی آستانے پر جھکایا اور جب اس ہستی کو پالیا جو ان کے لیے حاملِ سجدہ تھی تو پھر انھوں نے ساری زندگی میں کسی آشیانے پر بھی للچائی ہوئی نظریں نہیں ڈالیں ۔ گرد راہ یہی شہادت دیتی ہے ۔

گرد راہ کو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خود نوشت سوانح عمری کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور یقیناً یہ ہے بھی مگر کتاب کے ۱۹۸ صفحے تک یوں کہیے کہ کتاب کا تین چوتھائی حصہ خود نوشت کے لیے وقف ہے ۔ اس کے بعد خود نوشت نگار اختر حسین رائے پوری بطور سفرنامہ نگار اور ادبی مورخ کے آجاتے ہیں ۔ میری نظر میں یہ ان کی کوئی الگ الگ حیثیتیں نہیں ہیں ۔ انھیں اس لحاظ سے خود نوشت ہی کا حصہ سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے عمداً، ارادۃً سفرنامے اور ادبی تاریخ کی طرف توجہ نہیں کی ۔ اس حصے میں ان کے مشاہدات ہیں اور مطالعات ہیں ۔ یہاں ڈاکٹر اختر حسین اپنی باطنی دنیا کی سیر کے بعد سیرِ عالم بھی کرتے ہیں ۔ ویسے میں یہ عرض کروں کہ باطنی دنیا کی سیر کرتے وقت بھی ان کا نقطۂ نظر اپنی نوعیت کے اعتبار سے معروضی ہی رہا ہے ۔

ڈاکٹر اختر نے اپنی اس سرگزشت حیات میں اپنے مرحوم بھائی مظفر حسین شمیم کا بھی کہیں کہیں ذکر کیا ہے اور مجھے یہ شمیم بے اختیار یاد آ گئے ہیں ۔ لاہور اور بمبئی میں ان سے قریب رہنے کا کافی موقع ملا تھا ۔ بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے ۔ اور دوسرے ڈاکٹر اختر حسین بن سکتے تھے مگر ایسا نہ ہو سکا اصل میں ڈاکٹر اختر حسین نہیں ۔ ان کے برادر بزرگ مظفر حسین شمیم اس قافلہ تیز رو کی گرد راہ بن گئے تھے جو دوریوں میں جھلملاتے ہوئے عظمت کے افق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا اور قافلہ یہ کب پروا کرتا ہے کہ کون پیچھے رہ گیا ہے یا گرد راہ بن گیا ہے ۔ فیضی نے کچھ غلط نہیں کہا تھا ؎

این نیست کہ من ہم نفساں را بگزارم　　　　ما آبلہ پایاں چہ کنم قافلہ تیز است

ڈاکٹر اختر حسین کا اسلوب بڑا خوب صورت، بڑا دل آویز ہے اور گرد راہ میں یہ اسلوب اپنے تمام حسن کے ساتھ جلوہ گر ہے ۔

(روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۔ ۱۱ اگست ۱۹۸۴ء)

انتظار حسین

اختر حسین رائے پوری

گرد آلود دامن کے ساتھ واپسی

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو میں زمانہ ہوا پڑھ کر بھول چکا تھا ۔ وہ میری طالب علمی کا اور ترقی پسند تحریک کی جوانی کا زمانہ تھا ۔ ان کے تنقیدی مضامین

کے مجموعے "ادب اور انقلاب" کا بہت چرچا تھا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "محبت اور نفرت" اس سے پہلے ہی شائع ہو چکا تھا مگر وہ جلد ہی ہمارے ادبی منظر سے غائب ہو گئے اور شاید ادب کے قارئین کے حافظے سے بھی اترتے چلے گئے اور میں نے انھیں افسانہ نگار کی حیثیت سے تو یاد رکھنا چنداں ضروری نہیں سمجھا، باقی رہے ان کے تنقیدی مضامین تو جا ہے ترقی پسند تحریک کا آغاز انھیں سے ہوا ہو اور ترقی پسند تنقید کا بھی مگر اس نقطۂ نظر سے لکھی گئی تنقید کو میں کتنے دن یاد رکھ سکتا تھا۔ بس ان کا کیا ہوا شکنتلا کا ترجمہ حافظے میں منور چلا آتا تھا، مگر اب اختر حسین رائے پوری ایک عمر گزارنے کے بعد اچانک واپس آئے ہیں اور میں ان کے سحر میں ہوں۔

جس کتاب کے حوالے سے میں ان کی واپسی کی خبر دے رہا ہوں یہ ان کی خود نوشت "گرد راہ" ہے جس کو صہبا لکھنوی صاحب نے ابھی پچھلے دنوں اپنے مکتبۂ افکار (کراچی) کی طرف سے شائع کی ہے۔

"ادب اور انقلاب" سے لے کر "گرد راہ" تک ایک لمبا سفر ہے۔ اس سفر میں اختر حسین رائے پوری نقطۂ نظر کے حساب سے تو نہیں بدلے ہیں ان کی نظریاتی وابستگی جوں کی توں ہے، مگر اب وہ ۱۹۳۶ء والے ترقی پسند نظر نہیں آتے۔ نظر میں بہت وسعت اور ذہنی رویے میں بہت کشادگی آ چکی ہے۔

بیسویں صدی کے بڑے تجربوں کے پس منظر میں ایک خودنوشت

آنی بھی چاہیے تھی آخر جس شخص نے اتنی دنیا دیکھی ہو اور اتنے تجربوں سے گزرا ہو اور اتنے گھاٹوں کا پانی پیا ہو وہ صفدر میر بن کر تو نہیں رہ جائے گا۔

میں نے گرد راہ پڑھی اور میر کے اس دعوے کو یاد کیا

ع عالم کی سیر میر کے دیوان میں ہوگئی

میر صاحب اپنی جگہ سچے تھے۔ اختر حسین رائے پوری نے اپنے حساب سے عالم کی سیر کی ہے اور ہمیں کرائی ہے خراب تو باروں کے لیے زیر آسماں ترقی کی نئی راہیں اور سفر کی سہولتیں بہت نکل آئی ہیں۔ کتنے یار جیب میں امریکہ کا گرین کارڈ ڈالے پھرتے ہیں مگر شعور کی عینک بھی تو پاس ہونی چاہیے۔

"گرد راہ" میں ہم اختر حسین رائے پوری کے ساتھ متحدہ ہندوستان کو دیکھتے بھالتے، یہاں کی سرکردہ علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں سے ملتے ملاتے باہر کے سفر پہ نکلتے ہیں۔ یورپ، امریکہ، افریقہ کو کھوندنے کے بعد واپس اپنے ایشیا میں آتے ہیں۔ ایشیا میں گھومتے پھرتے ہم آخر میں نیپال پہنچتے ہیں۔ نیپال کا ذکر میں نے یوں خاص طور پر کیا کہ اس واسطے سے اختر حسین رائے پوری نے ۱۸۵۷ء کے گم شدہ ہیرور کے بارے میں بعض ایسی اطلاعات فراہم کی ہیں جو جنگ آزادی کے طالب علموں کے لیے سنسنی خیز انکشافات کی حیثیت رکھیں گی۔ مثلاً یہ اطلاع کہ عظیم اللہ خاں ۱۹۳۷ء کے بعد تک زندہ رہا ہے اور اس دوران اس نے اینی یادداشتیں بھی قلم بند کی تھیں یا کھٹمنڈو کے اس محلے میں جو بیگم کا محلہ کہلاتا ہے۔ بیگم حضرت محل کے مزار کی دریافت۔ مگر عظیم اللہ خاں کے بارے میں ان کا بیان مجھے بہت تشنہ نظر آیا جس شخص نے ستاون کی جنگ ہار کر نوے سے اوپر سال گم نامی میں گزار دیے اور دور سے بیٹھا انگریز راج کو عروج پاتے دیکھا کیا۔ اس کے بارے میں اچھا ہوتا کہ اختر حسین رائے پوری کچھ مزید کریدتے اور ہمیں بتاتے۔

متحدہ ہندوستان میں اختر حسین رائے پوری کے شب و روز بہت دل چسپ ہیں۔ وہ خالی اردو کے ادیب تو نہیں۔ وہ ہندی کے بھی ایک ممتاز لکھنے والے رہے ہیں اور انگریزی میں بھی رواں تھے۔ اس کے باعث انھیں بعض ایسے اداروں اور اخباروں سے وابستہ ہونے کا موقع ملا جن کے اسٹاف میں کسی مسلمان کی شمولیت ممکن نظر نہیں آتی تھی۔ سو اس زمانے کے بہت سے سیاسی واقعات کے پس پردہ ہمیں تاک جھانک کرا دیتے ہیں۔ مثلاً جہاں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ گاندھی جی اردو کے کن اثرات کے تحت بدکے تھے اور ہندی کے حامی بن گئے تھے، اس قسم کی شخصیتوں کو جو ہندوستان کو بنانے بگاڑنے کی حیثیت میں تھیں اختر حسین نے قریب سے دیکھا ہے اور جانا ہے۔ ہندوستان سے نکل کر وہ یورپ، امریکہ، افریقہ میں دیس دیس گھومتے اور وہاں کی ممتاز شخصیتوں اور

تحریکوں سے آشنائی پیدا کرتے نظر آتے ہیں۔

یورپ میں پیرس کا قیام ان کے لیے زیادہ معنی خیز تجربہ نظر آتا ہے۔ یہاں وہ کروہ ایسی شخصیتوں سے متعارف ہوئے ہیں جو ادب اور آرٹ کی نامی گرامی شخصیتیں ہیں، پکاسو اور پابلو نرودا اور اس کی خفیہ تحریک سے جو اسپین کی خانہ جنگی کے زمانے میں جمہوری طاقتوں کے حق میں کام کر رہی تھی۔ یہاں انھوں نے شاد آباد پیرس کو بھی برتا اور دیکھا اور رسائیں سائیں کرتے اس پیرس کا بھی مشاہدہ کیا جو شہر پر حملے کے اندیشے سے خالی ہو رہا تھا۔

اس قسم کے تجربے اس کتاب میں بکھرے پڑے ہیں جو کہیں رسم و رواج کے بیان کے راستے اس ملک سے ہمارا تعارف کراتے ہیں، اور کہیں اردگرد پھیلی ہوئی سیاسی دہشت اور خفیہ تنظیم کا ررو ائی کرتی ہوئی مزاحمتی تحریکوں کے بیان کے ذریعے ان خطّوں کی صورتِ حال سے ہماری شناسائی کراتے ہیں اور یوں یہ کتاب ایک عصری آگہی بخشتی نظر آتی ہے، یعنی یہ خود نوشت آپ بیتی ہی نہیں جگ بیتی بھی ہے، بلکہ مصنف کا تو یہ دعویٰ ہے کہ اس میں آپ بیتی کم اور جگ بیتی زیادہ ہے۔

"امیر اندلس عبدالرحمٰن ثالث کے وزیر با تدبیر المنصور کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب کسی مہم سے لوٹتا تو اپنی قبا کی گرد کو ایک کونے میں جھٹک دیتا۔ جب یہ جولی میں زندگی ختم ہوئی اور اس نے داعی اجل کو لبیک کہا تو کوزے کی خاک اس کے کفن پر چھڑک دی گئی، میں اتنی گرد راہ کہاں سے لاؤں، لیکن بساط میں جو باقی رہ گئی اسے ان اوراق پر جھٹک دیا ہے"

مگر کتاب چغلی کھا رہی ہے کہ اختر حسین رائے پوری کے دامن میں گرد تھوڑی نہیں ہے، آخر دلیس دلیس کی خاک چھانی ہے اور ٹھکانے سے چھانی ہے، دامن کو جھٹکنے سے کہاں کہاں کی مٹی برآمد ہوئی ہے اور ایک خود نوشت سرزد ہوئی ہے۔

اور آخر میں مصنف ہمیں اطلاع دیتا ہے "جب یہ کتاب چھپے گی تو میں اسے خود نہیں پڑھ سکوں گا"

اختر حسین رائے پوری بفضل تعالیٰ زندہ و سلامت ہیں، مگر وہ اپنی کتاب کو پڑھ نہیں سکتے، اُن کی بینائی جو جاتی رہی ہے اس لیے یہ کتاب کچھ مصنف نے خود لکھی ہے اور کچھ یعنی کتاب کا زیادہ حصہ بول کر لکھوایا گیا ہے۔

اختر حسین رائے پوری کی بینائی بحال ہو سکتی ہے مگر بیرون ملک ایک آپریشن کے بعد جس کے وہ مالی اعتبار سے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اکیڈمی آف لیٹرز اور رائٹرز گلڈ کے معذور ادیبوں کے فنڈ اگر اس کام نہیں آ سکتے تو پھر ان کا مصرف کیا ہے۔؟

روزنامہ "مشرق" — لاہور — ۸ رجولائی ۱۹۸۴ء

شبنم رومانی

اردو ادب کے قطب جنوبی

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

بعض تاریخ ساز شخصیتوں کا وزن زیادہ مگر حجم کم ہوتا ہے۔ وزن ان کے کام کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے اور حجم ان کی بے نیازی کے سبب کم ہوتا ہے۔ وہ شہرت پسند یا دولت پسند یا اقتدار پسند نہیں ہوتیں بلکہ صحیح معنوں میں حقیقت پسند اور ترقی پسند ہوتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی اپنے آدرش کے حوالے کر دیتی ہیں۔

یہ بھی قائم و دائم حقیقت ہے کہ تاریخ کے تجزیاتی اور تجرباتی مطالعے کے بغیر کوئی شخصیت تاریخ ساز نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہر عظیم آدمی، خواہ وہ کسی شعبۂ حیات سے تعلق رکھتا ہو، تاریخ کا گہرا شعور ضرور رکھتا ہے۔

[redacted]

تمہاری دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ عظیم لوگوں کے لیے اخلاقی طور پہ عظیم ہونے کی شرط کبھی نہیں رہی۔ قدیم تاریخ کو اٹھا کر گرد جھاڑیے تو آپ کی دھول اڑنے لگی کہ ایسے چہرے بھی پہچاننا مشکل ہو جائے گا اور جدید تاریخ تو بنی ہی اخلاق و کردار کی نفی سے ہے۔ مگر بعض لوگ سر ابعادی … مستقل شخصیت رکھتے ہیں یعنی اپنے عمل اور ردعمل سے معیارِ اخلاق بھی قایم کرتے ہیں۔ تاریخ ساز بھی ہوتے ہیں اور خود چلتی پھرتی تاریخ بھی ہوتے ہیں۔

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم نے اس عہد کے دو بڑوں کو اپنی روشن آنکھوں سے دیکھا ہے اور وہ اپنی نیم روشن آنکھوں سے ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کسی خطے کے لیے خیر و برکت کی ضمانت اس کے لوگوں میں … جو اللہ کے دوست (اولیا) ہوتے ہیں۔ مگر یہ صحیح ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ خطۂ ادب کی خیر و برکت بھی ان دو اقطاب کے دم قدم سے ہے جو اس کے … کو اپنے زانوؤں تلے دبائے بیٹھے ہیں۔ ایک پروفیسر مجنوں گورکھپوری جن کا آستانہ یا "ایوان" شمالی ناظم آباد میں … یحییٰ حسن رحمۃ اللہ علیہ کے تکیے کے پاس ہے اور دوسرے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری جن کا تکیہ سوسائٹی میں … واقع ہے … ہر ماہ کی … معتقدات کو شہر کے فقرا جمع ہو کر چراغاں کرتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ مجنوں صاحب ادب کے … ہیں اور … اختر حسین رائے پوری … صوفی ہیں۔

… ماہرِ تعلیم، ادیب و نقاد ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خود نوشت سوانح "گردِ راہ" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جو اس سے پہلے ماہنامہ "افکار" میں قسط وار شائع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے یہ کتاب لکھوا لینے اور پھر اس کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا سہرا مدیرِ "افکار" جناب صہبا لکھنوی کے سر ہے۔

> "ادیب، نقاد، عالم، معلم ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں میں قریب قریب نصف صدی سے آشنا اور معتبر ہے" • فیض احمد فیض

"گردِ راہ" اپنے تکنیکی معنی میں آپ بیتی نہیں ہے۔ آپ بیتی مصنف کی ذات کے گرد گھومتی ہے۔ مگر اس کتاب میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، علمی، ادبی اور اجتماعی شعور کو لکھا ہے۔ یہ بڑا پر آشوب عہد ہے۔ بیسویں صدی میں جتنی بڑی تبدیلیاں ہوئیں تاریخ کے کسی ایک دور میں کبھی نہیں ہوئیں۔ معاشرے میں واضح تبدیلی، بادشاہی کے تصور کا خاتمہ، سامراجیت کا خاتمہ، آزادی کے تصور میں تبدیلی، اشتراکیت کا فروغ، اتنے بہت سے ملکوں کی آزادی، آزادیِ نسواں کی تحریک، تعلیم کے تصور کی تبدیلی، ماس میڈیا کے اثرات، فاصلے کے تصور کا خاتمہ، سائنسی مہمات کی حیرت انگیز کامیابیاں۔ یہ سب کچھ اتنی تندی اور تیزی سے ہوا ہے کہ انسان خود اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ "گردِ راہ" ان سب تبدیلیوں کا مقیاس ہے۔ یہ ایک تاریخ بھی ہے، ایک شخصیت نامہ بھی ہے۔ ایک تہذیبی مطالعہ بھی ہے اور ایک یادداشت بھی۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحبِ نظر ہیں۔ وہ ایک بڑا ذہن رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی متنوع اور ان کا تجربہ وسیع ہے۔ جنگل ویرانے میں سادھو کی کٹیا سے لے کر یورپ اور حیدرآباد کی روشن دنیا کو انھوں نے جس طرح دیکھا اور دنیا نے ان سے جو معاملہ کیا یہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار بھی رہے ہیں اور ان کے افسانے اردو کلاسک کا حصہ ہیں اس لیے ان کی تحریر ویسے بھی اتنی شگفتہ اور مربوط ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو پڑھوا لینے کی زبردست قوت رکھتی ہے۔ … ادب … "گردِ راہ" تک انھوں نے علم و دانش کے بہت سے معرکے سر کیے ہیں لیکن "گردِ راہ" میں تو ان کا اسلوبِ تحریر اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ درجنوں … کے فقرے ایسے ہیں جو "اقوالِ زریں" کا درجہ رکھتے ہیں۔

"گردِ راہ" پر گفتگو کی جائے تو ایک اور کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ یہاں اس کا محل نہیں پھر بھی سرسری طور پر چند اہم واقعات و شخصیات کا

حوالہ ضروری ہے۔ مدت دراز کے بعد "گرد راہ" جیسی گراں قدر تصنیف اردو کے حصے میں آئی ہے۔ یہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی تخلیق ہی میں نہیں بلکہ اُردو کے سوانحی ادب میں بلا شبہ، ایک غیر معمولی اضافہ ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو بچپن سے سوائے علم و ادب کے کسی چیز سے شوق ہی نہ تھا۔ معاش کا مسئلہ تھا اس لیے انھوں نے ذہن اور ضمیر پر جبر کے ساتھ ملازمت کی۔ ملازمت میں بھی انھوں نے شعبۂ تعلیم کا انتخاب کیا۔ لرشن اور منٹو نمبر میں چلے گئے تھے ان کو بھی بمبئی ٹاکیز میں چیف سیناریو رائٹر کی جگہ پیش کی گئی تھی مگر وہ نہیں گئے۔ دیویکا رانی کے کتنے ہی خطوط اب بھی ان کی فائلوں میں پڑے ہیں۔ ریڈیو کی ملازمت بھی چھوڑی، صحافت بھی ترک کی۔ ہندوستان میں کل وقتی مصنف کے لیے سامانِ حیات بہم نہ تھا۔ لکھ پڑھ کر کوئی گزر اوقات نہیں کر سکتا تھا اس لیے یہی بہتر جانا کہ وزارتِ تعلیم سے منسلک ہو جائیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے دنیا دیکھی ہے، یعنی وہ ملکوں ملکوں گھومتے پھرے ہیں اور ان کی زندگی نو بہ نو تجربات و مشاہدات کا مرقع ہے۔ فرائضِ منصبی کے سلسلے میں ان کو امریکہ، انگلستان، فرانس، اطالیہ، اسپین، جاپان، سیلون، ایران، اسرائیل، فلسطین، صومالیہ، ترکیہ اور نہ جانے کہاں کہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے، وہ جہاں جہاں بھی گئے ہیں انھوں نے وہاں کے مظاہرِ فطرت اور ذہن و ضمیر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ کلکتے میں ان کی ملاقات اتفاق سے بہادر شاہ ظفر کے پڑپوتے بیدار بخت سے ہوگئی تو ان کی مدد سے بیگم حضرت محل کی تعمیر کی نشاندہی کر کے اس ویران کے نام کی تختی لگوا دی۔ ہمارے نزدیک ڈاکٹر صاحب کا یہ چھوٹا سا کام بھی ایک بڑا کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب دنیا کے سیکڑوں لوگوں سے ملے ہیں اور ان کو قریب سے دیکھا ہے مگر بالآخر وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "ڈو نہایت مبسی برٹیس کینٹیمپٹ" (کوئی کسی بڑے آدمی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش نہ کرے) ان لوگوں میں مولوی عبدالحق، مولانا آزاد، سروجنی نائیڈو کا رشتہ ہے۔ علم کی طلب، حسن کی تلاش اور حقیقت کی کھوج ان کی زندگی کا ماحصل ہے اس راہ میں بہت سے لوگ، بہت سے مقامات اور بہت سے مواقع آئے اور انھوں نے سب سے کچھ نہ کچھ اخذ کیا۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ خلوت پسند اختر حسین کو بھرپور مجلسی زندگی گزارنی پڑی ہے۔ ان کی عالمانہ متانت کو دیکھتے ہوئے یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید ان کی جوانی پر کبھی پتھراؤ نہیں ہوا، یہ خیال درست نہیں ہے ڈاکٹر صاحب بہ حال گوشت پوست کے انسان ہیں حسنِ ادراک، اور ادراکِ حسن رکھتے ہیں "خوب صورتی" ان کے دامنِ دل کو کھینچتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا ذوقِ جمال سطحی نہیں آفاقی ہے اور ان کا ردِ عمل سفلی نہیں وجدانی رہا ہے۔ جس طرح وہ یادری اسٹوکس کی دیومالائی پریوں جیسی لڑکیوں کو اچانک سامنے پاکر دست بدل رہ گئے تھے یا شیراز کے کالج میں حسن کی فراوانی کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے تھے بلکہ سہم گئے تھے اور حافظ کی شیرازیت پر ایمان لے آئے تھے، اسی طرح حسنِ فطرت بھی ان کا محبوبِ نظر رہا ہے۔ اسی طرح موسیقی، رقص، مصوری اور شاعری نے بھی ان کے اعصاب کو رگِ ساز کی طرح چھیڑا ہے۔

زمانۂ طالب علمی میں نوجوان اختر حسین کی شہرت کا آغاز ان کے ایک افسانے "زبانِ بے زبانی" سے ہوا تھا جس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی تھی! —

"میں برگد کا ایک عمر رسیدہ درخت ہوں۔ نہ جانے کتنی مدت سے تن تنہا اور خاموش کھڑا ہوں۔ برقرار اور بے قرار۔ بے زبان اور نغمہ زن۔ نہ جانے کتنی مرتبہ لڑکتی سردیوں میں اپنے بے برگ و بارشانوں سے کہرے کی چادر کو سنبھال کر میں نے فریاد کی ہے۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ موسمِ گل میں عطر بیز نسیمِ بہار نے میرے حسِ جسم میں سنسنی ڈالی ہے، لیکن کچھ دنوں سے میرے چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ جسمانی تاثرات سے بھی بے پروا ہو گیا ہوں۔ سردیاں اور گرمیاں میرے لیے یکساں ہیں —

[redacted]

اور اب ۱۵ سال بعد "گرد راہ" کے "حرفِ آخر" میں اختر حسین صاحب لکھتے ہیں :۔

"میں نے کم عمری میں جو حقیقت کی تلاش شروع کی وہ پیرانہ سالی میں بھی جاری ہے۔ ظاہر کی آنکھ نے تماشا گاہِ عالم میں بہت کچھ دیکھا اور چشمِ باطن نے روح کی گہرائیوں کو کچھ حد تک پہچانا۔ اب نہ کوئی تمنا ہے نہ کوئی خواہش۔ ماضی ایک دولتِ صادق کی طرح پہلو بہ پہلو چل رہا ہے۔ اب خواب اور بیداری میں کوئی فرق نہیں رہا۔ گل بانگِ فجر کے وقت جب میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو ستارہ صبح مسکرا کر کہتا ہے یونانی اساطیر کا یہ گمان صحیح ہے کہ جسمِ خاکی سے جدا ہو کر روحیں افلاک میں تاروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اخترِ سوختہ! تو میرے قریب آ۔ تیرے لیے ایک خاص مقام کا تعین ہو چکا ہے!"

حسنِ اتفاق ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ۱۲ر جون ۱۹۱۲ء کو یو پی میں پیدا ہوئے تھے اور ہم ان کے بارے میں یہ چند سطور لکھنے بیٹھے تو یاد آیا کہ آج بھی ۱۲ر جون ہے، ۱۹۱۲ء کا نہیں، ۱۹۸۴ء کا سہی، یوں آج کا دن ڈاکٹر صاحب کی بہترویں سال گرہ کا دن ہے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو پانچ ہزار سال تک زندہ و سلامت اور صحت مند و بارِ سر در رکھے اور زمین کا ہمسر ان کی یکتائی کا علم بلند کیے رہے (آمین)

(روزنامہ "مشرق" - کراچی - ۲۷ر جون ۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر سید مقصود زاہدی

مُطالعہ

"گرد راہ" اپنے مصنف ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے بقول صحیح معنوں میں سوانح حیات نہیں بلکہ ایسی تحریر ہے جس میں آپ بیتی کم اور جگ بیتی زیادہ ہے۔

ایک ایسے اہلِ قلم کی یادداشتیں جس نے آج سے چالیس پچاس سال قبل ایسی شہرت حاصل کی تھی جو کم لکھنے والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ۔ برصغیر پاک و ہند کا یہ ہفت زبان عالم اور ذہین کار جب بھی قلم سنبھال کر قارئین کی دنیا میں آیا ہے۔ تو اس نے ایسی شہرت حاصل کی ہے کہ عام لکھنے والے دنگ رہ گئے ہیں۔ سولہ سال کی عمر میں علم کی تلاش میں گھر سے نکلنے والے طالب علم اور آج کے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری میں کئی قرنوں کا فاصلہ ہے۔ اس دوران وہ اپنے ملک اور بیرونِ ملک ہزاروں انسانوں سے ملے ہیں اور یہ سب انسان اپنے اپنے ملکوں اور تہذیبوں کے نمائندے تھے۔ ان میں مردم بیزار اور انسانیت دوست سبھی طرح کے لوگ تھے۔ ان سب کو قریب سے دیکھنا اور دنیا جہان کا ادب پڑھنے اور اہلِ فضل اور اہلِ ایمان حضرات کی صحبت میں بیٹھنے سے جو شعورِ زیست اور انسان شناسی کا جوہر قابل مصنف میں پیدا ہوا ہے اور جنگِ عظیم دوم سے قبل اور مابعد کے معاشرتی، علمی اور ادبی ہنگاموں نے جس طرح اس جوہرِ قابل کی تربیت کی ہے اس پر ہر انسان نازاں ہو سکتا ہے۔

"گرد راہ" ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اس وقت لکھنی شروع کی جب ایک آنکھوں کے سرجن کی ایک فروگزاشت سے وہ اپنی بینائی سے محروم ہو گئے۔ یوں اس تصنیف کو ہم ان کی ذہنی پیداوار کہہ سکتے ہیں جو انھوں نے فاتح فرخ اور خورشید سلمہا کو ڈکٹیٹ کرائی اور جب کتاب مکمل ہو گئی تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ اسے خود پڑھ بھی نہ سکے۔ لیکن یہ افتاد ملٹن پر پڑی تھی۔ . . . . اس کی شہرۂ آفاق تصنیف "پیراڈائز لاسٹ" اس کے ایسے ہی عہد کی پیداوار ہے جب وہ خود بصارت سے محروم دنیا والوں کو علم کی بصیرت لٹا رہا تھا۔

انسان اور حقائق شناسی کی جس منزل پر پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے یہ یادداشتیں مرتب کیں وہ بڑا کٹھن اور صبر آزما سفر تھا۔ انھوں نے

کتاب کے حرفِ آغاز میں کہا ہے :" جب دن ڈھلنے لگتا ہے تو سامنے دھندلکا ہوتا ہے۔ وقت پیچھے رہ جاتا ہے اور ماضی سائے کی طرح پاؤں سے لپٹ جاتا ہے "۔

آخری باب میں انھوں نے لکھا ہے :" جب اندلس کا ایک وزیر با تدبیر اپنی کسی مہم سے لوٹتا تو اپنی قبا کی گرد کو ایک کوزے میں جھٹک دیتا۔ جب مہم جوئی میں زندگی ختم ہوئی تو کوزے کی خاک اس کے کفن پر چھڑک دی گئی۔ میں اتنی گرد راہ کہاں سے لاؤں لیکن بساط میں جو باقی رہ گئی ہے اسے ان اوراق پر جھٹک دیا ہے "۔ ہماری دعا ہے کہ " ڈاکٹر صاحب " ابھی مدتوں جیئیں۔ ان کی بصارت اور بصیرت دونوں کی ارضِ پاکستان کو ضرورت ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ایک قلم کار کی حیثیت سے ۱۹۳۲ء سے شہرت حاصل کرنا شروع کردی تھی۔ ان کا پہلا مضمون " زبان بے زبانی " 'نگار' میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی ابتدا یوں ہوتی تھی :۔

" میں برگد کا ایک عمر رسیدہ درخت ہوں۔ نہ جانے کتنی مدت سے تن تنہا اور خاموش کھڑا ہوں۔ بے قرار اور بے قرار، بے زبان اور نغمہ زن، نہ جانے کتنی مرتبہ کڑکڑاتی سردیوں میں اپنی بے برگ شاخوں سے کہر کی چادر تھام کر میں نے فریاد کی ہے! نہ معلوم کتنی مرتبہ موسمِ گل میں عطر بیز نسیم بہار نے میرے بے حس جسم میں سنسنی ڈال دی ہے، لیکن کچھ دنوں سے میرے چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ جسمانی تاثرات سے بھی بے نیاز ہو گیا ہوں۔ سردیاں اور گرمیاں میرے لیے یکساں ہیں "۔

۱۹۳۲ء میں جو کچھ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے برگد کی زبان سے کہلوایا تھا نصف صدی بعد ۱۹۸۳ء میں وہی کچھ انھوں نے اپنی زبان قلم سے 'گرد راہ' کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔

(روزنامہ " مشرق " کراچی ۔ ۱۷ جون ۱۹۸۳ء)

ڈاکٹر آغا سہیل

باتیں ہماری

"گردِ راہ" یا گردِ پسِ کارواں

" گرد راہ " کے مطالعے کے بعد میرا ذہنی افق واضح طور پر پھیلتا ہوا محسوس ہوا اور میری بصیرت میں اضافہ ہوا کہ بعض کتابیں محض افراد ہی میں نہیں قوموں میں شعور کی نئی جہتیں قائم کرتی ہیں اور نسلوں میں سفر کرتی اور صدیوں انھیں احساس دلاتی رہتی ہیں کہ ان کے دامن میں ایک متاعِ گراں مایہ محفوظ ہے۔ " گرد راہ " ایسی ہی ایک زندہ کتاب ہے جو برصغیر کے دانشوروں کی فکری اور عقلی تاریخ بھی ہے، جد و جہد آزادی کی تحریکوں کے مد و جزر کو جذب کرنے والی داستان بھی ہے۔ اس میں اجتماعی سطح پر ابھرنے والے احساسات اور جذبات کا انتہائی سلیقے اور توازن کے ساتھ تجزیہ بھی ہے اور معاشرتی محرکات اور تاریخی عوامل پر بالغ نظری سے احتساب اور محاکمہ بھی ہے۔

" گرد راہ " ایک فرد کی کہانی نہیں، افراد کی داستان ہے اور اقوام کی کتھا ہے۔ اس کا محلِ وقوع برصغیر، مشرقِ وسطیٰ، مشرقِ بعید، یورپ، امریکہ اور افریقہ تک پھیلا ہوا ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے مابین اور مابعد کے تاریخی حالات اور سرمایہ دار اور سوشلسٹ ممالک کی آویزش اور چپقلش بھی اس میں موجود ہیں اور ان کے بین السطور وہ آگہی اور شعور بھی ہے جو تفکر و تعقل کے ہزار باد ریچے وا کرتا ہے اور قوموں میں بصیرت اور بیدار مغزی کے چراغ روشن کرتا ہے۔

[redacted]

ڈاکٹر آغا سہیل

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی زندگی کے ایام کو نہایت جابک دستی سے گرفت میں لیا ہے۔ اپنے تخیل کے سیاق و سباق کو معروضی طور پر بیان کیا ہے اور داخلی نرگسیت کا شکار ہوئے بغیر بے باکی سے معروضی تجزیہ بھی کیا ہے۔ ہندی زبان سے اپنے غیر معمولی شغف اور لبنت کمار نامی ہم جماعت کے بچپن کے دوست کے ہمراہ گھر سے غائب ہونے کے رومانی اور مہم جویانہ جذبات کا بے باکی سے ذکر کیا ہے۔ میٹرک کے ایک انڈو نیشی طالب علم کے دل و دماغ کی کش مکش کو بہت خوبی سے بیان کرتے ہوئے میٹرک کی امتیازی کامیابی کا منکسر المزاجی سے بیان کرتے ہوئے آگے بڑھ جانا بھی اعلیٰ ظرفی کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس موقع پر اکثر لکھنے والے دھوم دھڑکا باندھتے اور لکھیں نخوت کے اسباب فراہم کرتے ہیں کہ بے چارہ قاری دم بخود رہ جاتا ہے اور خواہ مخواہ مصنف کے تبحر سے مرعوب ہو کر ساری کتاب کے مطالعے کے دوران تھکا ماندہ مضمحل اور دبا دبا اور گھٹا گھٹا سا رہتا ہے۔ اختر حسین نے اپنے قاری پر اپنی شخصیت کا بوجھ نہیں ڈالا بلکہ یہ ثابت کیا کہ ہر خود غلط اور بیمار ذہن صحیح اور صحت مند خطوط پر مبنی سوچ نہ رکھے تو وہ صحیح مصنف بھی نہیں بن سکتے۔ اس مجہول طبقے کے باب میں بغیر کچھ کہے سنے اختر حسین رائے پوری نے محض یہ کافی سمجھا کہ اس راہ سے چپ چاپ گزر گئے اور اپنے ذہین قاری کے استنباط مطالب اور استخراج مافی الضمیر کے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے۔ میٹرک کے بعد اختر حسین صاحب کے والد ماجد نے حکماً آبائی زمین پر انھیں بھیج کر ایک ایسا موقع فراہم کیا جس کے نقوش آج تک ان کے دل و دماغ میں تازہ ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے ان کی زندگی کی ایک فکری جہت ایک خاص زاویے پر قائم ہو گئی اور قارئین کے لیے بھی یہی وہ مقام ہے کہ جہاں برصغیر کے دیہی علاقوں کے عوام اپنی اقتصادی زبوں حالی اور دیہی کسان اور محنت کش اپنے تمام تر افلاس کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ گویہ محض ایک دریچہ ہے اور محض ایک علاقہ ہے لیکن اس دریچے سے پورے برصغیر کے محنت کشوں، کسانوں اور ہاریوں پر بلاواسطہ اور بالواسطہ سرکار انگلشیہ کے جاگیرداروں کا جبر، مرد اور سماج کا نقطۂ نظر عمل ظاہر ہو جاتا ہے اور ان کی تمام تر معنوی حیثیت کا احساس اجاگر ہو جاتا ہے۔ نہایت اختصار کے ساتھ کہیں سطروں میں اور کہیں بین السطور خاموش تبصرہ اس صورت حال پر کیا گیا ہے وہ مصنف کی بالغ نظری پر دال ہے۔

مصنف کی کلکتے روانگی کے بعد ہم ایک اور نظارہ کرتے ہیں کہ کلکتہ حکومت برطانیہ کا برصغیر میں پہلا بیت السلطنت تھا اور وہاں محض فورٹ ولیم ہی قائم نہیں ہوا بلکہ ۱۷۵۷ء میں جب سراج الدولہ کو مغلوب کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں باقاعدہ قدم جمائے تھے تو مغلوں کی بساط اسی دن الٹ گئی تھی ۱۸۵۷ء کے بعد اگرچہ برطانوی راج دہلی برصغیر میں دہلی قرار پائی، لیکن معنوی طاقت کا سرچشمہ ہر قسم کی قوت کا منبع کلکتہ رہا۔ اسی کلکتے میں اختر حسین رائے پوری اپنی پہلی شہری اقامت قائم کرتے ہیں اور شہر کے صنعتی مزاج کی تفہیم کا پہلا خط اپنے ذہن میں قائم کرتے ہیں کیونکہ ابھی انھوں نے برصغیر کے اکثریتی علاقوں کے باسیوں کے مزاج کے اجتماعی تول کو سمجھا تھا اور اب صنعتی نظام کے قریب پہنچ گئے۔ دونوں کی قربت نہایت ضروری اور دونوں کی تقسیم ناگزیر تھی۔ لطف یہ ہے کہ مصنف کے بڑے بھائی (مظفر حسین شمیم) پہلے سے کلکتے میں موجود تھے اور ملک کے نامور صحافیوں میں ان کی سنجیدہ و برجستہ اور اعلیٰ درجے کے قومی سطح کے لیڈروں سے دوستانہ مراسم تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی باہمی چپقلشوں کے نقشے یہیں تیار ہوتے۔ جلسے جلوس، ہڑتالیں اور خونریزی یہیں سے جنم لیتیں۔ جمہوری اور اشتراکی افکار کی سوچیں اسی مقام پر ملتی نظر آتیں۔ جس طرح غالب نے کلکتے کے سفر سے اپنے ایک نئے فکری سفر کا آغاز کیا تھا اسی طرح اختر حسین رائے پوری کی فکری زندگی کا آغاز بھی کلکتے سے ہوا۔ فرق یہ ہے کہ غالب کا کلکتہ برطانوی سامراج کی نشاۃ الثانیہ کا طلوع تھا اور اختر حسین کے زمانۂ قیام کا کلکتہ اس کے غروب کا پس منظر پیش کر رہا تھا۔ سارا آسمان شفق گوں تھا۔

مصنف نے مزید تعلیم کے حصول کے لیے کلکتے سے علی گڑھ کا رخ کیا۔ کلکتے میں ایک طرف جہاں برجستہ نقوش مشرق کی عظمت رفتہ کا نوحہ سنا رہے تھے تو دوسری طرف مزدور اور مل مالکان کی باہم رقابتوں میں سوشلسٹ نظام کے خدوخال نمودار ہو رہے تھے کہ روسی انقلاب کا پس منظر بہت واضح تھا۔ آزادی کی تحریکوں نے ادب اور صحافت میں نمایاں جگہ حاصل کر لی تھی اور البلاغ اور مولانا ابوالکلام کی خطابت ایک طرف تو ٹیگور کے نغمے دوسری طرف نوجوان اختر حسین کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ علی گڑھ پہنچتے ہی پروفیسر حبیب اور رشید احمد صدیقی سے قریب ہوئے تو سبط حسن حیات اللہ انصاری

اور مجاز لکھنوی بھی حلقۂ احباب میں شامل ہو گئے۔ ٹیگور اور اقبال سے بھی اسی زمانے میں ملاقاتیں ہوئیں اور مولوی عبدالحق، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی اور جواہر لعل نہرو سے بھی شناسائی پیدا ہوئی۔ اور بقول مصنف کے علم ادب کی سمتوں کا اسی جگہ تعین ہوا۔ ادب و زندگی کے فکر انگیز نتیجہ خیز اور انقلاب آفریں مقالے کی اساس قایم ہوئی اور اشاعت کی صورت بنی اور اسی مقالے نے مصنف کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

اسی طرح اختر حسین رائے پوری نے جنوبی ہند کے بعض ایسے مشاہیر کا مفصل ذکر کیا ہے جو ادب اور معاشرے پر بالواسطہ اور بلا واسطہ اثر انداز ہوئے۔ یورپ میں لندن اور فرانس کے مشاہیر میں سارتر، پابلو نرودا وغیرہ کا نہایت تفصیل سے احاطہ ہوا ہے۔ غرض کہ یہ ایک شخص کا ذکر نہیں ایک فرد کے پیچھے چھپی ایک قوم، ایک نسل اور اس قوم کی تاریخ، اس کے شعور، اس کے لاشعور، اس کے قبل شعور، تحت الشعور اس کی سائیکی (نفس) کی کتھا ہے جس سے تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ اس میں ان سب کی دلچسپی اور افادے کا مواد موجود ہے جو نقد ادب سے رومانوی، جمالیاتی، نفسیاتی، تہذیبی اور سائنٹفک زاویے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ محض کتب خانوں میں محفوظ کرنے والی کتاب نہیں بلکہ اس کے حرف حرف کو حرزِ جاں بنانے اور نئی نسل کے رگ و پے میں لہو بنا کر دوڑانے کی ضرورت ہے۔ یہ خود آگہی اور خود شناسی کے حوالے سے ذہنی افق کو روشن تر بنانے والی تصنیف ہے۔

(روزنامہ "جنگ" لاہور ۵ رجون ۱۹۸۵ء)

ریاض صدیقی

تاریخ و تہذیب کی گردِ راہ

"تہذیب و معاشرے کی بڑائی، گیرائی، استقامت اور آفاقیت کا مسئلہ تاریخ کے سفر اور لوگوں کے افعال کا مسئلہ ہے۔ اسپنگر صاحب کی ذکیا کائنات نے تہذیب مغرب کے مُردے کی آخری رسومات کا اعلان کر دیا، لیکن وہ مردہ کچھ اس طرح زندہ ہوا کہ سارے افریقی، ایشیائی، نیم ترقی پذیر ممالک اس کے پنجۂ گرفت میں آ گئے۔ بات یوں ہے کہ تاریخ و تہذیب، طرز معاشرت سیاسی و سرکاری اور انتظامی اداروں کی پالیسیوں اور منصوبہ بندیوں سے نہیں بنتے ہیں یہ تو وہ مرحلہ ہے جہاں اشتراکیت کو بھی ہار ماننی پڑی۔۔ ہمارے تعلیم یافتہ و باشعور طبقے اور حکام کو یہ احساس ہو گا کہ جو معاشرہ بڑا ادب، بڑی ادبی نثر، فنونِ لطیفہ اور فکر کا وارث ہوتا ہے وہ بڑی قوم اور بڑی تہذیب بنتا ہے کیونکہ وہ ملوم ادب، فنون لطیفہ اور افکار و نظریات کی برتری اور حرمت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ برعظیم کی آریائی اور ہند اسلامی تہذیب کا کینوس آفاقی ہے اسی لیے دنیا کی تاریخ اس کا ذکر کیے بغیر نہیں رہی۔ چینی سیاحوں سے لے کر البیرونی تک اور پھر فارسٹر وارڈیل سے لے کر بیسویں صدی کی ورلڈ انسائیکلو پیڈیا تک اس کا چرچا ہے۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد ہمارے یہاں دو چار دانش وروں کو اچانک محسوس ہوا کہ ہند و اسلامی آریائی تہذیب کے تمام رشتے ٹوٹ چکے ہیں اس لیے ایک نئی قومی تہذیب ڈھونڈھی جائے۔ گرما گرم بحثیں شروع ہوئیں تاریخی حقائق میں رد و بدل کرنے کے لیے نئی تاریخ لکھی گئی۔ تہذیب کے موضوع پر کتابیں شائع ہوئیں اور آخر حکومت نے اپنی پالیسیوں اور منصوبوں کے ذریعے ایک نئے کلچرل نقطۂ نظر کو عملی صورت دینے کے لیے پیش رفت کی، لیکن مرض بڑھتا ہی گیا اور نئی تہذیب کی تشکیل تو در کنار ہر طرف انتشار۔ بحران تنفر اور تعصب کا لاوا ابل پڑا۔ اس صورت حال کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے یہاں شروع ہی سے اردو اور علاقائی زبان و ادب، علوم و فنون اور افکار و نظریات کے آزادانہ سفر کو سرکاری مشینری کے تابع رکھا گیا اور ان مشاغل کو فضول سمجھا گیا اور جن فرائض کی ادائیگی بڑے معاشروں اور بڑی تہذیبوں میں ان کی ذمے داری ہوتی ہے ان کا ذمہ بھی سرکاری حکام اور کیبنٹ ڈویژن نے لے لیا اور چھتیس سال تک کام روکنے کے بعد یہ نتائج دیے کہ قومی و تہذیبی وحدت بکھر گئی، قدریں تباہ ہو گئیں اور پرنس کریم آغا خاں

[redacted]

ریاض صدیقی

کو یہاں ایسی کوئی عمارت علمی ہو قومی تشخص کی شناخت کرتی ہو اور جس کو عالمی تعمیراتی ایوارڈ دیا جا سکتا۔ ایک خلا پیدا ہوا جس کو بھرنے کے لیے مغربی تہذیب کا طوفان ہمارے گھر کے آنگن میں گھس آیا اور عملی صورت حال یہ ہے کہ قوم کی نمائندگی کرنے والے اور تعلیم یافتہ جوان نسل سر سے پیر تک پیروی مغرب میں شرابور ہے۔

اردو اور علاقائی زبانوں میں لکھنے والوں کو اگر مواقع فراہم ہوتے اور فضا موزوں ہوتی تو یقیناً ہم بھی بڑی ادبی نثر، عظیم الشان فنون لطیفہ اور افکار و نظریات کے سرمائے سے فیض یاب ہوتے۔ تہذیب و روایات کی تشکیل کا فطری ارتقائی تسلسل جاری رہتا اور بڑی قوم و تہذیب کی پرچھوٹ جھکی ہوتی لیکن ہمارے یہاں تو اس کام کا ذمہ سیاسی اداروں، لیڈروں، سرکاری حکام اور جاگیرداروں نے لے لیا۔

پاکستانی ادب خواہ قومی ہو یا علاقائی، ادبی نثر ہی سے نہیں بلکہ ادبی اصناف کے بعض شعبوں سے بھی زیادہ مانوس نہیں ہے۔ بعض اصناف جو تاریخ و تہذیب کو دوران سفر زادِ راہ فراہم کرتی ہیں مثلاً ادبی خودنوشت، ادبی سوانح اور خاکے وغیرہ کچھ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان اصناف میں خودنوشت ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہے اور تاریخ کی تفہیم و تدوین کے لیے سراول دستے کا کردار ادا کرتی ہے۔ ہماری پرانی تاریخ کے کتنے ہی معتبر نامے البیرونی۔ ابن بطوطہ۔ امیر خسرو۔ بابر اور جہانگیر کے سفرناموں اور خودنوشتوں کے مرہونِ منت ہیں۔ تہذیب و تاریخ کی تعبیرات و تشریحات کے ساتھ تعصبات اور ذاتیات کی بنا پر کی جانے والی بدعنوانیوں کی صحت و سند میں بھی ان اصناف کی کارفرمائی مددگار ہے۔ اردو کے وسیلے ہی سے۔ دوسری مسادہ ... کے ساتھ ہی اگر تزک جہانگیری موجود نہ ہوتی تو تاریخ کا میدان ملا بدایونی کے ہاتھ ہوتا۔

اردو میں ادبی خودنوشتوں اور خاکوں کی مقدار فکشن، تنقید اور دوسری اصناف کے تناسب سے کم ہے اور پھر وہ پھیلاؤ، گہرائی، آفاقیت اور تجربات و مشاہدات کی ظاہری و باطنی باریکیاں جو اچھی خودنوشت اور اچھے خاکوں کا تقاضہ ہیں ان میں دکھائی نہیں دیتی ہیں۔ ان حالات میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی ادبی خودنوشت گردِ راہ کی اشاعت ادب اور تاریخ و تہذیب سے دلچسپی رکھنے والوں کو ایک خوش خبری ہے۔ اس کام کی تحریک و تکمیل اور پھر طباعت و اشاعت کا سہرا ادبی رسالے ماہنامہ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی کے سر ہے۔ فن۔ معیار۔ مواد۔ واقعاتی ترتیب کینوس اور زبان کے اسلوب۔ غرض کہ ہر پہلو سے یہ ایک ایسی بڑی ادبی تخلیق ہے جو عہد حاضر کی انگریزی خودنوشتوں کے قد تک پہنچتی ہے۔ اس میں بیسویں صدی کے برعظیم کا سیاسی، ادبی، تہذیبی اور فکری گردوپیش بین الاعظمی سیاسی ادبی علمی تہذیبی و فکری گردوپیش سے جا ملا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے مشرقی و مغربی دنیا کے بہت سے حصوں کو چھانا ہی نہیں بلکہ روشن نگاہ سے دیکھا ہے چنانچہ ان خطوں کی پوری سیاسی، فکری، ادبی جمالیات اور علمی و تہذیبی سرگزشت سنائی ہے۔ ان مشاہدات و تجربات میں مصنف کا تنقیدی و تجزیاتی انداز معنی کی نئی نئی سمتیں کھولتا ہے۔ انھوں نے واقعات و مسائل اور تحریکات و افکار کو ایک عالم اور نقاد کی نظر سے دیکھا ہے۔ گردِ راہ، برعظیم اور عالمی منظر کے ان زمانوں کا آئینہ ہے جو تاریخ عالم میں سائنسی، سیاسی، علمی، فکری اور ترقیاتی اعتبار سے عظیم الشان تھا۔ زبان کی خوشبو، بیان کی سادگی و اثر پذیری اور پھر مصنف کے جامع اختصار نے اس کو زندہ ادبی نثر کا نمونہ بنا دیا ہے۔ گردِ راہ، ایک باغ و بہار ہے۔ اس میں آپ کی ملاقات ان بڑے عالمی فلسفیوں اور لکھنے والوں سے ہوگی جن سے مصنف نے براہِ راست گفتگو کی ہے اور جو اب ہمارے جدید علوم و ادبیات کا ضروری حوالہ بن گئے ہیں۔ تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونے والی دشواریوں کے حوالے سے بھی بعض ایسے گوشے اس میں کھلے ہیں جو مطالعہ اور تاریخ پاکستان کو وقار و اعتبار بخشتے ہیں اور جن سے ہماری تاریخ ابھی تک آگاہ نہیں ہے۔ مثلاً ہندی اردو تنازعہ کے بارے میں گاندھی جی، مولوی عبدالحق اور مصنف کے درمیان ملاقاتیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے پچھلے سالوں میں کئی بار یہ کہا تھا کہ بڑی تہذیب اور بڑی قوم کے لیے بڑی ادبی نثر کے فروغ و ارتقا کے مسئلے پر

ادیبوں کو سوچنا چاہیے "گردِ راہ" میں بھی انھوں نے اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے اور پھر خود ولاشت لکھ کر ایک نمونہ دیا ہے کہ نما بدلتے ہمارے سماجی اداروں، اہلِ دانش اور حکومت علم و ادب کی سرپرستی کے ذریعے ان کو سمجھیں اور ہمارے لکھنے والے اردو کے ساتھ علاقائی زبانوں کے ادبی تحقیقی نثر کے لیے میدان میں آئیں۔ قومی تہذیب و سالمیت کے حوالے سے اس وقت یہ ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہے۔

(روزنامہ "جنگ" لندن — ۱۴ / ۱۵ ستمبر ۱۹۸۵ء)

ادارہ

گردِ راہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری برصغیر کی ایک مشہور اور بزرگ علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ انھوں نے مغرب و مشرق کو اچھی طرح سے دیکھا بھالا ہے۔ اسی لیے ان کا تجربہ بھی ان کے علم کی طرح گراں مایہ ہے۔ "گردِ راہ" ان کی وہ کتاب ہے جس میں تحریر علمی کے ساتھ ان کے گراں قدر تجربات اس طرح بیان ہوئے ہیں کہ پڑھنے والے کو اپنے عہد کی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ کتاب قاری کو رائے پور سے کلکتہ، کلکتے سے علی گڑھ، پھر حیدرآباد دکن اور دہلی، اور دہلی سے قیامِ پاکستان کے بعد کراچی پہنچاتی ہے۔ کراچی سے پیرس، امریکہ، ایران اور افریقہ لے جاتی ہے۔ ان معاملات کی سیر کے علاوہ بڑی شخصیتوں سے ملاقات ہوتی ہے، اہم واقعات کا پتہ چلتا ہے اور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے اہم مسائل سے آگاہی ہوتی ہے اور نہ جانے کتنے ہی باریک اور حساس نکات سمجھ میں آتے ہیں جن سے عہدِ جدید کی تفہیم میں آسانی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے داخلی معاملات پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے زیادہ تر خارجی دنیا ہی کی زلفیں سلجھائی ہیں۔ لیکن غور سے پڑھنے والا بھی زندگی کی ایسی باتوں کو ہرگز نظر انداز نہیں کرے گا جو چند جملوں میں بیان ہونے کے باوجود نہایت بلیغ اور گہری معنویت کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری افسانہ نگار اور نقاد ہیں، مورخ اور معلم ہیں۔ ان کا مضمون "ادب اور زندگی" ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا جو "ادب اور انقلاب" کے عنوان سے کتابی صورت میں چھپا ہے۔ اس مضمون کو ۱۹۳۶ء کی ادبی تحریک کا سنگِ بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ "گردِ راہ" جس کی معنویت پر اختر حسین رائے پوری [illegible] گراں [illegible] سے آشنائی ہوتی ہے اور موضوع [illegible] [illegible] رائے [illegible] [illegible] [illegible] یہ اردو ادب کے قارئین کے لیے ایک اعلیٰ پائے کی کتاب ہے۔ [illegible] علم و فن، فلسفہ و جمالیات سے متعلق ایسی باتیں اس کتاب کا حصہ ہیں جو عصری اور معروضی دونوں اعتبار سے "قابلِ قدر" انداز میں زیرِ بحث آئی ہیں اور ان کے بغیر عہدِ جدید عالمی فکر کا ہر مطالعہ ادھورا رہ جائے گا۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی ۲۰ / فروری ۱۹۸۶ء)

ادارہ

گردِ راہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام ہمارے ادب میں تاریخ کا بدل ہے۔ وہ عہد ساز شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا ادبی اور علمی سفر اتنا طویل ہے کہ ان کو کتابوں، تحریروں اور تبصروں میں سمیٹا نہیں جا سکتا۔ وہ نصف صدی کے ادیب، نقاد، مؤلف اور کہانی کار ہیں۔ انھوں نے جس طرح علم حاصل کیا اسی طرح بانٹا بھی دیا۔ کبھی درس گاہوں کے اندر اور کبھی باہر۔ ان کے ادبی کارنامے اور علمی کاوشیں صرف برصغیر کی جغرافیائی حدود تک

[redacted]

... ... سے تعلق رکھتی ہیں جو مختلف مسلم ... ہیں۔

... ... آپ بیتی ہے جو ... سے قبل افکار میں قسط وار شائع ہوئی اور اس سے قبل کردہ وقت کے ساتھ مزید منتشر ہوتیں۔ ان کو

مکتبہ ... نے ... کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔

"گرد راہ" دیکھنے میں ایک آپ بیتی ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ وہ اس پورے زمانے کی تاریخ ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی آنکھوں

سے ... پورے ... برس کے عرصے میں رونما ہونے والے تمام سیاسی واقعات، سماجی عوامل اور ادبی اور علمی تحریکوں کے محرکات دکھائے ہیں اور

... ... دری اور خوب صورت پیرائے میں بیان کر کے ایک پورے عرصے کو محفوظ کر دیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کتاب آپ بیتی نہیں، مشاہدہ

... ... صورت دستاویز تصور کی جائے گی۔

... ... کی طباعت کا اہتمام ... ہے ... اس اہتمام سے کتاب کو شائع کیا ہے جس کے وہ لائق ہے۔ یہی اس عظیم عہد ساز

... ... ہے۔ مجنوں گورکھپوری اور فیض احمد فیض نے کتاب کے سرورق پر اپنی آرا لکھی ہیں۔ جب کہ موجد کا دیدہ زیب اور پُر فکر سرورق

... ... ہے یقیناً یہ کتاب اردو ادب میں ایک قابلِ احترام اضافہ ہے۔

(روزنامہ "حریت" کراچی ۔ ۲ مارچ ۱۹۸۴ء)

حسن عابدی

گردِ راہ ـــ ایک مطالعہ

ڈاکٹر ... حسین رائے پوری ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ اپنی تخلیقی اور علمی صلاحیتوں کی بدولت انھوں نے مشرق و مغرب کے ممالک میں

... ... شہرت حاصل کی۔ اقوام متحدہ کے ادارہ یونیسکو نے ڈاکٹر صاحب کی صلاحیتوں سے مدتوں استفادہ کیا۔ اب ڈاکٹر صاحب نے اپنی بوقلموں

زندگی کے مشاہدات اور تجربات کو کتابی صورت میں مرتب کیا ہے۔ وہ کئی حیثیتوں سے ممتاز ہیں۔ ماہر تعلیم ہیں۔ زبان داں ہیں، ہندی، سنسکرت اور

... ... ہندی کے کلاسیکی ادب اور مشرق کے علوم اور فلسفے پر فاضلانہ نظر رکھتے ہیں۔ وہ اردو لغت کی ترتیب و تدوین میں

... ... کے خاص معاون تھے

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ... تنقید کو اور افسانے کو جدید اور ترقی پسندانہ فکر سے اس وقت متعارف کرایا جب ابھی بہت کم لوگ جدید فکر

سے روشناس ہوئے تھے۔ چنانچہ ... کا شمار ... ترقی پسند تحریک کے ... ناموں میں ہوتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

... ... "ادب اور زندگی" اور چند دوسرے مضامین سے ترقی پسند تحریک اور انجمن کے اصول و نظریات کے تعین اور ترتیب و تدوین میں

... ... خصوصیت کے ساتھ "ادب اور زندگی" ترقی پسند تحریک کا سنگِ بنیاد ثابت ہوا۔"

... ... نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ "... نے ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دنوں میں اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا اور اس تحریک

کے سرگرم ... ... رہے۔"

... ... ڈاکٹر اختر حسین ... ... انداز میں گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط برصغیر کی ادبی، تہذیبی اور سماجی

زندگی کے نقوش پیش کیے ہیں۔ جہاں کہیں سیاسی نشیب و فراز آئے ہیں، ان کی جھلکیاں بھی دکھا دی ہیں، لیکن یہ پورا عرصہ سیاسی طور پر جتنا بیدار،

پُر شور اور ہنگامہ پرور تھا، اس کے بیان کے لیے تو کئی جلدیں ناکافی ہوں گی۔ سیاست، اس کتاب کا موضوع نہیں۔ یہ کہنا بھی شاید درست نہ ہو کہ یہ

ہمارے عہد کی مکمل ادبی، تہذیبی اور سماجی تاریخ ہے۔ (اس کا دعویٰ خود مصنف نے بھی نہیں کیا) تاریخ نویسی کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور اس کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب نے بڑا کام یہ کیا ہے کہ اپنے عہد کو اور اس کے واقعات، کردار اور پس پردہ حقائق کو کہ جس قدر ان کے مشاہدے اور تجربے میں آئے اپنی سادہ و شگفتہ تحریروں میں زندہ کر دیا۔ ان کے بہت کم معاصروں نے یہ کام اتنی یکسوئی سے کرنے کی زحمت کی ہے۔ شخصیات کے خاکے مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی نے اور کچھ دوسرے ادیبوں نے بھی لکھے۔ (نقوش کی دو جلدیں ان خاکوں پر مبنی بہت پہلے شائع ہوئی تھیں) رپورتاژ بھی بکثرت لکھے گئے۔ خطوط اور ڈائریاں بھی شائع ہوتی آئی ہیں، جن سے بعض حاضرین کی زندگیوں پر اور عصری ادب کے مسائل اور احوال و افکار اور ادبی مباحث پر روشنی پڑتی ہے۔ غرض کہ ہم منتشر تحریروں کی مدد سے گزشتہ ساٹھ ستر برسوں کی ایک ادبی، تہذیبی، سماجی دستاویز تو مرتب کر سکتے ہیں، لیکن کوئی ایک کتاب جو اتنی جامع ہو جیسی یہ آپ بیتی ہے، ہمیں نہیں ملتی۔ ادب کا وقائع نگار جب ہمارے زمانے کی ادبی اور تہذیبی تاریخ مرتب کرنا چاہے گا تو حوالے کے لیے یہ کتاب اس کی بڑی معاون ہوگی اور ویسے بھی ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی سوانح ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری خود ہی لکھ سکتے تھے۔ کوئی دوسرا کیوں لکھتا اور کیسے لکھتا!

'گرد راہ' میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ہمیں ایک بیدار مغز، حوصلہ مند اور جہد آزما شخص نظر آتے ہیں جو بہت کچھ خسارہ اٹھانے اور سختیاں جھیلنے کے باوجود زندگی سے تھکن، اکتاہٹ اور بیزاری محسوس نہیں کرتے۔ خود ترسی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ زمانے کی قدرناشناسی کا گلہ نہیں کرتے۔ اپنے علم اور ہنر کی نمائش اور خود ستائی کے عیب میں بھی گرفتار نہیں۔ سادگی اور صاف گوئی سے زندگی کے واقعات بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ جن جن سے ان کی ملاقات ہوئی، ان کا تذکرہ محبت اور احترام سے کرتے ہیں۔ ان میں ایشیا اور یورپ کے انقلابی، مفکر، ادیب، شاعر، سیاسی رہنما سبھی طرح کے لوگ آتے ہیں۔ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نہ تو مرعوب ہوتے ہیں، نہ ان کی خوبیوں کے بیان میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں اور نہ ان کی کمزوریاں بیان کر کے خوش ہوتے ہیں۔ البتہ ایک طرح کی تشنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے کہ مصنف اس سلسلے میں اگر کچھ لکھتا تو اچھا تھا ترقی پسند تحریک کے حوالے سے منشی پریم چند، ٹیگور، ملک راج آنند، حسرت موہانی، سجاد ظہیر اور ان کے کئی رفقا کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان میں سے بعض کا تذکرہ کہیں سرسری کیا ہے، کہیں صرف نام لے دیا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے اس خیال سے دانستہ اجتناب برتا ہو کہ مقطع میں سخن گسترانہ بات کبھی آ جاتی ہے، یہ احتیاط شریفانہ سہی لیکن ادبی وقائع نگاری کے باب میں سود مند نہیں۔

'گرد راہ' کی تحریر سلیس اور شگفتہ ہے۔ اس کا بیانیہ انداز کہانی کی طرح پرکشش ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں حکیمانہ رنگ لیے ہوئے [illegible] موقع پر مصنف اپنے تجربات کا حاصل بیان کرنا نہیں بھولتا۔ پھر اس کے فوراً بعد کسی نئی واردات کے حوالے سے کوئی نئی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ غرض کہ کتاب اتنی پرکشش ہے کہ ختم کیے بغیر اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

کتابت، طباعت اور گرد پوش نفیس اور معیاری ہے۔

(ہفت روزہ "اخبار خواتین" کراچی ۱۲ تا ۱۸ مئی ۱۹۸۶ء)

ا۔ س

گرد راہ پر ایک نظر

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی ذات گرامی کے لیے لفظ "ہمہ صفت" نہایت موزوں لگتا ہے [illegible] فرانسیسی زبانوں میں نہ صرف عالمانہ دست گاہ حاصل کی بلکہ ان میں سے اکثر زبانوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا [illegible]

[redacted]

یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اردو ماحول میں آنکھ کھولی، پروان چڑھے، لیکن اپنی ادبی و صحافتی زندگی کا آغاز ہندی سے کیا۔ ہندی کے مشہور جریدہ [illegible] بھارت، کلکتہ میں مضمون "بنگلہ کی آخری جھلک" اور دوسرے بہت سے مضامین لکھ کر ہندی ادبا اور ناقدین کے حلقے میں [illegible] ایک عرصے تک مشہور روزنامہ "وشوامتر" کلکتہ کے ادارتی [illegible] شامل رہے۔ پھر ایک ہندی رسالہ "وشووانی" کے مدیر اور [illegible] اردو کی طرف راغب ہوئے تو دیکھتے ہی دیکھتے اس پر چھا گئے۔ اردو ادب کی بہت سی اصناف میں نام اور شہرت پائی۔ بحیثیت افسانہ نگار ان کے افسانوی مجموعے [illegible] کا نام اور کام آج تک قارئین کو یاد ہے۔ تراجم کے باب میں کالی داس کا مشہور ڈرامہ شکنتلا، قاضی نذر الاسلام کی نظم [illegible] اور [illegible] آج تک لوگوں کو نہیں بھولتی۔ تنقیدی کتاب "ادب اور انقلاب" کے مقالے "ادب اور زندگی" نے انھیں اہل نقد کی نظر میں ترقی پسند تحریک کے [illegible] اور بقول سجاد ظہیر ترقی پسندوں کا پیش رو منوایا۔

"ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی سرگزشت کتاب "گردِ راہ" کے سیاق و سباق سے گزرنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی عملی زندگی کے [illegible] سال مختلف نوعیت کے تعلیمی مشاغل میں گزرے۔ مشغولیت کا یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء سے شروع ہو کر ۱۹۷۲ء میں ختم ہوا۔ اس طویل مدت میں انھوں نے [illegible] امرتسر میں پروفیسری کی۔ انگریزی دورِ حکومت میں حکومت کے معاون مشیر تعلیم رہے۔ بعد ازاں حکومت پاکستان کے نائب مشیر تعلیم [illegible] "یونیسکو" کے نمائندے کی حیثیت سے حکومت [illegible] حکومت ایران کے مشیر تعلیم کے فرائض انجام دینے پڑے۔

ڈاکٹر صاحب جس دور میں سن شعور کو پہنچے وہ [illegible] انقلابی تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ پیرس میں بغرض تعلیم مقیم تھے۔ وہاں ان کی ملاقات [illegible] ادیبہ اور عالم خاتون [illegible] اور مشہور شاعر [illegible] سے ہوئی۔ جنگ کے قبل اور بعد کے حالات ڈاکٹر صاحب کی نظروں سے گزرے۔ انھیں قریب سے دیکھا اور علمی سطح پر محسوس کیا۔ برصغیر کی آزادی کی تحریکوں میں ان کا قلم شریک رہا۔ اس دوران انھیں برصغیر کی آزادی کی [illegible] شخصیتوں [illegible] حسین خان، پروفیسر مجیب [illegible]۔ مولوی عبدالحق۔ سروجنی نائیڈو۔ ابوالکلام آزاد، پریم چند، ڈاکٹر رادھا کرشنن وغیرہ سے بار بار ملنے [illegible] کے ہمدردی [illegible] اور ان سے [illegible] مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کا موقع فراہم ہوتا رہا۔ یہ سارے تجربے اور مشاہدے اور یہ سارا علم "گردِ راہ" کے صفحات پر [illegible] سوانح عمری کی صورت میں سمٹ آیا ہے۔ اس کی صورت ایسی ترشی ترشائی ہے کہ ہر کوئی اسے دل میں [illegible] رہا ہے۔ دلچسپ بات [illegible] کا تاثر [illegible] ہے۔ کوئی اس کے صفحات میں وقائع نگار کو کہانی کار سے گلے مل کر چلتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ [illegible] ہوئے [illegible] کا سامان [illegible] ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک [illegible] سفر میں ہے۔

"گردِ راہ" کے قارئین کا ذوق و شوق [illegible] سے کس ادبی صنف کے خانے میں فٹ کر کے دیکھنا چاہتا ہے، اسے کوئی شناخت دینا چاہتا ہے، [illegible] کی حد کا [illegible] کے فیصلے پر پہنچنے نہیں دیتی۔ معروف نقاد محمد حسین نے "گردِ راہ" کو آپ بیتی کی بجائے جگ بیتی [illegible] میں کوئی [illegible] نہیں [illegible] جگ بیتی کے تقاضے پورے کرتی ہے، لیکن اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری [illegible] سوانح عمری کہا ہے، ہمیں اسی حوالے سے اس کی شناخت کرنی چاہیے۔ اس سوانح عمری کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس میں [illegible] نہیں ہے۔

"گردِ راہ" [illegible] کسی مقام پر قدرے تشنگی کا احساس ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ گفتگو وہاں ذرا تفصیل سے کی جاتی۔ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب تحریر میں ایجاز و اختصار کے حسن کو [illegible] اور ان کی نثر میں لفظوں کا ضیاع [illegible] رکھتا ہے۔ یہی وہ محاسن ہیں جن کی وجہ سے یہ کتاب ادبی و علمی حلقوں میں بہت مقبول ہو رہی ہے۔ کتاب میں تصویروں کی شمولیت نے اس کی قدر و اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

(ہفت روزہ "اخبار جہاں" کراچی ۔ ۹ تا ۱۵ جولائی ۱۹۸۴ء)


Mehranfans®
حکومت پاکستان کے ادارے
پاکستان اسٹینڈرڈ انسٹیٹیوٹ
کی طرف سے
صنعت پنکھا سازی
کے عالمی معیار کے مطابق
نشان سند
مہران
کمالِ فن کا نشان
○ سیلنگ ○ پیڈسٹل ○ ایگزاسٹ
حسنِ کارکردگی کی اعلیٰ مثال
PHONE . 651249
مہران پنکھے
مہران الیکٹرونکس کمپنی کراچی
ڈیلرز ماسٹر الیکٹرک کمپنی ایم. اے. جناح روڈ کراچی
Phone : 213204

پروفیسر مجتبیٰ حسین

"گردِ راہ"۔۔۔ ایک جائزہ

"گردِ راہ" ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ہمارے ادب کے معتبرین میں سے ہیں۔ وہ سنسکرت، ہندی، انگریزی، فارسی اور اردو کے عالم فاضل ہیں۔ ان کی شخصیت کئی جہتوں کی حامل ہے۔ افسانہ نگار، مترجم، تنقید نگار، معلم، محقق وہ سب کچھ ہیں۔ مدتوں تعلیمی مشاغل میں زندگی بسر کی۔ جیسا کہ خود لکھتے ہیں "میری عملی زندگی کے تیس سال تعلیمی مشاغل میں صرف ہوئے یہ سلسلہ ۱۹۳۲ء میں ایم اے او کالج امرتسر کی پروفیسری سے شروع ہو کر ۱۹۶۲ء میں ختم ہوا۔ جب میں اقوامِ متحدہ کے ادارہ یونیسکو کی ملازمت سے ریٹائر ہوا۔ اس دوران مجھے برطانوی حکومتِ ہند کے معاون مشیرِ تعلیم، حکومتِ پاکستان کے نائب مشیرِ تعلیم اور یونیسکو کے نمائندے کی حیثیت سے حکومتِ صومالیہ اور حکومتِ ایران کے مشیرِ تعلیم کے فرائض انجام دینے پڑے۔"

اپنے مشاغل کی وجہ سے وہ دنیا کے بہت سے ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ مشرق و مغرب اور افریقہ کے کئی ممالک کی زندگی، طرزِ زندگی اور طرزِ معاشرت کو انھوں نے بہت قریب سے مطالعہ کر لیا۔

برصغیر کی نامور ہستیوں سے انھیں ملنے اور گفتگو کرنے کے مواقع ملے ہیں۔ مولانا عبدالحق، سروجنی نائیڈو، مہاتما گاندھی، شیخ عبدالقادر، خالدہ ادیب خانم، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر رادھا کرشنن، سی۔ پی۔ رامن، پریم چند، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، سعادت حسن منٹو، اسرار الحق مجاز، ن۔ م۔ راشد [illegible] بہت سے دانشور، شاعر اور ادیب ان کی زندگی میں کسی نہ کسی پہلو سے آتے رہے ہیں۔

ایسی متنوع پہلو دار [illegible] بہت کم شاعروں اور ادیبوں کے حصے میں آتی ہے۔ چنانچہ جب ایسا آدمی جو ایسی زندگی بسر کر چکا ہو۔ اپنی سوانح عمری لکھے تو علم و ادب کے تجربات، مشاہدات، مطالعے اور غور و فکر کی صورت میں ہمیں کیا کچھ نہ دے گا۔

یہی وجہ ہے کہ "گردِ راہ" پڑھتے وقت یہ احساس اتنی شدت سے نہیں ہوتا کہ یہ ایک جید ادیب کی خود نوشت ہے ضمناً یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک مفکر، ماہرِ تعلیم، صحافی اور دانشور کے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی اولیں اور بنیادی شخصیت ادیب کی ہے۔

[illegible] سب سے پہلی "محبت اور نفرت" اور "زندگی کا میلہ" ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے افسانے اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئے۔ تنقید نگاری میں "ادب اور انقلاب" اور "روشن مینار" ان کی عہد آفریں کتابیں ہیں۔

اردو شاعری کو قاضی نذر الاسلام سے روشناس کرانے کا اوّلین فریضہ انھوں نے انجام دیا۔ کالی داس کے مشہورِ زمانہ ناٹک شکنتلا کا اردو ترجمہ انھوں نے حسن و خوبی سے کیا۔ ان کے دوسرے اہم تراجم میں گورکی کی آپ بیتی اور پرل بک کا ناول گڈ ارتھ انتہائی وقیع چیزیں ہیں۔ اس طرح انھوں نے اردو کا دامن افسانوں، تنقید اور تراجم سے مالا مال کر دیا۔

"گردِ راہ" پڑھتے وقت ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ زمین کے مختلف خطوں سے گزر رہے ہیں۔ ابھی رائے پور میں ہیں۔ ابھی کلکتے میں۔ ابھی بڑے بڑے شہروں میں ہیں اور ابھی گھنے جنگلوں میں، عظیم آباد، علی گڑھ، حیدرآباد، دہلی، شملہ، پیرس، طہران، ٹوکیو، لندن، نیویارک، افریقی شہر سب ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں۔ ادبی، ثقافتی، تعلیمی اور سیاسی تحریکوں میں ہم شرکت کرتے ہیں۔ دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں کی سیر کرتے ہیں اور اختر حسین رائے پوری کی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر زندگی کے نہایت اہم اور سنگین مسائل پر غور کرتے ہیں ہم کبھی درس گاہوں میں اپنے آپ کو پاتے ہیں، کبھی میدانِ جنگ میں، کبھی صلح کی میز پر اور کبھی ثقافتی سرگرمیوں میں۔

یہ خود نوشت اسی دلچسپ اور دل آگیں ہے کہ اس کے کسی حصے تو کیا کسی سطر کو بھی چھوڑنا محال ہوتا ہے۔ انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے "اس کتاب میں میں نے اپنے ماحول، مشاہدے اور مطالعے کا ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے صحیح معنوں میں یہ سوانح حیات نہیں بلکہ ایسی تحریر ہے جس میں آپ بیتی کم اور جگ بیتی زیادہ ہے۔"

غالباً اس کتاب کی بڑی اہمیت یہی ہے۔ ذاتی معاملات۔ ذاتی تعلقات، ذاتی الجھنوں کا ذکر اگرچہ اس کتاب میں جا بجا ملتا ہے۔ مگر جلد ہی یہ سارے مسائل زندگی کے پس منظر میں گم ہو جاتے ہیں اور سامنے بدلتی ہوئی اور نئے رنگ سے جلوہ دکھاتی ہوئی زندگی ہماری توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور وہ تمام اہم اور غیر اہم جو مصنف کی ذاتی زندگی میں داخل ہونے ہیں عالمی مسائل کے مباحث میں گم یا ضم ہو جاتے ہیں۔

"گرد راہ" بڑی سیر حاصل کتاب ہے۔ البتہ ادبی شخصیتوں پر گفتگو کرتے وقت اس میں کہیں کہیں تشنگی محسوس ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب چند باتوں کا جلدی جلدی ذکر کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کاش وہ معاصر شاعروں اور ادیبوں کا اور کھل کر ذکر کرتے تو ادب اور ادیبوں کی بہت سی ایسی باتیں سامنے آجاتیں جنھیں صرف ڈاکٹر صاحب ہی لکھ سکتے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے "گرد راہ" سوانحی ادب میں انتہائی اہم اضافہ ہے۔ اس میں عصری زندگی اور اس پر تنقید دونوں چیزیں ملتی ہیں۔

(بہ شکریہ بی۔ بی۔ سی۔ کوئٹہ)

(روزنامہ "جنگ" کراچی۔ یکم تا ۱۵ جولائی ۱۹۸۴ء)

سید شبیر علی کاظمی

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی "گرد راہ"

"گذشتہ نصف صدی سے اردو ادب میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام جانا پہچانا ہے۔ وہ ادیبوں میں معتبر اور قاریوں میں محترم شخصیت ہیں۔ انھوں نے اردو فکر جدید کا آغاز اپنے مضمون "ادب اور زندگی" سے کیا تھا۔ اس مضمون نے ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھ دی جس سے نقد و نظر کو نئی روشنی ملی اور وہ اردو کے بعض حلقوں کی ادبی فکر کی آج تک رہبری بنی ہوئی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ اور تجربہ اردو زبان کا وسیع سرمایہ ہے۔ وہ ہندی، بنگالی، سنسکرت، فارسی اور انگریزی وغیرہ میں مہارت کے ساتھ ترجمہ، تصنیف کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان زبانوں کے ادب سے کسب فیض کر کے یہی فکر سے اردو کے دامن کو گلِ ونقش سے بھر دیا ہے۔ ان کی تحریروں میں تاثیر ہے جو اس فطری سادگی کا نتیجہ ہے جو زبان اور خیال پر قدرت سے حاصل ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں الفاظ کی فضول خرچی نہیں۔ وہ اسلوب کی خاطر صفات کو صف آرا نہیں کرتے۔ ان کی زبان میں رس اور بیان میں نکھرتا ہے جو موثر ٹھہرتی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب کی زندگی ایک کامیاب اور منظم زندگی ہے۔ انھوں نے اپنے احباب اور متعلقہ واقعات کو پرخلوص انداز میں بیان کر کے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ واقعات خیال افزا، سبق آموز اور طرز تحریر سادگی میں تاثیر کا نمونہ ہے۔ مشاہدہ اور مطالعہ جب سرگزشت بن کر سامنے آتا ہے تو کچھ واقعات رہ بھی جاتے ہیں۔ اگر "گرد راہ" میں ایسا ہوا ہو تو ڈاکٹر صاحب سے التجا ہے کہ اس کمی کو دوسری تصنیف سے پورا کر دیں۔ "گرد راہ" کے نصف آخر میں سیر عالم کے تحت ڈاکٹر صاحب کے بصیرت افروز تجربات کا بیان نہایت موثر اور معلومات میں اضافے کا موجب ہے۔ ان یادوں کے بعد ادب کا ماضی و حال اور مستقبل کی اہمیت و فضیلت پر ادیبانہ خیالات کا اظہار ہے جو ادیبوں اور ناقدوں کو سوچنے اور سمجھنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ یہ انداز معلمی ہے جو زمانے تک یادگار رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر تلخی سے بے نیاز ہے۔ ایک دو جگہ طنز کا سامنا ہوتا ہے۔ بعض افعال اردو اور ہندی اشتراک کی

یادکو تازہ کردیتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ گردِراہ مصنفہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اردو ادب کا موقر اضافہ ہے۔

یہ سرگزشت "گردِراہ" نہیں بلکہ کحل البصر ہے۔ اس کا مطالعہ ضروری ہے کیوں کہ یہ بقول مصنف خام پن، پختگی اور سوختگی کی ایک معتبر اور وقیع شہادت ہے جو ذہن نشین رہے گی۔ کتاب ہر لحاظ سے دیدہ زیب ہے۔ مصنف اور ناشر دونوں ہماری مبارک باد قبول کریں۔

(ماہنامہ "قومی زبان" کراچی۔ مارچ ۱۹۸۴ء)

فضل قدیر

گردِراہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری پہلے ناقد ہیں جنھوں نے تخلیق ادب ـــ میں معاشی پس منظر پر نظریں مرکوز رکھنے پر زور دیا۔ ان کا مجموعہ مضامین "ادب اور انقلاب" تنقید میں اچھوتی نوعیت کی کتاب تھی۔

ان کی تازہ کتاب "گردِراہ" اس کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔ یہ کتاب جستہ جستہ مضامین کا مجموعہ ہے جو اہل ادب کے بے حد اصرار پر انھوں نے بصارت کے زیاں کے باعث بول کر لکھوائے ہیں۔ یہ ایک انداز کا کشکول ہے، ایک جہاں گرد صوفی درشی کا جس میں بڑے تھکے ہوئے ریسٹرنٹ سے کچھ تخی زندگی کی بھی جھلکیاں ہیں۔ اور آرٹ اور ادب کے گیانیوں کی صحبتوں کے تاثرات بھی ہیں۔ مختلف دیسوں کے مناظر اس میں سفرنامے کا رنگ پیدا کرنے کو موجود ہیں۔ عصری ادب پر ایک نظر بھی ڈالی گئی ہے اور دو ٹوک اور بے لاگ آرا کی بھی کمی نہیں۔

کتاب بہت منظم اور مربوط ہے تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اگر بول کر لکھوانے پر مجبور نہ ہوتے تو بعض مضامین کو اور زیادہ وسعت دیتے۔ یقیناً ان کے پاس ادب کو ابھی بہت کچھ دینے کو ہے اس لیے وہ "گردِراہ" کو اوراقِ کتاب پر بکھیر کر مطمئن نہ ہوں تو ادب کے لیے یہ مبارک ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب ایک مضبوط طبیعت رکھتے ہیں۔ ان کے خیالات مصلحتوں سے سمجھوتہ نہیں کرتے، اللہ انھیں تا دیر سلامت رکھے۔ ترقی پسند تحریک کے بیان گزار کی حیثیت سے وہ اس تحریک کے اثرات کا اور وسعت سے جائزہ لیں تو یہ ایک کارنامہ ہوگا۔ کتاب کی طباعت، جلد بندی اعلےٰ درجے کی ہے۔ کاغذ بہت نفیس ہے۔ اُسے دیکھتے ہوئے قیمت مناسب ہے۔

(ماہنامہ "ماہِ نو" ـ لاہور ـ مارچ ۱۹۸۴ء)

فضل من اللہ

گردِراہ پر تنقید و تبصرہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی پہلی کہانی ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ اس اعتبار سے ان کی تحریر اردو ادب کی گزشتہ نصف صدی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اُن کی اہمیت ایک اور زاویے سے بھی ہے کہ انھوں نے "ادب اور زندگی" کے عنوان سے جو تنقیدی مقالہ لکھا اُسے ادب کی ترقی پسند تحریک کی فکری اساس کہا گیا ہے (وہ ایک بار کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر بھی چنے گئے تھے) ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ وہ مرکزی حکومت کی وزارتِ تعلیم سے منسلک تھے۔ اس حیثیت سے وہ پاکستان آئے اور پھر چند سال بعد وہ یونسکو سے وابستہ ہو گئے اور ملک ملک پھرے اور اسی ادارے سے وہ سبک دوش ہو گئے۔ ستم ظریفی دیکھیے جب عمر بھر کے تجربے اور ملک ملک پھرنے کے بعد انھیں بے پناہ بصیرت میسر آئی تو وہ بصارت سے محروم ہو گئے۔ حضرت صہبا کا شکریہ کہ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اظہارِ رائے پر آمادہ کیا، پہلے افکار کے ذریعے اور اب اسے ایک خوب صورت

کتاب کے طور پر پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ترقی پسند تھے، اشتراکی بھی تھے۔ ان میں بھی ان کی اشتراکیت اور ترقی پسندی ایک بالغ نظر صاحب علم کی اشتراکیت اور ترقی پسندی ہے۔ شروع سے ہی وہ ہندی میں لکھتے رہے، ہندی کے جرائد سے ان کا تعلق رہا، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے بھی ان کا تعلق رہا۔ وہ کراچی سے شائع ہونے والے رسالہ "نیشنل" میں اپنے مضمون "عظیم تر ہندوستان کا تصور" (دی کنسیپٹ آف گریٹر انڈیا) پر مفصل بحث کا ذکر کرتے ہیں اسی نظریے کے مطابق قدیم زمانے میں ہندو تہذیب کا دامن بحر ہند کے اطراف میں پھیلا ہوا تھا (پنڈت نہرو نے ڈسکوری آف انڈیا میں یہی نظریہ پیش کیا تھا) اور بعد میں یہی نظریہ بھارت کی خارجہ پالیسی کی بنیاد بنا جو اُن کے مندرجہ بالا ابتدائی رجحانات سے مطابقت رکھنے کی غمازی کرتا ہے۔ قیام پاکستان کے موقع پر وہ پاکستان آ گئے اور اس موضوع پر لکھتے وقت وہ محب وطن پاکستانی نظر آتے ہیں۔ ہر چند کہ گرد راہ سے اُن کے مذہب کا اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ اسمعیلی امام حسن کا حوالہ دیتے ہیں، مہاتما بدھ کا ذکر کرتے ہیں، مگر اسلام کا ذکر بھولے سے نہیں کرتے، البتہ ثقافتی اور تہذیبی سطح پر وہ مسلمانوں کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ کبھی اسپین میں، کبھی فلسطین میں، کبھی یہاں کبھی وہاں۔ ہندی شاعری کا ذکر کرتے وقت وہ مسلمان شعرا کی عطا کا بھی ذکر کرتے ہیں جسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ کتاب کا نام "گرد راہ" بھی اندلسی عبدالرحمٰن ثالث کے وزیر با تدبیر المنصور سے متعلق ایک حکایت سے لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر رائے پوری اشتراکیت اور اشتراکیوں کے بارے میں جس طرح اظہار خیال کرتے ہیں اُسی کے نمونے "گرد راہ" میں جگہ جگہ ملتے ہیں مثلاً اشتراکیوں کے ہاں ایک عام استعمال ہونے والا لیبل "بورژوا" ہے جسے وہ فراخ دلی سے یہاں وہاں چپکا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں "تہذیبوں کو جاگیردار، بورژوا اور پرولتاری کے لنسوب نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ ان کا جوہر انقلاب زمانہ کے بعد بچ رہتا ہے وہ انسانیت کے سیاہ خانے کو اُجالتا ہے اور آگے کا راستہ سُجھاتا ہے" صہ ۱۳۹ اشتراکیت کو وہ آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کرتے۔ اُن کا کہنا ہے "میرا ذہن جمہوریت پر سرمایہ داری کے تسلط کو اس لیے مسترد کرتا ہے جس طرح اشتراکیت پر کسی قسم کی ڈکٹیٹر شپ کو" صہ ۱۱) روس میں جو آمریت قایم ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ کارل مارکس کی پیش گوئی کے برعکس اشتراکیت ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں قایم ہونے کے بجائے پس ماندہ زراعتی ممالک میں ظہور پذیر ہوئی۔ صنعتی ممالک میں ان لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے جو جسمانی یا ذہنی اعتبار سے محنت کش ہیں تو پھر وہاں ڈکٹیٹر شپ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" صہ ۱۱ آگے چل کر کارل مارکس پر تنقید میں اُن کا قلم کچھ اور تیز ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "لیکن وقت نے اس پیش گوئی کو غلط ثابت کر دیا کہ سرمایہ داری کی اندرونی کش مکش اور سمندر پار کی نوآبادیوں کی آزادی کے بعد مغربی یورپ کا پرانا معاشرہ لامحالہ منہدم ہو جائے گا اور اس کی جگہ انقلاب کا پرچم لہرائے گا۔ فلاحی ریاست کی تشکیل نے جمہوریت کو باقی رکھتے ہوئے اشتراکیت اور سرمایہ داری کا ایسا سنگم بنایا کہ عوام نے انقلاب سے منہ موڑ لیا۔ یہ حال اس مغربی یورپ کا ہے جسے کارل مارکس کے خیال میں انقلاب کا علم بردار ہونا چاہیے تھا" صہ ۱۹۱) ڈاکٹر صاحب کی انتہائی بصیرت رہی ہے کہ وہ اس میں شک نہیں کہ جنگ کے بعد مغرب میں طاقت کا محور یورپ سے ہٹ کر امریکہ منتقل ہو گیا اور اگر امریکہ کی پشت پناہی نہ ہوتی تو روس سے بڑھتے ہوئے انقلاب کا سیلاب مغربی یورپ کو بہا کر لے جاتا۔ صہ ۱۹۱

"گرد راہ" ڈاکٹر رائے پوری کو ایک محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ قیام فلسطین (جولائی ۱۹۴۷ء) کا ذکر کرتے ہوئے (وہاں سے روانگی کے وقت) لکھتے ہیں "میرا دل اپنے دور افتادہ ملک کے غم میں ڈوبا ہوا تھا جو ان دنوں خانہ جنگی کی آماج گاہ بنا ہوا تھا اور اس غم میں وہ رنج بھی سویا ہوا تھا جو غزہ کے سفر میں مجھے ودیعت ہوا" صہ ۲۳۶ شروع میں جب وہ پاکستان آئے تو وہ ایک پُرجوش محب وطن پاکستانی نظر آتے ہیں۔ کراچی میں بے سرو سامانی کے عالم میں ببول کے کانٹوں کو پنوں کی جگہ استعمال کر کے، دن رات کام کر کے وہ ایک نئے

ملک کی تعمیر میں مصروف رہتے ہیں۔ چند سال قبل کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا صدر منتخب ہونے والا شخص اس موقع پر لکھتا ہے " قیام پاکستان کے چند ماہ بعد سجاد ظہیر سے کراچی میں ملاقات ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب کیمونسٹ سیاست نے متحدہ محاذ کی پالیسی ترک کر کے وہ روش اختیار کی تھی جو زیڈ نوف لائن کہلائی۔ اس کے مطابق وہ اہلِ قلم اب ترقی پسند نہیں رہے جو اب سیاست سے بے تعلق ہوں۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ اس نوزائیدہ ملک کو استحکام کی ضرورت ہے اور یہاں قبائلی اور جاگیردارانہ نظام ایسا مضبوط ہے کہ پیش میں اور روشن خیال عناصر کا اتحاد ترقی پسندی کا ضامن ہو سکتا ہے۔" (ص ۱۸۶)

قیام پاکستان کے سلسلے میں بعض واقعات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا (ادب کے دائرے میں غالباً پہلی بار) مثلاً " یہ بھی تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو نے ہندو مسلم آئینی مصلحت کے جس امکان کو شدید صدمہ پہنچایا تھا وہ ان کے فرزند جواہر لال نہرو نے ہمیشہ کے لیے یوں ختم کر دیا کہ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں برطانوی کابینہ مشن کے مصالحتی فارمولے کو رد کر کے تقسیم کی راہ ہموار کر دی (ص ۶۲) ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان ناگزیر ہو گیا تھا تو اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب چند مستند نکات پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سدھیر گھوش کی کتاب " گاندھیز ایمیسری " سے یہ سطور پیش کرتے ہیں " کرپس نے نہرو سے کہا کہ لارڈ ویول سے تمھاری نہیں بنتی تو ہم اس کی جگہ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بناتے ہیں جو تمھارے کام کا آدمی ہے (ص ۱۷۱) پاکستان کا گورنر جنرل نہ بنائے جانے پر ماؤنٹ بیٹن نے جس تلخ ردِ عمل کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں " اس کا ردِ عمل کتنا شدید تھا۔ اس کا اظہار اس کی (ماؤنٹ بیٹن کی) ڈائری کے حوالے سے ہڈسن نے یوں درج کیا ہے۔" میں نے (ماؤنٹ بیٹن نے) مسٹر جناح سے کہا اس کی قیمت پاکستان کو ادا کرنا ہو گی۔" جذبۂ انتقام میں ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کو جو نقصانِ عظیم پہنچایا وہ سب کو معلوم ہے۔" (ص ۱۷۳) ایک جگہ مولانا آزاد کی ایک غلط بیانی کی تردید بھی کی ہے۔ لکھتے ہیں " مولانا کی کتاب 'انڈیا ونس فریڈم' میں جو کہا گیا ہے کہ ان کی وزارت کے مسلم عہدے دار دباؤ کے تحت پاکستان جانے پر مجبور ہوئے تھے یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ ہم میں سے کسی پر اربابِ اختیار نے کوئی " دباؤ " نہیں ڈالا۔ یا تو اپنی خوشی سے آئے یا اپنی جان بچانے کے لیے۔" (ص ۱۷۸)

یورپی اہلِ قلم کے ذکر میں ڈاکٹر صاحب نے سارت (سارتر) کے حوالے سے ایک دلچسپ قول نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سارت سے کہا کہ پرانے اور نئے فرانس میں یہ فرق ہے کہ " آج کی زندگی میں قدروں کا نشان تک نہیں ملتا۔" سارت نے ہنس کر جواب دیا " نئے انسان کی نظر میں کپڑے دھونے کی مشین قدروں سے زیادہ مفید ہے" سارت کے اس جواب پر ان لوگوں کو غور کرنا چاہیے جو اپنے ادب کو' اپنے فن کو' مغربی معیارات سے جانچتے ہیں۔ ہم جو ابھی تک دینی و اخلاقی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں ہم کیسے برداشت کر سکیں گے کہ ہم اپنے ضعیف والدین کو بیماری کے ہاتھوں سسک سسک کر مرنے دیں اور خود رنگین ٹیلی ویژن خرید کر مزے سے منظر بازی کرتے رہیں؟

'گرد راہ' کے گرد پوش پر پروفیسر مجنوں گورکھپوری، فیض احمد، صہبا لکھنوی صاحبان کی آرا ہیں۔ لیکن ان آرا کے بغیر بھی 'گرد راہ' اپنی ادبی چاشنی، زندگی کے بھرپور تجربات، گزشتہ نصف صدی کی ادبی شخصیات کے تذکرے کے سبب دلچسپی سے پڑھی جائے گی اور پڑھی جاتی رہے گی اور اردو کے سوانحی ادب میں اسے ایک بلند مرتبہ حاصل رہے گا۔ (پاک ڈائجسٹ۔ لاہور۔ مارچ۔ اپریل ۱۹۸۴ء)

کریم بخش خالد

"گرد راہ" — میری نظر میں

اردو ادب کے غائر مطالعے سے معلوم ہوگا کہ ہمارے ہاں سفرناموں اور آپ بیتیوں کی طرف کم توجہ دی گئی ہے اور جب کبھی ان موضوعات

[redacted]

کریم بخش خالد

پر کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو اسے اردو ادب کے لئے نیک فال تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ اس قسم کے ادب کے ذریعے ہمیں مختلف ممالک اور اقوام کے بارے میں اور خود مصنف کے متعلق ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو عام طور پر تحریر میں نہیں لائی جاتیں۔

آزادی کے بعد پاکستان میں جس ہمت اور خلوص سے محترمہ صہبا لکھنوی نے اردو زبان و ادب کی خدمت سرانجام دی ہے وہ تاریخ ادب اردو میں مثالی حیثیت کی حامل ہے۔ ماہنامہ افکار کی مسلسل اشاعت کے ساتھ بے سروسامانی کے عالم میں صہبا بھائی نے مکتبۂ افکار کی بھی داغ بیل ڈالی اور بہت اچھی اچھی کتابیں پیش کیں۔

"افکار" پاکستان کا منفرد علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ ہے جو گزشتہ ۴۰ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اس کی خاص اشاعتیں یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور لائبریریوں میں محفوظ کی جاتی ہیں۔ پاکستان کے علاوہ بیرونی ممالک مثلاً افریقہ، امریکہ، انگلستان، خلیج کی ریاستوں، سعودی عرب اور کینیڈا میں بھی افکار کا ذوق و شوق سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔

مکتبہ افکار کی تازہ کتاب "گردِ راہ" ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت سوانح عمری ہے جو گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ یہ باب علم و ادب، تہذیب و فکر، سیاست و تمدن، سیر و سیاحت، مشاہدہ و مطالعہ اور عصری آگہی کی ایسی جامع دستاویز ہے جس کی نظیر آپ بیتی ادب میں مشکل سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے مختلف حیثیتوں سے بھرپور زندگی بسر کی اور اپنے مشاہدات کو نہایت شستہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر رائے پوری ہمارے ان مشاہیر ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جنھوں نے اپنے فکروفن سے اردو ادب میں نئی روایات کی بنا ڈالی اور ان کو مستحکم بھی کیا۔ انھیں تحریک ترقی پسند ادب کے بانیوں میں اولیت حاصل ہے۔ اب تک ان کی دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں تنقید، افسانے اور تراجم ---- شامل ہیں۔ "گردِ راہ" میں قاری کو بہت سے سیاسی اور ادبی انکشافات سے دوچار ہونا پڑے گا جن کے بارے میں تفصیلی وضاحتیں شاید ضخامت کے خوف کی وجہ سے چھوڑ دی گئی ہیں۔ مثلاً آزادی کے بعد پاکستان میں تعلیم کے فروغ کو کیا اہمیت دی گئی اور ان اہم مسائل سے کس طرح غفلت برتی گئی اور تحریکِ آزادی کے دوران کس طرح جانے پہچانے لوگ مجاہدینِ آزادی کے ساتھ رہتے ہوئے ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب تو ہوئے لیکن ساتھ ساتھ حکومت کے لیے مخبری بھی کرتے رہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر رائے پوری نے اپنے ہم عصروں کے بارے میں بھی بہت سے حالات حقیقت پسندانہ طور پر بیان کیے ہیں اور اردو ادب کی تاریخ میں بہت سی اولیات کا انکشاف کیا ہے۔

"گردِ راہ" صوری و معنوی اعتبار سے ایک بیش بہا ادبی دستاویز ہے جس کی پذیرائی کرنا ہر ادب دوست فرد اور ادارے کا فرضِ منصبی ہے۔ کتاب نہایت خوب صورت انداز میں شائع کی گئی ہے اور مکتبہ افکار رابسن روڈ کراچی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

(ماہنامہ "اظہار" کراچی ۔ مئی۔ جون ۔ ۱۹۸۴ء)

سحر انصاری

گردِ راہ۔ ایک جائزہ

جدید ادب میں آپ بیتی اور خودنوشت حالات سے دلچسپی کا رجحان برابر ترقی کر رہا ہے۔ قارئین اُن اہلِ علم کے حالات، تاثرات و مشاہدات سے آگاہی حاصل کرنے کے متمنی رہتے ہیں جنھوں نے کسی خاص شعبے میں نام پیدا کیا ہو۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کم و بیش نصف صدی سے ہماری ادبی اور تہذیبی شخصیت کی حیثیت سے معروف ہیں۔ "ادب اور انقلاب" کے مصنف اور "شکنتلا"، "پیاری زمین" اور "گورکی کی آپ بیتی"

کے مترجم کی حیثیت سے وہ تاریخ ادب میں اپنا ایک اہم مقام بنا چکے ہیں ۔ ایک دانش ور، معلم ادیب اور مفکر کی ساری خوبیاں ان کی ذات میں سمٹ آئی ہیں ۔ انھیں مشرق و مغرب کی اکابر شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے اور مشرق و مغرب کی دیار و امصار میں رہنے کا موقع ملا ہے ۔ ان کی قوت مشاہدہ و استنباط بہت موثر ہے وہ متوازن انداز میں بڑی سے بڑی اور گہری سے گہری بات کو ادیبانہ سطح پر پیش کرنے میں کمال رکھتے ہیں ۔

"گردراہ" اختر حسین رائے پوری کی خود نوشت ہے جس میں مطالعہ اور مشاہدے کی روشنی قدم قدم پر نظر آتی ہے ۔ اختر حسین رائے پوری کو ایسا زمانہ میسر آیا جس میں ایک طرف تو دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد کے یورپ خصوصاً فرانس کو دیکھنے کا موقع ملا ۔ دوسرے اسی زمانے میں برصغیر میں آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی ۔ نئے نئے نظریوں کے آغاز کا زمانہ تھا ۔ اختر حسین رائے پوری نے ایک عالمی شہری کی طرح ان تمام تغیرات و انقلابات کا جائزہ لیا اور اپنے ایک خاص اسلوب میں بڑی خوب صورتی سے سپرد قلم کر دیا ہے ۔ "گردراہ" کی صرف سات قسطیں دراصل مدیر "افکار" صہبا لکھنوی نے اپنے پرچے میں سلسلے وار شائع کی تھیں اور اب نئی اقساط کے اضافے کے ساتھ اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے ۔ اس سلسلے کو بہت پسند کیا گیا تھا اور اہل ادب کو انتظار تھا کہ کب یہ کتاب شائع ہو کر ان تک پہنچتی ہے ۔ "گردراہ" کا اسلوب بطور خاص بہت انوکھا ہے ۔ اختر حسین رائے پوری کی نثر پر جدید فرانسیسی نثر نگاروں کے اسلوب کا اثر نمایاں ہے ۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اچھی نثر میں لفظ کا کام معنی کو چھپانا نہیں بلکہ اجاگر کرنا ہے ۔ اختر حسین رائے پوری کی نثر اس معیار پر پوری اترتی ہے ۔ "گردراہ" میں بیسویں صدی کا جدید ذہن اپنے حقیقی تناظر میں ابھرتا دکھائی دیتا ہے ۔ اس کے فلیپ پر مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے کہ "آپ بیتی کے پیرائے میں دراصل یہ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں کی ادبی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تاریخ کی زندہ دستاویز ہے اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام ہی اس کے مستند و معتبر ہونے کی سب سے بڑی ضمانت ہے ۔" فیض احمد فیض لکھتے ہیں کہ "گردراہ" کے صفحات ہماعصری دور کا منظر نامہ پڑھنے والوں کے لیے یقیناً دلکش اور بصیرت افروز ثابت ہوگا ۔ گردراہ کا سرورق مشہور آرٹسٹ موجد نے بنایا ہے ۔ کتاب خوب صورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور اس میں اختر حسین رائے پوری کی زندگی کے تقریباً تمام ادوار کی نمائندگی کرنے والی تصاویر کا ایک انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے ۔ یقین ہے کہ "گردراہ" کو اچھے ادب کے شیدائی بہت پسند کریں گے ۔

(ماہنامہ "افکار" ۔ کراچی ۔ اپریل ۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر انور سدید

گردراہ پر ایک نظر

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ادب کی خدمت میں گزرا ہے ۔ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کی زندگی کے واقعات میں رنگ آمیزی غیر ضروری تھی اور ایک نقاد کی حیثیت میں وہ تصرف بے جا سے نفرت کرتے تھے ۔ "گردراہ" کہنے کو تو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی سوانح عمری ہے ۔ لیکن درحقیقت یہ برصغیر کی سماجی، سیاسی، فکری اور ادبی زندگی کا ایک خیال انگیز مرقع ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے گزشتہ نصف صدی کے واقعات کو اس خوبی اور خوب صورتی سے سمیٹا ہے کہ ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے واقعات ایک لو مرتب فلم کی طرح متحرک ہوجاتے ہیں اور اس دور کی تزئین نو ہو جاتی ہے اور بعض مقامات پر تو ڈاکٹر رائے پوری کی عملی جد و جہد پر بے اختیار زبان سے صدائے تحسین بھی نکل جاتی ہے یہ کتاب ترقی پسند تحریک کے ایک بانی رکن کی روداد حیات بھی ہے اور اس لحاظ سے اس مؤثر اور فعال تحریک کی ابتدائی تاریخ کا مستند

(باقی ص ۳۱۹ پر)



ایک عورت کی جلد کس حد تک تکلیف برداشت کر سکتی ہے؟
WAX
تھریڈنگ تکلیف دہ ہے اور بال نوچنے سے جلد کو نقصان بھی پہنچتا ہے۔
ویکسنگ کا نتیجہ درد اور تکلیف۔ بالوں کو کھینچ کر نکالنے سے جلد ڈھیل پڑ جاتی ہے۔
شیونگ غیر نسوانی طریقہ ہے۔ جلد کو بدنما کرتا ہے۔ بالوں کی نمو میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔
غیر ضروری بالوں کو صاف کرنے کا نسوانی انداز - این فرینچ
خواتین کی نازک جلد کو نرم برتاؤ کی ضرورت ہوتی ہے اور این فرینچ نرمی کے ساتھ جلد کو صاف و ملائم کر دیتی ہے۔
پُراثر این فرینچ جلد کی تہہ تک پہنچ کر بالوں کو نفاست سے صاف کرتی ہے۔
این فرینچ کا استعمال نہایت آسان۔ کریم لگا کر کچھ دیر انتظار کیجیے اور پھر صاف کر دیجیے۔
این فرینچ لیجیے۔ پھر دیکھا اچھائی ہمیشہ ابل اٹھتی ہے خصوصاً آپ کی جلد پر۔
FACIAL QUALITY
Anne French
lotion
Anne French cream hair remover
CREAMS AWAY HAIR FROM FACE, LEGS, ARMS AND UNDERARMS
25 gms.
تین خوشبوؤں میں دستیاب۔
گلاب۔ لیمن۔ ہربل

DAWN

FRIDAY, MARCH 9, 1984

Dr. Raipuri: a world-view of life

By "Zeno"

Dr Akhtar Husain Raipuri made an impact on Urdu progressive literature at a time when the word progressive was not as yet associated with any kind of literary movement in South Asia.

Very few of the younger generation of Urdu critics seem to be aware of either his position as a precursor of progressivism or of the importance of the turbulent period of the twenties and early thirties as the seed time of the movement which was later to transform our literature from medievalism to modernism.

Progressive literary trends had come into existence already in that period side by side with the psychological moulding of our people because of the expansion of the revolutionary working class movement.

It is often forgotten that the era of revolutionary thinking and feeling had started soon after the discrediting and exposure of Gandhism at the beginning of the twenties. The withdrawal of civil disobedience movement by Gandhi in 1922, and the dissolution of Khilafat movement because of the abolition of the Caliphate by the Turks in 1924, left the masses of people in India in a political vacuum which was soon filled by a spontaneous upsurge of revolutionary feeling, thinking and action.

Trade unions

For almost a decade, while the bourgeois nationalist leaders were trying to come to terms with the British rulers, the youth everywhere merged their anti Imperialist feelings with socialist and rvolutionary thought.

The twenties were caracterised by organisatios like Peasants and Workers Parties, revolutionary trade unions, and terrorist movements like Naujawan Bharat Saba of Chandar Shekhar Azad and Bhagat Singh.

Two of the most significant political events of this decade were the trials of the Communist leaders, Dange and others (the famous Meerut Conspiracy Case) and of the terrorists Bhagat Singh, Sukhdev, and others.

Most of the young writers and journalists in this period were inspired by socialist ideas. We come across some very strange and even bizarre images thrown up by the memory of those who were young in those stormy times.

Who could, for instance, imagine the portly and sedate figure of Maulana Chiragh Hasan Hasrat leading a procession in Calcutta, and chanting the song

"Woh samney hai hurriyet ka rasta
Barhey chalo, Barhey chalo."

And yet that is the way it was in 1928 or thereabout, as recounted by Dr Akhtar Husain Raipuri in the book of his memoirs *Gard-i-Rah* (published by Maktaba-i-Afkar, Robson Road, Karachi).

This is a most enchanting book by one of the oldest of progressive writers and one which throws a flood of light on the psychological atmosphere in which the progressive literary temperament was taking shape in the twenties and early thirties.

The most important service which this book may render to the task of clarification of our literary history is to dispel the erroneous impression that the progressive literary movement was suddenly born in 1936, fully formed like Minerva emerging out of the head of Zeus.

It may also make us realise that there had to be progressive writers before there could be a progressive writers' movement. This would also resolve for us the troublesome paradox of whether there can be progressive writers outside the organisation of Progressive Writers Association.

Sajjad Zaheer in his *Roshani* (which is so far the only authentic history of the Progressive Writers Association, though not of the progressive writers movement in general), has in a way resolved the issue when he says about Akhtar Husain Raipuri's article *Adab aur Zindagi*

"In my opinion this was the first essay in our language in which the necessity of creating the new progressive literature was discussed elaborately and with sound arguments, and in which the reactionary values of the old literature

were explained and condemned As the author of this important article Akhtar Husain Raipuri has the precedent position among the founders of progressive writers movement in Urdu"

This article was published in 1935 in the magazine *Urdu* which was the organ of Anjuman Taraqqi-i-Urdu, and impelled its editor, Maulvi Abdul Haq, to invite Mr Raipuri to join the staff of the Anjuman, which he did A couple of years later he left for Paris for his doctorate

But before he left for Europe he had already made a name for himself as a creative writer of a definite leftist bias both in Urdu and Hindi Actually he began his career as writer and journalist in Hindi magazines and newspapers Even his first job, as a journalist was with the Hindi daily *Vishwa Mitra* of Calcutta

Born in 1912, Raipuri left his hometown, after his matriculation in 1928, for higher studies at Calcutta, where his brother, Muzaffar Husain Shamim worked in newspaper *Asr-i-Jadid* Here he came into contact with some of the most brilliant writers and intellectuals of the time, and found himself in the midst of the hectic political and literary life of one of the storm centres of revolutionary activity in India He got acquainted with such celebrities as Chiragh Hasan Hasrat (a colleague of his brother) Agha Hashar, Maulana Wahshat, Nawab Nasir Husain Khayal Maulana Azad Qazi Nazrul Islam Ramanand Chatterjee (of *Modern Review*) and so many others who then ruled over the sentiments of the people

From Calcutta he went to Aligarh for his B A where he came across a number of like minded young writers like Hayatullah Ansari Sibte Hasan and Majaz He was influenced by great teachers like Professor Habib and Rashid Ahmed Siddiqui

In the meantime, he continued to contribute articles and stories to Hindi magazines and newspapers paying his way through college from his own earnings as at Calcutta At the same time he sought out such celebrated writers and political leaders as Prem Chand, Iqbal and Jawahar Lal Nehru

After his stint with Maulvi Abdul Haq's organisation at Aurangabad, he left for Europe His early study of Hindi and Sanskrit made him choose Sanskrit literature as his subject for doctorate His thesis was entitled "Life of Ancient India in the mirror of Sanskrit literature"

His supervisor in this work at Sarbonne was the famous Indologist Professor Louis Renard, and he was also guided by the great sociologist Marc Bloch In his memories of Paris he talks fondly of such friends as Dr Abdullah Chughtai, Nawabzada Imtiaz Ali Khan, and Brijesh Singh (who later married Stalin's daughter Suetlana)

In more detail he has discussed his meetings with Khalida Adib Khanum, Pablo Neruda and Pablo Picasso He has also fondly remembered his meetings in London with Sheikh Abdul Qadir

After his return from Europe Dr Raipuri worked with All India Radio for a while where he was the colleague of Rashed and Manto He later went to Amritsar as Vice Principal of MAO College In 1945 he became employed in the education service of the Central Government at Simla

This was an eventful period — of the Cabinet Mission Plan and the Simla Conference During this period he came into close contact with Maulana Abul Kalam Azad, whom he already knew from Calcutta In 1947 he opted for Pakistan

Pakistan idea

Of Pakistan he had first heard from Khalida Adib Khanum in Paris, who told him about Chaudhri Rahmat Ali's ideas It was she who convinced him that the national problem in India was a much more urgent issue than the social one

In his memories of his days in Simla, Dr Raipuri has discussed in detail why Pakistan had become inevitable and how it was formed in the way it was

In the course of his impressions of the early years in Pakistan he has given his views of the malaise which has caused our ruin since then Though he has talked about it briefly, his formulations of our major trouble is not without an element of truth

"To begin with there was great peace and amity in the city and the people of Sind welcomed the Muhajirs with eagerness Things were spoilt when people came dashing in, not to save their lives, but to make their fortunes That is when the tussle of self interest between the local people and the emigres began

"If the constitution had been made in the times of Liaqat Ali Khan the problem of evacuee property had been settled, and the principle of provincial quotas in Government services had been eliminated, then the country would have been saved from the terrible flood of misfortunes which overtook it in time

"India had crossed all three of these hurdles in the very early period without much difficulty If Pakistan failed in this test then it was mainly due to the fact that the vested interests came into the control of the country at a very early stage

"The evacuee property entered the social system like a deadly poison There was such a free play of lust and greed that the faces of the people became distorted The upstarts, tricksters and pick pockets ruled the roost Many times I wandered about in distraction through the streets of this strange city and came across stiff necks, beard like lassoes of deceit and Begums in the guise of wanton Bahatiyaris, passing along

"This delusion was dispelled by Agha Ashraf when he said, 'When you realise that in 1947 every one got an entirely new birth, then you will understand' "

He served in the education department for another six years, and despite offers from foreign universities and even in the United Nations where Prof A S Bokhari arranged for a job for him, he would not abandon his country

But then, as he says, he realised that 'My countrymen leapt with such avidity towards the Khilafat-i-

Rashida that they went two steps beyond it, so that Abu Jahl attained supremacy."

Disgusting

This disgusting phenomenon was too much for Dr Raipuri. He joined Unesco and went to Paris — his "second spiritual home". For seventeen years he went on Unesco's assignments from country to country and became a homeless wanderer. He has much to write about Somalia, Iran, Palestine, Spain, Italy, U.S., Japan — where he lived for short or long periods.

Gard-i-Rah is not really an autography of Akhtar Raipuri. It has more to say about people he has met and cities in which he has lived, than about his personal life. Even so it brings before our eyes the panorama of a world in rapid transformation. The feeling it gives of a changing world — first in the Subcontinent and later in the rest of the world — is the most endearing quality of these memoirs.

DAWN, FRIDAY, MARCH 16, 1984

LITERARY ROUND-UP

Dr. Raipuri holds mirror to his times

By Ariel

The paucity of biographical material in Urdu literature is partly due to the hypocritical values of our society which don't let courageous men and women narrate their experiences with required abandon and nonchalance. The fear of displeasure of the concerned persons and persuasions weighs so heavily with the biographers that much is lost by way of design than by default in the process.

Dr Akhtar Husain Raipuri's biography *Gard-i-Rah* launched recently at a Hamdard function in Karachi is not an attempt reminiscent of Bertrand Russel's or Sartre's by any stretch of imagination but it is a uniqe effort in the sense that Dr Raipuri has confided a lot more in his readers than hitherto resorted to by most biographers in our language.

Courage

It is an undeniable fact that our writers have to weigh their words while describing their personal experiences with the opposite sex. The narratives are usually flattened out partially or completely. The utmost courage one can exhibit is in the domain of belief and this too is predisposed to reconciliation — ending up the conformist's way.

Dr Akhtar Husain Raipuri's reminiscences — since he doesn't like to call this book either an autobiography or a journal — sets out to describe his early days in Raipur, the city of his birth.

Dr Raipuri's grip over the content is so complete that he has succeeded in evolving a style which reflects this essential blend between form and content. He is very much himself and has successfully curbed sentimentality.

His prose is the best specimen of prevision, poise and integrality. He has shared with us many a development in his formative years with much ease and — without the slightest batting of the eye — as to vindicate his trust in himself and the class of readers he seems to be addressing to.

I am confident that Dr Akhtar Husain hasn't hidden much from us. He has left a great deal of hints to fill up the blanks in his narrative. What emerges in the end is a life lived fully — but not without scruples.

There is hardly any other Urdu writer whose experiences with Truth have been so manifold as Raipuri's. He has enjoyed a rare opportunity to pursue his interests in a non-stop manner.

Granted that he didn't serve any term of imprisonment or undergo any stint of 'exile' but his professional duties in the continents of Europe, Asia and Africa have provided him rare opportunities to see some countries struggling quite hard to preserve their cultural identity in the face of cataclysmic changes.

Dr Raipuri has recorded these changes in the first person singular and emerges fully convinced in the end that the writ of Change couldn't be challenged. The societies which are averse to change are left behind. He thinks that the scars of wilful underdevelopment are far more nauseating than the scars of colonial era.

Accomplishments

Dr Raipuri's reminiscences are an interesting journey a scholar who has done his best to enrich his language and literature He is a pioneer in modern Urdu short story as well as in modern criticism. His achievements as a linguist, translator and educationist are on top of his creative accomplishments

Dr Akhtar Husain's biography doesn't set out to narrate his life-story. It seeks to describe the whole atmosphere in which he breathed It discusses all the important characters of Indian politics and literature from the third decade of this century onward

One comes across Nawab Nasser Husain Khayal, Pandit Sunderlal, Pandit Chaterwedi, Munshi Premchand, Allama Iqbal, Sirojini Naidu, Jawaharlal Nehru, Maulana Abul Kalam Azad, Jigar Moradabadi, Sir Shaikh Abdul Qadir, Dr Zakir Husain, Hayat-ullah Ansari, Saghar Nizami, Agha Hossain, Dr Syed Mehmoud, Chiragh Hasan Hasrat, Khaleda Adeeb Khanum, Manto, Moulvi Abdul Haq, Josh Malihabadi, Sibte Hasan, Majaz, Rashid Ahmed Siddiqui, Maulana Najib Ashraf Nadvi, Faiz Ahmed Faiz, Rashid, Shahid Ahmed Dehalvi, Tagore and Qazi Nazrul Islam and others.

Reactions

The book unfolds the writer's personal reactions to the political events — the Khilafat Movement, the formation of the Communist Party, the famous Meerut Trial, the Simon Commission, the 1935 Constitution, the Non-Cooperation Movement, the Urdu-Hindi tangle and the heyday of the independence struggle leading to the creation of Pakistan.

Eversince the writer joined the British Government service in the Ministry of Education 1945 to his option for Pakistan and secondment to the UNESCO he touches on the personalities occupying high places in the realm of education, knowledge and arts and we know from his pen reminiscences of the Sorbonne (Paris University) days when exiles from Russia were thronging the Paris restaurants and salons.

He also talks about Pablo Neruda, the great Chilean poet and Pablo Picasso The other Urdu writer to be on friendly terms with Neruda is Faiz Ahmed Faiz. What comes out in the end is a life lived to the full. It is a pity that circumstances have prevailed upon the learned scholar to share only that part of the life which is sharable

I believe on good authority that he could come out with some sensational disclosures which would continue to excite the memories of those few friends who have enjoyed his confidence It is seldom that Dr Sahib speaks about himself but whenever he does it is a treat to listen to him

I deem it a great privilege for me to have, at times, his 'bits of unexpurgated reminiscences' and one could only wish that they were not so private as they now appear to be. Perhaps there is no hope of ever getting them in print The irretrievable part of the reminiscences should go down as grand invisible monument to the limits of sanctioned 'propriety'

Born in Raipur (M P) on 12 June 1912 of a Patna family his ancestor, General Mir Madan, laid down his life in the battle of Plassey in 1757 His grandfather was a hero of the war of independence in 1857 His father was an Aligarian as well as graduate form Thomson Engineering College His mother was a well educated lady having mastery over Urdu, Arabic, Persian, English and Hindi

Hindi

It is no wonder that Akhtar Husain Raipuri's first short story *Projit (Shakist Khurda)* appeared in a Hindi monthly of Lucknow, *Madhuri* He served as a journalist in a Hindi paper in Calcutta and the main influences on his early career came from Pandit Sunder Lal and Pandit Banarsi Das Chaterwedi, editor of *Vishal Bharat*

From Calcutta he went to Aligarh and joined that group of young intellectuals who wanted to radicalise the atmosphere of Aligarh University It is surprising that these Young Turks were not taken to task for their radicalism

He left Aligarh in 1938 to do his Ph D in Sorbonne His topic was 'Ancient India — in the Light of Sanskrit Literature' Most probably he is the only subcontinental to take up this subject

From 1942 to 1945 he taught at MAO College, Amritsar, and also edited Pandit Sunderlal's *Vishwa Bharti* — an Allahabad publication, during Pandit's jail term He is the first Muslim to get this honour He joined the British Indian Government as Joint Educational Adviser in 1945 He found himself on the other side of the border in 1947

He had also served the Anjuman Taraqqui-Urdu Hind as an associate of late Maulvi Abdul Haq (1935-37) He worked on the Hindi translation of Urdu English dictionary. In Pakistan he served the Ministry of Education and then he was seconded to UNESCO to serve at its headquarters in Paris as well as in Somalia and Iran

He retired from UNESCO in 1972 and it is after a long time that he thought it worth while to commit his memory to writing He contributed his reminiscences in monthly *Afkar* They were liked so much that he was persuaded to extend them to the book form

Akhtar Husain Raipuri is a pioneer in the real sense Be it short story, criticism, translation, lexicography, art criticims and education he has blazed new trails and achieved solid glories

His article *Adab Aur Inquilab* had taken the country by storm Sajjad Zahir acknowledged his pioneering contribution to the Progressive Movement in *Roshnai* So have Majnoon Gorakhpuri and Faiz Ahmed Faiz on the flap of the book It was the time when, despite the modern means of communications, good works were duly praised and honoured.

Short stories

His first book was a collection of short stories *Muhabbat aur Nafrat* in 1938 His second collection of

stories was *Zindagi Ka Mela* (1956). His first book of criticism *Adab Aur Inquilab* was published in 1944 and the second one *Roshan Minar* in 1956.

Among his translation is *Shakuntala* (1939), *Payam-i-Shabab* (translations from Qazi Nazrul Islam (1940), Gorky's autobiography in three volumes and Pearl S Buck's *The Good Earth* under the title of *Piyari Zameen* In 1935 he compiled a book *Habsha-o-Atalya* which contained articles against Mussolini's fascism. He also edited Garcon d'Tassy Lectures with Prof. Aziz Ahmed besides working on *Quarterly Urdu* and the English-Hindi Dictionary. His last stint was with the Urdu Development Board's Dictionary.

Gard-i-Rah, as the speakers at the launching ceremony — among them Dr Jamil Jalibi, Mumtaz Husain and Aziz Hamid Madani — maintained, is a work of great importance for its writer as well as Urdu literature. It is high time all those scholars who have passed tumultous years of their lives under colonial rule and the post-Independence ruling elites put their memories on paper, however sketchily, however hurriedly.

It is only in the absence of adequate biographical material that persons of doubtful origins and careers pounce upon the vacant territory of contemporary history in order to provide us with distortions in the absence of facts. The facts should speak for themselves and preferably from those who have played their role — however humbly

MORNING NEWS

FRIDAY, MARCH 23, 1984.

Dr. Raipuri's 'Gard-i-Raah'-a monumental book

To write an autobiography or to pen down memoires is a difficult job indeed, if not impossible One has to be very honest, sincere and precise. Often it has been observed that the autobiographies are full of self-praise or self-aggrandisement. In most of the autobiographies that have been written in Urdu, the writers have invariably tried to make them more personal and subjective

The autobiography or the memoir of Dr Akhtar Husain Raipuri is quite distinct from other autobiographies written in Urdu so far The canvas of this book is quite wide It is spread over the events of half a century. The recollections capture the extremely viletile moments of eventfull happenings.

When I started going through the pages of "Gard-i-Raah", it appeared to me as if events are passing before the eyes like the pictures frames of a highly sensitive and realistic movie projecting events of not too distant a period—a period of political upheaval, social revolution and literary changes

One of the characteristics of the book is that the readers get involved and lost in it. Dr. Raipuri's observations are so lucidly recorded that one feels deeply engrossed in it and finds himself walking along with the author on the pavement of social, political and literary avenues, deriving pain and pleasure at the same time

The period from 1930 to 1977 is pregnant with political turmoil, disarray and confusion throughout the world. On the political horizon of the subcontinent in particular, the period from 1930 to 1947 is a conglemoration of such events that brought about myraid changes in the thinking pattern of the people Sometimes we find the author as a political observer analysing the ramifications and complexities of world politics and sometimes he appears as a conscious and intrepid thinker examining the trends in world literature

Dr. Raipuri's quick shuttling from one place to another in Asia Africa and Europe leaves an imprint of his boisterous and vehement character in the minds of the readers He does not waste a single moment of his eventful life, he makes use of every second and minute of his activities. He starts his career as a journalist in a Hindi newspaper in Calcutta at a time when political horizon was poignantly heading towards communal disturbances. It was here that he came across with two great poets of the age—Tagore and Qazi Nazrul Islam The study of their poem broadened his vision and revolutionised his ideas. It was also here indeed that galvanised his mental creativities

Perhaps, it was 1935 or 1936 that I first had the opportunity of going through his translations of Qazi Nazrul Islam's poems in Allama Niaz Fatehpuri's "Nigar" and then in Moulvi Abdul Haq's "Urdu". The publication of these translations made a deep impact in Urdu literature Never before Qazi Saheb was known to the Urdu readers The author has described his meetings with these two great poets of Bengal in detail About his meeting with Qazi Saheb he writes "I came to know from a college friend of mine that Qazi Saheb often visits his house . When I saw Qazi

Nasrul Islam I found his personality very attractive and then I though to translate his poetry in Urdu. The translations of his selected poems started to translations of his selected poems started appearing in 'Nigar', 'Saqi' and 'Urdu'. The way these translations directly influenced Urdu poetry is so very obvious"

About Tagore, he writes, "For the first time I saw Tagore in Calcutta in the middle of 1934 Whenever he came to Calcutta from Shantiniketan, he stayed at his ancestral Tagore Palace in Shayambazar . One day when I visited Tagore Palace, I was told that he was busy with his friends and admirers Despite his old age, his personality appeared to me as a god of art "

IN ALIGARH

In Arigarh, he could not sit idle He brought out "Payam" a weekly magazine. In the editorial board he included Hayat ullah Ansari, Sibte Hasan and Iltefaat Malihabadi besides himself, It, however, could not survive for long. But it greatly helped awakening the whole atmosphere of Aligarh

Here he meets Majaz. He admires his poetry and speaks of his poetic life in detail He mentions the name of Prof Mohammad Habib, Prof Rashid Ahmad Siddiqi, Dr Zakir Hussain with respect and admiration. It is here that he met Jigar Muradabadi About his poetry he says "As the classical period of Urdu Ghazal ended with Dagh Dehlavi, likewise the renaissance period of Ghazal of this century ended with Jigar "

While mentioning the visit of Pundit Jawaharlal Nehru in Aligarh, Dr Raipuri has given his view on communism and progressivism in a very subtle and pragmatic way. He writes: "This period of modern history was important in a sense that the dictatorship of Hitler in Germany and Stalin in Russia was established One in the name of racial domination and the other in the name of communism, unleashing a kind of atrocity which had no parallel in history The champions of progressivism at that time overlooked the atrocities of Stalin when they were trying to uproot the reactionary movement of Fascism but the way this self-delusion damaged the ideology of communism is very difficult to weigh ' Sartre has rightly said that one should not forget the difference of philosophy and police."

MEETING WITH ALLAMA

Dr Raipuri describes his meeting with Allama Iqbal in these words- "An old associate of Ataturk, Raoof Bay visited India on the invitation of Jamia Millia. I went to Delhi to listen to his speech accompanied by Ashraf and stayed in Koocha Pundit with Ahmad Ali The meeting was presided over by Allama Iqbal He delivered an extempore speech in English and I got convinced with his insight and intelligence When I entered in a room he was lying on a cot. I sat in the corner after saluting him. Since he was alone, he turned towards me When he heard that I am staying in Delhi to pay a visit to the rebel farmers of Mewat, he smiled and said "It seems you pay little attention to education. If not now do you find time for such activities."

I replied "I am in that stage of inquiry and curiosity when formal education appears to me as time consuming I am a seeker of reality and as such I consider it the result of education."

IN HYDERABAD-DECCAN

In this chapter, Dr Raipuri has mentioned his meetings with great personalities like Sarojni Naidu, Moulvi Abdul Haq and Gandhiji He has compared the mansion of Sarojni Naidu in Hyderabad with "Salon" of Paris. She was not only the political leader of the first rank, she was also a great poetess Dr. Raipuri developed his friendship with Dr Jaisuria who was the eldest son of Sarojni Naidu He says "that his friendship enlightened my soul Till then, I was not aware of the sweetness of music He and his wife Eva explained to me the secret of western music and thus I got opportunities to derive pleasure from it during my stay in Europe "

About Moulvi Saheb's devotion to Urdu he writes in detail He has also disclosed some aspects of his personality which are very interesting and revealing at the same time His encounter with Gandhiji is worth reading Dr Raipuri has also given a graphic picture of the meeting of Sahitya Parishad which was held in Nagpur where Gandhiji was exposed It was here that Gandhiji started the controversy of Urdu and Hindi which later developed into a language dispute

IN EUROPE

In Paris Dr Raipuri met Khalda Ad'b Khanum Mrs Sarojni Naidu had given an introductory letter to him to deliver it to Khalida About her Dr Raipuri writes 'A few years back, she had visited India at the invitation of Jamia Millia. On her return to Turkey, she wrote a travelogue under the title "Inside India which was later translated in Urdu. Khalida Khanum and her husband Adnan Bay were among the first associates of Ataturk but because of some political differences they migrated from Turkey and settled in Paris. Adnan Bay started teaching Turkish language and Khalda Khanum got busy writing books in English She was a recognised writer of both English and Turkish languages Some of her books were translated in European languages "

Dr Raipuri has written in detail about the civil war in Spain. When he met Picaso, he was busy in arranging the exhibition of his masterpiece "Goernica" This city was completely devastated by the Nazi bombers In the background of this devastated city, Picaso has ridiculed the withering humanity He also met Pablo Niroda, the celebrated poet of Chili

RETURN TO INDIA

When Dr Raipuri returned to

By YUNUS AHMAR

India from Europe in 1940, the whole subcontinent was greatly affected by the Second World War During his stay at Delhi he met some of the Urdu poets and writers N M Rashid, Saadat Hasan Manto, Prof. Ahmad Shah Bukhari etc. Under the subtitle of "Stay in Amritsar" he writes: "In June 1942, I fell ill seriously and when I regained my health, I started feeling a basic change in myself France which had become my mental homeland, had been ruined. Russia was engaged in the struggle of life and death and India, my native land was standing at the crossroad of history"

For sometime he remained Vice-Principal in MAO College of Amritsar. In July, 1946, he accepted the post of Assistant Education Adviser and thus started a new life in Simla. Here he observed closely the political struggle between the Congress and Muslim League He has written in details how the subcontinent was divided and how Pakistan came into being.

Dr. Raipuri also stayed in Africa for two years and in Iran for four years During his stay both in Africa and Iran, he experienced a lot. He never wasted a single moment. His attachment with UNESCO provided him ample opportunity to travel from one continent to another His stay in Palestine is full of terror and horror Of all the countries that he visited, he liked Japan the most.

In the chapter under the title, "Past and present of literature" Dr Raipuri has discussed in depth about poetry and fiction in the world of literature And in this very chapter, he has also expressed his critical views on Urdu literature. In the two chapters titled, "In search of beauty" and "In search of reality", Dr Raipuri's intellectual sublimity and his indepth study of beauty are enough to stir the feelings and emotions of the readers. He has admitted that the writings of Bertrand Russell have left an impact in his mind. In particular, he has quoted the following lines from the Autobiography of Bertrand Russell: "Three passions have governed my life the longing for love, the search for knowledge, and unbearable pity for the suffering of mankind."

And the most pathetic line in the last page of the book that I came accross is "And when this book will be published, I would not be able to read it" This is so because he has lost the vision of his eyes. What a tragedy "Gard-i-Raah" is both an autobiography and a memoir Prof Majnoon Gorakhpuri has rightly said about the book "This is a living document of literary cultural, political and social history of past fifty [illegible]"

THE STAR

Thursday, March 29, 1984.

Glimpses from contemporary history

by Anwar Enayetullah

Both the books under review project contemporary history. The first one is an autobiography written by an eminent scholar who offers picturesque glimpses into it as seen by a sensitive intellectual. The second describes the role played by over fifty *Shias* most of them politicians in creating history.

Unlike the situation in the West, autobiography is a genre of literature which had not been popular in Urdu. But like the sporadic outburst of travelogues' and reportages this situation has changed significantly during recent years. This has been mainly due to the efforts of some like Sahba Luckhnawi, the Editor of *Afkar* monthly. He has been instrumental in motivating many scholars, poets and authors, including me to write their autobiographies which have neen serialized in *Afkar*

In the West, autobiographies have appeared in most cultures during past centuries. So also diaries and memoirs. These literay forms, though closely related to autobiography, differ in approach.

They are all, no doubt various forms of self-revelation. But while a diary records day to day events in one's life, memoirs concentrate more on events outside the author's life. On the other hand, a good autobiography not only records significant events in one's life, it also analyses them through introspection and self-dissection. Through this intricate process readers often get an illuminating picture of the author and the times during which he flourished.

Beginning with Xenophon's *Anabasis* written around 400 B.C. and Caesar's *Commentaries* to some of the best autobiographies written in the 19th century by Goethe, Rousseau, Wordsworth and Thoreau, this genre has often reflected social, political and cultural currents and cross currents as they influenced the author. In this behalf an excellent example which is a deft combination of the forms of diaries, memoirs and autobiographies is Fydor Dostoyevsky's *The House of the Dead* While reading *Gard-e-Raah* many such famous autobiographies came to my mind

Nearer home most of the autobiographies serialized in the *Afkar* have not yet appeared in book form The only exception seems to be *Gard-e-Raah* from the pen of Dr. Akhtar Husain Raipuri, distinguished linguist, scholar, critic and short story writer. As one goes through it, at the outset what strikes a reader most is his lucid, unambiguous style not entangled by symbolic complexities. The fluent ease with which he describes his early life and the interesting anecdotes with which he embellishes his narrative about his life in Calcutta, Hyderabad, Delhi, Paris, London, Tehran, Mogadeshu in Somalia where he served as the UNESCO chief, some cities of Japan and the U.S.A. and his meetings with many famous world figures beginning with Tagore, Iqbal and Nazrul Islam to Louis Aragon, Khalida Adeeb Khanum, Pablo Neruda and Picasso, Mualvi Abdul Huq, Majaz and Manto and dozens of other writers, all that material makes it as irresistible as any delightful piece of fiction.

That is why unlike the autobiographies of some like the poet William Butler Yeats which has been unnecessarily loaded with obscure symbolism, *Gard-e-Raah* reminded me of Somerset Maugham's *Summing up* As a keen observor of events around him, Dr. Akhtar Husain too has tried to sum up the literary and cultural history of the sub-continent spread over a period of sixty eventful years interlacing it with his experiences in many famous centres of art and culture

As a student of literature who has always considered the author as one of his mentors, I found the book excitingly familiar for in my quest for learning I had traversed almost the same path as the learned author did in the sub-continent A childhood and educational career close to or in cities where Dr Husain grew up and was educated. Even localities in cities, institutions, names and personalities whom I also knew intimately and often remember nostalgically I found all of them there in *Gard-e-Raah* The fact that I found their images bright and vivid in the book is a testimony to the author's remarkable memory His facile pen describes those men and events so graphically that they all come back to life with intensity.

One reason for that impact — could be that in the book, all the related forms of diary, memoir and autobiography have been welded to produce a homogeneous pattern. From the external observation of a reporter to internal motivational analysis penetrating superficial actuality to offer glimpses of reality around the paradoxes of life, his vision has remained clear. That is why the book reflects various social, cultural, political and literary movements which prevailed in the sub-continent after the turn of the century. Thus it covers a span of time which had several landmarks which changed the life pattern of millions of people of the sub-continent

Very few writers from our younger generation know that Dr Akhtar Husain Raipuri was the precursor of the Prog-erature which revolutionized writings in the sub-continent His famous essay, *Adab Aur Zindagi* was written in 1935, a year before the progressive literary movement was launched by a small group of writers, most of whom are now dead Sajjad Zaheer, one of its founders had referred to it with admiration in his *Raushni* Inspite of Dr. Raipuri's multifarious activities and his bureaucratic national and international positions, he has always remained a great champion of the rights of the common man. That is why his compassion for uprooted humanity and his sympathetic understanding of human failings which beset all men is there throughout *Gard-e-Raah* Produced neatly, the book is a must for students of literature and scholars alike.

The Herald, March 1984

Gard-e-Rah

Dust of a Lifetime

By Asif Aslam Farrukhi

LIFE is like a journey — the dust one gathers along the way! This from Dr Akhtar Hussain Raipuri in his recently published autobiography, *Gard e Rah*. He talks of Al-Mansur (Prime Minister to Abdur Rehman, Islamic Spain's glorious caliph) who every time he returned home from a journey asked for his cloak to be shaken and its dust gathered in an earthen pot. Much later when he prepared for his final journey, he asked for the earthen pot to be brought out and its contents sprinkled on his coffin. The dust collected from his many journeys was the souvenir of a lifetime.

Dr Raipuri, both a writer and traveller, says that all the dust he piled up in his life and journeys has been preserved in *Gard*'s pages. And that's the reason why his autobiography is titled *Gard-e-Rah*.

Dr Raipuri is a well-known man of letters, and his autobiography describes a life richly lived. He belongs to the generation of the early progressives, and is regarded as one of the pioneers of modern writing. He is a major figure, fluent in more than one language and well-versed in more than one discipline. His critical essay, *Adab aur Zindagi* published in 1935, is often acknowledged as the starting point of the progressive movement. Besides their historical importance, his essays successfully formulate the line of argument the progressive critics were to take up a little later.

Dr Raipuri is a distinguished short story writer as well. He is, in a sense the link between Prem Chand and the 'realist' writers like Manto, Bedi and Krishan Chandr. In fact, Dr Raipuri was a personal friend of both Prem Chand and Manto. He has mentioned both of them in his book. He is no less a figure in the field of education, having served both the Pakistan government as well as UNESCO.

Besides Urdu, Dr Raipuri has worked in English, French and Persian. His translations of Kalidasa's *Shakuntala* from Sanskirit and Qazi Nazrul Islam's Bengali poems are well-known. He first became known as a Hindi writer (one of the few Muslims to gain recognition in Hindi) and moved on to Urdu much later. Since Dr Raipuri is equally at home and well-known in both languages, one might have expected him to serve as a kind of rallying figure to prevent the twin languages from running in opposite directions. Unfortunately, this was not the case, and Dr Raipuri's recollections of the days when the Urdu-Hindi question became politicized, strike a tragic note.

Dr Raipuri's *Gard-e-Rah* is a collection of memorable events and faces. There are several celebrities peeping out from these pages; Gandhi, Nehru and Abul Kalam Azad. Dr Raipuri refuses an appointment with Gandhi, takes Nehru from a backdoor in Aligarh and sits down to a lively cup of tea with Maulana Azad. There are glimpses of poets Tagore, Iqbal and Sarojini Naidu. Later, we meet Aldous Huxley and Louis Aragon, as Dr Raipuri hobnobs with writers Eastern as well as Western. There are tantalisingly brief glimpses of Noon Meem Rashid and Majaz. If only these had been done in more detail. As Dr Raipuri was associated with the Anjuman Taraqqi-e-Urdu, he has portrayed Maulvi Abdul Haq in some detail, highlighting not his work as a scholar but the human side of his character.

The locale of Dr Raipuri's life story changes rapidly. He has really collected the dust of many cities and many countries. He speaks of Calcutta, Delhi, Karachi, Paris and Tehran in different periods of his life. He has described his visits to Europe (then on the brink of the Second World War) Somalia, Iran, Palestine, Spain, USA and Japan.

Dr Raipuri's work with UNESCO made a globe-trotter of him. His travels resulted in a marked decline in his literary output. In that sense his gain was literature's loss.

Gard-e-Rah is an autobiography, but Dr Raipuri has given primary importance to places and people. He has kept himself in the background. There are neither the elements of character analysis nor the self-revelations that one expects from an autobiography. Instead, we are offered sundry opinions on various matters. As befitting a philosophical mind's "summing-up," the book ends in three general articles on the past and future of literature, the search for beauty and the search for truth.

This book was originally serialized in the monthly *Afkar* and while it was being written, Dr Raipuri lost his eyesight completely, as a result of an unsuccessful operation. So his first book in nearly thirty years may well be his last. But it is an apt crowning of an interesting and fruitful lifetime.

DAWN, THURSDAY, DECEMBER 6, 1984

Paris Congress remembered: a biography: collection of essays

Very few autobiographies have been written in Urdu which offer glimpses of significant national and international cultural and literary events occurring in the past five decades. Dr Akhtar Husain Raipuri's *Gard-e-Raah* is such a book. But so much has already appeared in the Press about it that one hesitates to reflect upon some of its aspects once again. There is, however, a chapter in it about the author's stay in Paris which reminded me of the First International Congress of Writers held in June 1935 at Paris

Dr Akhtar Husain Raipuri, the distinguished critic, educationist and short story writer belonging to the senior most group of Urdu authors, is one of those Pakistani intellectuals who began writing when the Progressive Movement in Literature was taking shape in the Subcontinent

He remained associated with it during its heyday playing a significant role in projecting its aims and objects for the benefit of new writers Writers of my generation who began writing in early forties under the influence of that powerful movement owe a lot to thinkers like him for influencing us in our literary pursuits

By Anwar Enayetullah

Monumental

. In this behalf one of his monumental work *Adab Aur Zindagi* deserves mention Perhaps for the first time, simply and lucidly, it emphasised why good literature should be for life's sake That is why in most of what he wrote or in the writings of most other great Urdu short story writers during the early phase of the Progressive Writers' Movement, literature often seems indistinguishable from social documentation and criticism reflecting adequately the problems of the common man

In *Gard e Raah*, Dr Raipuri describes his meetings with many well known European and American writers, intellectuals and artists who also appear in an account about the First International Congress of Writers which was held in Paris almost at the same time or immediately preceding Dr Raipuri's visit

Roger Shattuck writes details of this meeting in an article entitled *Writers For the Defence of Culture* Although Dr Raipuri refers to the Spanish Civil War, Picaso and his meetings with Louis Aragon and Pablo Neuroda, Shattuck's essay does not mention them, not even Hemingway

In order to widen its appeal, the invitation to the Congress seems to had been sent to a very large number of writers from all over the world without mentioning either the rise of fascim or danger from any political philosophy "In the face of of dangers which threaten culture in a number of countries, a group of writers are taking the initiative of bringing together a congress in order to examine and discuss means for defending that culture They propose that the congress clarify the conditions of literary creation and the relations between the writer and his public "

Those who responded positively to that invitation included Andre Gide, Romain Rolland, Andre Malraux, Aldous Huxley, Bertold Brecht, Boris Pasternak, Elia Ehrenburg, Louis Aragon, E M Foster and many others Some notables who did not care to attend included Thomas Mann, Bernared Shaw, H G Wells and Upton Sinclair

Since the congress was held at a critical juncture in contemporary history, it may not be out of place to refer to what was happening then in Europe By that time Hitler had already been installed as Chancellor It is strange that even after the Richstag fire, the true direction towards which the wind was blowing in Europe had not alerted the nations to the demon of fascism.

Oblivious of its evil designs, intellectuals and writers were in one way or another endorsing the words of Gide that there was no danger to literaure and culture from any quarter. In view of what happened to France and the free world later, his opening remarks now sound amusing

"Literature had never been more alive," he had declared. "Never has so much been written and printed, in France and in all civilised countries Why then do we keep hearing that our culture is in danger?"

It is intriguing to understand why *ever after listening to the German* poet Regler who gave details of the resistance of a group of writers against Hitler and watching Pasternak being brought to the Palais de la Mutualite under armed guard, Gide was optimistic about life and literature in Europe.

Later developments in the political, cultural and literary fields proved how the congress achieved nothing more than, in the words of Shattuck, "a mere epiphenomenon clinging to the surface of history."

Whatever happened on the international level does not reflect upon the genuineness of the philosophy behind the Progressive Writers Movement in the Subcontinent which inspired and influenced such a large number of Urdu authors who emerged on our literary horizon around 1936

Their thinking and philosophy is deftly reflected in the writings of intellectuals like Dr. Akhtar Husain Raipuri and poets like Faiz.

In 1958, addressing the Afro-Asian Writers' Conference, he had declared: "We all firmly believe that literature is closely linked to our people's destiny, that literature cannot flourish save in the midst of freedom and national sovereignty."

This was the philosophy which had inspired Urdu writers of the Subcontinent to use their pen judiciously in their struggle for independence against the British, interesting details of which appear in *Gard-e-Raah*

MAG WEEKLY

May 9 – 15, 1985

By IKRAM BRELVI

An Absorbing Autobiography

GARD-E-RAH first appeared in January, '84. This reprint was published in August last. It is a highly commendable book written and produced twice within a span of eight months Perhaps it was for books like this that André Gide remarked. "I write to be re-read". I wonder if Dr. Akhtar Husain Raipuri had any such susceptibility while writing this work of art which deserves and demands rereading.

The other thing I could not resist noting is that this auto-biography reminds me of André Gide's *'If I Die'* and Isodora Duncan's *'My Life'*. This is not to suggest that the auto-biographies of André Gide or, for that matter, Isodora Duncan are identical with *'Gard-e-Rah'* in nature, approach and attitude. The only semblance or similarity, I could guess, is the turbulent period in which art and literature, thought and culture, party and politics, study and observation, manners and atticism and, above all, contemporary awareness were either cryptically crumbling or wilfully destroyed and discredited under the emerging thoughts and new ideological concept of life and living which are, by and large, the purpose and purport of this book.

Dr. Akhtar Husain Raipuri, a critic and creative writer, is a man of many faceted spirit. His protean personality has arrested, gripped and reflected innumerable rays of radiant thoughts and situations in the twenty chapters of the autobiography. His work raises many important issues, but no direct controversies. The only petulant prick in his soul is sublimated in the cult of 'modernity' or, to be more precise, in the 'progressive' melange of his times which he has fondly described at various places in the book. The quality or the beauty of Dr Raipuri or this autobiography is that in moments of excessive sympathy, he forgets himself and inadvertantly beams out in the characters, he is moving, moulding or shaping. But all these characters, (even he himself), are moulded and shaped in such a subtle way as if in reality he has abandoned his own point of view to take on the thought and emotion of another – and thus makes his men, matter and material more magnificent.

But underneath this, lies the conflict of his puritan and the emancipated being. This conflict is further intensified by his natural bashfulness. He can neither deny it nor accept it.

The auto-biography poses the roblem of how to live and earn, and what to live for. In his attempt, Dr. Raipuri has, if not solved the problem, has surely suggested means of salvation or at least a route to refuge. In this sense, the auto-biography makes an interesting contribution to that body of reflection which can be roughly classified as opinions on those eventful days It surely mirrors the days, the decays, the divergencies of his age of flux, a aith, a firm point of view, the uthor has, and also a belief which he has in the pro-creative apacity Hence he looks with a ertain equanimity on the future nd on the shape of things to ome (chapters 17, 18 and 9)

As a creative writer and a enowned critic, Dr Akhtar Husain Raipuri has presented chaste auto-biography. here, n this book, are the facts of life y the use of which we better understand his values and views he book aroused lot interest y its searching and literary assages of 'par excellence, his adept memory and mental eproduction, his past sensational experiences vivid as well as visual The episodes recorded n the book are portrayed to have played a significant role in Dr. Raipuri's intellectual development.

It is no less true that all these facts are described with utmost simplicity and frankness. The book is, for all that, much less the astute confessions of an invert than the story of a critic and a creative writer – his family, his lineage, his relationships with his father, mother, brothers, wife and children besides his friends, the people and the personages he came in contact. Those who inspired and influenced him, and also those whom he inspired and influenced.

A profitable and revealing book; it is no less rich in brilliant asides and in flashes of insight into the lives of men and women, like Maulvi Yasin who taught Akhtar Husain the Holy Quran, his mother, Mumtaz-ul-nisan, his father, Syed Akber Husain, his 'aya' Piranbibi who appears in *'Mohabbat aur Nafrat'* (Love and Hate), and also his bosom-pal, Basant Kumar. Such were the people in whose care he was brought up. These pictures so vivid and catchy that one only marvels at them.

Whatsoever, not a single portrait in his art gallery is insipid or colourless, may it be Maulana Wahshat, Salah-uddin, his brother, Shamim, Khuda Bakhsh, Nawab Nasir-uddin Khaiyal, Maulana Abul Kalam Azad, Agha Hashr, Chiragh Hasan Hasrat, Humayun Mirza, Sadru (his servant), Babu Mulchand, Majaz, Prof. Habib, Prof. Rashid Ahmad Siddiqui, Hatim Baig (the jeweller), Dr. Zakir Husain, Pandit Jawahar Lal Nehru, Allama Iqbal, Sarojni Naidu, Gokul Chand Narang, Maulana Abdur Razzaq Malihabadi, Ishaq Amritsari, Najeeb Ashraf Nadvi, Amanand Chatterji, Pandit Banarsi Das and above all Maulvi Abdul Haq whose love and admiration was always uppermost in his mind, or, for that matter, Khalida Adeeb Khanum, Birjeesh Singh, Mustafa Sagheer, and Iqbal Shaidaey.

There is not a single chapter in the book which is dull or drab.



اب
باتھ سائز
میں بھی دستیاب
پامی
تازگی، بچت، خوشبو
پامی صابن سے
پامی ٹائیلٹ صابن کی حسین ٹکیہ
جھاگ دے زیادہ بھی اور بہت ملائم بھی
تازگی ہے پامی سے، زندگی ہے پامی سے
جسم پامی صابن سے دیر تک مہکتے ہیں
تازگی بچت خوشبو ساتھ ساتھ چلتے
پامی
بنانے والے
ذوالفقار انڈسٹریز لمیٹڈ
ٹریڈ کارپوریشن لمیٹڈ کا ذیلی ادارہ
PRESTIGE Z I L 3755 82 PTS

ادب اور زندگی

عصرِ حاضر میں ادب کا مقام

محفلِ رقص کی تصویر

مقدمہ

باغی

دل کا اندھیرا

مجھے جانے دو

کافرستان کی شہزادی

مویشی بازار

بازگشت

۳۰

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

ادب اور زندگی

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا مشہور مقالہ "ادب اور زندگی" پہلی بار جولائی ۱۹۳۵ء میں رسالہ اردو (اورنگ آباد دکن) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے مدیر مولوی عبدالحق تھے۔ دوسری بار یہ مقالہ دیگر مضامین کے ساتھ کتابی صورت میں "ادب اور انقلاب" کے عنوان سے حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا اور عرصے سے نایاب تھا اور اب اس خصوصی اشاعت میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ نئی نسل اس کی تاریخی قدر و اہمیت کا اندازہ لگا سکے —— سہا لکھنوی

ادب کیا ہے۔ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی؟ ادب کے مقاصد کیا ہیں؟ یہ سوالات اتنے ہی پرانے ہیں جتنی عمر ادب کی زندگی۔ ارباب حل و عقد نے اس بحث پر بڑے بڑے دفتر سیاہ کر دیے اور اب اس موضوع پر از سر نو کچھ کہنا تحصیل حاصل سمجھا جائے گا۔ اگر مجھے اس کا احساس نہ ہوتا کہ آج زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے، سماج ایک دور تغیر سے گزر رہا ہے اور انسانیت ارتقا کے دوراہے پر آ کر ایمان دار ادیب سے پوچھ رہی ہے کہ:

"دونوں میں سے کس کے موئید ہو۔ پیشہ ور گوشہ نشینی یا عوام سے یگانگی؟ جنگلوں اور پہاڑوں کی چاہت یا انسان کی خدمت؟ غیر ذمے دارانہ خودسری یا خیالات کا ارتباط، قدرت یا ضمیر؟ جبر یا اختیار؟ تقدیر یا تدبیر؟ قدرت کی اطاعت یا قدرت پر حکومت؟ آرٹ، آرٹ کے لیے یا آرٹ انسان کے لیے؟ زمین یا آسمان؟ دوئی یا یگانگی؟ ان میں سے ایک پر زندہ درگور دنیائے قدیم کا انحصار ہے اور دوسرے پر مستقبل کا دار و مدار۔ تم دونوں میں سے کس کے حامی ہو؟"

(زمانۂ حال کا ادب از پی۔ سی۔ کوگن)

اگر یہ مرحلہ درپیش نہ ہوتا اور ادیب سماج کا ایک فرد نہیں بلکہ کوئی بن باسی ہوتا تو مضمون کی نوعیت مجھے قلم اٹھانے کی اجازت نہ دیتی۔ مگر چونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور حقائق زندگی و اشارات ادب کی خلیج اس ملک میں وسیع تر ہوتی جاتی ہے اچھا ہو کہ یہ مسئلہ پھر چھیڑا جائے اور یاران نکتہ داں کے آگے یہ اہم سوال پیش کیا جائے۔

مضمون کے پہلے حصہ میں دکھایا جا چکا ہے کہ تخلیق ادب معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے۔ پھر جب یہ تصفیہ ہو چکا کہ زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہی ہیں تو روح مقصد کی وضاحت کے لیے ہم ہندوستانی ادب کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کریں گے اور دیکھیں گے کہ ہمارے ادب نے اپنے فرائض کی تکمیل کس حد تک کی ہے۔ ہندوستان پر برطانیہ کی فتح سامنتی FEUDAL تمدن پر صنعتی INDUSTRIAL تمدن کی فتح تھی اور دیسی سماج کی سامنتی بنیاد جو پلاسی کی جنگ سے پہلے متزلزل ہو رہی تھی ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اس کا شیرازہ تیزی سے منتشر ہونے لگا۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء ہمارے سماج کی منزل ارتقا میں ایک حد فاصل قائم کرتا ہے۔ اس زاویۂ نگاہ کی روشنی میں ادب ہند کے بھی دو دور مقرر کیے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اس زمانے کے لگ بھگ انحطاط پذیر ہونے لگتا اور دوسرا وہ جو اس کے بعد رفتہ رفتہ آنکھیں کھولنے لگتا ہے۔ آسانی کے لیے ہم انھیں قدیم اور جدید ادب کہیں گے۔ یہ تجزیہ خالصتاً معاشی ہے۔

کسی یونانی حکیم کا قول ہے کہ خیالات کی اینٹوں کو جذبات کے چونے سے ہی جوڑا جا سکتا ہے۔ انسان خیالات و جذبات کا مجموعہ ہے۔ سائنس خیالات میں ربط و نظم قائم کرتا اور ان کی تراش خراش کرتا ہے۔ آرٹ جذبات کو بناتا سنوارتا اور نقش و نگار، اشارات و الفاظ کے ذریعے ان کی ترجمانی کرتا ہے۔ ادیب اپنی جذباتی کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہناتا اور اپنی افتاد طبیعت کے مطابق اس کی کاٹ چھانٹ کرتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ادب جذبات کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جذبات کی ترتیب و تکمیل کس طرح ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر جذبہ گرد و پیش کا مطیع ہے اور حالات کے مطابق جذبات بدلتے رہتے ہیں۔ زندگی کا پھیر کچھ ایسا ہے کہ کبھی آدمی کو رُلاتا اور کبھی ہنساتا، کبھی آزردہ اور کبھی غضبناک بناتا ہے۔ مثلاً "موت" اور "بھوک" کے مسائل ہمیشہ آدمی کو خون کے آنسو رُلاتے رہے ہیں۔ ایک کے لیے قدرت، دوسرے کے لیے سماج ذمے دار ہے۔ اگر یہ دو مصیبتیں نہ ہوں تو ہمارے ادب کی حزنیت بہت کم ہو جائے گی، اور پھر فراق یار کے علاوہ بہت کم چیزیں اسے رنج دیا کریں گی۔ اگر سماج اور قدرت کے نظام میں ایسی تبدیلی ہو کہ یہ نقشہ بدل جائے تو ایسے جذبات کبھی پیدا نہ ہوں گے۔

اب تک ہمارے تنقید نگاروں نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ ادیب نے جذبات کو کس طرح ظاہر کیا ہے۔ FORM کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ادیب جن جذبات کو آشکار کر رہا ہے وہ الہامی نہیں بلکہ ماحولی ہیں تو یہ سوال زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ ان جذبات کو کون اور کیوں کر برانگیختہ کر رہا ہے۔ ادیب سماج کے مطالبات اور اپنے گرد و پیش سے ہر انسان کی طرح متاثر ہوتا ہے۔ وہ جس زمانے میں، جس تہذیب و تمدن کی گود میں پرورش پائے گا، جن لوگوں کے ساتھ رہے گا اور جن روایات و خیالات کا حامل ہوگا، وہ یقیناً اس کے جذبات کو رنگ روپ دیں گے۔ اس یہ میری رائے ہے کسی ادیب کی روح کو سمجھنے کے لیے اس فضا کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے جس میں اس نے پرورش پائی۔ جب تک اس زمانے کی زندگی نہ سمجھی جائے یہ سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ ادیب نے یہی کیوں کیا۔ اس کے خلاف کیوں نہیں کیا۔ اس لیے کہ ادیب اپنے جذبات کی نہیں اپنی فضا کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس کی زبان سے اجتماعی انسان بول رہا ہے۔

فرض کیجیے کہ کسی شہر میں ایک کارخانہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر کی ظاہری صورت یہی ہے کہ ایک امیر نے سرمایہ لگایا، انجینیر نے نقشہ بنایا اور مزدوروں کی محنت نے سرمایہ کھڑا کر دیا۔ لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ جب تک اقتصادی ضروریات کا مطالبہ نہ ہوتا کہ کارخانہ بنایا جائے اس وقت تک اس کا خیال بھی کسی کے ذہن میں نہ آتا۔ کارخانے کی وجہ تعمیر کو سمجھنے کے لیے اس زمانے کی مالیات پر غور کرنا

چاہیے نہ کہ اس سیٹھ کی تھیلی کی لمبائی اور انجنیر کے نقشے کی ستھرائی پر۔ اسی طرح کسی زمانے کے ادب کا غائر مطالعہ مقتضی ہے اس زمانے کے حالات کو سمجھنے کا اُن مخصوص جذبات کو اُن مخصوص حالات نے ہی پیدا کیا تھا۔ سنسکرت شاعری جن جذبات کی حامل ہے وہ قدیم ہند کے ساطیر ... کے پس منظر میں ہی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ سماج اپنے عہد طفلی میں اپسراؤں[1] اور راکششوں کے افسانے سُن اور سمجھ سکتا ہے، لیکن اب اپنے ... پیری میں وہ ان رنگین خوابوں کا تانا بانا کیوں کر بُن سکتا ہے جب کہ اپسرا کی جگہ سینما کی طوائف اور راکشش کا منصب روبٹ[2] ROBOT نے چھین لیا ہے اب شمع پر پروانے بھی کم آتے ہیں کہ آگ کی جگہ بجلی آ گئی اور خرمن پر برق بھی کم گرتی ہے کہ اس پر برقی سنداخ نصب کر دی گئی ہے! صحراؤں میں محمل کا پتا نہیں کہ موٹر چلنے لگے اور ڈولیوں کا رواج بھی کم ہو چلا کہ کہاروں کے کاندھے چھل گئے۔ زمانے کے رد و بدل نے سنسکرت شاعری کے پر نوچ لیے اور احساسات و جذبات کی تبدیلی کا یہ مطالبہ ہوا کہ ہندوستانی ادب کا دھارا اپنے بہاؤ کے لیے نیا میدان تلاش کرے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ادب کے فرائض کیا ہیں۔ میرا مطلب اُن کے مقصد سے نہیں ہے۔ طالستائی کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ آرٹ جذبات انسان کو متاثر کرنے کا ایک ذریعہ ہے یعنی ایک یاس انگیز نغمہ چھیڑتا ہے اور سُننے والے بلا امتیاز اندوہ و الم سے چیخ اٹھتے ہیں۔ شاعر طرب و نشاط کا گیت سناتا ہے تو سُننے والے شادماں ہو جاتے ہیں۔ دستووسکی جب "گناہ اور سزا" میں ایک روح کی کشمکش دکھاتا ہے تو ناظر کی روح میں گتھی سی پڑ جاتی ہے۔ ادیب کے کمال کا ایک معیار یہی ہو سکتا ہے کہ اپنے جذبات سے وہ دوسروں کو کس حد تک متاثر کر سکا۔ اُس کی عبارت زمان و مکاں کے امتیاز سے جتنی بالاتر ہو گی اس کا آرٹ اتنا ہی دیرپا اور مستحسن سمجھا جائے گا۔ مگر وہ اپنے ماحول سے جدا نہیں ہو سکتا، اپنے ماحول کے تاثرات کو بیان کرتا ہے یعنی اپنے ماحول سے لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ جب تلسی داس ایک زن مرید باپ کی اطاعت کو بیٹے کا دین و مذہب بتلاتا ہے تو اُس کے قلم سے اُس زمانے کی تہذیب بولتی ہے جس میں بیٹے کی حیثیت باپ کی غیر منقولہ جائداد سے زیادہ نہ تھی۔ آج جب ہر بیٹا اپنی انفرادیت کو شفقت پدری سے زیادہ قیمتی سمجھ رہا ہے تو اس قسم کی تعلیم رجعت اور قدامت سے تعبیر کی جائے گی۔

یہاں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آرٹ کا مقصد کیا ہے؟

"ادب برائے ادب" کے علم برداروں کا خیال ہے کہ روح اور خدا کی طرح ادب بھی کوئی مافوق الفطرت شے ہے اور جس طرح حسن و حقیقت کو عام معیار پر نہیں جانچا جا سکتا اسی طرح ادب سے سرور و حظ اسی حالت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ اسے سماج کی پابندیوں سے الگ رکھا جائے۔ جمالیاتی نقطۂ نظر جس کے موئید ہیگل، شوپن ہار نتشے اور بہت سے انگریز ادبا اور مفکرین ہیں، آرٹ کا مقصد تلاش حسن کو قرار دیتے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ خیال جس کی تشریح طالسطائی نے کی، آرٹ کو نیکی کا آئینہ دار قرار دیتا ہے۔ معاشی اور مادی نقطۂ نگاہ سے یہ دونوں معیار مبہم اور ادھورے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ادیب انسان ہے اور ہر انسان کی طرح ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اگر یہ حقیقت ہے کہ ادب نگاری بھی ایک قسم کا سماجی عمل ہے اور انسانیت اس سے اثر اندوز ہوتی ہے تو ادب اور انسانیت کے مقاصد ایک ہیں۔ ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ مادی سرزمین میں جذبات انسانی کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے وہ روح القدس بنے اور عرش پر جا بیٹھنے کا دعویٰ کرے۔

---

[1] اپسرا۔ حور کا ہندو تصور   [2] روبٹ مصنوعی انسان

ادب اور زندگی

ڈاکٹر اعجاز حسین الٰہ آبادی

زندگی کا نام ایک مکمل اور واحد ہے یا اس میں سائنس، آرٹ اور فلسفے کے مختلف خانے نہیں ہیں کہ جس کا جی چاہے کہہ دے کہ مجھے زندگی سے کیا غرض، میں آپ اپنے لیے زندہ ہوں؟ اور چیزوں کی طرح فن و ادب بھی زندگی کے پروردہ اور خادم ہیں۔ ادب ماضی و حال اور حال و مستقبل میں رشتہ جوڑتا ہے۔ [illegible] نسل اور ملک و قومی بندشوں کو توڑ کر دوسری قوموں [illegible] کو وحدت کا پیغام سناتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اتنے اہم معاشی [illegible] لیجئے کہ ایک فن کی اپنی ذاتی ماہیت سمجھ اور اس کا یہ دعوٰی تسلیم کر لیا جائے جس کیا ہے جس کی تلاش میں ہم سب ادب برائے ادب کہتے ہیں۔ [illegible] ہیں جس کی تعریف ناممکن سی ہے۔ والٹیر نے اپنی مشہور تصنیف DICTIONAIRE DE PHILOSOPHIE میں ان لوگوں کا بڑا مذاق اڑایا ہے جو حسن کا کوئی معیار قایم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے "مینڈک کی نظر میں مینڈکی [illegible] خوبصورتی کا دعوٰی ہے اور ایک حبشی حسینہ کے چہرے اور موٹے ہونٹوں پر بھی عاشقوں کا گروہ دل و جان [illegible] ہے۔ جرمنی کے کلاسکل فلسفیوں کے نزدیک ادب آدمی کی تفریح کا ایک وسیلہ ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ادب کا مقصد دلی تفریح طبع ہے اور چونکہ دعوٰی یہ بھی ہے کہ آرٹ زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے لہٰذا تفریح زندگی کی معراج ہوئی۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی جس چیز سے مسرور ہوتا ہے وہ دوسرے کے لیے اجیرن ہے۔ زندگی اور ادب کا یہ نظریہ اس قدر بے معنی ہے کہ اس پر کچھ لکھنا فضول ہے۔ پھر کیا آرٹ کا مقصد تلاش حق ہے؟ حقیقت کیا ہے! کیا حقیقت کی کوئی قطعی اور آخری تعریف ہوسکتی ہے جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو؟ جو چیز ایک کے لیے اچھی ہے۔ دوسرے کے لیے بُری۔ امیر کے لیے جو حق ہے وہ غریب کے لیے ناحق ہے۔ پھر ادب کس حقیقت کا جویا ہے!

میں پھر اپنے اسی جملے کو دہراتا ہوں کہ زندگی کے مقاصد سے ہٹ کر ادب نہ اپنی منزل تلاش کرسکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے۔ زندگی کی روانی اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کرتی ہے، عام اس سے کہ وہ اپنے آپ کو رموزِ حیات کا محرم اور حسن و عشق کا پروردگار کہتا رہے۔ ایک انسان اور ایک ادیب کے داخلی و مقاصد یکساں اور مشترک ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا اور دوسرا اس سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پرانے ادب میں ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی کہ ادب اپنے ماحول سے بے خبر اور آزاد ہو کر آگے یا پیچھے جانا چاہتا ہے۔ اپنے موقع پر ایسی واردات کے اسباب پر بھی غور کیا جائے گا اور ہم دیکھیں گے کہ یہ حالات کا ہی ردعمل تھا۔ کوئی الہامی کیفیت نہ تھی۔

اب تک ہم جن نتائج پر پہنچے وہ یہ ہیں:-

(۱) ادب زندگی کا ایک شعبہ اور اپنے ماحول کا ترجمان ہے۔

(۲) زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں۔

زندگی کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر ہمیں سماج کی بنیاد کا جائزہ لینا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ سماج کیوں بنتا اور بگڑتا ہے اور یہ تبدیلیاں اسے کس منزل کی طرف لے جا رہی ہیں۔

سماج ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو اشتراکِ عمل کے لیے یکجا ہوتے ہیں۔ اشتراک اور تعاون کے لیے ان افراد کا مقصد یکساں ہونا ناگزیر ہے۔ ہر فرد کی مادی ضروریات کم و بیش ایک سی ہوتی ہیں اور سماج کی ابتدا اس غرض سے ہوتی ہے کہ ضروریاتِ زندگی کے حصول و تقسیم میں آسانی رہے۔ یعنی سماج کا سنگِ بنیاد انسان کی مالی ضروریات کی پیداوار اور تقسیم پر ہے اور افراد کا رشتہ باہمی اس پیچ و خم کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ سماج کی ترقی سے مراد یہ ہے کہ اس کے افراد کا رشتہ مستحکم ہوتا رہتا ہے یعنی ضروریاتِ زندگی

کی بہم رسانی آسان ہوتی جاتی ہے جس سے انھیں اپنی خواہشوں کی تکمیل کا موقع ملتا ہے۔ پیداوار کے ذرائع جتنے وسیع اور کارآمد ہوں گے اور مال کا طریقۂ تقسیم اکثریت کے لیے جتنا قابل قبول ہوگا اسی اعتبار سے نظام معاشی کی عمر دراز ہوگی۔ سماج کے ارتقا سے مراد دراصل پیداوار کے انھیں ذرائع کے ارتقا سے ہے۔ دورِ وحشت سے گزر کر انسان دورِ حرفت میں کیسے پہنچ گیا اسے سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا کہ کلہاڑی نے ٹریکٹر کی شکل کس طرح اختیار کر لی اور نیزہ مشین گن کیسے بن گیا۔ پیداوار کے ذرائع دو حصوں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک طرف تو قدرتی ذرائع و عناصر ہیں جنھیں حسب ضرورت کارآمد بناتا ہے اور دوسری طرف وہ انسانی محنت ہے جو یہ فرض انجام دیتی ہے۔ زمین کان اور خام اشیا کی دوسری قدرتی رسدگاہیں جیسی پہلے تھیں ویسی ہی اب بھی ہیں۔ ان میں فرق نہیں آتا۔ سماج کا ارتقا و تغیر محتاج ہے انسانی محنت کا جو ان اشیا کو قابل استعمال بناتی ہے۔ جس کھیت میں کاشت کاری کے فرسودہ طریقوں سے دس من غلہ پیدا ہوتا تھا آج وہاں مشینوں سے سیکڑوں من اناج پیدا ہوتا ہے۔ یہ پیداوار کے ذرائع کی ترقی ہے جسے ہم سماج کی ترقی سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ نظام معاشی کا بنیادی پتھر ضروریات زندگی کی پیداوار پر رکھا گیا ہے اور سماج اسی وقت تک قائم ہے جب تک اس کے افراد کا رشتۂ باہمی مستحکم ہے جس کی ضمانت ہر فرد کی ضروریات کی تکمیل ہے۔ اس سے یہ لازم آیا کہ پیداوار اور تقسیم کے طریقے ایسے ہونے چاہئیں کہ ہر فرد اپنی بساط کے مطابق محنت کرکے اپنی ضروریات حاصل کر سکے۔ یعنی پیداوار اور تقسیم کے ارتباط رشتۂ افراد کے استحکام کا ضامن ہو سکے۔ ہر فلسفۂ زندگی کا منشا یہی ہے کہ ہر فرد بشر کو روحانی، ذہنی و جسمانی نشو و نما کا موقع مل سکے، مگر انسان کا مادّی وجود اس کا مقتضی ہے کہ سب سے پہلے اس کی جسمانی ضروریات کا انتظام ہو۔ سرمایہ، دولت یا امارت سے وہی لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں جو پیداوار کے ذرائع پر کسی نہ کسی طرح قابض ہوتے ہیں۔ غریب و فقیر وہ لوگ ہیں جو ان کی ملکیت سے محروم ہیں۔ اگر کبھی ایسا ہو سکے کہ پیداوار کے ذرائع پر کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ پورا سماج قابض ہو اور مال کی تقسیم اس طرح ہو کہ ہر محنت کش فکرِ روزگار سے آزاد ہو جائے اور آئندہ نسل کی تربیت و پرورش کی کفالت و تحفظ سماج کر سکے، تو یہ سماج کی مادّی ترقی کی انتہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ذہنی و تمدنی اعتبار سے بھی انسانیت کو مرتبۂ بلند کی طرف لے جا سکے گا اور اس وقت روح الاجتماع خداوند بن جائے گی اور کثرت و وحدت میں کوئی تنازع نہ رہے گا۔ یہ زندگی کا مقصد اولیٰ ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ اس کا ہر شعبہ اس کے حصول کے لیے کوشاں ہو۔

اسی چیز کو مدنظر رکھ کر ادبِ جدید کا پیغمبر 'میکسم گورکی' کہتا ہے:

"ادب انسانیت کا نقاد ہے۔ وہ اس کی کج روی کو ظاہر کرتا اور اس کی خام کاریوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انسان کی حیات مستعار کو دائم و قائم بنائے۔ ادب کی بے کلی اور تڑپ اس لیے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں ہے بلکہ حالات اس کے غلام ہیں۔ وہ آدمی کو تبلانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے جس روش پر چاہے لے جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ادب تغیر پسند، قدامت شکن اور دورِ جدید کا پیش رو ہے۔"

ادب زندگی کے اس سوال کا جواب ہے کہ انسان کس سے محبت اور کس سے نفرت کرے اور کس طرح زندہ رہے۔ یہ سچ ہے کہ تدریسیت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ گی انسانیت کو وہ پند و نصیحت کی کڑوی دوا نہیں پلاتا بلکہ ہلکے اور میٹھے سروں سے اس کی عیادت کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ادب کے ماخذ ماضی و حال ہیں لیکن وہ مستقبل کا جویا ہے۔ وہ پیچھے یا دائیں بائیں طرف اس غرض سے دیکھ لیتا ہے کہ منزل حیات کے نشیب و فراز کو دیکھ سکے اور آگے بڑھ سکے۔ تاریخ کے محاذ میں اس کی جگہ صف آخر

میں نہیں بلکہ پیش پیش ہے۔ لہٰذا ادب کا یہ مقصد ہے کہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی اپنے گردوپیش کا آئینہ دار ہو تاکہ اس کے حسن و قبح سے آگاہ ہو کر انسانیت ترقی کے زینوں پر گام زن ہو۔ علم اور ادب میں وہی فرق ہے جو استاد کی دھمکیوں اور ماں کی لوریوں میں ہے۔ ادب وہ استاد ہے جو کہانیوں اور گیتوں میں انسانیت کو رموز حیات سمجھاتا ہے۔ ادب کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں، ان جذبات پر نفرین کرے جو دنیا کو آگے نہیں بڑھنے دیتے اور پھر وہ انداز بیان اختیار کرے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے۔ کیونکہ بہرحال زندگی کا مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بھلا ہو سکے۔

ادب ہند کا ایک خاکہ پیش کر کے ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ کہاں تک مذکورہ مقصد کا حامل رہا ہے۔ کیا وہ زندگی کے حقائق اور مقاصد کی ترجمانی کرتا رہا ہے اور کیا وہ انسانیت کا مصلح اور پیشوا کہا جا سکتا ہے! ابھی صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے ادیب عموماً کس ماحول میں رہتے آئے ہیں کیوں کہ ہمارے تجزیے کے مطابق اُن کے جذبات کی شکل اُسی ماحول میں ہوئی۔ کیا یہ ماحول اور یہ جذبات زندگی کے لیے چراغ راہ بن سکتے ہیں؟ اب زندگی کو کس طرف جانا چاہیے اور ہمارا ادب کس طرف جا رہا ہے؟

زمانۂ قدیم اور عہد وسطیٰ بلکہ گزشتہ صدی کے اواخر تک علم و ادب پر دو قسم کے لوگوں کا اجارہ رہا ہے۔ ایک وہ جو بیراگی یا صوفی تھے اور دوسرے وہ جو طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے تھے۔ اوّل زندگی کی تگ و دو سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ آشرموں یا حجروں میں اور درباروں یا امیروں کی ڈیوڑھیوں میں پڑے ہوئے یہ عالم اور ادیب زندگی کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے ماحول میں رہتے تھے جو یا تو زندگی سے دور تھا اور یا جھوٹی زندگی کا عکاس تھا۔ سوچیے کہ دربار یا آشرم میں رہ کر انسان کن جذبات کی ترجمانی کن کی زبان میں کرے گا۔ ایک محدود دائرے میں رہ کر جہاں ایک سے لوگ ایک قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں، جہاں حزنیت یا منافقت کا دور دورہ ہے۔ وہاں کسی ادیب کی حالت کیا ہوگی؟ اس لحاظ سے ہمارے ادب قدیم کے تین نقائص اتنے نمایاں ہیں کہ حاشیہ تشریح طلب نہیں۔

(۱) موضوعات ادب بہت ہی فرسودہ اور محدود ہیں۔

(۲) لطف بیان اور زیب داستاں پر معنی و مقصد کو قربان کیے جاتے ہیں۔

(۳) ادب کو لوگ پیشے کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس ملک کا ادب ہر دور میں طبقۂ امرا کا خادم اور منت پذیر رہا ہے۔ کچھ صوفی شاعر اور عہد وسطیٰ کی بھگتی تحریک کے علم بردار ادب ایسے ضرور ہوئے ہیں جو امیروں کے دست نگر نہ تھے لیکن ان میں سے اکثر دنیا سے بیزار اور بے نیاز تھے جس کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے۔ کبیر داس اور نظیر اکبرآبادی جیسے شاعر خال خال ہی ہوئے ہیں جو گھوم پھر کر آپ اپنی روٹیاں کماتے اور زندگی کو کوچہ و بازار میں رہ کر نہیں بلکہ قدرت کے نگارخانے میں رہ کر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان درباری بھاٹوں اور بے غیرت عاشقوں کے متعلق طالسطائی کہتا ہے:۔

> "کیوں کہ ان کا پیشہ امیروں کی خوشنودی ہے اس لیے ان میں خودداری کا احساس باقی ہی نہیں رہتا۔ قبولِ عام کی ہوس میں یہ اندھے ہو جاتے اور مدح و ثنا پر اپنا دین و ایمان نثار کر دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کتنا افسوس ہوتا ہے کہ آرٹ کی خاطر یہ زندگی کے بیش بہا لمحے ضائع ہو ہی جاتے ہیں لیکن یہ بے ایں ہمہ آرٹ کو فائدہ کیا اُلٹا نقصان

پہنچاتے ہیں۔ علاوہ بریں یہ لوگ امیروں کی غیر فطری زندگی کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ بیزار ہو کر مر نہیں جاتے بلکہ حسن و عشق کی دنیا میں اپنی روح کو تلاش کرنے کا دلچسپ مشغلہ اختیار کرتے ہیں۔ امیروں کو آرٹ یہ تلقین کرتا ہے کہ انسان نیکی کے لیے نہیں بلکہ حسن پرستی یعنی عیاشی کے لیے زندہ ہے۔ امیروں کے زیر سایہ جو غریب رہتے ہیں وہ بھی ان مکروہ جذبات سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جن کی ترجمانی آرٹ کر رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں میں وطن پرستی اور اوباشی کے اثرات سرعت سے پھیلتے جاتے ہیں۔ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے زمانے کے آرٹ کا وہی حشر ہوا جو ایک عشوہ فروش ہرجائی کا ہوتا ہے۔ آرٹسٹ فصاحت و بلاغت، عبارت آرائی اور رنگین بیانی میں اپنی ضمیر فروشی اور نفس پروری کو چھپاتا ہے، طوائف روغن و غازہ سے اپنی بدصورتی پر پردہ ڈالتی ہے۔ غرض کہ ہمارے زمانے اور ہمارے طبقے کے آرٹ اور کسی کسبی میں ذرا فرق نہیں۔ یہ تشبیہ لفظ بہ لفظ صحیح ہے آرٹ اتنا ہی خود فروش، سیاہ باطن اور فریب کار ہے۔"

یہ باتیں ہندوستان کے قدیم اور جدید ادب کے لیے زیادہ سچائی کے ساتھ کہی جا سکتی ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی ادیب اور فن کار ہرزہ سرائی کرتے رہے ہیں لیکن ہم دیکھیں گے کہ ہمارے ادب کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ رہی ہے۔ زمانۂ حال کا سحر طراز ادیب رومن رولاں ادب کے اس رویے کے خلاف احتجاج کرتا ہوا کہتا ہے :-

"پچھلی صدی کے ادیبوں اور فن کاروں نے سماج کے ضمیر کو سلا دیا ہے۔ سماج کی ذمے داری سے بچنے کے لیے انھوں نے لوگوں کو نئے نئے بہانے سکھا دیے ہیں اور حقیقت سے بچنے کے لیے نئے نئے بت خانے کھڑے کیے ہیں۔ ان کی تاویلوں کے بعد ہر شخص کے لیے یہ کہنے کی گنجائش پیدا ہو گئی ہے کہ سماج کے مظالم اور ستم خیزیوں کے لیے میں ہرگز ذمے دار نہیں ہوں!"

آج ادیبوں کی حالت کیا ہے جو بیشہ ور ہیں وہ فلم کمپنیوں، جاہل کتب فروشوں اور تن آسان ناظروں کے ہاتھ خود کو بیچ رہے ہیں جو شوقیہ لکھتے ہیں وہ نہ زندگی سمجھتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ وہ زندگی کھیتوں اور کارخانوں میں ہے نہ کہ آرام کرسیوں اور آراستہ ایوانوں میں۔ پھر جب کبھی ان سے کہا جاتا ہے کہ تمھارے فرائض و مقاصد کم از کم ایک معمولی انسان جیسے تو ہیں انھیں ان ناخوش گوار حالات کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے تو یہ بندگانِ خدا "ادب برائے ادب" کی دہائی دینے لگتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے لیے زندہ ہیں، ٹوپیوں اور جوتیوں کی طرح بازار کی ضرورت کے لحاظ سے کتابیں لکھتے ہوئے اور مشاعروں کی تحسین و آفریں اور امیروں کے مہر و کرم کے خیال سے تک بندی کرتے ہوئے بھی یہ لوگ بے باکی سے کہتے ہیں کہ آرٹ صرف انفرادی آزادی کی فضا میں پنپ سکتا ہے۔ انھیں مخاطب کر کے "لینن" اپنے اخبار "نوازیجن" میں ایک جگہ لکھتا ہے :-

"ہم ادب کو کامل طور پر آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ صرف سیاسی بندشوں سے ہی نہیں بلکہ دولت اور خود غرضی کی پابندیوں سے بھی اسے آزاد کر دیں گے۔ یہی نہیں بلکہ ہم اسے سرمایہ دارانہ انفرادیت کا خادم کبھی نہ رہنے دیں گے۔ یہ آخری الفاظ ناظرین کو متضاد معلوم ہوں گے۔ ممکن ہے کہ کوئی "آزادی کا پرستار ادیب" چیخ اٹھے کہ تم سماج کی چکی میں آرٹ کو پیسنا چاہتے ہو، تم اس تخلیقی صلاحیت کو معدوم کرنا چاہتے ہو جو مکمل انفرادی آزادی کی فضا میں ہی پروان چڑھ سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ لمبے چوڑے دعوے تمھاری منافقت کے ثبوت ہیں۔ جس

سماج کی بنیاد کمینہ زر پر رکھی گئی ہے، جہاں معدودے چند سیٹھ عیش اور مزدور فاقہ کشی کرتے ہیں، وہاں آزادی کا ذکر تک مضحکہ خیز ہے۔ میں مصنفوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ سرمایہ دار پبلشروں کے دست نگر نہیں ہیں؟ کیا وہ عیاش طبع ناظرین کے رہینِ احسان نہیں ہیں جو ننگی تصویروں کے دلدادہ ہیں۔ کیا اُن کی خاطر ادب برائے ادب، میں طوائفوں کا ذکر مسعود نہیں کرنا پڑتا؟ سماج میں رہتے ہوئے آپ سماج سے الگ نہیں ہو سکتے۔ کسی سرمایہ دار مصنف، آرٹسٹ اور ایکٹر کا دعویٰ آزادی اس کی جہالت کا پردہ ہے!"

صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثر قبول کر سکیں۔ اس کے لیے دل میں خدمتِ خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہیے کیوں کہ ادب پیغمبری کی طرح خودگزاری کا مقتضی ہے نہ کہ ملائیت کی طرح چتر دری۔ ماضی حال اور مستقبل کو سمجھنا ادب کے لیے ضروری ہے تاکہ اس کی دردمندی رائگاں نہ جائے اور وہ تاریخ کے اشاروں کو سمجھ سکے۔ پھر زندگی کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اس کی آگ میں تپا جائے اور اُس کے ہنگاموں میں حصہ لیا جائے۔ اس کی تگ و دو سے الگ رہ کر اس کے رموز کو سمجھنے کی کوشش ویسی ہی ہے جیسی ساحل پر کھڑے ہو کر دریا کی گہرائی کا اندازہ لگانا۔ اس صورت میں نہ ادیب زیادہ لوگوں کے احساسات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اپنی زبان اور پیام اُن تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ معیار بہت بلند اور مشکل ہوگا اس لیے کہ اب تک ادب پر اس جماعت کا قبضہ رہا ہے جو کسی راجہ کے مشہور درباری کی طرح ندی کی لہریں گننے کی تنخواہ لیا کرتا تھا۔

پوچھا جائے گا کہ ادبا و شعرا کون سی راہ اختیار کریں، اپنے تخیل اور تخلیق کی باگ کس طرف موڑیں کہ زندگی کی شاہراہ سے آملیں جس سے ہنوز وہ بہت دور رہے ہیں۔ روس کا مشہور مفکر پرنس کروپاٹکن، جواب میں کہتا ہے۔

"اگر تمھارے دل میں بنی نوع انسان کا درد ہے، تمھارے جذبات کا رباب اُن کے دُکھ سُکھ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا اور اگر ایک حساس انسان کی طرح تم زندگی کے پیغام سُن سکتے ہو۔ تو تم ہر قسم کے ظلم کے مخالف ہو جاؤ گے! جب کروڑوں آدمیوں کی فاقہ کشی پر غور کرو گے، جب تم میدانِ جنگ میں لاکھوں بے گناہوں کے لاشے تڑپتے دیکھو گے جب تمھارے بھائی بند قید و بند اور دار و رسن کے مصائب جھیلتے نظر آئیں گے اور جب تمھاری آنکھوں کے آگے دلیری کے مقابلے میں بزدلی اور نیکی کے مقابلے میں بدی فتح یاب ہوگی تو ادیبو! اور شاعرو! اگر تم انسان ہو تو ضرور آگے آؤ گے! تم ہرگز خاموش نہیں رہ سکتے، تم مظلوموں کی طرف داری کرو گے کیونکہ حق و صداقت کی حمایت ہر انسان کا فرض ہے"

ہر ایمان دار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ وہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے۔ اُسے رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت و مساوات کی حمایت کرنی چاہیے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریائے زندگی کو چھوٹے چھوٹے بچوں میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ کیا زمانۂ حال کا ادیب یہ کرے گا؟

اب تک وہ قدامت اور رجعت، خود پرستی اور ظلم پروری کا ساتھ دیتا رہا ہے جس کی مثالیں ہم نے مضمون کے دوسرے باب میں پیش کی ہیں۔ گو یہ تبصرہ مختصر ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ غور و فکر کے لیے تھوڑا سا سامان مہیا کرے گا۔

قدیم ادب ہند کا معاشی تجزیہ

پلاسی کی لڑائی سامنتی اور صنعتی تہذیبوں کی ٹکر تھی۔ اس کے بعد پورے ایک سو سال تک ہندوستانی سماج کا شیرازہ منتشر ہوتا رہا اور ۱۸۵۷ء کی آخری کشمکش کے بعد سامنتی تمدن نے ہتھیار ڈال دیے اور یہ معلوم ہو گیا کہ کرگھوں اور ہلوں کے دن گئے اور مشینوں کا زمانہ آگیا۔ تاہم جدید تمدن کا اثر ۱۸۵۷ء کے بعد زیادہ نمایاں ہوا جس کی گونج پہلے راجہ رام موہن رائے، بعد ازاں سرسید کی مغرب دوستی میں سنائی دی۔ ہندوستان کی زندگی میں انقلاب سا آگیا جس کی رو میں پرانی روشنی کے چراغ گل ہونے لگے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میں نے اسی اعتبار سے ادب ہند کے دو دور مقرر کیے ہیں کیوں کہ اس سے پہلے ہزاروں سال تک ہمارے سماج کی حالت یکساں رہی۔ پیداوار کے ذرائع ایک سے رہے اور تقسیم کے اصولوں میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ مقامی حالات میں عارضی طور پر خیرات یا قحط کی وجہ سے یونہی سی تبدیلی ہو جاتی تھی ورنہ وہی آسمان تھا اور وہی زمین۔

دنیا کے ہر گوشے میں سامنتی عہد طبقۂ امرا کے رزم اور بزم کے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ اس کی پوری زندگی خون آشامیوں یا رنگ رلیوں میں گزر جاتی ہے۔ ہند قدیم کی تہذیب عوام اور امرا (مذہبی اعتبار سے کہیے دو طبقوں میں بٹی) اور علم و ادب کو عموماً برہمنوں کا اجارہ قرار دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ کشتریوں اور ویشیوں میں بھی علم و فن کے چرچے ہونے لگتے ہیں، لیکن عوام الناس یعنی شودروں کو نہ انھیں حاصل کرنے کی فرصت ہے نہ اجازت۔ بیچارگی سے قناعت اور اس سے قسمت پرستی عبارت ہے اور پچھلے جنم کے ناکردہ گناہوں کے لیے شرمساری اور اگلے جنم کی کامرانیوں کا خیال ان میں رس بس جاتا ہے۔ پوری سنسکرت اور ہندی شاعری کو چھان ڈالیے، اساطیر اور افسانوں کا ورق ورق الٹ جائیے، شاذ و نادر ہی کہیں عوام کا ذکر آتا ہے اور وہ بھی نفرت و حقارت کے ساتھ۔ البتہ راجاؤں کو رعایا پروری اور عدل گستری کی تعلیم دی جاتی ہے کیوں کہ رعایا کی خوشنودی ہی قیام حکومت کی ضامن ہے۔ سنسکرت کے قواعد ادب اسے لازم قرار دیتے ہیں کہ ہر ادبی تصنیف دیوتاؤں کے علاوہ حکومت اور برہمن جماعت کی دعائے خیر کے ساتھ شروع ہو۔ برہمن کی خداداد برتری اور کشتریوں کے اختیار حکومت کو بار بار دہرایا جاتا اور ان سے سرکشی کرنے والوں کو جہنمی اور لعنتی قرار دیا جاتا ہے۔ شودروں کو بار بار ٹوکا جاتا ہے کہ اونچی جاتیوں کی خدمت ان کا فرض منصبی اور دین و ایمان ہے۔ منیوں اور دیوتاؤں کی نگہ کرم ہمیشہ روح اور جسم کے خداوندوں کے لیے مخصوص ہے اور ہند کا ادب ان کی مدح و ثنا سے لبریز ہے۔ شرنگار رس، اور شانت رس، سنسکرت شاعری پر چھائے ہوئے ہیں کیوں کہ ایک امیروں کے صنفی رجحان کو بڑھاتا اور دوسرا بوڑھوں کے احساس گناہ کو کم کرتا ہے۔ خود فریبی کا یہ عالم ہے کہ فضا ٹریجیڈی کے تذکرے تک کی متحمل نہیں اور اسے محض دشمن سمجھتی ہے۔ چنانچہ ہر سنسکرت ٹریجیڈی خواہ مخواہ کامیڈی میں منتقل کر دی جاتی ہے۔

اس سماج کا یہ طبقہ کس حد تک عیش و طرب میں ڈوبا ہوا بزم کی رنگینیوں کی داد دے رہا تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس زمانے کے ادب کو دیکھیے۔ اکثر سنسکرت افسانے مثلاً "دش کمار چرتر" بیتال پنچ شت (بیتال پچیسی) اور مرچھ کٹکا (مٹی کی گاڑی) وغیرہ ڈرامے بداخلاقی، اوباشی اور قابل نفرت جنسی فساد سے بھرے پڑے ہیں۔ شاعر اور ادیب انھیں یوں مزے لے لے کر بیان کرتا ہے گویا زندگی کے فرائض یہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ عشقیہ شاعری کے لیے جو ہم معنی لفظ "شرنگار" ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ محبت اور بوالہوسی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ ہندی اصناف سخن میں نائیکہ بھید اور نکھ شکھ ورن یعنی اقسام معشوق کی شرح اور معشوقہ کے سراپا کو جو مرتبہ و مقبولیت حاصل ہے وہ اس کی شہوت پرست ذہنیت کا پرتو ہے۔ نائیکہ بھید میں جس تجسس اور انہماک سے صرف کنواری ہی نہیں بلکہ شادی

شدہ عورتوں کی بدکاریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس فضا کا اخلاقی معیار کیا تھا۔ شعر و ادب اس فضا کے لیے قوت باہ کی گولیوں کا کام انجام دیتے تھے۔ اس زمانے میں طبقۂ امرا کی حالت کیا تھی اس کا اندازہ لگانے کے لیے مہابھارت کے کچھ واقعات پر غور کرنا دور از مبحث نہ ہوگا۔

جب ارجن نے کرشن جی کی بہن سبھدرا سے بیاہ کیا تو انھیں جہیز میں ایک ہزار حسین و جمیل دوشیزائیں دی گئیں! یودھشٹر نے جب راجسو یگیہ کیا تو انھیں راجاؤں نے ایک لاکھ حسینوں کے پارسل بھیجے کرشن جی کی سولہ ہزار گوپیوں کا قصہ ممکن ہے کہ مبالغہ ہو لیکن مہابھارت اور رگھا گوت میں ایسے صدہا واقعات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے حرم میں ہزار ہا عورتیں رہتی تھیں۔ یہی نہیں یودھشٹر نے دھرم راج میں اٹھاسی ہزار طلبہ کی ضروریات حکومت کی طرف سے مہیا کی جاتی تھیں اور ان میں سے ایک اہم جنس یہ تھی کہ ہر طالب العلم کی خدمت کے لیے تیس دوشیزائیں مقرر تھیں۔ لطف یہ ہے کہ مہابھارت کا مصنف کہیں اشارتاً بھی اس شہوانی گرم بازاری کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا۔ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ عہد قدیم اس قسم کی بزم آفرینیوں سے جگمگا رہا ہے!
اس زمانے کے لوگ تاریخ نویسی سے بے بہرہ تھے۔ شعر و ادب میں ہی راوی نے چٹخارے بھر بھر کر یہ کہانیاں سنائی ہیں۔ یہ اس زمانے کی زندگی کا بزمیہ پہلو اور عشقیہ شاعری میں اس کا عکس ہے۔ اب ششو پال ودھ، رامائن وغیرہ رزمیہ نظموں کو دیکھیے۔ قتل و غارت گری کا کوئی اثر قسم کھانے کے لیے شاعر پر نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ والمیک اور تلسی داس تک لنکا کی تباہی اور لاکھوں انسانوں کے تہ تیغ ہونے پر اظہار تاسف نہیں کر سکے بلکہ بیواؤں کی آہ اور یتیموں کی فریاد پر یہ لوگ خندہ زن ہیں!

ملک کی آبادی کا پچانوے فی صدی حصہ کسانوں پر مشتمل ہے لیکن میں نے آج تک کسی قدیم سنسکرت یا ہندی تصنیف میں ان کے حالات نہیں دیکھے۔ جا بجا درندوں اور پرندوں کے رنج و راحت کا حال ہے، لیکن کسانوں کا نام تک کہیں نہ ملے گا۔ کبھی کوئی نیک طینت وزیر راجا کے آگے "پرجا" کی تکالیف کا دکھڑا روتا ہے یا کوئی راجا خیرات کرتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ اس ملک میں 'رعایا' نام کی بھی کوئی چیز تھی۔ ورنہ منیوں، راجاؤں، بنیوں اور حسینوں کے تذکرے اس کثرت سے ملیں گے کہ یقین سا ہو جاتا ہے کہ اس جنت نشاں میں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا تھا! طبقاتی احساس کی یہ شدت ہے کہ ڈراما میں سنسکرت کا استعمال صرف اونچے طبقے کے لوگوں کے لیے اور وہ بھی مردوں کے لیے مخصوص ہے۔

کالیداس اس عہد کا مایۂ ناز ادیب اور شاعر ہے۔ اس کی سحر طرازی اور جادو بیانی کا لوہا مشرق و مغرب میں سب نے مانا ہے۔ منظر کشی اور تصویر نگاری میں وہ اپنا مقابل نہیں رکھتا۔ ایشیا کے شاعروں پر بجا طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا بیانیہ کلام تناسب سے دور ہوتا ہے۔ ایک کالیداس ہے جس کا ایک ایک لفظ نگینے کی طرح جہاں جم گیا وہاں سے اٹھ نہیں سکتا۔ کالیداس کی یہ حیثیت ہمیشہ قائم رہے گی، لیکن ماحول کا جیسا اثر جذبات پر پڑتا ہے اس کی سبق آموز مثال یہی شاعر بے ہمتا ہے۔ اس کے آگے انسانیت کا مقصد اگر کچھ ہے تو محض یہ کہ نیک دیوتاؤں، رحم دل راجاؤں اور ہٹ دھرم رشیوں کی پوجا کرے۔ 'شکنتلا' میں جا بجا برہمنوں کی عظمت کا اعلان کیا گیا ہے۔ 'رگھو ونش' میں رام چندر جی کے اجداد کی فوج کشی اور بزم آرائی کا ذکر ہے۔ قدرت کے استبداد اور سماج کے مظالم کے خلاف وہ بھی کچھ نہیں کہتا اور اس کے کردار ایک ہی طبقے میں رہتے اور ایک ہی ماحول میں پرورش پاتے ہیں۔

'ویدک' عہد میں آرام و آسائش کے سامان کم تھے اس لیے اس زمانے کی شاعری بھی تصنع سے پاک ہے۔ رفتہ رفتہ

جاہ وحشمت کے طلسم کھڑے ہوتے اور عیش وطرب کے نئے نئے سامان مہیا کیے جاتے ہیں۔ادب وشعر اس عروج یا زوال کی جو تصویر کھینچتے ہیں اس میں معنیٰ آفرینی کی جگہ ندرت بیان اور لفظی بندشیں لے لیتی ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ علم بیان ومعانی کے لیے سنسکرت میں 'النکار' کا لفظ ہے جو 'زیور' کا ہم معنی ہے۔عبارت آرائی ورنگین بیانی کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ ادب آخر میں پہیلیاں بجھوانے لگتا ہے۔چنانچہ 'بان بھٹ' کا کمال یہ ہے کہ الفاظ کو یوں ترکیب دیتا ہے کہ ایک ایک لفظ ۲۶-۲۶ سطروں تک پھیل جاتا ہے اور تشبیہہ واستعارے کے بیان میں اتنی بلند پروازی کرتا ہے کہ مطالب چیستاں بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایک خاص صنف سخن 'بھرم جیندا' ہے جس کی مثال مہابھارت اور سورداس وغیرہ کے ہندی کلام میں ملے گی۔اب تک سخن سنجوں میں یہ بحث ہوتی ہے کہ ان سے شاعری کی مراد کیا ہے۔ غرض ایسے لفظی تکلفات سے وہ تمام شاعری بھری پڑی ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔شاعر کے مشاہدات اور احساسات اسے آگے بڑھنے کی اجازت کیوں کر دیتے۔ایک خاص بات یہ ہے کہ اس زمانے میں شاعر روح اور جسم میں کوئی امتیاز نہیں کرسکتا اور نہ 'دوئی' کے پردے کو چاک کرنے کی سعی رائیگاں میں وقت گنواتا ہے۔ وہ اس زندگی اور اس کی لذتوں کے لیے زندہ ہے اور اسی وجہ سے 'بھرتھری' جیسے دو چار بیراگیوں کو چھوڑ کر حزنیاتی رنگ کم ملے گا اور تصوف کا تو کوسوں پتہ نہیں ہے!

'پنچ تنتر' 'ہتو پدیش' اور 'مدرا راکشش' وغیرہ میں ہمارے لیے ایک جہان عبرت پنہاں ہے کیوں کہ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے طبقۂ امرا اور علمائے سو کا اخلاق کتنا پست اور انسانیت سوز تھا۔ مگر افسوس تو اس پر ہوتا ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے اپنے ذمے یہ خدمت لے لی تھی کہ ان بدعنوانیوں کو ایسی ساحرانہ رنگ آمیزی سے بیان کریں کہ دیکھنے والا نفریں کے بدلے آفریں کہے اور کفِ حسرت ملے کہ ہم ان محفلوں میں کیوں نہ شریک ہوسکے!

مسلمانوں کی فتوحات کے بعد ہندو سماج کی ذہنیت جس طرح بدلی اس کے دور بیں اثرات ہندی شاعری میں موجود ہیں۔ ایک تو رزمیہ اور جوشیلی نظموں کی مقبولیت۔ 'پرتھوی راج راسو' 'ہمیر راسو' اور 'آلہا اودل' وغیرہ اس زمانے کی نظمیں ہیں۔ بعد میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں جب ہندوؤں کے حصہ منہ بۂ قومیت میں ہیجان پیدا ہوا تو 'شیواجی' اور درگا داس جیسے سورماؤں کے ساتھ 'بھوشن' اور 'رام داس' جیسے شاعر بھی پیدا ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں بڑا اشتعال پھیلایا۔ پچھلے دنوں جب ملک میں ہندو مسلم فسادکی آندھی امنڈی تھی تو یہ دونوں فرقہ پرست شاعر قبر میں کروٹ بدلنے لگے تھے۔

ہندو مذہبی پیشواؤں کے آگے یہ مسئلہ بھی پیش تھا کہ اسلام کے نرغے سے ہندو عوام کو کس طرح بچایا جائے جو برہمنوں اور پنڈتوں کی دست برد سے عاجز تھے۔ اس صد وجہد کا اظہار شاعری میں بھگت شاعروں نے کیا۔ انھوں نے روزمرہ کی زبان میں بتایا کہ سارے فساد مذہبی دلالوں کی وجہ سے شروع ہوتے ہیں اور بھگوان کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔کبیر داس ہندوستانی جنتا MASSES کا پہلا اور سب سے بڑا شاعر تھا جس نے امیروں اور پنڈتوں سے بے نیاز ہو کر عوام میں خود داری اور خود احساسی کے جذبات پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی کیوں کہ وہ اور اس کے معاصرین امیروں کی نہیں بلکہ غریبوں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں' اس لیے ان کا کلام ہر طرح کے تملّقوں سے پاک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گوشہ نشین اور سادھو منش ہونے کی وجہ سے یہ شعرا موت کو زندگی پر ترجیح دیتے اور لوگوں کو زندگی کی تگ ودو سے الگ رہنے اور جسمانی تفکرات سے بے پروا رہنے کی نصیحت کرتے ہیں۔چنانچہ کبیر داس ایک جگہ مارٹن لوتھر سے ہم نوا ہو کر کہتا ہے کہ پرچار اجابن جائے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا؟ روحانی تسکین کے لیے وہ جسمانی تسکین کو ضروری نہیں سمجھتا۔

عشقیہ شاعری کا عنصر ہندو ادب پر اب بھی اتنا ہی غالب ہے جتنا عہد قدیم میں۔ بنگال میں 'چندی داس' بہار میں

ودیا پتی اور برج بھاشا میں بہاری، دیو، متی رام وغیرہ سماج کی اس بے حرکتی اور بے حسی کے نقاش ہیں جو مسلمانوں کے آنے اور یہاں جم جانے کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ پھر بھی ان میں سے اکثر فطرت اور عوام کے قریب رہتے ہیں، اردو شاعروں کی طرح نوابوں اور معشوقوں کے در پر نہیں پڑے رہتے لہٰذا ان کا عشق ایسا بیہودہ نہیں جیسا ان کے مسلمان متاخرین کا۔ تاہم کوئی نصب العین اور مسلک نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ بھی کرشن اور گوپیوں کے تذکرے سے آگے نہیں بڑھتے جس سے ان کا محدود زاویۂ نگاہ ظاہر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر 'کرشن جی' پیدا نہ ہوتے تو شاید قدیم ہندی شاعری کا بڑا حصہ نہ لکھا جاتا۔ یہ ہندو طبقہ امرا کی ذہنیت کا اظہار ہے جسے بڑھاپے میں اپنے بچپن کے افسانے سننے میں لطف آتا ہے۔ رام اور کرشن کی فتوحات میں یہ لوگ ظالموں کی شکست کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

اردو ادب کے دور قدیم پر کچھ کہنے سے پہلے دو تین باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اردو ادب کا پیش منظر ایرانی ہے۔ عروض، بیان، معانی، تشبیہ و استعارات اور اساطیر ہی نہیں تقریباً تمام اردو شعرا کی ذہنیت بھی غیر ملکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایرانی دس سال عرب میں رہنے کے بعد ہندوستان آیا اور یہاں کی زبان میں شاعری کرنے لگا۔ وجہ ظاہر ہے۔ مسلمان حکمراں طبقے اور عوام کے مابین ایک سد سکندری قائم تھی۔ حضرات شعرا میں سے کم ایسے ہوئے ہیں جو دیہاتوں اور جنگل پہاڑوں کی سیر کر چکے ہوں۔ شہروں میں اور وہ بھی محبوب کی گلیوں اور نوابوں کے آستانوں میں ان کی عمریں گزر جاتی ہیں۔ 'درد' اور 'نظیر' جیسے شاعر کم ہوئے کہ جنھوں نے شاعری کو اپنا پیشہ نہ بنالیا ہو۔ جب شاعری ایک جنس سمجھ لی جائے تو اُسے بازار کے خرید و فروخت کے اصولوں کے ماتحت رہنا پڑتا ہے اور چونکہ اس کے خریدار صرف دولت مند ہوتے ہیں لہٰذا ان کے ذوق و طبیعت کا پاس لازمی ہے ورنہ میر تقی میر کی سی حالت ہو جاتی ہے۔ اب درد جیسے صوفیوں کو دیکھیے کہ دنیا سے الگ رہتے اور نظم میں عبادت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ حیات بعد الموت کے مسائل کے لیے ان کی راہبانہ شاعری مفید ہو۔ جہاں تک اس زندگی اور اس کے ارتقا کا سوال ہے، اس قسم کی شاعری 'کرم' اور 'قسمت' کے اصولوں کی طرح عوام کے لیے مضر اور جوشِ عمل کے حق میں نشہ آور ہے۔

اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ قصائد پر مشتمل ہے جن پر کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ قصیدہ خواں شاعر ایک ایسا مصاحب ہے جو مقفیٰ تک بندی کر لیتا ہے۔ غزل گوئی میں اظہار واردات کا دائرہ اتنا محدود ہو جاتا ہے اور قافیہ و ردیف کے ساتھ کیفیت کی یک رنگی کا وہ عالم ہوتا ہے جیسے کوئی مشین ایک رفتار سے ایک سی آواز کرتی چلی جا رہی ہے۔ اس صدی میں غزل گوئی کا زوال اور نظم کی اٹھان کا براہ راست تعلق ہماری معاشرت کے تغیر سے ہے۔ اب ان متمول اور متوسط طبقوں کے ماحول کو دیکھیے جس میں لوگ روز ایک ہی طرح کے کام کرتے ہیں۔ ان کے مشاغل اور دلچسپیوں میں کبھی فرق نہیں آتا تھا۔ آمد و رفت کے ذرائع کم ہونے کی وجہ سے سفر کی نوبت بھی کم آتی تھی۔ نہ اخبارات شائع ہوتے تھے اور نہ خطوط آسانی سے آجا سکتے تھے تاکہ باہر کے حالات معلوم ہو سکیں۔ اس بے رنگ و بو زندگی کی جھلک غزل کی مقبولیت کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ معشوق سے ہم کلام ہونا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ عرش آشیاں تھا یا فرش نشیں۔ اردو شاعر کا سب سے اہم فریضہ تھا! بجز مثنوی اور مرثیے کے دوسرے اصناف سخن کی زبوں حالی اس طبقے کی کم فہمی اور محدود خیالی کی دلیل اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے کی اردو شاعری امیروں کی تفریح کے سوا کوئی کام انجام نہ دے سکی۔ اس میں دو رجحانات زیادہ واضح ہیں۔ ایک تو معشوق حقیقی سے خطاب اور جسم کی قید سے آزادی کے لیے روح کی بے کلی۔ یہ صوفیوں کی ترجمانی ہے جو نام نہاد مسلمان امرا کی عیش کوشی اور منافقت سے تنگ آ کر دنیا سے بیزار ہو گئے اور ایک جہانِ نو

کی طرح ڈالنے۔ غربت اور افلاس کی وجہ سے جن شاعروں کی پہنچ محفل جاناں میں نہ ہو سکتی تھی انھیں بھی اچھا بہانہ ہاتھ آیا اور وہ جمال باری کے آئینے میں جلوۂ یار دیکھنے لگے۔

فتح ہند کے بعد ہی مسلمان امرا اور علما میں تنازع شروع ہو گیا تھا۔ مذہبی جماعت امور سلطنت میں دست اندازی کی متواتر کوشش کرتی رہی جس میں اسے سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ مولویوں نے رئیسوں کو احتساب کی تلقین کی بلکہ کئی مرتبہ مے خانوں پر پہرے بھی لگا دیے جس کی وجہ سے عیش پسند اور رند مشرب ان سے سخت ناراض رہنے لگے۔ چنانچہ فارسی اور اردو شاعری میں عام طور پر محتسب، زاہد اور شیخ کی جس بری طرح خبر لی گئی ہے شاید بولشیوک شاعروں نے سرمایہ داروں اور معشوقوں کو بھی اتنا نکو بنایا ہوگا۔ دراصل یہ اس ماحول کی رندانہ ادر احتساب و شریعت کی پابندی سے بیزاری کا اظہار ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ عہد وسطیٰ میں عموماً اور اورنگ زیب کے بعد خصوصاً مسلمانوں کے زوال کے ساتھ سماج میں ایسی ابتری پھیل گئی جس کی مثال نہیں ملتی۔ دلّی اجڑنے لگی اور لکھنؤ کی چمن بندی شروع ہوئی۔ نادر شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں نے دلی کو جیسا خستہ و خراب کیا اس کا اضمحلالی اثر میر، درد اور دلی اسکول کے دوسرے شاعروں پر کم و بیش نمایاں ہے۔ لکھنؤ کی خوش حالی اور خوش باشی کا اثر وہاں کے شاعروں پر جیسا کچھ پڑا اس کے آئینہ دار امانت، رشک، رند اور جان صاحب وغیرہ ہیں۔ آتش ان سے کسی قدر الگ ہے کیوں کہ دوسرے لکھنوی شاعروں سے اس کی زندگی مختلف ہے۔

تمام ہندوستانی شعرا زندگی سے کتنے بے خبر اور بے پروا تھے، ان کے جذبات کتنے اوچھے اور احساسات کتنے بے حقیقت تھے اس کا اندازہ لگانے کے لیے چشم عبرت کی ضرورت ہے۔ پلاسی کی لڑائی کتنا بڑا قومی سانحہ تھا، پانی پت کی تیسری لڑائی ہند و طاقت کے لیے پیام موت تھی، ٹیپو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے تنزل کا اعلان تھا اور ان سب سے اہم ۱۸۵۷ء کا سانحہ تو ہندوستانی سماج کی بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ کتنے شاعروں نے ان خوں چکاں واقعات کو نظم کیا؟ کتنے نوحے لکھے گئے؟ کہاں تھے وہ رجز گو، مرثیہ خواں جن کی جادو بیانی سے محرم کی ہر محفل ماتم کدہ بن جاتی تھی؟ کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی[1] پر ایک نوحہ نہ لکھا۔ واقعہ ۱۸۵۷ء پر داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھیے اور سر پیٹ لیجیے کہ جب پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا، یہ حضرات اپنی رنڈیوں کے سوا کچھ نہ سوچ سکتے تھے اور سوچتے تھے تو ایسے بزدلانہ اور رجعت پروانہ طریقوں سے جو زندگی اور شاعری کے لیے باعث ننگ ہیں۔

اس ادب کی مثال امربیل سے دی جا سکتی ہے جو اسی درخت کو فنا کرتی ہے جس پر پرورش پاتی ہے۔ کیونکہ عہد قدیم کے تمام شاعر پیشہ ور تھے اور نوابوں اور راجاؤں کے منت کش تھے لہٰذا امیروں کے مفاد سے ان کا اثر پذیر ہونا لازمی تھا۔ ان کی خوشنودی کے لیے ان کی زبان میں بولنا بھی ضروری تھا اور بعد میں تو زبان دانوں کے معرکے بٹیروں کی پالی کی طرح عام ہو گئے۔ اردو زبان میں بال کی کھال جس طرح نکالی گئی شاید اس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہ ملے گی۔ معنی پر زبان کو ترجیح دینا، اس طبقے اور اس کے لگے لپٹوں کے جھوٹے نظریۂ

---

[1] گزشتہ صدی کے آخر میں جب بنگالیوں میں قومیت کا احساس پیدا ہونے لگا تو اس سانحے پر ان کے شیریں مقال شاعر نوین چندر سین نے ایک ولولہ انگیز نظم بعنوان "پلاسیر یودھ" لکھی۔ اسی طرح اس موضوع پر بنگال کے مشہور شاعر نذرالاسلام نے بھی ایک نظم قلم بند کی ہے واقعہ ۱۸۵۷ء پر منیر شکوہ آبادی کے کچھ کلام اور شاہ ظفر کی کچھ غزلوں کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔

زندگی کا ثبوت ہے جو نظامِ زندگی پر سانپ کی کینچلی کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر طالسطائی کے اس خیال سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ۔

"ہمارے سماج میں لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ اگر کوئی آرٹسٹ فکرِ معاش سے آزاد ہو جائے تو زیادہ بہتر کام کر سکتا ہے۔"

یہ خیال میرے اس دعوے کی پُر زور تائید کرتا ہے ہم جس چیز کو آرٹ سمجھتے ہیں وہ ہرگز آرٹ نہیں بلکہ اس کی پرچھائیں ہے!

آرٹ اور صنعت میں بڑا فرق ہے۔ آرٹ فنکار کے ہیجانات کو دوسروں تک منتقل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ہیجان اسی آدمی میں پیدا ہوگا جو ایک معمولی انسان کی طرح اپنی فطری زندگی کے ہر پہلو کو نشو و نما حاصل کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اگر فن کاروں کو مفت کی روٹیاں ملیں تو ان کی تخلیقی قوت برباد ہو جائے گی۔ کیوں کہ پھر قدرت اور سماج سے خود حفاظتی کے لیے وہ کیسے لڑیں گے اور ان معائب کو کیوں کر سمجھیں گے جن سے فکرِ معاش میں ہر فرد بشر کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح وہ سب سے اہم ہیجانات سے محروم رہ جاتے ہیں جو ہر آدمی میں کم و بیش موجود ہیں اور انفرادیت کے ارتقا کے لیے ناگزیر ہیں۔ آج ہمارے سماج میں آرٹسٹ جس عیش و اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے اس سے زیادہ مضر ماحول کسی فنی تخلیق کے لیے ہو نہیں سکتا۔

اُردو شاعروں میں درد اور نظیر جیسے معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ وظیفہ خوار تھے۔ درد دنیا سے بے گانہ اور میرؔ اپنی ناکامیوں کی وجہ سے زندگی سے بیزار! اس لحاظ سے دونوں زندگی کے لیے ضروری جذبات کے اظہار سے اجتناب برتتے ہیں! افسردگی، رہبانیت اور حزنیت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، بدنصیبی اور ناکامی کے گلے ہیں، حسرت و یاس کے افسانے ہیں۔ زندگی کی کشمکش سے الگ رہنے اور فطرت سے محظوظ نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان حضرات کو برائیوں کے سوا کہیں کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ چونکہ میں اظہارِ خدمات کو جذبات پر ترجیح نہیں دیتا اس لیے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر کہتا کیا ہے، "کیسے کہتا ہے" کا سوال بعد میں آتا ہے۔ نظیرؔ کے یہاں حسنِ بیان کی کمی اور عامیانہ جذبات کی زیادتی ضرور ہے جس کی وجہ اس کی آوارہ اور خانہ بدوش زندگی ہے، لیکن پورے اردو ادب میں وہی ایک ایسا شاعر ہے جو عوام کے ساتھ رہتا، انھیں سمجھتا اور اُن کے تاثرات کو انھیں کی زبان میں بیان کرتا ہے۔ اس زمانے کی زندگی کا معیار اتنا جاہلانہ تھا کہ ادیب سے زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر وہ اپنے زمانے کی صحیح تصویر پیش کر دے اور ساتھ ہی قلب میں جذبۂ دردمندی رکھتا ہو تو بہت ہے۔ اس لحاظ سے نظیر تلسی داس اور کبیر داس سے پیچھے ہے۔ تاہم وہ ایک عام شہری کی نظر سے دنیا کو دیکھتا اور اپنے آئینۂ زندگی میں وہ تمام خرابیاں دکھاتا ہے جو اسے نظر آتی ہیں۔ طور اور نجد کے تذکرے اُس کے کلام میں ناپید ہیں۔ وہ بوڑھوں، غریبوں اور فقیروں کے ساتھ رہتا اور انھیں قوتِ گویائی بخشتا ہے۔ افسوس کہ نظیر محنت کش نہ تھا ورنہ اس کا زاویۂ نگاہ بلند ہوتا۔ اپنی تمام برائیوں کے باوجود ہندوستان کے ادبِ قدیم میں اسے ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ کبیر عوام کا مصلح ہے تو نظیر ان کا یارِ غار ہے۔ کاش یہ دونوں فقیر نہ ہوتے۔!

چند صفحات میں ہزاروں سال کے ادب کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے اپنے تجزیے کے مطابق یہ اصول قائم کیا تھا کہ ادب جذبات کا اظہار ہے اور جذبات ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ اچھے جذبات اچھے ماحول کے محتاج ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ زندگی ارتقا بالضد DIALECTIES کے زینوں سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہے اور ادب اس وقت تک زندگی کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہم دوش نہ ہو۔ ادیب کا فرض ہے کہ ماضی کے عیوب سے حال کو باخبر کرے اور حال کی تصویریں کھینچ کر اس میں مستقبل کے لیے اشارات پنہاں ہوں۔ جب ہم نے اس روشنی میں ہندوستانی ادب کو دیکھا تو مایوسی اور شرمساری کے ساتھ ہم گورکی سے

ہم آہنگ ہو کر چیخ اٹھے کہ :

"ماضی کے بت کو پوجنے والے شاعر، حال کی برائیوں کو چھپانے والے ادیب، اور مستقبل پر تاریکی کا پردہ ڈالنے والے افسانہ نگار، رومت جاؤ ورنہ تاریخ تمہیں مٹا دے گی۔"

اردو شاعری کے عیوب کے لیے کئی اسباب ذمے دار تھے۔ ایک یہ کہ وہ اس زمانے میں پھولی پھلی جو مسلمانوں کی حکومت اور سامنتی تمدن کے زوال کا دور تھا جس طبقے نے اسے گود لیا وہ خود قعر مذلت میں پڑا ہوا تیزی سے بربادی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ پھر اس کی تربیت ایسے ہاتھوں سے ہوئی جنھوں نے نان بائی کی دکان کی طرح اسے اپنی روٹی کمانے کا وسیلہ بنا لیا۔ یہ تو تھا ہی ساتھ ساتھ ایک تنگ نظر سوسائٹی میں پرورش پاکر اس نے اپنے لیے عرصۂ حیات تنگ کر لیا۔ سماج کے دباؤ اور اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے شاعر بہت کم موضوعات پر لکھ سکتا تھا۔ ادب کا پودا آزادی کی ہوا میں ہی پروان چڑھے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ پردے کی بے جا سختی اور جنسی تشدد کی وجہ سے گھونٹے تغزل میں بینی کا پھندا سا پڑ گیا۔ اردو شاعری کی معشوقہ اگر ایسی کوئی چیز ہے تو ایک ہرجائی طوائف ہے اور سوچیے کہ اس سے کسی قسم کا لگاؤ شاعری کی نازک روح پہ کس قدر گراں ثابت ہوگا۔

اس تجزیے سے کسی کی تنقیص یا تضحیک مقصود نہیں۔ اس بحث کا ماحصل صرف یہ ہے کہ زندگی کی حفاظت اور ترقی کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اور کسی چیز کو اس پر فوقیت اور برتری نہیں دی جا سکتی۔ ادب زندگی سے عبارت ہے نہ کہ زندگی ادب سے۔ ادب کے نام پر جو چیز انسان کو زندگی سے بیزار ہونے کی تعلیم دیتی ہے انسان کو فوراً اس سے بیزار ہو جانا چاہیے۔ سچ پوچھا جائے تو اس دور کے تقریباً تمام آرٹسٹ ضائع ہوئے ہیں۔ اس وقت تک صحیح معنوں میں آرٹ کا ارتقا ہوا ہی نہیں۔ کالیداس، کبیر، نظیر اور غالب وغیرہ کے سوا شاید کوئی ایسا شاعر نہیں جسے مستقبل کا انسان عزت سے یاد کرے گا۔

ہندوستانی ادب کے دورِ جدید کا معاشی تجزیہ

ہندوستانی ادب کے دورِ جدید پر ہم زیادہ تفصیلی نظر ڈالیں گے کیوں کہ اس کا براہِ راست ہماری نسل سے تعلق ہے اور اس کی ترکیب و تدوین ہمارے ہاتھوں ہو رہی ہے۔

اشاروں اشاروں میں پہلے ہم یہ دکھلا چکے ہیں کہ سماج کی بنیاد افراد کے اقتصادی تعلقات پر منحصر ہے اور ان کے رشتۂ مادی کے اعتبار ہی سے کسی دور کی ذہنی و روحانی تحریکات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں، ادب اب تک تعلیم یافتہ طبقے کا اجارہ رہا ہے اور اس کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے اس طبقے کے رجحانات کو پہچاننا بے حد ضروری ہے۔ سچ پوچھو تو ہمارے ادب کے سرچشمے سے جو نئی نہریں کٹ رہی ہیں وہ دراصل متوسط طبقے کی حالت کا پتا دیتی اور اس ذہنی ردعمل کو ظاہر کرتی ہیں جو ایک طرف تو حرفتی اور سامنتی تمدن کی کش مکش اور دوسری طرف ہندوستانی قومیت یعنی دیسی حرفت اور غیر ملکی ملوکیت کے تصادم کی وجہ سے ان میں پیدا ہو گئی ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستانیوں کی ذہنیت میں سرعت سے ایک انقلاب ہو رہا کیونکہ انسان جب اپنے مادی حالات میں رد و بدل کے لیے مجبور ہوتا ہے تو ان کے قبول کرنے کے لیے دلیلیں بھی پیدا کر لیتا ہے۔ مسلمان حکمراں طبقہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے بے سر پیکار رہ کر انحطاط پذیر ہو چکا تھا اب اس کی پذیرائی کے لیے مجبور ہوا۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک درحقیقت نئی تہذیب کی فتح کا اعتراف تھی۔ پچاس سال پہلے راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں جو تحریک شروع کی تھی سرسید نے اب اس کی تجدید مسلمانوں میں کی

اور دونوں کا رد عمل قومی زندگی پر تقریباً ایک سا ہوا۔ جب نئی تہذیب کے نشے میں سرشار ہو کر ایک دو نسلیں بنگال میں نکل چکیں تو وہاں کے اکابر کو یکایک محسوس ہوا کہ انگریزی رومان ان کی زندگی میں زہر ڈال رہی ہے اور اس حالیہ ناسور پہلے سے موجود تھا جسے یہ مغربی نشتر اب اُبھار کر دکھا رہا تھا۔ ان لڑیوں میں ہندو اور تمیز کی وجہ سے آہستہ آہستہ ہندو مسلم کی تفریق بڑھتی گئی۔ ادھر زندگی کے نئے نظریوں نے قدامت کا قلع قمع شروع کیا اور ضرورت ہوئی کہ پرانی شراب نئی بوتلوں میں ڈھالی جائے اور اس پر جدت کی چٹیں چپکائی جائیں۔ فرقہ دارانہ تفریق کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں قومیں اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی اپنی معاشرت اور تاریخ کے تاریک پہلو کو چھپائیں، اپنے ماضی کو بڑھا چڑھا کر دکھائیں اور ساتھ ساتھ نئی روشنی کے حملوں سے بچنے کے لیے جدید کو اپنے مشقِ ستم کا ہدف اور 'قدیم' کو تمام خوبیوں کا منبع ثابت کریں۔

چلن اور لکھنئو کے ساتھ مسلمان متوسط طبقے نے طلسم ہوشربا اور اندر سبھا کا بانا بھی چھوڑا اور نئے خیالات کے اظہار کے لیے نئے پیرائے ڈھونڈے۔ انگریزی تعلیم کی مقبولیت نے ان کے آگے قدرت کے نئے مناظر پیش کیے اور سماج کے ساتھ ادب کو بھی پابندیوں سے آزاد کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ نظام حکومت کی تبدیلی نے اس طبقے کو مجبور کر دیا کہ تحفظِ حیات کے لیے اپنی ذہنیت کو مادی ضروریات کے لحاظ سے بدلے اور پھر اسے یکایک معلوم ہوا کہ جو بات تھا مذہب کا وہ نصب غلط ہے جو اسے حرفتی تمدن کے ساتھ چلنے سے روکتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے قبل از غدر کی رومانی اور داخلی ([illegible]) فضا سے نکل کر واقعاتی نقطۂ نگاہ پر آنا ضروری تھا اور اب ادب اور زندگی میں بے ربطی اس طبقے کے لیے مضرت رساں تھی۔ قعرِ مذلت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کے جگانے کے لیے بیانیہ اور خطیبانہ انداز اختیار کرنا ضروری تھا۔ نظم کا عروج اور غزل کا زوال خود فریبی پر خود تنقیدی، تصور پر عقل اور پابندی پر آزادی کی فتح یابی کا ہونا ہے۔ نئے جذبات اپنے لیے نئے اصناف تلاش کر لیتے ہیں۔ ادھر بنگال میں ٹیگور نے پیش پا افتادہ اور پامال بحروں کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نئی طرز کی طرح ڈالی۔ اس کوشش میں اسے عہد وسطیٰ کے وشنو شاعروں سے بڑی مدد ملی جو سماج کی پابندیوں کے ساتھ سنسکرت چھندوں کی قید سے بھی آزاد تھے اور اپنی تیز رفتاری کے لیے نئی راہیں تلاش کرتے تھے۔ ہندی پر ان دو تحریکوں کا گہرا اثر ہوا اور برج بھاشا کو چھوڑ کر لوگوں نے کھڑی بولی کو اپنایا جو میرے خیال میں سنسکرت آمیز اردو ہے۔ اسی طرح گجراتی اور مرہٹی میں بھی شاعری نے نیا رنگ روپ اختیار کیا۔ غرض زندگی کے ساتھ شاعری کا ظاہر بھی بدلا۔ اب یہ دیکھیے کہ زندگی کی مختلف النوع تبدیلیوں کے ساتھ ادب کے موضوعات اور رجحانات بھی کیسے بدل رہے ہیں۔

'سرشار' اور 'مولوی نذیر احمد' کے ناول سامنتی تمدن کی پستی کے دور کا نقشہ کھینچتے ہیں جو اب اتنی نمایاں تھی کہ چشم پوشی سے کام نہ چل سکتا تھا۔ یہ دونوں حضرات لکھنؤ اور دلی کی زندگی سے خوب آشنا تھے اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں شہر مسلمان حکمراں طبقے کے نقش آخر اور اب ان کے انتہائی تنزل کے آثار تھے۔ سجاد حسین کا اخبار ایک چھوٹے پیمانے پر وہی کر رہا تھا جو مولیر نے فرانس میں اور سروانٹس نے اسپین میں صدہا سال پہلے کیا تھا۔ یہ دونوں سامنتی تمدن کے دور انحطاط میں پیدا ہوتے اور اپنے طنز کے تیر دل سے اس کی زندگی ادھیڑ کر دیتے ہیں۔ سجاد حسین اور رتن ناتھ سرشار نے اپنی بساط کے مطابق یہی کیا۔

ادھر ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق نے ان میں فرقہ پرستی کے بیج بو دیے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ادب پر مردہ پرستی کی مہر لگ جائے اور دونوں قوموں کے اہلِ قلم ایک دوسرے پر چھینٹا زنی شروع کریں۔ ادب کی زندگی کا نیا دور انگریزی زبان کی رومانی تحریک سے متاثر تھا اور اس جذبۂ قومیت کے اظہار کے لیے رومانی ناول سب سے زیادہ مناسب تھے۔ چنانچہ بنگال میں بنکم چندر

اردو میں مولانا شرر اور مرہٹی میں آپٹے نے ناول نگاری کو نئے طریقے سے چمکایا۔ بنگال میں انگریزوں کے خلاف نسلی تعصب کے جذبات پھیل رہے تھے اور اس طرح بنکم چندر کے ناولوں میں مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے مظالم کی بھی داستان ہم پڑھتے ہیں۔ تعجب کا مقام ہے کہ اس زمانے کا یہ سرکاری عہدے دار اور خطاب یافتہ مصنف دل میں وہ ولولۂ قومی رکھتا تھا کہ اس کا ناول 'انند مٹھ' بنگال میں نراج ANARCHISM کا محرک اور اس کا گیت بندے ماترم قومی تحریک کا ترانہ بن گیا۔ شرر' اسلامی فتوحات کا قصہ گو ہے لیکن بنکم چندر کی تحریروں سے پیچ و تاب کھا کر 'منصور موہنا' جیسے ناولوں میں اپنے معاصر کی 'چنچل کماری' کا جواب دیتا ہے۔ شکر ہے کہ ادب کے سر سے یہ آسیب جلد اُتر گیا اور بعد میں صرف اخباری نظموں اور 'افسانہ' کے نام سے منسوب کی جانے والی چیزوں میں اس کا اثر باقی رہ گیا۔

حالی کی مسدس نے شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور ان کے ہم عصر اردو اور ہندی کے شاعروں نے اس قسم کی شاعری کو خیالات کی تبلیغ کے لیے بہت موزوں سمجھا۔ موجودہ دور کے ہندی شاعروں میں 'بابو میتھلی شرن گپتا' کا رتبہ بہت بلند ہے۔ مسدس سے متاثر ہو کر انھوں نے 'بھارت بھارتی' نامی نظم لکھی جو ہندی میں بے حد مقبول ہوئی۔ موضوع دونوں کا ایک ہے، دونوں کارنامۂ اسلاف سنا کر زمانۂ حال کی زبوں حالی کی تصویر کھینچتے اور اپنی اپنی قوم کو پیام عمل سناتے ہیں۔ مسدس جس کی نقالی ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں کی گئی، ادبی انقلاب اور قومی بیداری کی خبر دیتی ہے۔ اس کے چند سال بعد ہی انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آتی ہے اور کچھ عرصے بعد بنگال سودیشی تحریک شروع ہوتی ہے۔ یہ قومی اور سیاسی تحریکیں بیداری کے آثار ہیں۔ ان کے محرک اور مؤید ایک تو وہ لوگ تھے جو سیاسیات اور حکومت میں شرکت کے طالب تھے یا وہ لوگ جو قومی حقوق یعنی دیسی صنعت و حرفت کی توسیع کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ہندوؤں میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً قومی خودداری کا احساس بڑھتا جا رہا تھا اور سیاسی بیداری کے ساتھ ادب میں بھی جوش و ولولہ کے اثرات پیدا ہونے لگے تھے۔ گزشتہ صدی کے اواخر میں جب نیل کی کاشت کے انگریز اجارہ داروں کے مظالم حد سے تجاوز کر چکے تو ایک بنگالی مصنف کا ڈراما موسومہ 'نیل درپن' ہی تھا جس نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک احتجاج کا علم بلند کر دیا اور بالآخر حکومت کو ان شکایتوں کو رفع کرنا پڑا۔ 'نوبن چندر سین' نے پلاشیر جدہ (پلاسی کی لڑائی) کے عنوان سے ایک عدیم النظیر رزمیہ نظم لکھ کر اس خوں چکاں واقعے کی یاد دلائی اور مشہور ڈراماٹسٹ ڈی۔ ایل۔ رائے نے کئی قومی گیت لکھے جو آج بھی بنگالی بچے بچے کی زبان پر ہیں۔

نئی روشنی اور پرانی روشنی کا تنازعہ دراصل ہندوستانی سماج کی اس کش مکش کو ظاہر کرتا ہے جو مشینوں کے عروج اور دست کاری کے زوال کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ ہمارے تعلقات کی نوعیت بدل رہی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نظریۂ زندگی بھی بدل جائے۔ یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ مستقبل کی تاریکی انسان میں ماضی کی پرستش کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے چاہے وہ بذات خود کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ جس طرح بوڑھا عہد پیری میں اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے درآں حالیکہ یہ یاد بے سود ہے، اسی طرح جب کوئی تہذیب غارت ہوتی ہے تو اس کے نام لیوا زمانۂ قدیم کی مدح سرائی کی صورت میں اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں۔ روس میں سامنتی دور کے انحطاط اور سرمایہ داری کی اٹھان کے ساتھ 'طالسطائی' پیدا ہوتا ہے، انگلستان میں 'رسکن' اور 'کارلائیل' مشینوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، فرانس میں روسو، رجعت قہقری کی حمایت کرتا ہے۔ اس دور کے ہندوستانی ادیبوں میں بھی بڑی حد تک یہ ذہنیت کام کر رہی ہے۔ چونکہ ہندو اور اسلامی تمدنوں کا امتیاز متوسط طبقے میں رہتا آیا ہے اور یہی لوگ ہنوز قومی زندگی کے نگہبان اور علم و ادب کے پاسبان رہے ہیں، اس لیے اپنی اپنی روایتوں کے لحاظ سے یہ اس جذبۂ شکست کا اظہار کرتے ہیں۔ طالسطائی جس قسم کے نراج کی تبلیغ کرتا ہے

وہ ہندو تمدن کے عہدِ زریں کی تصویر ہے۔ عدم تشدد، رہبانیت، مشینوں کا ناس اور اس قسم کی چیزیں ہندو تمدن کے عناصر میں سے ہیں اور ان کے لیے قابلِ قبول ہیں۔ اسی وجہ سے 'طالسطائی' کے اصول، 'ٹیگور' کے ادب اور 'گاندھی جی' کی تحریکوں پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئے ہیں، حالانکہ میرے خیال میں 'ٹیگور' اس روسی ادیب سے قریب تر ہے۔ مسلمان ادبا بھی دورِ حرفت اور مشینوں سے منحرف ہیں ان کی برائیوں کا حل وہ اسلامی روایتوں کے مطابق تلاش کرتے ہیں۔ تاہم دورِ حرفت اور سائنس سے کلیتاً بغاوت اور ماضی کی پرستش اس دور کے ادب کی بڑی خصوصیتیں ہیں۔ 'اکبر الہ آبادی'، 'اقبال' اور 'ٹیگور' جابجا مغربیت کے خلاف مشرقی معاشرت کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ خصوصاً اکبر الہ آبادی کو ہر پرانی چیز اچھی اور ہر نئی چیز بری معلوم ہوتی ہے، لیکن چونکہ وہ کوئی مفکر نہیں اس لیے اپنے باقی دونوں معاصروں کی طرح موجودہ مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کر سکتے۔

ادبِ ہند کے موجودہ رجحانات کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر یہ دیکھ لیا چاہیے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے ملک میں کیسی کیسی تحریکیں بنتی اور بگڑتی رہی ہیں۔

دیسی سرمایہ داروں کی تحریک بنگال کی سودیشی تحریک سے شروع ہو کر ۲۲-۱۹۲۰ء کے عدم تعاون میں اپنے عروج کو پہنچتی اور پھر رفتہ رفتہ کمزور ہونے لگتی ہے اور گزشتہ سول نافرمانی کی تحریکوں کے بعد پرشکستہ ہو جاتی ہے۔ قومی تحریکوں کی وسعت کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کا صور پھونکا جاتا ہے اور ہندی اور اردو کو ملانے کی کوشش ہونے لگتی ہے۔ عربی فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کم کرنے کی سعی بھی کی جاتی ہے اور ہندی میں اردو اور اردو میں ہندی الفاظ مقبول ہونے لگتے ہیں۔ مسلمان متوسط طبقے پر چونکہ حجاز و شیراز کا رنگ چڑھا رہا ہے لہٰذا ان کی تہذیب میں بھی غیر ملکی عنصر پیدا پایا جاتا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ وطن پرستی کے نقطۂ نظر سے اردو نے جو سب سے بڑا شاعر پیدا کیا وہ کوئی مسلمان نہیں بلکہ ایک ہندو یعنی 'برج نارائن چکبست' آنجہانی تھے۔ ہندو متوسط طبقہ ان تحریکوں میں پیش پیش رہا ہے اور اسی لیے اس کا ادب زیادہ قوم پروانہ ہوتا جاتا ہے۔ ادھر قبل از جنگ اور دورانِ جنگ کی پان اسلامی تحریکیں اور ۲۲-۱۹۲۰ء کی تحریکِ خلافت سے اردو شاعری بے حد متاثر ہوتی ہے اور 'اقبال' کی سرکردگی میں اسلامی قومیت کے سپاہی اردو ادب پر چڑھ آتے ہیں۔ بایں ہمہ مسلمان نوجوانوں کا ایک طبقہ ملکی تحریکوں کا ہمدرد اور موئید ہے اور 'جوش ملیح آبادی'، 'سیماب اکبرآبادی'، اور 'ساغر نظامی' وغیرہ ان جذبات سے متاثر ہوئے ہیں۔ عدم تعاون کی ناکامی کے بعد ملک میں کئی سال تک جمود کی سی کیفیت رہتی ہے۔ نوجوانوں کا ایک طبقہ مستقبل سے ہراساں ہو کر یا تو انگریزوں پر بم پھینکنا چاہتا ہے یا طرب و نشاط میں اپنی کلفتوں کو بھول جانا چاہتا ہے۔ اس دور کی بعض ہنگامی تصنیفیں اور اردو اور ہندی شاعری کی رومانی تحریکیں اس جذبۂ شکست کو ظاہر کرتی ہیں۔ گاندھی جی کے عدم تشدد اور انقلاب پروروں کے نظریۂ تشدد میں تصادم ہو رہا ہے جس کا عکس ہم ایک طرف کناڑی کے مشہور شاعر 'اناگولا' اور گجرات کے سحر طراز قومی شاعر 'اردشیر جبروار' کی ستیاگرہی نظموں اور دوسری طرف شاعرِ انقلاب 'قاضی نذر الاسلام' کے ہنگامہ پرور کلام میں دیکھ سکتے ہیں۔ ۱۹۲۵ء کے بعد سے عوام کی خفتہ روح بھی جاگ رہی ہے اور مزدوروں اور کسانوں نے سیاسی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ متوسط طبقے کے کچھ لوگ ان کے حقوق اور مطالبات کی تائید کر رہے ہیں اور اسی طرح دورِ جدید کے ادب میں صرف یہی نہیں کہ ان کی حالت کیا ہے بلکہ کہیں کہیں یہ بھی دکھلانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ 'پنڈت دیوندر ستیارتھی' نے بہت بڑے پیمانے پر دیہاتی گیتوں کو جمع کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے۔ ادھر 'ٹیگور'، 'شرت چندر چٹرجی' اور 'پریم چند' ان برائیوں کا حل 'اصلاح' کو سمجھتے ہیں اور سرمایہ داروں اور زمینداروں سے رحم و کرم کی توقع رکھتے ہیں تاکہ وہ کسانوں اور مزدوروں کے

ساتھ ایک ہی گھاٹ پانی پی سکیں۔ کچھ عرصہ سے اشتراکیت اور انقلاب کی تحریکوں کی مقبولیت اور اصلاحی جد وجہد کی ناکامی نے ہر زبان میں ایسے ادیب پیدا کر دیے ہیں جو نظام معاشی کی صحت کے لیے سرمایہ داری کی تباہی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم مرہٹی کی چندر لوک (چاند کی دنیا) اور بنگلہ کی "شریک گان" (مزدوروں کا گیت مصنفہ منصور احمد) کے نام لے سکتے ہیں۔

بہر حال یہ تو ظاہر ہے کہ دور جدید کا ادب بڑی حد تک زندگی کا ترجمان ہے اور غزل جیسی داخلی صنف کا زوال اور نظم جیسی واقعاتی صنف کی مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کا ادیب جذبات و خیالات میں ارتباط قائم رکھنا اور ادب کے ذریعے زندگی کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ادب کے یہ نئے رجحانات زندگی کو منزل مقصود کی طرف لے جا رہے ہیں یا نہیں اور اگر ان میں کمی ہے تو وہ کس طرح دور ہو سکتی ہے۔ ہم اپنی سہولت کے لیے اس دور کے کچھ بڑے شاعروں اور ادیبوں پر زیادہ وضاحت سے نظر ڈالیں گے، اس اعتبار سے کہ یہ لوگ کن مختلف ادبی تحریکوں کے پیشوا ہیں۔

رجعت اور ٹیگور

حرفتی تہذیب پرانی بنیادوں کو تہ و بالا کر کے زندگی میں خلا پیدا کر دیتی ہے۔ خاندان کا شیرازہ منتشر ہوتا جاتا ہے، دیہاتوں کی خود اطمینانی ختم ہوتی اور شہروں کی ہنگامہ پروری ان پر حاوی ہوتی جاتی ہے۔ سرمایہ داری پرانے بندھنوں کو توڑ کر نئی راہوں کو بھی بند کر دیتی ہے۔ بچہ اگر بڑھ کر بالغ ہو گیا تو اس کی پوشش کے لیے نئے کپڑوں کی ضرورت ہے۔ پرانی تھگلیوں میں لپٹا گیا تو یا تو اس کا دم گھٹ جائے گا یا کپڑا پھٹ جائے گا، لیکن سادہ لوح والدین اس کش مکش سے گھبرا کر کپڑوں کی قید سے اسے آزاد کرنے کو ہی مصلحت وقت سمجھتے ہیں۔ یہی حالت ان مفکرین کی ہے جو راہ ترقی کی دشواریوں سے بچنے کے لیے رجعت کی کلہاڑی سے دنیا کے پیر کاٹنا چاہتے ہیں۔

طالسطائی پر تنقید کرتے ہوئے "لینن" ایک جگہ لکھتا ہے کہ:

> "اس کی قوت تخلیقی اور جدت طبع بظاہر سرمایہ داری کے مظالم پر نکتہ چینی کرتی ہے۔ حکومت کے استبداد اور عدالت کی انصاف کشی پر اس کا دل غم و غصے سے لبریز ہے۔ تہذیب کی فتوحات کے ساتھ جس طرح غریبوں کے خون سے دولت کے ایوان کھڑے ہوتے ہیں وہ ان سب کا جائزہ لیتا ہے، لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ بانگ دہل ہے جو یہ مجذوب تشدد کے مقابلے میں عدم تشدد کی حمایت میں بلند کرتا ہے۔ طالسطائی میں مظالم کے خلاف نفرت ہے۔ کسی روشن مستقبل کی تمنا ہے۔ "ماضی" کی پابندیوں سے آزاد ہونے کی جد وجہد ہے لیکن ساتھ ساتھ اس کا تصور ابھی خام ہے، شعور سیاسی کی کمی ہے اور تغیر پسندی سے جھجک ہے۔"

قبل از انقلاب فرانس اور روس کے ادبا اور مفکرین نظام زندگی کی بدعنوانیوں کی عقدہ کشائی کرتے رہے، لیکن جب کسی نے آگے بڑھ کر اس کے عملی سد باب کی تدبیر بتائی تو یہ حواس باختہ ہو کر تصوف اور روحانیت کے حجروں میں جا چھپے۔ ہندوستان میں بھی یہی ہو رہا ہے اور ٹیگور کو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں۔

شاعر سوال کرتا ہے کہ "کوی کی گاتھے" کی شنا ہے؟ شاعر تو کیا گائے گا کیا سنائے گا؟ اور خود ہی جواب دیتا ہے۔

> "دنیا میں جب سب لوگ برسر کار تھے، اکیلا تو آوارہ لڑکوں کی طرح بھاگ کر میدان میں آیا اور بھری دوپہر میں غم دیدہ درختوں کے سائے میں بیٹھ کر دن بھر بانسری بجاتا رہا۔ للہ اب تو اٹھ جا۔"

آگ کہاں لگی ہے؟ دنیا کو بیدار کرنے کے لیے کون صور پھونک رہا ہے۔ کس کی فریاد سے فضا گونج رہی ہے؟ کس قید خانے میں پابہ زنجیر دکھیاری مدد کی طلب گار ہے؟

لاتعداد بے بسوں کے سینوں کا خون توہین انسانی کو غسل دے رہا ہے۔ خود غرضی درد انسانی پر ہنس رہی ہے۔ وہ بے زبان جو سرنگوں کھڑا ہے، جس کے اترے ہوئے چہرے پر صدیوں کے مظالم کی داستان کندہ ہے، جو جیتے جی ہر قسم کے بار کو اٹھائے چلتا ہے اور پشت در پشت اس بار مصائب کو ورثے میں چھوڑ جاتا ہے۔ وہ قسمت کا گلہ گزار نہیں ہے، نہ دیوتاؤں کو کوستا ہے اور نہ انسان کی شکایت کرتا ہے جو کام کرنے کے لیے زندہ رہتا ہے اور زندہ رہنے کے لیے دو مٹھی اناج کے سوا کچھ نہیں چاہتا اور جب اس مایۂ حیات کو بھی کوئی چھین لیتا ہے، جب کوئی فرعون اس کے اثاثے پر بھی دست درازی کرتا ہے تو وہ بدبخت غریبوں کے خدا کو پکار کر جان دے دیتا ہے۔

اسی حسرت نصیب کو توت گویائی بخشتا ہے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دل میں اُمید کا دیا جلاتا ہے۔ اسے پکار کر کہتا ہے کہ چشم زدن کے لیے سربلند ہو جا اور پھر دیکھ کہ جس ظالم کے خوف سے تو لرزہ براندام ہے وہ تجھ سے کہیں زیادہ بزدل ہے۔ جیسے ہی تو جاگے وہ راہ فرار اختیار کرے گا۔ تیرے سامنے آتے ہی وہ راستے کے کتے کی طرح دم ہلانے لگے گا۔ خدا اس کا دشمن ہے، نہ بے یار و مددگار ہے اس کی چرب زبانی پر نہ جا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی ذات پر نادم ہے۔ اے شاعر! اگر تیرے دل میں ذرا بھی احساس ہے تو اسے اپنا ہم نوا بنا اور اپنی زندگی اس پر قربان کر۔ غم واندوہ کی انتہا نہیں اور اس سیاہ خانے کی تاریکی اور اس بدنصیبی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ روٹی، زندگی اور روشنی کی ضرورت ہے۔ صحت، غم اور آزادی سے دنیا کو مالا مال کرتا ہے۔ اے شاعر! افلاس کی طغیانی میں ایک مرتبہ جنت کے ہوش ربا نظاروں کے دروازے کھول دے۔" (ماخوذ از چترا)

سرمایہ دارانہ تمدن کے خلاف اپنی مشہور نظم "وسوندھر" زمین میں کہتا ہے:

"یہ حیا سوز خون کی پیاسی بربریت کسی دین دآئین کی قائل نہیں اور نہ کسی رسم و رواج کی پابند ہے۔ اسے فکر فردا ہے اور نہ فکر امروز۔ اس کی زندگی سمت و ساحل سے بے خبر ہو کر دیوانہ وار بھاگ رہی ہے۔ نہ وہ ماضی کی طرف دیکھتی ہے اور نہ مستقبل کی پروا کرتی ہے۔ "آج" کی موجوں پر آوارگی اور حباب آسا مسرتوں کو نچاتی ہوئی وہ اس بے حقیقت ناؤ کی طرح رواں ہے جو اپنا ہر بادباں کھوئے کسی بے سمت کی طرف جا رہی ہو۔"

لیکن بجائے اس کے کہ وہ ان تعلقات کی بربادی کا آرزومند ہو جو انسان کے لیے آتش زیر پا بن گئے ہیں وہ پیداوار کے تمام جدید ذرائع کو مٹا کر دور وحشت کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہے۔ "تہذیب سے خطاب" نامی نظم میں کہتا ہے:

"اے نئی تہذیب! مجھے وہ پرانے دشت و جبل لوٹا دے اور اپنے اس شہر کو واپس لے، پتھر اور لکڑی کے مقبرے کو واپس لے لے۔ اے انسانیت سوز تہذیب لئیم ایک بار پھر وہ عبادت گاہ مجھے لوٹا دے جس کا سایہ عاطفت نیکی کا گہوارہ تھا .... میں آزادی چاہتا ہوں، اپنے سینے میں بھڑکن کھوئے ہوئے جذبات کو جگہ دینا چاہتا ہوں اور تمام پابندیوں کو توڑ کر اپنے دل کو اس دنیا کا آئینہ بنانا چاہتا ہوں۔"

ٹیگور کا کوئی ادبی کارنامہ حال اور ماضی کے اس تنازع سے خالی نہیں ہے۔ زمانۂ حال سے اسے سخت نفرت ہے، مثلاً پیارا

تمدن کا وہ گلہ گزار ہے۔ یہ تمدن مادی مطالبات سے روح کو گراں بار ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کے وجود سے انسان کو بے پروا بنا رہا ہے۔ زندگی ابد تک وسیع کیا ہوتی بلکہ آج 'اور دائمی' کی ایک ساعت میں سمٹ رہی ہے۔ ٹیگور یہ خوب سمجھتا ہے کہ نظام معاشی کی افراتفری نے ہی یہ ستم برپا کیا ہے۔ روس کی سیاحت کے اثنا میں وہ پروفیسر پٹروف کو لکھ چکا ہے کہ روس کی اس ترقی کا راز یہ ہے کہ وہاں دولت پر کسی ایک طبقے کا نہیں بلکہ پورے سماج کا قبضہ ہے۔ تاہم اپنے ملک کے مسائل کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا سوا اس کے کہ لوگ جنگلوں اور پہاڑوں میں تصوف کی الجھنوں کو سلجھاتے رہیں۔ امید وبیم کے دو متضاد جذبات اس کے کلام میں جا بجا ملیں گے۔ انسانیت کے مستقبل پر اس کا ایمان ہے، لیکن تغیر کب اور کیسے ہوگا یہ وہ نہیں بتا سکتا۔ یہ رنگ عمر کے ساتھ زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے اور سونار تری (سنہری کشتی) میں جس نامعلوم منزل کا پتا دریافت کیا گیا تھا شاعر اپنے آخری مجموعے 'بلاکا' میں بھی اس کی تلاش میں سرگرداں ہے:

"جو دریائے زندگی میں اتر چکا وہ ساحل کی پروا کیوں کرے؟ کشتی کا آسرا کیوں ڈھونڈے؟ ناخدا کا احسان کیوں اٹھائے؟ اس کارواں کی کوئی منزلِ مقصود نہیں۔ نہ وہ کہیں ٹھہرتا ہے اور نہ کہیں آرام لیتا ہے۔ راہ میں کہیں دم بھر آرام لیے بغیر وہ اس راستے پر چلتا رہتا ہے جس کا اور چھور نہیں ملتا۔"

اس کی اکثر نظمیں اس فقدانِ مقصد کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً:

"انسان کی وہ آوازیں میرے کان میں گونج رہی ہیں جو کہرآلود ماضی سے نکل کر بعید از فہم ابد کی طرف کسی نامعلوم رستے سے سفر کرتی جا رہی ہیں اور اپنے دل میں اس آشیاں بدر پرندے کی فریاد سنتا ہوں جو لاتعداد پرندوں کے ساتھ اس دھوپ چھاؤں سے نکل کر معلوم نہیں کہاں سے کہاں جا رہا ہے۔ اس کا یہ نغمہ فضا کو مترنم کر دیتا ہے کہ یہاں نہیں، کہیں اور، کہیں اور، کسی دوسری جگہ۔"

راہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے شاعر کی جستجو ناکام رہ جاتی ہے اور وہ تصوف کے بکھیڑے میں الجھ کر انجام کار حزنیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی پچھلی نظموں میں سے اکثر موت، عدم، فنا اور پیری کا نوحہ سناتی ہیں۔ وہ ٹیگور جس نے بنگال کی سودیشی تحریک سے متاثر ہو کر لکھا تھا کہ "اگر تیری پکار سن کر کوئی نہیں آتا تو نہ سہی تو اکیلا ہی بڑھا چل"۔ جس کے ولولہ انگیز نغمے نے انقلاب پسندوں کو دار ورسن پر امید کا چراغ دکھلایا تھا۔ "اگر رات اندھیری ہے اور کوئی راستہ نہیں دکھاتا تو اپنے سینے کی ہڈیوں کو مشعل راہ بنا اور اکیلے ہی چلا چل"۔ اس کا جسم ہی نہیں روح بھی بوڑھی ہو چکی اور اس کا پچھلا مجموعۂ کلام اس کی بے راہ روی کا افسانہ ہے۔

گاہے گاہے ٹیگور ریفارمر کی صورت میں بھی نظر آتا ہے۔ "گورا" اور "مد کمدنی" نامی ناولوں میں سماج کی ناپاکیوں کو دکھانے کے بعد وہ تعلیم یافتہ طبقے سے انصاف اور اصلاح کی اپیل کرنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نظام میں بنیادی تبدیلیوں کے بغیر برائیاں دور ہوسکتی ہیں۔

غریبوں میں وہ نمک حلالی اور ایمان داری کے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے اور امیروں کو رحم دلی اور انصاف پروری کی تلقین کرتا ہے۔ اپنی ایک نظم "بوڑھا نوکر" میں اس ملازم کا تذکرہ رو رو کر کرتا ہے جو لاکھ تکلیفیں جھیل کر بھی اُف نہیں کرتا اور مالک کو خدا مانتا ہوا اس کی چوکھٹ پر مر جاتا ہے۔

بہرنوع جہاں تک استعمار کا سوال ہے "ٹیگور" اس کا مخالف ہے۔ بعد ازاں اس کے پیغام میں ثنویت — DUALISM پیدا ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ تمدن کو وہ سرمایہ دارانہ نظام کا نہیں بلکہ مشینوں کے رواج کا لازمی نتیجہ سمجھ کر اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

آگے چلوں یا پیچھے بھاگوں اور جب ملوکیت کو فنا کرنے کے لیے اس سے عملی تدبیریں دریافت کی جاتی ہیں تو وہ اصلاح، عدم تشدد اور تصوف کی تبلیغ کرنے لگتا ہے۔ تاہم ٹیگور کے کلام کا بڑا حصہ ادب جدید کے لیے قابل قبول ہے اور یہ خیال بڑی حد تک غلط ہے کہ وہ عمل کا دشمن ہے۔ ٹیگور ہر گام پر پیام عمل سناتا ہے اور اسی لحاظ سے اپنے معاصرین سے کہیں بلند اور قابل احترام ہے کہ اس کا پیغام کسی خاص دور یا مخصوص جماعت کے لیے نہیں ہے۔ اس کا نقطۂ نظر بین الاقوامی اور زمان و مکان سے بالاتر ہے۔

اکبر الٰہ آبادی مرحوم رجعت اور قدامت کے سب سے بڑے علم بردار گزرے ہیں اور ان کا طنز از ابتدا تا انتہا مغرب پرستی کے ماتم سے بھرا پڑا ہے۔ یہ ان بوڑھے والدین کے شاعر ہیں جن کا تمدن دیسی جوتے، پگڑی اور اچکن تک محدود ہے اور جن کا مذہب چھکڑوں پر چل سکتا ہے۔ ریل گاڑی سے اسے بُعد ہے! یہ سامنتی تمدن کا شدید احتجاج تھا جو طنزیہ تک بندی میں کفر کے فتوے صادر کر رہا تھا یہ کہنا لاحاصل ہے کہ یہ ادبی رجحان عام تھا جو نئی روشنی اور پرانی روشنی کے اس تنازع کا پرتو ہے جو اب بھی ہر ہندوستانی خصوصاً ہر مسلمان خاندان میں شد و مد کے ساتھ جاری ہے۔ سامنتی تمدن مغربیت کے نرغے سے نکلنے کے لیے نئی نئی ترکیبیں سوچتا ہے۔ کبھی وہ انگریزی تعلیم کا یک لخت مخالف ہو جاتا ہے اور کبھی ملازمتوں کے لالچ سے یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ مغرب سے اچھی اچھی چیزیں لے لی جائیں۔ چنانچہ ہمارے ادبا کا ایک گروہ اب اس حد تک صلح کرنے پر تیار ہے کہ مشرق و مغرب یعنی سامنتی اور حرفتی تہذیبوں میں میل کرا دیا جائے۔ اس لچر نظریے کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ ہنوز ہمارے ملک میں سامنتیت کے کھنڈر باقی ہیں اور صنعت و حرفت کو وہ فروغ نصیب نہیں ہوا جو ملوکیت سے آزاد ہو کر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ بہرحال، ٹیگور، اقبال، جوش اور اردو تیسرے درجے جیسے استعمار دشمن شاعروں نے بھی مشین، اور مشین کے مالک کے امتیاز کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور تقسیم کی بے عنوانی سے تنگ آ کر پیداوار کے ذرائع کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ جو غلطی سیاسی میدان میں گاندھی جی اور دوسرے سامنتی رہنما کر رہے ہیں، اس کا اعادہ دنیائے ادب کے یہ اکابر بھی کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان جذبات کی مقبولیت مادی اعتبار سے دنیا کو پیچھے لے جائے گی کیونکہ تہذیب کے مستقبل کا انحصار قدرت اور انسان کی جنگ کے نتیجے پر ہے۔ اس لیے یہ نظریہ انسان کی شکست اور پس پائی کا اعلان ہے۔

اقبال

اقبال کا نظریۂ زندگی بڑی حد تک اس تحریک سے متاثر ہے جس کے بانی جمال الدین افغانی تھے۔ مشرق نے مغربی استعمار کی چیرہ دستیوں کے خلاف جو احتجاج شروع کیا اور یورپ میں نیتشا، برگساں اور میزنی نے حرفتی تہذیب پر جو اعتراضات کیے اقبال ان سے بھی اثر پذیر ہوا۔ وہ اسلام کے نام پر ایک تصور عالم پیش کر رہا ہے اور اس کی رائے میں مسائل زندگی کا واحد حل یہ ہے کہ دنیا اس تصور کو عملی جامہ پہنائے۔ یہاں میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ اقبال فاسطیت کا ترجمان ہے اور یہ درحقیقت زمانۂ حال کی جدید سرمایہ داری NEO-CAPITALISM کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ فاشیزم پر کوئی جامع بحث اس مضمون کے احاطے سے باہر ہے لیکن اگر ضرورت ہوئی تو اپنے تجزیے کی تائید میں بعد ازاں ثبوت پیش کروں گا۔

سلطنت STATE بجائے خود کوئی منتہا نہیں بلکہ سماج کے تعلقات انسانی کی محافظت کا ایک آلہ ہے اور چونکہ ان تعلقات کا انحصار ذرائع پیداوار کی ملکیت پر ہے اور وہی طبقہ سماج میں برسر اقتدار رہتا ہے جس کے ہاتھ میں کلید ملکیت ہے لہٰذا سلطنت، تہی دست طبقے کی پامالی کے لیے 'طبقۂ غالب' کی انجمن کارساز ہے۔ ارتقائے انسانی کے لیے ضروری ہے کہ زمام سلطنت اس طبقے

کے ہاتھ میں رہے جو پیداوار کے ذرائع کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے یہ فائدہ ضرور پہنچایا کہ سامنتی سماج کی بنیاد کو فنا کر کے مشینوں کے رواج کو عام کر دیا۔ لیکن اس کی عمر طبیعی اسی روز ختم ہوگئی جب وہ پیداوار اور اس کی تقسیم میں ارتباط قایم نہ کر سکا۔ کیونکہ دور حرفت اجتماعی پیداوار کا زمانہ ہے اس لیے ضروری ہوگیا کہ پیداوار کے ذرائع پر چند لوگوں کی ملکیت نہ ہو بلکہ پورا سماج اس کا مالک اور منتظم ہو۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب وہ محنت کش طبقہ سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے جو اقتصادی قالب کو اس طریقے سے بدل سکتا ہے۔ سرمایہ داری انحطاط پذیر ہوتی جاتی ہے اور اپنے کو زندہ رکھنے کے لیے وہ نئے حیلے تراشتی اور نئے معاونین تلاش کرتی ہے۔

مشین نے معاشیات کو قوم و ملک کی حدود سے نکال کر بین الاقوامی بنا دیا ہے اور اب اس کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ قومی حکومت کی پابندیاں توڑ دی جائیں اور مالیات و سیاسیات میں امتزاج پیدا ہو جائے' لیکن وطنی سرمایہ داروں کی جماعتیں یوں خودکشی نہیں کر سکتیں۔ بین الاقوامیت کے چڑھتے ہوئے دریا کو روکنے کے لیے وہ نئی دیواریں باندھنے لگتے ہیں۔ وہ کہنے لگتے ہیں کہ ہمارا ملک یا ہماری قوم یا ہمارا مذہب یا ہماری نسل دنیا میں سب سے زیادہ افضل اور اکمل ہے۔ اطالیہ قدرت کی طرف سے دنیا کے نام ایک خاص پیغام لایا ہے! جاپانی برگزیدہ بندے ہیں، جرمن خدا کی بہترین مخلوق ہیں! وہ اپنا فرض اسی حالت میں ادا کر سکتے ہیں کہ آپس کی خانہ جنگیاں بند ہوں۔ رعایا کا ہر فرد عام اس سے کہ وہ سرمایہ دار ہے یا مزدور صرف ایک حاکم کا اطاعت گزار ہے۔ ہیگل اور اس کے جرمن متاخرین سلطنت کو اس تصور IDEA کی تعبیر بتاتے ہیں جس کے حصول کے لیے سماج ارتقا بالضد کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے۔ پارلیمنٹری نظام حکومت صرف اس حالت میں قابل قبول تھا جب تک مالیات میں عدم مداخلت کے اصول پر عمل ہو سکتا تھا' لیکن اب مزدوروں کی تحریک کو کچلنے اور ساتھ ساتھ سلطنت میں یک جہتی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جمہوریت کو فنا کر کے ڈکٹیٹری قایم کی جائے۔ ڈکٹیٹر ایک انسان برتر ہے جو ہر طبقے کے ساتھ انصاف کرتا ہے جو ہر قسم کے طبقاتی اور نسلی تعصب سے بالا ہے۔ وہ سرمایہ داری کی سرکوبی کرتا ہے اور مزدوروں کو 'انتہا پسندی' کی طرف نہیں جانے دیتا! پھر اس کا وطن دنیا کا پیشوا ہوگا' اس لیے وہ قومی اور وطنی تہذیب کا نگہبان بھی ہے! اشتراکیت میں وطنیت' قومیت اور روحانیت کے لیے جگہ نہیں ہے اور چونکہ متوسط طبقے کو ان چیزوں سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے اس لیے وہ ہمیشہ ان کی دہائی دیا کرتا ہے۔ اس طبقے کے نوجوان پر فاشیت حکومت کے پشت پناہ ہیں۔

اقبال ایک قوم کو ہی نہیں بلکہ اس قوم کے ایک خاص طبقے کو مخاطب کرتا ہے۔ یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے۔ تاریخ اسلام کا ماضی اسے بہت روشن اور شاندار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا دور فتوحات اسلام کے عروج کی دلیل ہے اور ان کا زوال یہ بتلاتا ہے کہ مسلمان اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اسلام کی ابتدائی فتوحات عرب ملوکیت کی فتوحات نہیں تھیں اور تاریخ کے کسی دور میں کبھی اسلامی تصور زندگی پر عمل کبھی ہوا تھا۔ بعد ازاں مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ قطعاً غیر اسلامی تھا۔ اور ممکن ہے کہ وہ روحانی اعتبار سے مسلمان ہوں' لیکن اسلام کے سماجی تصور سے انھیں کچھ زیادہ واسطہ نہ تھا۔ بہر حال وطنیت کا مخالف ہوتے ہوئے بھی' اقبال' قومیت کا اس طرح قائل ہے جس طرح' مسولینی۔ اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ ایک کے نزدیک قوم کا مفہوم نسلی ہے اور دوسرے کے نزدیک مذہبی۔ فاشستوں کی طرح وہ بھی جمہور کو حقیر سمجھتا ہے ۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانی نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

(جمہوریت از پیام مشرق)

فاشیزم اور اشتراکیت میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ جہاں اول الذکر عوام کی پیدائشی خرد بتاتا ہے، وہاں اشتراکیت ان کی کم فہمی کو ماحولی سمجھتی ہے اور بنا بریں اس ماحول کو بدلنے کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ فاشیزم کا ہم نوا ہو کر وہ اشتراکیت اور ملوکیت دونوں کی مخالفت کرتا ہے ؎

هردو را جاں ناصبور و ناشکیب — هردو یزداں ناشناس، آدم فریب
زندگی ایں را خروج، آں را خراج — در میانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
غرق دیدم هردو را در آب و گل — هردو را تن روشن و تاریک دل

(اشتراکیت و ملوکیت از جاوید نامہ)

ملوکیت و سرمایہ داری کا وہ اس حد تک دشمن ہے جس حد تک متوسط طبقے کا ایک آدمی ہو سکتا ہے۔ بندہ اور بندہ نواز کی تفریق بظاہر مٹ جائے اور محمود و ایاز ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیں۔ مشینوں کا رواج انسانیت کے لیے مضرت رساں ہے ؎

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

دراں حالیکہ آلات خود کچھ نہیں کرتے، بلکہ وہ مخصوص حالات مروّت کو کچل دیتے ہیں جن میں ان سے کام لیا جاتا ہے۔ آلات تو مال پیدا کر دیتے ہیں، اب یہ انسان کا کام ہے کہ اس کی تقسیم مناسب طریقے سے کرے۔ اقبال، مزدوروں کی حکومت کو چنداں پسند نہیں کرتا ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ہوس اندر دلِ آدم نہ میرد — ہماں آتش میانِ مرزغن ہست
عروسِ اقتدارِ سحر فن را — ہماں پیچاک زلفِ پرشکن ہست
نماند نازِ شیریں بے خریدار — اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

(از پیام مشرق)

سرمایہ داری اور ملوکیت کی موجودہ بنیادوں کو مٹا کر نظام معاشی کو از سرِ نو قایم کرنے کے لیے، اقبال، ایک تصورِ عالم پیش کرتا ہے۔ لیکن ایک بین اقوامی تصور کا عامل اس کے نزدیک ایک بین اقوامی طبقہ نہیں بلکہ ایک قوم ہے جس میں ایک بہت بڑا

گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو اقبال کی نظریں بھی مسلم نما کافر ہیں اور اس کی تحریک کے سب سے بڑے مخالف یہی لوگ ہوں گے۔ اپنے خواب کی تعبیر اطالوی فاشیت میں دیکھ کر وہ جوش سے کہتا ہے ؎

رومۃ الکبریٰ! دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر
این کہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب
چشم پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں تیرے ہیں سوز آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت! یہ تمنا! یہ نمود!
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب
(مسولینی از بالِ جبریل)

یہ فیض 'مسولینی' کا ہے جو اطالیہ کی بہبودی کے لیے ساری دنیا کو فنا کر سکتا ہے، جو اطالیہ کے سرمایہ داروں کا سپہ سالار ہے، جو جنگ کو انسانیت کے لیے شیر مادر بتاتا ہے۔ اقبال ایسے ڈکٹیٹر کو ہی اسلامی پاکستان کے استحکام کا ضامن سمجھتا ہے۔ خلافت کا تصور اس کے نظریے کی تائید کرتا ہے حالانکہ 'خزانِ جمہور' میں وہ 'طبع سلمانی' کہاں جو اس ڈکٹیٹر کو 'مشورہ' دے سکے۔

مختصر یہ کہ اقبال، اسلامی فاشیت ہے اور اس کا ردعمل بھائی پرمانند اور ڈاکٹر مونجے کے ہندو فاشیزم کی صورت میں ظہور پذیر ہو رہا ہے جن کے نزدیک ویدک عہد کی تہذیب انسانیت کی معراج اور ذات پات کی تقسیم تقسیمِ عمل کا بہترین نمونہ ہے[1]۔

ادب اور قومیت

ہندو مسلم نفاق دراصل دو مختلف تہذیبوں کی کش مکش ہے اور ہم دیکھ چکے کہ کس طرح ٹیگور اور اقبال اپنا تصورِ عالم پیش کر کے ان متضاد رجحانوں کو ظاہر کر رہے ہیں۔ سیاسی اغراض کی خاطر ہر دو قوم کے متوسط طبقوں میں باہم اتحاد اور امتزاج کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ بھی ادب ہند پر ایک نقش چھوڑ گئی ہے اور دونوں قوموں کے کئی ادیب خالص وطنی اور قومی جذبات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ خانہ جنگیوں کو بند کر کے غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنا محاذ قایم کریں۔ ان کے نزدیک وطن سب کچھ ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچنا چاہتے ہیں کہ آئندہ حکومت کا دستور کیا ہوگا بس انگریزوں کے جاتے ہی کوئی جادو کی چھڑی ہر معاملے کو درست کر دے گی۔ گویا سماج کی تمام برائیاں صرف ان سے وابستہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب تک جو سیاسی تحریکیں اس ملک میں اٹھا اٹھ کر گرتی رہیں وہ اس قوم پرورانہ جذبے سے متاثر تھیں جس کے پیچھے دیسی سرمایہ دارانہ مفاد کام کر رہے تھے۔ اردو میں چکبست،

---

[1] اُس وقت (جب یہ مقالہ تحریر کیا تھا) میں نے اقبال کا کلام جستہ جستہ پڑھا تھا، اب انصاف کا تقاضا ہے کہ اُن کی (اقبال کی) شاعری اور شخصیت کی عظمت کا اقرار کروں۔ غم دوراں کا ایسا نوحہ خواں اور عظمت انسان کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہ ہوا۔ (ماخوذ از گردِ راہ۔ صفحہ ۸۵)

'جوش' اور 'ساغر نظامی' ہندی میں 'نوین' 'ایک بھارتیہ آتما' اور 'بالو میتھلی شرن گپتا' انگریزی میں 'سروجنی نائیڈو' اور 'ہرین چٹوپادھیا' ۔ گجراتی میں 'اردشیر خبردار' اور دکن میں 'اناگولا' اس قومی رجحان کے ترجمان ہیں۔ ہندو مسلم تفریق کو مٹاکر ایک قوم کا جنم دینے اور ہندی اور اردو کی آمیزش سے ایک زبان وضع کرنے کا بھی سامان ہو رہا ہے۔ چنانچہ صرف نثر میں ہی نہیں بلکہ نظم میں بھی اردو والے ہندی کے اور ہندی والے اردو کے بکثرت الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ تحریک اتحاد کے بعد ہی اردو میں ہندی گیتوں کی مقبولیت ہوئی اور ہندی میں مشہور شاعر 'ہری اودھ' کی ٹھیٹ ہندی کو قبول عام میسر آیا۔ ان کے چوپدے پڑھیے تو بہ اعتبار زبان وہی لطف آتا ہے جو 'آرزو لکھنوی' کی خالص اردو میں ہے۔

قومی تحریک کا سب سے بڑا شاعر شاید 'اردشیر خبردار' ہے۔ گجرات میں آج اس کا وہی مرتبہ ہے جو اردو میں اقبال کا اور بنگالہ میں 'ٹیگور' کا۔ وہ کوئی 'ہنگامی' شاعر نہیں بلکہ قومیت کے نظریے کی تہہ تک پہنچتا ہے اور اس کا مجموعۂ کلام 'درشنکا' (فلسفہ) بمبئی یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کا ترانہ 'گونجتی گجرات' اقبال کے ترانے یا ڈی۔ ایل۔ رائے کے 'بنگ آمار جننی بھومی' سے کم مقبول نہیں ہے۔ وہ سخت قسم کا وطن پرست اور قوم پرور ہے اپنی ایک نظم میں کہتا ہے ؎

" اے مادرِ وطن! روز آفرینش سے جس کے خوابوں کا ہار تیرے تاروں سے گوندھا گیا ہے۔

جو مرتے دم تک تیرے ہی نام کو لیے دیتا ہے

اے ماں، اس نے تجھے پہچان کر اپنی خودی کو سمجھا ہے

جب میں مرجاؤں تو تیری خاک پاک سے دوبارہ جنم لوں تاکہ تجھ پر دوبارہ قربان ہوسکوں۔ تیری مٹی

میرے لیے مایۂ حیات ہے، کیونکہ خالق کے پرستار کی مٹھی میں تمام مخلوق ہے "

ایک دوسری نظم میں ستیاگرہ کی تبلیغ یوں کرتا ہے :

" آج اپنے ساتھ کیا کیا لوگے؟ جرأت تلوار میں نہیں دل میں رہتی ہے۔ کاش تمھاری ہمت مردانہ میں ہے ورنہ ہر تلوار بے آب ہے۔ ان کند ہتھیاروں کو پھینک کر دل کو جنگ کے لیے مستعد بناؤ۔ ہمیں کسی کا خون نہیں بہانا ہے۔ حریف کے خون جگر سے اپنے دل کے دیوتا کو کیوں کر ناپاک کریں جس فتح کی تاریخ انسان کے خون سے لکھی جاتی ہے وہ بے پایاں ہے "

ادب اور تحریک اصلاح

مغربیت نے اتنا فائدہ ضرور پہنچایا کہ ہمارے ارباب حل و عقد اپنی آنکھوں کے شہتیر کو دیکھنے لگے۔ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ان کی موجودہ زندگی کسی نہ کسی حد تک بے ربط ضرور ہے۔ چنانچہ ہندوؤں میں 'سماج سدھار' کی تحریک زور شور سے چل پڑی۔ سوشل معاملات میں کم عمری کی شادی، بیواؤں کی بدحالی اور مردوں کی تماشش بینی کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ گجرات میں گوندرام نے اور بنگال میں 'ٹیگور' اور 'شرت چند' نے اس تحریک کی حمایت میں افسانے لکھے۔ ادھر مسلمانوں کی ہر برائی بھی چونکہ برگزیدہ ہے اس لیے 'قاضی سرفراز حسین' اور 'راشد الخیری' نے چند پیش پا افتادہ مسائل پر اکتفا کیا اور ایک عرصے تک کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ ایک تیز نشتر لے کر اس ناسور کو دکھائے جس نے سماج کے رگ و پے میں زہر ساری کر دیا ہے۔ اس طرف دو کتابیں ایسی شائع ہوئیں جو قابل توجہ ہیں۔

'انگارے' افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جو اب ضبط ہو چکا۔ یہ افسانے ہماری جنسی زندگی کا مرقع تھے اور حالانکہ ان کا انداز تحریر جنسی تشدد سے متاثر تھا اور اس ذہنیت کا آئینہ دار تھا جو روح یا پیٹ کی طرح محض جنس ہی کو واحد شعبۂ زندگی قرار دیتی ہے تاہم اردو افسانہ نگاری میں یہ پہلی مثال ہے کہ ادب نے منافقانہ پابندیوں پر اپنے فرائض کو ترجیح دی ہو۔ دوسری کتاب 'لیلیٰ کے خطوط' ہے۔ افسوس کہ اس کے مصنف نے مظلوم نسوانیت کا ترجمان ایک شاہد بازاری کو بنا کر اس مسئلے کو محدود بنا دیا اور شہری زندگی میں طوائف کی ناگزیریت کو نظر انداز کر دیا ورنہ اس کتاب کا شمار ہندوستان میں دورِ جدید کی اچھی تصنیفوں میں ہوتا۔ تاہم اس کی مقبولیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس طبقے کے کچھ لوگ محض اصلاح کو ہی کافی نہیں سمجھتے اور یہ بھی دیکھنے لگے ہیں کہ ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے نظامِ زندگی میں بنیادی تبدیلی کرنی ضروری ہے۔

اقتصادی مسائل میں طبقاتی تصادم CLASS-WAR کا مطلع صاف ہوتا جاتا ہے اور واقعیت نگار ادیب اس طرف بھی متوجہ ہونے لگے ہیں۔ پریم چند کے تقریباً سبھی کردار اصلاح پسند REFORMIST اس کے سامنے ایسے خوش حال زمین داروں کی مثالیں ہیں جو 'طالسطائی' کے 'ڈسٹیری' RESURRECTION کی طرح کسانوں میں اپنی جائداد تقسیم کر کے اپنی زندگی کو خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ عورتیں اپنے ڈربوں سے نکل کر مردوں کے دوش بدوش قومی زندگی کی تدوین میں حصہ لے رہی ہیں۔ 'سبحان سنگھ' 'پریم شنکر' اور 'دینے کمار' اسی قسم کے نوجوان ہیں۔ 'سمن'، 'گائتری' اور 'صوفیہ' ایسی ہی عورتیں ہیں، لیکن جب ایسے زمین دار مستثنیات میں شمار ہوتے ہیں اور اس کلیے کو ثابت کرتے ہیں کہ اپنے حقوق سے کوئی طبقہ برضا و رغبت دست بردار نہیں ہوتا تو پریم چند سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ دورِ انقلاب کی آتش اندازیوں سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ طالسطائی اور ٹیگور کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ انقلاب اور رجعت کے دوراہے پر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر یہ کہتا ہوا بیٹھ جاتا ہے: 'اے کاش اس رستے پر چلے بغیر ہم وہاں پہنچ جاتے!'

اصلاح کی ہر تحریک نیک نیتی لیکن تنگ نظری پر مبنی ہے۔ زندگی اور موت میں اتحاد نہیں ہو سکتا اور نہ ظالم و مظلوم کو ایک لڑی میں گوندھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح تعلقاتِ جنسی میں اس وقت تک توازن، استحکام و صحت کی گنجائش نہیں جب تک زندگی کے دوسرے مسائل سے ہم اسے الگ کر کے دیکھنے کی عادت نہ چھوڑ دیں اور ترغیباتِ جنسی کو شیطان کا غلبہ نہیں بلکہ ایک فطری جبلّت INSTINCT نہ سمجھنے لگیں۔

ادب اور فقدانِ مقصد

پل صراط کی طرح انقلاب کا رستہ بھی بڑا دشوار گزار ہے۔ بہت سے لوگ راہ میں تھک تھک کر رہ جاتے اور تصرف کی خندق یا نزاع کی گھاٹی میں گر پڑتے ہیں۔ ہندوستان ایک دورِ تغیر سے گزر رہا ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کا ایک گروہ لازمی طور پر داخلی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اس کے لیے زندگی کی حقیقت ایک رقصِ شرر سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی معیار یا مسلک نہیں ہے۔ ماضی اس کے لیے بے معنی اور مستقبل لایعنی ہے۔ جو کچھ ہے 'ابھی' اور 'آج' کی مسرتوں میں ہے۔ شراب و شباب کا یہ فلسفہ پہلے بھی اس ملک میں مقبول تھا لیکن ہر جام کے ساتھ توبہ تھی اور ہر معصیت کے ساتھ احساسِ گناہ اور عفوِ گناہ کی امید۔ لیکن اب مستقبل کی تاریکی خودکشی کے رجحان کو بڑھاتی جاتی ہے اور با ہمت بے راہ رو بم پھینک کر، کم ہمت لوگ آپ اپنی جان لے کر اور آزاد منش 'خیام' 'بائرن' 'آسکر وائلڈ' کی قسمیں کھا کر

اس نراجی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ دنیائے ادب میں اس کا پرتو رومانیت اور 'ادب برائے ادب' کی صورت میں آشکار ہوتا ہے حقائق کی تلخ کامیوں سے گھبرا کر انگلستان میں 'بائیرن' اور 'کیٹس' وغیرہ نے سامنتیت کے زوال کے زمانے میں اور اب ییٹس YEATS اور ڈی۔ ایچ لارنس وغیرہ نے حرفت کے زوال کے وقت اسی جذبۂ شکست کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی متوسط طبقہ میدانِ کارزار سے گھبرا کر تصوف اور رومانیت کی آڑ پکڑنے لگتا ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا ناول نگار شرت چندر چیٹرجی اپنے ناول چرتر ہین (بداخلاق) شیش پرشن (آخری سوال) اور شری کانت، میں ایسے ہی لوگوں کی تصویر کھینچتا ہے۔ بنگلہ اور ہندی میں رومانیت اور ٹیگور سے اثر انداز ہو کر شاعری میں 'چھایہ واد' یعنی اشاریت SYMBOLISM کی تحریک شروع ہوئی اور حقیقت پرستوں کو ایک عرصے تک ان رجحانات کے خلاف برسرپیکار رہنا پڑا۔ اردو کے نوجوان شاعروں میں بھی یہ ذہنیت عام ہو گئی ہے اور یہ اصحاب حسن و عشق کے علاوہ دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز نظر آتے ہیں حالانکہ نہ ان کا عشق بوالہوسی سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کا معیار حسن عالم دوشیزگی سے آگے بڑھتا ہے۔ ان کی نسوانیت دوشیزہ پرستی تک محدود ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جس طرح ہمارے نظام زندگی میں عورت اپنی مالی ضروریات کے لیے مرد کی دست نگر ہے اسی طرح مرد اپنی شہوانی ترغیبات کے لیے اس کا غلام بن گیا ہے۔

زندگی میں حسن و عشق کے لیے بھی جگہ ہے اور شراب و شباب کے لیے بھی لیکن ان کے نام پر زندگی کے مطالبات سے بے پروا ہونے کی کوششیں رجعت پرورانہ اور لائق تعزیر ہیں۔

نذر الاسلام

یورپ ہندوستانی ادب میں صرف ایک ایسا شاعر ہے جو میکسم گورکی کی کسوٹی پر کھرا اُترتا ہے۔ جو انقلاب پرور، قدامت شکن اور تغیر پسند ہے۔ جب ادب کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ انسان کو رُلائے یا سلائے اور یا گمراہ کرائے تو اُفق بنگال پر ایک ستارے کا طلوع ہوتا ہے جو صراط مستقیم کا نشان ہے۔ مختصراً نذر الاسلام کا فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ زندگی دایم و قائم ہے اور انسان لاشریک لہٗ اس کا مالک ہے۔ انسان اور قدرت کی کشمکش کا نام تہذیب ہے اور انسانیت کی ترقی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کس حد تک قدرت پر فتح حاصل کر لی ہے۔ انسان سب سے افضل اور اکمل ہے۔ دین حق کا مطلب ہے ہر قسم کا سدباب اور اخوت و مساوات کا قیام۔ قومیت، سرمایہ داری، تمیز رنگ و نسل اور تفریق مذاہب کو وہ انسانیت کے لیے سم قاتل سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں ایک نسل کو دوسری نسل کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہر آنے والی نسل زندگی کی محافظ اور ضامن ہے۔

اس لحاظ سے 'نذر الاسلام کو' روحانیت نوازی اور داخلیت سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں۔ جب دنیا حیات و ممات کی کشمکش میں ہے تو وہ ایسے وقت میں فلسفۂ قدرت پر غور و خوض کو غیر ضروری اور مضر مانتا ہے۔ اس وقت فلسفۂ قدور (PHILOSOPHY OF VALUES) کی فکر کہیں زیادہ اہم اور مفید ہے۔ جب رجعت اور انقلاب برسرپیکار ہوں تو ادب فصیل پر بیٹھ کر واقعیت REALISM کے کیمرے سے فوٹو نہیں لے سکتا۔ یا تو وہ رجعت کے قلعے میں جا چھپے گا یا انقلاب کے میدان میں ہوگا اور یا تصوف داخلیت کے خندق میں جا گرے گا۔ طبیعتاً وہ باغی اور سرکش ہے۔ حسن و عشق کی وادیوں میں گرفتار ہو کر

بھی اپنی منزل کو نہیں بھولتا۔ "پجارن" میں عشق کی ناکامیوں کا ردِ عمل یوں بیان کرتا ہے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا۔ کیونکہ نہ اب میں موت در آغوشِ طوفان کا ہم سفر بن جاؤں۔ راستے میں کس کی یاد میں فریاد کرتا پھروں؟ کیوں نہ آتش فشاں پہاڑ اس مرتبہ اپنے غارت گر دہانے کھول دیں؟ نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرا دے اور موت کے ترانے میرے ہم سخن بن جائیں۔ لے آؤ اپنے آتشیں رتھ اور پھونک دو ہنگامِ قیامت کے صور! برساؤ زہر و آتش میں بجھے ہوئے تیر! برباد کر دو اِس دنیائے معصیت کو! ٹپکاؤ یہ خونیں شراب عزرائیل کے گلے میں!"

نذر الاسلام کے نزدیک دنیا ہمیشہ دو طبقوں میں بٹی رہی ہے۔ اور اس ظالم و مظلوم کی تفریق کو اقبال چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری بتاتا ہے۔ لیکن جہاں ایک "خود گزاری" و "نالۂ نیم شبی" اور "گنبدِ نیلوفری" کے تماشوں کا آسرا ڈھونڈتا ہے، دوسرا مظلوموں کو اتحاد و انقلاب کا درس دیتا ہے ؎

"میں اس روز مطمئن ہوں گا جب مظلوموں کی فریاد فضائے آسمانی میں نہ گونجے گی اور جب میدانِ جنگ میں تلوار اور خنجر کے خوف ناک ترانے نہ سنائی دیں گے۔ وہ جو ازلی باغی اور میدانِ جنگ سے نالاں ہے، صرف اسی روز خاموش ہوگا۔"　　　(باغی)

"وہ جو سمندر کی گہرائی میں، آسمان کی وسعت میں، زندگی کے ہیجان میں ، فضا کی ہر سمت میں موت سے نبرد آزما رہتا ہے، وہ جس نے بادل کی بیٹیوں کو کنیز بنا رکھا ہے کہ جو بجلی کو اپنی مٹھی میں پکڑے رکھتا ہے۔ میں اسی کے آستانے پر سر جھکاتا اور اسی کے گیت گاتا ہوں۔"　　　(پیامِ شباب)

اپنے عزمِ راسخ کے لیے وہ کسی معاوضے کی تمنا نہیں کرتا۔ وہ حال کی ترجمانی کر رہا ہے تاکہ انسانیت کا مستقبل روشن ہو، زمانہ اُسے یاد کرے گا یا نہیں اُسے اس کی پروا نہیں ہے ؎

"میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔ کوئی کہتا ہے کہ اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ شاعر کو قید و بند سے کیا نسبت؟ کسی کا مشورہ ہے تو دوبارہ جیل جا کہ وہیں خوب لکھ سکتا ہے۔ مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (داڑھی) نہ پا کر مایوسی سے اپنی داڑھی کھجانے لگتا ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کر کے اپنی فرقہ پرستی کا ثبوت دیا ہے۔ گاندھی جی مجھ پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔ عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست بتاتے ہیں۔ غرض کہ میری جان ضیق میں ہے۔

لوگو! سنو کہ یہ دل انتقام اور درد کی آگ سے پھنکا جا رہا ہے۔ تن تنہا خون نہیں بہا سکتا، اس لیے اپنے خون سے یہ نظمیں لکھ رہا ہوں۔

مجھے اس کی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں۔ تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلقِ خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں میری خوں چکاں تحریر ان کے لیے پیامِ موت ثابت ہو!"

سرمایہ اور محنت کے تصادم کے انجام پر سماج کی قسمت کا انحصار ہے۔ وہ طبقہ محنت کش ہی ہے جو تقسیم کی

ے انصافیوں کو دور کر کے پیدا دار کے ذرائع کو انتہائے عروج پر لے جا سکتا ہے۔ شاعر اس کی فتح یابی کا ترانہ یوں گاتا ہے ؎

"وہ مبارک ساعت آ پہنچی۔
ہتھوڑی اور کدالی لیے جو پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے، راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں، تمھاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہے، تمھارا بارِ گناہ اٹھانے کے لیے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے۔
وہی۔ صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔ میں اسی کے گیت گاتا ہوں۔ اس کا ٹوٹا ہوا دل ایک نئی دنیا کی تعمیر کرے گا۔
اونچی عمارتوں میں رہ کر اب یہ توقع نہ کرو کہ یہ خاک نشین ہمیشہ تمھارے آگے سربسجود رہے گا۔ جو لوگ فرطِ احترام سے مادرِ گیتی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں وہ انھیں ہی اپنا وارث بنائے گی۔
میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں جن سے لپٹ کر مٹی اپنی یگانگی کا اعلان کرتی ہے۔ آج بے کسوں اور مظلوموں کے خون سے رنگ کر بطنِ گیتی سے آفتابِ تازہ پیدا ہوا ہے۔ اب تمام پابندیوں اور بندھنوں کو توڑ کر پھینک دو۔ فلکِ کج رفتار کو چاہیے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے آستانے پر گر پڑے۔
ہمارے سروں پر آفتاب و ماہتاب اور ستارے پھول بن کر برسیں کہ ہم نے ایک جہانِ نو کی داغ بیل ڈالی ہے۔
مزدوروں کی جمعیت کو مژدہ ہو کہ ہم سب ایک ہی کارواں کے مسافر ہیں۔ ایک کا دکھ سب کے لیے موجبِ اندوہ ہے اور ایک کی توہین ہی نوعِ انساں کی توہین ہے۔
آج دنیا کے کل بندھن کٹ رہے ہیں اور ایک عظیم الشان دورِ بیداری کا آغاز ہو رہا ہے جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے اور شیطان خوف سے لرزتا ہے۔"

نذرالاسلام شباب کا ہم دوش اور انقلاب کا نقیب ہے۔ وہ تغیر کا حامی اور جمود کا دشمن ہے۔ وہ قدیم کا حریف اور جدید کا علم بردار ہے۔ وہ قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علمِ جہاد بلند کرتا ہے اور شاعری کو اس مہم میں چھاؤنی کی کسی نہیں بلکہ جنگ کی دلیری بنا دیتا ہے۔ اس کی شاعری ادبِ ہند کے رستے میں ایک نئی للکار ہے جو بتاتی ہے کہ آرٹ موت کا نہیں زندگی کا پروردہ اور خادم ہے۔ وہ اس روح کو مٹا دے گا جو جسم کو قید سمجھتی ہے۔ وہ استعمار و استبداد کو فنا کر کے حسن و عشق کے صحیح جذبات سے انسان کو آشنا کرے گا۔

ادب جدید کی ضرورت

اس مختصر سے سماجی تجزیے میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ ادبِ ہند کا دورِ قدیم حقائقِ زندگی سے ناآشنا اور بالکل داخلی تھا۔ کوئی حل پیش کرنا تو درکنار وہ زندگی کے مسائل کو سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے۔ دورِ جدید زندگی سے اس حد تک بے گانہ نہیں ہے اور اس کی خدمت کا ولولہ بھی رکھتا ہے، لیکن اس کے بتلائے ہوئے راستے بڑی حد تک گمراہ کن ہیں۔

ادب کا فرضِ اولین یہ ہے کہ دنیا سے قوم، وطن، رنگ و نسل اور طبقہ و مذہب کی تفریق کو مٹانے کی تلقین کرے اور اس

جماعت کا ترجمان ہو جو اس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہو۔ انسانیت کے دشمنوں کی دشمنی دراصل دردِ انسانی کی دلیل ہے۔ اب تک ہمارا ادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے چارگی کا نوحہ پڑھتا آیا ہے۔ اب اسے اس جذبۂ بزدلی سے نکل کر یہ کہنا چاہیے کہ زندگی ابدالآباد تک ہے اور انسان اس کا کارساز حقیقی ہے۔ قیامت کے معنی ہیں کہ روح الاجتماع داورِ محشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لیے جہنم رسید کرے اور پھر اسی زمین پر ایک ایسی بہشت کی تخلیق کرے جس میں ہر انسان ذہنی، جسمانی اور روحانی ترقی کی بلندیوں تک پہنچ سکے۔ انسانیت اور ادب کے مسلک الگ نہیں ہیں اور دونوں کی نجات کا رستہ بھی ایک ہے۔ وہ یہ ہے کہ ستم رسیدہ انسانیت اپنے حقوق اور ان کے غاصبوں کو سمجھے اور ان تمام پابندیوں کو توڑ دے جو اس کے ارتقا کی راہ میں حائل ہوں۔ یہ مضمون اردو کے ادیبوں کے لیے لکھا گیا ہے، لہٰذا میرا خطاب ان سے ہے —

ایک طرف پولیس کا وہ پنشن خوار داروغہ ہے جو تا عمر اپنی فرعونیت اور ہوس پرستی کا مظاہرہ کرنے کے بعد تسبیح کے دانوں پر اپنے گناہوں کا شمار کر رہا ہے۔ اسے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اسے رُلانے اور سُلانے میں مدد پہنچائیں۔ پھر وہ مولوی ہے جو دین کے پردے میں سب سے بڑا دنیادار ہے اور جس کی ہوس پرستی کو اشتعال رکھے اس ناپاک دفتر سے ایک گونہ تسکین ہوتی ہے۔ اور وہ تعلیم زدہ لڑکیاں ہیں جو زن مرید شاعروں کی ٹھنڈی سانسیں سن کر کسی مجنوں کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔ وہ ایسی کہانیاں پڑھنا چاہتی ہیں جن کی ہیروئن وہ خود ہوں اور جن کے ہیرو خودکشی کر کے بٹیروں کی طرح تڑپ رہے ہوں۔

آپ اب تک انھیں لوگوں کے لیے لکھتے رہے ہیں۔ کیا آپ کی آئندہ کاوشیں بھی انھیں کے لیے وقف ہوں گی۔

دوسری طرف وہ کسان ہے جو سماج کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے۔ زمین دار اور سود خوار جونک کی طرح اس کا خون پی رہے ہیں۔ مولوی اس پر خود گزاری اور صبر و شکر کا جادو پھونکتے ہیں۔ اس کی بیوی روٹیوں کے لیے عشوہ فروشی پر مجبور ہے۔ اس کے بچے بھوک سے تنگ آ کر آپ کی جیب پر گھات لگائے ہوئے ہیں اور وہ مزدور ہے جو سماج کی عمارت کا ستون ہے۔ وہ مال اس لیے پیدا کرتا ہے کہ منافع کے نام سے ایک دوسرا شخص اسے ہتھیا لے جس کے لیے لغت میں "مالک" کا لفظ تراشا گیا ہے۔ قید خانے کی کوٹھڑیوں سے بدتر جھونپڑیوں میں، پلیگ اور ہیضے میں تڑپ کر وہ بھوکا اور ننگا مزدور اس حسرت میں مرجاتا ہے کہ مارواڑی کا سانڈ یا کسی امیر کا کتا کیوں نہ ہوا؟

کیا اس کے حال زار نے کبھی آپ کے دل میں چٹکی لی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا کبھی ان اسباب و علل کو مٹانے کا خیال آپ کے ذہن میں آیا ہے؟ اگر نہیں تو آپ ادب کے لیے باعثِ ننگ ہیں۔ ایسے ادیبوں کے لیے گروپاٹکن کہتا ہے:

"کیا تم مصنف بننے کی آرزو رکھتے ہو! تو اپنے ملک کے مصائب کی داستان پر نظر ڈالو اور اگر اس کے بعد تمھارا دل خون نہیں ہو جاتا تو اپنے قلم کو پھینک دو۔ اس قلم کا مصرف صرف یہ ہے کہ تمھارے بے حس دل کی ناپاکی کا پردہ فاش کرتا رہے۔"

گویا ادب آج کبیر داس کی زبان میں کہہ رہا ہے ؎

کبیرا کھڑا بزار میں لیے لکاٹھی ہاتھ
جو گھر پھونکے آپنا چلے ہمارے ساتھ

ہمیں ان لوگوں سے غرض نہیں جن کے دماغ ردیوں کے لیے چیکلا گھر بنے ہوئے ہیں اور جو سرمایہ دار پبلشروں اور جاہل بے درد شہریوں کے زرخرید غلام ہیں۔ ہمارا خطاب ان سے ہے جو تخلیق ادب کو رتبۂ پیغمبری دیتے ہیں۔ جو حق گو اور حق پرست ہیں اور

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

جو سچ کہتے ہوئے کسی قسم کی پابندی سے نہیں ڈرتے۔

اردو اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں۔ اردو اگر قومی زبان بننا چاہتی ہے تو اسے ہر قسم کے خیالات و جذبات کا حامل بننا چاہیے۔ وہ زبان ہرگز کسی ترقی یافتہ قوم کی زبان بننے کا استحقاق نہیں رکھتی جس کے حسن و قبح کا فیصلہ کوئی مذہبی جماعت کرتی ہو۔ یعنی اردو کے ادیبوں کو رواداری اور روشن خیالی کی تلقین کرنا چاہیے۔

متوسط طبقے کی زندگی بندپانی کی موری ہے۔ عوام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور انھیں بتائیے کہ وہ اس خستہ حالی میں کیوں ہیں اور کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہیں؟

اردو ادب کی زبان ہیں دونوں جنسوں کے لیے باعث عار ہے۔ پردے کی سختی اور عورت کی کم یابی نے مرد کے نقطۂ نگاہ کو یک سر جو داد تی MASOCHISTIC بنا دیا ہے۔ سجاد حسین اور مہدی حسن جیسے آزاد خیال ادیب بھی عورت کو شہوت رانی کا آلہ سمجھتے ہیں۔ جنسی مساوات کی تبلیغ ہی اس ناپاک ذہنیت کو دور کر سکتی ہے۔

مولویوں اور پنڈتوں کی زبان میں گفتگو بند کیجیے۔ عربی و سنسکرت کو ان کے لیے اور انھیں عربی و سنسکرت کے لیے چھوڑ دیجیے۔

ادب کو فطری بنانے کے لیے ہندوستانی اسپرٹ ہی نہیں ہندوستانی صورت اور اسلوب بھی اختیار کیجیے۔

ادب جدید کے حامیوں کی انجمن بنائیے اور اس کے آرگن شائع کیجیے تاکہ جدید خیالات کی اشاعت میں آسانی ہو اور قدامت پرستوں کے اعتراضات کا جواب دیا جا سکے۔

ہر سیاسی اور سماجی انقلاب کے پہلے ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ہندوستانی عوام ہر اعتبار سے ملکی جدوجہد سے الگ اور ناآشنا ہیں تو اس کی ذمے داری ان کے تعلیم یافتہ طبقے پر ہے جو خود بھی اوہام و تعصب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اردو کی ادیب بھی اپنے بنگالی اور ہندی معاصرین کے نقش قدم پر چلیں اور یہ ثابت کر دکھائیں کہ ادیب کا مشرب قومی و مذہبی تعصبات سے پاک ہے اور وہ واقعتاً انسانیت کا خادم، مصور اور پیشوا ہے۔

سوچیے کہ انسانیت کے ماضی میں آپ کے لیے کون سے اشارات پنہاں ہیں۔ مسائل حال کیا ہیں اور مستقبل کی راہ کیا ہے!

اپنے انداز بیان کو ایسی جلا دیجیے کہ وہ ظلم کے لیے تلوار اور مظلوموں کے لیے بیداری کا صور بن جائے۔

اور آپ کا مذہب کیا ہو؟ ٹیگور سے بھی کسی نے یہ سوال کیا تھا اور اس کا جواب دنیا کے ادب کا جواب ہے:

"میرا مذہب وہ ہے جو ہر آرٹسٹ کا مذہب ہونا چاہیے۔ میں کسی ایک قوم یا مذہب یا ملک کا ترجمان نہیں ہوں۔ میری زندگی بنی نوع انسان اور جملہ اقوام کے لیے اور میرا پیغام ان کے ارتقا کے لیے ہے۔ میری روح زندگی اور انسانیت کی وحدت میں گم ہو گئی ہے اور میں مذہبی، قومی و طبقاتی پابندیوں کو توڑ چکا ہوں۔"

اور آپ کا فرض کیا ہے؟ جو ہر انسان کا فرض ہونا چاہیے۔ کرد پاٹکن کے آگے بھی یہی سوال آیا تھا اور اس کا جواب ہر ایمان دار ادیب کا جواب ہے:

"اگر تمھیں اپنے دل و دماغ میں جوانی کی امنگوں کا احساس ہوتا ہے، اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو، اگر تم پاک و صاف، مکمل اور ارتقا پرور زندگی سے سرفراز ہونا چاہتے ہو یعنی اگر تم ان حقیقی مسرتوں سے محظوظ ہونا چاہتے ہو جن کی تمنا ہر ذی حیات کرتا ہے تو مضبوط بنو، عظمت و وقار کے زینوں پر چڑھو اور ہر کام مستقل مزاجی

سے انجام دو۔

اپنے چاروں طرف زندگی کی تخم ریزی کرو۔ خبردار! اگر تم دھوکا دو گے، جھوٹ بولو گے اور سازش کرو گے تو آپ اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاؤ گے، تحت پستی میں جا گرو گے اور تمھاری حالت اس غلام کی سی ہو جائے گی جو اپنے آقا کو اپنا خدا ماننے لگتا ہے! اگر تمھارا رجحان طبع اسی طرف ہو تو یہی کرو، لیکن اس حالت میں لوگ تمھیں کمزور، حقیر اور قابل نفرت سمجھنے لگیں گے اور تم سے ایسا ہی برتاؤ کریں گے۔ تمھاری طاقت کا کوئی ثبوت نہ پا کر عوام تمھیں قابل رحم سمجھیں گے۔ سوچو رحم و کرم کے قابل ہو جانا انتہائی ذلت ہے۔ اگر خود اپنی صلاحیت کے بال و پر لو چکے ہو تو دنیا کو دشنام نہ دو۔ اس کے خلاف خود کو کمر بستہ کرو اور اگر کہیں تمھیں کوئی بے انصافی نظر آتی ہو خواہ اس کی نوعیت کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو تو تم اس جبر و ظلم اور ناحق کے خلاف بغاوت کر دو۔ جہاد کرو تا کہ ساری دنیا اطمینان کی زندگی بسر کر سکے۔ یقین جانو کہ اس لڑائی میں تمھیں جو روحانی مسرت حاصل ہوگی وہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔"[1]

انھوں نے زبان کی جو خدمت کی اور اسلوب کے جو سانچے تیار کیے ان سے ہمیں استفادہ کرنا ہے اور اس حد تک ہم ان کے مرہون منت ہیں، لیکن ان کی روایت کی تقلید نہ اس زمانے کے لیے مفید ہے اور نہ کوئی معنی رکھتی ہے۔ زبان اور اسلوب کے معاملے میں بھی ان کی تحریر کو حرف آخر اور سند مطلق نہیں کہا جا سکتا اور قدیم کی طرح دور جدید کے ادب کو بھی تجربے کا حق ہے۔ تاہم تمدنی معاملات میں تسلسل کے قانون سے گریز ناممکن ہے۔ اس لیے زبان و ادب میں کوئی بھی اجتہاد کرتے وقت یہ فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ہم اپنے بزرگوں کے نام لیوا اور ریا نئی دیوا ہیں۔

دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ ہم نے اقبال مرحوم کے افکار و خیالات کی صحیح ترجمانی نہیں کی۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ جب میں نے اپنا مقالہ "ادب اور زندگی" تحریر کیا تھا تو میں نے اقبال کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا تھا۔ مدتوں بعد جب نظر ثانی کا موقع ملا تو اپنی خود نوشت "گرد راہ" (صفحہ ۸۵) میں میں نے حسب ذیل الفاظ میں اقبال کے شاعرانہ مرتبے کا اعتراف کیا ہے:

"اقبال سے آخری ملاقات ۱۹۳۶ء میں پانی پت میں مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ کے مشہور جلسے میں ہوئی جب میرا مقالہ "ادب اور زندگی" ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ جب کسی نے میرا تعارف علامہ اقبال سے ان الفاظ میں کیا کہ یہ آپ کی شان میں سخن گسترانہ باتیں لکھ گئے ہیں تو انھوں نے کمال شفقت سے فرمایا: "ایسے مخلص نوجوانوں کی میں قدر کرتا ہوں۔ بے جان لوگوں کے اتفاق پر جان دار لوگوں کے اختلاف کو ترجیح دیتا ہوں"۔

اس وقت میں نے اقبال کا کلام جستہ جستہ پڑھا تھا۔ اب انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کی شاعری اور شخصیت کا اقرار کروں۔ غم دوراں کا ایسا نوحہ خواں اور عظمت انسان کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہ ہوا۔"

---

[1] اس مقالے کی تائید اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جو اعتراض کیے گئے ہیں ان میں سے دو پر اختصار کے ساتھ کچھ عرض کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم نے اردو کے کلاسیکل شاعروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ یہ غلط فہمی غالباً موضوع کی وسعت کے مقابلے میں بیان کے اختصار سے پیدا ہوئی ہوگی۔ ہندوستان کے قدیم شاعروں پر ہمارا یہ الزام بے جا نہیں کہ (۱) یا تو ان کا ماحول محدود اور مصنوعی ہے۔ اور یا (۲) روایات کی پابندی کی وجہ سے وہ ماحول سے بے پروا رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ داخلی بھی نہیں بلکہ روایتی اور تقلیدی ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

عصرِ حاضر میں ادب کا مقام

(خطبۂ صدارت جو حلقۂ اربابِ ذوق کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۶۰ء میں پڑھا گیا)

مجھ جیسے کوتاہ قلم گوشہ نشین کو اس جلسے کی صدارت کے لیے کیوں منتخب کیا گیا یہ تو حلقۂ اربابِ ذوق کو ہی بہتر معلوم ہو گا۔ بہرصورت میں ممنون ضرور ہوں کہ ایک ایسا موقع فراہم ہوا جب ادبی مسائل پر بے تکلفی اور سنجیدگی سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ میرا عریضہ کسی خاص مدرسۂ فکر کا ترجمان نہیں۔ یہ مظہر ہے محض ان خیالات اور شبہات کا جو کبھی کبھی مجھے آواز دیتے ہیں۔ اس نوائے سوختہ کا آپ پر کچھ اثر ہو یا نہ ہو اس کے اظہار سے میرے جی کا بار کچھ تو ہلکا ہو ہی جائے گا۔

یہ سوال مجھے سالہا سال سے پریشان رکھتا ہے کہ آج کی دنیا میں ادب کی اہمیت کیا ہے؟ اس سوال کا پس منظر تاریخ کی وہ تیز رفتاری ہے جس نے بیس سال کی قلیل مدت میں انسانیت کو بے دم سا کر دیا ہے۔ قدروں کو جانچنے کے پرانے پیمانے اس حد تک بے کار ہو گئے کہ قبل از جنگ کا زمانہ قبل از تاریخ کا دور محسوس ہوتا ہے۔ مشاہدے اور تجربے کے اتنے دروازے آئے دن کھلتے جاتے ہیں کہ ادب کو ان کی طرف بڑھنے کا ہیاؤ بھی ابھی نہیں ہوتا۔ یہ تو ہمارے دیکھتے ہو رہا ہے۔ ذرا پیچھے مڑیے تو دو سو سال کی مدت میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔ اس سے پہلے کائنات و حیات پر اسرار و ابہام کا پردہ سا پڑا ہوا تھا اور ادب بھی ان کا نقشہ حیرت و استعجاب کی لکیروں سے بناتا تھا۔ پھر جب سائنس کے عروج کے ساتھ عقل کی حکمرانی شروع ہوئی تو ادب پہلے انسان کے ظاہر اور پھر اس کے باطن کی طرف توجہ دینے لگا۔ ادب کا مرکزِ توجہ نظم سے ہٹ کر نثر کی طرف آنے لگا کیونکہ انسان اب احساسات کے غلاف سے منہ نکال کر واقعات اور حقیقت سے دوچار ہونے لگا تھا۔ لیکن پھر زمانے نے تیزی سے کروٹ لی اور بیسویں صدی نے ہنگامہ و انتشار اور تعمیر و تخریب کا وہ صور پھونکا کہ انسانیت کے کان سُن اور اوسان گم ہو گئے۔ اس کی صدائے بازگشت نئی موسیقی کی شور آفرینی، نئی مصوری کی ابہام پسندی اور نئے ادب کی پریشاں نگاری میں عیاں ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ عہدِ حاضر کی قدروں کو پرکھا جائے تو تہذیبِ عالم میں آرٹ اور ادب کا مقام کیا رہ جاتا ہے۔ اگر شیکسپیر اور گوئٹے، حافظ اور ہومر، بیتھوفن اور رفائیل پیدا نہ ہوتے تو کچھ ویسی ہی کمی رہ جاتی جیسے کھانے کے پھیکا پن سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان بھوکا تو نہ مرجاتا البتہ جو لوگ محض روٹیوں کے لیے نہیں جیتے، زندگی میں کچھ بدمزگی سی محسوس کرنے لگتے۔ لیکن اگر نیوٹن اور

آئن اسٹائین، فرائڈ اور ایڈیسن پیدا نہ ہوتے تو سماج کی مادی ترقی رُک جاتی اور انسان کی خوش حالی کے نئے وسائل دریافت نہ ہوتے۔ یہ بات ماننے کی ہے کہ دورِ حاضر میں انسانی ذہانت کو ادب اور آرٹ سے وہ تسکین حاصل نہیں ہوتی جو سائنس کی بے اندازہ وسعتوں میں ہوتی ہے۔ ذکر ادیبوں کا نہیں جنھیں ادبی تخلیق سے خاص قسم کی ذاتی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ جو مقام ادب کو مہذب سوسائٹی میں زمانۂ حال تک حاصل تھا وہ آج نہ رہا اور جو حیثیت آج ہے وہ ممکن ہے آگے نہ رہے۔ اس تغیر کے مختلف اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ سماج کے مادی اغراض تعمیری و تخریبی دونوں کی نگہبانی سائنس کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تجسس کے راستے میں سائنس تعینات کا قائل نہیں۔ وہ دن گئے جب پادری کسی گلیلیو اور ملا کسی ناصر خسرو کی جان کے لاگو ہو جائیں۔ ادب اور آرٹ کی حیثیت سماج کے جسم کی نہیں بلکہ لباس کی رہ گئی ہے۔

انسان اب محض ایمان، قیاس اور قیافے کی بنا پر واقعات اور حالات کو نہیں جانچتا اور نہ وہ اپنے اوہام کے ترازو پر علم کو تول سکتا ہے۔ کائنات کی بے کراں وسعت کا اندازہ جتنی شدت سے ہوتا جاتا ہے اس دنیا کی کم مائیگی کا بھرم اتنا ہی کھلتا جاتا ہے۔ اور گو انسان نے وطنیت اور قومیت کے بت بنا رکھے ہیں لیکن وہ جانتا ہے کہ بین الاقوامی تعاون کے علاوہ انسانیت کی نجات کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے ادب کے کتنے حریف نکل آئے۔ فلم، ریڈیو، ٹیلی وژن۔ یہ سب مطالعے کی زحمت دیے بغیر انسان کی حس کو اپنی طرف آسانی سے راغب کر لیتے ہیں۔ ہم بزعم خود تہذیب حاضرہ کے ستے پن پر خندہ زن ہوا کریں، لیکن انصاف شرط ہے۔ عہد حاضر کے انسان کی بے بسی ملاحظہ ہو۔ اس کی زندگی کا بڑا حصہ دو عالمی جنگوں کی تباہ کاری اور تیسری جنگ کی تیاری میں گزرا ہے۔ کبھی کسی خدا نے اپنے بندے پر احکام کا وہ بار نہ لادا ہوگا جو آج کل کی حکومتوں نے انسان غریب کی حفاظت کے لیے جتنے قوانین اور احکامات مرتب ہوئے ہیں انھیں یک جا کر کے اگر اس کے سر پہ مارا جائے تو یقیناً اس کا بھُرکس نکل جائے گا۔ اس بحث کا موقع نہیں کہ اس بوالعجبی میں انسان کی اپنی حماقت کو کتنا دخل ہے اور حکومتوں کی آمریت کا کیا حصہ ہے۔ قطع نظر اس کے کہ مغرب کا آسودہ تن باشندہ ہے یا ایشیا کا مفلس، دونوں تاریخ کی ایک ہی روش کے گرفتار ہیں۔

ہر طرف سے شور بپا ہے کہ جلد از جلد زیادہ سے زیادہ سامان پیدا کیے جاؤ جس میں سے کچھ باہمی تخریب کے لیے استعمال ہو تو کچھ آئے دن کی ضروریات کی تسکین کے لیے۔ اور سب سے مہذب وہ معاشرہ ہے جو نہ صرف یہ کہ بہت سامان پیدا کرتا رہے بلکہ اسے بے دریغ نئی فصل سے پہلے ہضم کر سکے۔ تاریخ کے اس عمل میں تخلیقی ادب کا کوئی خاص حصہ تو ہو نہیں سکتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے کی طرح ادب آج بھی مہذب تفریح کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ فلم، ریڈیو، اخبار وغیرہ تفریح کے زیادہ ارزاں اور مقبول وسائل ہیں۔ جدید انسان تفریح کی خاطر ذہن پر بار ڈالنے کا قائل نہیں۔ یوں نہ سمجھیے کہ تاش کے کھیلوں یا جدید ورزشوں کا چلن خواہ مخواہ مقبول ہو گیا ہے۔ ان کی اصلیت یہ ہے کہ جدید انسان بے مطلب کی بات کہنے سے گریز کرتا ہے کیونکہ اس سے ذہن پر بار پڑتا ہے ویسا ہی جیسا اچھی کتاب کے پڑھنے سے ہوتا ہے۔ گھنٹوں چپ بیٹھے فلم یا ٹیلی وژن دیکھنا، ریڈیو سننا یا تاش کھیلنا آسان ہے۔ گو اندیشہ ضرور ہے کہ آگے چل کر اس کی زبان اسی طرح بے کار ہو جائے گی جس طرح مسلسل موٹر چلانے والوں کے پاؤں بے کار ہو سکتے ہیں، لیکن مشینی تہذیب کے یہ ناگزیر نتائج ہیں اور ان سے گریز ممکن نہیں۔ جدید انسان کی تنہائی اب اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ سچی دوستی کے لیے اسے کتوں سے بہتر جان دار نہیں ملتے۔

لینے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی ضروریات کے ساتھ انسانی قدریں سرتاسر بدل گئی ہیں۔ تعلیم عام ہو گئی ہے تو کتابیں بھی بہت چھپتی اور بکتی ہیں، لیکن دوسری تفریحات پر انسان جو خرچ کرتا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی کتابوں پر صرف نہیں کرتا اور ان میں سے بیشتر کا شمار ادنیٰ مطبوعات میں ہوگا۔

میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا اس کا اختصار یہ ہے:

انسان کے علم اور عمل کا دائرہ سائنس اور مشین تک سمٹ آیا ہے اور وہ اپنے سارے مسائل انھیں کے سہارے طے کرنا چاہتا ہے۔ اس تحریک پر اس کی ساری ذہانت اور توجہ صرف ہو رہی ہے۔ اس جدوجہد میں اس نے تفریحات اور اطلاعات کے بہت سے نئے باب کھول دیے جن میں سے بعض ادب کے براہِ راست حریف ہیں کیونکہ وہ بلا زحمت عام آدمی کا دل بہلا لیتے ہیں۔ اعلیٰ ادب کے شائق جب تخلیقی ادب کے جدید ترین نمونوں کا مقابلہ متاخرین کے کارناموں سے کرتے ہیں تو عموماً ان کی تشفی نہیں ہوتی اور وہ تسکینِ خاطر کے لیے لامحالہ کلاسیکل ادب کی طرف چلتے ہیں۔

ہمارے دور میں ادبِ عالم کی یہ عام کیفیت ہے۔ اس پس منظر میں ذرا سوچیے کہ اردو کے ادیبوں کے مسائل کیا ہیں اور وہ کس حد تک ان سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

حلقۂ اربابِ ذوق سے جن حضرات کا براہِ راست تعلق رہا ہے وہ شہادت دیں گے کہ اس ادارے کا واسطہ نہ تو سیاسی ادب سے ہے اور نہ ادبی سیاست سے۔ جب ہر سو دھندلکا پھیلا ہو، تو کسی گوشے میں چار درویش کا سر جوڑے بیٹھے رہنا بھی کرامات ہے۔ اس اجنبی کو آپ اجازت دیں کہ اس حلقے کا حاشیہ نشین بن کر اس صحبت میں چند سخن گسترانہ باتیں عرض کرے۔

زبان کی بنیادی اہمیت یہی ہے کہ وہ ایک نسل کے افراد نیز مختلف نسلوں میں ہم کلامی کا وسیلہ ہے۔ اس لحاظ سے زبان انسان کا سب سے بڑا افادی حربہ ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ زبان انسانوں کے رابطے اور اتحاد کی ضامن ہے تو ان کے نفاق اور علیحدگی کی بھی ذمے دار ہے۔ مذہب اور زبان کی ضرورت انسانوں کی گروہ بندی کو توڑنے کے لیے ہوئی تھی، لیکن ان کے جلتوں نفرت کی کیسی کیسی سنگلاخ دیواریں کھڑی نہ ہوئیں۔

کسی زبان کے مرتبے کو جانچنے کے دو پیمانے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے بچپن تک اردو کو جو فوقیت حاصل تھی وہ آج نہیں رہی۔ وجہ یہ نہیں کہ لوگوں کا حافظہ خراب ہو گیا، بلکہ نئے سیاسی تقاضوں کے تحت اردو کے بہت سے جاننے اور ماننے والے بھی اس سے منکر ہو گئے۔ ہمیں حقائق سے بحث کرنا ہے اس لیے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ غم ہوا کرے لیکن غصے کا موقع نہیں۔ کیونکہ مذہب کی طرح زبان بھی زبردستی مسلط نہیں کی جا سکتی۔ یہ سوچ غلط ہے کہ کسی زبان کا حق محض اس کی صلاحیت کی وجہ سے تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

دوسرا پیمانہ یہ ہے کہ کسی زبان میں ادب کا کیا مقام ہے؟ مثلاً لاطینی، قدیم یونانی اور سنسکرت جیسی مردہ زبانوں کو لیجیے۔ انھیں کوئی سمجھتا بولتا نہیں، لیکن ان کے ادب سے انسانیت آج تک استفادہ کرتی ہے۔ اگر کسی زبان کا حلقہ اس طرح محدود ہو جائے جیسا اردو کا، اور اس کے ادب کی باڑھ بھی رک جائے تو جتنی بھی تشویش ہو کم ہے۔ ادب کو بھی دو نظروں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک تو تحت السطور، سرگوشی اور تحت شعور کی زبان ہے جو ادبی ورثے کا ایک خاص حصہ ہوتی ہے اور جس سے وہ لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں جو مخصوص تہذیبی قدروں اور مقامی ماحول میں سموئے ہوئے ہوں۔ ادب کا دوسرا حصہ زیادہ عالم گیر ہوتا ہے جو دوسری زبان

کے قالب میں ڈھل کر بھی اپنے اثر کو باقی رکھتا ہے یہی اعلیٰ ادب ہے جس کے سہارے زبانیں زمان و مکاں کے انقلابات پر حاوی آجاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اردو میں اس قسم کے ادب کی فراوانی ضرور ہے جو اس کے پڑھنے والوں کی تہذیب اور معاشرت کی آئینہ دار ہے لیکن زمانے کے الٹ پھیر کی وجہ سے اس حصۂ ادب میں موجودہ ماحول کے ناظر کے لیے کشش کا زیادہ سامان نہیں اور ایسا اعلیٰ و عظیم ادب جو دوسری زبانوں میں اعتماد کے ساتھ منتقل کیا جاسکے تقریباً ناپید ہے۔

اس تضاد کی وجہ کیا ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے لسانی اعتبار سے اردو میں جو وسعت ہے وہ کم زبانوں میں ہوگی۔ پھر اس کے ادب میں عظمت کیوں نہ پیدا ہوسکی۔ اس جواب سے کام نہیں چلتا کہ اردو نئی زبان ہے۔ یہ مفروضہ یوں غلط ہے کہ ابتدائی اردو میں نثر و نظم کے جو نمونے ملتے ہیں وہ چار سو سال تک پرانے ہیں۔ یوں زبانوں کی شکلیں تو بدلتی رہتی ہیں۔ اور روسی یا جرمن ادب کی عمر اس کے مقابلے میں کوئی بہت زیادہ تو نہیں ہے۔ میری بے لاگ رائے یہ ہے کہ قصور زبان کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا تھا جو اسے ادبی تخلیق کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ادب کی عظمت صرف شعر سے نہیں بلکہ نثر سے وابستہ ہے۔ یہ تو ماننے کی بات ہے کہ میرامّن کے زمانے میں جس نثر کا نک سک درست ہو چکا تھا لیکن پوری انیسویں صدی ختم ہونے پر آئی تو اردو نثر میں کچھ کام کی باتیں کی جانے لگیں۔ شعر کو لیجیے تو صدیوں کے خس و خاشاک لجھانے کے بعد کیا رہ جاتا ہے۔ غرض یہ کہ اردو ادب کا افلاس کے لکھنے والوں کے ذہنی افلاس کا نشان ہے اور اس افلاس کی وجہ کیا ہے۔ اس کا تعلق کم فرصتی یا غربت سے نہیں۔ ہمارے ہم عصر ادیبوں نے زیادہ سخت زندگی گزاری ہے۔ بات یہ ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے بزرگ اجداد کی روایات پر اکتفا کر کے رہ گئے۔ اردو ادب کا افلاس نثر کے افلاس کا مظہر ہے جو جھلکی کھاتا ہے اس ذہنی ابتری کی جو گزشتہ صدی کے آخر تک اردو داں طبقے پر محیط تھی۔

اس ذہنی پس ماندگی کا براہِ راست تعلق مسلمانوں کے دورِ زوال کی تاریخ سے ہے۔ اٹھارویں صدی میں ایک طرف تو مغرب میں جمہوریت، صنعت اور سائنس کو فروغ ہوا اور ان کے ساتھ اہلِ افرنگ کا دورِ جہاں بانی شروع ہوا۔ دوسری طرف مسلمانوں پر سیاسی، معاشی اور ذہنی انحطاط و جمود کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ مولویانہ اور شاعرانہ تحریریں اس تاریکی کو کیسے اجال سکتی تھیں۔ اس کے لیے جدید علم کی مشعل کی ضرورت تھی۔

غرض یہ کہ اردو ادب کی خستہ حالی پرتو ہے مسلمانوں کی حالیہ تہذیبی پس ماندگی کا۔

اردو ادب میں اس پس ماندگی کے علاج کی نہ سہی تشخیص کی صلاحیت پیدا ہونی چاہیے اور یہ محتاج ہے آزادیِ تنقید کی۔ میں یہ اس لیے کہتا ہوں کہ تخلیقی ادب میں لامحالہ تنقید مضمر ہوتی ہے۔ پس ماندگی ایک قسم کا مرض ہے اور جب تک اس کے مریض کو مسلسل رگڑے نہ دیے جائیں، بجلی کی شعاعوں کے ٹھوکے نہ لگائے جائیں، زبردستی چلایا پھرایا نہ جائے وہ اچھا کیسے ہوگا؟ جس فضا میں موسیقی کا نطری جذبہ دبا ہوا ہو وہاں نظمیں لکھنا اور گن گنانا آسان ہے، لیکن محض ان کی تکرار سے ادب کا مقصد پورا نہ ہوگا۔ تخلیقی نثر سادگی، سنجیدگی اور اختصار کی محتاج ہے اور اس کی روایت ابھی اردو میں کم یاب ہے۔

اس صحبت میں میں پیش پا افتادہ باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا۔ مثلاً انسائیکلوپیڈیا یا ڈکشنری وغیرہ بننا چاہیے۔ تراجم ہونے چاہئیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایسی باتیں بہت ہو چکیں اور کہیں کہیں لوگ اس قسم کے کام بھی مقدور بھر کرتے رہتے ہیں، لیکن اردو کے مستقبل کا دار و مدار اس کے ادب کی عظمت پر ہے۔ صرف یہ کہنے سے کام نہ چلے گا کہ اردو اس سرزمین کے مسلمانوں کی تہذیبی میراث کی محافظ ہے۔ زندہ رہنے کے لیے اردو کو اس تہذیب میں ترمیم و اضافہ کرنا ہوگا۔ یہ کام ماضی کی سمجھائی ہوئی لکیروں

پر چلنے سے نہ ہوگا۔ قوموں کی ترقی کے لیے خودی کے احساس سے زیادہ خودگزاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور صحت مند ادب کی تخلیق تو ایک قسم کی عبادت ہے جسے اشتہار بازی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

حضرات!

مجھے اس امر کا احساس ہے کہ یہ تقریر طول کھینچ گئی اور پھر بھی تشنہ رہی۔ میں کئی سوال پوچھ گیا، کئی شبہات ظاہر کر چلا اور اردو کی موجودہ دشواریوں کے عمل کا کوئی سستا سا نسخہ تجویز نہ کر پایا۔ میں گفتن برائے گفتن کے اصول کا کبھی قائل نہ تھا۔ اور کوئی نکتہ گفتنی نہ ہو تو خاموشی کو بہر قیمت ترجیح دیتا ہوں۔ ادب کو ماحول کا عکاس اور نقاد ہونا چاہیے۔ ورنہ ماحول کی ہم نوائی اور قصیدہ سرائی میں کوئی فرق نہیں۔

آپ سب اہلِ قلم ہیں اور یہ سوچنا آپ کا فرض ہے کہ کن سرگرمیوں سے زبان اور ادب کی ترقی ہو سکتی ہے۔ لیکن بات وہ کہیے جس پر عمل ہو سکے۔ سچ پوچھیے تو ادب اور آرٹ کی ترقی کسی پروگرام کے تحت نہیں ہوتی۔ اس کی واحد ضمانت ادیبوں اور فن کاروں کا عہدِ وفاداری اپنی تخلیق کے ساتھ ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

محفلِ رقص کی تصویر

(کالیداس، پیرلوتی اور میر حسن کے قلم سے)

یہاں منظرِ رقص کی تین تصویریں پیش کی جاتی ہیں جن کے صنّاع تین باکمال ادیب ہیں۔
کالی داس نے اپنے ڈرامے مالوکا اگنی متر میں نہایت حسن و خوبصورتی سے محفلِ رقص و سرود منعقد کی ہے۔ راجا اگنی متر اپنی دھرنی کی باندی مالوکا کی تصویر دیکھ کر اس پر ریجھ جاتا ہے اور اسے دیکھنے کا موقع تلاش کرتا ہے۔ مالوکا اور راجا کی ایک دوسری باندی گوتمی، دو مختلف استادوں سے ناچ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ یہ دونوں استاد جوشِ رقابت میں ایک محفل سجاتے ہیں تاکہ اپنی اپنی چیلی کے کرتب دکھلائیں۔ ایک جوگن جو محل میں رہتی ہے' اس مقابلے کی ثالث مقرر کی جاتی ہے۔ راجا کا مطلب بر آتا ہے اور وہ اپنی محبوبہ کو دو بدو دیکھ لیتا ہے۔ سنسکرت ڈرامے میں ودوشک (مسخرہ) کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کلاسیکل یورپین ڈرامے میں "فول" کو وہ عموماً ہیرو کا لنگوٹیا یار ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ ڈرامے کے دوسرے ایکٹ سے براہِ راست سنسکرت سے کیا گیا ہے۔ حصۂ نظم داوین میں رکھا گیا ہے۔
فرانس کے نامور ادیب پیرلوتی (PIERRE LOTI) نے اپنے سفرنامۂ ہند میں کوچین کے ایک ناچ کا حال بڑے لطیف انداز میں لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ ہندوستانی رقّاصہ کے عنوان سے کیا گیا ہے۔
میر حسن نے بھی اپنی مثنوی میں بدرِ منیر اور بے نظیر کی شادی کے بیان میں ناچ کی محفل بڑی دھوم سے سجائی ہے۔
ان ترجموں اور اقتباس سے ایک تو ان ادیبوں کا کمال ظاہر ہوتا ہے اور پھر ادب کا تقابلی مطالعہ بھی کم دلچسپ نہیں۔ — (مترجم)

(رقص و سرود کا انتظام ہو چکا ہے اور راجا اپنے دوست کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ رانی، جوگن اور خدم و حشم حسبِ مراتب بیٹھے ہوئے ہیں)

راجا:- دیوی ان دونوں استادوں میں سے کس کی تعلیم اداکاری کا امتحان لیا جائے گا؟

جوگن:- یوں تو دونوں اپنے فن کے چاند سورج ہیں تاہم عمر کی بزرگی کے لحاظ سے گن داس کو ترجیح دینا چاہیے۔

راجا :۔ اچھا تو، مودگلیہ، ان صاحبوں کو یہ خبر پہنچا کر اپنی خدمت پر مستعد رہو ۔

حاجب :۔ کرامات، جہاں پناہ ۔ (رفت)

گن داس :۔ حضور، شرمشٹھا کا بنایا ہوا ایک گیت چوپائی میں ہے، جو مدھم سُر میں گایا جاتا ہے ۔ اس کے ایک بند کو توجہ سے سننے کی زحمت فرمائیے۔

راجا :۔ فرطِ احترام سے ہمہ تن گوش ہوں ۔

(گن داس باہر جاتا ہے)

راجا :۔ (علٰحدہ) یار ۔ وہ جو لبِ پردہ ہے اس کے شوق دیدار میں یہ بے قرار نین گویا پردے کو اُلٹ دینے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

مسخرہ :۔ (چپکے سے) بھئی لو، تمھاری آنکھوں کا رس تو آ گیا، لیکن تمھاری رانی شہد کی مکھی بنی بیٹھی ہے ۔ ذرا ہوشیاری سے درشن پیاس بجھانا ۔

(مالوکا اپنے اُستاد کے ساتھ جو اس کے سڈول بدن کو غور سے پرکھ رہا ہے، اندر آتی ہے)

مسخرہ :۔ (کان میں) حضور دیکھیے تو سہی ۔ تصویر اور اصل کے حسن میں جو سرِ مو فرق ہو ۔

راجا :۔ (آہستہ سے) دوست ۔ میرا دل اس خیال سے دھڑک رہا تھا کہ کہیں چھب میں اس کا روپ نکھر نہ آیا ہو، لیکن اب تو یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کا مصوّر نظارۂ حسن میں اتنا کھو گیا تھا کہ اس کے رنگ روپ کو نکھار نہ سکا ۔

گن داس :۔ بیٹی لاج اور جھجک کو چھوڑ کر اپنے آپے میں آجا ۔

راجا :۔ (خود بخود) حقا کہ اس کا ہر عضو تن سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، آنکھیں غلافی ہیں، چہرہ زمستان کے ماہتاب کی طرح روشن ہے اور کاندھوں سے دونوں ہاتھ کس بانکپن سے نیچے ڈھل گئے ہیں ۔ بھری ہوئی چھاتی ہے، گدرائے ہوئے جوبن تن کر ایک دوسرے سے بھڑ گئے ہیں ۔ آغوش میں کیا کٹا ڈُہے اور کمر اتنی پتلی کہ بازو حمائل کرے ۔ ساق بلورین گداز ہیں ۔ اور ان سب پر پاؤں کے انگوٹھے کی ہلکی سی کجی غضب ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کالبد اپنے اُستاد کے تخیّل کی مناسبت سے تیار کیا گیا ہے ۔

(مالوکا تال سُر ملا کر اس رباعی کو لحن سے گاتی ہے)

"پیتم پیارے کا ملنا ناممکن ہے ۔ اس لیے اے دل اب آس چھوڑ دے، لیکن میری بائیں آنکھ رہ رہ کر پھڑک کیوں رہی ہے! مدّت دراز کے بعد آج جو محبوب نظارہ فروز ہے تو اس کے پاس جاتے ہوئے میں شرما رہی ہوں ۔ میرے مالک! گو میں باندی ہوں پھر بھی یقین جان کہ تیرے فراق کی ماری ہوئی ہوں"

(گیت کے بین السطور معنی کے اظہار کے لیے وہ ناچ کر بھاؤ بتلاتی ہے)

مسخرہ :۔ (کان میں) دوست، گیت سُنا کر اُس نے بھی اظہارِ الفت کر دیا ۔

راجا :۔ بھائی، میرا دل بھی یہی شہادت دیتا ہے ۔

"میرے مالک! میں تیری مشتاق ہوں" یہ گا کر غمزہ و عشوہ سے اس نے ان الفاظ کو واضح کیا اور اشارے اشارے

لے جنوں کے راجا کی بیٹی اور راجا بیاتی کی بیوی تھی جس کا ذکر پرانوں میں کئی جگہ آیا ہے ۔

میں مخاطب کر کے اپنا دردِ دل سُنا دیا۔ کیونکہ رانی دھرنی کی موجودگی کے سبب اظہارِ مدّعا کی کوئی دوسری صورت نہ ہو سکتی تھی۔"

(گانا ختم کر کے مالوکا محفل سے اٹھنا چاہتی ہے)

مسخرہ :۔ ٹھہریے جناب آپ کی ایک آدھ بھول چوک کے متعلق مجھے دریافت کرنا ہے۔

گنُ داس :۔ بیٹی ذرا ٹھہر جاؤ کسی کو یہ کہنے کی جگہ نہ رہ جائے کہ تمھاری تعلیم میں کوئی نقص رہ گیا۔

(مالوکا پلٹ کر خاموش کھڑی ہو جاتی ہے)

راجا :۔ (خود بخود) ہر ڈھب پر اُس کا حُسن نئی آن بان دکھانے لگتا ہے۔

" لاریب کہ شانِ رقص سے یہ انداز استادگی کہیں زیادہ دل فریب ہے۔ یہ انداز کہ دھڑ چھڑی کی طرح سیدھا ہے اور بایاں ہاتھ سُرین پر اس انداز سے رکھا ہوا ہے کہ اُس کی چوڑی جُب جاپ کلائی سے لپٹی ہوئی ہے اور دوسرا ہاتھ یوں ڈھیلا لٹکا ہوا ہے گویا شیام بیل کی زلف ہے۔ اس کی آنکھیں روش پر جمی ہوئی ہیں جس پر بکھرے ہوئے پھولوں کو وہ اپنے انگوٹھے سے آہستہ آہستہ مَسل رہی ہے"

گنُ داس :۔ (مسخرے کو مخاطب کر کے) سُنیں تو سہی کہ جناب کا اعتراض کیا ہے ؟

مسخرہ :۔ پہلے اپنی ثالثہ سے پوچھ لیں بعد ازاں میں نقص کا ذکر کروں گا جو دورانِ رقص مجھے نظر آیا۔

گنُ داس :۔ دیوی جی! اپنے منشا ہدے کے مطابق فیصلہ کیجیے کہ یہ کرتب کامیاب رہا یا ناکام"

جوگن :۔ میری دانست میں تو وہ بالکل بے عیب تھا۔ کیونکہ :۔

" اس کے جسمِ نازنیں کا ہر بُن مو جذبات کی بولتی ہوئی تصویر بن گیا تھا۔ خرام اور لے میں مناسبت کی تھی اور وہ خود جذبات کے اظہار میں محو ہو گئی تھی۔ سپیں بازوؤں کی سرجنبش کیا ہی نازک تھی اور رس کی لہریں یکے بعد دیگرے اُمنڈتی آتی تھیں، لیکن ازابتدا تا آخر جذبۂ محبت میں جو قیام تھا اُس نے دلچسپی میں بڑھاؤ پیدا نہ ہونے دیا"

ہندوستانی رقّاصہ

وہ چہرہ قریب آتا جاتا ہے جس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی ہیں، جو شباب پرور ہے، جس پر غازہ مَلا ہوا ہے۔ شہوانیت اور کلفت اس پر صاف عیاں ہیں اور بڑی نزاکت و سُرعت سے وہ کبھی سامنے آتا اور پھر فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اس کی ناچتی ہوئی نین پتلیوں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ سفید مینا کاری کی زمین پر سیاہ سنگِ سلیمانی جُڑے ہوئے ہیں۔ ہر خرامِ ناز کے ساتھ جذبۂ شہوت اُبھارتی ہوئی وہ آگے آ کر پھر تاریکی کی طرف لوٹ جاتی ہے اور اُس کی ہر پیش قدمی میں ایک نیا اشتعال انگیز اشارہ پنہاں ہوتا ہے اور اس سارے وقفے میں اس کا تارِ نظر مجھ پر بندھا ہوا ہے۔ یہ سانولا سلونا مکھڑا جواہرات سے منڈھا ہوا ہے۔ ہیرے اور کندن کا ایک مکٹ پیشانی کا ہالہ بنا کر دو زلفوں کو اپنے آغوش میں چھپا کر کانوں کے اوپر ڈھلک گیا ہے۔ ناک میں اور کانوں میں کئی ہیرے جگمگا رہے ہیں۔

رات کا وقت ہے اور ہر طرف روشنی ہو رہی ہے لیکن اس انبوہ میں فقط اس تاج دار حسینہ کو دیکھ سکتا ہوں جس نے مکٹ کی اَنی مجھ پر جادو پھونک رہی ہے۔ بہتیرے تماشائی اُس کے گرد حلقہ بنا کر یوں گھور رہے ہیں کہ اسے بمشکل تمام تاؤ بھاؤ بتانے کی جگہ ملتی ہے۔ ایک ذرا سی کھُلی ہوئی جگہ رہ گئی ہے جس میں سے ہو کر وہ میرے قریب آتی اور پھر پلٹ جاتی ہے، لیکن اس کا ہونا نہ ہونا میرے لیے برابر ہے اور میں صرف اس عورت کو، اس کے درخشاں مکٹ کو، اس کی چشمِ سرمہ سا کو اور کٹیلی ابرو کو دیکھ سکتا ہوں۔ اس کا جسم نازنیں سانپ کی طرح لچکیلا ہوتے ہوئے بھی گداز اور مضبوط ہے۔ کیسے سحر طراز بازو ہیں۔ وہ جو گل بہیاں کرنے کو بے تاب معلوم ہوتے ہیں، جو سانپوں کی طرح بل کھا رہے ہیں اور جو کاندھوں تک گہر و زمرد سے زیر بار ہیں، لیکن نہیں کشش تو ان آنکھوں میں ہے جن کا انداز ہر آن تغیر پذیر ہے۔ کبھی وہ طعنہ زن ہیں تو کبھی اُن میں عجب دل پذیر حلاوت ہے۔ جب وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہے تو میں کانپنے لگتا ہوں۔ مکٹ کے رتن اور ناک کان کے جواہرات اس آب و تاب کے ساتھ جلوہ فگن ہیں اور یہ طلائی مینہ ایسا روشن حلقہ بنائے ہوئے ہے کہ اس وقت بھی جب وہ مجھ سے بچھڑ جاتی ہے، اس کا چہرہ اپنے دل رُبا نک سک اور اُڑے اُڑے سے سالونے رنگ کے ساتھ ایک پُر اسرار ابہام میں ملبوس نظر آتا ہے۔ رقاصہ آتی ہے اور جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف مجھے ناچ دکھا رہی ہے۔ کتنا لذا محروم ہے یہ رقص! صرف ان بیش قیمت گھنگروؤں کی رم جھم سُنائی دیتی ہے۔ اس کے ننگے اور ننھے پاؤں کی چاپ کا زیر و بم قالین ہی میں سما جاتا ہے۔ ان پیروں کی کشیدہ اور سیماب وش انگلیوں میں چھلّے پڑے ہیں۔

یہ رقص جس جگہ ہو رہا ہے وہ پھولوں کی مہک اور عطروں کی لپک سے اس قدر بسی ہوئی ہے کہ دم گھُٹ رہا ہے۔ فرانسیسی علاقے کے جو ہندوستانی یہاں رہتے ہیں انھوں نے میری خاطر یہ محفل سجائی ہے۔ میں اس کا مہمان ہوں جو ان میں سب سے زیادہ دولت مند ہے۔ میرے آتے ہی میزبان نے یاسمین کے پھولوں کا کئی لڑی کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا اور ایک نقرئی گُلاب پاش سے مجھ پر چھڑکا ڈکیا۔ گرمی کے مارے سانس رُک رہا ہے۔ تقریباً سب ہی مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ گویا کالے کالے سروں کی ایک قطار ہے اس پر زری کی پگڑیاں رکھی ہوئی ہیں۔ نیم برہنہ ایستادہ نوکر تاڑ کے رنگین پتوں کے بڑے بڑے پنکھوں کو ان کی کھوپڑیوں پر جھَل رہے ہیں۔ اس خوش لباس مجمع میں جہاں مرد بھی جواہرات میں جڑے ہیں ان غریبوں کی برہنگی کمال درجہ موجبِ حیرت ہے۔

رقاصہ سے کہہ دیا گیا تھا کہ یہ جشن میرے اعزاز میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ جسے ذوق و اکتساب دونوں حاصل ہیں یوں مجھ پر توجہ کر رہی ہے۔

آج شام کو وہ دور دراز سے یہاں آئی ہے۔ دکن کے کسی مندر میں وہ شیو بھگوان کی داسی ہے۔ دور دُور تک اُس کا شہرہ ہے۔ اور ایک ناچ کے لیے اسے بہت روپے دینے ہوتے ہیں۔

وہ آگے پیچھے جھوم رہی ہے۔ ساتھ ساتھ اس کے برہنہ سیمیں بازو مچل رہے ہیں۔ اس کی اُنگلیاں طرح طرح سے مٹک رہی ہیں، انگشتِ پا جو بچپن سے اپنے کرتب کی مشق کرتے آئے ہیں اور بھی اچرج دکھا رہے ہیں۔ انگوٹھا برابر الگ اور ادھ کھڑا رہتا ہے۔ سنہرے کمر بند اور اس سینے بند کے بیچ جس میں اس کے جوبن جکڑے ہوئے ہیں، اس کے چمپئی بدن اور گٹھے ہوئے سڈول جسم کی ذرا سی پھبن نظر آ رہی ہے۔ سینے کے نچلے اُبھار کی تھرکن کو بھی ہم صاف دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا رقص مختلف اداؤں کے اظہار کا ایک سلسلہ ہے۔ ایک قسم کی اداکارانہ ایک شخصی تمثیل ہے۔ اس کا رہ رہ کر سامنے آنا اور جھک کر پیچھے لوٹ جانا۔ تماشائیوں کے جمگھٹ کو چیر کر مجھ پر ٹکٹکی باندھے ہوئے بہت قریب آ جانا اور پھر بجلی کی طرح اس تاریکی میں گھُل مل جانا جو دیوان خانوں کی پشت پر چھپائی

ہو ئی ہے ۔
وہ شہوت اور ملامت کا ایک نظارہ پیش کر رہی ہے۔ پس منظر میں سازندے طنبوروں اور بانسریوں سے اس نظارے کو سرود کا لباس پہنا رہے ہیں ۔

اداکاری کے ساتھ وہ زیر لب گاتی بھی جاتی ہے ۔ اتنے دھیمے سروں میں جنھیں اس کے سوا کوئی اور نہیں سن سکتا ۔ اس سے اس کی یادداشت تازہ ہوتی جاتی ہے اور اپنے کرتب کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں اسے مدد ملتی ہے ۔

لو وہ دیوان خانے کے تاریک گوشے سے باہر نکلی، سونے روپے سے جگمگاتی ہوئی! "گلہ و شکوہ" کی پُرعتاب اداؤں کے ساتھ وہ میری طرف لپکتی ہے اور اس انداز سے مجھ پر ملامت کرتی ہے گویا فلک کو میرے گناہ کی ہوسناکی کا شاہد بنا رہی ہے ۔

ایک بیک رقاصہ طنز سے کھل کھلا کر ہنسنے لگتی ہے ۔ اپنی زہر آلود حقارت سے وہ مجھے عرق عرق کر دیتی ہے اور طعنہ زن مجمع کو انگلی اٹھا کر میری طرف متوجہ کرتی ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کی طعن و تشنیع بھی اسی طرح فرضی ہے جس طرح وہ پُرغضب ہو رہی تھی ، لیکن اس اداکاری کے نظری ہونے میں ذرا شبہ نہیں ۔ اس کی کھل کھلاہٹ اور اُداس ہنسی کی صدائے بازگشت اس کے سرجوش سینے میں گونج رہی ہے اور جب وہ ہنستی ہے تو اس کا منہ، آنکھیں، ابرو، نیز ہانپتی اور کانپتی ہوئی چھاتیاں بھی ہنسنے لگتی ہیں ۔

جب وہ اس طرح ہنستی ہوئی پیچھے بھاگتی ہے تو بلا کا اثر ہوتا ہے اور تماشائی اس کے ساتھ ہنسنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے ۔ وہ پوری طاقت سے پیچھے پلٹتی ہے ۔ اپنے سر کو اس طرح موڑ کر کہ مجھے دوبارہ نہ دیکھ سکے، لیکن وہ اب ہولے ہولے بڑی شان کے ساتھ اِدھر آ رہی ہے وہ طعن چھیڑنے کے لیے ہی تھا ۔ اس کی محبت اتھاہ ہے ۔ اثرِ الفت نے اسے پُرشکستہ کر کے اس صورت میں کھینچا ہے ۔ کبھی تو وہ معافی کی التجا میں دونوں ہاتھ پھیلاتی ہے اور کبھی خودسپردگی کا یقین دلاتی ہے ۔ اور اب جو وہ اپنے سر کو پیچھے پھینک کر ادھ کھلے نیم کشادہ لبوں میں گوہرِ دنداں کی آب دکھلا کر جو ہیرے کی کیل کے نیچے جھلک رہے ہیں، بازگشت کرتی ہے تو وہ مجھے دعوتِ ہم رکابی دیتی ہے ۔ بلکہ وہ مجھے حکم دے رہی ہے ۔ اس کے بازو، اس کے جوبن، اس کے متوالے نین مجھے اپنے پاس بلا رہے ہیں ۔ اس کی زندگی کا ہر تار سراپا اذن بن گیا ہے ۔ گویا وہ مجسّم مقناطیس ہے ۔ ذرا سی دیر میں بلا ارادہ کہیں میں اس کی دعوت پر لبیک نہ کہہ دوں ۔

ان دل رُبائیوں نے مجھے گرفتارِ نظر کر لیا ہے ۔ جھوٹے ہیں اس کی محبت کے دعوے ۔ اس کی ہنسی کی طرح یہ بھی اس تماشے کے سیپارے ہیں ۔ یہ کون نہیں جانتا اور پھر بھی اس احساس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا ۔ شاید اس عشوہ طرازی کا علم منظر میں نئی اور شدید کشش پیدا کر دیتا ہے ۔

جب وہ بھاؤ دکھاتی ہے تو دونوں سازندوں میں اور اس میں ایک مقناطیسی یا پوشیدہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے ۔ وہ بھی انسانوں کی قطاروں سے ہو کر آگے آتے اور پیچھے جاتے ہیں ۔ آگے بڑھ کر پھر تین چار قدم پیچھے لوٹ جاتے ہیں ۔ رقاصہ جب میرے پاس آتی ہے تو وہ بھی قریب آ جاتے ہیں، لیکن اس کی واپسی سے پہلے ہی لوٹ جاتے ہیں ۔ وہ کبھی نظروں سے اسے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور ان کی آنکھیں نگاہیں اس پر جمی رہتی ہیں ۔ ساتھ ساتھ وہ گلا پھاڑ کر مؤذن کی سی فلک سیر آوازیں گاتے جاتے ہیں ۔ یہ اونچے پورے سازندے سر جھکا کر اس کے بوٹے سے قد کا جائزہ لیا کرتے ہیں ۔ ان کے وتیرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُستاد ہیں جو اس رقاصہ کی روح میں سمائے ہوئے ہیں ۔ گویا وہ اپنی آواز سے اس کی رہبری کر رہے ہیں اور وہ اپنے سانس کی گرمی سے اسے گرما رہے ہیں یا یہ کہ وہ کوئی نازک اور فرخندہ تتلی ہے جسے انھوں نے اپنی مرضی کا غلام بنا رکھا ہے ۔ اس پوری روش میں کوئی ایسی نامعلوم شے ہے جو غیر مرئی اور کجِ فطرت معلوم ہوتی ہے ۔

طائفہ جس جگہ بیٹھا تھا وہاں روشنی کچھ ہلکی ہلکی سی تھی ۔ وہاں دو تین خوش لباس رقاصائیں بیٹھی ہوئی تھیں جن کا ناچ پہلے ہو چکا تھا ۔

ان میں سے ایک نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا کیونکہ وہ ایک زہریلے مگر حسین پھول سے ملتی جلتی تھی۔ دراز قامت اور چھریرا بدن جس کے اعضا بہت نازک معلوم ہوتے تھے اور آنکھیں کاجل کی لمبی لیک کے بغیر بھی بہت بڑی تھیں۔ گہرے کالے بال جن کے گچھے چوٹیوں میں گندھے ہوئے، گالوں پر لہرا رہے تھے۔ سیاہ لباس، سیاہ کمربند اور ہلکی سی رو پہلی گوٹ کی کالی نقاب، اس کے گہنوں میں زمرد کے سوا کچھ نہ تھا۔ کلائی اور ہاتھوں میں بیش بہا لعل اور ناک میں عقیق کی بلاق جو لبوں پر یوں لٹکی ہوئی تھی گویا مرے ہوئے ہونٹوں پر خون کا ایک قطرہ ٹپک پڑا ہے۔

لیکن میں ان سب کو بھول گیا جب میں نے اس رانی کو اس ستارہ جبیں کو دیکھا جو یکایک سازندوں کی قطار کو چیر کر نمودار ہوگئی۔ وہی جو سونے روپے میں لدی ہوئی سب کے بعد سامانِ نظارہ مہیا کرنے آئی تھی۔

یہ رقص طویل تھا۔ بہت طویل حتیٰ کہ تکان سی محسوس ہونے لگی تاہم اس لمحے کے خوف سے میں ہراساں ہو رہا تھا جب وہ ختم ہو جائے گا اور میں پھر کبھی اسے نہ دیکھ سکوں گا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے ملامت اور مسکراہٹ کے نشتر لگائے از سرِ نو اس کی جھکتی ہوئی آنکھوں کا تیر طنز میرے دل میں چبھ گیا اور اوپر لگاوٹ کے وہ اشارے میرے دل میں کھُب گئے۔

بالآخر وہ خاموش ہوگئی اور سب کچھ ختم ہوگیا۔ میں ہوش میں آتا ہوں اور اس مجمع کو دیکھ کر یاد کرتا ہوں کہ یہ جشن اور اس کی حقیقت کیا تھی۔ اب برخاست ہونے کا وقت ہوگیا ہے اور میں اپنا ہدیۂ تحسین پیش کرنے کی غرض سے رقاصہ کے پاس جاتا ہوں۔ وہ ایک جھینے ہوئے رومال سے منہ کا پسینہ پونچھ رہی ہے۔

گرمی کے مارے اس کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں مرمریں سینے پر ڈھلک رہی ہیں۔ اب بالکل بے نیازی، بے پروائی اور تکلف کے ساتھ یہ تھکی ہاری تجاہل کیش تماشا گر مجھے سلام کرتی ہے۔ اس ہندوستانی سلام کے بھولے پن میں بھی تیلھا طنز پنہاں ہے۔ ہر سلام کے ساتھ وہ اپنے رُخِ زیبا کا پردہ دار ہاتھوں کو بنالیتی ہے جن کے پور پور میں ہیرے دمک رہے ہیں۔

کسی رقاصہ کی روح نسل اور نجابت کی کیا پروا کرتی ہے؟ وہ خاندانی نرتکیوں کی اولاد ہے جسے سیکڑوں اور ہزاروں سال سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ محض عیش وعشرت کی بندی ہو کر زندگی گزارے۔

بے نظیر اور بدرِ منیر کی شادی کا جلسہ

کروں راگ اور ناچ کا کیا بیاں　　قدیمی کسی وقت کا سا سماں
وہ اربابِ عشرت کا آپس میں مل　　جمانا کھڑے راگ کا دے کے دل
وہ ایمن کی تانیں اِدھر اور اُدھر　　ملے سُر طنبوروں کے با یک دگر
اور اس صف سے اک چھوکری کا نکل　　جتانا ہنر اپنا پہلے پہل
اُلٹنا دو پٹے کا دے دے کے تال　　وہ بڑھنا سا قد اور گھنگرو کی چال
کبھی پھر ملو، میں دکھانی ادا　　کہ جوں لوٹ کر ہووے بجلی ہوا

کبھی، گت سری، ناچنا ذوق سے — کہ تیورا کے عاشق گرے شوق سے
اِدھر کی تو یہ گت اور اُس کا یہ بھاؤ — اُدھر اوٹ میں نائیکہ کا بناؤ
کھڑی ہو کے دو گھونٹ حقے کی لے — چبا پان اور رنگ ہونٹوں پہ دے
انگوٹھی کی لے سامنے آرسی — وہ صورت کو دیکھ اپنی گلزار سی
اُلٹ آستیں اور چُھری کا چاک — نئے سر سے انگیا کو کر ٹھیک ٹھاک
بنا کنگھی اور کرکے ابرو درست — جھٹک دامن اور ہو کے چالاک چُست
دوپٹے کو سر پر اُلٹ اور سنبھل — یکایک وہ صف چیر آنا نکل
پکڑ کان اور گھنگھرو دُوں کو اُٹھا — پہن پاؤں میں اور سر سے چھوا
اِدھر اور اُدھر رکھ کے کاندھے پہ ہاتھ — چلے ناچتے آنا سنگت کے ساتھ
فتح چند کے ہاتھ کی مورت ایک — لحائی ہوئی چاند سی صورت ایک

کبھی ناچنا اور گانا کبھی
رجھانا کبھی اور بتانا کبھی

معاصر جرمن ادب

نمائندہ ادب پاروں کا مجموعہ

شائع ہو گیا

انتخاب و ترجمہ

ڈاکٹر منیر الدین احمد

اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا معیاری انتخاب جس میں

معاصر جرمن ادب کے نمائندہ تخلیق کاروں کی نظمیں ۔ افسانے ۔ طنزیے وغیرہ

براہِ راست جرمنی سے ڈاکٹر منیر الدین احمد نے اردو میں منتقل کیے ہیں ۔

ناشر: جرمن پاکستان فورم

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

مقدمہ

ہند جدید کی تاریخ میں جنگِ عظیم کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ قومی تحریکیں جو یہاں وہاں چھوٹے بڑے چشموں کی صورت میں بہہ رہی تھیں اب ایک عمیق اور وسیع دریا کی شکل میں اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگتی ہیں۔ قومیت ایک بہت بڑے گروہ کے لیے فلسفۂ زندگی بن جاتی ہے اور حیات کے اُن شعبوں پر بھی اپنا اثر ڈالنے لگتی ہے جو بظاہر مادّی تحریکوں سے بے نیاز ہیں۔ ہندوستانی مصوّری اور موسیقی کے نئے رجحان اس امر کے شاہد ہیں۔

ہماری قومیت کا تمدّنی سانچہ بنگال میں تیار ہوا تھا۔ ہند جدید کا سب سے پہلا ریفارمر راجہ رام موہن رائے وہیں پیدا ہوا۔ مغربی علوم و فنون کا چرچا پہلے پہل وہیں شروع ہوا۔ اور ۱۹۵۰ء کے بعد سیاسی و سماجی اصلاح کی صدا بھی وہیں سے بلند ہوئی۔ جنھوں نے یورپ کے ریفارمیشن REFORMATION کی تحریک کا مطالعہ کیا ہے انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تاریخ زمان و مکان کی قیود سے کتنی آزاد اور انسان کی جد و جہد کس قدر مطیع ہے۔ ہزاروں میل کی دوری اور صدیوں کے فصل کے باوجود ارتقا کی وہی روِش دو مختلف موقعوں اور جگہوں میں اپنا کام کرتی ہے۔ یعنی یورپ میں سینکڑوں سال پہلے جن سیاسی و اقتصادی مطالبات کی وجہ سے نشاۃ ثانیہ اور سماجی اصلاح کی مہم شروع ہوئی تھی، تقریباً وہی نظارہ اب بنگال نے دیکھا۔ فرق یہ تھا کہ ہندستان میں دو تمدن۔ ہندو اور مسلم۔ موجود تھے اور اُن کے آگے ایک بدیسی سامراج کا مرحلہ درپیش تھا۔ بنگال کی قومی تحریک نے ابتدا میں اس مثلث کو جس طریقے سے سلجھانا چاہا اُس کی مثال بنکم چٹرجی کے ناول ہیں۔ ان میں ہندُستان کے لیے کسی واحد قومیت کا تخیل نہ تھا۔ مسلمانوں اور انگریزوں دونوں سے بیزاری تھی اور وطن کا وارث حقیقی ہندوؤں کو بتلایا گیا تھا۔ جنگِ عظیم تک یہ نقطۂ نگاہ کم و بیش باقی رہا اور اس کی صدائے بازگشت ہم دستوری تحریکوں میں ہی نہیں بلکہ 'یگ ماں' اور تلک اسکول کی انقلابی تحریروں میں بھی پاتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ بنگال میں برہمو سماج، رام کرشن پرم ہنس و ویکا نند وغیرہ کے باطنی، انسانیت پسند اور لبرل خیالات بھی مقبول تھے۔ دیانند کی ویدک اور تلک کی گیتا والی جابرانہ تعلیم کے مقابلے میں یہ لوگ اُپنشد کی امن پسند تعلیم کے علمبردار تھے۔ مگر دونوں کا مقصد ہندو نشاۃ ثانیہ اور قدیم ہند تہذیب کی نئی زندگی تھی۔

بنگالی ادب کا موجودہ "دور "ٹیگور" کا عہد" کہلاتا ہے۔ ٹیگور کی شخصیت نے بنگالی ادب کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یوں تو

ادب کا ہر شعبہ اس کا منت پذیر ہے لیکن یہاں ہم صرف اُس کی شاعری کا ذکر کرتے ہیں۔

بنگالی مشرق کے اطالوی کہے جاتے ہیں۔ بڑی حد تک یہ تشبیہ صحیح بھی ہے۔ آب و ہوا نے ان دونوں قوموں میں رومان اور نغمے کی محبت پیدا کر دی ہے، اگر دونوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ امن پسند ہیں اور ان تمام چیزوں کے خوگر جو برسات اور گرمی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی زبان شیریں ہے جس میں قدرے نسوانیت ہے۔ اُن کا ادبی ذوق حقیقت کی طرف نہیں بلکہ رومان اور ابہام کی طرف لے جاتا ہے، اور غالباً یہ سچ ہے کہ اطالیہ نے جتنے سینٹ اور بنگال نے جتنے سادھو اور سوامی پیدا کیے ہیں اتنے کہیں اور نہ ہوئے ہوں گے۔

ٹیگور کا کمال یہ نہیں تھا کہ اُس نے بنگال کی روح کو جِلا دی بلکہ یہ کہ بنگال کی روح کو پا گیا۔ بنگالی زبان کی غنائی خوبیوں کو اُس نے سنوارا اور زبان کی آب و ہوا کو اُس نے اپنی نظموں میں سمویا۔ اُس کے لیے اُس نے مغربی اور قدیمی (سنسکرت) بحروں کو جس خوبصورتی سے برتا، اور زبان کے لیے جیسے نادر اسلوب پیدا کیے اُن کا شمار ادبِ عالم کے شہپاروں میں ہو سکتا ہے۔ شاعری کے قالب سے قطع نظر کر کے اگر ٹیگور کے نفسِ مضمون کی طرف آئیے تو یہاں ہم جمود اور بے حرکتی کا وہی تماشہ دیکھتے ہیں جو گوتم بدھ اور ٹالسٹائی سے منسوب ہے۔ نظامِ زندگی کی ناانصافیوں سے وہ تنگ تو ضرور ہے لیکن اس کا کوئی مداوا اُس کے پاس نہیں ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر سے آپ کسی دوا کی توقع کیوں رکھیں۔ لیکن ٹیگور کسی نہ کسی صورت میں "دعا" پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی مفکر ماضی و حال کی بے راہ روی کو سمجھتے ہوئے بھی مستقبل کو دعا کے سپرد کر دے تو اسے کیا کہا جائے۔

ٹیگور نے امن و عافیت کا جو طلسم کھڑا کیا تھا اُس کے گنبدوں میں کبھی کبھی دہشت پسندوں کے بم گونج اٹھتے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خواب جو کالی داس کے عہد سے شروع ہوا ہے جلد ٹوٹنے والا ہے۔ لیکن جنگِ عظیم کے خاتمے تک کوئی قومی تحریک عوام تک نہ پہنچی اور متوسط طبقہ کبھی کُھل کر اس سے متاثر نہ ہوا۔ ٹیگور کا جادو بنگال میں باقی رہا۔

عدمِ تعاون کی سیاسی تحریک ہماری تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے۔ اس لڑائی میں ہم نے جو حربے استعمال کیے اُن سے بحث نہیں۔ بلکہ یہ امر قابلِ غور ہے کہ انھیں استعمال کرنے والا ہمارا کسان تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مدتوں سے سویا ہوا یہ کوہِ آتش فشاں جاگ اٹھا ہے اور اپنے بندھنوں کو ابھی توڑ کر پھینک دے گا۔

ہم سب کو وہ دن ابھی بھولے نہ ہوں گے۔ سیاسی ہنگاموں کا تو کہنا ہی کیا۔ پارسی تھیٹر بھی، اندرسبھا، اور لیلیٰ مجنوں، کو چھوڑ کر سودیشی اور سوراج کے گیت گانے لگے تھے۔ قوالیوں اور کیرتنوں سے ہندو مسلم اتحاد کی صدا آتی تھی۔ شاعروں کا لشکر حکومتِ برطانیہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا اور وہ حضرات جنھوں نے غزل کی مشاطہ گری میں داڑھیوں کے بال سفید کر لیے تھے، اب مجاہدانِ ملت کے نئے روپ میں نظر آ رہے تھے۔

بنگال جو تمام قومی تحریکوں کا جنم داتا تھا اس ہیجان میں خاموش تماشائی نہ رہ سکتا تھا۔ ہندوستان میں بنگالی سے زیادہ وطن پرست کوئی نہیں۔ اُس کا جوش اُس ندی کی طرح ہے جس کی جوانی مانسون کے دم تک ہے۔ جب وہ اُمنگ میں آتی ہے تو اپنے سامنے کسی بند کو نہیں ٹکنے دیتی۔ اس ہنگامہ خیز دور میں وہاں جتنی سیاسی تحریریں قلم بند ہوئیں اُن کا شمار ناممکن ہے۔ یہ جوش تو آیا گیا ہوا، جو چیز باقی رہ گئی وہ نیا دور تھا جو بنگال کے آرٹ اور ادب کی دنیا میں شروع ہوا اور اب تک چلا جا رہا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ زمانہ بڑے بڑے ہنگاموں اور انقلابوں کی یاد صرف اُن چند لکیروں اور محاوروں میں چھوڑ جاتا ہے جو کسی ملک کے طرزِ تعمیر اور طرزِ بیان میں وہ

جاتے ہیں۔

اس نئے ادبی دور کے بانی اور علم بردار کا نام نذرالاسلام تھا۔

جنگِ عظیم کا زمانہ ہے۔ عراق کا میدانِ کارزار دن بھر گرم رہ چکا ہے اور اب خدا خدا کر کے رات ہوئی ہے۔ ہر طرف سناٹا اور اندھیرا ہے۔ کبھی کبھی ہوائی جہاز دشمن کی ٹوہ لینے کے لیے نیچے روشنی پھینکتے ہیں۔ دفعتاً بندوقوں کی آواز اور بموں کی شور و غل سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ خندقوں میں سپاہی غفلت کی نیند سونے لگتے ہیں۔

مگر کسی خندق میں ایک سپاہی جاگ رہا ہے دن بھر مورچے پر وہ بڑی مستعدی سے لڑتا رہا ہے اور تھکان سے اس کے بند بند ڈھیلے پڑ چکے ہیں۔ پھر بھی اس کی آنکھوں سے نیند کالے کوسوں دور کیوں ہے؟ اس بے کلی اور بے چینی کی وجہ کیا ہے؟ اسے خود نہیں معلوم! تھوڑی دوری پہ شط العرب کا دھارا تیزی سے بہہ رہا ہے۔ سپاہی نذرالاسلام صرف یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے دل میں کچھ جذبات موجزن ہیں اور الفاظ کا لباس پہننا چاہتے ہیں اس سے پہلے اس نے شاعری کی باقاعدہ مشق نہیں کی تھی اور بحر و قوافی کے گُروں سے ناواقف تھا۔ لیکن یہ وہ عالم ہے جسے شاعر الہام سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اندھیرے میں پنسل سے کاغذ پر کچھ لکھنے لگتا ہے اور صبح ان جملوں کو دیکھ کر اس کی حیرت و استعجاب کی حد نہیں رہتی۔ بلاارادہ اس نے ایک نظم لکھ ڈالی۔ یہ اس کی پہلی مطبوعہ نظم "شاتی العرب" ہے۔

نذرالاسلام ایک گم نام کسان گھرانے کا فرد تھا۔ بردوان کے کسی گاؤں میں آج سے ۴۲ سال پہلے وہ پیدا ہوا۔ قدرت نے اسے پالا اور غربت کے سرد مہر ہاتھوں نے اس کی تربیت کی۔ اسکولوں اور کالجوں کے عیش اس کے نصیب میں نہ تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں بھرتی ہو کر وہ عراق چلا گیا۔ اور سچ پوچھا جائے تو یہی میدانِ جنگ اس کے لیے سب سے بڑی تعلیم گاہ ثابت ہوا۔

جب وہ لڑائی کے میدان سے حوالدار بن کر ہندوستان لوٹا تو اس کے ساتھ چند نظموں کا مسودہ بھی تھا۔ اس دوران میں یہاں تحریکِ خلافت اور عدم تعاون کی سن گن شروع ہو چکی تھی۔ نذرالاسلام نے دیکھا کہ جو آگ دل میں چھپا کر وہ لایا ہے اس کی لپٹیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور سارا ملک قربان گاہ بنا ہوا ہے۔

بدنصیبی سے ہم ہنوز ان اثرات اور اسباب سے نا آشنا ہیں جنھوں نے نذرالاسلام کے خیالات کی کایا پلٹ کر دی اور ان کے اظہار کا ذریعہ شاعری کو بنایا۔ ہمارے استفسار کے جواب میں وہ کہتا ہے "یہ کیوں پوچھتے ہو کہ طوفان کہاں اور کیوں کر پیدا ہوا" تاہم میدانِ جنگ میں لکھی ہوئی ان نظموں کو پڑھ کر اور اس کے ماحول کو دیکھ کر ہم اس کے رجحان کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان کا مجموعہ "اگنی بینا" (آگ کی بانسری) کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ آٹھ یا نو نظموں پر مشتمل ہے جن میں سے دو کو چھوڑ کر باقی سب عراق میں لکھی گئی تھیں۔ یہ سب اسلامی روایات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں ہم اس مسلمان انقلابی کی جھلک دیکھ سکتے ہیں جس کی مثال اس زمانے میں کم یاب نہ تھی اور جو ہندوستان سے زیادہ ترکی اور ممالک عرب کی آزادی کا خواہاں تھا۔ جو بھی ہو یہاں اس کی فطرت کا اصلی جوہر ہمیں ملتا ہے جو آزادی کی لگن اور ظلم کی نفرت ہے۔

اس کے ماحول کو دیکھو تو وہ ایک مسلمان کسان کا بیٹا ہونے کے ساتھ سپاہی بھی ہے۔ کسان سپاہی میں انقلاب گری کے بڑے بڑے امکانات پنہاں ہوتے ہیں بشرطیکہ اس کا ساتھ مزدور سے ہو جائے۔ کسان مزدور اور سپاہی۔ ان کا اتحاد دنیا کی تمام جابر سلطنتوں کا تختہ الٹ سکتا ہے۔ زار کا زوال اس حقیقت کا ثبوت ہے۔

مسلمان کی گرم گفتاری کسان کی حقیقت پسندی اور سپاہی کا جوش۔ یہ تینوں چیزیں نذرالاسلام کو ودیعت کی گئی تھیں۔ مزدور کی انقلابی سرشت کی کمی تھی، سو وہ بھی بعد میں پوری ہو گئی۔

ہندوستان لوٹنے کے بعد نذرالاسلام کو اپنے خیالات کی تہذیب اور مطالعے کا موقع ملا۔ اس کے بعد اُس نے وہ زندہ جاوید نظم "ودروہی" (باغی) لکھی جس نے اُسے ادبی انقلاب کا علم بردار بنا دیا اور "ودروہی کوی" (شاعرِ بغاوت) کا لقب دلایا۔ پروفیسر بنے کمار سرکار اپنی تصنیف میں اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "جب میں نے نذرالاسلام کی نظم "باغی" کو پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ گزشتہ دس سال سے ہم بنگلہ ادب میں جس انقلاب کے متوقع تھے آج اس کا آغاز ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں زندگی اور جوش کا الم۔ در اصل حقیقت یہ ہے مسلمانوں نے اب تک اپنی مادری زبان کی خدمت اتنی نہیں کی تھی جتنی ان پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اب ثابت ہوا کہ بنگال کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کرنے کا سہرا نذرالاسلام ہی کے سر بندھنے والا تھا۔"

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ "باغی" ہمارے ادب میں اپنی قسم کی اچھوتی چیز ہے۔ وکٹر ہیوگو (طوفان) سون برن (رہبر تھا) اور لارڈ بائرن (تخریب)، جیسے باکمال شاعروں نے اس موضوع پر سیر حاصل نظمیں لکھی ہیں اور پشکن کا ترانہ "آزادی" روسی انقلابیوں کے وردِ زباں رہ چکا ہے۔ لیکن باغی کی عظمت ان سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس میں بلا کا زور ہے اور اُس کی خوبی ان اضداد میں مضمر ہے جن کے تو قلموں جوہر سے شاعر نے "آتشیں بت" بنایا ہے۔ ابھی اُس کے خیالات میں وہ پختگی اور صفائی تو نہیں آئی ہے اور اس کا نظریۂ زندگی اتنا واضح نہیں ہے جس کی نظیر "نعرۂ انقلاب" کی نظموں میں ملے گی۔ مگر بغاوت کا ایسا نکھرا رنگ اور مکمل خاکہ مشکل سے کہیں ملے گا۔

"آگنی" (آمد) اور "ودروہی" (باغی) ان دونوں نظموں نے بنگال کے ادبی حلقوں میں ہل چل مچا دی۔ اخباروں میں مہینوں ان کا چرچا رہا اور قدامت پسندوں نے ان پر سخت واویلا مچایا۔ ان کی نئی بحریں اور نئے مضامین ایک نئے دور کا اعلان کر رہے تھے۔ ٹیگور اسکول کے حامیوں کو یاد نہ رہا کہ کبھی انھوں نے بھی بنکم چٹرجی اور ڈی۔ ایل۔ رائے کی روایات کو توڑ کر اپنے لیے راستہ بنایا تھا۔ ان ادبی مباحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوان اور بوڑھے دو حلقوں میں بٹ گئے اور ان کے تنازع کی بنا نذرالاسلام کی شاعری قرار پائی۔

بنگلہ ادب کو نذرالاسلام کا عطیہ بڑا بیش قیمت تھا۔ سب سے بڑی چیز تو وہ سندیس تھا جو وہ اپنے وطن کے نام لایا تھا۔ یہ اُن جاں بازوں کا پیغام تھا جو انسانیت کی نجات کے لیے دیس پردیس میں سولیوں پر چڑھ رہے تھے اور کال کوٹھریوں میں سڑ رہے تھے۔ لیکن وہ اسلوب کم اہم نہ تھا جس میں اُس نے اس پیام کو پیش کیا۔ شاعری یا ادب کے ہر شعبے میں طرز یا اسلوب کو سب سے بڑا مرتبہ حاصل ہے اور اچھے سے اچھا مضمون اسلوب کے نقص کی وجہ سے بے اثر اور بے جان رہ جاتا ہے۔ نذرالاسلام اس راز کو سمجھا اور اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اُس نے جو لباس وضع کیا اُس کی سج دھج ہی نئی تھی۔

بنگلہ زبان کی نسوانی غنائیت کسی رزمیہ مضمون کے لیے زہر ہلاہل تھی اور ٹیگور کے بنائے ہوئے سانچے امن و آشتی کی ٹھنڈک میں تو خوب کام دیتے تھے۔ لیکن عمل اور حرکت کی آنچ پڑتے ہی تڑخ جاتے تھے۔ یہاں فارسی کا وہ علم نذرالاسلام کے آڑے آیا جو اس نے مکتبوں میں حاصل کیا تھا اور جس کی مشق اس نے بعد میں بھی جاری رکھی تھی۔ وہ اُردو بھی کام آئی جو اس نے کلکتے کے بازاروں اور لڑائی کے میدانوں میں سیکھی تھی۔ اُس نے فارسی اور اُردو کے سبک الفاظ اپنی نظموں میں گھلانے شروع کیے تاکہ بیان میں خاطر خواہ زور پیدا ہو سکے۔ ادبی پاک بازوں کے لیے یہ بہت بڑی بدعت تھی۔ گو کہ بنگلہ بولنے والوں کی زیادہ تعداد مسلمانوں پر

مشتمل تھی اور وہ عربی اور فارسی سے استفادہ کرنے کے اُتنے ہی مجاز تھے جتنا کہ ہندو سنسکرت سے، مگر جب نذرالاسلام نے ادبی ضروریات کی وجہ سے بہ جدّت شروع کی تو اسے فرقہ پرستی کا نام دیا گیا۔ بہرحال رفتہ رفتہ یہ رجحان بہت مقبول ہو گیا۔ اور اب تو اس کے تتبع میں غزل نویسی بنگلہ شاعری کی خاص صنف بن گئی ہے۔

نذرالاسلام کی دوسری دین وہ رزمیہ موسیقی تھی جو اس کے پیام کو پُراثر بنانے کے لیے ضروری تھی۔ یہاں موسیقی کے اُس علم نے اُس کی مدد کی جو اُس نے لڑکپن میں حاصل کیا تھا۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ ہندوستانی شاعری کے قالب کو بدلنے والے سب لوگ موسیقی کے ماہر ہیں۔ بنگلہ میں ٹیگور اور نذرالاسلام اور ہندی میں "پنت" اور نرالا اس کی مثالیں ہیں۔ اُردو میں اب تک یہ تغیر نہ ہو سکنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ اردو داں تعلیم یافتہ طبقے میں موسیقی کا چرچا نسبتاً کم ہے۔ علاوہ بریں اُردو بحروں کو وسعت دینے کے لیے ہندوستانی موسیقی کو جاننے کی اُتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ عربی و فارسی موسیقی کو۔ اور یہ ٹیڑھی کھیر ہے۔

پیغام کی نوعیت، زبان و بیاں کی جدّت اور طرزِ کلام کی قوّت۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جنھوں نے بہت کم عمری میں نذرالاسلام کو بنگال کا سب سے مقبول شاعر بنا دیا۔

اس قسم کی نظموں کی اشاعت کا یہ ناگزیر نتیجہ تھا کہ ہمارے شاعر سے حولداری کی وردی چھن جائے اور اس کی چھوٹی سی پنشن بند ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ حکومت نے اس کی نظموں کے مجموعے بھی ضبط کرنے شروع کیے۔ چنانچہ اب تک وہ دو مرتبہ جیل کی ہوا کھا چکا ہے اور اُس کے پانچ مجموعے ضبط ہیں۔ ہندوستان کے کسی دوسرے شاعر کو یہ فخر حاصل نہیں۔

لیکن حکومت کا عتاب اور قدامت پرستوں کی مخالفت اُس کا کیا بگاڑ سکتی تھی جسے قبولِ عام کی سند مل چکی ہو۔ اس نے ۱۹۰۰ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان، "کلّول" اور "نوروز" کے نام سے دو ہفتہ وار اخبار نکالے۔ شروع میں تو یہ خوب چلے لیکن جب سیاسی ہنگاموں کی جگہ ہندو مسلم فسادوں نے لے لی تو انھیں کون پوچھتا۔ بند ہو جانے کے بعد بھی کلّول کا اثر باقی رہا اور "کلّول اسکول" کے ادیب یورپ کے رومانی ادیبوں کی طرح اپنے لیے ایک خاص مقام بنا گئے۔ ان کی جدّتوں اور بدعتوں نے پنڈتوں اور مولویوں کے حجروں کو ماتم کدہ بنا دیا۔ ان ادیبوں میں سے کچھ نے نذرالاسلام کی سرکردگی میں سماجی انقلاب کو اپنا اصلی مقصد بنایا۔ مگر کچھ اس راستے سے ہٹ گئے اور "جیمس جوئس" اور فرائڈ سے متاثر ہو کر انھوں نے جنسی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ اس کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ معلوم۔

یہ نذرالاسلام کی خوش نصیبی تھی کہ ٹیگور اسکول کی مخالفت کے مقابلے میں اسے سی۔آر۔داس جیسے قدرشناس کی پشت پناہی مل گئی۔ داس مرحوم بڑے وسیع القلب تھے اور ہونہار نوجوانوں پر اُن کا خاص التفات رہتا تھا۔ خود شعر کہتے تھے اور اُن کے کلام کا ایک مجموعہ بھی موجود ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی نے اُن کٹھن منزلوں میں نذرالاسلام کی رہبری کی جن کی کھکھیڑیں ہر باکمال کو ابتدا میں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ وہ اس کے ایسے شیدا تھے کہ اپنے انگریزی روزنامہ فارورڈ FORWARD کے سرورق پر اس کی بنگالی نظمیں چھاپا کرتے تھے۔

۱۹۲۶ء کا سال نذرالاسلام کے لیے بڑا منحوس ثابت ہوا۔ اس سے پہلے اُس کے مشفق سی۔آر۔داس کا انتقال ہو چکا تھا۔ ادھر ہندو مسلمانوں میں ہر طرف جنگ چھڑی ہوئی تھی اور ہر درد دار انسان فریقین میں نکّو بنا ہوا تھا۔ اس پر طُرّہ یہ کہ اُس نے انھیں دنوں ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی۔ اس کے بعد تو فرقہ پرست اس کی جان کے لاگو ہو گئے اور ہر طرف سے اس پر اعتراضات کا ڈونگرا برس پڑا۔ حکومت کا ظلم، مولویوں کا غیظ و غضب اور اب ہندو جماعت کا ستم۔ اپنی ایک نظم میں وہ اس مرحلے کا ذکر کرتا ہے:-

"میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔
کوئی کہتا ہے کہ اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔
کوئی کہتا ہے شاعر کو قید و بند سے کیا واسطہ۔
کوئی کہتا ہے دوبارہ جیل جاکر وہیں خوب لکھ سکتا ہے۔
مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (داڑھی) نہ پاکر مایوسی سے اپنی داڑھی کھجانے لگتا ہے۔
ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کرلی ہے، لہٰذا یقیناً فرقہ پرست ہے۔
گاندھی جی مجھ پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔
عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست بتلاتے ہیں۔
غرض کہ میری جان ضیق میں ہے۔
لوگو! مجھے اس کی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں۔ تمنّا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلقِ خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں، میری خوں چکاں تحریر ان کے لیے پیامِ موت ثابت ہو۔"

اس وقت نذرالاسلام یہ آندھی بھی سہہ گیا۔ اس زمانے کی زندگی کا نقشہ اس نے افلاس میں کھینچا ہے۔ وہ اُسی لگن کے ساتھ اپنا کام کرتا گیا۔ یہ ہمارے ادب کی کم نصیبی ہے کہ روٹیوں کے لیے اسے وہ گیت لکھنے پڑے جو اب بنگال کے بچے بچّے کی زبان پر ہیں۔ اس ادبی کاوش میں لامحالہ شاعری سے زیادہ موسیقی کو دخل تھا اور یہ شاعر کا نہیں 'نغمہ ساز' کا کام تھا۔ آہستہ آہستہ یہ رنگ زور پکڑ گیا اور اب اس کی شاعری پر یکسر غالب ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی انقلابی شاعری ۱۹۲۰ء میں شروع ہوکر ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ سرد ہوگئی۔ اس قسم کی جدوجہد اپنے ماحول سے زیادہ عرصے تک الگ نہیں رہ سکتی۔ چرخہ اور کھادی کے ساتھ انقلاب کے گیت نہیں گائے جاسکتے۔

نذرالاسلام کی شاعری تین ارتقائی منزلوں سے گزری ہے۔ ابتدائی دور جو بہت مختصر اور کم اہم تھا اس اسلامی اثر کا شاہد ہے جو تحریکِ خلافت کے دنوں میں ہر مسلمان پر چھایا ہوا تھا اس زمانے میں اس نے جو نظمیں لکھیں ان میں انور پاشا اور مصطفیٰ کمال پر دو چھوٹے چھوٹے رزمیہ منظوم مکالمے تھے۔ ان کا سارا لطف حسنِ بیان میں مضمر ہے جس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ معرکۂ کربلا وغیرہ پر بھی چند نظمیں ہیں۔

دوسرا دور جو سب سے طویل اور اہم ہے "باغی" کی اشاعت کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی نظموں کا انتخاب ہم نے "مجاہد کی صدا" کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ جوش اور اُمنگ کا زمانہ تھا اور اس پر اس ماحول کا اثر تھا جس نے بنگال کے بہت سے نوجوانوں کو بم بازی اور دار و رسن کی طرف کھینچا تھا۔

تیسرا دور جو ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ شروع ہوا۔ سب سے زیادہ اہم ہے اس اعتبار سے کہ اس زمانے میں اسے غور و خوض کا موقع ملا اور وہ اشتراکیت کے خدوخال کو جانچ پرکھ سکا۔ اسے وہ فلسفۂ زندگی اب جاکر ملا جس کی تلاش میں وہ برسوں سے بھٹک رہا تھا۔ "نعرۂ انقلاب" کے تحت کی نظمیں بتلائیں گی کہ اُس نے اپنے موضوع کا مطالعہ کیا ہے اور اس ضمن میں ایسے ایسے نازک نکتے بیان کرگیا ہے جو نظر بینی کے طالب ہیں۔

مگر اس ساری مدت میں اس تناور درخت سے وہ امربیل لپٹی ہوئی تھی جو کسی فن کار کو بے داغ نہیں چھوڑتی۔ اس کا نام "رومان پسندی" یا "بوہیمیت" ہے۔ بنگال کی سرزمین اس بیل کی نشوونما کے لیے موزوں ہے کبھی۔ وہاں کے اودے اودے بادلوں، گھنیرے پیڑوں اور ڈبڈبائی ہوئی ندیوں کے پیچھے رومان مسکراتا ہے۔ نذرالاسلام پر بھی یہ جادو چل ہی گیا۔ اس کا ہلکا سا پرتو ان تینوں نظموں میں ملے گا جو "یادِ ایام" کے نام سے اس مجموعے میں شامل کی گئی ہیں۔ لیکن سچ پوچھا جائے تو اس رجحان کا اثر بہت دور رس تھا۔

ابھی ہم نذرالاسلام کے قریب اور اُس منزل سے دور ہیں جس کی جھلک دکھانے وہ آیا تھا۔ جب ہم اپنے تمدنی ورثے کو تنقید کی آگ پر پرکھیں گے تو وہ ہمیں ادبِ جدید کے پیغمبر کی صورت میں نظر آئے گا۔

یہ اس لیے کہ ہماری شاعری میں وہ پہلا شاعر ہے جس نے ہمارے اقدار کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس لحاظ سے کہ زندگی کی رَو پیچھے کی طرف نہیں بلکہ آگے کی طرف بڑھے۔ جب وہ بار بار جوانی اور پیری کے تنازعے کا ذکر کرتا ہے تو اس کا مدعا وہ نئی تہذیب ہے جو پُرانے کھنڈروں کو توڑ کر اپنا گھر بنا رہی ہے۔ یہ وہ سرمایہ دارانہ "مغربی" تہذیب نہیں ہے جو آقا اور غلام کے پُرانے رشتے کو مالک اور مزدور کے نئے ناتے میں گوندھتی ہے بلکہ وہ نئی تہذیب جو قوم و مذہب، رنگ و نسل کی سرحدوں کو توڑ کر دنیا کو مساوات اور آزادی کا درس دیتی ہے۔ اس مہم کی فتح یابی کا ترانہ شاعر یوں گاتا ہے:-

وہ مبارک ساعت آپہنچی۔
ہتوڑی اور کُدالی سے جو پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔
راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں۔
تمھاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہے۔
تمھارا بار گناہ اٹھانے کے لیے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے۔
وہی — صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔ میں اُسی کے گیت گاتا ہوں۔ اُس کا ٹوٹا ہوا دل ایک نئی دنیا کی تعمیر کرے گا۔

آج مظلوموں اور بے کسوں کے خون سے رنگ کر بطنِ گیتی سے آفتابِ تازہ پیدا ہوا ہے۔
آج دنیا کے بندھن کٹ رہے ہیں اور ایک عظیم الشان دورِ بیداری کا آغاز ہو رہا ہے جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے اور شیطان خوف سے لرزتا ہے۔

نذرالاسلام کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی دایم و قایم ہے اور انسان لاشریک لہٗ اس کا کارساز ہے۔ وہ شباب کا ہم دوش اور انقلاب کا نقیب ہے۔ وہ تغیر کا حامی اور جمود کا دشمن ہے۔ وہ قدامت کا حریف اور جدید کا علم بردار ہے۔ وہ قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے اور شاعری کو اس مہم میں جنگ کی دیوی بنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان سب سے افضل اور اکمل ہے۔

ہندوستان کی شاعری میں یہ ایک نیا خیال ہے۔ اب تک ہم زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے چارگی کا نوحہ سنتے آئے تھے اور ہمارا ایمان راسخ تھا کہ حقیقت صرف موت کے بعد مل سکتی ہے۔ صرف ایک مرتبہ کبیر داس نے دبی زبان میں کہا تھا کہ جو چیز زندگی میں نہیں مل سکتی وہ موت میں کیوں کر مل سکتی ہے۔ لیکن ہم نے اُس کے ماننے والوں کو چار بنا کر چھوڑ دیا۔ اور پھر قضا و فنا کی حمد گانے

لگے اب پہلی بار ایک شاعر نے اس ذہنی غلامی کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور ادبی انقلاب کی ایسی طرح ڈالی کہ اس کی لیک پر آج ہر طرف آتش کدے روشن ہو رہے ہیں۔

نذر الاسلام نے دوئی کا پردہ اٹھانے کی لاحاصل کوشش کبھی نہ کی۔ اس معاملے میں اس نے گوتم بدھ کے اس صائب مشورے پر عمل کیا کہ جو اس جھمیلے میں پھنسا وہ پاگل ہو کر رہے گا۔ اس نے صرف دنیوی زندگی اور اس کے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے میں اپنی صلاحیت صرف کی۔ اس سے بڑی عبادت اور کیا ہو سکتی ہے؟ زندگی کی تلخیوں سے منہ چرانا بہت آسان ہے اور صوفیوں کی قبا بہت سستے داموں بازار میں مل جاتی ہے۔ لیکن مجاہد کا خونی کفن ہر کسی کے نصیب میں نہیں ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

زندگی کی ہر وادی میں چل پھر کر اس نے یہی دیکھا کہ دنیا دو چھاؤنیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک طرف انسانوں کی اکثریت جہالت اور افلاس میں گھٹ رہی ہے۔ اور دوسری طرف اس کی محنت کا پھل تھوڑے سے تن آسان ہڑپ کر رہے ہیں۔ چند سرفروش ہر دور میں اس ظلم پرور نظام کو بدلنے کے لیے لڑتے ہیں۔ نذر الاسلام صرف انھیں کا ثنا خواں ہے۔ "باغی" اسی مجاہد کا ترانہ ہے۔ اور اتنا عظیم الشان ترانہ کہ اسے سن کر ہم مبہوت سے رہ جاتے ہیں دیر تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف تاریکی ہے اور بادلوں میں ایک بجلی تڑپ رہی ہے۔

یہ مجاہد ظلم اور بے انصافی کے نظاروں کو دیکھ دیکھ کر انتقام کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت کا نقشہ روسی ناول نگار "ترجنیف" نے اپنے شاہکار FATHER AND SONS میں کھینچا ہے۔ جب اس کا ہیرو مرتا ہے تو ایک نقاد کہتا ہے "وہ بربادی جو برباد کرتے کرتے خود برباد ہو گئی"۔ کیا نذر الاسلام کا ہیرو بھی تخریب و تباہی کے سوا کچھ نہیں جانتا؟ "ستارۂ تخریب" فضا میں ہول اور دہراس کے سوا کچھ باقی نہیں چھوڑتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز مر گئی، مٹ گئی۔ مرجھا گئی۔

لیکن یہ عارضی کیفیت ہے مستقل جذبہ اس تعمیر کا ہے جس کا خواب ہم "نعرۂ انقلاب" کے آخری بندوں میں دیکھتے ہیں۔ رہ رہ کر امید کی یہ کرن شاعر کے اندھیرے ماحول کو اجالتی ہے اور شک و شبہ کے اس منجدھار سے نکالتی ہے جسے ہم "ناخدا" میں پاتے ہیں۔

دہشت پسندی اور اشتراکیت کے بیچ میں جو دور تغیر ہے اس سے انقلاب پرور دیر میں گزرتا ہے اور اس کے لیے بڑے ضبط اور توازن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کی انقلابی تحریک اس پُرخار راہ سے کس طرح گزری اس کا مرقع ہمیں ان نظموں میں ملے گا۔ وہ "باغی" جو سر ہتھیلی پر لے کر نکلا تھا بیچ میں مجروح ہو کر۔ تھک کر نہیں۔ گر پڑا:

"صبح تک وہ مسافر ساحل کو نہ پہنچا جس نے اس اندھیری رات کو تلاطم خیز دریا میں اپنی ناؤ ڈال دی تھی۔"

اب شاعر اپنی منزل سے بھٹکنے لگتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اشتراکیت کی چند کتابیں الماریوں میں رکھی ہیں اور کچھ آرام طلب دیوان خانوں میں انقلاب زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہے ہیں۔ لیکن نظریہ اور عمل کے درمیان ایک حد فاصل ہے جس کے طے ہونے میں ابھی دیر ہے۔ تو شاعر بھی تھک کر راستے میں بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن شراب و شباب کی معصیت میں گرفتار ہو کر بھی اپنے مقصد کو نہیں بھولتا۔ "یاد ایام" میں اس ردِ عمل کا ذکر یوں کرتا ہے:

"معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا۔ کیوں نہ اب میں موت در آغوش طوفان کا ہم سفر بن جاؤں؟ راستے میں کس کی یاد میں فریاد کرتا پھروں؟ کیوں نہ آتش فشاں پہاڑ اپنے غارت گر دہانے کھول دیں۔ کیوں

"نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرا دے اور موت کے گیت میرے ہم سخن ہو جائیں"

دو مرتبہ جیل جانے اور کلام کے کئی مجموعے ضبط ہو جانے کے بعد بھی اس کے استقلال میں فرق نہیں آتا۔

"اے خالقِ جدید! تیرے اشارے پر میں کس عزم و استقلال سے اسی راہ پر چلتا رہا ہوں۔ جب تو نے مجھے پکارا تجھے یہی جواب ملا کہ ہاں ہاں میں ثابت قدم ہوں"

تھوڑے عرصے سے وہ پھر بجھا بجھا سا ہے اور وہ گیت ہم نے نہیں سنے جنھوں نے شباب کے خون کو گرمایا اور اس کے دل کو دھڑکایا تھا۔ لیکن یہ ایک وقفہ ہے اور عجب نہیں کہ جب "آزادی کے سپاہی" وزارتوں کی گدیوں کو خالی کر کے اپنے اصلی مورچوں پر لوٹ جائیں تو بنگال کا باغی شاعر ایک مرتبہ پھر جاگ جائے اور اپنے روح پرور نغموں سے ملک کو تھرا دے۔

کئی سال پہلے جب ہم نے رسالۂ اردو کے لیے نذر الاسلام کی بعض نظموں کے ترجمے کیے تو اس کے ایڈیٹر نے اپنے نوٹ میں لکھا تھا "ہندوستان کی کسی زبان میں اس قیامت خیز قوت کا کوئی شاعر نہیں پایا جاتا۔ اس کے کلام میں ایک آگ بھری ہوئی ہے جس کے آگے ہماری شاعری کے عامیانہ خیالات اور مضامین گھاس پھوس معلوم ہوتے ہیں"

دراصل اس کی شاعری کا کمال اس کی قوت میں مضمر ہے۔ ترجمہ اس کے بیان اور تخیل کا تو ہو سکتا ہے لیکن اس کی موسیقی کا زور ترجمے کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ یہ موسیقی کبھی طوفان خیز لہروں کی طرح دہاڑتی اور کبھی لو کے آتشیں جھونکوں کی طرح سنسناتی ہے، کبھی وہ آسمان بوس پہاڑوں کی طرح اپنی شوکت سے آپ مبہوت ہو جاتی ہے۔ مثلاً "آگمنی" (آمد) نامی نظم کو لیجیے اس میں میدانِ جنگ کا نقشہ ایک نئے انداز سے کھینچا گیا ہے۔ گرمیٔ بیان کا یہ حال ہے کہ میدان کے شور و شغب کا ہنگامہ کانوں تک پہنچتا ہے۔ زورِ الفاظ کا اس سے بہتر نمونہ پیش کرنا دشوار ہے۔ گو کہ رسم الخط بنگلہ تلفظ کو تحریر میں لانے سے قاصر ہے۔ پھر بھی ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے:

اے کی — رن باجا باجے گھن گھن
جھن رن رن رن جھن جھن جھن!
لیکی — دِکی دکی، دھکی دھکی
داما دریمی دریمی گمکی گمکی
اوٹھے چھوٹے پھوٹے
چھوٹے لوٹے پھوٹے!
بہنی — پھنکی چمکی چمکی
ڈھال تلوار سے گھن گھن!!
اے کی رن باجا باجے گھن گھن
رن جھن جھن۔ رن جھن جھن

ہندوستانی زبانوں میں آلہا اودل کے رزم نامے کے علاوہ شکوہِ الفاظ کا یہ نمونہ اور کہیں نہیں ملے گا۔

دوسرا بڑا کمال یہ ہے کہ اس کی قوت بے حسن نہیں ہے۔ اردو زبان میں ادھر بہتیری انقلابی نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ ان میں خالی خولی جوش کی اتنی بھرمار ہے کہ بادِ سموم کا سارا زور ختم ہو جاتا ہے، ہمارے حصے میں صرف دھول اور ریت رہ جاتی ہے۔ رزمیہ

موسیقی کے بدلے وہ آوازیں سُنائی دیتی ہیں جو پہلوان "ڈنڑ" پیلتے وقت نکالتے ہیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ ان انقلابی مضامین کو نذرالاسلام نے ادب پارے کیسے بنادیا؟ تخیّل کی یہ پرواز کیسے باقی رہی؟ تصور کی یہ رنگینی پھیکی کیوں نہ ہوئی؟ یہ آگ جلتے جلتے بھی اپنی شعاعوں میں ہمواری کیسے باقی رکھتی ہے؟ یہ طوفان گرجتے گرجتے بھی اپنے تال سم کو بگڑنے کیوں نہیں دیتا؟ "باغی" سے زیادہ زوردار اور ساتھ ہی ساتھ خوبصورت نظم کہاں ملے گی؟ یہ باغی یونان کا رستم ہرکلس نہیں جس کی ٹانگیں آہنی ستونوں سے زیادہ موٹی تھیں۔ بلکہ "ہومر" کا شکیل وجمیل ہیرو ایکیلیس ہے جس کی تلوار میں اتنی ہی کاٹ تھی جتنی کہ اُس کے مدبھرے نینوں میں۔

جب ہم اُس کے کلام کو پڑھتے ہیں تو اُس کے خیالات سے اتفاق کریں یا نہ کریں اُس کی تحریک کی تائید کریں یا نہ کریں۔ لیکن اُس کے خلوص کا سکہ ہمارے دل پر بیٹھ جاتا ہے اور اُس کی سرفروشی کے آگے ہمارا سر ادب سے جُھک جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی وہ اپنی راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ لیکن اس راہ روی میں لطف ہی کیا اور ایسے ہم سفر کا ساتھ ہی کیا جس نے کبھی ٹھوکر نہیں کھائی اور کبھی راہ نہ بھولا اس وقت ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ یہ راستہ کتنا دشوار ہے اور اس پر چلنے والے کتنے گنے چُنے لوگ ہیں۔ ان میں سے کوئی اگر تھک کر دم بھر کے لیے بیٹھ جائے یا کوئی گھائل ہو کر گر پڑے تو وہ ہماری ہمدردی کا مستحق ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ نذرالاسلام ظلم اور ظالم کا دشمن ہے۔ اور وہ ہر انسان و خیال کو اس کسوٹی پر کستا ہے۔ اگر کذب و افترا کی تنقید میں وہ کبھی درشتی سے کام لیتا ہے تو اُس کے معنے یہ نہیں کہ اس کا واحد مقصد کسی عقیدے کی تنک ہے۔ میدانِ جنگ میں فصیل پر بیٹھنے والوں کو ہوشیار رہنا ہی پڑے گا۔ اِدھر اُدھر سے ایک آدھ نشانہ انھیں آ ہی لگے گا۔ ایسے موقع پر تماش بین کو اس خود فریبی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ میدان کا مرد وہی ہے اور سارے نشانے اُسی پر لگائے جارہے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ ایشیا نے جو جمہوریت کی نعمتوں سے ہمیشہ محروم رہا، اگر کبھی تحریر کی آزادی دی تو صرف اپنے شاعر کو۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر شاعر شراب چھیننے والے خدا پر چشمک زنی کرے تو ہم ہنس کر ٹال دیں اور اگر روٹی چھیننے والے خدا پر چیں بجبیں ہو تو ہم اس غریب پر جبیں تاننے لگیں۔

ہم نے دیکھا کہ جب ہمارے ملک کی ترقی پسند تحریک قومیت سے بڑھ کر اشتراکیت کی راہ ڈھونڈ رہی تھی تو ادب میں اس رُجحان کی علم برداری نذرالاسلام نے کی۔ اسی طرح ادب کے قالب میں اُس نے یہ تبدیلی کی کہ ٹیگور کی ابہام پسندی کو چھوڑ کر مضمون کی خارجیت اور اسلوب کے حُسن کا وہ امتزاج کیا جسے رومانی حقیقت پسندی کہتے ہیں اور جو گورکی مرحوم کا خاص وصف تھا۔

اگر ہم یہ مان لیں کہ ٹیگور نے دانستہ کسی فلسفۂ زندگی کی تلقین نہیں کی تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہند جدید کے دو سب سے بڑے مفکّر شاعر۔ اقبال اور نذرالاسلام۔ مسلمان تھے۔ گو وہ دو متضاد رجحانوں کے پیشوا تھے لیکن انھیں وہ بےچینی متحرک کر رہی تھی جو مسلمانوں کے جمود کو دیکھ کر ہر ذی حِس میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ دونوں رجحان دو مختلف سمتوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ ایک پیچھے کی طرف بُلاتا تھا اور دوسرا آگے کی طرف بڑھاتا تھا لیکن دونوں حرکت اور عمل کی دعوت دیتے تھے اور سرمایہ داری و سامراج کے دشمن تھے۔ ہندوستانی شاعری کو ان دونوں کی ایک بڑی دین یہ بھی تھی کہ اس میں انھوں نے زندگی کے مقاصد کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔

اس مجموعے کی تکمیل کے وقت ہمیں یاد آتا ہے کہ اس کی چند نظمیں ایک موقع پر ہم نے اقبال مرحوم کو دکھائیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور ہم سے دیر تک نذرالاسلام کا ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمائش کی کہ انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ افسوس کہ اقبال آج ہم میں نہیں ہیں۔ وہ نذرالاسلام کے خیالات کے سخت مخالف تھے لیکن اس کے شاعرانہ کمال کے بڑے معترف تھے۔ اس کا ذہن کی

وہ یقیناً داد دیتے۔!

یہ کہا جا چکا ہے کہ نذرالاسلام کے انقلابی کلام کا بیشتر حصہ ضبط ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے یہ کلام انمول ہے۔ اب جب کہ ہر طرف "رام راج" کی ہوا چل رہی ہے۔ اچھا ہوا گران پر سے تحدید ہٹالی جائے۔

فی الحال ہمارے تراجم کا دائرہ ان نظموں تک محدود ہے جو بازار میں بکتی ہیں۔ اُن کے انتخاب کی ذمہ داری ہم پر ہے۔

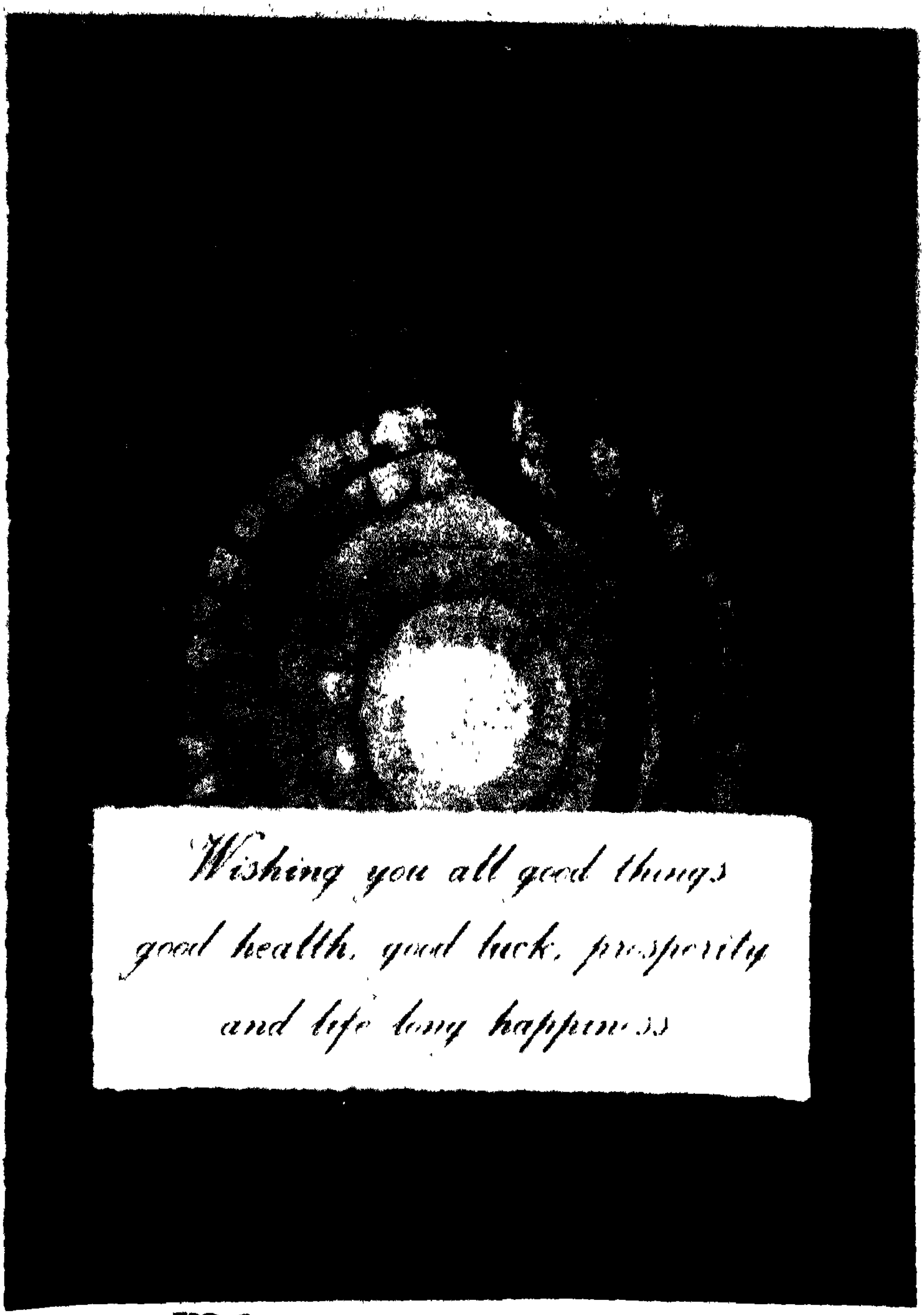
آج سے چھ سات سال پہلے جب ہم نے اُردو داں طبقے سے اس شاعر کا تعارف کرایا تو لوگوں کی حیرت کی حد نہ رہی۔ یہ تراجم بڑے شوق سے پڑھے گئے اور ہم سے متعدد مرتبہ انھیں مجموعے کی صورت میں چھپوا دینے کی فرمائش کی گئی۔ خدا خدا کر کے وہ ساعت اب آئی۔ ان میں سے کئی نظموں کے تراجم غیر مطبوعہ ہیں۔

نذرالاسلام کا پیغام مذہب و ملّت کی قیود سے آزاد ہے۔ ممکن ہے کہ اُس کے خواب کی تعبیر کبھی نظر آئے اور پھر اُس کے گیت پرانے ہو جائیں۔ لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ دنیا میں مجاہدوں اور شہیدوں کی ضرورت یک سر نہ رہے گی۔ بفرض محال کبھی ایسا ہوا بھی تو نذرالاسلام سے زیادہ کسی کو خوشی نہ ہوگی۔ خود کہتا ہے۔

"میں دورِ حاضر کا شاعر ہوں مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔ آنے والا زمانہ مجھے یاد کرے گا یا نہیں، اس کی مجھے پروا نہیں"

وہ اپنی نسل کی خدمت اس لیے کر سکا کہ اُس نے ابد کی ڈائری میں اپنا نام ٹانکنے کی کوشش نہیں کی۔

لندن ــــ ار نومبر ۱۹۳۸ء (ماخوذ از "پیام شباب")


Wishing you all good things
good health, good luck, prosperity
and life long happiness

قاضی نذرالاسلام

مترجمہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

باغی

(براہ راست بنگلہ سے)

کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں سربلند ہوں۔
اتنا سربلند، اتنا سربلند، کہ ہمالیہ کی چوٹی بھی میرے آگے سرنگوں ہے۔
کہہ دے! اے بہادر کہہ دے کہ اس وسیع آسمان کو چیر کر چاند سورج اور ستاروں کو توڑ کر، جنّت و دوزخ کو ہلا کر اور عرش سے ٹکرا کر۔
میں اس دنیا کے لیے مجسمۂ حیرت بن گیا ہوں۔
کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میرا سر ہمیشہ بلند رہے گا۔
میں سرکش، سنگ دل اور آتش زباں ہوں۔
میں قیامت کا ندیم ہوں۔ طوفان ہوں۔ تباہی ہوں، دہشت ہوں۔ میں دنیا کے لیے سراپا ہلاکت ہوں۔
ہر چیز کو چکنا چور کر دیتا ہوں! لااُبالی ہوں، اصول شکن ہوں۔
قانون، قاعدوں اور پابندیوں کو پاؤں کے نیچے روند ڈالتا ہوں۔
میں بربادی کا دیوتا ہوں۔ موسم ہو یا نہ ہو موسلا دھار برکھا برسا دیتا ہوں۔
کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمیشہ سربلند رہوں گا۔
میں باغی ہوں! مادرِ گیتی کی سرکش اولاد!
میں ہوں بادِ سموم اور لو کا گرم جھونکا۔
میری راہ میں جو چیز حائل ہوتی ہے اُسے میں چور چور کر ڈالتا ہوں۔
میں وحشیوں کا رقص ہوں! اپنے تال پر میں آپ ہی ناچنے لگتا ہوں۔
سماج کی بندشوں سے آزاد ہو چکا ہوں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

میں سپاہیوں کا گیت ہوں! میں آتش لا موسیقی ہوں۔
میں سرابِ صحرا ہوں۔
چلتا ہوں اور ٹھٹکتا ہوں۔ سنبھلتا ہوں اور لڑکھڑاتا ہوں۔
ایک ایک قدم پر ہزاروں لغزشیں۔
میں مضطرب برق سوزاں ہوں۔
جو دل میں آتا ہے کرتا ہوں۔
دشمن سے تکرار کرتا ہوں اور قدرت سے نبرد آزمائی میرا کھیل ہے۔
مہلک مرض ہوں، وبا ہوں، ایک عالم گیر خطرہ ہوں۔!
حکومتوں کے لیے آفت کا کوہِ آتش فشاں!
غارت گر ہوں ـــــ تند خو ہمیشہ بے قرار!۔
کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں سر بلند ہوں۔
میں ہوں سرمستِ ازلی اور رند خانہ خراب جس کا کوئی طاقت کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔
میرا پیمانۂ زندگی ہمیشہ چھلکتا رہتا ہے۔ میں قربان گاہ کی آگ ہوں۔
میں خود ہی آتش ہوں اور خود ہی آتش پرست!
میں ہی تخلیق ہوں اور میں ہی تخریب!
میں شہرِ آباد ہوں اور شہرِ خموشاں!
لیلائے شب کا قاصد ہوں ـــ!
دیوتاؤں کی ملکہ کا نورِ نظر ہوں۔
میری مٹھی میں چاند ہے اور پیشانی پر سورج جگمگاتا ہے۔
ایک ہاتھ میں سریلی بانسری ہے اور دوسرے میں لڑائی کا بگل۔
میں وہ مہادیو ہوں جس نے سمندر کو کھنگال کر زہر ہلاہل نکالا اور اُسے خود ہی پی لیا[1]
میں وہ مہادیو ہوں جس نے گنگا کو اپنی زلفوں میں قید کر رکھا ہے۔
اپنی خودی کے علاوہ میں کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔
میں لوندے کی لپک اور بجلی کی چمک ہوں!
میں صورِ اسرافیل کی صدائے بازگشت ہوں۔!

---

[1] ہندو دیو مالا کا ایک قصہ کہ سب دیوتاؤں نے سمندر کو کھنگال کر اس میں سے چودہ جوہر نکالے جن میں آبِ حیات بھی تھا اور زہر بھی۔ امرت پینے والے تو سب تھے لیکن زہر کون چکھتا۔ آخر مہادیو جی نے یہ کڑوا گھونٹ گلے سے نیچے اُتارا۔

قیامت کے دیوتا کا پرچم اور جبرئیل کا عصا ہوں۔
میں اُن پیغمبروں کا پجاری ہوں جن کی چیں جبیں ایک عالم کو تہ و بالا کر ڈالتی تھی۔
میں آتش، کا پرکالہ ہوں! اس دنیا کو جلا کر خاک کر دوں گا!
میں وہ قہقہہ ہوں جو روح سے نکلتا ہے۔
میں اس بوسیدہ سماج کا دشمن اور اس کے لیے خطرۂ عظیم ہوں۔
میں آفتاب کی تپش ہوں۔
کبھی پُرامن ہو تو کبھی شر انگیز۔
میں وہ نوجوان ہوں جس کی رگوں میں تازہ خون بہتا ہے!
میں وہ ہوں جو دنیا کا غرور توڑ دیتا ہے۔
کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمالیہ سے بھی بلند ہوں۔
میں لو کی لپٹ ہوں اور دریا کی پُر شور روانی۔
میں روشن ہوں آگ کی طرح!
میں بہتے ہوئے پانی کی آواز ہوں چنچل موجوں کی شیریں راگنی۔
کسی دوشیزہ کی زلفِ پریشاں کا جوڑا ہوں، ترچھی آنکھوں کا تیر ہوں۔
کسی حسینہ کا اوّلین بوسہ ہوں آفریں ہے مجھ پر!
کسی غم رسیدہ کا دل بے قرار ہوں! کسی بیوہ کے دل کی آہ ہوں۔ کسی لوٹے ہوئے دل کی پکار ہوں۔
میں اُس مسافر کا غم ہوں جو ہمیشہ کے لیے مارا مارا پھر رہا ہو۔
کسی دل جلے کی پکار ہوں! زہر کی تلخی ہوں!
محبوب نے جس دل کو ٹھکرا دیا ہو اُس کی دھڑکن ہوں!
کسی مغرور اور غضب ناک دل کی بے کسی ہوں۔
وہ درد ہوں جو دل پر چھا گیا ہو۔
پہلے بوسے کے بعد دوشیزہ کے جسم میں پیدا ہونے والی تھرتھری ہوں۔
کسی پردہ نشین معشوق کی سہمی ہوئی نگاہ ہوں جو شرارت سے دیکھنے کے بعد بھی یوں آنکھ چُرا لیتی ہے گویا دیکھا ہی نہیں۔
کسی چنچل چت چور کا عشق ہوں اور اُس کی چوڑی کی میٹھی جھنکار!
میرا بچپن اور جوانی دائمی ہے۔
جو دیہاتی لڑکی جوانی کے بوجھ سے دبی جاتی ہے میں اُس کے دامن کا نچوڑ ہوں۔
کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمیشہ سر بلند رہوں گا۔

میں بادِ مہر پرور بھی ہوں اور بادِ سموم بھی۔
میں اس شاعر کا متین ترانہ ہوں جو راہ طے کر رہا ہے اور بانسری پر گیت گاتا جا رہا ہے۔
میں ایک بے قرار اور پریشان دل ہوں۔
میں وہ سورج ہوں جو آگ برساتا ہے۔
ریگستانی آبشار کی روانی ہوں! دیوانہ وار بھاگا جا رہا ہوں۔
میں وہ وحشت ہوں! اور بے ہوش قلب کا ہوش ہوں۔
میں ترقی اور پستی کی انتہا ہوں۔
اس سرائے فانی پر میرا جھنڈا لہراتا ہے۔
انسان کی ظفر مندی کا میں نشان ہوں۔
جب طوفان کی طرح تالی بجاتے ہوئے چھٹتا ہوں تو زمین و آسمان میرے ہم نوا ہو جاتے ہیں۔
دنیا کی پیٹھ پر میں آگ کا پہاڑ ہوں، شعلۂ جاں کاہ ہوں۔
کہہ دے! اے جوان مرد کہہ دے کہ میں سربلند ہوں۔
میں وہ جنگ کی دیوی ہوں جس کا سر تن سے جدا ہو گیا ہو۔
جہنم کی آگ میں نہا کر جب میں ہنستا ہوں تو میرے منہ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں۔
میں فانی ہوں! میں باقی ہوں! میں ازلی ہوں! میں ابدی ہوں۔
میں وہ وحدت ہوں جو کثرت سے بالاتر ہے۔
میں انسان، شیطان، فرشتہ۔ سب کے لیے باعثِ خوف ہوں۔
دنیا میں مجھے آج تک شکست نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہوگی۔
میں خدا ہوں! میں حقیقی معنوں میں مکمل ترین انسان ہوں۔
بہشت، زمین اور تحت الثریٰ میں رقص کرتا پھرتا ہوں۔
میں دیوانگی ہوں، وحشت ہوں۔
کہہ دے! اے جوان مرد کہہ دے کہ میں ہمیشہ سربلند رہوں گا۔
میں نے خود کو پہچان لیا۔ میرے سب بندھن کھل گئے۔
میں 'پرشورام' کی سنگ دل کلہاڑی ہوں[1] دنیا کو خوں ریزیوں سے پاک کر دوں گا۔ یہاں میں ہی امن و امان قائم کروں گا۔

---

[1] ہندو دیو مالا کا ایک قصہ۔ پرشورام برہمن تھے اور کسی بات پر چھتریوں سے برہم ہو گئے اپنی کلہاڑی سے انھوں نے ۲۱ مرتبہ چھتریوں کا قتلِ عام کیا۔

ایک نئی دنیا بسا کر میں اس قدیم سیاہ کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔
میں تحت الثریٰ کا بے لوث شرہوں جہاں آگ شور و غوغا مچاتی ہوئی دہاڑیں مارا کرتی ہے۔
میں بجلی پر بیٹھ کر کلیلیں کرتا ہوا کبھی یہاں اور کبھی وہاں دوڑا پھرتا ہوں!
میں زلزلہ پیدا کر کے دنیا کو لرزہ براندام کر دیتا ہوں!
کشن کی کلغی اور جبرئیل کے نورانی عصا کو میں نے چھین لیا ہے۔
میں دیوتاؤں کی اولاد ہوں۔
میں مضطرب ہوں۔ میں گستاخ ہوں۔ مادرِ عالم کا آنچل اپنے دانتوں سے تار تار کر ڈالتا ہوں۔
میں شیام کے ہاتھوں میں نسی ہوں۔ میری جادو بھری تان سے متوالا ہو کر سمندر گرج گرج کر آتا ہے اور سہمی ہوئی دنیا کو بوسہ دے کر سُلا دیتا ہے۔
جب میں بگڑ کر اٹھتا ہوں تو آسمان ہلا دیتا ہوں۔ دوزخ بھی تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔
میں ساون کے مہینے کی ڈبڈبائی ہوئی ندی ہوں۔ کبھی زمین کو شاداب بنا دیتا ہوں تو کبھی برباد۔
شہابِ ثاقب ہوں، مریخ ہوں، دُم دار ستارہ، زہریلے ناگ کا من ہوں۔
کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمیشہ سربلند رہوں گا۔
میں باغیوں کا سردار ہوں۔
خوں خواری سے میرا جی بھر گیا ہے۔
میں اُسی دن مطمئن ہوں گا جب مظلوموں کی فریاد فضائے آسمانی میں نہ گونجے گی۔
جب میدانِ جنگ میں تلوار اور خنجر کے خوفناک ترانے نہ سنائی دیں گے، وہ باغی جو جنگ و جدل سے نالاں ہے اُسی روز خاموش ہوگا۔
میں وہ باغی "بھرگو"[1] ہوں جس نے بھگوان کے دل پر اپنا نقشِ قدم ثبت کر دیا تھا۔
جو خیالی قسمت سارے ظلم و ستم کی جڑ ہے، میں اس کی بوند بوند پی جاؤں گا۔
میں وہ باغی ہوں جو قسمت کے طلسم کو توڑ سکتا ہے۔
میں ہوں ازلی اور غیر فانی باغی۔
دنیا کو ٹھکرا کر ایک بار پھر میں تنِ تنہا سر اٹھا کر کھڑا ہوا ہوں۔

(ماخوذ از "پیامِ شباب")

---

[1] ہندو دیومالا کا ایک قصہ۔ ایک مرتبہ وشنو بھگوان آرام فرما رہے تھے کہ ناگہاں برہما جی کا سرکش بیٹا "بھرگو" وارد ہوا۔ اور اُن کے سینے پر ایک ایک ٹھوکر جڑ دی۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

دل کا اندھیرا

(گزشتہ جنگ کے آغاز کے وقت میں پیرس میں مقیم تھا۔ یہ افسانہ دورانِ جنگ میں فرانس کی حالت سے متاثر ہو کر انہی ایام میں لکھا گیا تھا۔)

جب ریل کی رفتار یک بیک سست پڑ گئی اور کسی نے ہوا میں ایک نیلی قندیل کو جنبش دے کر زور سے "گار دیت ـ پاتی"[۱] کی صدا لگائی تو آندرے چونک پڑا۔ کھڑکی سے اُس نے سر نکال کر دیکھا کہ ہر طرف اندھیرا گھُپ ہے اور اُجالے کے نام پر بس برف کے وہ گالے ہیں جو لگاتار آسمان سے ٹپک رہے ہیں۔

آندرے کو یقین نہ آیا کہ یہ اس قبرستان کا اسٹیشن ہے جسے "پیرس" کہتے ہیں۔ مانا کہ جنگ کا زمانہ ہے اسے یاد دلانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ خود لڑائی کے میدان سے ہفتہ بھر کی چھٹی پر آ رہا تھا۔ لیکن یہ سدا روشن شہر مسلسل تاریکی میں کس طرح زندہ تھا۔ پھر آپ ہی آپ آندرے کو اپنی اُس پڑ دسن کا خیال آیا جو محبت کی طرح حسین تھی لیکن کئی سال بعد جب وہ اس سے دوچار ہوا تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس کی جوانی ڈھل چکی تھی، حسن پامال ہو چکا تھا، جھُرّیاں چہرے پر زوال کی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ اپنے شہر کی خاموشی اور تاریکی کو دیکھ کر آندرے کو ویسا ہی جھٹکا لگا اور وہ دیر تک دم بخود کھڑکی کا سہارا لیے کھڑا رہا۔

مہینوں بندوق چھتیائے دشمن کے مقابل کھڑے کھڑے بھی جو حقیقت اس پر عیاں نہیں ہوئی تھی وہ اس اندھے اور اندھیرے شہر پہ نگاہ پڑتے ہی واضح ہو گئی۔

ہاں یہ دراصل لڑائی تھی، انسانوں کے دو قبیلوں کے درمیان جو ایک کھنچی ہوئی لکیر کے آر پار کھڑے اس گھڑی کے منتظر تھے۔ جب انھیں ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم ملے گا اور ان میں سب سے زیادہ فرض شناس وہ ہو گا جو سب سے زیادہ آدمیوں کو مار ڈالے گا۔

آندرے کے ذہن میں پیرس کی تصویر کسی نفیس اور نازک یونانی مجسمہ کی صورت میں محفوظ تھی اور اب اسے محسوس ہوا کہ اس مجسمے پر کسی نے سیاہ چادر ڈال دی ہے۔

---

[۱] پیرس کے ایک اسٹیشن کا نام

ریل آہستہ آہستہ چلتی اور رکتی ہوئی دیر کے بعد پلیٹ فارم پر آ کھڑی ہوئی۔ اسٹیشن میں اگر اندھیرا نہیں تو خاصا دھندلکا تھا۔ ادھر ادھر بجلی کے قمقمے گہرے نیلے سرپوشوں میں منھ لپیٹے پڑے تھے۔ آنے جانے والی گاڑیوں کا کوئی وقت معین نہیں تھا۔ جسے جب فرصت ملتی آجاتی۔ پھر بھی بڑے دن آرہے تھے اور تھوڑے سے خوش نصیب سپاہیوں کو اس موقع پر گھر جانے کی اجازت ملی تھی۔ ان کے عزیز یہ تو نہ جانتے تھے کہ وہ کب آئیں گے اور اگر آئے بھی تو اندھیرے میں کس طرح پہچانے جائیں گے۔ پھر بھی وہ آس باندھے ہر پھاٹک پر کھڑے باہر جانے والے مسافروں کو ٹارچ کی روشنی میں پہچاننے کی کوشش کررہے تھے۔

آندرے اس بھیڑ میں گھس بیٹھ کر بہ مشکل باہر نکلا۔ مفلوج درختوں اور سپاٹ چھتوں پر برف تہ بہ تہ جم گئی تھی۔ سڑکوں کو صاف کرنے کا اس سال کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لیے برف کے تودے ہر طرف جمع تھے اور آنکھ چوکتے ہی راہ گیر پھسل کر منھ کے بل گر پڑتے تھے۔

برف باری کا سلسلہ جاری تھا اور اسٹیشن کے علاقے سے ہٹ کر ہر سو سناٹا تھا۔ پہلے تو اس کے جی میں آیا کہ کوئی سواری لے اور اپنے محلے کی راہ پکڑے لیکن قریب سے سین ندی کی سرگوشی سنائی دے رہی تھی وہ زیر لب اس کے بچپن کا فسانہ گنگنا رہی تھی جب وہ کنارہ دریا کے ایک گاؤں میں رہتا اور اس میں تیرا کرتا تھا۔ آندرے اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھائے اور کمبل کاندھے پر ڈالے ہوئے اس طرف چلا اور پل کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

ندی کا پانی بے رنگ تھا اور اس پر برف کے تختے تیر رہے تھے۔ صدیوں کی داستان اس کے جگر پر مرقوم تھی اور آس پاس کے اندھیرے کو دیکھ کر اس پر حیرانی اور اداسی کی کیفیت طاری تھی۔ ابھی کچھ مہینوں پہلے کی بات ہے جب سڑکوں اور عمارتوں سے رنگ برنگی کرنیں اس کی موجوں پر تیرا کرتی تھیں۔ چاندنی راتوں میں بادبانی کشتیاں اس کی گود میں ناچتیں اور اس کے کنارے پر بے گھروں یا چاہنے والوں کا ہجوم سکون کی تلاش میں آتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہو گیا۔ پھر بھی یہ لازوال دریا لیل و نہار سے واقف تھا۔ جس قوم کے قلب سے ہو کر اس کی راہ گزرتی تھی اسے وہ روز اول سے جانتا تھا اور بہتے بہتے جب اس کی تہہ سے وہ خون کی بوندیں اوپر چھلک آتیں جو یہاں کے رہنے والوں کی تلواروں سے ٹپکی تھیں تو دریا جوش میں آجاتا اور اس کا دھارا تیز ہو جاتا۔

آندرے بہتے ہوئے پانی کے تاثرات کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے اپنے جسم کی مہک اور اس کی اپنی آواز کی لہک اس میں سرایت تھی۔ طبیعت کے بھاری پن کو جھٹک کر اس کے دل نے کہا "نہیں یہ شہر ابدالآباد تک قایم رہے گا۔ اس کی تعمیر چوب و سنگ سے ہوئی ہو لیکن اس کی بنیاد ایک خیال اور ایک خواب پر رکھی گئی ہے اور اگر وہ آج بگڑ گیا تو کل پھر بنے گا۔ جب اس کی آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو گئیں تو آس پاس کچھ اور لوگ نظر آئے جو اس کی طرح ندی سے باتیں کرنے آتے تھے۔ وہ سب پل کے ستونوں کو تھامے سر جھکائے کھڑے تھے اور ان کی بے زبانی میں جہان غم پنہاں تھا۔ دفعتہً آندرے کو اس مقدس وعدے کی یاد آئی جس کی تکمیل کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔ پیڑوں کے جھرمٹ میں اس کے قدموں کے پاس ایک نیم جان لاش پڑی ہے۔ اپنی ٹول کے ساتھ وہ دشمن کی ٹوہ لینے نکلا تھا۔ ہوا برف میں گھلی ہوئی، چاندنی کہر میں سنی ہوئی، بہت دور افق کے پاس دشمن تاک لگائے بیٹھا ہے۔ دونوں چاہتے ہیں کہ موقع ملتے ہی ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں اور زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو کم سے کم عرصے میں مار ڈالیں۔ ان کی ساری صلاحیتیں ہلاکت کے حربوں کے استعمال کے لیے وقف ہیں اگر ان کا بس چلے تو یہ اپنے ناخونوں کو بڑھا لیں، اپنے دانتوں کو تیز کرلیں اور درندوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں۔ آندرے کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بندوق پر اس کی انگلی جنبش کرتی ہے، ایک گولی فضا کو چیر کر کسی نامعلوم انسان کے جسم میں گھس جاتی ہے، وہ مر جاتا ہے۔ اس کے عزیزوں کے نام جنگ کے دیوتا کی طرف سے شکریے کا پروانہ آتا ہے اور محلے والے ان ننگے بھوکوں کو دیکھ کر ہمدردی

سے سرہلاتے ہوئے کہتے ہیں، یہ ملک و قوم کے لیے مصائب برداشت کررہے ہیں۔

یہ نیم جاں لاش جس کی ہے اُسے وہ جانتا پہچانتا نہیں۔ وہ ابھی نوجوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ارمانوں اور آرزوؤں کی دنیا بسی ہوئی تھی، امید اس کے ہونٹوں پر مسکراتی تھی۔ جب رات کو وہ گشت لگانے نکلے تو وہ چپکے چپکے اپنی باتیں سُنانے لگا۔ پیرس میں فلاں مقام پر اس کی دوکان ہے۔ اندر وہ گھر والوں کے ساتھ رہتا ہے۔ گھر میں بوڑھی ماں اور نئی دُلہن کے سوا کوئی نہیں۔ بڑے دنوں میں اسے گھر جانے کی چھٹی ملے گی۔ کپتان نے اس کی درخواست پر سفارش کردی ہے۔ اتنے میں ایک گولی اس کے سر پہ لگتی ہے اور وہ گھڑی بھر تڑپ کر مرجاتا ہے اور مرتے مرتے وہ پُرحسرت نگاہوں سے اپنے نامعلوم ساتھی کو دیکھتا ہے اور وہ ان کے پیغام کو سمجھ جاتا ہے۔ مرنے والے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے آندرے یہ سوچنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ موت جیسی قادرِ مطلق شے کیسی حقیر چیزوں میں رہتی ہے۔ لوہے کے ذرّوں میں، زہریلے جراثیم میں اور زندگی کہاں رہتی ہے۔ ایک ہچکی میں، سانس کے ایک جھٹکے میں!

رات بھیگ رہی تھی ہوا سرد تر ہوگئی تھی۔ آندرے اُٹھ کر آگے چلنے لگا۔ اب بھی کئی درماندہ ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے ماضی کی روشنی اور حال کی تاریکی کو گھور رہے تھے۔ جب صبح ہوگی تو ان میں سے کئی اس ندی کی تہہ میں سوتے ہوں گے۔ زندگی کے افکار و مصائب سے انھیں ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔ ان کا گوشت مچھلیاں کھاجائیں گی اور پھران مچھلیوں کو انسان کھاجائے گا۔

گھروں اور دکانوں کے دروازے بند، صرف کھانے پینے، اور ناچنے گانے کے ٹھکانے کھلے ہیں۔ ان کے اندر سے ہنسنے بولنے کی آوازآتی ہے، لیکن آوازوں میں ہذیان کی کیفیت۔ لوگوں کی ہنسی میں وحشت کا انداز ہے آندرے ایک کیفے میں داخل ہوا، اور کونے کی ایک میز پہ بیٹھ گیا۔

یہ عورتیں اور یہ مرد سرسام کے مریضوں کی طرح کہرام مچارہے ہیں۔ گویا یہ سب ایک پُرآشوب سیلاب سے بچنے کے لیے نوح کی کشتی میں بیٹھ گئے ہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ اس کشتی کو کبھی ساحل ملے گا یا نہیں اور وہ سوچتے ہیں کہ آؤ کچھ ایسا کریں کہ زندگی اور موت کی یاد بھول جائے۔

آندرے کو ہنگری کے اس گاؤں کی یاد آئی جس کے چاروں طرف دشمنوں نے آگ لگادی اور جب لوگوں کے لیے بچنے کا کوئی راستہ نہ رہا تو وہ سب ایک جگہ جمع ہوئے۔ شراب کے گیلن کھول دیے گئے۔ باجوں نے موت کے رقص کا نغمہ چھیڑا، سب مرد عورت متوالے ہوگئے۔ دو دو ایک دوسرے سے لپٹ کر پڑگئے اور جب آگ انھیں جلانے آئی تو کسی کو اس کی پروا نہ ہوئی۔

تہذیب و تمدّن کے باوجود انسان وہی دوپایہ ہے جو باغِ عدن میں عورت اور چارے کی فراوانی سے خوش اور ان کی محرومی سے دکھی رہتا تھا۔ آدم اور آدمی میں زبان اور ہاتھوں کی چند جنبشوں کا امتیاز ہے اور بس۔ آندرے کے آگے لڑائی کے میدان کا نقشہ کھنچ گیا۔ سپاہی وہاں کیچڑ سے لت پت خندق میں جیتے مرتے ہیں، یہی اُن کا گھر اور یہی ان کی قبر ہے۔ جب شہروں کے رہنے والے سردی میں کوئلے اور رضائیوں کے لیے واویلا مچاتے ہیں اور چائے گوشت کی کمی کا رونا روتے ہیں تو یہ سپاہی کھلے ہوئے آسمان کے تلے برف کے بار سے دبے ہوئے اس تار پہ کھڑے رہتے ہیں جو زندگی اور موت کے مابین سرحد قایم کرتا ہے۔ وہ مذہب، ملک یا قوم کی خاطر لڑنے بھیجے جاتے ہیں اور ان بلند بانگ الفاظ کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ تھوڑے سے آدمیوں کے لیے پشت ہا پشت تک بہت سی خوبصورت عورتوں اور طرح طرح کے کھانوں کے وسائل مہیا کیے جائیں۔

آندرے کے ہونٹوں پر ایک تلخ تبسم آیا اور اُس نے بیئر کے چوتھے گلاس کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا " اور

جب ان ملکوں کے پیشوا مر جاتے ہیں تو ان کا جسم سڑ کر کھاد بن جاتا ہے اور اس کھاد سے اناج اُگتا ہے جسے انسان اور حیوان سب کھاتے ہیں۔

بیزاری اور تلخی کا طوفان لیے ہوئے وہ باہر نکلا اس کے بے گناہ دوست نے اس لیے اپنی جان دی تھی کہ کیفے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی خواہش کی تکمیل کی جائے اور ان خواہشوں کا ماحصل اچھے کھانے کے بعد کی ایک پُرسکون ڈکار اور کسی عورت کے آغوش میں پُراطمینان خراٹوں کے سوا کیا ہے۔

(۲)

دن چڑھ چکا تھا جب آندرے کی آنکھ کھُلی۔ مہینوں بعد وہ اتنی گہری نیند سویا تھا۔ کھڑکی کا پردہ کھینچ کر اُس نے زمین و آسمان کو دیکھا نیلے آکاش پر سورج جگمگا رہا تھا اور دھوپ جمی ہوئی برف پر چاندی لٹا رہی تھی۔

آندرے تیار ہو کر اس پتے پر چلا جہاں ایک بوڑھی ماں اور ایک دُلہن اپنے پیارے کا انتظار کر رہی تھیں اور ان جیسی کتنی عورتیں اپنے عزیزوں کی راہ شب و روز تکا کرتی ہیں۔

آندرے اس گھر سے جتنا قریب ہوتا گیا اس کے دل کی دھڑکن اتنی ہی تیز ہوتی گئی۔ لڑائی کے میدان میں کئی بار اسے بکٹ سے بکٹ مہم پر جانا پڑا تھا لیکن اب تک وہ کسی مہم میں اتنا ہراساں نہ ہوا تھا۔ شدید سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا اور وہ اپنے رعشہ رعشہ میں کپکپی سی محسوس کرنے لگا۔ راستے میں ایک جگہ ٹھہر کر اس نے شراب پی اور سوچنے لگا کہ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ وہ خط یا تار کے ذریعے یہ خبر بھیج کر اپنی گلوخلاصی کرے۔ لیکن اس کی جیب میں شادی کی وہ انگوٹھی ہے جو مرنے والے اپنی دلہن کو لوٹا لی ہے اور چاندی کے ننھے سے چوکھٹے میں جڑی ہوئی عیلیہ کی وہ تصویر جو ماں نے اپنے بیٹے کے ساتھ کر دی تھی۔۔ ان یادگاروں کو بھی تو ان سوگوار عورتوں کے سپرد کرنا ہے۔ آندرے نے اپنے بٹوے کو کھول کر دیکھا اور یک بیک اس کی نگاہ اس لوہے کی زنجیر پر پڑی جو ہر سپاہی کی کلائی سے بندھی ہوئی تھی۔ اس میں اس کا نام اور اس کی فوج کا نشان کھُدا ہوا تھا۔ جب کوئی مر جاتا تو یہ زنجیر اُس کے گھر بھیجی جاتی۔ آندرے کی جیب میں مرنے والے کی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ تینوں چیزوں کو رومال میں لپیٹے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اپنی موت سے زیادہ اندوہ ناک امر کسی دوسرے کی موت کی اطلاع اس کے عزیزوں تک پہنچانا ہے۔ اُسے ان لوگوں کی بے باکی پر حیرت ہوئی، جو لاشوں کے پاس بیٹھ کر اطمینان سے پُرسا کرتے اور سیاپہ گاتے ہیں اس وقت اپنی حالت دیکھ کر ایسے لوگوں پر بے حسی کا شبہ ہونے لگا۔ کیونکہ موت کا پر وقار سکون صرف لاکلامی کا طلب گار ہے۔

اسے اپنی قسمت پر بھروسہ نہیں رہا۔ اس کی بیزاری اور تلخی موم بن کر پگھل گئی۔ ان عورتوں نے تو زندگی سے کچھ زیادہ نہیں مانگا تھا۔ دونوں کا سہارا ایک مرد تھا جس نے دانستہ کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ ایک چھوٹی سی دکان میں وہ تینوں اخبار اور کتابیں بیچا کرتے تھے۔ اتنے میں ایک روز ان کے ملک پر ایک دوسرا ملک حملہ کر دیتا ہے۔ وہاں کا ایک ویسا ہی دکان دار دور بیٹھ کر ہوا میں بندوق چلاتا ہے اور اس کی گولی کسی کو مار ڈالتی ہے۔ اور اب یہ بوڑھی ماں کس کے برتے پر جیے گی۔ یہ پریم پیاسی عورت کس کا سہارا لے گی۔

آندرے اپنی قسمت کو سراہتا ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ وہ کسی کو نہیں چاہتا اور کوئی اس کی پروا نہیں کرتا۔ جب ہر طرف امن تھا تو یہ بے معنی زندگی اس کے لیے وبال تھی لیکن آج یہ سب سے بڑی برکت ہے، کوئی اس کا انتظار نہیں کرے گا۔ کوئی اس کے مر جانے پر آنسو نہیں بہائے گا اور یہ صورت حال عین موت کے مطابق سکون پرور ہے۔ وہ دکان میں داخل ہوتا ہے۔ کونے میں کرسی

ایک بڑھیا اونی مفلر بُن رہی ہے۔ اندر کے کمرے سے برتن دُھلنے کی آواز آرہی ہے۔ وہاں شاید مرنے والے کی بیوی ہے۔ آندرے اندر جاکر ٹھٹک جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہے۔ وہ الماری سے کتابیں نکال کر دیکھنے لگتا ہے۔ بوڑھی عورت اپنی جگہ سے اٹھتی ہے اور گاہک کو سلام کرتی ہے "کیسی سُہانی صبح ہے لیکن عیسیٰؑ کی شہادت کے دن موسم بہت اُداس تھا۔۔۔۔ آپ کو کیسی کتابوں کی ضرورت ہے؟ اگر میں غلطی نہیں کرتی ہوں تو آپ مورچے سے چھٹی پر آئے ہیں۔ جی؟ میرا قیاس سچ ہے نا؟ تو پھر آپ ایسی کتابیں پڑھیے جن سے امید اور تسکین ملے۔ عیسیٰ کی زندگی، سان فرانسس کے بول؟

بڑھیا خوش ہے۔ اسے یقین ہے کہ اُس کا بیٹا بھی آج کل میں آتا ہوگا۔ وہ کتابیں نکال نکال کر میز پر رکھتی ہوئی کہتی جاتی ہے "روزگار بہت مندا پڑگیا ہے شہر ویرانہ ہوگیا ہے، بکری ہو تو کس چیز کی، اخبار ضرور بک جاتے ہوں گے، لیکن"۔ اس لیکن کے ساتھ بوڑھی کا چہرہ فرطِ انبساط سے کھِل اٹھتا ہے "

"جب لڑائی ختم ہو جائے گی تو مورس سب کام سنبھال لے گا۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ کاش آپ جانتے ہوتے کہ وہ کتنا محنتی اور سعادت مند ہے۔ آپ نے اسے کہاں دیکھا ہوگا، اونچا قد، بھوری نیلی آنکھیں، سنہرے بال۔ وہ بھی آج کل میں دس دن کی چھٹی پر آنے والا ہے۔ میں تو اس کے لیے مفلر کے سوا کچھ نہ بُن سکی لیکن اس کی بہونے۔ اوہ اگر آپ اس کے بنائے ہوئے سوئٹر اور موزوں کو دیکھیں "

آندرے کا دل بھر آیا۔ مدت کے بعد اس کی آنکھوں کو آنسوؤں کی تری محسوس ہوئی۔ وہ چپ چاپ یہ سب سُنتا رہا اور پھر پیٹھ موڑ کر کسی الماری سے کتابیں نکالنے لگا۔ بھرائی ہوئی آواز میں وہ صرف یہ کہہ سکا:۔

"ان کی قیمت؟"

جب بڑھیا نوٹ کا چینج لینے کے لیے صندوقچے کی طرف گئی آندرے نے فوراً جیب سے وہ تینوں چیزیں نکال کر میز کے کونے پر رکھ دیں۔ آنکھیں پھیر کر اس نے الوداع "خدا آپ کا نگہبان ہو" کہا اور فوراً دکان کے باہر نکل آیا۔ وہ یوں لپکتا ہوا پاس کی گلی میں گھس گیا گویا کسی جرم کا خطاوار ہو۔ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے اندھا دھند بھاگتا گیا اور اُس کا دل ڈرا کہ وہ بےکس عورتیں اس کا دامن تھام کر زندگی کی بھیک مانگ بیٹھیں تو وہ کیا دے گا۔

آسمان کا نیلا پن اور نکھر گیا تھا سورج کی تابانی زیادہ کھل گئی تھی لیکن دلوں میں اندھیرا تھا اور اندھیرے میں مایوسی تھی۔ ہر مکان کے در و دالان سے ایک خاموش دعا، ایک بےزبان التجا اٹھتی اور اس طرف دیکھتی جہاں انسانوں کے غول زندگی کے حکم پر مرنے اور مارنے کے لیے جمع تھے۔

بچے آندرے کی طرف انگلی اٹھا کر آپس میں کچھ کہنے لگتے شاید ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کے باپ اور بھائی اسی سپاہی کی طرح لڑ رہے ہیں۔ سپاہی اور لڑائی کے کھیل وہ آپس میں رچاتے ہیں اور حسرت سے سوچتے کہ کاش ہم بڑے ہوتے اور سپاہی بن کر لڑتے۔ آندرے یہ سوچ کر کانپ جاتا ہے کہ ایک نئی نسل وجود میں آرہی ہے جس کی سب سے بڑی تمنا قتل و غارت گری ہے۔ لیکن مائیں اسے دیکھ کر پسیج جاتی ہیں اور سہم کر آپس میں کہتی ہیں کہ بہت دور اسی جواں سال کی طرح ان کے بیٹے بھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ جوان عورتیں اسے للچائی ہوئی نظروں سے گھورتی ہیں اور انھیں اپنی جوانی پر رونا آتا ہے جو سونی بیت رہی ہے۔ گلیوں کا سلسلہ ایک پارک کے سامنے جاکر ختم ہو جاتا ہے۔ آندرے تھک کر ایک بنچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ دو چار دن میں

ہیں وہ اپنی نوج کے ساتھ ہوگا اور پھر شاید اس کو کبھی اتنی فرصت نہ ملے کہ یوں تنہا بیٹھ کر آسمان و زمین کو اس نگاہ سے دیکھ سکے۔ یہ کائنات کتنی عجیب ہے اور کس قدر پُراسرار۔ انسان اس طلسم کے دروازے پر کھڑا ہو کر قیامت تک دستک دیتا رہے گا اور قیامت کے دن جب یہ دروازہ ٹوٹے گا تو یہ نظر آئے گا کہ خون کا ایک دریا ہے کہ جس کے بیچوں بیچ ہڈیوں کا محل بنا ہوا ہے اور جس میں وہ معبود رہتا ہے جس کی پرستش فریب خوردہ انسانیت ہمیشہ سے کرتی آئی ہے۔

بھری دوپہر میں کلیسا کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ بس ایسے بج رہا ہے کہ ہمیشہ سے بجتا آیا ہے۔ بجانے والوں اور سننے والوں کو کچھ نہیں معلوم کہ اس آواز میں خوشی ہے یا غم، امید ہے یا مایوسی!؟

آندرے دیر کے بعد اپنی جگہ سے اٹھتا ہے۔ اسے کہیں نہیں جانا ہے اسے کچھ نہیں کرنا ہے، اسے سب کچھ بھول جانا ہے۔ جب زندگی کا مقصد موت کے سوا کچھ نہیں تو اس کے مرحلوں پر سرکیوں کھپایا جائے۔ چلتے چلتے وہ کلیسا کے سامنے پہنچتا ہے اور بلا ارادہ اس کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ ہلکا ہلکا اندھیرا گہری گہری سی خاموشی۔ ارگن ایک متین لیکن دل سوز نغمہ بجا رہا ہے۔ یہاں وہاں سوگوار عبادت گزار گھٹنے ٹیکے اور ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ جگہ جگہ عیسیٰؑ اور مریم کی شبیہوں کے آگے موم بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ اگر اور عود کی خوشبو سے ہوا بوجھل ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر اس فضا میں بیٹھ کر آندرے کو محسوس ہوا کہ انسان کے میدانِ جنگ سے عبادت گاہ زیادہ مہلک ہے۔ کیوں کہ یہاں آدمی اپنے مصائب کو بھول جانے کا درس لیتا ہے ان سے لڑنے کا نہیں۔ عبادت کا کلوروفارم سُنگھا کر ظلم انسانیت پر نشتر زنی کیا کرتا ہے۔

آندرے کو ان انسانوں پر رحم آیا۔ یہ پیاسے ہیں اور زندگی کے صحرا میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اگر سراب میں پانی کی جھلک دیکھ کر یہ فریب کھا جائیں تو کیا عجب؟

اتنے میں وہ کیا دیکھتا ہے کہ وہی بوڑھی لاٹھی ٹیکے ہوئے اندر آ رہی ہے۔ اس کی بہو سیاہ نقاب اور سیاہ لبادے میں ملبوس اس کا ہاتھ تھامے ہوئے ہے۔ دونوں کے سر جھکے ہوئے ہیں۔ وہ کمزور درخت جنھیں پالا مار گیا ہے۔ دونوں کونے کے ایک شہ نشین کے مقابل جا کھڑی ہو جاتی ہیں۔

آندرے دم بخود ہے۔ وہ مجرم کی طرح ان دُکھیاریوں کو دیکھ رہا ہے کیوں وہ یہ منحوس خبر لایا۔ کون زیادہ قابلِ ملامت ہے۔ موت کا فرشتہ یا موت کی خبر دینے والا؟

یک بیک کئی لوگ چیخ پڑتے ہیں۔ درتیں ... کے آندرے کی سمجھ میں کچھ آئے وہ اپنے کو اس بڑھیا کے پاس پاتا ہے بڑھیا نہ دعا مانگ رہی ہے، نہ رو رہی ہے۔ نہ اس نے سجدہ کیا ہے نہ فریاد کی ہے۔ اس نے مریم کے بُت کے منہ پر تھوک دیا ہے۔ یہ تھوک خدا کی ماں کے گالوں پر بہہ رہا ہے۔

آندرے بوڑھی کو ایک ہاتھ میں لپیٹ لیتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں رومال لے کر بُت کا منہ صاف کرنے لگتا ہے۔

(ماخوذ از "زندگی کا میلہ")

افکار — اپنے شہر کے ہر بک اسٹال سے طلب کیجیے

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

مجھے جانے دو

"مجھے جانے دو" اس نے کہا اور جب تک میں اسے روکوں وہ ہاتھ چھڑا کر جا چکی تھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کی ایک جھلک اور دہلیز پر پاؤں کے بچھوے کی ایک جھنک سنائی دی۔ وہ چلی گئی اور میں کوٹھری میں اکیلا رہ گیا۔

میں وہاں جانا نہ چاہتا تھا۔ میں اکثر اس مکان کے آگے سے گزرا تھا۔ شام کے وقت کچھ جوان لڑکیوں کو اس کے پھاٹک کے آگے کھڑا پایا تھا۔ جاڑے کی راتوں میں نیم آستین جمپر پہنے ہوئے یہ چھوکریاں راہ چلتوں کو لبھانے کی تدبیر کیا کرتی تھیں۔ کوئی بھی آنکھوں والا غازے کی سرخی میں عصمت کے خون کی جھلک دیکھ سکتا تھا ان کے جسم کا ہر رواں تھر تھرا کر کہہ رہا تھا — ہمیں لے لو۔ ایک روپے کے بدلے!!

ان میں سے بعض سگریٹ کا دھواں نہایت نزاکت سے کسی رنگیلے کے منہ پر پھینک دیتی تھیں اور کوئی من چلی کسی بدنما مارواڑی کے جوتے پر پان کی پیک تھوک دیتی تھی۔ جب وہ پلٹ کر دیکھتا تو لڑکیاں آنکھ مار کر کھل کھلا پڑتی تھیں۔ ان کی ہر ادا زبانِ حال سے کہتی تھی — ہمیں لے لو۔ ایک روپے کے بدلے —

ٹرام پر شریف زادیوں اور موٹروں پر امیر زادیوں کے کھیپ کے کھیپ گزرا کرتے تھے۔ ان سستی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ توبہ استغفار کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔ یہ بدبخت، نسوانیت کی کلنک، خدا انھیں غارت کرے! چند ٹکوں کے لیے، شراب کی ایک بوتل یا سگرٹ کی ایک ڈبیا کے لیے یہ اپنا تن ہرایرے غیرے کے سپرد کر دیتی ہیں — اور ہم؟ پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کرنے لگتی تھیں جنھوں نے انھیں اونچی حویلیاں، ریشمی ساریاں اور چھ چھ بچے عطا کیے تھے۔

اس مکان سے لگ کر کالی دیوی کا ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ یہ کالی کلوٹی اور ننگ دھڑنگ دیوی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے لیل و نہار کا تماشہ دیکھا کرتی تھی۔ شام کو جب آرتی شروع ہوتی اور کم سن لڑکیاں اس کے سامنے ناچنے لگتیں تو مٹی کے چراغوں کی دھندلی جوت میں اس کی شکل زیادہ پُراسرار ہو جاتی۔ معلوم ہوتا کہ عورت کی روح ایک سیاہ کفن اوڑھے ہوئے اپنی قبر سے اٹھی ہے اور ایک آن میں مرد کو فنا کر دے گی۔ جو لوگ درشن کے لیے آتے، وہ ہاتھ باندھے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے ان رقاصاؤں کو تاکا کرتے تھے اور جب وہ التفات نہ کرتیں تو یہ زیادہ بے باکی سے ان طوائفوں کو گھورنے لگتے جو بچاری ڈر کے مارے سیڑھی کے نیچے سر جھکائے کھڑی رہتی تھیں۔

ان میں سے ایک کا انداز سب سے نرالا تھا۔ اس کے دل میں پوجا کی عظمت کا مطلق احساس نہ تھا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے نہایت اطمینان سے آرتی کا تماشا دیکھتی اور وقتاً فوقتاً کیرتن کی لے پر پیروں سے ٹیک دینے لگتی۔ جب کوئی بوڑھا اپنی پھٹی ہوئی آواز سے تال کو

بے تال کر دیتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتی اور ہنواڑی کو پکار کر کہتی — "ارے، ذرا سی سُرتی تو بنا نا۔"
اور کیرتن کا نغمہ کسی مجروح پرندے کی طرح دیر تک تڑپتا رہتا تھا۔

جب ہم نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو میرا دل آپ ہی آپ بہوت ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں وہاں سے بھاگتے بھاگتے بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

لیکن اس نے بے پرواہی سے مجھے دیکھا اور اپنی ایک سہیلی سے پوچھنے لگی،۔

"پیاری، اس حرام زادے سے کتنے اینٹھے —؟"

اب میں ہر شام کو اس فٹ پاتھ سے گزرنے لگا۔ جب وہ اس مقام پر ہوتی تو ذرا حیرانی سے میری طرف دیکھتی اور پھر کچھ مسکرا کر اپنی ہم چشموں سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ کبھی وہ وہاں نہیں بھی ہوتی تھی اور میں سمجھ جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ میرے دل پر چوٹ سی لگتی، خون کی روانی تیز ہو جاتی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں آ جاتیں۔ دور ہٹ کر لیمپ کے کھمبے کا سہارا لیے میں گھنٹوں کھڑا رہتا تھا حتیٰ کہ پیر شل ہو جاتے تھے میں یوں ہی ٹکٹکی باندھے اس پھاٹک کو تاکتا رہتا تھا۔ بہتیرے شریف اس کے اندر سے نکلتے اور دائیں بائیں دیکھ کر لپکتے ہوئے بھیڑ میں گم ہو جاتے تھے۔ لمبی لمبی چوٹیوں اور گھنیری داڑھیوں والے بیسیوں بدمعاش اس گھر سے برآمد ہو کر بھیگی بلیوں کی طرح پنجے دبائے بھاگتے نظر آتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے کیوں کر اس سے ہم کلام ہونے کی جسارت کی تھی۔ اس روز میں اپنے سب سے پیارے دوست کو قبر میں لٹا کر لوٹا تھا۔ اب دنیا میں میرا کوئی اپنا نہ تھا۔ وہ دق میں گھل گھل کر مر گیا اور میں اس کے علاج کا کوئی انتظام نہ کر سکا۔ جب وہ مر گیا تو ہم نے اسے مٹی کے تودوں کے نیچے دبا دیا۔ جب وہ قبر میں سلا دیا گیا تو میں نے کلیجہ تھام کر آخری مرتبہ اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس پر اب بھی وہی بھولا پن تھا۔ گویا انسان سماج کی قبر میں چاندی کے ڈھیلوں کے نیچے دب گیا اور اس نے مرتے مرتے کہا —
"میری پیپ تمھارے جسم کو سڑائے گی میرا خون تمھارے بدن کو تپائے گا۔ میرے آنسو تمھارے گوشت کو گلائیں گے۔"
میں قبرستان سے لوٹا تو میرے جسم کے اندر کچھ نہ تھا۔ ضمیر کی جگہ کوئی چیز بھائیں بھائیں کر رہی تھی، ایک خلا جس میں کاش کے سوا کچھ نہ تھا۔

شام کے وقت بلا ارادہ میں اسی مکان کے آگے موجود تھا۔ میں نے بنا کچھ کہے ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر گھسیٹ لیا۔
اس نے مجھے ایک روپیہ دے کر کہا "اس مندر کے پیچھے کی گلی میں ایک کلال کی دُکان ہے، وہاں سے ایک اَدھا خرید لاؤ۔"
میں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا، لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہو گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ہر وہ کام اچھا ہے جسے دنیا برا کہتی ہے
پھر میں اس کلال کی دکان میں گھس گیا۔

مٹی کے بڑے بڑے مٹکے جن پر جھاگ کے بادل سمٹ آئے تھے۔ جیسے بھینس کے تھن سے دودھ ٹپک رہا ہو۔ ان میں مکھیاں اور مکوڑے تیرتے ہوئے۔ اندر متوالے مل کر گا رہے تھے۔

"ایک شا ممبرون کا آآآآ....... بہاآآآ.... ...دے نالا......"

میں نے جلدی سے ایک اَدھا خریدا اور دوانی کی چاٹ چٹپٹی مسالے دار۔
اس نے منہ لگا کر دیکھتے دیکھتے آدھی بوتل ختم کر دی۔ پھر چُپ چاپ ایک سگرٹ سُلگایا اور میری گود میں اپنے پاؤں پھیلا کر

ٹوٹی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہوگئی۔

یک بیک وہ زور سے ہنسی اور مجھے غور سے دیکھ کر پوچھا "تم یہاں کیوں آئے ؟"

ہوا بند تھی۔ کھڑکی سے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آرہا تھا جس میں دو تین ستارے چنبیلی کے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سوال کا جواب کیا ہوسکتا تھا۔

"بولتے نہیں۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ تم یہاں کس غرض سے آئے ہو مجھے اس مرد سے نفرت ہوتی ہے جو عورت کے پاس بیٹھ کر اپنا مدعا زبان سے نہیں بلکہ نگاہ سے ظاہر کیا کرتا ہے اور اس گھڑی کا منتظر رہتا ہے جب عورت خود اس سے کچھ پوچھے گی، تم چاہتے کیا ہو؟"

اس نے بوتل کی بچی ہوئی شراب اپنے گلے کے نیچے اُتاری اور سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر باہر دیکھنے لگی۔ میں بدستور چپ تھا۔ خود مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کیوں آیا ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔

پھر وہ اٹھ کر کوٹھری میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اس میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔ جب وہ دوبارہ ہنسی تو مجھے ایسا لگا کہ کوئی مُردہ ہنس رہا ہے۔

"یہ میری ہی صورت ہے۔ اگر میں کاجل غازہ اور لاکھے کو دھوڈالوں تو کیا رہ جائے گا۔ دھندلی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، سوکھے ہوئے ہونٹ۔ تین سال کے اندر کیا سے کیا ہوگیا۔ میرے جسم کو گھن لگ چکا ہے۔ میں اندر سے کھوکھلی ہوگئی ہوں مجھے ایسی ایسی بیماریاں لگ گئی ہیں جن کے تصور سے تمھیں وحشت ہوگی اور تم یہاں سے بھاگ جاؤ گے۔"

دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی اس کا منہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ مجھ پر آنکھیں گاڑ کر وہ کہنے لگی۔

"اور یہ بیماریاں مجھے کہاں سے لگیں؟ یہ تم جیسے چاہنے والوں کا ہی عطیہ ہیں۔ مرد ــــ سوزاک اور آتشک کے جراثیم کا باپ"۔

تم ابھی اس کوچے سے ناواقف ہو۔ نہیں جانتے کہ عورت کیا ہے۔ اگر تمھیں اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح معلوم ہوتا کہ وہ مٹی کا ایک کھلونا ہے۔ اور بس، تو تم آتے ہی اُسے توڑ دیتے، یوں حیرت اور ہیبت سے مجھے نہ تاکا کرتے۔ مگر تم ان لوگوں سے اچھے ہو جو وحشی درندوں کی طرح دیکھتے ہی ہمارے سینوں پر چڑھ آتے ہیں، ہمیں کتوں کی طرح بھنبھوڑتے ہیں اور جب ہڈیوں میں گودا نہیں رہتا تو ہمارے پلو میں دو چار ٹکلیاں باندھ کر چلے جاتے ہیں۔

پھر گھروالی آتی ہے۔ ہماری گرہ سے ایک ایک چھدام نکال کر لے جاتی ہے۔ اور اس کے بدلے ہمیں کھانے کے لیے روٹیاں اور سنگار کے لیے کاجل کی سلائی دے جاتی ہے۔

دن کے اُجالے میں جب تم لوگ اِدھر سے آتے جاتے ہو تو حقارت سے منہ پھیر کر اپنے ساتھیوں سے کہتے ہو یہاں چکلا ہوتا ہے ان ٹکیتی طوائفوں کو عصمت یا عزت کا ذرا پاس نہیں۔ انھیں شہر سے باہر نکال دینا چاہیے۔

مگر رات کے اندھیرے میں تم کشاں کشاں آتے ہو ان ویران خرابوں کو آباد کرتے ہو۔ تم اپنا مُنہ کالا کر کے اپنی حرام کی کمائی کے چند درم ہمیں دیتے ہو اور پھر اس تجسس میں اپنی حرم سرا کو بھاگتے ہو کہ بیوی تو خیریت سے ہے۔"

وہ ہانپنے اور کھانسنے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا اور وہ چارپائی پر گر پڑی۔ اس نے در و دیوار کو دیکھا اور آپ ہی آپ کہنے لگی؛

"زیادہ دن نہیں ہیں کہ یہ مصائب بہت جلد ختم ہوجائیں گے" اب سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔

جب میں مر جاؤں اور میری لاش لاوارثوں کے قبرستان میں پھینک دی جائے تو تم علی گڑھ کے مولانا نور الاسلام سے ملنا۔ اُس وقت ان کے پاس جانا جب وہ منبر پر بیٹھے جمعہ کا خطبہ سنا رہے ہوں اور تمھیں شرافت کی قسم کہ جب وہ اخلاق کی تفسیر بیان کرنے لگیں تو اپنی صف سے نکل کر کہنا۔ مولانا میں ایک پردیسی ہوں اور آپ کو یہ پیغام سنانے کے لیے کلکتے سے آیا ہوں کہ بداخلاقی اس دنیا سے چل بسی، اب آپ ناحق نہ بسوریے۔

اور جب سب بڈھے اپنی عینکیں کھسکا کر تمھیں گھوریں اور پوچھیں کہ کیا بکتا ہے، تو تم کہنا۔ میں آپ کی بیٹی کے جنازے کا تماشہ دیکھ کر آرہا ہوں۔ وہ جسے ایک حرامی بچہ پیدا کرنے کے جرم میں آپ نے گھر سے نکال دیا تھا اُسے ایک مردِ مومن نے کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر ڈال لیا۔ اور اسی طرح ہاتھوں ہاتھ وہ کلکتہ پہنچ کر طوائف کا پیشہ کرنے لگی۔

آپ کے ہم جنسوں نے اُسے تحفے میں گھناونی بیماریاں دیں اور جب وہ مرگئی تو ایک حافظ نے اُس کی قبر پر فاتحہ خوانی کی، جب تم یہ کہہ چکو گے، تو لوگ تمھیں بہت پیٹیں گے لیکن اپنی محبت کے صدقے میں اتنی تکلیف اٹھا لینا۔

میرا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں مگر پیروں میں جیسے زنجیر پڑ گئی تھی۔

وہ پھر کھانسنے لگی۔ جب اُس کا جی کچھ سنبھلا تو میں نے دیکھا کہ وہ چپکے چپکے رو رہی ہے۔

"تم لوگ جانوروں پر رحم کھاتے ہو۔ ان پر کوئی تشدد کرتا ہے تو سزائیں دیتے ہو۔ میں نے سیٹھوں کو دیکھا ہے کہ چیونٹیوں کو شکر اور سانڈوں کو پوریاں کھلاتے ہیں —— مگر عورت! آہ عورت پر اتنا ظلم کرتے ہو؟۔

مگر عورتیں بیویاں بن کر طوائفوں سے مردوں کی بہ نسبت زیادہ نفرت کرتی ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ ہمارا وجود ان کے حق میں کتنی بڑی نعمت ہے ہم انھیں زنا بالجبر، اغوا اور اعلانیہ عصمت دری سے بچاتی ہیں۔

اور خدا! —— وہ ہماری کیوں نہیں سنتا؟ اگر اس کی جنت میں حوروں کے لیے جگہ ہے تو دنیا کا ایک کونہ ہمیں کیوں نہیں مل سکتا؟"

اب ہوا چل رہی تھی اور تاڑ کے پتے غمناک آواز میں کراہ رہے تھے۔ سڑک پر ٹراموں اور موٹروں کا شور بہت کم ہو گیا تھا۔ البتہ اکّے دکّے رکشا کی گھنٹی بج اٹھتی تھی۔ بادلوں نے آسمان کے اس ٹکڑے کو گھیر لیا تھا اور ان میں کبھی کبھی بجلی چمک اٹھتی تھی۔

وہ پھر بولنے لگی:

"میں نے صرف ایک مرتبہ محبت کی ہے اور اب بھی اس فریب میں مبتلا ہوں کہ وہ سچی محبت تھی۔ یہ فریب کبھی نہ ٹوٹے گا کیونکہ قبل اس کے کہ میں اس کا امتحان لوں، وہ مر چکا تھا۔

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر کس التجا سے مجھے دیکھتا تھا۔ وہی تصور مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے میں نے اپنا مایۂ حیات اسے سونپ دیا اور اس سے پہلے کہ وہ اس امانت کو لوٹائے، وہ پلیگ میں مر گیا۔

اس نے مجھے جو بچہ دیا وہ حرامی تھا۔ کاش ہماری محبت کو اخلاق کی مُہر مل جاتی اور میرا بچہ بچ جاتا"

ان بھولی ہوئی باتوں کی یاد سے اس کا دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اُسے کس طرح دلاسا دوں جس ماں کے آگے اس کے بچے کی لاش پڑی ہوئی ہو اور جس عورت کے آگے اُس کے محبوب کا جنازہ! اُسے تسلّی دینے کا اسلوب کوئی زبان پیدا نہیں کر سکتی۔

جیسے وہ عدالت کے آگے بیان دے رہی ہو۔

"میری سوتیلی ماں نے اندھیری رات میں اس بچے کی لاش آنگن میں گاڑ دی۔ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے بجلی کی روشنی میں میں نے وہ نظارہ دیکھا اور پھر چیخ کر بے ہوش ہو گئی۔

دو تین روز بعد میرے سوتیلے ماموں نے مجھے گاڑی میں بٹھا کر الہ آباد کا ٹکٹ ہاتھ میں تھما دیا۔ یہیں سے میری مصیبت کا آغاز ہوتا ہے۔

الہ آباد ..... میرے نسبتی خالو کا مکان ہے ..... میری مرضی کے خلاف عصمت دری ...... بدنامی کا ڈر.....

کلکتہ ...... یہ چکلہ گھر ....."

زیر لب یہ ٹوٹے پھوٹے جملے دہراتی رہی، اور چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی۔

میں دبے پاؤں اٹھا اور نکل بھاگنے کی نیت سے جوتے پہننے لگا۔ اتنے میں وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

"کیا تم جا رہے ہو"؟

اس نے اداسی سے پوچھا۔ اب اس کی آواز نرم و نحیف ہو گئی تھی۔

میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اب بھی کچھ نہ کہہ سکا۔

"اچھا جاؤ۔ خدا حافظ۔ اب نہ آنا۔ میں تم سے انتقام نہیں لینا چاہتی اور کوئی ہوتا تو میں بصد شکر سوزاک اور آتشک کے چند جراثیم نذر کرتی، وہ کسی اور کو دیتا اور یہ اس کے بچوں کو ورثے میں ملتے۔ غرض ساری انسانیت ان امراض میں مبتلا ہو جاتی۔ تب شاید سماج کے ٹھیکے داروں کو ہوش آتا کہ اس بلا کی جڑ کہاں ہے۔؟

مگر کبھی کبھی آ کر پوچھ لینا کہ میرے مرنے میں کتنی دیر ہے۔ کوئی کانوں میں کہہ رہا ہے کہ زیادہ نہیں۔

کوئی بھری جوانی میں مرتا ہے تو لوگ افسوس کرتے ہیں کہ کیسا نامراد چلا۔ لیکن مجھے دیکھو کہ زندگی سے موت کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ تم نہیں جانتے کہ ہم اپنی نظر میں کتنی ذلیل ہیں، ہمارا ہر لمحہ دوسروں کی خوشنودی میں بسر ہوتا ہے۔ ہم ایسی لونڈیاں ہیں جن کے آقا ہر روز بدلتے ہیں۔ کیوں کس خیال میں گم ہو گئے۔ جاؤ خدا کے لیے چلے جاؤ۔"

لیکن میں نہ جا سکا۔ مجھے اس سے کچھ نہ لینا تھا۔ میں گرفتارِ نظر پرندے کی طرح اپنی جگہ سے ٹل نہ سکا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنا سر اس کے آغوش میں رکھ دیا۔ وہ ایک بے جان لاش کی طرح یوں ہی پڑی رہی۔ اس کے دل کی دھڑکن کو میں صاف سن سکتا تھا۔ اس کی روح کا نوحہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

"تو پھر مجھے جانے دو۔"

اس نے کہا ــــ اور وہ چلی گئی ــــ

(ماخوذ از "محبت اور نفرت")

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

کافرستان کی شہزادی

(افغانستان کے مشرق کی طرف ایک علاقہ ہے جو پہلے کافرستان کہلاتا تھا۔ تھوڑی مدت ہوئی کہ یہاں کے باشندے مسلمان ہوئے۔ اور اب یہ صوبہ نورستان کہلانے لگا۔ اسی علاقے کا ایک کونہ چترال میں دھنس جاتا ہے اور وادیٔ بمبریت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مجھے کئی سال پہلے چترال جانے اور چند روز اس وادی میں گزارنے کا موقع ملا تھا۔ یہ افسانہ انہی ایام کی یادگار ہے۔)

الاؤ کی آگ سلگتی، سنسناتی اور چٹختی ہوئی اور بھڑکی اور اس کی چنگاریاں جگنوؤں کی طرح ہرے بھرے پیڑوں میں چمکنے اور بجھنے لگیں۔ جب لکڑی کے سب کندے آگ کی گرفت میں آ گئے تو ایک آتشیں مینار ننگے میدان کی کوکھ سے نکل کر تن گیا اور یوں بلند ہوتا گیا گویا زمین کے اندر سے کوئی اُسے اوپر دھکیل رہا ہو۔ گھنے گھنے چناروں کے جھرمٹ کو چیر کر اس کی تمتماتی ہوئی آنچ دور دور پھیل گئی اور اس سے بھی بہت دور اس نقارے کی پیہم چیخ پھیلی گئی جسے دو نوجوان مارخور کے سینگوں سے پیٹ رہے تھے وہ چیخ ہندوکش کی اونچی اونچی چوٹیوں سے ٹکرا کر ہر طرف بکھر گئی۔ وہ چوٹیاں جو کافرستان کی اس حسین وادی بمبریت کے چاروں طرف زنجیر کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔ پہاڑی نالا اپنے پانی کی صفائی پر اتراتا ہوا ایک بے معنی شور مچاتا اپنی راہ بہا جا رہا تھا۔

برف پوش پہاڑ جن کی چوٹیوں نے دھوپ کا منہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ ملگجی سی چاندنی میں جاگ کر اپنے ارد گرد لہلہاتی ہوئی بہار کو پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ بہار جس کا جادو رات کو بھی نہ سویا تھا اور جس کی آواز پر چیڑ اور دیودار کے پیڑ اپنے کھردرے بدن میں سے نئی نئی پتیاں نکال رہے تھے۔

مسافر الاؤ سے ہٹ کر چنار کے نیچے کمبل اوڑھے چپ چاپ بیٹھا رہا بے نور چاند کو اس نے شب قدر کی برفانی چوٹی پر یوں اٹکا ہوا پایا جیسے اُسے سولی پر ٹانگ دیا گیا ہو۔ اور چھاگلوں کی جھنکار پر اسے جنگلی پریوں کے ناچ کا گمان ہوا۔

ایک ایک دو دو کر کے کافر زن و مرد آنے لگے۔ اور ایک پہر رات بیتے اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی۔ مردانی لبادے میں ملبوس ہاتھ میں بلم یا بھالا لیے ہوئے۔ عورتوں کے لبادے کمر پر پٹے سے کسے ہوئے اور اُن کے سر اونی رومالوں سے ڈھکے ہوئے جن پر رنگ برنگ کے پتھر جڑے ہوئے تھے۔ گورے گورے پیر جنگلی مہندی سے خوں ناب۔ بڑی بڑی آنکھوں کے گرد سیاہ سا حلقہ جو بکرے کے

سنگ کی لیپ سے بنایا گیا تھا۔ تندرستی اور جوانی سے ڈبڈبائے ہوئے جسم تنگ قباؤں میں تلملا رہے تھے اور وہ سب اپنے جنگلوں کی پھول پتیوں کی طرح حسین اور معصوم تھیں۔

جب سب جمع ہو گئے تو ملک شاہ جوان سب کا بزرگ اور جاہ و جلال میں کسی یہودی پیغمبر سے کم نہ تھا، اٹھا اور ایک مشعل لیے ہوئے قبرستان کی طرف گیا جو اس میدان کے پاس ہی تھا۔ عورتیں منھ موڑ کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئیں اور مردوں نے نقارے کی چوب پر ہُو ہُو کا نعرہ بلند کیا۔ عورتوں نے دھیمے سروں اور یکساں آواز میں کوئی گیت شروع کیا۔ ذرا دیر میں ملک شاہ لکڑی کا ایک بت کاندھے پر اٹھائے ہوئے پلٹا اور اس بت کو دیکھتے ہی سب زن و مرد سجدے میں گر پڑے۔ مرد ہوا میں بلّم ہلاتے ہوئے ہو ہو کرتے آگ کا طواف کرنے لگے اور عورتوں نے اپنے گیت کی لے تیز کر دی۔ وہ بُت جس کا نام "ایشان" تھا، چنار کے تنے کا تکیہ لگا کر بٹھلا دیا گیا۔

یک بیک چھاگلوں کے گھونگرو ایک ساتھ مرتعش ہوئے سارے بلّم بجلیوں کی طرح ہوا میں لپکے۔ نقارہ جلدی جلدی غضب ناک اژدہے کی طرح سانس لینے لگا۔ الاؤ کے چاروں طرف مردوں کے پیر دھما دھم زمین کو کوٹنے لگے۔ لیکن عورتوں نے آہستہ سے زمین کو ٹھوکر لگائی۔ گویا اس کا بوسہ لے رہی ہوں اور دو کافر بوڑھوں نے جو ایشان دیوتا کے پجاری معلوم ہوتے تھے جھوم جھوم کر ایک ترانہ گانا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے ان سب نے اپنے اوپر ایک ایسی وجدانی اور ہیجانی کیفیت طاری کر لی گویا وہ ابھی اپنی قدیم روایت کی تجدید کر کے انسانوں کو زندہ جلا دیں گے اور پھر ان کی کھوپڑیوں کے ہار بنا کر پہن لیں گے۔ ذرا دیر کے لیے مسافر مبہوت رہ گیا اور اُسے یقین نہ آیا کہ وہ افغانستان کی سرحد پر مہذب دنیا سے کالے کوسوں دور ان وحشی کافروں کا مہمان ہے۔ جو ناچنے والا تھک جاتا وہ گھڑی بھر کے لیے دیوتا کے آگے زمین بوس ہوتا اور پھولوں کی شراب کی مُشک میں منھ لگا کر دوبارہ اس ہنگامے میں شامل ہو جاتا تھا۔ رقص کی لے کے ساتھ ساتھ آگ کی لو بھڑکتی گئی۔ اور ہُو ہُو ہُو ہُو کے وحشیانہ نعرے پہاڑوں سے ٹکرا کر شور قیامت کی طرح فضا میں گونج اٹھے۔

مسافر مشرق و مغرب کے بہت سے ناچ دیکھ چکا تھا۔ لیکن کسی ناچ میں اُس نے یہ وارفتگی، یہ قوت اور یہ وحشیانہ مسرت نہ دیکھی تھی۔ وہ سب بہار کے دیوتا ایشان کے اشارے پر مرنے مارنے کو تیار تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے جذبۂ عقیدت کو کس طرح ظاہر کریں۔ رات میں ٹھنڈ سمائی ہوئی تھی لیکن وہ پسینے میں شرابور تھے اور لڑکیوں کے دل ربا چہروں پر گویا موتیوں کی جھالر لٹکی ہوئی تھی۔

ملک شاہ نے مسافر کو بتایا کہ یہ دیوتاؤں کا ملک ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ کافر سکندر اعظم کے بھٹکے ہوئے سپاہیوں کی اولاد ہیں۔ اور کوئی انھیں قدیمی آریاؤں کا نام لیوا بتلاتا ہے لیکن در اصل وہ دیوتاؤں کے پالے ہوئے دیوا ہیں۔ ہزاروں سال سے وہ یہیں رہتے بستے ہیں۔ انھوں نے تاتاریوں، ترکوں اور افغانوں کے قبیلوں کو گزرتے دیکھا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتوں اور تہذیبوں کو بنتے اور بگڑتے دیکھا ہے لیکن ان انقلابوں کا ان پر اتنا ہی کم اثر ہوا جتنا ان پہاڑوں پر۔

اس گفتگو کے دوران میں ایک دوشیزہ صف چیر کر ایشان دیوتا کے آگے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے زمین کی مٹی اٹھا کر آنکھوں کو لگائی، پھر تالی بجا کر ہاتھ ہوا میں پھیلا دیے اور سارے مجمع کی تالیوں کی گت پر اس نے ناچنا شروع کیا۔ وہ اپنے دیوتا کو رجھانے کے لیے ناچ رہی تھی۔ اور اس کا ناچ گویا قدرت کا خاموش شکریہ تھا کہ اسے حسین بنایا۔ گردن سے لے کر ٹخنے تک اُس کا جسم ایک لبادے میں چھپا ہوا تھا۔

لیکن ناچ کے دوران میں وہ یوں مچلا گویا ابھی عریاں ہو جائے گا۔ اور چھلّوں میں چھپی ہوئی اس کی انگلیاں تیروں کی نوک کی طرح ہوا میں تھرتھرائیں۔ اس کے سڈول پیر کبھی ڈگمگائے کبھی کسمسائے۔ اپنی چوٹی میں سے اس نے سرخ پھولوں کا ایک گچھا نکالا اور اسے ہتھیلی میں لیے دیوتا کی نذر کو چلی۔ آہستہ آہستہ اس کے قدم اٹھے۔ پایلوں نے ہیبت کے مارے سانس روک لیا لیکن پھول بت کے آگے رکھ کر وہ خوشی سے اچھلی اور اس کا چہرہ دمک اٹھا اور وہ پھرتی سے ہاتھ پاؤں یوں نچانے لگی گویا تتلی کی طرح ابھی اڑ جائے گی اور اسی وقت ایک خوش رو نوجوان بلم ہلاتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ اپنے سر اور بازوؤں کو اس نے ہری بھری ٹہنیوں سے ڈھک رکھا تھا۔ اس کے پُر وقار انداز سے مسافر سمجھ گیا کہ یہ ایشان دیوتا کا پارٹ ادا کر رہا ہے۔ اب دونوں گل بہنیاں کر کے ایک گت پر مزے میں ناچنے لگے اور سب نے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ان کا گھیرا کر لیا۔

مسافر کے رہنما ملنگ نے چپکے سے کہا۔

"جانتے ہو یہ جام زرد (حسینہ) کون ہے؟ یہ ملک شاہ کی نواسی گلون ہے۔ اس بہار میں وہ بالغ ہوئی ہے اور اپنی جوانی کا صدقہ اتارنے کے لیے ناچ رہی ہے لیکن اس کا ساتھی ملک شاہ کے دشمن نامدار کا غلام گاشش ہے صدیوں سے گاش کا گھرانا نامدار کے گھر غلامی کرتا آیا ہے۔ یہ دل میں لاکھ ایک دوسرے کو چاہیں لیکن سب کے دیکھتے انھیں اس محبت کا اظہار نہ کرنا چاہیے۔"

ملنگ وادیٔ بمبریت کا فلسفی تھا۔ اپنے کانوں میں سونے کا بالا ڈالے، مخمل کا پھٹا ہوا شلوکا پہنے پرانی وضع کی بندوق بارود کے تھیلے کے ساتھ پیٹھ پر لادے وہ ایک عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ وہ کافروں کا بھاٹ، سرپنچ، مشیر سب کچھ تھا۔ بہار میں جب کافر اپنے مویشیوں کو چرانے کے لیے جنگلوں میں چھوڑ دیں گے تو ملنگ ان کی حفاظت کرے گا۔ بمبریت اور افغانستان کے درمیان اس پہاڑ کے سوا اور کوئی اوٹ نہ تھی۔ جب اکثر افغان مویشی چور آ کر ان کے آوارہ مویشیوں کو پکڑ لے جاتے تھے تب تو آئے دن ملنگ سے اُن کی مڈ بھیڑ ہوا کرتی تھی۔

ملنگ کی چلم میں گانجا تھا یا چرس یا تمباکو۔ مسافر کے لیے یہ معلوم کرنا مشکل تھا لیکن ملنگ تابڑ توڑ اُس کے کش لگاتے اور کھانستے ہوئے بیچ بیچ میں اپنی لال لال آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے پانی کو میلی آستینوں سے پونچھ پونچھ کر مسافر سے کہنے لگا۔

"یہ کم بخت گاشش آپ اپنی جان کا لاگو ہے۔ ملک شاہ کافروں کا پجاری ہے۔ اس کی نواسی سے یہ غلام زادہ شادی نہیں کر سکتا جب تک کوئی دس گھوڑے، پچاس گائیں اور سو بکریاں نہ لا دے گلون سے بیاہ کیسے کر سکتا ہے۔ لیکن گاش کے سوا کوئی اس چھوکری کی آنکھوں میں جچا بھی تو نہیں۔ نوروز کو وادی کی سب جوان لڑکیاں "مارا" دیوتا کے مندر کے آگے آ بیٹھتی ہیں۔ کنوارے آتے ہیں اور جو جسے پسند ہو وہ اسے اپنی جائداد کی تفصیل سناتا ہے۔ یہاں سونے روپے کی کوئی قدر نہیں۔ زمین اور مویشی ہی اصل جائداد ہے۔ اگر کوئی کسی کا ہاتھ پکڑ لے تو سمجھو کہ منگنی ہو گئی۔ پچھلے نوروز کو کئی کنوارے گلون سے شادی کرنے کو آئے مگر اس نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اسے تو گاشش کے سوا کوئی بھاتا ہی نہیں۔"

ملنگ ٹھیک کہتا تھا کیوں کہ وہ دونوں سُدھ بُدھ بھول کر یوں ناچ رہے تھے گویا دنیا اور کوئی تھا ہی نہیں۔ ان کی آنکھیں باتیں کر رہی تھیں اور ان کے جسم ایک دوسرے کی پیاس میں تڑپ رہے تھے لیکن اور سب کی آنکھوں میں غصہ جھلک رہا تھا۔ دیوتا اور مہمان کی موجودگی کی وجہ سے مجبوراً خاموش تھے۔

بہت رات بیتے وہ ناچ ختم ہوا اور مسافر اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے کان سے الوداعی گیت کے اس بول کو نکال پھینکنے کی ناکام کوشش کرتا رہا جس کا مطلب یہ تھا کہ "ہائے بہار بھی نہ رہے گی اور مسافر بھی چل جائے گا۔"

رقص کے دوران میں وہ ٹکٹکی باندھے کلون کو تکتا رہا تھا۔ رقص کے دوران میں وہ کبھی پھول کی طرح کھلی کبھی ناگن کی طرح لہرائی کبھی اس پہاڑی ندی کی طرح گنگنائی اور مسافر سے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا گلون نے کبھی ایک نگاہ غلط انداز سے اسے دیکھا تھا۔ اپنی سہیلی کمی کو کہنی مار کر وہ مسکرائی تھی۔ پھر اپنی رسم کے مطابق دو انگلیوں کے بیچ سے دیدہ دکھا کر دوستی کا اشارہ بھی کیا تھا۔

ملنگ نے مسافر کو جھنجھوڑا جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ پھیل چکی تھی اور ملنگ کے ٹوٹے ہوئے دانتوں میں ہنسی پھیل رہی تھی۔

"کھیل چکے تم مارخور کا شکار۔ اٹھو بہت سو چکے"

ایک لمحہ مسافر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ کسی کافر کے مکان کی بالائی منزل میں وہ ٹھیرایا گیا تھا۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک چولھا جو بیک وقت انگیٹھی، تندور اور لیمپ کا کام دیتا تھا اور نیچے اُترنے کے لیے لکڑی کی اٹھاؤ سیڑھی جو بوقتِ ضرورت اوپر کھینچی جا سکتی تھی تاکہ مکین دشمنوں یا ڈاکوؤں سے محفوظ رہیں۔

عورتیں گھروں یا کھیتوں میں کام کر رہی تھیں اور مرد شکار کھیلنے، پھل توڑنے یا شہد جمع کرنے باہر نکل گئے تھے۔ رات کو جب یہ لوٹیں گے تو عورتیں پاؤں دھلا کر انھیں کھانا دیں گی لیکن شہد، گھی اور پنیر کو خود ہاتھ نہ لگائیں گی۔ یہ نعمتیں صرف مرد کے لیے مخصوص ہیں کیونکہ اسی کی ذات پاک دیوتاؤں کی مظہر ہے۔

مسافر کی آنکھیں اِدھر اُدھر کسی کو ڈھونڈتی چلیں۔ اس نے ایک کسک سی محسوس کی جس میں درد کا شائبہ تو نہیں مگر خفیف سا احساس ضرور تھا اور چلتے چلتے اس نے کاشش کو دیکھا جو ایک آنگن میں بیٹھ مٹی کے برتن بنا رہا تھا۔ کس پھرتی سے وہ گیلی مٹی کے برتنوں کو اپنے ہاتھ میں نچاتا اور پھر ان سے پیالی یا صُراحی بنا کر دھوپ میں رکھتا جاتا تھا۔ مسافر کو دیکھ کر اس کی روشن آنکھیں مسکرائیں اور وہ رات کی بچھڑی ہوئی محبت کی یاد میں مگن ہو گیا۔

ملنگ تیز قدم چل رہا تھا اور چلتے چلتے کبھی بتوں پر مٹی ہوئی ادس کو غور سے دیکھ کر کہتا کہ ادھر سے لومڑی گئی ہے اور کبھی ٹیلوں پر بنی ہوئی قبروں کی طرف اشارہ کر کے کہتا کہ ان میں ہمارے اجداد سو رہے ہیں۔ جب کوئی کافر مرتا ہے تو لاش کے ساتھ ان کے کپڑے ہتھیار اور گہنے دفن کر دیے جاتے ہیں۔ پہلے تو انھیں کوئی ہاتھ کبھی نہ لگاتا تھا لیکن جب سے لال کافر مسلمان ہوئے ہیں یہ قبریں محفوظ نہیں ہیں۔

ملنگ مارخور کی دُھن میں ایک سوکھے ہوئے نالے کے پتھروں پر اُچھلتا کودتا چلا جا رہا تھا۔ پھر کسی چیز کا خیال آتے ہی وہ بولا۔

"مسافر کاش ہمیں ایسا مارخور ملے جس کی ناف میں منکا چھپا ہوا ہو، منکا افعی تک کے زہر کو پل بھر میں چوس لیتا ہے۔ اسے دکھلا کر تو راجہ کی بیٹی کو بھی موہ سکتا ہے"

یک بیک اس کی آنکھ میں شرارت چمکی اور وہ خود بخود کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

"رات کو میں تیری آنکھوں کو تاڑ رہا تھا۔ گلون کو تو نے پسند کیا، کیوں؟ ایں؟"

اخروٹ کے پیڑ کی چھاؤں میں دونوں بیٹھ گئے۔ مسافر نے سگریٹ اور ملنگ نے چلم سلگائی۔ ملنگ کہنے لگا۔

"اس میں کوئی ہرج نہیں۔ مہمان ہماری چیز کو پسند کرے تو اس میں ہماری عزت ہے۔ دس گھوڑوں اور پچاس گایوں اور سو بکریوں کے دام یہاں چھ سات سو روپے سے زیادہ نہ ہوں گے۔ تو گلون کو بیاہ کر یہیں بس جا۔ تجھے ہم مفت میں یہ جنگل اور پہاڑ دیں گے"

اس نے دوبارہ شریر نگاہوں سے مسافر کو گھورا۔

"نہیں ملنگ! گلون اور اس کا دیس حسین سہی۔ مگر نہ میں ان کے لیے ہوں اور نہ وہ میرے لیے۔"

ملنگ ٹوہ لینے کے لیے جھوٹ موٹ جھنجھلا کر بولا ۔

"یہ ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ نہ تیرا دیس ایسا حسین ہے اور نہ وہاں گلون جیسی حوریں ہیں۔"

ملنگ اسے چھیڑتا گیا۔ پشاور تک تو میں بھی جا چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تو اونچے مکانوں اور صاف سڑکوں کو پسند کرتا ہے لیکن کیا ان کے ساتھ گندی گلیاں اور تنگ جھونپڑیاں نہیں ہیں۔ تیرے دیس میں عورتیں یا تو شادی کرکے پردے کی اوٹ میں بچے جنا کرتی ہیں اور یا دام لے کر یا بے دام طوائفیں بن جاتی ہیں تو ہماری بیٹیوں کے مرتبے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

مسافر کی خاموشی کے باوجود ملنگ سمجھ گیا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ وہ ان کافروں کو وحشی سمجھتا ہے۔ ان کے رسوم پر ہنستا ہے ان کے رہن سہن کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ اس احساس سے ملنگ کے باطن میں سوئی ہوئی سیکڑوں دیوتاؤں کی ہزاروں سال پرانی روح بپھر پڑی اور وہ دراصل بگڑ کر بولا ۔

"تجھے اپنی ریلوں، موٹروں اور ہوائی جہازوں کا گھمنڈ ہے۔ انھیں دیکھے بغیر تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ پہاڑوں، ندیوں اور جنگلوں سے وہ تجھے زیادہ بھلے لگتے ہیں۔ انھیں تو اپنی تہذیب و ترقی سے تعبیر کرتا ہے اور یہ تو کہہ کہ اس ترقی کی قیمت تو کس طرح ادا کرتا ہے۔ ایون کے پوسٹ ماسٹر کے پاس ایک اخبار آتا ہے۔ ہر مہینے میں نمک اور چائے خریدنے ایون جاتا ہوں تو وہ اخبار پڑھ کر مجھے سناتا ہے۔ اس میں لڑائی، قحط، گداگری اور بے کاری کی خبروں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن تیری روح ایسی خبیث ہے کہ ان کے تماشے کے بغیر اسے سکون نہیں مل سکتا۔"

ملنگ ابھی جانے کیا کیا کہتا لیکن اسی وقت داہنی طرف سرسراہٹ سی ہوئی۔ دونوں ایک پیڑ کی آڑ میں دبک گئے اور انھوں نے دیکھا کہ ایک چٹان پر کھر جوڑے ایک مارخور کھڑا ہوا ہے۔ اس کے پرپیچ اور لمبے لمبے سینگ بڑے بھلے لگتے ہیں اور وہ اپنی بھری بھری گردن اٹھائے سورج کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اپنی ریشمی داڑھی کو وہ رہ رہ کر ہلاتا ہے گویا منبر پر کھڑا وعظ دے رہا ہو اور اس کے حساس نتھنے پھڑک پھڑک کر اسے فضا کی ہر تبدیلی کی خبر دے رہے ہیں۔ مسافر کی انگلی بندوق کی لبلبی کی طرف بڑھی مگر مارخور اچانک ایک چٹان سے اچھل کر دوسری پر اور وہاں سے تیسری پر پہنچا۔ وہ اسی طرح چٹانوں پر چوکڑیاں بھرتا گیا اور جب بندوق دغی تو حیرانی سے ایک بار پیچھے دیکھ کر پہاڑ کی ایک دراڑ میں گھسا اور غائب ہو گیا۔ کچھ دیر گولی کی آواز کبھی یہاں اور کبھی وہاں گونجی۔ مرمٹوں[1] نے "کررر" کی کرخت صدائیں بلند کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا اور ایک دو شاہین اپنے گھونسلوں کو چھوڑ کر ہوا میں اڑنے لگے۔

لوٹتے وقت مسافر نے گلون کو دیکھا۔ وہ چراگاہ میں بیٹھی ہوئی اپنے کتے کے بالوں میں ہاتھ ڈال رہی تھی۔ کتے نے اس کی انگلیوں کے مس کی لذت کو بخوبی دل نشین کرنے کی غرض سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کبھی کبھی اس کی کھال سکڑ جاتی اور اس کی دھیمی دھیمی غراہٹ میں مسرت کا اظہار تھا۔ بکریاں اور گائیں ادھر ادھر چر رہی تھیں اور بیچ بیچ میں وہ گلون کی طرف اطمینان کرنے کے لیے دیکھ لیتی تھیں کہ وہ اپنی جگہ پر ہے یا نہیں۔

مسافر سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں اور وہ ہونٹوں پر غیر محسوس سی مسکراہٹ لا کر الھڑپن سے گھاس کو نوچنے لگی۔ ملنگ کو اپنی زبان میں اس نے سلام کیا اور اس کی چھیڑ چھاڑ کا جواب ایک میٹھی جھڑکی میں دیا۔ مسافر نے اس کی جھکی ہوئی چوٹیوں کو اپنے قدموں کا تعاقب

---

[1] ایک برفانی جانور

کرنے پایا۔ اور اس امر اس سے اس کی ٹانگوں میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔
پہاڑی نالے کے ٹھنڈے پانی کو انگلیوں سے ٹٹولتے ہوئے وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ اس وادی کو ایک
خواب سمجھتا ہے۔ وہ اس میں سے گزر کر پھر اپنی تنگ و تاریک دنیا میں چلا جانا چاہتا ہے جہاں بدصورتی اور ریاکاری کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔
اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا کثافت اور غلاظت میں بھی کوئی لذت ہے جو زہر کی طرح انسان کی رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ گوبریلوں
اور تل چٹوں کی طرح اسی مٹی میں گُھستا اور اسی میں زندہ رہ سکتا ہے۔ کیا اذیت پسندی اس نام نہاد تہذیب کا ایک لازمی حصہ ہے اور جب
تک ہم جسمانی اور روحانی ہلاکت کا نظارہ نہ کریں ہمیں چین نہیں مل سکتا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مسافر کو اس وادی میں بسنے کا خیال ناگوار
کیوں ہے۔ وہ اپنی ذہنی کیفیت کے تجربے کی کوشش کرنے لگا۔ بچپن میں جنگل کا راجہ بننے اور جنگل کی پری سے عشق کرنے کا خیال کس قدر
دلچسپ تھا۔ لیکن آج وہ خیال ممکن الحصول تھا تو وہ جھجک کیوں رہا تھا۔ اس مہذب دنیا سے اسے لینا کیا تھا۔ انسانوں سے دکھ درد کے
سوا اسے ملا کیا تھا۔ وہاں کی روحوں میں جسمانی اور اخلاقی امراض کے جراثیم تھے اور وہ سب اسیر تھے۔ آپ اپنی خودی کے اسیر۔
ممکن ہے یہی بات ہو اور یا یہ ہو کہ مسافر بظاہر ان کا فردوں کا سا آدمی تھا۔ ورنہ ان کے مابین دو ہزار سال کا فرق تھا۔ یہ فرق جو
اس کو محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وقت کی روانی کو محسوس کرنے کی صلاحیت حواس میں نہیں۔ البتہ حواس سے پرے جسم کے تہ خانوں
میں مدفون نامعلوم طاقتیں وقت کے اسرار سے واقف ہیں۔
مسافر صرف یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ ان سے مختلف ہے وہ گلون کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اگر گلوں کی عمر سولہ سال ہے
تو اس کی اپنی عمر دو ہزار سولہ سال! اور نہ وہ ان پہاڑوں میں رہ سکتا ہے۔ کیونکہ اگر اس کی اپنی عمر تیس سال ہے تو ان کی دو لاکھ تیس سال۔
کل صبح مسافر واپس چلا جائے گا۔ ابھی ابھی اس نے اپنے میزبانوں سے رخصت لی ہے اور ان کی مہربانی کا شکریہ آئینوں، جوتوں
اور رنگین رومالوں کی صورت میں ادا کیا ہے۔ اپنا سامان بند کرتے ہوئے وہ سوچتا ہے کہ ان کا بوجھ زیادہ ہے یا میرے دل کا؟
گلون کی تصویر وہ اپنے دماغ سے نہیں نکال سکتا لیکن وہ اسے اس سرزمین سے الگ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تا زندگی اس خیال
سے اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ سدابہار پھول کی طرح اپنی وادی میں مہک رہی ہے اور کسی مشاطہ نے اس کے گیسو نہیں سنوارے
ہیں۔ وقت اگر کہیں ملے تو اس سے وہ کہنا چاہتا ہے کہ مرتے دم تک اسے جواں رہنے دے۔
چارپائی پر بیٹھے بیٹھے وہ سوچتا ہے کہ جب موم بتی بجھ جائے گی تو میں لیٹ جاؤں گا لیکن اُس وقت جب موم بتی کی لو بھڑک کر
بجھنے کے قریب ہوتی ہے دروازہ اپنی چول پہ چرچراتا ہے۔ ملنگ ہانپتا ہوا چوکھٹ پر کھڑا ہوا نظر آتا ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔
"مسافر" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ لوگ گلون کو قتل کر رہے ہیں۔" مسافر اچھل پڑا اور اسی وقت موم بتی بجھ گئی۔
شام کو وہ گلون سے ملنے کھیت پر گیا۔ سلمیٰ اپنے دوستوں کے ساتھ ان دونوں کی تاک میں تھا۔ دونوں پکڑے گئے۔ اب قبرستان
کے سامنے مارا دیوتا کے حضور میں پنچایت انھیں سزا دینے کے لیے جمع ہوئی ہے۔
مسافر کے جسم کا لہو خشک ہو گیا اور اس کے ہمدردیں نے پکار کر کہا کہ بھاگو۔ ملنگ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "مسافر تو گلشن
کی جان بچا سکتا ہے" اور مسافر کو وہ باہر کی طرف کھینچنے لگا۔
قبرستان کے مقابل چناروں کے جھرمٹ میں آگ جل رہی تھی۔ لیکن اس میں کل رات کا سا جوش و خروش نہ تھا۔ اداس اداس
اور بجھی بجھی سی آگ، اس کی پھیکی سی روشنی مارا دیوتا کے اونچے پورے چوبی بت پر پڑ رہی تھی جو قبرستان کے پھاٹک پر مُردوں

کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس کے روبرو بوڑھے کافر ادب سے دوزانو بیٹھے ہوئے تھے۔ بیچ میں ایک شہتیر نصب تھا جس سے گاش بندھا ہوا تھا۔ پاس ایک زخمی بکرا پڑا ہوا وحشت انگیز آوازیں کراہ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اسے گھائل کر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ بیچوں بیچ میں گلون ناکام عاشق سلمیٰ۔ زمین سے چلّو بھر خون اٹھا کر گاش پر چھڑک دیتا تھا۔ مارا دیوتا کے آگے گلون اوندھی لیٹی ہوئی تھی اور جب بکرے کی چیخ بند ہو جاتی تو گلون کی سسکیوں کی آواز سنائی دینے لگتی تھی۔

ذرا دور پر ملنگ نے مسافر کو روکا اور کہا "یہ مذہبی رسم ہے۔ کوئی اجنبی اس میں شامل نہیں ہو سکتا تو یہیں چھپ کر تماشا دیکھ اور جب ملک شاہ دیوتا کو مخاطب کرے تو تو اُس کے پاس جا اور گاش کی جان کی امان مانگ۔"

دیر تک بکرا تڑپتا اور کراہتا رہا۔ سلمیٰ اس کے خون کے چھینٹے گاش پر چھڑکتا رہا گلون خاموش ہو گئی۔ ورعجب نہیں کہ اس کے تھکے ہوئے بدن کو ایسی حالت میں نیند آ گئی ہو ملک شاہ زیر لب کوئی لامتناہی منتر جپتا رہا۔ اتنے میں بکرا آخری وقت چلّایا اور تڑپ کر مر گیا۔ اسی وقت سب لوگ کھڑے ہوئے اور مارا مارا کی صداؤں سے ہوا تھرا اٹھی۔ سلمیٰ کسی پیڑ کی اوٹ میں چھپی ہوئی کھوپڑیوں کی مالا اٹھا لایا۔ وہ کھوپڑیاں جو اس کے اجداد نے دشمنوں کے مردہ اجسام میں سے نکالی تھیں۔ یہ ہار گلے میں ڈال کر سلمیٰ نیزہ ہلاتے ہوئے گاش کی طرف جھپٹا اور پھر دیوانہ وار مرگھٹ کے بھوت کی طرح ناچنے لگا۔ اس کے نیزے کے اشارے پر کبھی گلون ڈر کے مارے چلّاتی اور ایک آدھ مرتبہ تو گاش بھی زخمی بکرے کی طرح چیخ پڑا۔ باقی سب لوگ ہو ہو ہو اور مارا مارا کی آواز پر گویا اس ناچ پر تال دینے لگے۔

مسافر اس خیال سے سہم گیا کہ کہیں نیزہ گاش کے بدن میں چبھ نہ جائے لیکن ملنگ نے اسے تسلّی دی۔ ابھی ملک شاہ نے مارا دیوتا کی اجازت نہیں لی ہے۔ ملنگ نے سمجھایا کہ اُن کا جرم بڑا سنگین ہے۔ ایک تو منگنی سے پہلے ان کا تنہائی میں ملنا پھر وہ پجاری کی لڑکی اور یہ غلام زادہ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اپنی وعدہ گاہ عین اُس مقام کو بنایا جہاں مارا دیوتا اُن کے گناہ دیکھ سکتا تھا۔

ملک شاہ کے ہاتھ اٹھاتے ہی رقص بند ہو گیا اور موت کا سنّاٹا چھا گیا۔ ابھی ملک شاہ اپنے دیوتا سے مخاطب ہوا ہی تھا کہ اسے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ وہ چونک پڑا اور حیرانی سے ملنگ سے پوچھا کہ مہمان کیا چاہتا ہے۔

مہمان نے مارا دیوتا کے قدموں کی خاک اٹھا کر آنکھوں کو لگائی اور گلون کی ملتجی نگاہوں نے اُس کے کانپتے ہوئے دل کو ہمت دی۔

وہ بولا "کل میں یہاں سے چلا جاؤں گا اور میرا دیس اتنا دور ہے کہ شاید پھر کبھی نہ آ سکوں۔ میں چاہتا ہوں کہ چند دنوں کی یاد میرے دل میں ہمیشہ رہے اور اس یاد میں صرف احسان اور مسرت ہو۔ غم کی کوئی کھٹک نہ ہو — وہ جانتا تھا کہ آخری الفاظ جھوٹ ہیں۔ کیونکہ جس مسرت میں غم کی جھلک نہ ہو وہ یاد کیسے رہ سکتی ہے۔ ملک شاہ نے جواب دیا۔

"ملنگ! مہمان سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ مہمان کی خوشنودی ہمارے مذہب کا آئین ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ گاش کی جان بخش دی جائے۔"

ہر شخص اپنی جگہ بھنّا اٹھا اور ان کی بھنبھناہٹ میں مخالفت صاف عیاں تھی۔ لیکن ملک شاہ کے حکم سے سب خاموش ہو گئے اور وہ دیوتا کے آگے جھوم جھوم کر اپنی زبان میں دیر تک کچھ کہتا رہا۔ کبھی وہ اپنے کان دیوتا کے لبوں کی طرف لاتا گویا اس کی آواز سن رہا ہو۔ کبھی اس کی منّت کرتا۔ کبھی چپ ہو جاتا۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سب لوگ دوبارہ مارا مارا کہتے ہوئے سجدہ ریز ہو گئے۔

ملک شاہ نے پیغمبرانہ شان سے ہر لفظ تول تول کر کہنا شروع کیا۔

"اس غلام کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن —" اس "لیکن" پر سلمیٰ اور اس کے حامیوں کے چہرے اتر گئے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

"لیکن مہمان نے اپنے قیام کے دوران میں صرف ایک خواہش ظاہر کی ہے اور اسے رد کرنا ہمارے آئین کے خلاف ہے۔"

ملنگ نے خوشی کا نعرہ لگایا اور جلدی جلدی گاش کے بندھن کھولنے لگا۔

"ٹھہرو۔" ملک شاہ کی بوڑھی آواز کڑکی "گاش آئندہ ہماری وادی میں نہ رہ سکے گا۔ مہمان قیمت ادا کرکے اسے خرید لے۔ پھر چاہے اسے چھوڑ دے یا پاس رکھے۔"

گاش کو زہر آلود نگاہ سے اس نے گھور کر تائید کی "اگر تم نے کبھی اس وادی میں قدم رکھنے کی جرأت بھی کی تو یاد رکھو کہ مارا دیوتا کے مندر کی دیوار میں زندہ چُن دیے جاؤ گے۔"

پھر اس نے سرد مہری سے گلون کی طرف دیکھا جو روندی ہوئی ٹہنی کی طرح اب تک زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ بوڑھے کے اشارے پر وہ اٹھی اور کسی نے اس پرحسن کی ایسی بہار نہ دیکھی تھی جیسی اس وقت تھی۔

"اگر تو سلمی سے بیاہ کرے تو دیوتا تیرے گناہوں کو معاف کردیں گے۔"

گلون کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ پتھر کی طرح سخت پڑ گیا اور اس نے سر کی جنبش سے انکار کر دیا۔

"گاش کے علاوہ تجھے اور کوئی کافر پسند ہے؟"

گلون کے منہ سے صاف آواز نکلی۔

"نہیں۔"

"تو جانتی ہے کہ دیوتا کے آگے انکار کرنے کے بعد تو عمر بھر کسی مرد کے ساتھ نہ رہ سکے گی۔"

گلون کی گردن نے اشارہ کیا کہ ہاں میں انجام جانتی ہوں۔

"تو پھر مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔"

دفعتاً ملنگ نے جھک کر ملک شاہ کے کان میں کچھ کہا اور بوڑھے نے ذرا حیرت سے مہمان کو گھور کر لڑکی سے سوال کیا۔

"مہمان اگر یہیں رہ جائے تو تو اسے پسند کرے گی؟"

مسافر کا دل بلیوں اُچھل پڑا اور اسے ایسا لگا کہ یہ لمحہ ہزاروں سال کی دوری طے کر رہا ہے اور اس کی روح میں پنہاں تہذیب کی زنجیریں یوں منتشر ہو رہی ہیں جیسے زلزلے میں سیکڑوں ہزاروں سال پُرانی عمارتیں ایک آن میں برباد ہو جاتی ہیں۔ اور وہ حیران رہ گیا کہ اپنی قسمت کا وہ آپ مختار نہیں بلکہ اس کی ملکہ یہ لڑکی ہے جو ابھی لکڑی کے ایک بے ڈول بت کے آگے سجدے میں پڑی سسک رہی تھی۔

گلون نے گھڑی بھر مسافر کو اداسی سے دیکھا۔ اس کی معصوم آنکھوں نے اجنبی سے کچھ پوچھا۔ مگر اس کی گردن دائیں بائیں ہلی۔ اور اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں نے کہا۔

"نہیں ——" (ماخوذ از "زندگی کا میلہ")

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
ــــــ ترجمہ ــــــ
مقبول الٰہی

مویشی بازار

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اردو اور ہندی کے علاوہ متعدد مضامین اور افسانے براہِ راست انگریزی میں بھی تحریر کیے ہیں۔ ذیل کا افسانہ "کیٹل مارکیٹ" ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۴۲ء میں لکھا تھا جو پہلی بار انگریزی کے مشہور رسالہ "نیو لٹریچر" لندن میں اشاعت پذیر ہو کر بے حد مقبول ہوا اور بعد میں کئی یورپین زبانوں میں شائع ہوا۔ اردو میں پہلی بار اس کا ترجمہ مقبول الٰہی نے کیا ہے جسے ہم ان کے شکریے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں ــــــــ (صہبا)

رستم نے اپنے بھیڑوں کے گلّے پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور بادل ناخواستہ دور افتادہ مویشی منڈی کی طرف بوجھل قدموں سے چل پڑا۔ یہ کمبخت بھیڑیں، وبا پھوٹتی تو بیسیوں نے حساب سے مرتیں اور وہ بھی پہلے ہی لے ہیں، کوئی بچاؤ کی صورت بھی نہ کرتیں۔ انھوں نے تو ایک ساتھ مرنے کا گویا عہد کر رکھا ہو، محض بغض کی بنا پر۔ بس ایک نے اپنی ان کٹی اون میں چیچک کا جرثومہ چھپایا اور لگی اپنے ساتھیوں میں چوری چوری بڑھانے۔ پھر اچانک ہی سب کی سب زمین سے لگ جاتیں، کراہتیں اور مر جاتیں۔ گوشت کا رنگ بدل جاتا اور رات ہی رات میں بدبو چھوڑ جاتا۔ بھنگی ہو یا چھکڑے والا، پھوٹی کوڑی دے کر بھی انھیں نہ خریدتا۔

رستم بڑبڑاتا رہا اور چلتے چلتے لعنت ملامت کرتا رہا۔ پچھلے پورے ایک ہفتے بھر میں اس نے ایک بھی بھیڑ ذبح نہیں کی تھی۔ یہ خبر گویا ہوا کے دوش پر پھیل گئی کہ رستم کی بھیڑیں بیمار تھیں۔ انھیں ان چبائی گھاس الٹتے دیکھا گیا اور ان کی کھال سے جیسے موت کی بدبو اٹھ رہی ہو۔ یہ ضرور تھا کہ ثبوت حتمی نہ تھا کیونکہ یہ خبریں اس کے مدمقابل شکور نے اڑائی تھیں۔ ویسے لوگ تو ہوتے ہی مزاج کے شکّی ہیں اور پھر چاہتے بھی ہیں حلال گوشت۔ رستم کے بارے میں کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ اپنی بھیڑوں پر تکبیر پڑھتا تھا یا نہیں، البتہ متقی شکور اس معاملے میں کسی شک وشبہہ کی اجازت نہ دیتا۔ وہ عین سڑک پر ایک چم چماتی چھری کو بہتے پانی میں تین مرتبہ دھو دھا کر ذبح کیا کرتا۔ ان کی رخصت ہونے والی روحوں کے آرام کے لیے وہ اپنی سی کوشش ضرور کرتا بن گھاس اور تازہ پتے جتنے چاہتیں ان کے سامنے ہوتے جب ان کی ٹانگیں باندھی جاتیں اور گلا چھری کے نیچے ہوتا تو وہ ان کے کانوں میں زور سے اللہ اکبر کہتا۔ بیوقوف تو بھیڑیں ہوتی ہی ہیں، وہ بڑی دردانگیز آوازیں نکالتیں۔ اپنی کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی بڑی بوڑھیاں

خوشی کے مارے چیخ اُٹھتیں۔

رستم نے اپنی بدبختی کے حساب کا جائزہ لیا۔ چلم سے گویا بدلہ لینے کے لیے ایک کش لے کر دانت بھینچے وہ اپنے متبرک سفر پر روانہ ہوا۔ اس کا ارادہ تھا بیش بھیڑیں خریدنے کا۔ سبھی موٹی سبھی چربی دار۔ اُن کے لیے بڑے تیے اور گندم کی بھوسی خریدے گا۔ اس طرح وہ کھا پی کر موٹی ہو جائیں گی جب نصیبے میں کسی کی موت ہوگی اور اس تقریب پر ضیافت اُڑے گی تو وہ بھیڑوں کو آہستہ آہستہ، بلا ضرر ذبح کرے گا تا آں کہ اُن کی پھولی ہوئی گردنوں سے سرخ خون چشمے کی طرح پھوٹ پڑے۔

یہ سارا نظارہ اس نے تصور ہی تصور میں ایک روکھے پھیکے اطمینان کے ساتھ کیا۔ چھپی ہوئی چھری کو بھیڑیں بے زبانی سے دیکھ رہی ہیں۔ رکھوالا کتا بھوک کے مارے اپنی دُم ہلاتا رہا۔ کوتے دعوتوں کا ایک سلسلہ ساتھیوں کو دیتے ہوئے فوت ہونے والے کے عزیز رشتہ دار جس کے اعزاز میں یہ قربانی دی جا رہی ہوگی، اس پورے عمل پر نظر رکھے ہوئے۔ بحث کرتے ہوئے کہ سانا اچھا ہے یا پٹھہ۔ امام صاحب نماز فجر کے بعد واپس آتے ہوئے اُن کے نرم ہاتھوں سے تسبیح کے دانے پھسلتے ہوئے اور وہ خود سادہ لوح روحوں کے سکون کے لیے آیات تلاوت فرماتے ہوئے۔ رستم اپنے احمقانہ پن میں دبی دبی ہنسی ہنسا۔

لیکن اچانک ہی وہ ایک دم رک گیا اور ماتھے پر تیوری چڑھا لی۔ اس نے اپنی بیمار بیوی کو تو بھلا دیا تھا۔ اخ، وہ دائم مریضہ، پچھلے ایک ہزار دن میں وہ یخنی کے مٹکے کے مٹکے صاف کر گئی ہوگی۔ رستم نے ذہن ہی ذہن میں حساب لگایا۔ مقامی معالجوں کی تمام جڑی بوٹیاں، تازہ گردے، اور جانے کیا کیا۔ بیمار، ہر روز بیمار، ہر وقت بیمار، رستم کی اپنی جان اُس کی وجہ سے ضیق میں تھی۔ اللہ میاں کی تمام وباؤں سے زیادہ مہنگی۔ اس پر زیادتی یہ کہ مجھے روز کا صرف ایک جام شراب بھی اس کو کھٹکتا ہے جو میں محض کھانا ہضم کرنے کے لیے پیتا ہوں۔ اف، یہ بے کار عورت، اس کا چکا ہوا منہ میٹھے رس کے بس ایک قطرے کے خلاف جنت و دوزخ کی کیسی کیسی دعائیں بد دعائیں نکالتا ہے۔

پرانی چھتری کے ان سلے سوراخوں میں سے بارش کے قطرے اس کے سر پر گر رہے تھے تو اس نے اپنے بھیگے ہوئے گالوں کو اندر سے چوستے ہوئے سوچا کہ وہ اس کی موت پر کیا کچھ خیرات کرے گا۔ پاس ہی بڑے پیر صاحب کا مزار تھا۔ سبز چادر اور پھولوں کے ہاروں تلے صندل کی دھونی کی مہک میں، سو سال پہلے کا مرحوم و مدفون، ولی اللہ، قبر کی تہہ میں دیدہ بیدار لگ رہا تھا۔ اس جگہ کے سونے ماحول سے رستم خوف زدہ سا ہو گیا اور مزار کے اندر داخل ہوتے ہوئے اس بے کلی سی لاحق تھی۔ ٹین کے سائبان پر بارش کی ٹپ ٹپ کا شور تھا اور کبوتر اپنے اپنے خانوں میں متبرک پیر سے بے نیاز بوس و کنار میں مصروف تھے۔

رستم کو جرأت کرنے کے لیے تھوڑی کوشش کرنی پڑی۔ پاک چادر کا ایک کنارہ ہاتھ میں پکڑ لیا اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگا۔ چادر کے اوپر کچھ ریزگاری بکھری پڑی تھی جو مزار کی مرمت وغیرہ کے لیے عقیدت مند وہاں رکھ جاتے۔ خدا کی رحمت اور اپنی ناکارہ بیوی کی موت کی دعا مانگتے ہوئے اسے مزار پر اپنے مالی نقصان کا بھی خیال آ گیا۔ اسے یہ قطعی طور پر نامعقول و وحشت ناک لگا کہ نیک پاک روحیں بھی معاوضے کے بغیر کچھ بھی جھولی میں نہیں ڈالتیں۔ جب وہ سہمے سہمے اپنے پاجامے کی گرہ میں سے بٹوا نکال رہا تھا تو سچائی اس پر روشن ہو گئی۔ ارے ہاں مرحوم نہیں بلکہ مجاور یہ روپیہ اینٹھتے ہیں۔ بدمعاش کہیں کے، اُس نے بٹوا پھر سے خفیہ جیب میں چھپا لیا اور بڑے چھائے ہوئے چھپر کو بغور دیکھنے لگا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔

کچھ اور سوچے سمجھے بغیر اس نے جلدی جلدی صرف ایک تاڑی بوتل خریدنے کے لیے کافی ریزگاری اُچک لی۔ ڈر کے مارے اِدھر اُدھر دیکھا اور باہر بھاگ نکلا۔ اپنے مجرم ضمیر کے ساتھ بحث بھی کی۔ میں نے مالک نہیں مجاور پہ ہاتھ صاف کیا ہے۔ کیا یہ سچ

نہیں کہ اس توند والے حرام خور سے اس کی تاڑی اور جوا خانوں میں اکثر مٹھ بھیڑ ہوتی ہے؟

رستم کے بویا چال چلتے چلتے بارش کم ہوئی اور پھر تھم گئی ۔

بکرا منڈی میں پہنچا تو وہاں ایک ہزار بیل اور بھینسیں سر ملا کر ڈکرا رہے تھے۔ اس روز ان کے مزاج کی کیفیت سنکی سی تھی۔ سینگوں یا نتھنوں کو ہاتھ ہی نہ لگانے دیتے۔ گلہ بان اور قصاب مویشیوں سے حاصل ہونے والے گوشت اور دودھ کا حساب انگلیوں پہ لگا رہے تھے۔ پورے فرش پر ان ڈھوروں ڈنگروں کا گوبر لتھڑا ہوا تھا اور عجب طرح کا سبزہ اس میں سے پھوٹ رہا تھا۔

ابھی دوپہر تھی۔ کافی وقت تھا ابھی۔ رستم منڈی میں بے مقصد گھومنے لگا۔ اس کے کنارے کنارے ہر نوع کے کھوکھے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف خوانچے والا سرخ مرچ اور لیموں سے پوتے ہوئے چاول کے نالوں کی تعریف کر رہا تھا تو دوسری طرف ایک پھیری والا قلندر کچھ شعبدے دکھا رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر لوگ ایک الف ننگے فقیر کے گرد جمع تھے جو گیلی زمین پر دراز تھا۔ رستم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ آخر اس کے بھبھوت ملے گندے جسم میں کیا خاص بات تھی۔ اس دھکم پیل اور ریل پیل میں مصروف انبوہ میں جو اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہ لیتا، جس کا کبھی منہ کھلے کا کھلا رہتا، کبھی آنکھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا، کبھی بادلوں کی طرف اور کبھی مویشیوں کے کھروں اور سروں کی طرف، رستم کچھ کھو سا گیا۔ اس بھیڑ بھڑکے میں سے وہ بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو نکال کر عارضی دکانوں والوں کے ہنگامی خیموں کے ساتھ ساتھ بلا مقصد چلنے لگا۔ وہ ایک کانے دیہاتی بھاٹ کے پاس سے جو بڑے جوش و خروش سے اپنے پرانے اکتارے کی سنگت میں گا رہا تھا، گزر ہی رہا تھا کہ اس کا آمنا سامنا اچانک اپنے دوستوں سے ہو گیا۔ وہ ایک دری پر پانسوں کے ارد گرد جمے بیٹھے تھے اور غل غپاڑے، طرح طرح کی حرکات اور روپیوں کے لین دین میں مست تھے۔ اس نے پاس ہی گھاس پر نیم دراز پولیس کے سنتری کو سوالیہ نظروں سے دیکھا لیکن جب اس ذات شریف کو ہر بازی پر دو ایک سکے جیب میں ڈالتے پایا تو وہ بھی بڑے اشتیاق سے چار یاری میں شامل ہو گیا۔

اپنی پے بہ پے جیت کی خوشیوں کی لہر میں رستم سبھی کچھ بھول گیا۔ اس روز قسمت اس کے ساتھ تھی اور پانسہ اس کے اشارے پہ ناچ رہا تھا۔ اس نے اپنا سرپوش اتار کر پھیلا رکھا تھا اور لالچ میں آ کر اپنی لوٹ اس میں جمع کر رہا تھا۔ دوپہر گزری، شام ہو گئی۔ رستم وہیں ابد تک گڑا بیٹھا رہتا، مگر پیچھے سے ایک جھونڈے نے اسے چونکا دیا۔ اس کا گڈریا نانو گھبرا بری طرح سے ہانپ رہا تھا اور سانس درست کرنے کی کوشش میں تھا۔ کوئی بری خبر اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"مالکن مر گئی۔ مالکن مر گئی۔" وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ خبر کی اہمیت نے اسے بری طرح مغلوب کر رکھا تھا۔

رستم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ جب اسے سانحے کے صحیح معنی کا ادراک ہوا تو اسے اپنے کندھوں پہ پڑا ذہنی بوجھ گرتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک بارگی جیسے ہر شے پگھل گئی ہو، ہلکی ہو گئی ہو۔ اسے خود کو حیرت ہوئی جب اس نے اپنے آپ کو بیوی کے نہیں پیر صاحب کے بارے میں سوچتا ہوا پایا جنھیں صبح ہی اس نے لوٹ لیا تھا۔ ان ہی نے اس کی دعا من وعن قبول کر لی تھی۔

جب وہ گھر بھاگنے کے لیے تیار ہوا تو اس کے سنگیوں نے اسے پکڑ لیا۔ واہ رے دھوکے باز اب گھر بھاگنا چاہتے ہو؟ ہمیں قلاش بنا کر؟ اچھا تو یہ ہے تمھاری چال؟ بھلا یہ تو بتاؤ کہ وہ اگر مر گئی ہے تو تم تو کچھ بھی نہیں کر سکتے؟ کیا کر سکتے ہو؟ تمھارا بیٹا کفن دفن کا انتظام کرے گا اور پھر دفنانے والا اس کا ذمہ آدھی رات کو تھوڑا ہی لے گا؟ . . . . . اور سچ بتاؤ کیا تم اس سے

نہال نہیں ہو؟ اس سے تو تم انکار نہیں کرسکتے، چھٹے ہوئے کہیں کے' ان کا اصرار بڑھا تو رستم بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ بڑی خبر لانے کی پاداش میں اس نے شرمیلے سے گڈریے کے کانوں پہ کتے پہ کے چلائے' اسے دفع دفعان کیا اور دوسرے جوش و خروش کے ساتھ بازی لگانے بیٹھ گیا۔

اس کا دماغ روحانی مسرت اور سکون سے لبریز تھا۔ اسے اپنی بیمار بھیڑوں پر بھی رحم آنے لگا۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ بجائے اس عطائی ڈاکٹر کے جو گھوڑے، کتے، ہیضے اور طاعون کے واسطے صرف ایک ہی نسخہ جانتا تھا' وہ ایک اصلی سلوتری سے مشورہ کرے گا وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے فاتحہ کے کھانے پر ذبح کی جانے والی بھیڑوں کے متعلق فیصلہ کرلیا کہ کون کون سی ہوں گی۔ اس خوش آئند خبر سے ان دونوں بھیڑوں کو اس نے چشم تصور میں تسلیم و رضا سے مسکراتے اور ممیاتے دیکھا۔

شام سیاہی میں ڈھل گئی تو بازی ختم ہوئی۔ سب تھک چکے تھے۔ رستم انھیں تاڑی خانے میں لے گیا۔ .

ایک متعفن جوہڑ جہاں بھینسیں تیرتیں اور گھوڑے پانی پیتے اور ایک لمبے چوڑے گندے نالے کے درمیان جس میں خونیں مچھروں کی فوج کی فوج پیدا ہوتی رہتی ایک ٹیلے پر تاڑی خانہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گھاس پھونس کی نیچی چھت والی کٹیا۔ دروازے پر ایک چھوٹی سی لڑکی کوئلوں پر کباب بنا رہی تھی اور لکڑی کے بنچ تھے۔ ہر ایک نشست کے سامنے ٹین کا آب خورہ تھا۔ کاؤنٹر ایک کونے میں تھا جہاں جھاگ اٹھاتے ہوئے رس کے مٹی کے مٹکے تیار مال کی طرح موجود تھے' درحریص مکھیوں اور مبہم چیونٹیوں کا ایک انبوہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک دھواں دینے والی موم بتی شراب خانے کی تاریکی میں روشنی کر رہی تھی۔

اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھنے کے ساتھ ہی رستم کا دل گانے لگا۔ اس کا جی چاہا وہ ایک ایک سے بغل گیر ہو کر کہے' میں کتنا خوش ہوں' بنین حرف اس کتیا پہ جو بھیڑوں کے گردے کھاتے کھاتے خود اس کی روح کو اندر ہی اندر سے کھا رہی تھی، جب جوان اور تگڑی تھی تو کیسے ہر نتھو خیرے کے ساتھ یارانے گانٹھا کرتی۔ وہ خود گدھے کی طرح گوشت کی دوکان پر کام کرتا۔ انھیں خیالات کی رَو میں، جب راجو الستی شرابی بھکاری نے درزمیں سے قطرے بھر کا سوال کیا تو رستم نے چھوٹتے ہی اسے دعوت دے دی حالانکہ اس کے ساتھی منع کرتے رہے۔ راجو بڑا بدنام حرامی تھا۔ گانجے کی ساری قسمیں پیتا اور چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو پریوں کی بے حیائی کی کہانیاں سناتا۔ جادو کے ایک بالس کے بارے میں کہتا کہ وہ زمین پر بارش کے لیے بادلوں کو چیر سکتا ہے اور ایک رنڈی کی سناتا کہ وہ ننانوے فرشتوں کے ساتھ ہم بستر ہوئی۔ وہ نہاتا کبھی نہ تھا۔ ہاں سال میں ایک مرتبہ اس کا دھوبی ہمسایہ اسے بھی گندے کپڑوں کے ساتھ اپنے بڑے کڑاہے میں ڈال کر اُبال دیتا۔ یہ بات البتہ ضرور تھی کہ اس کی آواز سنہری تھی اور اس کے گیتوں میں درد بسا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ مینڈک اور سانپ تک کان کھڑے کرتے اس کا گانا سنتے' یہی وجہ تھی کہ ہر جگہ اس کی عزت ہوتی۔

راجو کو اصرار کی تو بالکل ضرورت نہ تھی۔ وہ کسی بھی روز اچانک گر جانے کو تیار دروازے کی چول کو دھکا دے کر آ دھمکا' اڑا کر اسٹول پر چڑھ بیٹھا اور ایک ہی گھونٹ میں تاڑی کا آب خورہ خالی کردیا۔ جیسے ہی اس نے ترنگ میں اپنے ہاتھوں کو ملا اور منہ پانی کو ملتجیانہ دیکھا تو ہیرے دھوبی نے جسے اس سے خاص کد تھی' کینہ بھری آواز میں کہا۔ "ابے او آوارہ' اپنی یہ طوطا کہانیاں بس کرو، دیکھو بھئی' یہ آوارگی کرتا پھرتا ہے اور اس کی ماں لدو جانور کی طرح کام کرتی رہتی ہے۔ ادھر مرغ نے اذان دی ادھر وہ اٹھ کر پانی کے پمپ پر آن قابض ہوئی۔ پانی کے پچاس پیپے ایک گھر سے دوسرے تک اٹھا کرلے جاتی ہے۔ جو کوئی اُسے پمپ سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں ان سے جنگ لڑتی ہے۔ جب سورج سر پہ آتا ہے تو وہ گھنٹوں چکی پیستی ہے اور ساتھ ہی ساتھ احمقانہ سے بین لوریاں گاتی جاتی ہے۔

ہر بدھ کو دودھ دیوتا کے مندر میں جاتی ہے جہاں بھکاریوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اور یہ سست الوجود؟ یہ سارا وقت مدھک خانے کے سامنے دھوپ تاپتا ہے، گیتیں الاپتا ہے اور جوا کھیلتا ہے۔"

سب حاضرین نے راجو کو انتہائی نفرت سے دیکھا۔ گو رستم کا دل سب طرف سے صاف تھا پھر بھی وہ اپنی بیزاری کو نہ چھپا سکا۔ لیکن راجو نے لعنت ملامت کرنے والے کی بات سنی ان سنی کر دی۔ اس نے اپنی جیب میں سے ایک بڑی سی چلم نکالی، اس میں بڑے اہتمام سے گانجا بھرا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اسے سلگاتے ہوئے گانجے اور حشیش کے دریافت کرنے والے مہا دیو دیوتا کی شان میں بھجن گانا نہ بھولا۔ اسی نے فلسفیانہ انداز میں کہا:۔

"جیون سندر ہے بھائیو، جیون سندر ہی تو ہے۔"

اسے وہ دہراتا رہا، دہراتا رہا حتیٰ کہ رستم بھی بے صبرا ہو گیا۔ کہنے لگا:۔

"زندگی بلا شبہ خوبصورت ہے اس لیے کہ تمھیں اسے گزارنے کے لیے کام نہیں کرنا پڑتا۔ جو کام کرتے ہیں ان سے پوچھو وہ تمھیں بتائیں گے کہ یہ کتنی بدصورت ہے۔"

"پر کچھ کو کام کرنا ہوگا اور کچھ کو بے کار رہنا ہوگا۔" راجو نے اصرار کیا جتنا بھی اچھا جیون کوئی بتا سکتا ہے، اسے بتانا چاہیے۔ تم کیوں چاہتے ہو میں اپنی جان ماروں؟ میری سستی تمھارے پیروں فقیروں کی سستی سے کیسے فرق ہے؟ یہی نا کہ وہ بھگوان کے لیے راس رچاتے ہیں اور میں انسان کے لیے ..... سمجھو، تم سب مورکھ ہو، سبھی مورکھ ہو۔"

اس پر پورا تاڑی خانہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ راجو اپنی ترنگ میں کش لگاتا رہا، پیتا رہا۔ بڑی ہی محبت سے رستم کو سینے سے چمٹاتے ہوئے اونچی آواز سے کہنے لگا:۔

"پر میرے یارو، لوگ جیون کو بڑا کٹھن بنا دیتے ہیں، اس ہسپتال کے کمپونڈر کو ہی دیکھ لو جو سرے سے مجھے دوائی ہی دینے سے انکاری ہے، جب تک میں گانجا نہ چھوڑ دوں۔ یہ کیسا انیائے ہے کہ ایک آدھ چیز کھا پی لینے کے کارن کوئی دکھ ہی بھوگتا رہے۔"

مگر دھوبی بھی دبنے والا تھوڑا ہی تھا۔ اس نے ایک اور چوٹ کی "مفت خورے، تمھارے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہیے۔ ابھی دو ہی ہفتے گزرے ہیں تم نے نہ پینے اور نہ سوٹا لگانے کی قسم کھائی تھی، جب رضا کاروں نے منہ کالا کرکے پرانے جوتوں کا ہار پہنا کے تمھیں گدھے پر سوار کیا تھا۔ مگر سچی بات یہی ہے کہ تم چھچھو سے بھی بڑے ادھری ہو۔"

راجو نے جمائی لی اور کھانستے ہوئے کہا "پڑ دسی تم نے مجھے دق کر رکھا ہے۔ جیسے میلے چکٹ کرتے دھوتے ہو، تمھارا من بھی ویسا میلا ہے اور یہ رضا کار بھی کیا بھلے مانس ہیں۔ مندر کے پنڈت پانڈوں نے بھی مجھ کو ایسے منتر نہیں سنائے ہوں گے اور وہ بھی جیون کی ایسی چیزوں کے بارے میں اور کیوں؟ کہ ہم کھاتے ہی نہیں تو ہمارے پوتوں کے لیے کیا رہے گا؟ بھئی اگر مجھے جوتے ہی کھانے ہیں تو جوتے سفید ہوں یا کالے، کیا فرق پڑتا ہے؟" عین اس وقت کوئی اور داخل ہوا تو سب کا دھیان بٹ گیا۔ نامو، تھا تو ذات کا بھنگی، پر نالیوں کے انسپکٹر کے معزز عہدے تک ترقی پا گیا۔ ہر روز صبح وہ نالیوں کو بڑی حسرت سے تکتا اور قصبے کے باسیوں کو گندی عادتوں پر برا بھلا کہتا۔ شام ہوتی تو گنجے سر پر پرانی چینی ٹوپی پہن لیتا اور بالوں بھرے جسم پر مصنوعی سلک کا کرتا۔ کنپٹیاں نارئیل کے تیل سے چپ چپ، ہونٹوں پہ پان کی لالی، وہ بڑی دھج سے بازار میں نکلتا۔

اس سب کے باوجود، سبھی اس بے اصل کو برداشت کرتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ضلع جگت اور دوکانوں میں ایک صرف

یہی راجو کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ جب کبھی یہ دونوں گیت ساز اس دور دراز قصبے میں مل بیٹھتے تو گویا ایک بڑی تقریب کا سا سماں بندھ جاتا۔
یہی وجہ تھی کہ نامی کا داخل ہونا تھا کہ ایک عام صلح نامہ سا ہو گیا اور فضا میں ایک برقی لہر سی دوڑ گئی۔ "آیئے، تشریف لایئے" کی صدائیں بلند ہوئیں، اور نامی کے آب خورے پیش ہوئے یہاں تک کہ دوستی راجو بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈگرا کر نامی سے کہنے لگا "پکڑے گئے نا، بھگوڑے، میں تجھے چھتیس سروں میں ایسی سکھشا دوں گا کہ تمہارا سر چکرا اٹھے گا۔"
"ابے او جعل ساز! تم نے الف، ب کہاں سیکھے تھے؟"
اس طرح کی خوش گپیوں اور دوستانہ طعن و ملامت کے بعد انھوں نے ایک دوگانا شروع کیا۔ بس گرنے ہی والی پرانی دیواروں کے بڑی بڑی درازوں میں سے آسمان شفاف اور نیلا دکھائی دے رہا تھا۔ بدبو سے بوجھل ٹھنڈی ہوا ہولے ہولے چل رہی تھی۔ مینڈک ایک ہی لے میں ہیک آواز ٹرا رہے تھے۔ راجو نے ایک سارہ سی دھن چھیڑی۔ ندی میں نہاتے ہوئے ایک الھڑ لڑکی کا کنگن گم ہو گیا، اس کا افسوس۔ وہ برستی بارش میں اسے ڈھونڈتی رہی کیونکہ مارے ڈر کے ساس سے اس کی جان جاتی تھی۔
نامی نے اسی موضوع کو آگے بڑھایا، بڑے جوش و خروش سے ساس کی روایتی سختیوں کا اظہار کیا کہ کیسے وہ نوجوان لڑکیوں سے محض اس لیے نفرت کرتی ہیں کہ وہ ان کے بیٹوں کی محبت کا دم بھرتی ہیں۔
یہ ضلع جگت ایک لمبے، طول طویل گیت کا روپ دھار گیا جس میں سر اور تال کا ملاپ ہوتا رہا جس کے نتیجے میں ایک دل خوش کن سماں سا بن گیا۔ جب یہ منڈلی ختم ہوئی تو رات آدھی جا چکی تھی۔ رستم گھر کو چلا لیکن چکر کاٹ کر۔ اس نے راجو کو ساتھ چلنے کو کہا۔ اسے پہلے ہی رستم کی بھری جیب کا اندازہ تھا، اس لیے خوش خوش ساتھ چل دیا۔ گلی کوچے ویران و سنسان پڑے تھے جیسے وبا کے بعد ہر طرف خاموشی تھی ماسوائے اس کے کہ کبھی کبھی آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی یا پھر چوکیداروں کی نیند بھری خبردار۔ خال خال پان کی دکانیں کھلی تھیں جہاں رنڈیوں کی ٹولیاں اپنے عاشقوں سے ہنسی ٹھٹھا کرتیں تو ان کے لٹکے ہوئے جسم کینچلیاں بھرتے دکھائی دیتے۔ بالاخانوں میں سے ٹکے ٹکے کی نرتکیوں کے بے ہودہ ساز اور بہراگ کی بیزار آوازیں آ رہی تھیں۔ خالی دکانوں کے برآمدوں کے سخت پتھروں پر قلی اور فقیر سوئے پڑے تھے۔ گرما کی ٹھنڈی ہوا کے مزے لینے کے لیے دکان داروں نے لکڑی کے تختوں پر گدے بچھا رکھے تھے۔ ننگ دھڑنگ، گول مٹول توندیں نکالے وہ چاند اور ستاروں کو گستاخانہ خراٹے سنا رہے تھے۔
تاڑی اور گانے سے رستم کی روح ترنگ میں تھی۔ اسے پاکیزگی ایک عظمت کا احساس تھا۔ کچھ مدہوش بھی تھا۔ راجو کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگا — "بندہ ہے؟ آج تو میری عید ہے، میری بیوی مر گئی ہے، خدا خدا کر کے۔"
راجو کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ آنکھیں جھپکتا رہا۔ روتا کہ ہنستا، کیا کرتا، کیا ..... ؟ کیسے ..... ؟ آخر ..... ؟"
ہاں، میرے بھائی، "آخر" مجھے ذرا حساب لگا لینے دو۔ محرم کے اس چاند سے لے کر جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہنومان مندر کے اوپر بڑھی ہوئی پیپل کی شاخ پر فساد ہوا تھا، آج دن تک، زیادہ نہیں تو چالیس چاند گزر چکے ہیں۔ وہ کم سے کم پانچ ہزار گردے اور چار سو من تو ضرور چٹ کر گئی ہوگی۔ سوچا جائے تو کتنا بڑا نقصان ہوا۔"
رستم اپنی قسمت کو روتا رہا۔ راجو اسے تسلیاں دیتا رہا۔ "ناشکری مت کرو، میرے بھائی، بھگوان کی کرپا پر شکر کرو۔ مانو۔ وہ تین سال اور زندہ رہتی، پھر کیا ہوتا؟ بیوی تو ہے ہی بھگوان کی مار پھٹکار۔ جب تک وہ اسے خود نہ ہٹائے، پیچھا تھوڑا ہی چھوڑتی ہے؟"
یہی باتیں اور بحث کرتے کرتے وہ مزار کے سامنے آ پہنچے۔ اسے اپنی حرکت یاد آ گئی تو بہت نادم ہوا۔ چرائے ہوئے پیسے نکالے۔ راجو کو

اس کی کمیشن دی جو اس نے بلا حیل و حجت تھام لی۔ خرگوش کی سی تیزی کے ساتھ وہ مزار میں داخل ہوا۔ اس ہولناک تاریکی میں مزار چوہروں کا نمار لگ رہا تھا۔ راجو نے پیسے جیبوں میں بھرے۔ پھر ماچس جلا کر گلی میں گرے پڑے پیسے ڈھونڈتا رہا۔ قبر سے سرگوشی میں کہنے لگا۔

"ہے سورگ باشی جی! میں پاپی ہوں۔ بدی مجھے سزا دینی ہی ہے تو اگلے جیون میں دیجو، پر مجھ پہ دیا کر دو، مجھے ہر دن کا خرچہ دے دیا کرو۔"

جب راجو باہر آیا تو رستم نے اسے شک کی نظر سے دیکھا ضرور مگر خاموش رہا۔ وہ اس کی کمیشن دے چکا تھا۔

راجو کہنے لگا: "اپنے جیون کے اچنبھے کا تو سوچو، تم اب سانڈ کی طرح آزاد ہو۔ جو چاہو کر سکتے ہو۔ گجریوں، دھوبنوں، بنساریوں کا کوئی کال نہیں . . . . بیوی مر گئی؟ تو کیا ہوا؟ تم پہ تو بھگوان کی دیا ہے، رستم!" وہ اپنی دھن میں ایسی باتیں کہتا رہا کہ رستم کو گھر میں پڑی ہوئی لاش کا خیال آ گیا۔ اس کے بیٹے نے کفن دفن کا انتظام کر لیا ہوگا۔ کل صبح قبرستان میں خاندان کے لیے مخصوص گوشے میں اس کو دفن کریں گے۔ رشتے کی عورتوں نے اسے نہلا دھلا دیا ہوگا۔ اس کے چھوٹے موٹے گہنے پاتے غریب غربا کو دے دیے ہوں گے۔ کچھ میت کے پاس بیٹھے ہوں گے۔ اس کا پہلوٹھی کا بیٹا اپنے بے راہ باپ کی تلاش میں سرگرداں ہوگا اور اس بات پر اس کے کینہ ور ہمسائے دل ہی دل میں مزے لے رہے ہوں گے۔ سبھی کو یقین ہو گا کہ رستم کسی کی طرح نشے میں دھت کسی گندی نالی میں پڑا ہوگا جو اکثر اس کا مشغلہ رہا۔ اس علاقے کی بھینسیں بھی تو اپنے مالک کے ہم پیالہ و ہم نوالہ تھیں۔ نشے کی ترنگ میں اپنا سارے کا سارا دودھ لنڈھا دیتیں۔ ان کے بچھڑے بیچارے بڑے ہی مایوس نظر آتے۔

پھر رستم نے ماضی میں اپنی بیوی کا تصور باندھا۔ جوانی میں دیر سے اٹھتی تھی۔ بھیڑوں کا تعفن اور بھینسوں کی گرمی، ساری عمر گھر کی گھٹن میں بیٹھے جوئیں مارتے گزری۔ بچے پیدا کرنے کے سوا اسے کوئی کام ہی نہ آیا، رردو کے علاوہ سب کے سب ایک ایک کر کے مر گئے۔ رستم نے رقت کا بس ایک قطرہ بجوڑ نچوڑ کر بہانے کی کوشش کی لیکن اس کا دل خشک اور سخت ہو چکا تھا۔ اسے یہ خیال تو تھا کہ کسی کی موت پر خوشی منانا گھناؤنی حرکت ہے لیکن وہ اس احساس کا کیا کرتا کہ وہ آزاد تھا، سرخوش تھا۔ دو ایک واقف کار اسے ملے جنھیں اس نے اپنے صحیح جذبات کمال احتیاط سے چھپاتے ہوئے اس حادثے کی اطلاع دی اور جنازے میں شامل ہونے کے لیے کہا۔ جہلم پرشان وارضیافت اور اگلے روز قرآن خوانی کا بھی ذکر کیا۔

گھر کے پاس پہنچا تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ہزاروں یادیں جاگ اٹھیں۔ محبت و الفت کے بہت سے چھوٹے چھوٹے منظر اس کے دل و دماغ میں گھومنے لگے۔ وہ اداس ہو گیا۔ نشے میں وہ ضرور تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ اپنی مرحومہ بیوی کی میت کے پاس جا کر کیا کچھ کرے گا۔ کیا کچھ کہے گا۔ اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔

اس کا گوجر ملازم ہلکے ہلکے دھوئیں کی دھاریں چھوڑتی ہوئی لالٹین کے پاس دروازے پر اونگھ رہا تھا۔ کتا اپنا سر اس کے زانو پر رکھے خواب دیکھ رہا تھا۔ اپنے مالک کے قدموں کی چاپ پہچانتے ہوئے جب کتا خوشی سے بھونک اٹھا تو وہ ہڑبڑا کر جاگا۔ رستم نزدیک آیا تو چھپاتے ہوئے بول اٹھا۔

"سب معاملہ ختم، بالکل ختم!"

جب رستم اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا تو اس نے بڑے اشتیاق سے وضاحت کرنی شروع کی۔

"وہ ڈنگر ڈاکٹر بھیڑوں کا معائنہ کرنے آیا تھا۔ جب اس نے مالکن کو دیکھا کہ سانس بڑی مشکل سے لے رہی ہے، اس پر بے ہوشی طاری ہے اور آنکھیں پھر گئی ہیں، تو کہہ دیا کہ وہ انتقال کر گئی ہے۔ آپ کے بیٹے کو یقین نہ آیا۔ وہ سول سرجن کے پاس بھاگا بھاگا گیا۔ وہ دیر سے آیا۔ آ کر سینہ ٹھونک بجا کر دیکھی، زبان اور آنکھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا تب جا کر کئی نسخے لکھے۔ اسے ڈنگر ڈاکٹر پر بہت غصہ آ رہا تھا کہ اس نے بھیڑوں کا معائنہ کرنے والے آلات کے ساتھ مالکن کا معائنہ کیا تھا۔"

وہ اور کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ رستم نے اسے ایک جڑی کہ وہ سنبھل نہ سکا اور دور جا گرا اور خود رستم دھڑام سے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔۔۔

کامل القادری

آصف فرخی

ڈاکٹر آغا سہیل

شبنم رومانی

حسن عابدی

صہبا لکھنوی

آئینہ خانے میں

کامل القادری

اختر حسین رائے پوری سے ایک ملاقات

اردو ادب میں انٹرویو، گفتگو اور تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے کا سلسلہ یوں تو عرصۂ دراز سے جاری ہے۔ بس فرق پڑا ہے تو اتنا کہ انٹرویو، گفتگو اور ملاقات کرنے والے اپنے اپنے دور اور اپنے اپنے اسلوب نگارش میں تبدیلیاں لاتے رہے اور اب تو پانچ پانچ اور چھے چھے حضرات باقاعدہ مجلس مذاکرے کی صورت میں انٹرویو کرتے ہیں۔

ذیل میں ہم کامل القادری (مرحوم) کی ایک ملاقات ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے (انٹرویو کی صورت میں) ماہِ نو۔ کراچی۔ مارچ ۱۹۷۱ء کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کئی سال یونسکو کی خدمات کے دوران جب پاکستان تشریف لائے تو یہ اُن کا پہلا بھرپور انٹرویو تھا جسے کامل القادری ایسے زیرک اور بالغ ادیب نے قلم بند کیا تھا۔ اس انٹرویو سے جہاں ڈاکٹر صاحب موصوف کے ادبی نظریات پر روشنی پڑتی ہے وہیں اُن کی ہمہ جہت زندگی کے خدوخال بھی بڑی حد تک اجاگر ہوتے ہیں ——— صہبا

آواز میں نرمی، گفتگو میں رچاؤ، میانہ قامت، بڑا کاسۂ سر، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، بڑی بڑی اُداس آنکھیں۔ یہ ہیں اختر حسین رائے پوری۔ افسانہ نگار، مترجم، نقاد، ماہرِ تعلیم، ہفت زبان، لغات نویس، جہاں بین وجہاں گرد۔

ایسی جامع الصفات شخصیت سے انٹرویو کے لیے سوال نامہ تیار کرنا بدمذاقی ہوتی۔ گفتگو شروع ہوئی، بات سے بات نکلتی ہی چلی گئی، اور بات بن گئی۔

ص :۔ یہ عجیب بات ہے کہ ادیب کی پہلی سی قدر و قیمت باقی نہیں رہی۔

ح :۔ جی ہاں! پہلے سے قاری بھی تو نہیں رہے، اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ مثلاً ایک صدی پہلے اخبار کم تھے، رسائل و جرائد بھی خال خال نکلتے تھے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما نہیں تھے۔ محض کتاب ایک ایسی چیز تھی جس سے ہم دل بہلایا کرتے تھے یا اس کے ذریعے معلومات حاصل کرتے تھے۔ اور دور کیوں جائیے تیس چالیس برس پہلے تخلیقی ادب انکشافِ حقیقت کی حیثیت رکھتا تھا اور شعرا داد یا کوئی

اہمیت دی جاتی تھی۔ کتابیں ذہنی تربیت کا بہترین وسیلہ تھیں۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد ادب کا زور ٹوٹ گیا۔ اور اب محض کتابیں اور تخلیقی ادب کا سرمایہ ہی ہماری علم و معلومات فکر و نظر اور تفریح طبع کا ذریعہ و وسیلہ نہ رہا، بلکہ علم و معلومات اور تفریح طبع کے دوسرے ذرائع بھی ہمیں اپنی جانب متوجہ کرنے لگے۔

دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ گزشتہ تیس چالیس سال نہایت ہیجان انگیز گزرے، اور ابھی تک یہ ہیجانی دور ختم نہیں ہوا۔ اس طویل عرصے میں دنیا کے نقشے میں نئے نئے ملک ابھرے اور بادشاہتیں معدوم ہوئیں۔ نیز "سوشل آرڈر" میں بھی انقلابی تبدیلیاں اور شکست و ریخت ہوئی ہے۔ بہت سے افریقی و ایشیائی ملکوں کو برائے نام آزادی میسر آئی اور وہ حقیقی آزادی کے لیے سرگرداں ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنولوجی نے اقدار حیات میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا ہے، انتشار پیدا کر دیا ہے۔ کشاکش حیات کی جہتیں معین نہیں اور کوئی "ڈائریکشن" نہیں ملتی۔

یہ ہماری دنیا کی عمومی کیفیت ہے جس پر اضطرار و اضطراب کابوس کی صورت میں سوار ہے۔ ایسے اضطراری عہد میں ادب یا ادیب ہمیں کوئی راہ بھاتا نظر نہیں آتا حالانکہ تیس چالیس سال پہلے ادب ہماری رہنمائی کیا کرتا تھا۔ کوئی ادیب ہمیں "ڈائریکشن" دیتا تھا یا کسی "ڈائریکشن" کی پیروی کرتا تھا۔ سارے جنھیں ہم سارتر کہتے ہیں نہ معلوم جہالت میں یا پیار میں) کا نام لیں، وہ ہمیں کوئی "ڈائریکشن" دیتا ہے یا کم از کم اپنے تخلیقی ادب کے ذریعے ہماری رہنمائی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے اچھے شاعر اور ادیب ہیں ان پر اضطراب و اضطرار اور انتشار کی کیفیت طاری ہے۔ پرانے آئیڈیل مسمار ہو گئے ہیں۔ تحریک آزادی، فاشزم یا اشتراکیت ملک کی آزادی کے بعد آئیڈیل نہیں رہے۔

تخلیقی صلاحیتوں پر ان سب کا اثر پڑتا ہے۔ خود پاکستانی زبانوں کے ادب میں اس کی چھاپ کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے یہ مسئلہ اور بھی گمبھیر صورت اختیار کر گیا ہے۔ تقسیم ہند کا اردو پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ یہ ایک زبان کی بقا اور فنا کا مسئلہ ہے۔

س:- اور ادب۔

ج:- اردو کا پرانا مرکز لاہور تھا اور اب بھی لاہور ہی ہے۔ کراچی میں اردو بولنے والوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے لیکن یہ اردو کا گہوارہ بننے کی صلاحیت سے عاری شہر ہے۔ یہاں بلکہ پاکستان میں مستند ناشر نہیں اور نہ صحت زبان و معیار کا کوئی پیمانہ ہے۔ ہر قسم کی چیزیں "چالو" ہیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ تقسیم سے پہلے کے حالات سے کیجیے تو آپ کو کتب و رسائل کے معیار میں ایک بین فرق نظر آئے گا۔

س:- اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ زبان ایک نئے ارتقائی مرحلے سے گزر رہی ہے اور ادب کے موضوعات بدل گئے ہیں اور اسلوب اور ہیئت کے بھی نو بہ نو تجربے کیے جا رہے ہیں۔

ج:- اس کا بھی کچھ نہ کچھ اثر یقیناً زبان و ادب پر پڑا ہے لیکن جو نثر و نظم کا معیار اردو میں ہے اس میں حرکت تو ہے جمود نہیں، لیکن یہ حرکت اضطرار و انتشار کی نشان دہی زیادہ کرتی ہے۔ گویا یہ پرتو ہے ہمارے معاشرے کے انتشار کا۔

س:- کیا تنقیدی ادب میں انتشار پیدا ہو چکا ہے؟

ج:- اس وقت جو ادبی کاوشیں اردو میں ہیں ان میں سب سے نمایاں کام تنقید کے میدان میں ہوا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تنقید کا میدان وسیع ہے۔

تنقید کلاسیکل ادب کا احاطہ کرتی ہے اور عالمی ادب کا بھی اور یہ ضروری نہیں کہ موجودہ ادبی رجحان ہی کی جانب اشارہ کرے۔ لیکن اگر آپ اوضاع تنقید کے نمونوں کا گہری نظر سے مطالعہ فرمایئے تو آپ کو وہاں بھی ڈائریکشن کا فقدان نظر آئے گا۔ بیشتر تنقیدی ادب ذاتی تاثرات کے اظہار پر مشتمل ہے اور اس کی کوئی فکری اساس یا انٹلکچوئل فاؤنڈیشن نہیں پھر اس وقت کوئی کسی ایسے نثر نگار یا شاعر کا نام نہیں لے سکتا جس نے گزشتہ

تیس سال میں نمایاں کام کیا ہو اور اردو ادب میں ایک مستقل مقام حاصل کیا ہو۔ جوش ملیح آبادی۔ ن۔ م۔ راشد وغیرہ پرانے دور کے لوگ ہیں۔

تخلیقی ادب کا یہ المیہ محض اردو تک محدود نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب ہم اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار محض ادب کے ذریعے نہیں کرتے بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے بھی کرتے ہیں مثلاً ہمارے بہترین دماغ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے لکھ رہے ہیں ظاہر ہے کہ وہاں تخلیقی ادب ایک نئے روپ میں قاری تک پہنچ رہا ہے جو بیک وقت ایک سے زیادہ حواس کو متاثر کرتا ہے۔ ایسی صورت میں کتابوں کی اہمیت کا کم ہونا حیرت انگیز بات نہیں، اب ناظر کی توجہ بٹنے لگی ہے۔ تفریح اور درس دونوں کے لیے اور بھی ذرائع پیدا ہو چکے ہیں جو کتابوں سے زیادہ جاذب نظر بھی ہیں اور سہل بھی۔ لہٰذا تیس چالیس سال پہلے کی نسبت اب کتاب کی قوت کم ہو گئی ہے اور اسی تناسب سے مصنف یا ادیب کی اہمیت بھی کم ہوتی چلی گئی ہے۔

گویا یہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے اور نئے ملکوں میں جسے سیاست اور اقتصادیات کا مسئلہ کہا جاتا ہے وہ بھی اسی سائنس اور ٹیکنالوجی کے بطن سے پیدا ہوا ہے تو ادیب کی اہمیت اس ماحول میں لامحالہ کم ہو جائے گی۔ البتہ دانشور کی اہمیت اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔

س :۔ کیا پاکستان میں کوئی دانشور ہے؟

ج :۔ صحیح معنوں میں نہیں (توقف کے بعد) میری نظر میں اقبال کے بعد کوئی دانشور پیدا نہیں ہوا۔

نظریۂ تنقید

س :۔ آپ کا نظریۂ تنقید کیا ہے؟

ج :۔ میں دونوں چیزوں کو دیکھتا ہوں۔ کیا لکھا جا رہا ہے اور کیسے لکھا جا رہا ہے۔ پہلے میری توجہ زیادہ مضمون پر جاتی تھی اور اسلوب پر کم لیکن اب میں اسلوب کی اہمیت کا بھی کچھ کم قائل نہیں ہوں۔

س :۔ خوب! غالب کا ایک شعر ہے ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج   شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اسی خیال کا اعادہ وہ دوسرے اسلوب میں کرتے ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

آپ کے خیال میں بلحاظ اسلوب کون سا شعر بہتر ہے؟

ج :۔ گوتم بدھ کا خیال ہے کہ زندگی ایک مستقل ابتلا ہے۔ اس سے نجات یا نروان موت کے بعد ہی ممکن ہے۔ اس نقطۂ خیال کا اعادہ یا اختلاف اسلوب مندرجہ بالا شعروں میں ہوا ہے۔

میرے خیال میں دوسرا شعر زیادہ اچھا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

س :۔ گویا غزل گوئی طرزِ ادا کے نوبہ نو تجربے کے ماسوا کچھ نہیں؟

ج :۔ غزل میں عشق و عاشقی کے ایک ہی طرح کے خیالات و مضامین کو نئی نئی طرح سے شعرا باندھتے رہے ہیں۔ حافظ ہی کو لیجیے جو یقیناً بہت بڑا غزل گو ہے، اگر ہم مضامین اور خیالات کے لحاظ سے دیکھیں تو وہ کون سا خیال ایسا ہے جو اس سے پہلے نہیں باندھا گیا، لیکن اسی خیال کو حافظ نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ بایں ہمہ غزل ایک بڑے فن کار کے لیے طرزِ ادا کے ماسوا بھی کچھ ہے۔

غالب کے اشعار جو ابھی ابھی آپ نے سنائے ہیں، ان کا غزل کے روایتی مضامین سے تعلق نہیں۔ فلسفۂ غم بیان ہوا ہے۔ ہر بڑے

اختر حسین سے ایک ملاقات

کامل القادری

غزل گو کے دیوان میں معتدبہ تعداد میں ایسے اشعار ہوتے ہیں جو محض اس کی فکر، تجربے اور احساس کی اوس کھا کھا کر نمو پاتے ہیں۔ غالب و حافظ ان ہی معنوں میں بڑے شاعر ہیں۔

س۔ آپ کی نظر میں غالب کی مابہ الامتیاز خصوصیت کیا ہے؟

ح۔ میری نظر میں غالب نے اردو غزل کو فکری سطح عطا کی۔ غزل میں اس نے سوچنے کی صلاحیت پیدا کی ہے۔ غالب سے پہلے محسوس کرنے کی صلاحیت تھی۔ ایک شعر لیجیے ؎

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دگر سے   ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

نفسیات کا کتنا عمیق مسئلہ ہے ؏

ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

س۔ کیا غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر آپ پیرس میں تھے؟

ج۔ نہیں اُن دنوں میں تہران میں تھا۔ غالب کی صد سالہ برسی سے پہلے بہت کم لوگ غالب کا نام جانتے تھے۔ کاش! غالب نے فارسی کی خدمت میں جتنا وقت صرف کیا تھا، اگر اس کا آدھا وقت بھی اردو دیوان پر صرف کرتے تو اردو دیوان اتنا مختصر نہ ہوتا۔ اردو اشعار دو ہزار سے کم ہیں اور فارسی بارہ ہزار ہیں۔ ان بارہ ہزار میں بمشکل ہزار پانچ سو کام کے نکلیں گے۔

س: کیا یورپی ممالک میں غالب کی شاعری کا ترجمہ مقبول ہو رہا ہے، اور غالب کی تفہیم ہو رہی ہے؟

ج۔ غزل کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ حافظ کے کلام کے ترجمے کی مشق ایک عرصے سے کی جا رہی ہے، لیکن اب تک اس میں کامیابی نصیب نہیں ہو سکی۔ عمر خیام جو حافظ سے کم تر ہے۔ اس کا نام نسبتاً زیادہ مشہور ہے۔ غزل کے اشعار کا حسن ترجمہ میں برقرار رکھنا اور معانی کو مجروح نہ ہونے دینا اس لیے بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے کہ قلیل الفاظ میں بہت کچھ مذکور ہوتا ہے اور الفاظ سے زیادہ بین السطور میں ہوتا ہے۔ لہٰذا کلام کی تمام خوبیاں کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں کی جا سکتیں اور ابھی تو غالب شناسی کی جانب مخلص لوگوں کی توجہ مبذول کی گئی ہے۔

اردو غزل پر ہی کیا منحصر، شاعری کا ترجمہ یوں بھی مشکل ہوتا ہے کوئی چابک دست مترجم زیادہ سے زیادہ "پیرا فریزنگ" ہی کرے تو بھی غنیمت ہے۔

س۔ جدید شعرا، افسانہ نگار، نقادوں میں حوصلہ افزا اٹھان کس کس کی ہے؟

ح۔ میں ۱۹۵۲ء سے وطن سے باہر رہا ہوں، لہٰذا نئی پود کی سرگرمیوں کا مجھے اچھی طرح علم نہیں اور نہ تمام مطبوعات ہی میری نظر سے گزری ہیں۔ ناصر کاظمی اچھا غزل گو شاعر ہے، گو اب غزل ختم ہو چکی ہے اور اس میں بڑی شاعری کا امکان نہیں۔ عبدالعزیز خالد کی کچھ چیزیں میں نے دیکھی ہیں۔ بڑی تخلیقی صلاحیت ہے اور اس کے استعاروں کا میدان بڑا وسیع ہے۔ مجھے "خدا کی بستی" اور "اداس نسلیں" بھی پسند آئی ہیں۔ شوکت (صدیقی) اچھی تخلیقی صلاحیت رکھتے ہیں۔

س:۔ اور نقادوں میں؟ کیا جمیل جالبی کی کچھ چیزیں دیکھی ہیں آپ نے۔

ج:۔ جی ہاں جمیل جالبی، لیکن میں ممتاز حسین کا بھی نام لوں گا، ان کی تنقیدیں بڑی حوصلہ افزا ہیں۔

س:۔ اور نظیر صدیقی؟

ج:۔ ہاں میں ان سے واقف ہوں۔ ان کا ایک مضمون مجھے بہت پسند آیا۔ "یگانہ" کی شاعری پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ انھوں نے لگانہ کو ایک خاص زاویے سے پیش کیا ہے۔ بہرکیف میری یہ رائے سرسری ہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں نئی مطبوعات اور ابھرتے شعراء ادباء سے نیم واقف ہونا ہے۔ شاید کہ پلنگ خفتہ باشد!

س:۔ مختصر سوانح؟

ج:۔ میرا آبائی وطن عظیم آباد ہے۔ میرے والد سید اکبر حسین بسلسلۂ ملازمت رائے پور آئے اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ میرے رائے پوری ہونے کی حقیقت اسی قدر ہے۔

س:۔ گویا جس سرزمین میں گوتم کی آنکھ لگی، وہیں آپ نے آنکھیں کھولیں۔

ج:۔ جی نہیں، میں رائے پور میں پیدا ہوا۔

س:۔ وہ کون سی شبھ گھڑی تھی؟

ج:۔ جون ۱۹۱۲ء۔

س:۔ تعلیم؟

ج:۔ میں نے ۱۹۲۸ء میں میٹرک کیا۔ اسکول میں ہندی اور سنسکرت کا درس لیا۔ اردو اور فارسی گھر میں برادر بزرگ مظفر حسین شمیم سے پڑھی۔ میری زندگی کے تین ادوار رہیں: (۱) ۱۹۲۸-۴۲ء (۲) ۱۹۴۲-۵۶ء (۳) ۱۹۵۶ء تا حال۔

۱۹۲۸ء میں رائے پور سے میٹرک کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے کلکتہ چلا گیا تھا۔ کلکتے کے دوران قیام ہی میں اخبار نویسی اور مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ شروع میں ہندی میں لکھتا تھا۔ بعد میں اردو میں لکھنا شروع کیا۔ اسی زمانے میں مختلف رسائل و جرائد میں مضامین لکھنے لگا۔ پھر بنارس یونیورسٹی سے میں نے "ساہتیہ النکار" کا امتحان دیا۔ یہ امتحان "منشی فاضل" یا "آنرز ان سنسکرت" کے مساوی سمجھا جاتا تھا۔

۱۹۳۲ء میں علی گڑھ چلا آیا۔ میرے دور کے ممتاز طلبہ میں محاز، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، سبط حسن تھے۔ ان سے میرے گہرے روابط و مراسم تھے۔ جن اساتذہ کی خاص شفقت مجھ پر تھی ان میں رشید احمد صدیقی اور پروفیسر حبیب کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ علی گڑھ کے دوران قیام میری ملاقات مولوی عبدالحق صاحب سے ہوئی اور اُن کے خلوص کار نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ان کی خدمت میں حیدرآباد چلا گیا۔

س:۔ کب؟

ج:۔ ۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام "اردو انگلش ڈکشنری" کی ترتیب و تدوین سے مجھے وابستہ کیا اور رسالہ "اردو" کی ادارت میں اپنا مددگار بنایا۔

س:۔ اس ڈکشنری کی ترتیب میں اور بھی اہل علم شریک تھے؟ بہت سے لوگوں کا اس پر دعویٰ ہے اور بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ خود مولوی عبدالحق نے اس ڈکشنری کے مرتب کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیا اور اپنے نام کا چراغ دوسروں کے خون سے جلایا ہے؟ حقیقت کیا ہے؟

ج: یہ صحیح نہیں کہ مولوی صاحب نے ڈکشنری کی ترتیب میں حصہ نہیں لیا۔ اس کام میں ان کی حیثیت مرکزی تھی۔ البتہ یہ کام کئی لوگوں کے اشتراک سے تکمیل کو پہنچا۔ ان میں سے کچھ کا ذکر مولوی صاحب نے کیا اور کچھ کا ذکر بھول گئے۔ میں بھی اسی زمرے میں آتا ہوں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایس سے لے کر زیڈ تک کے آٹھوں پروف میں نے دیکھے اور ضمیمہ میں نے تیار کیا تھا۔ ڈکشنری کا مختصر ایڈیشن بھی میں نے ہی ترتیب دیا تھا۔

س:۔ اور وہاں کیا کیا ہوتا رہا ؟

ج:۔ رسالہ اردو کی ادارت میں مولوی صاحب کا ہاتھ بٹاتا تھا، نیز "ناخدا" کے نام سے کتابوں پر تبصرہ کیا کرتا تھا۔ میرے یہ تبصرے بہت پسند کیے جاتے تھے۔ حیدرآباد کے دورانِ قیام ہی میں "شکنتلا" کا اردو میں ترجمہ کیا جسے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ نیز براہِ راست بنگالی سے نذرالاسلام کے کلام کا ترجمہ بھی کیا۔ اردو کے قارئین کو نذرالاسلام سے میں نے پہلی مرتبہ روشناس کرایا اور پھر بعد میں ان کی کچھ اور نظموں کا ترجمہ کرکے "پیامِ شباب" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا جسے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔

میرے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "ادب اور انقلاب" کے بعض مضامین بھی پہلی بار "اردو" میں شائع ہوکر موضوعِ سخن بن چکے تھے۔

س:۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ آپ نے ایک ایسے زمانے میں نذرل کی شاعری سے اردو قارئین کو روشناس کیا جب کہ ٹھاکر جی (رابندر ناتھ ٹیگور) کا طوطی بول رہا تھا اور "گیتان جلی" کا غالباً اردو میں ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ نذرل کو ایسے دور میں دریافت کر لینا واقعی حیرت انگیز ہے۔ نذرل کے کلام کو ترجمے کے لیے انتخاب کا حقیقی پس منظر کیا تھا ؟

ج:۔ کلکتے کے دورانِ قیام میں میں نے بنگالی سیکھی تھی۔ میرا ذہن یہاں کی انقلابی اور اشتراکی تحریکوں سے متاثر تھا۔ اس بنا پر نذرالاسلام کی نظموں کے ترجمے کا خیال آیا جن کا ذکر اس زمانے میں بنگال کے خاص و عام کی زبان پر تھا۔

س:۔ آپ کی شادی بھی غالباً اسی دور میں ہوئی ہوگی ؟

ج:۔ جی ہاں۔

س:۔ کب اور کہاں ہوئی ؟

ج:۔ میری شادی سنہ ۱۹۳۶ء میں ظفر عمر[1] صاحب کی دختر سے ہوئی۔

س:۔ بہت خوب۔ اب دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے جسے میں تیسرا بھی کہہ سکتا ہوں۔ کیوں کہ آپ نے عہدِ طفولیت (سنہ ۱۹۱۲-۲۸ء) کو اپنے قایم کردہ ادوار میں شمار نہیں کیا۔

درس و تدریس

ج:۔ یہ دور میری تدریسی زندگی سے عبارت ہے۔ میں سنہ ۱۹۳۷ء میں یورپ گیا، اور سنہ ۱۹۴۰ء میں پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ لے کر آیا۔ ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں میرا تقرر تاریخ کے پروفیسر اور وائس پرنسپل کی حیثیت سے ہوا۔ جہاں میں سنہ ۱۹۴۲ء تک رہا۔ میرے شاگردوں میں عارف عبدالمتین اور سیف الدین سیف بھی تھے جو اب صفِ اول کے شعرا میں ممتاز ہیں۔

سنہ ۱۹۴۵ء میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے میرا انتخاب کیا اور حکومتِ ہند کے محکمۂ تعلیم میں معاون مشیرِ تعلیم مقرر ہوا۔ مشیرِ تعلیم سر جان سارجنٹ نے تعلیمی بہتری کے لیے ہندوستان کی تعلیمی کیفیت کا سروے کرانے کے بعد ایک رپورٹ مرتب کرائی جو بعد میں "سارجنٹ رپورٹ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخی لحاظ سے یہ رپورٹ بڑی اہمیت کی حامل ہے، کیوں کہ نظامِ تعلیم میں بعد میں جس قدر اصلاحات ہوئیں اس کی سفارشیں اس رپورٹ میں کر دی گئی تھیں۔

---

[1] ظفر عمر صاحب سے کون واقف نہیں، وہ پولس سروس سے وابستہ تھے، ایس۔ پی ہوکر ریٹائر ہوئے۔ آپ کی ایک ٹانگ شکار میں ضائع ہو گئی تھی۔ آپ جاسوسی ناولوں کے مشہور مصنف ہیں۔ نیلی چھتری۔ بہرام کی گرفتاری۔ لال کنٹھور۔ چوروں کا کلب۔ آپ کی مشہور ناولیں ہیں۔

معاون مشیرِ تعلیم کی حیثیت سے مجھے سر جوگندر سنگھ، راج گوپال اچاریہ اور مولانا ابوالکلام آزاد سے بارہا ملنے کا موقع ملا جنھوں نے اس زمانے میں وزیرِ تعلیم کے فرائض انجام دیے اور ان کی شخصیت کے گوناگوں نظارے بھی کیے۔

مولانا آزاد سے میری ملاقات تو کلکتے کے دورانِ قیام میں ہی ہو چکی تھی اور وہ مجھ پر شفقت بھی فرماتے تھے خیر یہ باتیں تفصیل طلب ہیں، جن پر کبھی تفصیل سے کچھ لکھوں گا۔

س:۔ آپ پاکستان کب آئے؟

ج:۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد، میں نے پاکستان آپٹ کر لیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد میں نائب مشیرِ تعلیم اور ڈپٹی سکریٹری کے عہدے پر ۱۹۵۶ء تک فائز رہا۔

یونسکو سے وابستگی

س:۔ گویا دوسرا دور یوں بسر ہوا، پھر کیا گزری؟

ج:۔ جی ہاں! پھر ۱۹۵۷ء کے آغاز میں اقوام متحدہ کے ادارہ یونسکو سے وابستہ ہو گیا۔ چند سال یونسکو کے "شعبۂ فرہنگ" کا ناظم رہا اس دوران میں قیام پیرس میں رہا۔ ۱۹۵۹ء میں یونسکو کا ایک علاقائی دفتر کراچی میں آ کر قایم کیا اور اسی پروجکٹ کے تحت "نیشنل بک سنٹر" بھی میری کوششوں سے قایم ہوا۔

سومالیہ اور ایران

س:۔ اس کے بعد۔

ج:۔ پاکستان سے کام ختم کر کے میں دوبارہ پیرس گیا اور کچھ دن بعد یونسکو کے نمائندے کی حیثیت سے سومالیہ چلا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں ایران بھیج دیا گیا اور یہاں چار سال قیام رہا۔ اب پھر میرا تبادلہ یونسکو کے صدر دفتر پیرس ہو گیا۔

ایران کی نفوذ پذیر علمی و ادبی فضا نے مجھے کھوئی ہوئی متاعِ لوح و قلم لوٹا دی۔ حافظ۔ خیام عشقی۔ قرۃ العین طاہرہ اور دوسرے متعدد فارسی شعرا پر از سر نو تحقیقی نظر ڈالی۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ لوگ قرۃ العین کے مزار سے واقف نہیں۔ نہایت چھان بین کے بعد دریافت کر سکا۔

س:۔ کہاں ہے بھلا؟

ج:۔ تہران کے ایک محلہ یوسف آباد میں۔ لوگوں نے اس شعلہ نفس شاعرہ کو بھلا دیا۔ حالانکہ ابھی سَو سال بھی نہیں گزرے۔

س:۔ جی ہاں، وہ قاچار کے عہد کی شاعرہ تھی، آپ کتنی زبانیں جانتے ہیں؟

ج:۔ جہاں تک زبانوں کا تعلق ہے، اردو، ہندی اور انگریزی میں تحریریں موجود ہیں سنسکرت، فارسی، فرانسیسی اور بنگالی زبانیں میں اچھی طرح جانتا ہوں اور ان میں اپنا مافی الضمیر بخوبی ادا کر سکتا ہوں۔

جب سے میں یونسکو سے وابستہ ہوا ہوں تصنیف و تالیف کی نبض سست پڑ گئی ہے۔ گاہے گاہے کچھ لکھ لیتا ہوں جس کی وجہ ظاہر ہے۔ کچھ ملک اور زبان سے دوری، کچھ زندگی کی ہیرا پھیری۔

س:۔ ہماری علمی و ادبی دنیا کی کن ممتاز شخصیتوں کو آپ نے دیکھا ہے؟

ج:۔ مجھے بچپن سے اب تک جن بزرگوں سے استفادہ کرنے کا موقع ملا، ان میں سے کم ہی ایسے لوگ شامل ہیں جنھیں دیکھنے اور ملنے کا موقع میسر نہیں آیا اور ان کی صحبتوں سے استفادہ نہیں کیا۔ علامہ اقبال۔ مولانا ابوالکلام آزاد، آغا حشر، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر ذاکر حسین۔

مسز سروجنی نائیڈو، خالدہ ادیب خانم، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پنڈت سندر لال وغیرہ (متعدد نام نوٹ نہیں کر سکا)

علامہ اقبال

س :۔ علامہ اقبال سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی تھی؟ آپ نے کیا تاثر قبول کیا تھا؟

ج :۔ میں اپنی کم عمری میں بہت بے باک واقع ہوا تھا۔ ڈاکٹر اقبال سے سب سے پہلے ملنے کا اتفاق ۱۹۳۳ء میں ہوا، ان دنوں میں علی گڑھ میں زیر تعلیم تھا۔

جامعہ ملیہ کی دعوت پر کمال اتاترک کے دست راست رؤف بیگ ترکی سے دہلی آئے ہوئے تھے۔ ایک جلسے کی صدارت ڈاکٹر اقبال نے کی تھی اور وہ ڈاکٹر انصاری کے دولت کدے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر اقبال کی شاعرانہ خوبیوں کا میں گرویدہ تھا لہٰذا ان سے ملنے کے لیے دل بے اختیار ہو تھا۔ میں چند سوالات مرتب کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے جب میں نے ان سے چند گستاخانہ باتیں کیں تو وہ تعجب سے اٹھ بیٹھے اور دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔

وہ سوالات اور علامہ کے دیے ہوئے جوابات اب تک محفوظ ہیں، انشاء اللہ انھیں کبھی شائع کروں گا۔

بعد ازاں جب لاہور جانے کا موقع ملتا تو میں ان کی خدمت میں حاضری ضرور دیا کرتا تھا اور اس کے باوجود کہ وہ مجھ سے بعض باتوں میں متفق نہ تھے، وہ مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔

س ۔ کیا آپ کی رائے میں علامہ اقبال کے افکار میں فسطائیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔

ج ۔ علامہ اقبال کے نظام افکار کا جہاں تک تعلق ہے اسے فاشزم سے دانستہ مناسبت نہیں۔ نیطشے کے "سپرمین" اور اقبال کے "مرد کامل" کی صفات میں بڑی مناسبت اور یکسانی پائی جاتی ہے گو اس کی جڑیں نہ زیادہ مضبوط ہیں اور نہ بہت گہری۔ افراط و تفریط سے قطع نظر میں محسوس کرتا ہوں کہ علامہ اقبال کے سیاسی فلسفے کا از سر نو جائزہ لینے اور از سر نو قدر متعین کرنے کی ضرورت ہے۔

افسانہ و افسوں

س ۔ آپ نے افسانے کس دور میں لکھے تھے اور پھر افسانہ لکھنا ترک کیوں کر دیا؟

ج ۔ میرا پہلا افسانہ "زبانِ بے زبانی" ۱۹۳۳ء میں رسالہ "نگار" (لکھنؤ) میں شائع ہوا۔ افسانہ نویسی کا سلسلہ ۱۹۴۷ء میں معطل ہو گیا۔

س ۔ کیا ترقی پسند ادبی تحریک کے بانیوں میں آپ بھی شریک تھے؟

ج :۔ میرا مقالہ "ادب اور زندگی" جولائی ۱۹۳۵ء میں رسالہ "اردو" میں شائع ہوا۔ ترقی پسند ادب کی اصطلاح سب سے پہلے اسی مقالے میں استعمال ہوئی۔ "انجمن ترقی پسند مصنفین" اس کے بعد سننے میں آئی۔

اس تحریک میں اس زمانے میں مختلف الخیال لوگ شامل تھے جن میں منشی پریم چند جیسے لبرل سے لے کر سجاد ظہیر جیسے اشتراکی تک تھے کسی خاص سیاسی فرقے سے اس ادبی تحریک کا خصوصی تعلق ۱۹۴۷ء سے پہلے نہ تھا۔

س :۔ پروفیسر احمد علی کا دعویٰ ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بانی مبانی وہ تھے۔ انجمن کی بنیاد ۱۹۳۳ء میں وہ کھڑی کر چکے تھے اور سجاد ظہیر اس میں شریک ہوئے۔

ج :۔ مجھے اس کا علم نہیں ۱۹۳۵ء کے اواخر میں سجاد ظہیر ولایت سے آئے تھے۔ انھوں نے ادیبوں کے نام ایک سرکلر جاری کیا تھا میرے نام بھی آیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین بنی۔

س :۔ آپ کی جملہ تصنیفات؟ براہ کرم یہ یادداشت ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۹۳۸ء: "محبت ونفرت": افسانوں کا مجموعہ۔

۱۹۳۹ء: "شکنتلا": ترجمہ

۱۹۴۰ء: "پیامِ شباب" نذرل کے کلام کا ترجمہ۔

۱۹۴۱-۴۲ء: "گورکی کی آپ بیتی" (تین جلدیں) ترجمہ

۱۹۴۲ء: "بہارِ رحمن" پرل کے ناول "گڈارتھ" کا ترجمہ

۱۹۴۳ء: "ادب اور انقلاب" تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔

۱۹۴۳ء: "زندگی کا میلہ" افسانوں کا مجموعہ۔

۱۹۵۷ء: "روشن مینار" تنقیدی مضامین۔

ج :۔ بالکل صحیح ہیں، مولوی صاحب (عبدالحق) کو گورکی کی آپ بیتی بہت پسند تھی، ان کی ترغیب واصرار سے اس کا ترجمہ کیا تھا پہلی جلد ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی اور پھر باری باری دوسری دو جلدیں شائع ہوئیں اور سچ پوچھیے تو گورکی کی تصنیفوں میں معرکے کی چیز یہی ہے۔

س :۔ آپ کی بعض تحریروں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں؟

ج :۔ اردو کے علاوہ میں نے خود براہِ راست ہندی اور انگریزی میں بھی کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ میرے کئی افسانوں اور تنقیدی مضامین کے تراجم مختلف ایشیائی اور یورپی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

س :۔ اگر زحمت نہ ہو تو قدرے وضاحت فرمائیے؟

ج :۔ تراجم جن زبانوں میں ہوئے ہیں، ان میں انگریزی، جرمنی، اطالوی، سوئیڈش، فارسی، روسی وغیرہ شامل ہیں۔

س :۔ بیرونی ممالک میں آپ کے کون کون سے افسانے مقبول ہوئے یعنی کون کون سا افسانہ ترجمہ ہوا۔

ج :۔ میرا ایک افسانہ "کیٹل مارکیٹ" ہے، یہ اردو[1] یا ہندی میں ابھی منتقل نہیں ہوا ہے۔ انگریزی میں لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ جرمن، روسی اور سوئیڈش زبانوں میں ہوا ہے۔ ان زبانوں میں "مرگھٹ"، "کافرستان کی شہزادی" اور "دل کا اندھیرا" بھی منتقل ہو چکے ہیں۔

س :۔ اور اہلِ ایران نے ترجمے کے لیے کس افسانے کا انتخاب کیا؟

ج :۔ فارسی میں "زبانِ بے زبانی" منتقل ہو چکا ہے۔ یہ رسالۂ "سخن" میں شائع ہوا تھا۔

س :۔ اور مضامین؟

ج :۔ فہرست بہت طویل ہو جائے گی، یوں سمجھیے "ادب اور انقلاب" کے بیشتر مضامین کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

سحر کیا، اعجاز کیا

انٹرویو ختم ہوا۔ اور جب انٹرویو ختم ہو جاتا ہے تو گہری شناسائی، قربت اور آگہی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اختر حسین صاحب کی باری تھی اور وہ میرے مشاغل کے بارے میں پوچھتے رہے، بلوچستان کے لوگوں کے بارے میں پوچھتے رہے، ممتاز حسین کی آمد کا انتظار رہا، بات سے بات نکلتی رہی۔

[1] اردو ترجمہ اسی اشاعت میں شامل ہے ——— صہبا

سیاست حاضرہ، فلسفہ، مذہب، اخلاق، ناشر، سرکاری امداد پانے والے ادارے، ناشروں اور ایڈیٹروں کی بے اعتدالیوں کا ہم رونا روتے رہے۔ اختر صاحب نے نہایت دردمندی کے ساتھ کہا کہ "میں شوق سے لکھتا ہوں، کبھی اپنی تحریر کا معاوضہ طلب نہیں کیا اور ملتا بھی کیا ہے، البتہ یہ خواہش ضرور رہی کہ صحت کے ساتھ میری چیزیں شائع ہوں، لیکن ناشر اور ایڈیٹر حضرات اتنی سی اخلاقی ذمے داری بھی قبول نہیں کرتے۔
ممتاز حسین صاحب تشریف نہیں لائے۔ بالآخر میں نے رخصت طلب کی اور جب جانے کے لیے اٹھا تو شرفائے عظیم آباد کی روایت کے مطابق دروازے تک چھوڑنے آئے اور معانقے کے بعد رخصت کرتے ہوئے بڑی لجاجت سے چار انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "انٹرویو کے آخر میں تناسا میرے بارے میں کچھ ضرور لکھ دیجیے گا۔

"میں آپ کے بارے میں کیا لکھ سکتا ہوں؟"

"کم از کم ایک آخری پیرا"

اختر حسین صاحب کی لجاجت، اصرار، گلے مل کر رخصت کرنے کی پُر از خلاص ادا نے میرے دل پر گہرا اثر کیا اور ان کی لجاجت بھری خواہش نے ایک ہلچل سی پیدا کر دی۔

"کیا میں واقعی اختر حسین رائے پوری پر قلم اٹھانے کا اہل ہوں! یا اُن کی یہ خواہش محض "انکسار و تواضع" کی ایک ادا ہے!"۔ میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔

بایں ہمہ مجھے اس کا شدید احساس ہے کہ ان کے علم و دماغ سے ملک و قوم کو جس قدر فائدہ اٹھانا چاہیے تھا، وہ نہ اٹھا سکی، اور جس کام کے لیے انھوں نے اپنے ذہن و دماغ کو تیار کیا تھا، اس کام کے لیے انھیں سازگار فضا مہیا نہ ہوئی اور "اردو ادب" کو وہ جو کچھ دے سکتے تھے، وہ بھی نہ دے سکے۔

آصف فرخی

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے گفتگو

سوال ۱۔ کیا آپ اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں غور و فکر کر رہے ہیں؟ اور اب اپنی ادبی زندگی کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں؟
کیا آپ کے خیال میں آپ فن تحریر میں اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لا سکے ہیں؟

ڈاکٹر رائے پوری:۔ میرا خیال ہے کہ میں ایسا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا اور ایک طرح سے مجھے اس کا بہت رنج ہے، کیوں کہ بچپن سے میرے ذہن میں یہی ایک خواہش تھی کہ ادیب بن سکوں اور ادب کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دوں۔ آپ نے میری یادداشتوں پر مشتمل کتاب "گرد راہ" کے ابتدائی ابواب میں دیکھا ہوگا کہ یہ موضوع بارہا دہرایا گیا ہے۔ تقریباً ۱۹۴۷ء تک میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ ادب کی نذر کیا۔ اس وقت تک میں شعبۂ تدریس و تعلیم سے وابستہ ہو چکا تھا۔ جب میں نے نوعمری میں لکھنا شروع کیا تو میرے ذہن میں یہ تاثر تھا کہ میں پیشہ ور ادیب کی حیثیت سے کام کر سکوں گا۔ مگر مجھے آگے چل کر یہ احساس ہوا کہ ادب کو پیشہ بنانا ممکن نہیں ہے یا کم از کم تقسیم سے قبل کے ہندوستان میں نہیں تھا۔ لہٰذا یورپ سے واپسی کے بعد جہاں میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے گیا تھا، میں نے تدریس کو اپنا پیشہ بنا لیا اور اس کے ساتھ ساتھ ادبی کام بھی کرتا رہا۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد یہ ممکن نہیں رہا۔ تقسیم ملک کا مفہوم مختلف لوگوں کے نزدیک مختلف تھا۔ میں نے پاکستان کا انتخاب کیا تھا اور جب میں کراچی آیا تو یہاں نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ درحقیقت یہ ملک ہم میں سے بہت سے لوگوں کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا اور ہمارے پاس وقت نہیں تھا، کم از کم میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کسی اور کام میں بھی مشغول ہو سکوں۔ دوسری بات یہ کہ جس وقت پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس وقت یہاں کتابوں کی اشاعت کا کاروبار بہت مندا تھا۔ کوئی بھی چیز چھپوانا کافی مشکل کام تھا۔ مزید برآں، آپ بلاشبہ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ سنجیدہ ادب یا کوئی بھی سنجیدہ کام کل وقتی توجہ کا طالب ہوتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ..... کم از کم تسلی اور تسکین نہیں ہوتی دو کام ایک ساتھ کرنے میں۔ لہٰذا میں تخلیقی کام کو زیادہ وقت نہیں دے سکا۔ یہ تو ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد ہی ممکن ہو سکا کہ میں نے دوبارہ لکھنا شروع کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۹۵۶ء کے آغاز میں، میں یونیسکو چلا گیا اور وہاں تقریباً سترہ سال تک ملازمت کرتا رہا جو زیادہ تر ملک سے باہر تھی۔ وطن واپسی کے بعد ہی میں نے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو جوڑا۔ میں ان اکا دکا مضامین کا تو ذکر نہیں کروں گا جو میں کبھی کبھار لکھتا

[redacted]

... سنجیدگی کے ساتھ ادبی کام میں نے یونیسکو سے ریٹائرمنٹ کے بعد ہی دوبارہ شروع کیا۔ اسی زمانے میں مجھے اپنی دور کو قلم بند کرنے کا خیال آیا۔ بدقسمتی سے یہ کتاب آدھی کے قریب مکمل ہوئی تھی کہ میری بینائی ضائع ہو گئی اور یہ کام کافی عرصے تک ادھورا پڑا رہا۔ میں نے دوبارہ ہمت کی اور یہ مسودہ مکمل کیا تب جا کر یہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کتاب اس قدر داد و تحسین کی مستحق قرار پائے گی اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے بلا ارادہ اس میں بعض باتوں کو ناگفتہ چھوڑ دیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ کتاب اس قدر پسند کی جائے گی تو میں اس پر مزید وقت اور توجہ صرف کرتا اور کسی پیشہ ور آدمی کی خدمات مستعار لیتا۔ اس وقت میری مشکل یہی تھی کہ مجھے کوئی ایسا آدمی نہیں مل رہا تھا جس کو میں بول کر کتاب لکھوا سکوں۔ بہرحال یہ مسئلہ بھی کسی نہ کسی طرح حل ہو سکتا تھا۔ خیر آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ کیا میں اپنی ادبی ... سے مطمئن ہوں تو سچی بات تو یہ ہے کہ بالکل نہیں ہوں۔

سوال:۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ایک ادیب کی زندگی دھیرے دھیرے کسی سنگلاخ پہاڑی چوٹی کو تسخیر کرنے کی طرح ہے۔ آپ ایک دلچسپ اور بھرپور واقعات ادبی زندگی کے نقطۂ عروج یا (SUMMIT) پر پہنچے ہوئے ہیں تو اس بلندی سے آپ کو جو منظر نظر آتا ہے وہ کیسا ہے؟ زندگی کے بارے میں اور دوسری چیزوں کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

ڈاکٹر صاحب:۔ آپ نے بڑا مشکل سوال پوچھ لیا ہے، مگر یہ سوال ہے دلچسپ۔ بالعموم جب کوئی شخص عمر رسیدہ ہو جاتا ہے تو ... زندگی کچھ بے رنگ اور مایوس کن محسوس ہوتی ہے یہ انسان کی فطرت ہے۔ کیوں کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جس زندگی سے وہ مانوس تھا، وہ کہیں پیچھے رہ گئی ہے جب وہ اپنے اردگرد نظر دوڑاتا ہے تو اسے ماضی کے کھنڈر اور بربادیاں ہی دکھائی دیتی ہیں، لیکن معروضی طور پر اگر دیکھا جائے" اور یہ میں صرف اپنے میدان کے حوالے سے بات نہیں کر رہا ہوں، تو میرا خیال ہے کہ انسانی زندگی تضادات سے بھری ہوئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیشہ سے تضادات کا مجموعہ رہی ہے۔ اس کا تناظر بدلتا رہتا ہے۔ انسان کی زندگی آخر کار ہے کیا؟ یہ THESIS اور ANTI-THESIS کا سلسلۂ عمل ہے۔ یہ چیلنج اور چیلنج کے جواب دہی کا سلسلۂ عمل ہے۔ مسئلے پیدا ہوتے ہیں اس لیے کہ حل ہو جائیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے ایک مسئلے کا حل تلاش کر لیا ہے، لیکن اس کا اگلا قدم یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک نیا مسئلہ پیدا کر بیٹھتے ہیں اور یہ دائرہ بنتا اور بگڑتا رہتا ہے۔ مجھے اب کوئی احساسِ ملال نہیں ہوتا اس پر۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کو سطحی طور سے دیکھا جائے تو آدمی اداس یا خوش ہو سکتا ہے، جیسی بھی صورتِ حال ہو، لیکن اگر آپ کے اندر تاریخی شعور موجود ہے تو پھر یوں اداس ہونے کا کوئی سبب نہیں ہے۔ آپ دیکھیے کہ اس کا انحصار آپ کے فلسفۂ حیات پر ہے۔ ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ بنی نوع انسان نے اپنے واسطے بہت زیادہ مسائل پیدا کر لیے ہیں۔ قدرت کا یہ منشا نہیں تھا۔ فطرت کی یہ خواہش نہیں تھی کہ لوگ ایک دوسرے سے نفرت کریں رنگ اور نسل کی بنیادوں پر۔ فطرت کی یہ خواہش نہیں تھی کہ یہ چھوٹا سا ستارہ تقسیم اور بار بار تقسیم ہو کر چھوٹے چھوٹے ملکوں میں بٹ جائے۔ زبان کی تخلیق اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان نفرت میں اضافہ کرے، لیکن تاریخ اسی نہج پر چلتی رہی ہے۔ جو ہم نے تخلیق کیے ہیں، اتفاق اور نا اتفاقی کے مقام اور سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہم ان امور کو کتنی اہمیت دیتے ہیں جن پر اتفاق ممکن ہے۔ لہٰذا یہ تقسیم در حقیقت تقسیم ہے۔ کچھ قوتیں ایسی ہیں جو مختلف ملکوں، مختلف نسلی گروہوں کو قریب لانے کی کوشش کر رہی ہیں، کچھ قوتیں ایسی ہیں جو ان میں نا اتفاقی اور نفاق کو فروغ دے رہی ہیں۔ اب یہ آپ پر منحصر

ہے کہ آپ مختلف چیزوں کو کس طرح سے دیکھتے ہیں اور اس ماحول کے بارے میں کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اگر آپ بگاڑ پیدا کرنے والی قوتوں کا نشانہ ہو جاتے ہیں تو پھر آپ اس نااتفاقی کے لیے ہی کام کریں گے، لیکن اگر آپ ان قوتوں سے برسرِ پیکار رہتے ہیں تو آپ ہم آہنگی کے لیے کام کریں گے، نہ صرف اپنے ملک کے اندر بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کے لیے۔

سوال :۔ اس پہاڑی چوٹی سے جو ہم نے آپ سے دور تک دیکھنے کے لیے کہا ہے، تو اس کے ایک خاص نقطے پر میں آپ کی توجہ مرکوز کرانا چاہوں گا۔ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کا مضمون "ادب اور زندگی" ترقی پسند تحریک کا نقطۂ آغاز تھا۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں؟

ڈاکٹر رائے پوری :۔ ہاں، وہ مضمون آج سے ٹھیک پچاس برس پہلے ۱۹۳۵ء میں چھپا تھا اور وہ میرے مجموعۂ مضامین "ادب اور انقلاب" میں شامل ہے۔ اب یہ مضمون۔ میں اس وقت کم عمر تھا، بہت کم عمر۔ اور میں سوشلسٹ فلسفے سے بہت متاثر ہوا تھا، مگر راہ میں میں نے لکھا ہے کہ میں سوشلزم اور جمہوریت کو جدید تمدن کے دو بنیادی ستون سمجھتا ہوں۔ اپنی نوجوانی کے دنوں میں سوشلسٹ فلسفے سے متاثر تھا اور میں نے ان تحریروں کو بھی کسی حد تک پڑھا ہوا تھا۔ اس وقت کے حساب سے ... ادب کہہ سکتے ہیں۔ میں بہت کثرت سے مطالعہ کرتا تھا اور غور و فکر کرتا تھا، پھر میں نے اپنے خیالات کو اس مضمون کی شکل دی۔ میں اب بھی اس مضمون کے بنیادی خیالات پر قائم ہوں۔ میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی ادیب اپنے اردگرد ماحول کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی ادیب میں سماجی شعور نہ ہو۔ ادیب چاہے کسی اسلوب کا پیروکار ہو، وہ چاہے ... کسی تکنیک کا تجربہ کرے، لیکن میں کسی ایسی تحریر کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس کی بنیاد سماجی شعور پر نہ ہو۔ اور اگر آپ کے پاس سماجی شعور ہوگا تو پھر آپ کے اندر سماج سے وابستگی کا احساس ذمے داری بھی ہوگا۔ آپ کے چاروں طرف جو کچھ ہوتا ہے، آپ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر معاشرے میں ناانصافی ہے، ایک آدمی کے ہاتھوں دوسرے آدمی کا استحصال ہے، اگر سیاسی جبر ہے تو ان تمام چیزوں کا آپ کی فکر پر اثر مرتب ہوگا۔ اب یہ کہ آپ اپنی فکر کو اپنی تحریر میں کس طرح ظاہر کرتے ہیں، یہ بالکل مختلف سوال ہے۔ بعض تحریریں ان خیالات کے بیان میں بڑی واضح اور کھلی ہوئی ہوتی ہیں اور بعض تحریروں میں یہ بات اشارتاً بیان ہوتی ہے یا مضمر ہوتی ہے، لیکن بنیادی طور پر سماج اور ادب کے رشتے کی اہمیت برقرار ہے اور میں ان خیالات پر کاربند ہوں۔

سوال :۔ یعنی جب آپ کو ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ایک قرار دیا جاتا ہے تو آپ کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا؟

ڈاکٹر رائے پوری :۔ بالکل نہیں، بالکل نہیں۔ چاہے یہ بات کسی کو پسند آئے یا نہ آئے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن لکھنؤ میں اپریل ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی تھی اور میرا مضمون "ادب اور زندگی" جولائی ۱۹۳۵ء میں چھپ چکا تھا۔ سجاد ظہیر نے اپنی کتاب "روشنائی" میں بڑی وسعتِ قلب کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ میرا مضمون اس پوری تحریک کا منشور تھا۔ اس معاملے میں کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ یہ ادب میں میری بنیادی CONTRIBUTION میں سے ایک ہے اور مجھے اس پر فخر ہے۔

سوال :۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ اس تحریک کے پیش روؤں میں سے ایک تھے اور اس کے پیش رو کی حیثیت سے بعد میں اس تحریک نے جو رُخ اختیار کیا اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے، مثلاً یہ کہ تحریک تو بالکل "سرخ" ہو گئی جب

آپ تو زیادہ سے زیادہ بنگالی ہی تھے۔

ڈاکٹر رائے پوری:۔ (ہنسی) آپ نے میری دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔ ترقی پسند تحریک کو اُبھارا تھا پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن نے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس انجمن کے قیام سے پہلے ترقی پسند ادب موجود نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اردو کے پڑھنے والے اس تحریک کو صرف اردو کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ اس طرح کا ادب پہلے سے تخلیق ہو رہا تھا، نہ صرف مغربی ممالک میں بلکہ ۱۹۳۶ء سے پہلے ہی ہندوستان کی بعض اور زبانوں میں بھی۔ بنگالی کی مثال لے لیجیے۔ مجھے یاد ہے کہ مشہور انقلابی شاعر قاضی نذرالاسلام کی نظموں کا ایک مجموعہ ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء کے اوائل میں چھپا تھا جس کا نام تھا 'سامیوادی' یعنی سوشلسٹ، میں نے ان میں سے بعض نظموں کا بنگالی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے جو 'پیامِ شباب' میں شامل ہیں۔۔۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا، میں نے نذرالاسلام کو اردو میں متعارف کرایا۔ اگر آپ ان ترجموں کا مطالعہ کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ قاضی نذرالاسلام ہندوستان کے پہلے انقلابی شاعر تھے جس میں باقاعدہ طور پر انقلاب کا شعور موجود تھا۔ اب میں جنوبی ہند کی کوئی زبان نہیں جانتا، لیکن کم از کم شمالی ہند تک، میں وہاں کی بڑی بڑی زبانوں سے واقف ہوں، کوئی شاعر ایسی شاعری نہیں کر رہا تھا۔ تو جب ہم ترقی پسند تحریک کی بات کرتے ہیں تو ہم اس پیش رفت سے اس کے تعلق کو بھول جاتے ہیں (وقفہ)

سوال:۔ آپ اس بارے میں کچھ کہہ رہے تھے کہ اس تحریک نے بعد میں کیا رُخ اختیار کیا۔

ڈاکٹر رائے پوری:۔ اس نے اردو ادب کی بہت خدمت سرانجام دی، یہ تو امرِ مسلّمہ ہے۔ جو لوگ اس پر معترض ہوتے ہیں، اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ جدید اردو ادب کا اہم ترین موڑ تھا۔ سرسید احمد خاں کے دور کے بعد یہ دوسری تحریک تھی جس نے اردو ادب کا رُخ بدل دیا، لیکن یہ تحریک بھی تقسیم کے زمانے کے لگ بھگ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ ہم لوگ جو اس زمانے میں لکھ رہے تھے، ہمیں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ انگریزی سامراج کے خلاف جدوجہد تھی۔ کچھ ادیب قوم پرست تھے۔ اور وہ محض ہندوستان اور انگریز حکومت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ہم اس جدوجہد کے بارے میں سوچ رہے تھے جو نازی ازم اور فاشزم کے خلاف جاری تھی۔ ہمارا ذہنی افق وسیع تر تھا، لیکن ہم تمام لوگ اس بات پر متفق تھے کہ ادیب آزادی کی جدوجہد سے لاتعلق نہیں رہ سکتے اور براہِ راست یا بالواسطہ انھیں اس میں شریک ہونا پڑے گا۔ تو جب ملک آزاد ہو گیا، تو ادیبوں کا ایک مقصد پورا ہو گیا۔ آزادی کے بعد اس تحریک نے ایک اور رُخ اختیار کیا۔ میں ہندوستان سے پاکستان آیا تھا اور مجھے نہیں معلوم کہ کس وجہ سے اس زمانے میں چند لوگوں نے لاہور میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ انھوں نے ایک قرارداد منظور کی جس کے الفاظ تو مجھے یاد نہیں مگر مفہوم یہ تھا کہ آزادی کا حصول تو ہماری جدوجہد کی محض ایک ابتدائی کامیابی ہے اور ہماری اصل منزل سماجی انقلاب ہے اور یہ تمام ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اس کی راہ ہموار کرنے کے لیے کام کریں۔ مراد یہ تھی کہ اس کی سمت کا تعین اور قیادت کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھوں میں ہو۔ بعض ترقی پسند ادیبوں کو اس سے اتفاق نہیں تھا اور انھیں بڑی جلدی معتوب قرار دے دیا گیا۔ میں بھی انہی میں سے ایک تھا۔ یہ بات ہے غالباً ۱۹۴۸ء کی۔ ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا، یہ میں نہیں جانتا۔ یہ لوگ مجھ سے کسی بات میں مشورہ نہیں لیتے تھے۔ میں یہاں یہ ذکر کر دوں کہ میں دہلی کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا صدر منتخب ہو چکا تھا اور تقسیم کے وقت تک اس عہدے پر برقرار رہا۔ تقسیم کے بعد میں نے لکھا ہی برائے نام۔ 'نیا دور' میں چند

ایک مضامین اور بس۔ میرا خیال ہے کہ ان میں کوئی غیر ترقی پسندانہ چیز نہیں تھی۔ میرا یہ خیال بھی نہیں تھا کہ سماجی انقلاب بس آیا چاہتا ہے حالاں کہ کمیونسٹ پارٹی اسی طرح سوچتی تھی۔ کسی بھی انقلابی تحریک کے ساتھ یہ ضرور ہوتا ہے کہ پہلی معمولی سی کامیابی کے ساتھ بعض لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ انقلاب اب آنے ہی والا ہے اور ادیبوں کو اس کا استقبال کرنے کے لیے باقاعدہ جنگ کرنی چاہیے، لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ اس مرتبہ بھی نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو سیاسی جماعت قرار دے دیا۔ یہ غالباً ۱۹۵۴ء کی بات ہے اور تب سے انجمن عملی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ بلکہ اگر اس کا کوئی وجود ہے بھی تو ANIMATED SUSPENSION کی کیفیت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب اب ترقی پسند نہیں ہوتے۔ اس کے بعد سے بہت شاعری اور بہت افسانہ ایسا لکھا گیا ہے جو ترقی پسند نقطۂ نظر کا حامل ہے، لیکن ہم فی الوقت اس انجمن کی بات کر رہے ہیں، یعنی اس خاص انجمن کی کہ وہ آزادی سے پہلے کیا تھی، اس نے بعد میں کیا صورت اختیار کی اور اس بارے میں میرا کیا خیال ہے؟

سوال :۔ بعض ترقی پسند ادیبوں نے آپ پر ایک الزام عائد کیا ہے۔ سجاد ظہیر نے 'روشنائی' میں لکھا ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جس کا آپ نے ابھی حوالہ دیا کہ آپ نے تحریک کے عروج کے دنوں میں ایک اعلا عہدہ قبول کر لیا اور تحریک کو چھوڑ دیا اور یہ ایک قسم کی مفاہمت تھی۔ یعنی یوں سمجھیے کہ آپ دشمن کی صفوں میں شامل ہو گئے، ان لوگوں کے خیال میں۔

ڈاکٹر رائے پوری :۔ اب میں کیا کہہ نہیں سکتا کیوں کہ آپ کو یہ تو یاد ہوگا کہ تقسیم سے پہلے جب ہم سب آزادی کے لیے لڑ رہے تھے، یعنی ہم سب برطانوی سامراج سے لڑ رہے تھے تو اس وقت ان میں سے بعض ترقی پسند حضرات حکومتِ برطانیہ کی وردی پہنتے تھے۔ وہ آرمی کے افسر تھے۔ فیض احمد فیض بھی ان میں شامل تھے، تاثیر بھی ان میں تھے۔ یہ چیز گویا ان کے مقاصد کے مطابق تھی۔۔ چوں کہ برطانیہ ان کا حلیف تھا، اس لیے وہ یہ سمجھتے تھے کہ برطانیہ کی ملازمت کرنا ٹھیک ہے اور انگریزوں کے لیے کام کر کے دراصل وہ انقلاب کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہاں آ کر انھوں نے دوسرا نظریہ اختیار کیا۔ جو آدمی بھی حکومتِ پاکستان کی ملازمت کر رہا تھا، وہ دشمن بن گیا۔ کیا اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ انھوں نے قیامِ پاکستان کو دل سے قبول نہیں کیا تھا؟ بعد میں اگر آپ کو یاد ہو، ان میں سے بعض لوگوں نے حکومتِ پاکستان کی پیش کی ہوئی ملازمتیں قبول کر لیں۔ تو میں یہ کہوں گا اور مجھے اس بات پر بہت دکھ ہے، لیکن میں چبا چبا کر باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ یہ درست ہے کہ انقلاب ہی ان کا زاویۂ نظر تھا اور یہ ممکن ہے کہ انھوں نے خلوصِ دل کے ساتھ محسوس کیا ہو کہ انقلاب بس آیا ہی چاہتا ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، مگر جب انھوں نے مجھ ایسے لوگوں کو RE-ACTIONARY قرار دے کر الگ کرنا شروع کیا تو اس بات کی نوعیت ہی دوسری تھی۔ ایک ہی رات میں ہم رجعت پسند بن گئے۔ اس کے پشت پر نظریات نہیں بلکہ ذاتی رنجش تھی۔ میں اس کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا، لیکن ان کا یہ اقدام ذاتی وجوہ کی بنا پر تھا، نظریات کی بنیاد پر نہیں۔

سوال :۔ وہ ذاتی وجوہ کیا تھیں؟ کیا آپ اُن کی کچھ تفصیل بتائیں گے؟

ڈاکٹر رائے پوری :۔ بات یہ ہے کہ میں اس کے بارے میں خاموش رہنا ہی پسند کروں گا ورنہ میں کچھ ایسی باتوں میں اُلجھ جاؤں گا جن کا سلسلہ بہت تکلیف دہ ہیں۔ اور جب میں کہہ رہا ہوں کہ ذاتی وجوہ، تو میرا مطلب ذاتی وجوہ ہی ہے۔ یہ ذاتی جھنجھک یا رقابت تھی یا جو کچھ بھی آپ اسے کہہ لیجیے۔ ایک بنیادی اختلاف اسٹالن ازم کے مسئلے پر تھا اور بعد میں سامنے آنے والے حقائق نے میرے خدشات

کو درست ثابت کر دیا۔ میرا رویہ تو ذاتی رنجش پر مبنی نہیں تھا۔ لیکن یہی بات میں ان لوگوں کے بارے میں نہیں کہہ سکتا۔

سوال :۔ خیر کسی اور موضوع پر بات کرتے ہیں۔ اگر آپ اس کی تفصیلات نہیں بتانا چاہتے۔

ڈاکٹر رائے پوری :۔ لیکن میں ایک بات ضرور کہنی چاہوں گا۔ اب بہت وقت گزر چکا ہے۔ سجاد ظہیر پاکستان سے واپس ہندوستان جا چکے تھے۔ یہ ۱۹۵۲ء کے اواخر کی بات ہے۔ میں پیرس میں یونیسکو میں ملازم ہو چکا تھا اور وہاں سے دہلی گیا تھا ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے۔ میں اپنے ایک پرانے دوست پی۔ این۔ بھاٹیہ کے گھر پر ٹھہرا ہوا تھا جو چندی گڑھ سے شائع ہونے والے اخبار ڈیلی ٹریبیون کے اڈیٹر ان چیف ہیں۔ میں کوئی دو ہفتے ان کے یہاں رہا۔ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند بھاٹیہ کے گھر مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ اب یہ واقعہ آپ سمجھیے، کوئی تیئیس برس پہلے کا ہے۔ سجاد ظہیر کا انداز کچھ معذرت خواہانہ سا تھا۔ ان واقعات کے بارے میں جو ماضی میں پیش آ چکے تھے۔ ہمارا اصل اختلاف اسٹالن ازم پر تھا۔ اس وقت تک خروشچیف اپنی وہ مشہور تقریر کر چکا تھا اور روس میں DE-STALINIZATION کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہم نے اس کے بارے میں گفتگو کی اور جب ہم ترقی پسند تحریک کے موضوع پر آئے کہ اس نے کیا کچھ حاصل کیا، کہاں ناکام ہوئی اور کون سی غلطیاں سرزد ہوئیں، تو سجاد ظہیر نے لاہور کے اجلاس کا ذکر کیا اور یہ کہا کہ شاید یہ ساری باتیں بہت عجلت کے ساتھ ہوئیں اور اس معاملے میں ان کی رائے شامل نہیں تھی۔ یہ بات سجاد ظہیر نے مجھ سے کہی۔ سجاد ظہیر لاہور کے اس اجلاس میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ اس اجلاس کی صدارت فیض احمد فیض نے کی تھی اور قرارداد سبط حسن[1] نے پیش کی تھی۔ اور جب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے اس فہرست میں احمد علی، ن۔ م۔ راشد اور منٹو کے نام کیوں شامل کیے، تو مجھے اس کی وجہ نہیں معلوم۔ احمد علی کے پاس سنانے کے لیے اپنی کہانی موجود ہے، لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ اس فہرست میں میرا نام کسی نظریاتی بنیاد پر نہیں، بلکہ ذاتی وجوہ اور معاصرانہ چشمک کی وجہ سے شامل کیا گیا تھا تو میری یہ بات بالکل واضح ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ ریکارڈ پر آ جائے۔

سوال :۔ اب کچھ گفتگو آپ کے افسانوں کے متعلق۔ آپ نے اپنی ادبی زندگی کی ایک مختصر مدت میں افسانے بھی لکھے۔ آپ افسانے میں اس مقام پر داخل ہوئے جہاں پریم چند نے اسے چھوڑا تھا اور یہاں سے اسے آگے لے گئے اور جس مقام پر جا کر آپ کا فنی ارتقاء رُک گیا تو اس وقت تک منٹو ادبی منظر پر نمودار ہو چکے تھے۔ آپ کو ان دو دیوقامت فن کاروں کے درمیان ایک کڑی، مگر گم شدہ کڑی نہیں، قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور صرف افسانہ نگاروں کی درمیانی کڑی ہی نہیں، دو اسالیب اور دو ادوار کی درمیانی کڑی۔ کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے، یا آپ اپنے افسانوں کو اردو افسانے کے ارتقا میں کسی اور تناظر سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر رائے پوری :۔ آپ نے ابھی جو کہا، میں اس کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو منشی پریم چند زندہ تھے۔ مجھے ان سے ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا اور اگر آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں تو وہ میری تحریروں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میرے پاس ابھی تک ان کے بعض پرانے خط موجود ہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ میں اس وقت یورپ میں تھا۔ اس وقت تک میری بعض مشہور کہانیاں اردو اور ہندی میں چھپ چکی تھیں۔ منٹو نے ۱۹۳۰ء کے عشرے کے اواخر میں لکھنا

---

[1] سبط حسن صاحب نے اس الزام کی تردید فرمائی ہے۔ وہ اُن دنوں انڈر گراؤنڈ تھے ——— (صہبا)

شروع کر دیا تھا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں ان دونوں کے درمیان کوئی پُل کی حیثیت رکھتا تھا۔ پریم چند تو ظاہر ہے کہ ہم سے عمر میں بڑے تھے اور منٹو میرا ہم عصر تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے اور پسند کرتے تھے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے کا انداز مختلف تھا۔ میں نے بہت زیادہ کہانیاں نہیں لکھی ہیں اور جو لکھی ہیں وہ دو مجموعوں کی صورت میں اکٹھا ہو گئی ہیں: 'محبت اور نفرت' اور 'زندگی کا میلہ'۔ کچھ کہانیاں میں نے ہندی میں لکھی ہیں جو اردو میں شائع نہیں ہوئی ہیں کیونکہ جب میں ایک زبان سے دوسری زبان میں اپنی ہی تحریر کا ترجمہ کرنا چاہتا ہوں تو یہ کام میرے لیے بہت مشکل ثابت ہوتا ہے۔ میں اس سے اُکتا جاتا ہوں چنانچہ میری کچھ ہندی کہانیاں ایسی ہیں جو اردو میں شائع ہونے سے رہ گئی ہیں۔ اب افسانے میں نے جس زمانے میں لکھے ہیں . . . .

اگر میں ہندی میں اپنی ابتدائی تحریروں کو بھی شامل کر لوں تو میں نے ۱۹۳۳ء میں افسانے لکھنے شروع کیے اور ۱۹۴۵ء۔ یا ۱۹۴۶ء تک لکھتا رہا۔ تقسیم کے بعد میں نے شاید ہی کوئی افسانہ لکھا ہو۔ ان میں سے ایک تو ابھی تک نامکمل پڑا ہے اور مجھے پُرانے کاغذات ٹٹولنے پڑیں گے، لیکن میں اس کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ بہرحال ان افسانوں میں میں نے جو کام کیا ہے اور آپ بھی یہ محسوس کریں گے کہ میں نے خاصے تجربے کیے ہیں۔ اسلوب میں بھی اور تکنیک میں بھی۔ ان میں سے بعض کہانیاں ترقّی پسندانہ نقطۂ نظر کی حامل ہیں اور غالباً اردو میں پہلی ترقی پسند تحریر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے بعض کا ترجمہ یورپی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ 'محبت اور نفرت' کی بعض ابتدائی کہانیاں رومانوی انداز کی ہیں۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں ہم سب نیاز فتح پوری سے متاثر تھے اور یہ اثرات کافی عرصے تک برقرار رہے۔ جب نیاز فتح پوری نے اپنے رسالے 'نگار' میں میرا پہلا اردو افسانہ شائع کیا جس کا نام تھا 'زبانِ بے زبانی' تو ان دنوں میں علی گڑھ میں طالب علم تھا۔ یہ ۱۹۳۴ء کے آغاز کی بات ہے۔ میں زیبِ داستاں کا تو قائل نہیں ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس افسانے کی اشاعت نے اردو کی ادبی دنیا میں ہل چل مچا دی۔ نیاز فتح پوری نے اس افسانے پر ایک طویل ادارتی نوٹ لکھا۔ یہ بوڑھے برگد کے پیڑ کی کہانی ہے۔ رومانویت کے سیاق و سباق میں بھی یہ کہانی البیلے پن کی حد تک نئی تھی۔ میری بعض کہانیاں اسی نوعیت کی ہیں۔ مثال کے طور پر 'کافرستان کی شہزادی'۔ میں غالباً پہلا ہندوستانی ادیب تھا جو تقسیم سے پہلے چترال گیا تھا اور اس سفر نے مجھے یہ کہانی لکھنے پر اُکسایا۔ بعض نقادوں نے اس کہانی کا موازنہ ٹالسٹائے کے THE COSSACKS سے کیا ہے۔ اس کا فارسی اور تُرکی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ کام کی مقدار نہیں بلکہ معیار زیادہ اہم ہے۔ پھر میں جنگ کے خلاف لکھی جانے والی کہانی 'دل کا اندھیرا' کا بھی حوالہ دوں گا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی مہینوں میں یورپ کے ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ جن دنوں میں پیرس میں رہ رہا تھا۔ پھر ایک اور افسانہ 'سپاہی کی ٹانگ' ان سپاہیوں پر طنز ہے جو انگریز حکومت کی خاطر جنگ پر جا رہے تھے۔ تو اس طرح آپ دیکھیں گے کہ بعض کہانیاں جنگ کے خلاف بھی لکھی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر 'بیزاری' ہے جو جنگ کی تھکن کا تاثر پیش کرتی ہے کہ جنگ کا ہولناک ماحول کس طرح ایک حساس فرد کو مضمحل کر دیتا ہے کہ وہ انتشار اور ذہنی شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور پھر کچھ ایسی کہانیاں ہیں جنھیں آپ فی نفسہٖ ترقی پسند کہانیاں کہہ سکتے ہیں۔ 'مرگھٹ'، اور 'اندھا بھکاری'، وغیرہ۔ یہ اس زمانے میں بہت مقبول ہوئی تھیں اور ہندوستان کی کئی زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ حقیقت کہ ان کو اردو ہی میں نہیں، بلکہ اور زبانوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہ اس حقیقت کی غمّاز ہے کہ ان کی کچھ اہمیت ہے۔

سوال :۔ آپ نے ہندی سے لکھنے کا آغاز کیا، پھر اردو میں اپنی بعض اہم ترین تحریریں پیش کیں۔ آپ ایک ایسی دیو قامت شخصیت کی طرح ہیں جس کا ایک قدم ایک زبان پر ہے اور دوسرا قدم دوسری زبان پر۔ اور اس زمانے میں یہ دونوں متوازی حرکت کے ذریعے آگے بڑھنے کے بجائے ایک دوسرے سے دور ہٹتی چلی گئی ہیں۔ ایک ایسے ادیب کی حیثیت سے جس نے دونوں زبانوں میں لکھا ہے، آپ اس بڑھتے ہوئے فاصلے کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں ؟

ڈاکٹر رائے پوری :۔ مجھے اس بات پر بہت افسوس ہے، مگر یہ ہندو مسلم نفاق کے اندر مضمر تھی۔ اب میں اتنا عمر رسیدہ ہوں کہ مجھے یہ یاد ہے کہ یہ تنازعہ میری آنکھوں کے سامنے ہی کس طرح بڑھا۔ آپ یہ بات یاد رکھیے کہ بہت سے ہندو ادیب اور اہلِ دانش ہندی کی بہ نسبت اردو زیادہ بہتر طور پر جانتے تھے۔ اردو کے بہت سے اہم شاعر اور ادیب ہندو تھے۔ ان میں سے کچھ تو حالیہ زمانے تک لکھتے رہے ہیں، مگر ۱۹۳۰ء کے آس پاس سیاسی مسئلہ بن گیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن میں میں بھی شامل تھا، جو ایک مشترکہ ہندوستانی، زبان کی بات کرتے تھے۔ ہم میں سے بعض لوگ یہ یقین رکھتے تھے کہ اس فاصلے کو بڑھنے سے روکنا ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہندوستانی زبان کو ہندو مسلم اتحاد کی زندہ علامت کے طور پر فروغ دیا جائے۔ اس تحریک کے بانیوں میں پنڈت سُندر لال اور ڈاکٹر تارا چند جیسے لوگ شامل تھے۔ میں بھی انہی سے منسلک تھا۔ مجھے امید ہے کہ پنڈت سندر لال کا نام اس ملک میں مانوس اور قابلِ احترام سمجھا جاتا ہوگا کیوں کہ وہ نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے علم بردار تھے بلکہ بی، فارسی اور اردو کے بہت بڑے عالم بھی تھے۔ جنھوں نے اپنی تمام زندگی قومی اتحاد کے لیے وقف کر دی تھی۔ میں نے اتنے اعلا کردار کے بہت کم لوگ دیکھے ہیں۔ وہ جواہر لال نہرو کے ہم سبق تھے، تاریخ کے پروفیسر تھے اور انڈین نیشنل کانگریس کے سیکرٹری بھی تھے۔ مگر ہر چیز سے استعفیٰ دے کر قومی اتحاد کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ جب وہ "ہندوستان چھوڑ دو" والی تحریک کے زمانے میں جیل گئے تو مجھے ۱۹۴۲ء میں ان کے رسالے کی ادارت سنبھالنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ میں اس رسالے کا اعزازی مدیر تھا کیوں کہ میں امرتسر کے ایم۔ اے۔ او کالج میں پروفیسر تھا، خیر ایک طرف میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کی تقسیم ناگزیر ہو چکی تھی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ پسندیدہ (DESIRABLE) عمل بھی تھا۔ یہ ایک ایسے عملِ جراحی کی طرح تھا جو لازمی ہو چکا تھا۔ جب ملک تقسیم ہوا تو ہندوستانی، جو دونوں فرقوں کے درمیان نقطۂ اشتراک کی حیثیت رکھتی تھی، منظر سے غائب ہو گئی۔ حالاں کہ بات چیت کی زبان اب تک وہی ہے، مگر تحریری زبان مختلف ہو گئی۔ ہندی پر سنسکرت کا غلبہ بڑھتا گیا اور اردو پر عربی حاوی ہوتی گئی۔ اب وہ تمام کاوش جس کا مقصد سادہ اور قابلِ فہم زبان میں لکھنا اور تحریر و تقریر کی زبان میں فاصلے کو کم کرنا تھا، خاک میں مل کر رہ گئی۔

سوال :۔ آپ کی ادبی زندگی کا ایک عجیب پہلو بھی ہے کہ زبان میں تبدیلی کے علاوہ آپ نے ایک وقت میں لکھنا بالکل ہی ترک کر دیا۔ اس کی وجہ کیا یہ تھی کہ آپ اپنی ملازمت میں بہت مصروف تھے یا اس کا سبب WRITER'S BLOCK جیسی کوئی چیز تھی ۔

ڈاکٹر رائے پوری :۔ دونوں ہی باتیں ہیں۔ میں اپنی ملازمت کے کاموں میں مصروف تھا۔ پہلے وزارتِ تعلیم پاکستان میں اور پھر یونیسکو میں ان کے فرائض بہت ہی مشقت طلب تھے۔ ایک بات تو یہ تھی۔ اور پھر یہ کہ اپنے ملک سے فاصلہ بھی بہت تھا۔ لکھنے والے کو

اسی ماحول میں موجود رہنا چاہیے تاکہ وہ زبان کے احساس کو برقرار رکھ سکے، لیکن جیسا کہ آپ نے کہا، ایک قسم کی ذہنی بندش بھی تھی (MENTAL BLOCK) ذہنی بندش ان معنوں میں کہ سچ بتاؤں، میں بہت رنجیدہ ۔ ۔ ۔ ۔ DEPRESSED تھا۔ اب تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ان قوتوں کو دیکھ سکتا تھا جنھوں نے برصغیر کے لوگوں کو ایک دوسرے سے دور ہٹ جانے پر مجبور کیا۔ میں ان قوتوں کو تو دیکھ سکتا تھا، لیکن میرے سان دگمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنا کشت و خون اور اس قدر اکھاڑ پچھاڑ ہوگی۔ لاکھوں لوگ تہہ تیغ ہوجائیں گے اور لاکھوں خانماں برباد۔ یہ سب کچھ اس قدر دہشت ناک اور اس قدر کراہیت انگیز تھا کہ نہ پوچھیے۔ ہم مشرق کی روحانیت کا اتنا ذکر کرتے ہیں اور ہم پہ ایک سحر سا تھا ان چیزوں کا جنھیں ہم اپنی انسانی میراث، اپنی رواداری، اپنی امن دوستی اور عدم تشدد اور اسی قسم کے ناموں سے پکارا کرتے تھے، لیکن تقسیم کے وقت یہ سب چیزیں غائب ہوگئیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انسانی زندگی کے ساتھ کیا کچھ ہوا اور انسانی قدریں کس طرح پامال کی گئیں۔ جب ایک انسان دوسرے انسان کو قتل کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ انسانی قدروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اب اڑتیس برس گزر گئے، ایک پوری نسل جوان ہوگئی، اتنے سارے ملک آزاد ہو گئے اور ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کہ ملک تقسیم ہوجاتے ہیں۔ جنوبی ہند اپنے ایام گزشتہ میں بارہا تقسیم ہوا ہے اور پھر ایک ہوگیا ہے۔ ہندوستان وسیع و عریض سرزمین ہے اور اگر ایک علاقے کے لوگ مطالبہ کر رہے تھے کہ پاکستان ایک آزاد ملک بن جائے تو اس میں کیا قباحت تھی؟ لیکن بات یہ ہے کہ آزادی کا لفظ کوئی جادو کی چھڑی تو ہے نہیں۔ یہ آپ کو اپنے معاملات کے سنبھالنے کے لیے اور زیادہ ذمّے دار بنا دیتی ہے۔ اگر تیسری دنیا کے بعض ممالک اپنے حالات کو خود نہیں سنبھال سکتے تو اس کے لیے انھیں اپنے آپ ہی کو موردِ الزام ٹھہرانا چاہیے، دوسروں پر الزام تراشی نہیں کرنی چاہیے۔ اب رہی بات انسانی قدروں کی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک سانس میں آپ جنگ کی تیاری کریں۔ گویا ساری دنیا کو اس کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں ہے کہ فوجیں اور اسلحہ دیوانہ وار جمع کرتی جائے اور دوسرے سانس میں انسانی قدروں کی بات کریں۔ یہ دونوں چیزیں آپس میں کوئی میل نہیں رکھتیں کہ آپ تیاری تو کر رہے ہیں انسانوں کے قتل کی اور لب پہ ترانہ ہے انسانی عظمت کا۔ یہ سارا عمل ہی غیر انسانی (DE-HUMANIZATION) ہے۔

سوال :۔ کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ یہ DE-HUMANIZATION کا سارا عمل اس قدر ذاتی مسئلہ بن گیا کہ اس نے آپ کو لکھنے سے روک دیا۔؟

ڈاکٹر رائے پوری :۔ جی ہاں۔ یہ احساس آپ دیکھیے اور یہ ایمان اٹھ جانے کی سی کیفیت موجود تھی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ایسے واقعات بھی پیش آسکتے ہیں۔ اس سے قبل ہم پہلی اور دوسری عالمی جنگوں سے گزر چکے تھے جن میں بہت بے مقصد قتل و غارت گری ہوئی تھی اور بہت بڑے پیمانے پر ہوئی تھی۔ برسوں اس کا چرچا رہا۔ برس ہا برس تک، روزانہ ہم وہی جنگ و جدل کی باتیں سُن رہے تھے اور پڑھ رہے تھے اور جب یہ جنگ ختم ہوئی تو ہم نے ہندوستان کی نعمت پر خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ یہ آخر کار ایسا خطّہ ہے جسے ہم ساری دنیا کے سامنے نمونے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں کہ یہ ایسا امن پسند ملک ہے جہاں ہر عقیدے اور ہر نسل کے لوگ، اپنی غربت اور جہالت کے باوجود امن چین سے رہ سکتے ہیں، مگر ہوا کیا؟ ہم نے ملک کی تقسیم کا فیصلہ کر لیا۔ ہر شخص نے ملک کی تقسیم کا فیصلہ کیا اور کانگریس کے عہدے دار بھی اس فیصلے میں شریک تھے۔ یہ کہہ دینا کہ انگریز ملک کو تقسیم کر گئے، پوری طرح درست

نہ ہوگا اور پھر یہ بھی ہے کہ انھوں نے منصوبہ بنایا کیبنٹ مشن پلان کہ جس سے ملک متحد رہ سکے مسلم لیگ نے اسے قبول کرلیا مگر کانگریس نے رد کردیا۔ آخری تجزیے کے مطابق، کانگریس کو بھی اس فیصلے کی ذمے داری میں شریک سمجھا جائے گا۔ اور پھر ہوا کیا؟ تقسیم کا وہ منصوبہ سامنے آیا جس کو تمام پارٹیوں نے قبول کرلیا اور اس سے پہلے کہ اس معاہدے کے دستخطوں کی سیاہی خشک ہونے پاتی، تمام لوگ دیوانوں کی طرح ایک دوسرے سے دست وگریباں ہوگئے اور ایک دوسرے کے خون میں ہاتھ رنگنے لگے۔ کتنوں کی جانیں ضائع ہوئیں، اس کی صحیح تعداد بھی نہیں معلوم۔ کم از کم دس لاکھ تو ضرور مرے ہوں گے۔ لاکھوں اور گھر سے بے گھر ہوگئے۔ اس وقت انسانی قدروں کو کیا ہوا؟ اس وقت مذہب اور روحانیت کہاں گئے جن کا ہم ہر وقت نام لیتے رہتے تھے؟ ان الفاظ سے آخر ہمارا مطلب کیا ہے؟ اگر ہم اپنے آدرش کو اپنی روزانہ کی زندگی میں جگہ نہیں دے سکتے تو پھر ایسے آدرش کا فائدہ کیا ہے؟ چنانچہ اس چیز نے مجھے برسوں رنجیدہ وافسردہ رکھا۔ انسانی اقدار سے ایمان نہیں اٹھا، بلکہ جو سوال پریشان کیے رہا وہ یہ تھا کہ کیا بنی نوعِ انسان اپنے اخلاقی ارتقا کی اس منزل تک پہنچ گیا ہے جہاں وہ اپنے انسانی آدرش کے مطابق زندہ رہ سکے۔

سوال:۔ آپ نے ایک طویل عرصے تک فعال ادیب کی حیثیت سے کام کرنا تو بند کردیا، لیکن ذہنی پختگی کا عمل جاری رہا جس کا ثمرہ "گرد راہ" کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر رائے پوری:۔ جی، جی۔ اس تمام عرصے میں، میں وقتاً فوقتاً اردو اور انگریزی میں لکھتا رہا تعلیم کے بارے میں چند مضامین اور اسی قسم کی چیزیں۔ ادب میں میری دل چسپی زندگی بھر کا معاملہ تھی۔ میں نے کافی مطالعہ کیا ہے اس حد تک کہ میری آنکھیں متاثر ہوگئیں، لیکن جہاں تک تخلیقی ادب کا سوال ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ مجھے فرصت اور توجہ میسر آسکی ہے کہ میں اس کے تقاضے پورا کرتا۔ اس کی دو وجوہ تھیں، جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا۔ پہلی تو یہی رنجیدگی کا احساس۔ دوسرے یہ کہ سنجیدہ تحریر کُل وقتی توجہ چاہتی ہے۔

سوال:۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ "گرد راہ" میں آپ نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اس ماحول کو اجاگر کیا ہے جس میں آپ نے اپنی زندگی گزاری، لیکن آپ نے اپنے آپ کو عمداً پس منظر میں رکھا ہے اور کچھ ایسے ذاتی پہلو تھے جن کے ذکر سے آپ نے گریز کیا ہے۔ تو آپ نے یہ حکمتِ عملی کس وجہ سے اختیار کی؟

ڈاکٹر رائے پوری:۔ یہ درست ہے کہ میں نے شخصیات اور واقعات کے بارے میں زیادہ لکھا ہے اور اپنے بارے میں کم۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ پہلی تو ایک فطری تامّل ہے۔ میں اپنے بارے میں باتیں کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور نہ اپنی تحریروں کے بارے میں۔ مجھے اس وقت بڑی شرمندگی ہوتی ہے جب لوگ میری موجودگی میں میری تعریف کرنے لگتے ہیں۔ یہ تو ایک بات ہے۔ دوسرے یہ کہ میں نے اس مسئلے پر اس وقت بھی سوچا جب میں یہ کتاب لکھ رہا تھا۔ یہ مسئلہ ہے لکھنے والے اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان ابلاغ کا۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ اس کو اردو کا قاری کس حد تک برداشت کرے گا۔ یورپ میں صورتِ حال مختلف ہے۔ ادیب اپنے آپ کو عوام الناس کی نظر کے سامنے برہنہ کرسکتا ہے۔ یہاں ذاتی انکشافات بہت سی غلط فہمیوں کا سبب بن سکتے ہیں۔ مجھے اس پہلو کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا تھا۔ اگر میں نے زیادہ برہنہ گفتاری سے کام لیا ہوتا تو شاید کتاب چھپ ہی نہ پاتی۔ شاید پھر بہت سے غیر ضروری جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوتے۔ تو یہ دو باتیں تھیں۔ ہاں آپ مجھ سے یہ پوچھ سکتے

ہیں کہ میں زیادہ بھی لکھ سکتا تھا۔ ہاں میں یقیناً زیادہ لکھ سکتا تھا۔ میری مشکل یہ تھی کہ میری بینائی اس وقت جواب دے گئی جب مسودہ نامکمل تھا۔ مجھے کوئی ایسا شخص نہیں مل سکا جو ایک خاص مدت کے لیے اس کی تحریر میں میری مدد کرتا۔ اگر مجھے کوئی سیکریٹری مل جاتا، جس طرح یورپ کے ادیبوں کے پاس سیکریٹری ہوتے ہیں، تو بہتر ہوتا۔

سوال:۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کتاب ادھوری تو نہیں رہی، لیکن کچھ باتیں ان کہی رہ گئی ہیں۔

ڈاکٹر رائے پوری:۔ جی ہاں۔

سوال:۔ اس گفتگو کو سمیٹنے کے لیے کیا آپ اردو ادب کی موجودہ حالت کے بارے میں کوئی تبصرہ کرنا پسند کریں گے؟

ڈاکٹر رائے پوری:۔ میں نے یہ بات بارہا کہی ہے اور سب لوگ جانتے بھی ہیں کہ اردو ادب کی سب سے زیادہ قیمتی متاع شاعری ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ادبی تخلیق سائنسی ایجادوں کی طرح نہیں ہے۔ ادب میں کوئی گارنٹی نہیں ہوتی کہ آئندہ زمانے میں اس سے بہتر شاعر ہوں گے۔ اگر مجھے ایک مثال استعمال کرنے کی اجازت دیں تو ادب اونچے پہاڑوں کے ایک سلسلے کی طرح ہے۔ پہاڑوں کا بڑے سے بڑا سلسلہ بھی کہیں نہ کہیں سے تو شروع ہوتا ہوگا اور کہیں نہ کہیں اس کی سب سے اونچی چوٹی ہوگی۔ شیکسپیئر عظیم ترین ڈراما نگار ہے جس نے کوئی چار سو برس قبل ڈرامے لکھے تھے اور ہم یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ اس سے بڑا ڈراما نگار کوئی پیدا ہوگا یا حافظ اور میر سے بہتر غزل گو پیدا ہوگا، یا ٹالسٹائی سے بڑا ناول نگار۔ سائنس میں تو خیر ایسا ہوتا ہے کہ ایک سے بڑھ کر ایک ایجاد ہوتی ہے۔ اردو کا معاملہ یہ ہے کہ ہم نے نثر پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ ظاہر ہے کہ اردو نثر کی تاریخ سے میری مراد سنجیدہ نثر سے ہے۔ سر سید احمد خاں سے شروع ہوتی ہے، کوئی سو برس قبل، اور یہ ظاہر ہے کہ نسبتاً مختصر عرصہ ہے، لیکن جب ہم اردو نثر کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم چند ایک اچھی کہانیاں چن سکتے ہیں۔ شاید بارہ بیس اچھے ناول، ڈراما تو کوئی نہیں، چند سوانح اور آپ بیتیاں اور بس۔ یہی ہے کل متاع اردو نثر کی ہے۔ تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اردو کے ادیبوں کو اور ناشروں کو اردو نثر کی اس قلت کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ آپ کسی ذہین پڑھنے والے سے پوچھیے۔ وہ اردو نثر میں اچھی چیزوں کی کمی پر مایوسی کا اظہار کرے گا۔ اب ایک عام، چلتی ہوئی غزل لکھ لینا بہت آسان ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ غزل کیا ہے اور دس بارہ شعر قافیے کے حساب سے لکھ دیے۔ کوئی بھی گلوکار کسی بھی تیسرے درجے کی غزل کو اٹھا کر ریڈیو اور ٹی وی سے گانا شروع کر دیتا ہے اور وہ مقبول ہو جاتی ہے۔ یہی ہوتا ہے، مگر اس کی کوئی ادبی قدر و قیمت نہیں ہے۔ یہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ یہ چیز چونکہ گائی جا رہی ہے اس لیے مقبول ہو رہی ہے۔ اس کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہے۔ ادب میں اگر آپ بین الاقوامی معیار تک آنا چاہتے ہیں تو شاعری کے ساتھ ساتھ آپ کو نثر پر بھی توجہ دینی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افسانہ اور سوانح اور ڈراما اور دیگر علوم پر سنجیدگی سے کام کرنا ہوگا۔

تبصرے۔ تذکرے
صفحہ ۲۸۹ سے آگے

ماخذ بھی۔ کتاب میں کہیں خود نمائی اور تعلّی کا انداز نہیں ملتا، اسلوب شگفتہ اور رواں ہے۔

مکتبۂ افکار کراچی نے یہ کتاب بے حد خوب صورت انداز میں شائع کی ہے۔

(سالنامہ "اوراق" لاہور (اکتوبر۔ نومبر ۱۹۸۵ء)

ارمغانِ مجنوں

جلد دوم



صفحات: ۵۹۲

قیمت: پچاسی روپے

مرتب

صہبا لکھنوی
شبنم رومانی

ملنے کا پتہ:

مجنوں اکیڈیمی

معرفت ماہنامہ افکار، رابسن روڈ، کراچی

مجنوں گورکھپوری کی زندگی، شخصیت اور فن پر دستاویزی کتاب

ڈاکٹر آغا سہیل • شبنم رومانی • حسن عابد • صہبا لکھنوی

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے گفتگو

ڈاکٹر آغا سہیل: ہم یہاں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب کی خدمت میں حاضر ہیں اور میرے ساتھ صہبا لکھنوی، شبنم رومانی اور حسن عابد شریکِ گفتگو ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت، اس برصغیر میں نہایت اہم وقیع اور معتبر ہے۔ کئی اعتبار سے، ادبی لحاظ سے بھی اور تنقید کے میدان میں بھی، اور یہ کہ برصغیر کی جو تاریخ ہے اس میں بھی آپ کی شخصیت نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ بعض اوقات بڑی خاموشی سے اور اب اس اعتبار سے بھی یہ شخصیت بہت اہم ہے کہ بہت کم لوگ ایسے رہ گئے ہیں جو ہمیں اُن باتوں کے متعلق بتا سکیں جو تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ ادب میں تاریخ کے جو محرکات اور عوامل کام کرتے ہیں اور دانش و بینش کی جو سطح قایم ہوتی ہے اس میں ادب، اور ادب کے پیچھے جو بعض عالم ہوتے ہیں اُن کی شخصیت عالمانہ ہوتی ہے اور وہ خاص پیڈیسٹل سے گفتگو کرتے ہیں اور ایک خاص ویژن سے وہ دیکھتے ہیں اور اُن کا ایک خاص ذہنی اُفق ہوتا ہے، تو اس حوالے سے ہم بہت سی باتیں یہاں پر دریافت کریں گے اور معلوم کریں گے۔ ابھی حال ہی میں ڈاکٹر صاحب کی ایک کتاب "گرد راہ" کے نام سے آئی ہے جو بالاقساط ماہنامہ افکار، کراچی میں چھپتی رہی اور اس کے بعد صہبا لکھنوی صاحب نے اُسے زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ اس کتاب نے برصغیر کے علمی اور ادبی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا کئی اعتبار سے اور بہت سی سطحیں ایسی قایم ہوئی ہیں کہ جس پر میں سمجھتا ہوں کہ گفتگو ہونا چاہیے اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن پر ہم مزید استفادہ کر سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب سے۔ اس سلسلے میں ہم چند سوالات کرنا چاہتے ہیں اور ان سوالات کی جو نوعیت ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہمارے قارئین بھی جب اس کتاب کو پڑھیں یا ان میں سے بعض قارئین پڑھ چکے ہیں تو اُن کے ذہن میں جو کہیں کہیں پر خلا ہے یا ابہام رہ گیا ہے تو وہ ذرا واضح ہو جائے۔ اس سے تفہیم میں آسانی ہوگی تو ڈاکٹر صاحب کیا اجازت ہے کہ میں چند سوالات آپ سے اس کتاب کی روشنی میں کروں۔ سب سے پہلے میں گزارش کرتا ہوں کہ اس کتاب میں آپ نے بیس، چیپٹر شامل کیے ہیں اور اگر ہم دیباچے کو بھی شامل کر لیں تو یہ بجائے خود اکیسواں، چیپٹر بھی ہے۔ دیباچہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ آپ نے اس کتاب کے تمام مباحث کو اور ان کے عنوانات کو سمیٹ کر اپنے نقطۂ نظر کو اس میں واضح کر دیا ہے، لیکن ہم آخر میں اس کے بارے میں آپ سے استفادہ کریں گے۔ سب سے پہلے پہلا چیپٹر جس میں آپ کی زندگی کے ابتدائی سال، اس میں آپ کا ننھیال۔ رائے پور آپ کی تعلیم آپ کا آبائی مکان، آپ کا ہندی ادب سے اور اردو ادب سے رشتہ اور اس سے شغف اور اسی سلسلے میں بسنت کمار کی معیت میں سادھوؤں کے ساتھ جو آپ نے کچھ مکالمے کیے ہیں اور ایک خاص علاقے میں آپ نے اقامت بھی اختیار کی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ آبائی زمینوں کا حال بھی درج فرمایا ہے اور

جب آپ یہاں سے، اس ماحول سے نکل گئے ہیں تو گھر کی یادوں نے کس طرح آپ کو ہانٹ کیا ہے۔ یہ تمام باتیں آئیں گی۔ میں یہاں اپنی سہولت کے لیے اور اپنے قارئین کی آسانی کے لیے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ جس عمر سے آپ اُس وقت گزرے ہیں آج کی ایک اصطلاح ہے "ایڈولیسنس پیریڈ" اس سے ہمارے تمام اسکول گوئنگ بچے گزرتے ہیں، لیکن یہی بہت سینسیٹو زمانہ ہوتا ہے اور اسی میں ذہن بنتا ہے یا بگڑتا ہے اور شخصیت بنتی ہے یا بگڑتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوئی چیز تو اُس وقت آپ کے سامنے نہیں تھی۔ ماحول آپ کا سازگار تھا۔ اس نے بڑی معاونت کی آپ کے ساتھ، لیکن اس کے باوجود آپ غیر معمولی طالب علم اور غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے شروع ہی سے اس کے کچھ اور بھی اسباب ہیں جو آپ نے لکھے ہیں اس کے علاوہ۔

اختر حسین: اب جو میں غور کرتا ہوں اپنی ابتدائی زندگی پر تو مجھے یاد آتا ہے کہ جس چیز نے مجھے بچپن ہی سے غور و فکر کی طرف راغب کیا وہ میری تنہائی تھی کیونکہ آپ کو اندازہ ہوا ہوگا اس باب کے مطالعے سے کہ میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا جب میں تین سال کا تھا اور میرے والد بیشتر باہر رہتے تھے اور میری پرورش ایک پرانی آیا کے سپرد تھی اور میرے بھائی جو مجھ سے عمر میں چند سال بڑے تھے ایک شاعر تھے اور وہ باہر ہی رہتے تھے۔ اُن کا مزاج ہی کچھ اور تھا۔ تو میرے اس ماحول نے شروع سے ہی غور و فکر کی عادت پیدا کر دی تھی جو پہلے تو مطالعے سے ہوئی، کچھ کتابیں پڑھ کر لیکن طبعاً میں کچھ خلوت پسند تھا اور تنہائی کا عادی ہو گیا تھا اور اس کے بعد میں اگر کہوں کہ یہ سچ ہے کہ میں نے ہمیشہ روحانی تنہائی محسوس کی اس غور و فکر کی عادت کے ساتھ۔ میں اپنے حالات کے متعلق اتنا نہیں سوچتا تھا بلکہ اپنے ماحول اور کائنات کے متعلق اور کچھ چیزوں کے بارے میں سوچتا تھا جن سے کہ ذہن میں رسائی پیدا ہوتی تھی۔ اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھیل کر ان سے باتیں کر کے مجھے تشفی نہیں ہوتی تھی۔ ان سے میں کچھ سیکھتا نہیں تھا اور میرا یہ جی چاہتا تھا کہ کچھ سیکھوں کیوں کہ شروع سے ذہن میں ایک جستجو تھی اور کچھ جاننے کی طلب تھی اور اسی وجہ سے کم عمری میں ہی اپنی عمر سے زیادہ میں نے سیکھا اور جتنا سیکھتا گیا اُتنی ہی زیادہ علم کی جستجو بڑھتی گئی اور یہی وجہ تھی کہ جب میں سولہ[17] سال کا تھا اور جب میرے والد نے مجھ سے یہ کہا کہ والدہ کی جو جائیداد ہے اس کی ذمے داری تم سنبھالو تو لوگوں نے مجھے سمجھایا، مجھ سے یہ کہا کہ جائیداد اتنی ہے کہ تم آرام سے رہ سکتے ہو اور اس کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو جائیداد تباہ ہو جائے گی، لیکن مجھے کبھی جائیداد سے دلچسپی نہیں رہی۔ میرے لیے علم کی جستجو ہی زندگی کا ماحصل رہا اور اب بھی اس کو ماحصل سمجھتا ہوں۔ زندگی کو میں نے اس ترازو پر نہیں تولا جس سے عام طور پر زندگی کو تولا جاتا ہے۔ اب علم کی جستجو ہے وہ تو ایک بحر بے کراں کی جستجو ہے اور کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے جو کچھ بھی ڈھونڈھا تھا اُسے پالیا، لیکن بہر صورت یہ سفر ایسا ہے کہ اس سفر میں ہی سارا لطف ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں ہے، یہ تو سفر ہے ایک فرد ہی کیا پوری انسانیت ہی یہ سفر کر رہی ہے اور اگر تاریخ کے حوالے سے دیکھا جائے کہ انسانیت نے ابھی اس سفر کی پہلی منزل بھی نہیں طے کی ہے تو فرد کیسے دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے سفر میں کچھ حاصل کر لیا ہے، لیکن یہی بڑی بات ہے کہ کسی فرد نے اس سفر کا تہیہ کیا اور اس نے تگ و دو کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی زندگی کا ماحصل ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے یہ راستہ اختیار کیا۔

غا سہیل: ڈاکٹر صاحب اب جب ایک منزل پر پہنچنے کے بعد آپ نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کے ساتھ ساتھ اب جو آپ کا پیڈسٹل ہے وہ کچھ اور ہے اور اس جگہ سے آپ دیکھ رہے ہیں اُس مقام کو جو آپ کا بچپن بھی ہے اور آپ کے بچپن کے ساتھ ساتھ جو چیز سمٹ رہی ہے وہ تاریخ ہے۔ تاریخ کو بھی آپ دیکھ رہے ہیں۔ تاریخ میں یہ ہے کہ آزادی کی تحریکیں شروع ہو چکی ہیں اور بہت سی شخصیتیں سامنے آئی ہیں، اُن کو بھی آپ نے دیکھا ہے اُس وقت جو آپ نے لبنت کمار کے ساتھ سادھوؤں کی زندگی کا مطالعہ کیا تو اس میں آپ نے کیا یہ محسوس کیا کہ یہ معاشرے سے تھوڑے سے کٹ جاتے ہیں اور آپ کے سفر کا جو راستہ ہے وہ یہ نہیں ہوگا۔

اختر حسین: بے شک یہ میں نے اُسی وقت محسوس کیا تھا کہ حقیقت کو انسانوں سے الگ ہٹ کر تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت کی تلاش کا جواز یہی ہے کہ اس سے معاشرے کی کچھ بہتری ہو اور انسانیت اس سفر میں کچھ اور آگے بڑھ سکے۔ یہ تو میں نے اُسی وقت محسوس کیا تھا۔ اب آپ اگر یہ پوچھیں کہ زندگی گزارنے کے بعد آج میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ اس صدی میں اور بیسویں صدی میں شروع سے لے کر اب تک انسانیت نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ اگر یہ سوال آپ پوچھیں تو میں اس کا جواب اس طرح دوں گا کہ تاریخ میں بیسویں صدی میں جتنی بڑی تبدیلیاں ہوئیں ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئیں اور یہ تبدیلیاں ہمہ جہت ہیں۔ آپ دیکھیں کہ معاشرے میں کتنی بڑی تبدیلی آگئی ہے اور آزادی کا تصور جس طرح سے بدلا ہے، بادشاہت کا تصور ختم ہوا کتنی سلطنتیں ختم ہوئیں۔ آج سے پچاس سال پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مغربی امپریلزم اس طرح سے ختم ہو جائے گا یا اشتراکیت کو اتنا زیادہ فروغ حاصل ہوگا یا اتنے ملک دیکھتے ہی دیکھتے آزاد ہو جائیں گے یا آزادیِ نسواں کی تحریک اس طرح چل پڑے گی۔ آپ کو علم ہوگا کہ بیسویں صدی کے آغاز میں کئی مغربی ممالک میں بھی عورتوں کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا حتیٰ کہ کئی مغربی ملکوں میں عورتیں بنک میں اپنا اکاؤنٹ نہیں کھول سکتی تھیں، لیکن وہ تحریک جو ہے اُس نے ہمارے دیکھتے دیکھتے بڑا فروغ حاصل کیا۔ پھر اگر تعلیم کے حوالے سے آپ دیکھیں تو اس صدی کے آغاز میں فلسفۂ تعلیم کا محور استاد تھا، بچہ نہیں، شاگرد نہیں تھا۔ اب وہ فلسفہ ہی بدل گیا ہے۔ اب یہ سمجھا جاتا ہے کہ تعلیم شاگرد کی خاطر ہے اور استاد ایک وسیلہ ہے تعلیم کو منتقل کرنے کا۔ تو تعلیم کو لیجیے یا ابلاغِ عامہ کو لیجیے یہ جو ہے ماس میڈیا اس نے اتنی بڑی تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ اس کا براہ راست اثر ادب پر اور فکر پر اور علم پر اور ہر چیز پر ہوا ہے اور یہ جو ٹی وی، ریڈیو، فلم اور رسل و رسائل کی سہولتیں ہو گئی ہیں یہ ہوائی جہازوں میں تو اب فاصلے کا تصور ہی بدل گیا ہے بلکہ مٹ گیا ہے۔ ایک تو یہ بڑی تبدیلی ہو گئی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا یہ ردِّ عمل ہوا ہے کہ فرد اور فرد میں فاصلہ بڑھ گیا ہے اور ان تبدیلیوں کا مجموعی ردعمل اس طرح ہوا ہے کہ فرد اپنی ذات میں سمٹتا جاتا ہے۔

آغا سہیل: یہیں کہیں ادب میں شاید 'ایلی اینیشن' کا تصور پیدا ہوا ہے!

اختر حسین: ہمارے یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ مغرب میں تو بہت زیادہ ہے۔ اب آپ ایک ہی اپارٹمنٹ ہاؤس میں سال ہا سال رہیے، لیکن اپنے پڑوسی سے آپ کا کبھی تعارف نہیں ہوگا۔ میں اپنا ذاتی تجربہ بتلاؤں کہ میں پیرس میں مدتوں رہا ہوں تو کبھی وہاں کسی پڑوسی کا انتقال ہو گیا لیکن اُس کے ورثا سے تعارف اس کے جنازے پر ہوا۔ اب معاشرے میں ذاتی تعلق ختم ہوتا جا رہا ہے اور فرد اپنی ذات میں سمٹتا جاتا ہے۔ وہ خود اپنی ذات کو کسی حد تک سمجھتا ہے یہ کہنا بھی مشکل ہے۔ کیا اتنی فرصت اُسے ملتی ہے کہ وہ اپنے کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ وہ حالات کے دھارے پر بہتا جاتا ہے اور بالکل بے بس ہے یعنی ایک طرف تو اتنی بڑی آزادی ہے، لیکن دوسری طرف انسان اتنا بے بس ہے۔ حالات کے شکنجے میں اتنا بے بس ہے کہ اُسے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ اپنی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اپنے حالات کو سمجھنے اور ان پر قابو حاصل کرنے میں ہی اتنا وقت گزر جاتا ہے کہ وہ اپنے کو نہیں سمجھ پاتا۔

شبنم رومانی: ڈاکٹر صاحب یہ جو مغائرت یا 'ایلی انیشن' کا ذکر کیا جاتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ کچھ عوامل اور اسباب تو ہمارے یہاں پیدا ہوئے ہیں، لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے باہر سے اسے امپورٹ کر لیا ہے، مفروضے قائم کر لیے ہیں اور خواہ مخواہ اس چیز کو ہوا دے رہے ہیں۔

اختر حسین: میرا خیال ہے کہ یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ باہر سے آئی ہے۔ یہ معاشرے کی تبدیلی ہے۔ ہم مشرق اور مغرب کا جو ذکر کرتے ہیں سچ پوچھیے

تو مشرق اور مغرب جغرافیے کی ایک حقیقت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بنیادی طور پر یہ فرق ہے مشرق اور مغرب کا کہ ایک زراعتی سماج ہے اور ایک صنعتی سماج ہے۔ یعنی اب جاپان کو لیجیے کہ یہ ایک ایشیائی ملک ہے لیکن معاشی اور معاشرتی اعتبار سے وہ اب مشرق کا حصہ نہیں رہا وہ مغرب کا حصہ ہے۔

شبنم رومانی: کلچرلی تو وہ خالصتاً مشرقی ہے۔

اختر حسین: کلچر کی تعریف بڑی مشکل چیز ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ انھوں نے اپنا رہن سہن نہیں بدلا، کھانے پینے کا طریقہ بھی وہی پُرانا ہے۔

شبنم رومانی: آخر یہ دو انتہائیں کیسے یک جا ہو گئیں۔!

اختر حسین: لیکن ان کا ذہن ان معنوں میں، روایتی مشرقی ذہن نہیں ہے۔ اصل چیز ذہن ہے لباس یا میز کا دسترخوان اتنا اہم نہیں ہے۔ اصل چیز تو ذہن ہے کہ آپ سوچتے کس طرح ہیں اس پر عمل کس طرح کرتے ہیں!

حسن عابد: آپ کی حیثیت ماہر تعلیم کی ہے تعلیمی اداروں سے متعلق رہے ہیں ہمارے یہاں گریک دور میں جو بچوں کی تربیت ہوتی تھی کہ ایک خاص وقت تک کچھ موسیقی سیکھیں پھر کھیل کھیلتے تھے اور اس سے جسمانی لحاظ سے فٹ ہوتے تھے۔ اُن کے جو علوم تھے اُن کی وجہ سے اس وقت جو آدمی نکلتا تھا اس کی جامع حیثیت ہوتی تھی۔ آج کا دور اسپیشلائزیشن، کا دور ہے تو کیا اس چیز نے فرد کی شخصیت کو محدود نہیں کیا۔!

اختر حسین: آپ صحیح فرماتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کو آپ الگ نہیں کر سکتے۔ تعلیم، تعلیم گاہ میں دی جاتی ہے، لیکن تربیت گھر میں ہوتی ہے۔ جب تک گھر کے ماحول اور تعلیم گاہ دونوں میں ارتباط نہیں ہوگا یہ تعلیم نامکمل سی رہ جاتی ہے۔ اور تعلیم گاہ میں ہر چیز نہیں سکھائی جاتی، کئی چیزیں گھر میں سکھائی جاتی ہیں اور گھر کے ماحول پر بہت کچھ منحصر ہوتا ہے اور یہ بات تعلیم سے بڑھ کر اخلاق تک پہنچتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہت سی قدریں بہت اہم ہیں۔ اِن قدروں کا زوال ہماری نظر کے سامنے ہے۔ قدروں کی شکست و ریخت ہو رہی ہے۔ ہمارے بچپن میں یہ بات نہیں تھی۔ یورپ میں ایک صدی سے زیادہ کا وقفہ گزرا ہے جب کہ یہ تبدیلیاں ہوئیں۔ وہاں کا انسان اتنی تیزی سے نہیں بدلا، آہستہ آہستہ بدلا ہے۔ ہمارے یہاں ۱۹۴۷ء سے اب تک اڑتیس ۳۸ سال ہوئے، ایک ہی نسل ابھی گزری ہے۔ اڑتیس سال میں اتنا بڑا فرق آگیا۔ یورپ میں ہم روایتوں اور قدروں کا ذکر کرتے ہیں، اخلاق کا ذکر کرتے ہیں اور خلوص سے کرتے ہیں۔ حکومت بھی چاہتی ہے، معاشرہ بھی چاہتا ہے کہ وہ قدریں باقی رہیں مگر صرف چاہنے اور خواہش کرنے سے کوئی چیز نہیں بدلتی۔ یہ سب ضروری عمل ہے اور اس کے لیے بہت ہی ضروری ہے کہ گھر کے ماحول میں اور تعلیم گاہ دونوں میں ارتباط ہو۔

آغا سہیل: یہ بڑی اچھی گفتگو ہو رہی ہے مگر میں چاہتا یہ ہوں کہ کتاب کے حوالے سے گفتگو زیادہ ہو اور اسی پر ہم کنسنٹریٹ، کریں۔ یہ پہلا چیپٹر جو تھا اس کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے بڑی اچھی باتیں کیں۔ اب دوسرا چیپٹر جو ہے وہ کلکتے میں آپ کے قیام سے متعلق ہے اور اس میں آپ کو اردو، انگریزی اور ہندی کے اخباروں اور اُن کے ذمے دار لوگوں سے واسطہ بھی پڑا۔ بڑے اچھے اچھے صحافی بھی آپ کو وہاں ملے اور لیڈر بھی اُس زمانے میں بہت سے موجود تھے اور کانگریس اور مسلم لیگ کی کچھ چپقلشیں چلتی ہیں وہ بھی آپ کے سامنے آئیں۔ جمہوریت اور اشتراکیت کے جو سلسلے قایم ہوئے وہ بھی سب کے سامنے ہیں تو یہ اس برِصغیر کی تاریخ کا ایک بہت اہم حصہ ہے۔ آپ نے مولانا ابوالکلام کو بھی اسی زمانے میں پہلی بار دیکھا، بہت قریب سے دیکھا بلکہ اس کا حوالہ بھی دیا۔ بعد کو دلّی میں بھی اُن سے رابطہ

قایم ہوا تو یہاں پر آپ نے کیا یہ محسوس کیا کہ کلکتے کی جو زندگی ہے وہ باقی برصغیر کی اجتماعی زندگی کا ایک جو تصور قایم ہوتا ہے اس سے مختلف ہے کیوں کہ ۱۷۵۷ء سے کلکتہ جو تھا وہ مستقر بن چکا تھا ایسٹ انڈیا کمپنی کا اور یہاں پر کچھ بیداری پہلے محسوس ہوئی۔ باقی برصغیر جو تھا وہ کافی عرصے تک اس سے کٹا رہا تو وہ کون کون سے رجحانات تھے جن کو آپ نے وہاں جاکر یہ محسوس کیا کہ آپ کا ذہنی اُفق تیزی سے پھیلا ہے جس نے گویا یہ احساس دلایا ہے کہ ہم دوسرے لوگوں سے زیادہ مختلف ہیں۔

اختر حسین : کلکتہ آج سے پچاس ۵۰ سال قبل تک برصغیر کا سب سے بڑا صنعتی اور تجارتی شہر ہی نہیں بلکہ سب سے بڑا ثقافتی مرکز بھی تھا۔۔ ہندوؤں کا بھی اور مسلمانوں کا بھی، یعنی آپ ادب ہی کے میدان میں ان ناموں کو یاد کریں۔ ابوالکلام آزاد، آغا حشر کاشمیری، نواب نصیر حسین خیال، وحشت کلکتوی، آرزو لکھنوی یہ سب کلکتے میں ہی رہتے تھے اور سیاست کا تو وہ بہرصورت بڑا اہم مرکز تھا۔ یہ میں ذکر کر رہا ہوں ۱۹۳۶ء - ۱۹۳۷ء سے پہلے کے کلکتے کا۔ اُس وقت مسلم لیگ اتنی فعال نہیں تھی البتہ اُس وقت جو تحریک چل پڑی تھی، اشتراکی تحریک اُس کا مرکز کلکتہ بن رہا تھا کہ وہ صنعتی شہر تھا، مزدور ٹریڈ یونینز تھیں۔ اس پس منظر پر آپ غور فرمائیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی سیاست کا سب سے اہم موڑ وہ ہے جب بنگال کی تقسیم ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے کی۔ وہیں سے کانگریس کی تحریک، ہندوؤں اور مسلمانوں کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ بنگال کی تقسیم کی مخالفت ہندو زمینداروں نے کی تھی جن کا مرکز کلکتہ تھا، لیکن انھوں نے مخالفت یہ کہہ کر کی تھی کہ یہ ہندوستان کی قومیت پر ضرب ہے حالانکہ ان کے مفاد پر یہ ضرب پڑ رہی تھی۔ لارڈ کرزن نے اپنے 'میماٹرز' میں یہ لکھا ہے۔ لارڈ کرزن کو فارسی سے بڑا شغف تھا اور مسلمانوں کی تہذیب سے بھی شغف تھا۔ وہ امپریلیسٹ تھا۔ جب اُس نے اندرونِ بنگال کا دورہ کیا اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا اُسے احساس ہوا تو اس نے یہ دیکھا کہ سب سے زیادہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان اپنی زمینوں سے اور اپنی جائداد سے بے دخل کر دیے گئے ہیں اور اُن کی حیثیت اب معمولی کسانوں سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اور زمیندار اور مہاجن سب ہندو ہیں۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اگر بنگال کو تقسیم کر دیا جائے اور مشرقی بنگال کو الگ کر دیا جائے تو مسلمانوں کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ یہ چیز تھی اور اس کے تحت اس نے بنگال کو تقسیم کیا تو اب وہ تحریک جو شروع ہوئی تقسیمِ بنگال کی مخالفت ہندو زمینداروں نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے کی اور مسلمانوں نے مسلم لیگ بنالی۔ ڈھاکہ میں اس کا پہلا سیشن ہوا اور اس کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ تقسیمِ بنگال کو منسوخ نہ کرنے دیا جائے اور مشرقی بنگال کی انفرادیت باقی رہے، یہ ایک بڑا مقصد تھا مسلم لیگ کے قیام کا۔ اب جو تقسیمِ بنگال کی مخالفت شروع ہوئی تو وہ صرف کانگریس کے پلیٹ فارم تک محدود نہیں رہی بلکہ دہشت پسندی کی تحریک بھی شروع ہوگئی اور اس تحریک کا پہلا مقصد تو یہ تھا کہ تقسیمِ بنگال کو منسوخ کیا جائے لیکن پھر اس نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ انگریز کی مخالفت اور امپریلزم کی مخالفت کی تحریک چل پڑی۔ یہ تھا سیاسی پہلو۔ اب کلکتہ جو ہے وہ اس زمانے میں سیاست کا ایک بڑا مرکز تھا اور ثقافت کا بھی۔ اگر میں کہوں تو صحیح ہے کہ بنگالی ادب اُس زمانے میں ہندوستان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ادب تھا اور شاید اب بھی ہے کیوں کہ ٹیگور، نذرالاسلام وغیرہ سب وہیں تھے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ جب میں رائے پور سے نکلا تو کلکتے گیا اور کلکتے میں میری ذہنی پرورش ہوئی۔ میں اگر عام طالب علم کی طرح کالج میں پڑھتا اور گھر آکر آموختہ یاد کرتا تو مجھے شاید یہ فائدہ نہ ہوتا۔ چونکہ میں اخباروں سے منسلک رہا اور صحافیوں سے منسلک رہا اور اس زمانے کی سیاست اور ثقافت کے میدان میں کئی اہم لوگ تھے انھیں دیکھنے کا، اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا، اس سے میرے ذہن کے بہت سے اُفق روشن ہوئے۔

آغا سہیل: ڈاکٹر صاحب ایک بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ برصغیر میں لوگوں میں بیداری اور بطور خاص مسلمانوں کی بیداری گو اس کا تعلق کبھی کسی حد تک کلکتے سے ہے یعنی اگر ہم تاریخ میں پیچھے کی طرف ذرا آپ کو لے جاؤں تو ۱۷۵۷ء میں جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگالے پر قبضہ کر لیا وہ ہوگیا۔ واقعتاً تو ابھی باقی علاقوں میں وہی مغلوں کی حکومت تھی اور وہ ایک زوال پذیر معاشرہ تھا کئی اعتبار سے اس میں 'انحطاط' ہو رہا تھا۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ کلکتے کا سفر غالب نے کیا تو وہ زمانہ تھا ۲۶-۱۸۲۵ء کا۔ اس کا مطلب یہ کہ کافی زمانہ گزر چکا تھا ۱۷۵۷ء کے بعد سے۔ غالب جب وہاں گئے تو انھوں نے وہاں کافی تبدیلیاں محسوس کیں جو باقی علاقوں میں نہیں تھیں۔ دلّی میں نہیں تھیں، لکھنؤ میں نہیں تھیں ـــــ وہ ایک زوال پذیر معاشرے سے آئے تھے اُن کو احساس ہوا کہ وہ بالکل مختلف معاشرہ ہے۔ اس کے بعد جب غالب واپس گئے ہیں تو کچھ عرصے کے بعد ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج قایم ہوتا ہے۔ دہلی کالج میں ایک صاحب تھے ماسٹر رام چندر یہ پہلے ہندو تھے بعد کو عیسائی ہو گئے تھے۔ دہلی کالج کے نصاب میں جو رسالے شامل تھے ان میں سے ایک کا نام تھا "فوائد الناظرین" دوسرے کا نام تھا "محب ہند" اور تیسرے کا نام تھا "قران السعدین"۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ رسالے بہت اہم تھے اس اعتبار سے کہ اس کالج میں جو طالب علم پڑھتے تھے بطور خاص جو مسلمان پڑھتے تھے اور جن کا سابق ہی درس نظامیہ سے تعلق رہا تھا وہ جب ان رسالوں کو پڑھتے تھے اور یہاں کے نصاب کو پڑھتے تھے تو وہ ذہنی طور پر بالکل منقلب ایک دوسری فضا میں پہنچ جاتے تھے۔ گویا یہ طریقۂ تعلیم بدل رہا تھا، فرسودہ نظام تعلیم جو تھا وہ ختم ہو رہا تھا۔ یہاں مولوی ذکاء اللہ بھی پڑھتے تھے اور یہیں محمد حسین آزاد بھی پڑھتے تھے، نذیر احمد بھی تھے اور پیارے لال آشوب وغیرہ بھی تھے۔ تو کہا یہ جاتا ہے کہ اس نے مسلمانوں میں خصوصاً اس وقت کے نوجوانوں میں بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا تو کیا یہاں سے بیداری شروع نہیں ہو گئی تھی کہ ہم یہ کہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید احمد خان نے جو تحریک شروع کی یہ سلسلہ وہاں سے شروع ہوتا ہے۔

اختر حسین: بے شک کچھ اثر تو ضرور ہوا تھا اور سرسید احمد خان کی تحریک کا زیادہ اثر ہوا، کیوں کہ وہ تحریک ایک ادارے نے چلائی تھی اور اس ادارے کے ساتھ سرسید اور کئی اور لائق لوگ تھے جو اُن کے ساتھ تھے۔ دہلی کالج کے ماحول نے کئی لوگوں کے دماغ روشن تو ضرور کیے مگر کوئی تحریک وہاں سے پیدا نہیں ہوئی۔ اور آپ نے بالکل صحیح فرمایا کہ دلی کالج کے ماحول کا جو اثر ہے غالب کی شاعری میں اس کا جو عکس ملتا ہے اُن کے ہاں جو ایک نیا انداز ملتا ہے تو آپ یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ دلی کالج کے اساتذہ کی صحبت کا کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور غالب پر ہوا ہوگا۔

آغا سہیل: ڈاکٹر صاحب یہ وہی کالج تو ہے جہاں غالب خود گئے تھے، پروفیسری کے امیدوار تھے اور کسی وجہ سے وہاں سے لوٹ آئے تھے۔

اختر حسین: جی ہاں، یہ وہی کالج تھا لیکن بہرحال ان کے اساتذہ سے اُن کا خاص تعلق تھا ان کی صحبت میں بیٹھتے تھے، اُن کی گفتگو سنتے تھے ورنہ فارسی کے اساتذہ کے کلام کے مطالعے سے تو وہ باتیں غالب کے ذہن میں نہیں آ سکتی تھیں جو ان کے کلام سے ظاہر ہوتی ہیں۔ کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور دلی کالج کا تھا۔

آغا سہیل: اچھا یہاں پر یہ بات اور سامنے آتی ہے کہ جب سرسید احمد خاں نے پہلی مرتبہ "آثار الصنادید" لکھی اور غالب سے کہا کہ چچا اس پر تقریظ لکھ دیجیے، اور تقریظ کے بجائے انھوں نے تنقیص لکھ دی جو انھوں نے پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں کی۔ پھر اس پر ایک ناراضگی کا سلسلہ بھی چلا وہ الگ بات ہے تو یہاں کیا ہم یہ محسوس نہیں کرتے کہ غالب ذہنی طور پر سرسید سے زیادہ بیدار تھے۔ دراصل میں یہاں غالب کے حوالے سے حالی کو دریافت کرنا چاہتا ہوں اُس حالی کو جس نے بعد کو "مقدمۂ شعر و شاعری" لکھا اُس کی بنیادیں یہاں نہیں

پڑھا نہیں کیا ؟

اختر حسین: غالب کے کلام میں اشارے ملیں گے۔ بہر حال غالب شاعر ہیں' نثر نگار بھی ہیں۔ ان کے خطوط سے بھی آپ کو ان کی روشن دماغی کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں اور ان کی شاعری سے ہی آپ کچھ نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی باتیں نثر میں جس صاف اور صحیح طریقے سے بیان کی جا سکتی ہیں وہ شاعری میں نہیں کی جا سکتیں۔ سر سید احمد خاں نے جو باتیں کہی ہیں وہ نثر میں کہی ہیں اور صاف اور سیدھے انداز میں کہی ہیں اور انھوں نے جو کچھ کہا یعنی تعلیم اور سیاست سے قطع نظر انھوں نے مذہب کے متعلق جو کچھ کہا ہے' معاشرے کے متعلق جو کچھ کہا ہے اور جس کی وجہ سے وہ معتوب بھی ہوئے اور نیچری اور دہریے کہلائے' غالب کو ہمت نہیں ہوئی کہ اس صاف اور سیدھے انداز میں اظہار کر سکتے۔ اس لیے غالب بے شک اردو کے شاعروں میں پیش رو ہیں اس اعتبار سے کہ اگر میں کہوں کہ اردو غزل میں سوچنے کا انداز انھوں نے پیدا کیا' غزل کا مزاج جو تھا وہ محسوس کرنے کا تھا سوچنے کا نہیں تھا' غالب نے سوچنے کی صلاحیت غزل کو دی اور یہ غالب کا بڑا کارنامہ تھا شاعر کی حیثیت سے۔

آغا سہیل: یعنی سرسید میں تفکر اور تعقل کا عنصر زیادہ ہے۔ کیا یہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں!

اختر حسین: سرسید کا مرتبہ بالکل الگ ہے۔ قوم نے اُن کی تعلیمی خدمات کو تو سراہا لیکن سرسید احمد کا جو انداز فکر تھا اُس کو قبول نہیں کیا اور اس وجہ سے قبول نہیں کیا کہ اس زمانے کے معاشرے کے مطابق فکر نہیں تھا' لیکن آج آپ سوچیں کہ سرسید احمد نے جس طریقے سے سوچا تھا اور سرسید احمد کی جو فکری خدمت ہے اس کو پھر سے ہمیں مستقل طور پر مطالعہ کرنا چاہیے۔

آغا سہیل: ڈاکٹر صاحب! علی گڑھ کا جو قیام تھا آپ کا۔ یہاں علم و ادب کی کئی سمتیں مقرر ہوتی ہیں اور یہاں پر کئی ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں جو بڑی اہم تھیں' قومی لحاظ سے بھی اور ادبی لحاظ سے بھی۔ وہاں پروفیسر حبیب بھی تھے' پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی تھے۔ یہاں آپ نے بڑا زبردست واقعہ لکھا ہے جواہر لال نہرو کو علی گڑھ لانے کا! اُسی دور میں ٹیگور اور اقبال کے علاوہ مولوی عبدالحق سے جو آپ کی ملاقاتیں ہوئیں اور آپ نے ان سے بطور خاص استفادہ کیا۔ اب یہ استفادہ آپ کی ذات تک محدود نہیں رہا بلکہ ہم تک پہنچ چکا ہے اور یہ تاریخ کا بھی حصہ ہے۔ تو آپ یہ ارشاد فرمائیے کہ یہاں پر اصغر سے' جگر سے اور سبط حسن سے' حیات اللہ انصاری سے' مجاز لکھنوی سے اور یہ جو سب آپ کے ساتھی تھے' دوست تھے اور یہیں سے "ادب اور زندگی" کی اشاعت کی بنیاد بھی پڑتی ہوئی نظر آتی ہے' یہاں پر یہ بات اور عرض کرتا چلوں کہ آپ کی شخصیت کو اس حوالے سے جب ہم نے دریافت کیا اور اس کے بعد ایک لمبا گیپ آیا تو آپ کی واپسی پھر اُسی طرف ہوئی ہے جو ہم نے آپ کی اس کتاب کے مطالعے سے محسوس کی تو آپ ذرا یہ فرمائیے کہ' اور کون کون سی اہم باتیں ہوئیں جو ہمارے لیے اور ہمارے قارئین کے لیے رہنمائی کا سبب بن سکتی ہیں۔

صہبا لکھنوی: وہ شخصیتیں جو آپ کے قریب رہیں اُن کا جستہ جستہ ذکر آیا ہے تو لوگوں نے مطالعے کے بعد کہا کہ کچھ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً مجاز کے بارے میں آپ نے کچھ باتیں کہیں' سبط صاحب کا صرف دو جگہ ذکر آیا ہے جب کہ ان سے اتنی قربت اور وابستگی رہی۔ اسی طرح دیگر معاصرین کا بھی برائے نام تذکرہ ہے۔ اس کا کیا سبب ہے!

اختر حسین: ان باتوں میں اختصار سے کام لینا پڑا ہے' اگر میں ان باتوں کو تفصیل سے بیان کروں تو ایک اور کتاب لکھنا پڑے۔ سب کے ساتھ مجھے بھی تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ اپنی معذوری کے باوجود لکھنے کی مہلت ملی تھی تو مجھے تفصیل سے کام لینا چاہیے تھا' مشکل یہ آن پڑی کہ مجھے کوئی ایسا شخص نہ مل سکا جس سے میں کچھ لکھوا سکتا۔ میں حتی الامکان اس کا معاوضہ بھی

دینے کو تیار تھا۔ کئی چیزیں میں بھول جاتا تھا۔ کبھی کوئی آجاتا، لکھ کر چلا جاتا۔ دو دن کے بعد آتا تو بیچ میں وہ تار ہی ٹوٹ جاتا تھا۔ تسلسل برقرار نہیں رہ سکا۔ جن لوگوں سے میرے روابط تھے، وہ میرے بزرگ تھے۔ مولوی عبدالحق جن کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر ہے رشید احمد صدیقی کا ہے۔

آغا سہیل: اور بعض جگہ آپ محتاط بھی ہو گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے بارے میں بیان کرتے ہوئے آخر میں جو کچھ انھوں نے آپ کے ساتھ کیا یہ سب آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

اختر حسین: میں نے صرف واقعے کا ذکر کیا ہے، اُن کے متعلق زیادہ کچھ نہیں لکھا۔ اب آپ سے عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس وقت بڑا قلق ہوا تھا۔ اس وجہ سے نہیں میرا نام انگریزی اردو لغت کے معاونین میں شامل نہیں ہوا بلکہ اس وجہ سے کہ میں اس وقت نوجوان تھا، بہت آئیڈیلسٹ تھا۔ مجھے اس عمر میں یہ محسوس ہوتا تھا کہ مولوی عبدالحق سے بڑا آدمی میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ ایک طرف عظمت کا احساس تھا دوسری طرف یہ قلق تھا کہ ایک بڑے آدمی کو میں نے کھو دیا۔ اس کا قلق نہیں تھا کہ میری دو سال کی جو محنت تھی اُس کا ذکر نہیں آیا۔ معاوضہ تو بہر حال کچھ ملا ہی تھا، نام آجاتا تو ٹھیک تھا، لیکن اگر نہیں آیا تو چلیے کوئی مضائقہ نہیں، لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ دنیا میں ان معنوں میں کوئی بڑا آدمی نہیں ہوتا۔ اس کے بعد کئی مشہور آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن پھر میں نے کسی کو بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ کسی کو بہت قریب سے دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔ ممکن ہے کہ میں غلطی کر رہا ہوں مگر میرا تجربہ یہ بتلاتا ہے جسے انگریزی میں کہتے ہیں:

TOO MUCH INTIMACY BLEEDS CONTEMPT

بہت زیادہ قربت جو ہے وہ آخر ختم ہو جاتی ہے کہ ہر انسان نامکمل ہے۔

آغا سہیل: اچھا! ڈاکٹر صاحب ٹیگور اور اقبال کا جو ذکر آپ نے کیا ہے یہ دو مختلف شخصیتیں، دو مختلف رجحانات کی بھی حامل ہیں اور آپ دونوں سے تھوڑا تھوڑا قریب بھی رہے ہیں تو ـــ

اختر حسین: مجھے اقبال سے تو چند بار ملنے کا موقع ملا اور گفتگو کرنے کا بھی، بلکہ اقبال نے مجھ سے کہا کہ تمھارے ذہن میں جو شبہات ہیں تم قلم بند کر کے بیٹھو اور مجھ سے باتیں کرو تاکہ میں تمھاری تشفی کر سکوں تو میں نے ان سے سوالات پوچھے۔ انھوں نے جوابات بھی مجھے دیے بہت تفصیل سے گفتگو اُن سے ہوئی۔ اور میں نے سوچا تھا کہ ان پر مضمون لکھوں گا اور اگر شائع ہوتا اس زمانے میں تو ایک شور مچ جاتا۔ اب مشکل یہ آن پڑی ہے کہ وہ نوٹس کہیں پڑے ہیں اور میں جو ہوں دیکھ نہیں سکتا۔ خدا جانے کہاں پڑے ہوئے ہیں۔

آغا سہیل: ڈاکٹر صاحب وہ جو شبہات تھے کیا اب اُن کو تقویت نہیں پہنچ رہی ہے اب جو حالات ہیں۔

اختر حسین: بے شک تقویت پہنچ رہی ہے، لیکن اُن میں جو سوالات تھے ان سوالات کا تعلق کچھ فلسفے سے بھی تھا، کچھ معاشی اور معاشرتی سوالات تھے۔ یوں اقبال کی شاعرانہ عظمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی جگہ مستحکم ہے اور کوئی اُسے رد نہیں کر سکتا۔ بہر حال وہ درویش صفت آدمی تھے، اس میں بھی کلام نہیں۔ ان کے خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ٹیگور صحیح معنوں میں ہیومینسٹ تھے اور تصوف سے قریب۔ انھیں بنگالی زبان پر بڑا عبور تھا اور شاعری کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ موسیقی کا کچھ ادراک اگر ہو تو شاعر کو اپنے زبان و بیان پر بہتر عبور حاصل ہوگا اور ٹیگور موسیقی کے بڑے ماہر تھے اور اس سبب سے انھوں نے زبان کو جس طرح استعمال کیا بہت کم شاعروں نے کیا ہے۔ اقبال کی شاعری اور ٹیگور کی شاعری ان دونوں کو پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ

اقبال نے زیادہ تر فارسی شاعری کی ہے اور اُن کی اُردو بھی فارسی آمیز ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اصل چیز فارسی کلام ہے۔ اب میں نے غور کیا کہ اقبال زبان کا استعمال بہت احتیاط سے کرتے ہیں۔ فارسی ان کی مادری زبان نہیں تھی، مگر اس پر ان کو بہت عبور حاصل تھا مادری زبان پر آدمی کو کچھ ایسی قدرت ہوتی ہے کہ وہ ہر قسم کا اظہار کر سکتا ہے چنانچہ آپ نے بھی غور کیا ہوگا کہ اقبال زبان میں احتیاط سے کام لیتے ہیں اور ان کو یہ خیال رہتا ہے کہ اہل زبان کو اعتراض نہ ہو۔ غالب کو بھی یہ خیال ہمیشہ رہتا تھا۔ اس کے برعکس مجھے محسوس ہوتا ہے زبان جو ہے استاد ہے اور اقبال اس اُستاد کی انگلی پکڑ کر لا رہے ہیں اور ٹیگور کے متعلق مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ٹیگور استاد ہے اور زبان کو کسی بچے کی طرح اپنے ساتھ لیے جا رہا ہے یہ فرق ہے دونوں میں۔

شبنم رومانی: ہمارے یہاں بعض نئے لکھنے والے ہیں جو خیال کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور زبان کو بہت کم۔ بہت سے لوگ جو معروف ہیں نثر کے بھی نظم کے بھی، اُن کے یہاں زبان بڑی ڈھیلی ڈھالی جھول دار ہے تو وہ کہتے ہیں کہ خیال کو جتنی اہمیت حاصل ہے زبان کو نہیں، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

اختر حسین: زبان جو ہے صحیح معنوں میں اہمیت رکھتی ہے اس کے بغیر نظم ہو، غزل ہو یا نثر ہو، تحریر تو بے اثر رہ جائے گی۔

آغا سہیل: یہ تو سہل انگاری ہے کہ لوگ زبان کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میں یہاں یہ بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ تصوف تو دونوں کا موضوع تھا۔ اقبال کا بھی اور ٹیگور کا بھی لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے اور دونوں کے راستے جدا ہیں۔ ایک ہم کو گم کر دیتا ہے اور ایک ہم کو خودی کے حوالے سے بیدار کرتا ہے۔

اختر حسین: اقبال، میں سمجھتا ہوں کہ روایتی تصوف کے قائل نہیں تھے۔ اُن کے ذہن میں تو انسان اور بالخصوص مسلمان کی زبوں حالی تھی اپنی شاعری کے ذریعے انھوں نے انسان کو بالخصوص مسلمانوں کو روحانی اور ذہنی طور پر بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس ٹیگور کو اس دنیا میں انسان پر کیا گزرتی ہے یعنی اُس کی کوئی معاشی اور معاشرتی بہتری کی طرف اتنی توجہ نہیں ہے اُس سے زیادہ ٹیگور کی توجہ جو ہے وہ روحانی کیفیت جو انسان کی ہے اُس طرف ہے اور وہ مخاطب کسی خاص قوم کو نہیں کرتا۔ وہ ہندوؤں کو مخاطب نہیں کرتا بلکہ انسانوں کو مخاطب کرتا ہے اور اُس کے نزدیک سب انسان برابر ہیں۔ اس کے کلام میں وہ جوش اور زور نہیں ہے جو اقبال کے یہاں ہے۔ اس کے کلام میں ایک سکون ایک امن کا درس ملے گا، اپنے ماحول سے لڑنے کا درس نہیں ملے گا۔

آغا سہیل: ڈاکٹر صاحب آپ کی جواہر لال نہرو سے ایسی تواتر کے ساتھ ملاقاتیں رہی ہیں تو آپ نے ان کے اندر کوئی تبدیلیاں دیکھیں۔ اُن کے مزاج کو پہچانا ہوگا تو ایک شخصیت جواہر لال نہرو کی ہے جو "غبارِ خاطر" سے ہمارے سامنے اُبھر کے آتی ہے اور اس میں کہیں کہیں۔

اختر حسین: اس کتاب میں، میں نے وہ واقعہ نہیں لکھا ہے، لیکن چونکہ آپ اُن کا ذکر کر رہے ہیں اس لیے میں وہ واقعہ بیان کر دوں تاکہ بیان مکمل ہو جائے۔ یہ ذکر ۱۹۵۷ء کا ہے۔ میں یونسکو کا ملازم ہو چکا تھا۔ ہمارا پیرس ہیڈ کوارٹر تھا۔ یونسکو کی کانفرنس دہلی میں ہوئی اور مجھے عملے کے ڈائرکٹر جنرل کے ساتھ آنا پڑا اور چند ہفتے ہمارا قیام نئی دہلی میں ہوا۔ ایک شام کو اتفاق سے نئی دہلی میں کناٹ سرکس میں ٹہلتا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے پُرانے دوست فیروز گاندھی سامنے سے آ رہے تھے۔ فیروز گاندھی یعنی اندرا گاندھی کے شوہر۔ کتاب میں ذکر کر چکا ہوں کہ جب میں پیرس میں طالب علم تھا تو فیروز گاندھی لندن میں پڑھتے تھے اور اُسی زمانے میں اُن سے دوستی ہوئی، تو ان سے کئی سال کے بعد ملاقات ہوئی اور کیوں کہ زمانۂ طالب علمی کی دوستی تھی اس وجہ سے بڑی بے تکلفی سے ملے۔ وہ پارلیمنٹ کے ممبر تھے، شام کا وقت تھا، انھوں نے کہا کہاں جا رہے ہو میرے ساتھ چلو۔ پہلے تو میں جھجکا۔ میں سمجھا کہ شاید یہ پنڈت نہرو کے گھر پر رہتے ہوں گے

کیوں کہ ان کے بہت سے بچے لکھنؤ میں رہتے تھے، تو انھوں نے کہا کہ میں تو لکھنؤ سے آیا ہوں پارلیمنٹ کا سیشن ہو رہا ہے پہلے اس جگہ کو ولیسٹرن کورٹس کہتے تھے، وہ ایک ہوسٹل تھی، لیکن اب اس کو پارلیمنٹ کے ممبروں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا، وہ میرے ہوٹل کے قریب ہی تھا۔ وہ کہنے لگے کہ میں تو وہاں ٹھہرا ہوں۔ چنانچہ مجھے ساتھ لے گئے وہ ہم بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اب وقت گزر چکا تھا، حالات بدل چکے تھے جب میں ان سے ملا تھا تو نہرو کی ملاقات ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی، دس سال گزر چکے تھے ظاہر ہے کہ ان ساری تبدیلیوں پر اور تقسیم کے بعد جو واقعات ہوئے ان سب پر گفتگو ہوئی۔ پنڈت نہرو کا بھی ذکر ہوا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ انھوں نے پنڈت جواہرلال نہرو کا ذکر جس تلخی سے کیا اور جس طرح انھوں نے ان کی پالیسی پر چند باتیں کیں تو میں حیران ہوا اور میں نے کچھ اختلافات بھی کیے تو انھوں نے جواب دیا کہ اب تم ہندوستان میں نہیں رہتے ہو اب یہاں ۱۹۴۷ء کے حالات کے ساتھ انسان بھی بدل گئے ہیں اور لوگوں کا نقطۂ نظر بھی بدل گیا ہے۔ تو جن پنڈت نہرو کا ذکر کر رہے ہو وہ تمھارا پرانا تصور ہے۔ اب اُن میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان کا تم کو علم نہیں ہے میں اس کی تفصیل میں نہیں جا رہا کیوں کہ اگر یہ بات کوئی اور کہتا تو تعجب نہیں آتا مگر کیوں کہ یہ باتیں خود فیروز گاندھی نے کہیں اس وجہ سے کہ وہ اُن کے داماد تھے اور گھریلو حالات کو جانتے تھے اور آدمی گھر کے لوگوں سے جس بے تکلفی سے باتیں کرتا ہے باہر ایسا نہیں کرتا تو اب انھوں نے جو باتیں کہیں تو میری آنکھیں کھل گئیں اور مجھے اپنے کئی ایسے تصورات پر نظرثانی کرنا پڑی۔

حسن عابد: ڈاکٹر صاحب اس کی وضاحت نہیں ہوئی کہ یہ تبدیلی کس سمت میں تھی؟

اختر حسین: ایک سیاسی لیڈر طاقت حاصل کرنے سے پہلے کچھ ہوتا ہے اور طاقت حاصل کرنے کے بعد کچھ ہو جاتا ہے۔ جب وہ طاقت حاصل کرنے کے لیے لڑ رہا ہو تو جو انداز اختیار کرتا ہے اور جو باتیں کرتا ہے ان کا پس منظر کچھ اور ہوتا ہے اور طاقت حاصل کرنے کے بعد وہ بدل جاتا ہے۔ اگر آپ غور کریں اور جو سیاست داں ہمارے ملک کے اور دوسرے ممالک کے ہیں اُن کو دیکھیں کہ طاقت حاصل کرنے سے پہلے کیا تھے اور طاقت حاصل کرنے کے بعد اُن کا حال کیا ہوا تو میں جو بات کہہ رہا ہوں اس کی صداقت کا آپ کو علم ہو جائے گا۔

آغا سہیل: یوں تو ڈاکٹر صاحب اس پوری کتاب میں جو باتیں سطور میں نہیں ہیں وہ بین السطور میں کہی گئی ہیں اور سمجھنے والے بہت کچھ سمجھ لیں گے۔

اختر حسین: آپ کو یاد ہوگا کہ غالب جب خط ختم کرتے تھے تو آخر میں جملہ ہوتا تھا "لکھا کم سمجھنا بہت"۔

آغا سہیل: اچھا ڈاکٹر صاحب اب ہم پہنچ جاتے ہیں حیدرآباد دکن اور وہاں جو آپ نے انجمن آرائی کی ہے اور ایک اور بہت اہم شخصیت سروجنی نائیڈو اور اُن کے خاندان کے اکثر افراد سے آپ کی رسم و راہ۔ کچھ یہاں پر گاندھی، نہرو اور دوسرے لیڈروں سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں۔ اسی زمانے میں پریم چند اور سجاد ظہیر سے بھی آپ کی ملاقاتیں رہیں اور اسی زمانے میں مولوی عبدالحق کی شخصیت کے بہت سے نئے پہلو آپ نے دریافت کیے تو اس میں کوئی ایسا پہلو تو نہیں رہ گیا کہ جس کی وضاحت یہاں مناسب سمجھیں۔

اختر حسین: بات یہ ہے کہ مولوی عبدالحق کے متعلق تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور میں نے اس میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا۔ بہرحال میرے ذاتی تاثرات تھے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ حسن کہ شاید پریم چند کے متعلق میں نے زیادہ نہیں لکھا حالانکہ لکھنا چاہتا تھا کیوں کہ ان سے میرا تعارف کلکتے میں ہوا اور کبھی کلکتے سے علی گڑھ آتے ہوئے ان سے ملنے کے لیے بنارس ٹھہر گیا تھا۔ سوچا تھا کہ صبح ٹرین پہنچتی تھی۔ رات کی ٹرین سے علی گڑھ چلا جاؤں گا۔ تو ریلوے اسٹیشن پر اپنا سوٹ کیس رکھ کر ان کے گھر چلا گیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ بنارس میں پہلی بار آئے ہو، دو تین دن ٹھہرو۔ اپنے لڑکے کو بھیج کر سوٹ کیس منگوا لیا۔ میں اُن کے گھر دو تین دن ٹھہرا۔ مجھے انھوں نے بنارس دکھلایا، وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ملوایا اور پریم چند کے خلوص کا میرے اوپر بڑا اثر ہے۔ وہ بہت ہی مخلص ادیب تھے اپنی زندگی

انھوں نے سادگی سے گزاری اور بہت ہی وسیع النظر آدمی تھے۔ پھر بعد میں ان سے میری ملاقات ناگپور میں ہوئی جب ساہتیہ پریشد کا جلسہ ہوا۔ یہ ہنگامہ خیز جلسہ تھا اور بلا وجہ گاندھی جی نے ہندی اردو کا مسئلہ کھڑا کر کے مرہ کرکرا کر دیا۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں یہ جلسہ ہوا اور پھر وہ بحث شروع ہو گئی ہندی اردو کی تو میرے پاس ۱۹۳۷ء کا ایک مولوی عبدالحق کا خط ہے جب کہ گاندھی جی نے مولوی عبدالحق کو اس مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے واردھا بلایا تھا اور انھیں پریم چند نے آمادہ کیا تھا اس گفتگو میں حصہ لینے کو کہ گاندھی جی کو ندامت ہے کہ انھوں نے نادانستہ کچھ ایسی باتیں کہہ دیں اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح سے تصفیہ ہو جائے۔ تو مولوی صاحب نے مجھے لکھا کہ تم بھی پہنچ جاؤ مگر میں نہ پہنچ سکا، مگر ساتھ ہی ساتھ پریم چند نے مولوی عبدالحق کو خط لکھا، وہ خط بھی میرے پاس ہے۔ غیر مطبوعہ خط ہے کیوں کہ پریم چند دستخط دھنپت رائے کے نام سے کرتے تھے۔ وہ خط مولوی عبدالحق کے نام ہے اور دستخط دھنپت رائے کے ہیں۔ اب اس خط کا مضمون ایسا ہے کہ جب وہ شائع ہوگا تو تعجب ہوگا کہ پریم چند نے گاندھی جی اور ان کے ہم نواؤں پر بہت سختی سے تنقید کی ہے اور مولوی عبدالحق کو لکھا کہ وہ آپ کو بلا رہے ہیں میں بھی آؤں گا، لیکن مجھے اندیشہ ہے اور ان لوگوں کی نیت پر شبہ ہے۔

آغا سہیل: کیا آپ پنڈت سندر لال کے بارے میں کچھ کہنا پسند کریں گے۔

اختر حسین: نہایت روشن ضمیر تھے اور چاہتے تھے کہ ہندو مسلمانوں میں تقافتی طور پر جو مفاہمت ہے وہ باقی رہے اور اس کے لیے انھوں نے کوشش بھی کی اور میں اسے اپنی خوش قسمتی کہوں گا کہ ان لوگوں سے میرا ذاتی تعلق مدتوں رہا اور انھوں نے اپنے اپنے طور پر اس مقصد کے لیے قربانی بھی دی۔

آغا سہیل: کیا گاندھی جی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اُن کے رویّے سے یہ تنازعہ طول کھینچ لے گا۔

اختر حسین: میں اس کو گاندھی جی کی لاعلمی پر محمول کروں گا۔ میں نے ان کی شخصیت کا مطالعہ کیا اور مجھے چند روز قریب رہنے کا اتفاق بھی ہوا۔ وہ اردو تو خیر جانتے ہی نہیں تھے، ہندی پڑھ لیتے تھے مگر لسانی مسئلے کے مضمرات سے ناواقف تھے۔ ان کے ارد گرد جو منشر تھے، وہ انھیں غلط راستے پر لگاتے تھے۔ گجراتی کے ایک مشہور ادیب کے ایم منشی اور مراٹھی کے ایک مشہور ادیب کاکا کالیلکر ان کے منشیر تھے اور دونوں زبان کے معاملے میں بڑے متعصب تھے۔ گاندھی جی نے اس معاملے میں کبھی پنڈت نہرو سے یا مولانا آزاد سے مشورہ نہیں کیا۔ حالانکہ کانگریس میں وہ ان کے رفیق خاص تھے بلکہ لسانی مسائل میں انھیں دونوں سے مشورہ کرتے تھے۔

آغا سہیل: اس میں ایک بات اور نظر آتی ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ جنوبی ہند سے ان کا تعلق تھا اور شمالی ہند کے مسلمانوں کے کلچر سے ان کا تعلق نہیں تھا۔

اختر حسین: اس کا سیاسی پہلو یہ ہے کہ گاندھی جی کو یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ آگے چل کر وہ ہندوستانی قومیت بنائیں اور ہندوستانی قومیت میں اس کا انحصار قومی زبان کے فروغ سے ہوتا ہے۔ ہند میں کئی زبانیں ہیں لیکن ہندی ایک زبان ہے جو قومی زبان بن سکتی ہے۔ وہی ہندی قابل قبول ہوگی غیر ہندی علاقے میں جہاں ہندی ہیں، سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہوں۔ کیوں کہ سنسکرت ہی وہ ایک مشترک عنصر ہے ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں کے مابین اور انھیں یہ سمجھایا گیا کہ اگر ہندی میں اردو فارسی کے الفاظ زیادہ ہوئے تو وہ ہندی، گجراتی، مراٹھی والوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگی۔ وہ ہندی جس میں سنسکرت کے زیادہ الفاظ ہوں گے وہ قابل قبول ہوگی۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی اس لیے گاندھی جی نے یہ تہیہ کیا کہ ہندی کو اردو سے الگ کر دیا جائے۔ حالانکہ کانگریس کا ریزولیشن ۱۹۳۰ء کا یہی تھا کہ: "ہندوستان کی قومی زبان کا نام ہندوستانی ہوگا خواہ وہ ہندی رسم الخط میں لکھی جائے خواہ اردو رسم الخط میں اور اس زبان سے مراد

زبان ہے جو شمال ہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ میں ناگپور کے جلسے میں موجود تھا اور شاید سب سے کم عمر تھا اور اردو زبان کی طرف سے گاندھی جی نے مختلف زبانوں کے نمائندوں کو بلایا تھا۔ اردو کی نمائندگی مولوی عبدالحق کر رہے تھے اور منشی پریم چند وغیرہ سب ہی تھے۔ کانگریس میں سے کئی لیڈر وہاں موجود تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ساتھ نہرو تھے اور راج گوپال اچاریہ تھے۔ ہم سب حیران تھے۔ کیوں کہ ہمیں یہ کہہ کر بلایا گیا تھا کہ اس جلسے میں اس امر پر غور ہوگا کہ "جنگ آزادی میں مصنف کا کیا رول ہونا چاہیے"؟ یہ خبر ہوتی کہ وہاں زبان کا مسئلہ زیر بحث آئے گا تو ہم نہ جاتے۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو ایجنڈا وہ تھا ہی نہیں اور صدارت گاندھی جی کر رہے تھے۔ جب اعتراض ہوا تو کہنے لگے یہ مسئلہ بہت اہم ہے کہ ملک کی قومی زبان کیا ہوگی؟ جب ان سے کہا گیا کہ کانگریس کا ریزولیوشن موجود ہے تو کہنے لگے وہ ریزولیوشن تو میں نے ہی ڈرافٹ کیا تھا اور اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس میں ترمیم کر لینی چاہیے تو اب اس کا کیا جواب؟

آغا سہیل: اچھا ڈاکٹر صاحب اب ہم وہاں پہنچ گئے کہ جب آپ نے یورپ کا سفر کیا پہلے پہل۔

شبنم رومانی: ڈاکٹر صاحب۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی جمہوریت کی بنیادوں سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے کیوں کہ ریزولیوشن کو ڈرافٹ کرنے والا اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت اس ریزولیوشن کو منظور کرنے والے رکھتے ہیں۔

اختر حسین: گاندھی جی کا غیر جمہوری عمل تو وہ بھی تھا جب سبھاش چندر بوس کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے سیتا رامیہ کو شکست دے کر تو گاندھی جی کو اُن سے تعاون کرنا چاہیے تھا، لیکن گاندھی جی نے پوری کوشش کی کہ کسی ترکیب سے وہ مجبور ہو جائیں، ان سے کوئی تعاون نہ کرے اور ان کی صدارت ناکام ہو جائے۔

آغا سہیل: تو ڈاکٹر صاحب یورپ پہنچنے پر پیرس میں آپ کا قیام ہوا۔ یہاں آپ نے فرانسیسی زبان بہت تیزی سے سیکھی، پھر یہاں پر بہت سے ادیبوں، مصوروں اور فلسفیوں سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں پھر یہیں پر آپ کی سر عبدالقادر سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اِن ملاقاتوں کا بھی ایک بہت اہم پہلو ہمارے سامنے آیا ہے اور جس کے بہت سے سیاق و سباق بنتے ہیں ہمارے سامنے۔ پھر اسی زمانے میں دوسری جنگِ عظیم کی ابتدا ہوتی ہے جس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا اور فکری لحاظ سے لوگوں کی سوچ بدل گئی اور کئی سمتیں مقرر ہوئیں ساری دنیا کی۔ اس فضا میں آپ نے اپنا کام پھر بھی جاری رکھا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد آپ وہاں سے واپس آئے لیکن ابھی ہم نہیں چاہتے کہ آپ واپس آئیں۔

اختر حسین: کاش میں وہیں رہ جاتا۔ (قہقہہ)

آغا سہیل: ان میں سے بہت سے لوگوں کے بارے میں سرسری ذکر ہوا ہے تو کچھ تشنگی کا احساس ہوا تو جی چاہتا ہے کہ کچھ اور بھی باتیں ان کے بارے میں ہوں اور ان میں سے فرداً فرداً ہر ایک کے بارے میں آپ کچھ کہنا پسند فرمائیں گے۔

اختر حسین: آغا صاحب آپ نے بجا فرمایا، اور لوگ بھی مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں کوئی اور کتاب نہ لکھوں تو ضمیمہ ہی لکھ دوں اُن مختلف شخصیتوں کے بارے میں اور وہ واقعات جو اس کتاب میں لکھنے سے رہ گئے ہیں ان کو زیادہ تفصیل سے لکھ دوں تو آپ دعا کیجیے کہ میرا ذہن میرا ساتھ دے تاکہ میں اس کام کو کر سکوں۔ بطور خاص خالدہ ادیب خانم اور چند اور شخصیتیں ہیں جن کی عظمت کا اعتراف میرے دل میں باقی ہے۔ میں نے ان سے زیادہ بااصول اور باوقار خاتون نہیں دیکھی۔ میں نے سر عبدالقادر کا بھی ذکر کیا ہے، البتہ یورپین جو ادیب تھے ان کا ذکر دانستہ میں نے تفصیل سے یوں نہیں کیا کہ شاید قارئین کے لیے وہ غیر دلچسپ ہوں۔ وہ ان سے ناواقف ہوں اور میں ان تحریروں کا ذکر کرنے بیٹھ جاؤں تو شاید بات بڑھ جائے اور قارئین کے لیے بارِ خاطر ہو جائے۔

آغا سہیل : جی نہیں ڈاکٹر صاحب! اب تو یہ سلسلہ زیادہ قایم ہوگیا ہے۔ آج کا جو قاری ہے وہ اُن کے بارے میں بہت زیادہ جاننا چاہتا ہے اور اگر آپ کے حوالے سے ہم جانیں گے تو وہ براہ راست ہوگا۔

اختر حسین : پھر یوں سمجھ لیں کہ یہ تو میری ہی کم علمی تھی۔ اُس وقت میں یہ سوچتا رہ گیا کہ ان کے ذکر کو آگے بڑھاؤں۔ پھر فیصلہ نہ کر سکا یہ سوچ کر کہ شاید یہ تفصیلات لوگوں کو پسند نہ آئیں۔

حسن عابد : اس صورت میں تو ڈاکٹر صاحب یہ ضمیمہ بہت ضروری ہو جاتا ہے۔

آغا سہیل : اچھی بات ہے تو پھر اس ذکر کو ہم یہاں تک چھوڑتے ہیں اور انتظار کریں گے کہ ضمیمہ تیار ہو جائے۔

اختر حسین : اس صورت میں کوئی پڑھا لکھا اسکالر مل جائے تو میں بیٹھا کر لکھا سکوں۔ جس سے میں کہہ سکوں کہ ریفرنس کے لیے فلاں کتاب لاؤ، فلاں صفحہ پڑھ کر سناؤ، ایسا کوئی آدمی مل جائے تو میں کام کر سکتا ہوں۔ کتنا فرق ہوگیا کہ پہلے شہرت ہوتی تھی اور لوگ دور دور سے پڑھنے کے لیے آتے تھے آج جو ہے ایسی بے قدری ہے یعنی میں تلاش کرتا رہ گیا کہ شہر میں ایسا کوئی آدمی مل جائے۔ نہ مل سکا۔

آغا سہیل : ڈاکٹر صاحب! یورپ سے واپسی کے بعد آپ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے، یہاں بطرس بخاری سے آپ کی ملاقات رہی کرشن چندر اور منٹو سے بھی ان سے راہ و رسم رہی۔ پھر یہاں سے آپ امرتسر چلے جاتے ہیں اور بحیثیت وائس پرنسپل کے چارج لیتے ہیں اور یہاں پر بڑے ہنگامے ہوتے ہیں۔ ادبی ہنگامے بھی پہلی مرتبہ ہوئے۔ اس کے بعد آپ شملے کا سفر بھی کرتے ہیں اور بحیثیت مشیر تعلیم آپ سر جان سارجنٹ کے معاون ہوئے اور دوسری جنگ عظیم جاری ہے تو اس وقت آپ کئی کام بیک وقت کر رہے تھے تو اس میں کہیں ایسا خلا تو نہیں رہ گیا جس کی وضاحت آپ کرنا ضروری سمجھیں۔

اختر حسین : آغا صاحب! میں اپنی زندگی کا المیہ آپ سے عرض کروں۔ مجھے بچپن سے سوائے علم و ادب کے کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ میں اپنے متعلق آپ سے کہتا ہوں کہ میری کوئی آرزو نہیں تھی کہ کسی کی ملازمت کروں، دولت کماؤں منصب حاصل کروں۔ خدا حاضر و ناظر ہے، کبھی ذہن میں ایسا کوئی خیال نہیں آیا۔ خدا جانتا ہے کہ جب کبھی ملازمت کی جبراً کی۔ میرے ضمیر پر۔ میرے ذہن پر ایک جبر ہوتا تھا۔ ضمیر مجھ سے کہتا تھا کہ تمھیں علم و ادب کے کام کے سوا کوئی کام نہیں کرنا۔ شاید بہت کچھ کرنے کی صلاحیت تھی اور یہ صلاحیت ضائع بھی ہوئی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ ایک معاشی مسئلہ تھا۔ اس میں توازن باقی رکھا۔ ملازمتیں اور بھی مجھے مل سکتی تھیں جن میں تنخواہ زیادہ اور معقول تھی۔ یہ سب کرشن چندر، منٹو وغیرہ فلم میں چلے گئے تھے۔ مجھے بھی بمبئی ٹاکیز والوں نے جو بہت بڑا ادارہ تھا چیف سینیر یو رائٹر کی جگہ کے لیے بلایا تھا۔ دیویکا رانی کے خطوط میرے پاس ہیں، مگر میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ ماحول مجھے ناپسند تھا۔ جیسے ہی موقع ملا میں نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کبھی چھوڑ دی اور ایم۔اے۔او کالج چلا گیا، یہ سوچ کر کہ درس و تدریس کا ماحول ہوگا، لیکن امرتسر ایک چھوٹا سا تجارتی شہر تھا۔ میرے ذہن میں جو وسعت تھی وہ ماحول میرے لیے سازگار ثابت نہ ہوا۔ چنانچہ وہاں سے نکلنے کی میں نے کوشش کی۔ میں چاہتا تھا کہ پبلشنگ ہاؤس قایم کروں۔ اخبار نکالوں اسی طرح کا کوئی کام کروں۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ وہاں ہندوستان میں کل وقتی مصنف کے لیے کوئی جگہ تھی نہیں، صرف آپ کچھ لکھ پڑھ کر کام کر سکتے تھے۔ اب ممکن ہے مگر اُس زمانے میں ممکن نہیں تھا۔ پھر میں وزارت تعلیم میں چلا گیا۔ پھر میں نے طے کر لیا کہ اپنا پیشہ تعلیم اختیار کرلوں، لیکن جب مجھے فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے سلیکٹ کر کے اپریل ۱۹۴۵ء میں اپائنٹمنٹ کر لیا تو دو مہینے تک اس خط کو لیے سوچتا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ یہ ملازمت پچھلی ملازمت سے کافی اچھی تھی مگر میرا جی نہیں چاہتا تھا۔ اگر میں اس ملازمت میں ایک دفعہ پھنس گیا تو پھر نکل نہیں سکوں گا۔

تو پھر لوگوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ دو تین سال میں ملک آزاد ہو جائے گا پھر اس موقع پر نئے راستے نکلیں گے اور یہ ہوگا وہ ہوگا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ بعد میں کیا ہوگا سو میں چلا گیا اور باقی وقت گزر گیا اور خدا کا شکر ہے کہ اچھا وقت گزر گیا۔

آغا سہیل: اچھا ڈاکٹر صاحب یہاں پر ایک چھوٹا سا سوال یہ کرنا چاہتا ہوں کہ جو استاد اور شاگرد کا رشتہ آپ کے زمانے میں مستحکم ہوگا لیکن اب قدریں بدل گئی ہیں، حالات بدل گئے ہیں اور اب اینگری ینگ مین کا دور ہے۔ ہم اور حسن عابد اسی پیشے سے وابستہ ہیں اور نظر یہ آتا ہے کہ استاد کا مقام تو کچھ نہیں اور ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

تو اب عزتِ سادات بھی محفوظ نہیں ہے تو ڈاکٹر صاحب یہ بات آپ نے یورپ میں بھی محسوس کی۔ وہاں کے استاد اور یہاں کے استاد میں کوئی فرق نظر آتا ہے؟

اختر حسین: جب میں طالب علم تھا تو استاد اور شاگرد کا رشتہ یہاں اتنا اُستوار نہیں تھا جتنا وہاں اُستوار تھا اور پروفیسر جو تھے وہ اپنے شاگردوں کا بڑا خیال کرتے تھے، ان کی بڑی عزت بھی کرتے تھے۔ وہ اس قابل بھی تھے اور شاگردان کا احترام کرتے تھے تو وہ اس کے مستحق بھی تھے۔ اب میں اپنے ایک پروفیسر کا ذکر کروں جو یورپ میں تھے اور پیرس یونیورسٹی سے وابستہ تھے تو جو ڈاکٹریٹ کا طالب علم ہوتا ہے اس کی حیثیت بالکل الگ ہوتی ہے۔ اس سے یہ توقع بالکل نہیں کی جاتی کہ وہ کلاس میں آئے گا، البتہ ہفتے میں ایک بار اپنے استاد سے ملنا ہوتا تھا اور اُس کو بتلانا ہوتا تھا جو اُس نے کام کیا وہ کیا ہے! تو وہ گائڈ کرتا تھا کہ یہ کرو وہ کرو۔ پھر مہینے میں ایک بار وہ اپنے فلیٹ میں بلا کر ریسرچ کے پروگرام انھیں بتلاتے تھے۔ شام کو ان سے وہ عام باتیں کرتے تھے علم و ادب کی عام باتیں تاکہ جو تعلق استاد اور شاگرد کا تھا وہ مضمون تک ہی محدود نہ رہ جائے یعنی ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ان کا تعلق وسیع معنوں میں جو ہماری تہذیب سے ہے، ہماری تاریخ سے ہے وہ قائم رہے۔ میں نے ایک بار اپنے استاد سے کہا کہ میں فلاں ادیب سے ملنا چاہتا ہوں آپ میرا تعارف کرا دیں۔ چنانچہ انھوں نے ٹیلیفون کر دیا اور کہا کہ میرا فلاں شاگرد آئے گا۔ تو اس حد تک وہ دلچسپی لیتے تھے اپنے شاگردوں سے اور یہاں ہندوستان میں بھی یہی صورت تھی اُس وقت۔ اب اتنا فرق آ گیا ہے آغا صاحب کہ ذاتی تعلق ختم ہو گیا ہے استاد اور شاگرد میں۔ میرا تو خیال ہے کہ شادی کی عمر کو پہنچنے کے بعد جو لڑکے اور لڑکیاں جب اپنا گھر بناتے ہیں تو ان کا تعلق والدین سے نہیں رہتا۔ ایک ہی شہر میں رہ کر ایک دوسرے کا پتہ نہیں چلتا۔ ابھی میرا بھتیجا جو لاہور میں تھا، اس کی ساس بھی وہیں رہتی ہیں۔ اُن کی بیوی کہہ رہی تھیں کہ ہفتوں ان کی والدہ سے ملاقات نہیں ہوتی۔ ایک ہی شہر میں رہتی ہیں، اگر کوئی کام ہوتا ہے تو خط لکھ دیتی ہوں اور خط کا جواب آ جاتا ہے۔

آغا سہیل: اچھا ڈاکٹر صاحب اب ہم اور آپ ذرا تیزی سے چلیں گے۔ اب یہ مقام آ گیا کہ تقسیم ہوئی اور "دنیا بدل گئی" آپ نے عنوان رکھا ہے "قیامِ پاکستان" پھر فسادات اور غارت گری اور بڑے سے بڑے لیڈروں کی بے حسی کا آپ نے ذکر کیا ہے، پھر یہاں پر ایک بہت بڑی تاریخی بات ہوئی، میرا اشارہ ریڈکلف ایوارڈ کی طرف ہے۔ اس کی جو بدنیتی ہے وہ بھی ہمارے سامنے آئی اور پھر قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات ہیں اور مفاد پرست طبقہ جو اُبھر آیا ہے اور اس نے جو کردار ادا کیا ہے یہ بھی آپ کی نگاہ سے اوجھل نہیں تھا۔ پھر پاکستانی معاشرے میں جو اقتصادی لحاظ سے گڑبڑ پیدا ہوئی ہے اسی مقام سے، اس کا بھی آپ نے ذکر کیا ہے اخلاقی

قدریں یہیں سے ٹوٹنا شروع ہوئیں، ان کا بھی آپ نے ذکر کیا ہے۔ لیکن آپ کی زندگی کا اہم واقعہ بھی یہیں سے ظہور پذیر ہوا ہے وہ یہ کہ آپ کی یونسکو سے وابستگی کے بعد جو آگے چیپٹر میں ذکر کیا ہے کہ اس میں سومالیہ میں آپ کا قیام رہا اور اس کے قدرتی مناظر سے، وہاں کے جانوروں اور انسانوں کا جو رشتہ تھا وہ ریلیشن شپ آپ نے بطور خاص بیان کی ہے۔ اس پر تو آپ ایک الگ کتاب تحریر کر سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ صومالیہ میں آپ نے تعلیمی اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کا کتاب میں بھی ذکر کیا ہے۔ ذاتی طور پر میری آپ سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی تو بہت تفصیل سے آپ نے اس پر روشنی ڈالی تھی۔ پھر یہ کہ آپ نے ایران میں چار سال گزارے، وہاں کی تاریخی عمارتیں، تہران، قدرتی مناظر، وہاں کے سیاسی حالات اور اس میں ایک شخصیت کا ذکر دہلی سے ملتا ہے جس کا آپ نے ایک فرضی نام لکھا ہے "آقائے تکریمی"۔ یہ ایک فرضی نام ہے، پھر آپ نے کہا کہ ان سے ملاقات ہوئی بار بار۔ تو کیا آج کا جو ایران کا انقلاب ہے اس کے پیچھے جو شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ ایک تو اہم شخصیت ڈاکٹر علی شریعتی کی ہے۔ اب ہم نام نہیں پوچھیں گے، وجہ نہیں پوچھیں گے، تو کیا آپ کو اس شخصیت کے حوالے سے ایران بدلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اقتصادی لحاظ سے، سیاسی لحاظ سے۔

اختر حسین: اس وقت جو ایک تبدیلی ہے وہ تو سیاسی تبدیلی ہے۔ اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شاہ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ کسی کے وہم و گمان میں کبھی نہیں آ سکتا تھا کہ شاہ کو کوئی ہٹا سکے گا، لیکن یہ سب سمجھتے تھے کہ شاہ کے ہٹتے ہی یہاں پر انقلاب آئے گا۔ اچھا تو وہ انقلاب کون سا رخ اختیار کرے گا یہ کہنا مشکل تھا، لیکن یہ سب سمجھتے تھے کہ بادشاہت تو باقی نہیں رہے گی۔

غا سہیل: اچھا آپ اس شخصیت کا نام نہ لیں ہمیں کچھ ایسا بتا دیں کوئی اتہ پتہ نہیں۔ کیا اس قسم کی شخصیتیں جب تاریخ میں نظر آتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں انقلاب آنے والا ہے تو اس قسم کی شخصیتیں آپ کو کبھی کبھی ہمارے معاشرے میں کبھی ملی ہیں؟

اختر حسین: جی ہاں! ہمارے معاشرے میں بھی ہیں، میرا خیال ہے ایسی شخصیتیں موجود ہیں، ہمارے یہاں بھی ہیں اور ملکوں میں بھی ہیں۔ بہرحال میں نے لکھا بھی ہے کہ کسی بڑے مقصد کو لے کر کوئی آدمی بڑی قربانی کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے، آپ اس کا ساتھ نہ دے سکیں لیکن بہرحال آپ اُس کا احترام تو کرتے ہیں۔ اگر آپ کے دل میں کوئی خلوص ہے تو آپ احترام تو اس کا کریں گے ہی وہ کامیاب ہوگا یا ناکام ہوگا، یہ کہنا مشکل ہے۔ یہ تو وقت بتلاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ فضا پُرسکون ہوتی ہے اور کبھی طوفان ایک دم سامنے آ جاتا ہے اور ایسے ملک میں جہاں معاشرے کی بنیادیں کمزور ہوتی ہیں یا کھوکھلی ہو جاتی ہیں وہاں بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہر طرف امن اور چین ہے، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح یہاں ایسی طاقتیں اُبھریں جو طوفان کی طرح اس معاشرے کو الٹ پلٹ کر دیں۔ ایران کی یہی کیفیت ہوئی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۷۸ء کے آغاز میں امریکہ کے پریذیڈنٹ کارٹر جب تہران گئے تھے اور انھوں نے یہ تقریر کی تھی کہ اس پورے خطے میں سب سے زیادہ مستحکم حکومت ایران کی ہے اور سب سے زیادہ سکون ایران میں ہے۔ یہ تقریر انھوں نے کی اور ان کی اس تقریر کے چند مہینے کے بعد وہاں پر شورش ہو گئی۔ یعنی وہ امریکن سی۔ آئی۔ اے وغیرہ سب بے خبر رہے۔ انھیں خبر بھی نہیں ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے؟

غا سہیل: اچھا ڈاکٹر صاحب یہاں سے آپ بڑی تیزی سے چلے ہیں اور ایک بہت اہم مقام اسرائیل آتا ہے جہاں یونسکو کی طرف سے آپ نے چند ہفتے قیام کیا۔ بہت سی باتیں جو پسِ پردہ تھیں سامنے آئیں۔ پھر فلسطینیوں کی جو حالت زار ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے وہ اس کتاب کے ذریعے ہمارے سامنے آئی ہے اور یہودیوں کی جو فہرسامانیاں ہیں وہ بھی ہمارے سامنے

آئی ہیں۔ اس کے بعد آپ کا اسپین میں قیام ہوتا ہے اور عہد رفتہ میں جو مسلمانوں کی شان و شوکت تھی اس کے بہت سے نشانات آپ دریافت کرتے ہیں، وہ بھی ہمیں ملتے ہیں۔ عمارتیں ملتی ہیں، زبان و ادب ہے پھر جیسی لوگوں کا آپ نے ذکر کیا ہے اور بھی کچھ لوگوں نے جو اس سفر کیے ہیں اس میں بھی انھوں نے وہی چیزیں دریافت کی ہیں، لیکن آپ نے بڑی عالمانہ سطح پر ان چیزوں کو دریافت کیا ہے۔ پھر اطالیہ میں آپ کا قیام ہوتا ہے اور یہاں بھی ایک بڑی اہم شخصیت آئی ہے۔ اُس کا آپ نے بہت ذکر کیا ہے۔ وہ ہیں اقبال شیدائی ۔ اقبال شیدائی سے میں بھی ملا ہوں۔ یہاں پاکستان میں اور ایک خاص حلقے نے ان کو کسی اور حوالے سے اُچھالا تھا، نہ صرف اُچھالا تھا بلکہ ان کو ہیرو بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ امیج آپ نے شیٹر کر دیا ہے اُن کا۔ اور بھی اس قسم کے لوگ تھے۔ ایک صاحب کا تو آپ نے بتایا کہ ان کی لنسی بھی ہو گئی، لیکن خالدہ ادیب خانم نے آپ کو اُن کے بارے میں بتایا تو کیا اس طرح کی شخصیتیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ ہم مسلمانوں نے بہت سی ایسی باتیں کی ہیں اور ہمارے اندر اس طرح کے بہت سے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ہم کو انھوں نے نقصان بھی پہنچایا تو اس طرح کی شخصیتیں کیا آپ کو بھی ملیں جنھوں نے ہم کو ضعف پہنچایا ہو۔

اختر حسین : جی ہاں میں نے بعض لوگوں کا ذکر نہیں کیا اور بعض کا ذکر کیا ہے جن سے ماضی کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ میرا خیال ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر ملک میں ایسے لوگ ہوتے ہیں آج بھی آپ کیا کہہ سکتے ہیں۔!

آغا سہیل : میرے خیال میں یہاں خاموشی ہی بہتر ہے۔

حسن عابد : آپ نے ان لوگوں کا ذکر کتاب میں نہیں کیا ہے۔

اختر حسین : نام لینا کیا ضروری ہے :

آغا سہیل : اچھا ڈاکٹر صاحب اب ہم آتے ہیں امریکہ پر جسے آپ نے نو دولتیوں کے مرکز کی حیثیت سے دریافت کیا ہے اور پھر یہاں جو یہودیوں کا اڈا ہے بلکہ آج کل تو کھلم کھلا لوگ کہتے ہیں کہ یہ نیویارک نہیں بلکہ جیوز یارک ہے۔ پھر سائنس اور صنعت کے حوالے سے بہت سی باتیں کی ہیں۔ یہاں جو تہذیب ہے، جو کم مایئگی ہے اس کا بھی ذکر ہے۔ اصل باشندوں کو جو یہاں کے رہنے والے ہیں ان کو کس بے دردی سے کچلا ہے یہ بھی پہلی مرتبہ ہمارے سامنے تفصیل سے آیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے جاپان کا جو ایشیا میں صنعت اور تہذیب کے مرکز کی حیثیت سے سربلند ہوا ہے اُس کا بھی ذکر کیا ہے۔ پھر کچھ چھوٹے چھوٹے چیپٹر آپ نے لکھے ہیں سیلون اور برما وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور ایک بہت اہم بات یہاں برما میں بھی ہوئی ہے کہ بیگم حضرت محل کی نشان دہی کر کے آپ نے تختی لگوا دی۔ یہ تاریخ کی ایک گم شدہ کڑی تھی اور گویا اس نقش کو ثبت کر دیا۔

اختر حسین : آغا صاحب۔ اور کہیں میں نے ذکر کیا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے جو جانشین تھے جواں بخت جن کے غالب و ذوق نے سہرے بھی لکھے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ جواں بخت بھی رنگون بھیج دیے گئے تھے اور رنگون میں ہی وہ نظربند رہے۔ ان کے ایک ہی لڑکے تھے جمشید بخت اور جمشید بخت کا ایک ہی لڑکا تھا بیدار بخت۔ تو جب جمشید بخت کا انتقال ہوا ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء میں جمشید بخت کے جنازے کا جو جلوس رنگون میں نکلا تو اس کے ذریعہ بیدار بخت کو جو دو سال کے تھے انھیں لوگوں نے ہاتھی پر بٹھلا کر شہر میں جلوس نکالا اس پر انگریز بہت خائف ہوا اور اس نے لڑکے کو جو اس وقت یتیم ہو چکا تھا اس کے نانا کے ساتھ رنگون سے نکال کر کلکتے میں مٹیا برج میں نظربند کر دیا۔ وہ کس مپرسی کی حالت میں رہتے تھے۔ نہ ان کو پنشن ملتی تھی اور وہ نانا جن کا پیارے مرزا نام تھا وہ بے چارے نابینا ہو چکے تھے۔ اتفاق سے میری ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے ہی سب سے پہلے ان کا ذکر کیا۔ میرا سب سے پہلا

مضمون جس پر مجھے شہرت نصیب ہوئی "تیموریہ گھرانے کی آخری جھلک"۔ کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ یہ مضمون کسی طرح نظام دکن کی نظر سے گزرا تو انھوں نے بیدار بخت کی پنشن مقرر کر دی۔ ان کی تعلیم بھی معقول ہوئی۔ ابھی چند سال پہلے تک وہ زندہ تھے اور عزت کی زندگی انھوں نے گزاری۔ جب ان کا انتقال ہوا تو یہاں کے اخباروں میں خبر چھپی تھی کہ اُن کی بیوہ اور بچے کلکتے میں عسرت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے براہِ راست خاندانی جانشین تھے۔ یعنی جواں بخت، جمشید بخت اور پھر بیدار بخت۔

آغا سہیل: ڈاکٹر صاحب تو ابھی کتاب باقی ہے اور سوالات بھی بہت سے باقی ہیں مگر میں آخری سوال کر کے اسے ختم کروں گا۔ آپ کو ہم نے بہت زحمت دی۔ تو یہ دنیا میں جنگوں کا ادب پر جو اثر ہوا ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، عالمی ادب کا اس پر اثر ہوا ہے اور ہونا چاہیے تھا، اردو ادب پر بھی اس کا اثر ہوا ہے اور اس کے بعد سے جو اردو میں واضح طور پر کچھ رجحانات آئے ہیں وہ آپ کے خیال میں تنقید پر بھی، افسانے پر بھی، ہماری غزل پر بھی، تخلیقی ادب پر بھی اُس کا اثر پڑا ہے تو اس میں آپ کے نزدیک کون کون سے اہم رجحانات تھے جن کا جنگ سے پہلے ہمیں احساس نہیں ہوا تھا۔!

اختر حسین، سب سے بڑا جو اثر ہوا ہے تو سچ پوچھیے یہ نیا ملک بنا ہے اور جن حالات میں بنا ہے اور قیام پاکستان کا جو پس منظر تھا سب سے واضح اثر تو وہ ہے اور اس کے بعد انتشار کی جو کیفیت پیدا ہوئی پورے معاشرے میں، اُس کا عکس ادب میں موجود ہے، اور اس چیز کا ہم سب کو افسوس ہے، وہ یہ کہ اردو ادب نے جتنی ترقی تقسیم سے پہلے کی ہے۔ یعنی پہلی جنگِ عظیم سے لے کر ۱۹۴۷ء تک تقریباً پینتیس ۳۵ سال کے عرصے میں اب پینتیس ۳۵ چھتیس سال آزادی کے بعد۔ اگر اس کا موازنہ کیجیے تو آپ یہ دیکھیے گا کہ اُس دور میں ادب نے بڑی ترقی کی۔ شاعری میں ہی دیکھیے کہ اقبال وغیرہ تھے اور اردو کے بڑے غزل گو شاعر تھے، مختصر افسانے کے اُس دور کے لوگ تھے پریم چند وغیرہ۔ اردو پر کتنا بڑا کام ہو رہا تھا حیدر آباد دکن میں، دارالترجمے میں لاہور میں جو کام ہوا تھا اب آپ اس کا موازنہ کیجیے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان پینتیس چھتیس سال میں کام بے شک ہوا ہے لیکن بالخصوص تحقیق و تنقید کے میدان میں کام جیسا ہونا چاہیے تھا، نہیں ہوا اور ترقی رُک گئی۔ یہ ہونا نہیں چاہیے تھا۔ آزادی کے بعد تو زیادہ فروغ ہونا چاہیے تھا۔ ویسے غالباً ایک وجہ یہ ہے کہ تقسیم جو ہوئی ہے تو اس کے بعد اُردو دو ملکوں کی زبان بن گئی۔ ایک پاکستان کی اور ایک ہندوستان کی۔ کام وہاں بھی ہو رہا ہے اور یہاں بھی لیکن رابطہ براہ راست نہیں ہے۔ وہاں جو کتابیں چھپتی ہیں وہ یہاں نہیں آسکتیں اور یہاں جو کچھ چھپتا ہے وہ وہاں نہیں جا سکتا۔ اس سے یہ ہوا ہے کہ نشر و اشاعت پر بھی بُرا اثر پڑ رہا ہے تخلیق پر بھی اور اشاعت پر بھی۔ اگر بے روک ٹوک کتابیں آجا سکیں، رسائل جرائد کا آزادانہ تبادلہ ہو سکتا تو پھر آپ کا مارکیٹ بڑا ہو جاتا اور مارکیٹ جب بڑا ہو جاتا ہے تو ناشروں کو بھی تحریک ہوتی ہے کتابیں چھاپنے کی اور مصنفوں کو بھی۔ اچھا اب یہ دیکھیے کہ کتاب یہاں پر کوئی ایک ہزار بک جائے تو بڑی بات سمجھی جاتی ہے۔ صہبا صاحب بہت خوش ہیں کہ میری کتاب کی ایک ہزار جلدیں دو تین مہینے ہی میں نکل گئیں۔ یہاں یہ بہت بڑی بات ہے، لیکن سچ پوچھیے تو ایک بڑی زبان کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں۔ کسی ملک میں ایک ہزار کا ایڈیشن تو کوئی چھاپے گا ہی نہیں۔ تو اسی وجہ سے اردو کا بہت نقصان ہوا اور اس کا اثر براہِ راست تخلیقی عمل پر بھی ہوا۔ میں اپنے ذہن کی بات کرتا ہوں کہ پاکستان بننے کے بعد ایک تو لکھنے کی فرصت کم ملی، لیکن کبھی اگر کچھ میں نے لکھنا چاہا تو ذہن پر ایک پابندی محسوس ہوئی۔ میں مخاطب کر رہا ہوں اُن لوگوں کو جو ایک محدود علاقے میں رہتے ہیں۔ حالانکہ اس کا تعلق معاوضے سے اور صلے سے نہیں ہے۔ یعنی اگر مصنف جو کچھ لکھتا ہے

تو اس کو کیا صلہ ملتا ہے؟ وہ اپنی بات قارئین تک پہنچانا چاہتا ہے اس لیے وہ لکھتا ہے۔ پہلے یہ محسوس ہوتا تھا میں دلّی میں رہ کر جو کچھ لکھ رہا ہوں اس کے پڑھنے والے کلکتے میں بھی موجود ہیں، بمبئی میں بھی، لاہور اور حیدرآباد دکن میں بھی موجود ہیں۔ آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کراچی میں بیٹھ کر کہ پڑھنے والے بس لاہور میں ہوں گے اور کہاں ہوں گے۔ اس کا تخلیقی عمل پر بھی اثر ہوگا نشر و اشاعت پر تو ہوا ہے، تخلیقی عمل پر بھی ہوا ہے۔ اب آپ کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں، معاشرہ اس کو کس نظر سے دیکھے گا، قارئین اس کے متعلق کیا سوچیں گے۔ انگریزوں کی حکومت تھی جتنی آزادی سے ہم اس وقت لکھ سکتے تھے اس آزادی سے آج نہیں لکھ سکتے یا تو حکومت کی مداخلت سے یا معاشرے کی۔

آغا سہیل: ڈاکٹر صاحب جی تو یہی چاہتا تھا کہ مسلسل ہم آپ سے استفادہ کریں اور کتاب پڑھنے کے بعد بھی تھوڑی سی تشنگی کا احساس ہوا۔ وہ یہی تھا کہ آپ اس حکایت کو اور بیان کرتے اور لذیذ تر بناتے اور ہم پڑھتے ہی رہتے اور آپ کی باتیں سنتے ہی رہتے لیکن وقت ہر جگہ آکر راستہ روک لیتا ہے اب میں "ادارۂ افکار" کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اختر حسین: ایک شعر یاد آیا ہے

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمی سو گئے داستاں کہتے کہتے

اردو کے عہد آفریں ادیب

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

کی خود نوشت سوانح عمری

گردِ راہ

نصف صدی کی علمی، ادبی، فکری، تہذیبی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کا آئینہ خانہ — اردو میں اپنی نوعیت کی اہم ترین دستاویز

چند عنوانات

زندگی کے ابتدائی سال ○ کلکتہ کی یادیں ○ علم و ادب کی سمتیں ○ حیدرآباد دکن کی انجمن آرائی ○ یورپ کا پہلا سفر ○ یورپ سے واپسی کے بعد ○ پاکستان ناگزیر تھا ○ دنیا بدل گئی ○ افریقہ میں دو سال ○ ایران میں چار سال ○ فلسطین میں چند ہفتے ○ اسپین، اطالیہ، امریکہ، جاپان اور دیگر ملکوں کی جھلکیاں ○ حسن کی تلاش ○ حقیقت کی تلاش اور ادب کا ماضی و حال —

صفحات ۴۳۲ — ○ — سرورق مجلد

بہترین گیٹ اپ — ○ — متعدد یادگار تصاویر

قیمت : ———— ۶۰ روپے

ہر اچھے بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

مکتبہ افکار — رابسن روڈ کراچی

افکار کی خاص اشاعتیں

ایک نظر میں

پہلا دور

۱۹۴۵ء : افکار کا اجراء بھوپال سے
۱۹۴۸ء : لکھنو اردو کانفرنس نمبر (پہلی یادگار اشاعت)
۱۹۴۹ء : بھوپال اردو کانفرنس نمبر
۱۹۴۹ء : بھیمڑی ادبی کانفرنس نمبر

دوسرا دور
(پاکستان میں)

۱۹۵۱ء : پہلا خاص نمبر کراچی سے
۱۹۵۲ء : خاص نمبر
۱۹۵۳ء : افسانہ نمبر
۱۹۵۴ء : سالنامہ
۱۹۵۵ء : دس سالہ نمبر
۱۹۵۵ء : منٹو نمبر
۱۹۵۶ء : مجاز نمبر (دو ایڈیشن)
۱۹۵۸ء : سالگرہ نمبر
۱۹۵۸ء : آزادی نمبر
۱۹۵۹ء : رائٹرز کنونشن نمبر
۱۹۵۹ء : افسانہ نمبر
۱۹۵۹ء : انقلاب نمبر
۱۹۶۰ء : سالنامہ
۱۹۶۰ء : کہانی نمبر

> ۳ اگست ۱۹۶۰ء کو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی صدارت میں افکار کی سولہویں سالگرہ منائی گئی۔

۱۹۶۱ء : جوش نمبر (پہلا ایڈیشن)
۱۹۶۱ء : انقلاب نمبر

> ۵ نومبر ۱۹۶۱ء کو جشن جوش منایا گیا، اور "افکار" نے ۱۵۰۰ ادیبوں کے اس یادگار اجتماع میں "افکار" کا "جوش نمبر" پیش کیا

۱۹۶۲ء : جوش نمبر (دوسرا ایڈیشن باضافہ)

> چھپتے چھپتے یہ اطلاع ملی کہ کراچی یونیورسٹی نے افکار کے "جوش نمبر" کو بی اے (آنرز) اور ایم اے اردو کے نصاب میں شامل کر لیا ہے

۱۹۶۲ء : آزادی نمبر
۱۹۶۳ء : افسانہ نمبر
۱۹۶۳ء : حفیظ نمبر

> ۲۷ ستمبر ۱۹۶۳ء کو زیر اہتمام پاکستان رائٹرز گلڈ جشن حفیظ منایا گیا اور کراچی کے نمائندہ ادیبوں کے اجتماع میں افکار نے "حفیظ نمبر" پیش کیا

۱۹۶۴ء : افسانہ نمبر
۱۹۶۴ء : نئی تخلیق نمبر

> ۱۳ مئی ۱۹۶۴ء کو جناب الطاف گوہر کی صدارت میں افکار کی بیسویں سالگرہ منائی گئی

۱۹۶۵ء : فیض نمبر
۱۹۶۵ء : جنگ اور ادب نمبر
۱۹۶۶ء : غالب نمبر
۱۹۶۶ء : نئی تخلیق نمبر
۱۹۶۸ء : سالنامہ

> ۲۲ فروری ۱۹۶۸ء کو جناب حکیم محمد سعید دہلوی کی صدارت میں افکار کی تیسویں سالگرہ منائی گئی

بیاد جوش
۱۹۸۲ء

بیاد فیض
۱۹۸۵ء

۱۹۶۸ء : ڈراما نمبر
۱۹۶۸ء : انقلاب نمبر
۱۹۶۹ء : غالب نمبر
۱۹۶۹ء : اقبال نمبر
۱۹۷۰ء : جوبلی نمبر (۱۹۴۵-۷۰ء)
۱۹۷۵ء : ندیم نمبر
۱۹۷۵ء : امیر خسرو ایڈیشن
۱۹۷۷ء : کرشن چندر ایڈیشن
۱۹۷۷ء : نذر اقبال
۱۹۷۸ء : رومی ایڈیشن
۱۹۸۱ء : برطانیہ میں اردو ایڈیشن

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی ⭘ طابع : مشہور آفسٹ پریس کراچی ⭘ دفتر : رابسن روڈ کراچی ⭘ کتابت : الوری بیگم دہلوی

اَلحَمدُ لِلّٰہ

ہم نے آپ کے اعتماد کو برقرار رکھا ہے

نیشنل بینک آف پاکستان نے جمع شدہ رقوم پر قابلِ قدر مُنافع ادا کیا ہے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۸۵ء کو ختم ہونے والی ششماہی کی شرح مُنافع یہ ہے:۔

شرحِ مُنافع فیصد۔ جون تا دسمبر ۱۹۸۵ء

سیونگز بینک ——— ۷ء۸۰ فیصد

میعادی کھاتے

برائے ۵ سال یا زائد ——— ۱۴ء۴۰ فیصد

سہ ماہی	ششماہی	ایک سال	۲ سال	۳ سال	۴ سال
۹ء[illegible] فیصد	۱۰ء۲۰ فیصد	۱۰ء۶۰ فیصد	۱۱ء۶۰ فیصد	۱۲ء۵۰ فیصد	۱۳ء۴۰ فیصد

۷ دن اور ۳۰ دن کے نوٹس کھاتوں پر بالترتیب ۵ء۱۰ فیصد اور ۵ء۹۰ فیصد منافع دیا گیا

نیشنل بینک آف پاکستان قومی ترقی قومی بینک

United PID

Phone 214079

Rabson Road
KARACHI

AFKAR